سرسید کی لائف

مُلقّب بہ

حیاتِ جاوید

جس میں

عالی جناب جواد الدولہ عارف جنگ ڈاکٹر سرسید احمد خاں مرحوم و مغفور کی زندگی کے حالات اور ان کی سرکاری، ملکی، قومی اور مذہبی خدمات مفصل بیان کی گئی ہیں

مُرتّبہ

مولانا الطاف حسین حالی پانی پتی مرحوم

باہتمام محمد مقتدیٰ خاں شروانی

مطبع مسلم یونیورسٹی انسٹیٹیوٹ علی گڑھ میں ۱۳۴۰ھ ۱۹۲۲ء طبع ہوئی

تعداد طبع سوم ۱۰۰۰ جلد] مقام اشاعت بکڈپو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

فہرست مضامین حیات جاوید

حصۂ اوّل

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً و مصلیاً

دیباچہ طبعِ ثانی

سر سید احمد خاں مرحوم کی لائف کا پہلا اڈیشن جس کا حجم ہزار صفحہ سے کم نہ تھا سال گزشتہ میں شائع ہوا تھا اور باوجودیکہ اُس کی قیمت گراں سمجھی گئی تھی سال حال کے ختم ہونے سے پہلے اُس کی جس قدر جلدیں چھپوائی گئی تھیں تقریباً سب فروخت ہو گئیں۔ اگرچہ ایک ایسے وسیع ملک میں جیسا کہ ہندوستان ہے ایک ہزار جلد کا دو ڈیڑھ برس کے اندر فروخت ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے لیکن خاص کر اس کتاب کا اس قدر جلد بک جانا توقع کے بالکل خلاف تھا، کیونکہ نہ اُس کے مضمون سے عام اہلِ وطن کو چنداں دلچسپی تھی، نہ ملک میں مسلسل اشتہاروں کے ذریعہ سے اُس کا اعلان کیا گیا تھا اور نہ قومی اخباروں نے اُس سے کچھ نوٹس لیا تھا، صرف ایک اخبار میں اُس پر کچھ ریمارک کیا گیا تھا، سو اُس میں کتاب کی نقائص کے سوا اُس کی کوئی خوبی ظاہر نہیں کی گئی تھی۔ پس اگر ہمارا قیاس غلط نہ ہو تو سوا اس کے کہ سر سید کی وفات کے بعد ان کی خدمات قوم میں زیادہ وقعت کی نگاہ سے دیکھی جانے لگی ہیں، اُن کے مذہبی خیالات اور اصلاحات سے جو عموماً وحشت پھیلی ہوئی تھی

کسی دوسرے کام کا ارادہ کرنا۔ ہمارے عرفا و مشائخ کی پاکیزہ زندگی بھی ہم دنیا داروں کی موجودہ حالت سے کچھ مناسبت نہیں رکھتی وہ ہم کو اپنے اپنے قدح کی خیر منانی سکھاتی ہے مگر ہماری خیر اب اس میں ہے کہ سب مل کر ایک دوسرے کی خیر منائیں۔ پس اس وقت ہمارے سلف کے کارنامے ہم کو براہِ راست اس کے سوا کوئی سبق نہیں دے سکتے کہ بزرگوں کی بڑائی پر فخر کرو اور اس شعر کے مصداق بنو ؎

ان افتخرت باباءٍ مضوا سلفاً   قلنا صدقت ولکن بئس ما ولدوا

[یعنی اگر تم کو اپنے بڑوں پر فخر ہے تو ہم بھی تسلیم کرتے ہیں کہ وہ ایسے ہی تھے مگر اولاد بُری چھوڑ گئے]

ہم یہ نہیں کہتے کہ سلف صالح کے حالات ہماری قوم کے لئے بالکل فائدہ مند نہیں ہیں۔ ان کی بائیوگرفی میں وہ تمام اصول موجود ہیں جو قومی زندگی کے لئے بمنزلۂ ارکان و عناصر کے ہیں محنت، صبر، استقلال غیرت، دلیری، اولوالعزمی اور عالی حوصلگی سب کچھ اُن کے کارناموں میں موجود ہے مگر جن مہمات میں اُنھوں نے ان ہتھیاروں سے کام لیا تھا ہماری مہمات اُن سے بالکل جداگانہ ہیں جو شاید اُن کو کبھی پیش نہیں آئیں۔ جن آلات سے اُنہوں نے ملک فتح کئے تھے ہم کو اُنھیں آلات سے دل فتح کرنے ہیں۔ جو عزت اور آبرو اُنہوں نے اپنی قوم کی سلطنت میں حاصل کی تھی وہ ہم کو غیر قوموں کی حکومت میں حاصل کرنی ہے۔ اُن کے زمانے میں سلطنت کے سوا کسی کو مصالح عامہ میں دخل نہ تھا اس لئے اُن کو ملک اور قوم کی بہبودی کے لئے ہاتھ پاؤں ہلانے کی مطلق ضرورت نہ تھی مگر ہمارے زمانے کا حال بالکل اس کے برخلاف ہے۔ ہمارے زمانہ میں قوموں کی موت اور زندگی خود قوموں ہی کے ہاتھ میں ہے وہ چاہیں اپنے تئیں بنائیں اور چاہیں بگاڑیں، چاہیں جئیں اور چاہیں مر جائیں۔ سلطنت کا کام صرف اُن کی حیات و ممات کا رجسٹر رکھنا اور زندوں کو زندوں کے گھاٹ اور مُردوں کو مُردوں کے گھاٹ اُتار دینا ہے اور بس۔ ہمارے اسلاف نے اسلام کا وہ دورہ دیکھا تھا جب کہ غیر مذہب والوں کو بھی اُس کا اتباع کرنا پڑتا تھا۔ اور اُس کے خلاف کوئی دم نہ مار سکتا تھا اس لئے اُن کو دین کی حمایت کرنے کی صرف اُسی قدر ضرورت تھی جس قدر کہ صلح کے زمانے میں فوج رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے مگر ہم کو وہ زمانہ ملا ہے کہ بادشاہ اور رعیت دونوں کے مذہب پر نکتہ چینی کی جاتی ہے آزادی نے گونگوں تک کو گویا کر دیا ہے مذہب کا بدلنا کپڑوں کے بدلنے سے بھی زیادہ آسان ہو گیا ہے ادھر کرسچین سلطنت کی مقناطیسی کشش اپنی طرف کھینچتی ہے اُدھر سائنس مذہب کا نقش لوگوں کے دلوں سے مٹانا چاہتا ہے۔ جب کہ ہماری حالت سلف کی حالت سے اس قدر بدلی ہوئی ہے تو اُن کی

بائیوگرفی ہماری مشکلات پر کیا روشنی ڈال سکتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ اُن کی ہمت سے ہماری ہمت اور اُن کی دلیری سے ہماری دلیری بڑھتی ہے مگر یہ سمجھنا ہر شخص کا کام نہیں ہے کہ اُنھوں نے اپنی ہمت اور دلیری سے کیا کام لیا تھا اور ہم کو اُس سے کیا کام لینا چاہیئے جس قدر تیمور[1] کا ایک چیونٹی سے شاہانہ عزم و استقلال سیکھنا عجیب معلوم ہوتا ہے اُس سے زیادہ عجیب یہ ہے کہ تیمور کی لائف سے چیونٹی کا سا عزم و استقلال سیکھا جائے۔ پس اگرچہ زمانۂ سلف کے مشاہیر بلکہ مجاہیل کی بائیوگرفی بھی منفعت سے خالی نہیں لیکن اُس میں ہمارے لئے کوئی ایسی صاف اور کھلی شاہراہ موجود نہیں ہے جس پر ہم آنکھیں بند کرکے اپنی دشوار گزار منزل جو آج ہم کو درپیش ہے طے کرتے چلے جائیں۔

البتہ سر سید کی لائف ہمارے لئے ایک ایسی مثال ہے جس کی پیروی سے ممکن ہے کہ ہماری قوم کی یہ کٹھن منزل۔ جو تنگنائے دنیا میں ظاہرا اُس کی سب سے آخری منزل ہے۔ آسانی کے ساتھ طے ہوجائے۔ اس بزرگ کی لائف ہم کو نصیحت کرتی ہے کہ زمانہ کی مخالفت کو خدا کی مخالفت سمجھکر اُس کے ساتھ موافقت پیدا کرو تاکہ دنیا میں آرام سے رہو اور عزت سے زندگی بسر کرو۔ جب تم میں عمدہ حاکم بننے کی لیاقت باقی نہ رہے تو عمدہ رعیت بننے میں کوشش کرو تاکہ دونوں عمدگیوں سے ہاتھ نہ دھو بیٹھو۔ وہ بتاتی ہے کہ کوئی قوم محکوم ہونے کی حالت میں کیونکر قومی عزت حاصل کرسکتی ہے اور ایک شائستہ گورنمنٹ میں کیوں کر اُس کا رسوخ و اعتبار بڑھ سکتا ہے۔ وہ جس طرح ہم کو آزادی رائے کی تعلیم دیتی ہے اُسی طرح یہ بھی سکھاتی ہے کہ ہم کیوں کر اپنی آزادی کو قائم رکھ سکتے ہیں۔ وہ ایک طرف ہم کو خودداری اور سلف ریسپکٹ کی تاکید کرتی ہے اور غلامانہ خوشامد سے نفرت دلاتی ہے اور دوسری طرف حکمران قوم کا ادب اور اُس کی بزرگداشت ہمارے دلوں پر نقش کرتی ہے۔ وہ ہم کو خبردار کرتی ہے کہ قومی تنزل سے قوم کے مذہب کو کیا صدمہ پہنچتا ہے اور اُس کا تدارک کیوں کر ہوسکتا ہے اور مذہب کے متہم ہونے سے قوم کن آفتوں میں مبتلا ہوجاتی ہے اور اُس کا علاج کیا ہے۔ وہ ہم کو اسلام کے وہ اعلیٰ اصول یاد دلاتی ہے جن کو قرون اولیٰ کے بعد قوم نے بالکل فراموش کردیا تھا اور جن کا مطلب یہ تھا کہ قوم اور وطن کی محبت کو جزو ایمان جانو اور قوم کی خدمت کو سرداری کا تمغہ سمجھو۔ وہ ہم کو سبق دیتی ہے کہ قوم کی حقیقی خیرخواہی اُس وقت تک نہیں ہوسکتی جب تک کہ بہت سے کام اُن کی عقل اور عادات اور مرضی کے خلاف نہ کئے جائیں اور اُن کی مخالفت کو صبر اور استقلال کے ساتھ برداشت نہ کیا جائے

---

[1] تیمور نے ایک چیونٹی کو دیکھا کہ اناج کا دانہ جو اُس سے سنبھل نہ سکتا تھا لے کر بار بار دیوار پر چڑھتی تھی اور پھر گر پڑتی تھی اسی طرح ستر یا اسی دفعہ چڑھی اور گری آخر ایک دفعہ دیوار کی منڈیر پر جا پہنچی۔ تیمور اپنے تزک میں لکھتا ہے کہ اُس دن سے میں نے کبھی کسی مشکل یا سختی میں ہمت نہیں ہاری۔

وہ ہم کو آگاہ کرتی ہے کہ اگر دنیا میں بڑا بننا چاہو تو حرص، طمع، خود غرضی، جھوٹ، آرام طلبی اور عیش و عشرت سے ہمیشہ کے لئے دست بردار ہو جاؤ۔ وہ ہم کو یقین دلاتی ہے کہ تھوڑی سی تعلیم اور بہت سا تجربہ اور بالکل سچائی یہ تینوں مل کر ایسے ایسے عظیم الشان کام انجام کر سکتی ہیں جو بڑے بڑے حکیموں اور مدبروں سے انجام نہیں ہو سکتے وہ ہم کو تعصبات سے متنفر کرتی ہے، غیر قوموں کے ساتھ حسن معاشرت سکھاتی ہے، دوستوں کے ساتھ خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان، عیسائی ہوں یا یہودی خلوص و سچائی سے ملنا بتاتی ہے۔ وہ ہم کو ہدایت کرتی ہے کہ جیسا دل میں سمجھو ویسا ہی زبان سے کہو اور جو کچھ کہو اُس کو کر دکھاؤ۔ وہ باواز بلند کہتی ہے کہ وقت کی قدر کرو، ڈیوٹی کا خیال رکھو، ایک لمحہ بیکار نہ رہو اور کام کرتے کرتے مر جاؤ۔

تعجب کی بات ہے کہ ایسی قابل فخر بائیوگرفی جس کا لکھنا مسلمانوں کا نہایت ضروری فرض تھا اُس کے لکھنے کا خیال سب سے پہلے ایک شریف انگلشمین کو آیا۔ کرنل گریہم نے سرسید کی لائف ان کی وفات سے تیرہ برس پہلے انگریزی میں لکھکر شائع کردی اور اس ضروری کام میں سبقت کرنے کا فخر مسلمانوں کے ہاتھ سے جاتا رہا اگرچہ صاحب ممدوح کے ہم دل سے شکرگزار ہیں کہ اُنھوں نے باوجود غیر قوم ہونے کے ہمارے واجب التعظیم لیڈر کی ایسی قدر کی اور اُن کی بائیوگرفی کی سب سے پہلے نبیاد ڈالی لیکن سچ یہ ہے کہ اس عجیب و غریب شخص کی بائیوگرفی ایسی چیز نہیں ہے جس کے لکھنے کا حق ایک آدھ مصنف سے ادا ہو سکے۔ چنانچہ کرنل گریہم کی کتاب پر ایک انگریزی اخبار میں یہ ریمارک کیا گیا تھا کہ "وہ ایک مکمل بائیوگرفی ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتی"۔ ہم کو پہلے بھی یہی اُمید تھی اور اب جبکہ سرسید کی وفات نے ایک حیرت انگیز غلغلہ تمام ہندوستان میں ڈال دیا ہے یہ اُمید یقین کے درجہ کو پہنچ گئی ہے کہ جس قدر زیادہ زمانہ گزرتا جائیگا اُسی قدر سرسید کے کاموں کی زیادہ قدر اور اُن کے حالات کی زیادہ چھان بین ہوتی جائیگی، متعدد لوگ اُن کی بائیوگرفی لکھنے پر قلم اُٹھائینگے اور صدیوں تک اس ہیرو کا راگ ہندوستان میں گایا جائیگا۔

راقم کو سرسید کی زندگی کے حالات لکھنے کا خیال پہلے پہل اُس وقت پیدا ہوا تھا جب کہ وہ اپنے سب سے بڑے اور سب سے زیادہ مفید کام کی نبیاد ڈال چکے تھے۔ مدرستہ العلوم علی گڑھ میں قائم ہو چکا تھا اور باوجود سخت مخالفتوں کے بہت تیزی کے ساتھ ترقی کرتا جاتا تھا اور اُسی کے ساتھ تہذیب الاخلاق میں سرسید کی دلسنیں تحریریں جیسی کہ اُردو زبان میں پہلے کبھی نہیں دیکھی گئی تھیں۔ شائع ہو رہی تھیں اگرچہ سرسید نے اپنی زندگی عام بھلائی کے کاموں میں مدت سے وقف کر رکھی تھی مگر ابھی تک اُن کا حال پہلی رات کے چاند کا سا تھا کہ کسی نے دیکھا اور کسی نے نہ دیکھا لیکن مدرستہ العلوم اور تہذیب الاخلاق نے اُن کی کوششوں کو چودھویں رات کے چاند کی طرح سب پر روشن کر دیا۔ اگرچہ قوم میں عموماً مخالفت

پھیلی ہوئی تھی مگر ایک گروہ ایسا بھی تھا جو سر سیّد کے کاموں کو نہایت عظمت کی نگاہ سے دیکھتا تھا میرے دل میں بھی اُن کی وقعت روز بروز زیادہ ہونے لگی۔ اُسی وقت سے میں نے کچھ نوٹ اُن کی لائف کے متعلق قلمبند کرنے شروع کئے اور کم و بیش سو سوال ایک کاپی میں لکھکر سر سید کے پاس بمقام علی گڑھ اس غرض سے بھیجے کہ اُن کے جواب مختصر طور پر لکھدیں مگر وہ کاپی اُن کے پاس یونہیں پڑی رہی کسی سوال کا جواب وہاں سے نہ ملا۔ میں نے یہ بھی چاہا کہ برس چھ مہینے خود علی گڑھ میں جا کر رہوں جہاں اس کام کے لئے قیام کرنا نہایت ضرور تھا مگر ملازمت کے تعلق کی وجہ سے یہ موقع بھی نہ مل سکا بعض صاحبوں کی یہ رائے ہوئی کہ سر سید کی زندگی میں اُن کی لائف لکھنی مناسب نہیں اس کی جو وجوہات اُنھوں نے اُس وقت بیان کیں وہ مجھے بھی معقول معلوم ہوئیں ان اسباب سے آخر کار یہ ارادہ موقوف کر دیا گیا۔

کچھ دنوں بعد سر سید کے نہایت خالص و مخلص دوست آنریبل حاجی سمٰعیل خاں رئیس دتاولی کو یہ خیال پیدا ہوا کہ یہ معزز لائف جہاں تک جلد ممکن ہو اُردو زبان میں مکمل طور پر لکھی جاوے چنانچہ اُن کی تحریک سے میرے دوست منشی سراج الدین احمد مالک و مہتم چودھویں صدی سر سید کی لائف لکھنے پر آمادہ ہوئے۔ اُنھوں نے بڑی کوشش سے اُس کے لئے میٹریل جمع کیا اور ایک خاص حد تک اُس کو ترتیب دے کر حاجی صاحب کو دیدیا۔ کئی برس تک وہ مسودہ رکھا رہا مگر اُس کے چھپنے کی نوبت نہ آئی۔

چونکہ کرنل گریہم اور منشی سراج الدین سر سید کی زندگی ہی میں اُن کی لائف لکھنے کی راہ نکال چکے تھے میرے دل میں پھر ایک ولولہ اُٹھا میں نے خیال کیا کہ اگرچہ قوم میں لائق آدمی روز بروز بڑھتے جاتے ہیں مگر مزدوروں کا گھاٹا ہوتا جاتا ہے۔ خدا کے فضل سے ایسے لوگوں کی کچھ کمی نہیں ہے جو سر سید کے کاموں کی دل سے قدر کرتے ہیں، اُن کی خدمات کی داد دیتے ہیں۔ اُن کی بائیوگرفی کو قوم کے حق میں مفید سمجھتے ہیں اور اگر کوئی اُن کی بائیوگرفی لکھے تو اُس پر نکتہ چینی کی اعلیٰ لیاقت رکھتے ہیں مگر اُس کا لکھنے والا کوئی نظر نہیں آتا۔ جوہریوں سے بازار بھرا پڑا ہے مگر کان کھودنے والے مفقود ہیں۔ ایسی حالت میں اس ضروری کام کو لیت و لعل میں ڈالنا اور اُس وقت کا انتظار کرنا۔ جو معلوم نہیں کہ اول ہم کو پیش آئے یا سر سید کو۔ ٹھیک نہیں ہے۔ جس طرح ہو سکے اس کام کو اُن کی زندگی ہی میں پورا کر لینا چاہیئے تاکہ جب کبھی موقع آئے اُس کو فوراً شائع کر دیا جائے۔

ان خیالات سے میں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ سب کام چھوڑ کر پہلے اس قومی فرض کو ادا کرنا چاہیئے چنانچہ ۱۸۹۴ء میں اسی غرض سے میں نے چند ماہ علی گڑھ میں قیام کیا جہاں خود سر سید اور اُن کی لائف لکھنے کا تمام سامان موجود تھا اور اُس کے بعد کئی دفعہ اسی کام کے لئے وہاں جا جا کر ٹھیرا۔ میں

آنریبل حاجی اسمٰعیل خاں کا شکر گزار ہوں کہ جس وقت اُن کو میرا یہ ارادہ معلوم ہوا اُنہوں نے وہ تمام مسودات جو منشی سراج الدین نے مرتب کئے تھے میرے حوالہ کردیئے اور اپنے دوست منشی سراج الدین کا بھی ممنون ہوں کہ اُن کے مسودات سے میں نے فائدہ اُٹھایا ہی۔

اگرچہ سرسید کی لائف کا لکھنا بظاہر ایک آسان کام معلوم ہوتا ہی کیونکہ سنہ ستاون سے لے کر اخیر تک جو کچھ اُنھوں نے کیا وہ سب چھاپہ کے ذریعہ سے مشتہر ہوگیا ہی اور سنہ ستاون سے پہلے کے حالات بھی معتبر ذریعوں سے معلوم ہوگئے ہیں مگر درحقیقت اُن کے تمام سوانح عمری کا سمیٹنا نہایت دشوار کام ہی اُن کی زندگی ایسے اہم واقعات سے بھری ہوئی ہی کہ نہ کسی واقعہ کو سرسری سمجھکر چھوڑا جا سکتا ہی اور نہ ہر ایک واقعہ کو مفصل بیان کیا جا سکتا ہی۔ ایک دوست نے بالکل سچ کہا کہ جس قدر سرسید کی زندگی میں اُن کے مخالف یا موافق لکھا گیا ہی اور جس قدر اُن کی وفات پر اطراف ہندوستان میں رنج و ماتم کا اظہار کیا گیا ہی اگر صرف اُسی کو جمع کیا جائے تو متعدد ضخیم جلدیں مرتب ہوسکتی ہیں۔ اس سے اندازہ ہوسکتا ہی کہ جو شخص سرسید کی لائف ایک آدھ جلد میں ختم کرنی چاہتا ہی اُس کو کیسا مشکل کام کرنا ہی اس سے بھی زیادہ سخت مشکل جو بائیوگرفی کے مضمون سے علاقہ رکھتی ہی۔ یہ ہی کہ سرسید کی ذات میں اس قدر مختلف الجنس حیثیتیں جمع تھیں کہ ہر ایک حیثیت پر اُس کی شان اور اُس کے درجہ کے موافق گفتگو کرنا ایک ایسا کام ہی جس کا پورا پورا حق وہی مصنف ادا کرسکتا ہی جو خود بھی سرسید کے برابر جامع حیثیات ہو۔ مذہب، اخلاق، معاشرت، تعلیم، ججمنٹ، پالٹکس، لٹریچر، پبلک سپیکنگ، رفارمیشن وغیرہ وغیرہ کس کس بات کو بیان کیا جائے؟ اور کس کس حیثیت پر گفتگو کی جائے؟ لیکن خدا کا شکر ہی کہ ہم نے کام کی مشکلات دیکھکر جی نہیں چھوڑا اور اس عربی مثل کے موافق کہ "مالا یدرک کلہ لا یترک کلہ" سرسید کی لائف پوری یا ادھوری جیسی کہ ہم سے بن آئی قوم کے لئے مرتب کردی ہی اور ہمارا قیاس غلط نہ ہو تو آئندہ مصنفوں کے لئے کم سے کم ایک داغ بیل ضرور ڈالدی ہی جس کی حدود میں وہ ایک وسیع اور عالی شان عمارت آسانی سے تیار کرسکتے ہیں۔

اگرچہ ہندوستان میں۔ جہاں ہیرو کے ایک عیب یا خطا کا معلوم ہونا اُس کی تمام خوبیوں اور فضیلتوں پر پانی پھیر دیتا ہی۔ ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ کسی شخص کی بائیوگرفی کرٹکل طریقہ سے لکھی جائے اُس کی خوبیوں کے ساتھ اُس کی کمزوریاں بھی دکھائی جائیں اور اُس کے عالی خیالات کے ساتھ اُسکی لغزشیں بھی ظاہر کی جائیں۔ چنانچہ اسی خیال سے ہم نے جو دو ایک مصنفوں کا حال اب سے پہلے لکھا ہی اُس میں جہاں تک ہم کو معلوم ہوسکیں اُن کی اور اُن کے کلام کی خوبیاں ظاہر کی ہیں اور

اُن کے پھوڑوں کو کہیں ٹھیس نہیں لگنے دی لیکن اول تو ایسی بائیوگرفی چاندی سونے کے ملمع سے کچھ زیادہ قدر و قیمت نہیں رکھتی اس کے سوا وہ اُنھیں لوگوں کے حال سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے جنہوں نے اس موج خیز اور پُرآشوب دریا کی منجدھار میں اپنی ناؤ نہیں ڈالی اور کنارے کنارے ایک گھاٹ سے دوسرے گھاٹ صحیح سلامت جا اُترے۔ اُن کو سب نے بھلا جانا کیونکہ اُن کو کسی کی بھلائی یا بُرائی سے کچھ سروکار نہ تھا۔ وہ کہیں رستہ نہیں بھولے کیونکہ اُنہوں نے اگلی بھیڑوں کی لیک سے کہیں اِدھر اُدھر قدم نہیں رکھا۔ لیکن ہم کو اس کتاب میں اُس شخص کا حال لکھنا ہے جس نے چالیس برس برابر تعصب اور جہالت کا مقابلہ کیا ہے، تقلید کی جڑ کاٹی ہے، بڑے بڑے علماء و مفسرین کو لتاڑا ہے، اماموں اور مجتہدوں سے اختلاف کیا ہے، قوم کے پکّے پھوڑوں کو چھیڑا ہے اور اُن کو کڑوی دوائیں پلائی ہیں، جس کو مذہب کے لحاظ سے ایک گروہ نے صدیق کہا ہے تو دوسرے نے زندیق خطاب دیا ہے، اور جس کو پالٹکس کے لحاظ سے کسی نے ٹائم سرور سمجھا ہے تو کسی نے نہایت راستباز لبرل جانا ہے۔ ایسے شخص کی لائف چپ چاپ کیونکر لکھی جا سکتی ہے ضرور ہے کہ اُس کا سونا کسوٹی پر کسا جائے اور اُس کا کھرا پن ٹھوک بجا کے دیکھا جائے۔ وہ ہم میں پہلا شخص ہے جس نے مذہبی لٹریچر میں نکتہ چینی کی بنیاد ڈالی ہے اس لئے مناسب ہے کہ سب سے پہلے اُسی کی لائف میں اُس کی پیروی کی جائے اور نکتہ چینی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے۔ اگرچہ سرسید کے معصوم ہونے کا نہ ہم کو دعویٰ ہے اور نہ اُس کے ثابت کرنے کا ہم ارادہ رکھتے ہیں لیکن اس بات کا ہم کو خود بھی یقین ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ اوروں کو بھی اس کا یقین دلائیں کہ سرسید کا کوئی کام سچائی سے خالی نہ تھا اور اس لئے ضرور ہے کہ اُن کے ہر ایک کام کو نکتہ چینی کی نگاہ سے دیکھا جائے کیونکہ سچ میں اور صرف سچ ہی میں یہ کرامت ہے کہ جس قدر اُس میں زیادہ کُرید کی جاتی ہے اُسی قدر اُس کے جوہر زیادہ آب و تاب کے ساتھ ظاہر ہوتے ہیں۔

یہ کتاب بنظر سہولت دو حصّوں پر تقسیم کی گئی ہے پہلے حصے میں سرسید کی زندگی کے تمام واقعات اور اُن کے کام ابتدا سے اخیر تک ترتیب وار بقید تاریخ بیان کئے گئے ہیں اور دوسرے حصے میں اُن کی تمام لائف اور اُن کے ورکس پر ریویو کیا گیا ہے۔ سرسید کی زندگی کا زیادہ نمایاں حصہ جو غدر کے زمانہ سے شروع ہوتا ہے اُس کے متعلق زیادہ تر حالات علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، تہذیب الاخلاق، اور تصانیف احمدیہ سے لئے گئے ہیں اور بہت سی اطلاعیں سرسید کے دوستوں کی زبانی یا خود سرسید کے خطوط سے جو انہوں نے اپنے دوستوں کو وقتاً فوقتاً لکھے، یا سرکاری رپورٹوں، انگریزی اخباروں اور بعض مدبران سلطنت کی تحریروں سے جن میں سرسید کا ذکر کیا گیا ہے۔ اور بعض اور معتبر ذریعوں سے جن کی ہر ایک موقع پر تصریح کر دی گئی ہے حاصل ہوئی ہیں۔

غدر سے پہلے کے حالات کسی قدر اُن کی قدیم تصنیفات سے جو غدر سے پہلے لکھی جا چکی تھیں، یا سیرۃ فریدیہ سے جو حال ہی میں اُنھوں نے اپنے نانا کے حالات پر لکھی تھی یا اُن کے بعض رشتہ داروں کی زبانی اور زیادہ تر ایک مختصر تذکرہ سے جو مخدومی خان بہادر[1] غلام نبی خاں مرحوم نے ۱۸۹۴ء میں راقم کی درخواست پر میرٹھ سے ایک رسالہ کی صورت میں خود لکھوا کر بھیجا تھا، اور خاص کر خاندان، بچپن اور تعلیم کے حالات خود سرسید مرحوم کی زبانی لکھے گئے۔ اس کے سوا کرنل گریہم کی کتاب اور منشی سراج الدین احمد کے مسودات سے بھی جا بجا مدد لی گئی ہے اور اُن رسالوں اور اخباروں پر بھی ایک سرسری نظر ڈالی گئی ہے جو خاص کر سرسید کی مخالفت کی غرض سے ہندوستان میں وقتاً فوقتاً جاری ہوئے اور سرسید کے اخلاق و عادات وغیرہ کے متعلق کچھ اپنی خاص واقفیت سے اور کچھ اُن کے قدیم دوستوں کے بیانات سے اخذ کر کے لکھا گیا ہے۔

اگرچہ اس میں شک نہیں کہ سرسید کی لائف اگر اُن کی زندگی میں شائع ہو جاتی تو وہ عظمت جس کی وہ مستحق تھی اُس کو حاصل ہونی دشوار تھی مگر ایک خاص وجہ سے ہم کو اس بات کا افسوس رہ گیا کہ وہ سرسید کی زندگی میں شائع نہ ہو سکی اول اول تو جب کبھی سرسید کے سامنے اُن کی لائف لکھنے کا ارادہ ظاہر کیا جاتا تھا تو وہ ہمیشہ یہ کہا کرتے تھے کہ میری لائف میں سوا اس کے کہ لڑکپن میں خوب کبڈیاں کھیلیں، کنکوے اُڑائے، کبوتر پالے ناچ مجرے دیکھے اور بڑے ہو کر نیچری، کافر اور بے دین کہلائے۔ اور رکھا ہی کیا ہے۔ مگر آخر میں جیسا کہ عام طبائع انسانی کا خاصہ ہے۔ اُن کو اُس بات کے دریافت کرنے کا زیادہ خیال معلوم ہوتا تھا کہ اُن کی اخیر بائیوگرفی میں کیا لکھا جا رہا ہے اور اسی لئے وہ اپنی لائف کے جلد شائع ہونے کے مشتاق معلوم ہوتے تھے۔ ظاہر ہے کہ جس شخص نے چالیس برس مذہب کی حمایت میں بسر کئے ہوں اور سوائے تکفیر و تضلیل کے قوم کی طرف سے کچھ انعام نہ پایا ہو اُس سے زیادہ کون شخص اس بات کے دیکھنے کا خواہشمند ہو سکتا ہے کہ کوئی مسلمان اُس کی مذہبی تصنیفات پر نظر انصاف سے بحث کرے۔ پس اگر ہم یہ جانتے کہ سرسید کا ناگزیر وقت قریب آ پہنچا ہے تو کم سے کم جو کچھ ہم نے اُن کی مذہبی خدمات کی نسبت لکھا تھا وہ ضرور اُن کی نظر سے گزران دیتے۔ مگر ہم کو اُمید ہے کہ جو دائمی سرور اور روحانی خوشی مرنے کے بعد اُن کو اپنی خالص اور بے ریا خدمات کے صلہ میں حاصل ہوئی ہوگی اُس نے دنیا کی ناچیز و حقیر قدر دانیوں سے اُن کو ابدالآباد تک مستغنی کر دیا ہوگا۔

---

[1] خان بہادر غلام نبی خاں مرحوم رئیس میرٹھ غدر سے تین چار برس پہلے رہتک میں نائب سررشتہ دار کلکٹری تھے اور سرسید وہاں قائم مقام صدر امین ہو کر گئے تھے۔ وہاں دونوں صاحبوں میں بہت اتحاد ہو گیا تھا اور ایک مدت تک دونوں ایک ہی مکان میں رہے تھے اُس زمانہ کے حالات خان بہادر نے قلمبند کر کے راقم کے پاس بھیجے تھے۔ خان بہادر وہی بزرگ ہیں جو غدر کے بعد ایک مدت دراز تک پنجاب میں اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر اور سب آرڈنٹ جج اور بعد پنشن لینے کے بہاولپور میں مشیر مال رہے ۱۲

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حامداً و مصلیاً

سر سیّد مرحوم کی لائف

حصۂ اوّل

پہلا باب

۱۸۱۷ء سے ۱۸۳۸ء تک
۱۲۳۲ھ ۱۲۵۴ھ

تاریخ ولادت، خاندان، بچپن، تعلیم اور عنفوان شباب

تاریخ ولادت اور خاندان

سید احمد خاں ۵ ذی الحجہ ۱۲۳۲ ہجری مطابق ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دلی[۱] میں پیدا ہوئے۔ وہ باپ کی طرف سے حسینی سید ہیں اُن کا سلسلۂ نسب ۳۶ واسطوں سے آنحضرت صلعم اور جیسا کہ شجرۂ نسب مندرجہ خطبات احمدیہ سے پایا جاتا ہے اُن کے سلسلۂ نسب میں سب سے اخیر امام حضرت امام محمد تقی ابن امام موسیٰ رضا علیہم السلام ہیں اور اسی لئے وہ اپنے تئیں نقوی سید کہتے تھے۔

---

[۱] مہدی قلی خاں وزیر فرخ سیر نے اپنی وزارت کے زمانہ میں تراہہ بہرام خاں کے قریب ایک بڑی حویلی بنائی تھی جس میں دیوان خانہ فیل خانہ اصطبل وغیرہ متعدد مکانات تھے اس کو سرسید کے نانا خواجہ فریدالدین احمد نے خرید لیا تھا اور اب تک وہ خواجہ فرید کی حویلی کے نام سے مشہور ہے اسی حویلی کے ایک حصے میں جو خواص پورہ کہلاتا تھا سید احمد خاں پیدا ہوئے تھے ۱۲

جس زمانہ میں کہ بنی فاطمہ کو بنی اُمیہ اور بنی عباس کے ظلم وستم سے عرب اور عراق میں رہنا دشوار ہوگیا تھا اور اس لئے اکثر سادات کے خاندان وطن مالوف چھوڑ کر دور دراز ملکوں میں جا رہے تھے اُسی پُرآشوب زمانہ میں کسی وقت سرسید کے اجداد بھی دامغان میں۔ جو ایران کا قدیم مشہور شہر ہے چلے آئے تھے اور آخرکار ھرات میں اُنھوں نے مستقل سکونت اختیار کرلی تھی غالباً اُن کے بزرگ ہندوستان میں پہلے ہی پہل شاہجہان کے عہد میں آئے ہیں اور اُس وقت سے اکبر شاہ ثانی کے زمانہ تک اُن کو اس سلسلہ عالیہ کے ساتھ برابر کسی نہ کسی قدر تعلق رہا ہے۔

سید محمد دوست جو کہ سرسید سے پانچ پشت اوپر ہیں دکن کی مہم میں اورنگ زیب عالمگیر کے ساتھ تھے۔ وہ مع اپنی جمعیت کے ایک مورچہ پر متعین تھے جب اُس مورچہ کو اُنھوں نے تنہا بلا شرکت کسی دوسرے افسر کے فتح کرلیا تو عالمگیر نے اُن کو یکہ بہادر کا خطاب دیا تھا۔ اس کے بعد وہ اپنے وطن ھرات کو چلے گئے اور پھر ہندوستان میں واپس نہیں آئے۔ مگر اُن کے بیٹے سید برھان نے وہاں سے آکر دلّی میں سکونت اختیار کی۔ سید برھان کے بیٹے سید عماد اور اُن کے دو بیٹے سید ھادی اور سید مھدی تھے۔ سید ہادی جو کہ سرسید کے دادا تھے اُن کو عزیز الدین عالمگیر ثانی کے سنہ ۲ جلوس مطابق سنہ ۱۱۶۹ ہجری میں خطاب جوّاد علی خاں اور منصب ہزاری ذات و یا نصد سوار دو اسپہ وسہ اسپہ اور اُن کے بھائی سید مہدی کو بھی وہی منصب اور قباد علیخاں کا خطاب ملا تھا۔ قباد علیخاں دکن چلے گئے اور وہیں انتقال کیا۔ مگر جواد علیخاں بدستور دلّی میں بادشاہ پاس رہے۔ جب عالمگیر ثانی کا زمانہ ختم ہوا اور شاہ عالم بادشاہ ہوئے تو سرسید کے دادا کے خطاب میں جواد الدولہ اور اضافہ کیا گیا اور عہدۂ احتساب و کروڑی صوبہ شاہجہان آباد اور سنہ ۱۵ جلوس شاہ عالم مطابق سنہ ۱۱۸۸ میں عہدہ قضای لشکر عنایت ہوا۔ اور ۱۸ شعبان سنہ ہجری کو اُنھوں نے دنیا سے رحلت کی سرسید کہتے تھے کہ "سید ہادی فارسی شعر کہتے تھے اور اُن کا پورا دیوان اُن کے ہاتھ کا لکھا ہوا میرے پاس موجود تھا جو غدر کے زمانہ میں تلف ہوگیا۔"

سید ہادی کے بیٹے یعنی سرسید کے والد میر متقی۔ ایک آزاد طبیعت کے آدمی تھے۔ اگرچہ شاہ عالم کے زمانہ میں اور اُن کے بعد اکبر شاہ کے زمانہ میں جو درجہ دربار عام اور دربار خاص میں اُن کے والد کا تھا وہی درجہ میر متقی کا بھی رہا مگر چونکہ بادشاہت صرف برائے نام رہ گئی تھی اور اُس میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ جن لوگوں کو خطاب اور منصب دے اُس کے لوازمات بھی دے سکے اس لئے جب سید ہادی کے بعد اُن کا خطاب اور منصب میر متقی کو دیا جانا تجویز ہوا تو اُنھوں نے اُس کو قبول کرنا مصلحت نہ سمجھا۔ مگر چونکہ اُن کو اکبر شاہ کے ساتھ شاہزادگی کے زمانہ سے نہایت خلوص اور خصوصیت تھی اس لئے شاہ عالم کے انتقال کے بعد اُن کا

رسوخ دربار میں پہلے سے بھی زیادہ ہوگیا تھا۔ مثمن برج سے پیوستہ جو مکان خوابگاہ کے نام سے مشہور تھا اور جہاں خاص خاص لوگوں کے سوا کوئی نہ جاسکتا تھا۔ میر تقی برابر وہاں جاتے تھے۔ سرسید کہتے تھے کہ "میں بارہا اپنے والد کے ساتھ اور نیز تنہا بھی اُس خاص دربار میں گیا ہوں۔"

میر متقی کے آبائی سلسلہ میں میر قطبی کے سوا۔ جو مجذوب ہوگئے تھے اور جن کے لوگ بہت معتقد تھے اور کوئی باقی نہیں رہا تھا اور اُن کی ننہیال خواجہ میر درد کے خاندان سے علاقہ رکھتی تھی۔ میر متقی کا موروثی مکان جامع مسجد کے قریب اُس کے گوشۂ جنوب مشرق کی طرف تھا جو کئی دفعہ نادرگردی اور مرہٹہ گردی میں لٹ چکا تھا اور اُس کے اکثر حصے منہدم ہوگئے تھے۔ دالان اور کچھ مکان جو باقی رہ گئے تھے اُن میں رہتے تھے۔ اور دن کو جامع مسجد کے شرقی دروازہ پر جو مکانات ہیں اُن میں بیٹھتے تھے۔

اُس زمانہ میں شرفائے دلی تیراکی اور تیراندازی کو ایک جوہر شرافت جانتے تھے۔ میر متقی کو ان دونوں فنوں میں کمال حاصل تھا۔ اکثر مرشد زادے اور شریف زادے ان دونوں فنوں میں اُن کے شاگرد تھے۔ خود سرسید نے بھی تیراکی اور تیراندازی اُن سے سیکھی تھی۔ سرسید کے ماموں نواب زین العابدین خاں جو قطع نظر تیراندازی کے تیر اور کمانیں بنانے میں نہایت مشاق تھے میر متقی ہی کے شاگرد تھے۔

میر متقی اپنی زندگی نہایت آزادی اور بے فکری سے بسر کرتے تھے جس کا اثر سرسید اور اُن کی اولاد میں اب تک موجود تھا۔ اُن کو حضرت شاہ غلام علی سے جن کی خانقاہ دلی میں مشہور ہے بیعت تھی اور شاہ صاحب اُن پر پدرانہ شفقت رکھتے تھے۔ ہر روز بعد حلقہ کے ایک مرید جس کو حکم دے رکھا تھا میر متقی کی زنانی ڈیوڑھی پر آتا اور سب چھوٹے بڑوں کی خیر و عافیت پوچھکر شاہ صاحب سے جاکر عرض کردیتا۔ اور جب میر متقی یا اُن کے گھر میں کوئی اور بیمار ہوجاتا تو مرزا غفور بیگ صاحب خورجوی کو جو شاہ صاحب کے خلیفہ اور مریدان خاص میں سے تھے اور خود مرزا مظہر جانِ جاناں سے اکتساب کرچکے تھے سلب مرض کے لئے اُن کے مکان پر بھیجتے اور وہ ہمیشہ جب تک کہ بیمار کو صحت نہ ہوتی برابر آتے تھے۔

جو خاص عنایت شاہ صاحب کو میر متقی کے حال پر تھی اُس کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ جب شاہ صاحب نے شدتِ مرض میں مرزا صاحب کی قبر کے پاس اپنے لئے قبر کھدوانے کا حکم دیا تو میر متقی نے عرض کیا کہ میری آرزو یہ ہے کہ ٹھیک آپ کی پائنتی میری قبر ہو۔ چنانچہ اُن کے لئے بھی سرداب تیار ہوا اور بعد انتقال کے جو کہ ۱۵ رجب ۱۲۵۴ھ ہجری میں واقع ہوا۔ اُسی سرداب میں شاہ صاحب کے پائنتی مدفون ہوئے۔

میر متقی کے والد سید ہادی اور خواجہ فریدالدین احمد سے جن کا ذکر عنقریب آئے گا بہت رسم و راہ تھی میر متقی بھی والد کے انتقال کے بعد خواجہ فرید سے نہایت ادب کے ساتھ ملتے تھے اور خواجہ فرید بھی اُن کے حال پر

بہت مہربانی کرتے تھے۔ جب وہ ایران اور آوا کے سفر سے واپس آئے تو اُنہوں نے اپنی بڑی بیٹی عزیز النساء بیگم کی شادی میر متقی سے کردی اب میر متقی اپنے قدیم موروثی مکان سے اُٹھکر قلی خاں والی حویلی میں جو خواجہ فرید نے خرید لی تھی آرہے۔

میر متقی نہایت وضعدار اور راست باز آدمی تھے۔ معین الدین اکبر شاہ کے ایک بھائی مرزا شمس الدین تھے جن کی طرف سے بادشاہ کے دل میں نہایت رنج اور کچھ توہمات متعلق بہ دعوی سلطنت تھے۔ اتفاق یہ کہ میر متقی کو مرزا شمس الدین سے بھی نہایت خلوص تھا اور وہ اُن کے ہاں برابر آتے جاتے تھے۔ مرزا شمس الدین بھی اُن کی بہت عزت کرتے تھے۔ اُن کو اپنی مسند کے برابر بٹھاتے تھے اور خاص اپنا حقہ اپنے کو عنایت کرتے تھے۔ اکبر شاہ نے لوگوں کی دراندازی سے ایک بار اُن کو مرزا شمس الدین سے ملنے سے منع کردیا۔ میر متقی نے ہاتھ باندھکر کہا کیا حضور کو فدوی کی جان نثاری میں کچھ تردد ہوا ہے؟ بادشاہ نے ہنسکے فرمایا نہیں نہیں۔ میر متقی نے عرض کیا تو پھر میں اپنے قدیم طریقہ کو چھوڑکر مفت میں کیوں روسیاہی لوں۔ بادشاہ نے پھر کبھی اُن سے اس بات کا ذکر نہیں کیا اور وہ بدستور مرزا شمس الدین سے ملتے رہے۔

اکبر شاہ کے اخیر زمانہ میں وزارت کے اختیارات مرزا سلیم کے ہاتھ میں جو بادشاہ کے چاہیتے بیٹے تھے چلے گئے تھے اور اس لئے راجہ سوہن لال جو مرزا سلیم کی سرکار میں دیوان تھے وزارت کا کام کرنے لگے تھے چونکہ میر متقی کی راجہ سوہن لال سے موافقت نہ تھی اس لئے اُنہوں نے دربار کا جانا بہت کم کردیا تھا۔ اکثر ضروری موقعوں پر سرسید جایا کرتے تھے۔ جب بہادر شاہ تخت پر بیٹھے اور تمام نیا دربار کی بدل گئی تو میر متقی کا دربار میں جانا بالکل موقوف ہوگیا تھا۔ مگر جو تنخواہ قلعہ سے مقرر تھی وہ اور نوروز کو بادشاہ کی طرف سے سنہری رُپہلی چھلوں کے آنے کی رسم اور اسی قسم کی اور اعزازی رسمیں ان کی وفات تک بدستور جاری رہیں۔

سرسید کی ننہیال

سرسید کی ننہیال کا حال کسی قدر تفصیل کے ساتھ سیرۃ فریدیہ میں جو خود سرسید نے اپنے نانا خواجہ فرید الدین احمد کے حالات میں لکھی ہے مندرج ہے یہاں ہم اُس کا خلاصہ ایک یادداشت سے جو سرسید نے سیرۃ فریدیہ لکھنے سے پہلے لکھوائی تھی اخذ کرکے لکھتے ہیں۔

سرسید کے نانا خواجہ فرید الدین احمد جو خواجہ محمد یوسف ہمدانی کی اولاد میں ہیں اول اُن کے دادا خواجہ عبدالعزیز بعنوان تجارت دلّی میں آئے تھے جو کشمیری شال کی تجارت کرتے تھے اور اُنہوں نے یہیں سکونت اختیار کرلی تھی۔ اُن کے بیٹے خواجہ اشرف تھے جن کے آٹھ بیٹے ہوئے۔ ازاں جملہ دو شخصوں نے مختلف حیثیتوں سے بہت امتیاز حاصل کیا تھا اول خواجہ نجیب الدین جو نواح دہلی میں شاہ فدا حسین کے نام سے مشہور ہیں سہروردی خاندان میں ایک نیا فرقہ رسول شاہ کے پیروؤں کا پیدا ہوگیا تھا۔

شاہ فدا حسین اس فرقہ میں ابتدائی عمر سے داخل ہو گئے تھے اور رسول شاہ کے جانشین مولوی محمد حنیف کے چیلے بن گئے تھے شاہ فدا حسین نے تمام درسی کتابیں اپنے مرشد مولوی محمد حنیف سے پڑھیں اور جب تحصیل پوری ہو گئی تو مرشد کے حکم سے کل کتابیں کنوئیں میں ڈال دیں وہ خاص کر حقائق و معارف میں بہت بڑی دستگاہ رکھتے تھے۔ فصوص الحکم، فتوحات مکیہ، اور دیگر تصنیفات شیخ اکبر اور دیگر قائلین وحدت وجود کی بہت خوبی سے پڑھاتے تھے۔ مگر وضع یہ تھی چار ابرو کا صفایا کئے ایک لنگوٹی باندھے اور سارے بدن پر بھبوت ملے بیٹھے رہتے تھے۔ جب حجرہ سے باہر نکلتے تو تہمد گھٹنوں تک لپیٹ لیتے اور سر پر ایک مثلث رومال باندھ لیتے تھے۔ ایک بار اکبر شاہ نے اُن کے پاس آنا چاہا مگر انہوں نے ملنے سے انکار کر دیا۔ سرسید کہتے تھے کہ وہ "نہایت خوش بیان اور خوش تقریر تھے۔ جب میرے والد کا انتقال ہوا تو میری والدہ کو کہ جو اُن کی بہنیں تھیں اپنے پاس بلا کر ایسی عمدہ تقریر کی کہ اب تک اس کا لطف میرے دل سے نہیں بھولا۔ دلی میں اُن کے دیکھنے والے اب تک موجود ہیں۔ وہ آخر عمر میں الور چلے گئے تھے اور ۱۲۵۹ھ میں وہیں انتقال کیا اور وہیں رسول شاہیوں کے تکیہ میں جو چنبیلی باغ کہلاتا ہے اُن کا ڈھیر ہے"

دوسرے سرسید کے حقیقی نانا دبیر الدولہ امین الملک خواجہ فرید الدین احمد خاں بہادر مصلح جنگ جو اپنے خاندان میں سب سے زیادہ با اقبال لائق دانشمند صاحب علم و فضل اور خاصکر ریاضیات میں وحید عصر تھے۔ انہوں نے لکھنؤ جا کر علامہ تفضل حسین خاں سے جب کہ آصف الدولہ زندہ تھے ریاضی کی تحصیل اور تکمیل کی تھی۔ خواجہ فرید ریاضی میں مجسطی اور رسائل متوسطات جو اُکُر کے نام سے مشہور ہیں نہایت تحقیق سے پڑھاتے تھے اور زیج اور آلات رصد کے علم میں اپنا نظیر نہ رکھتے تھے۔ وہ خود آلات رصد کے بنانے اور رصد کرنے پر قادر تھے۔ بہت سے لوگوں نے اُن سے ریاضی کی تحصیل کی اور اس میں کمال بہم پہونچایا اور نامور ہوئے ازاں جملہ مولوی[1] کرامت علی، مولوی[2] رجب علی خاں، خواجہ[3] محمد ناصر جان، اور حکیم رستم علی خاں اُن کے مشہور شاگردوں میں سے تھے۔ خود اُن کے چھوٹے بیٹے نواب زین العابدین خاں جو فنون ریاضی میں ید طولے رکھتے تھے انہیں کے شاگرد تھے۔ ۱۸۵۲ء میں جب طالب علمی کے ارادہ سے پہلی ہی بار میرا دلی جانا ہوا اُس وقت زین العابدین خاں زندہ تھے اور دلی میں اُن کی ریاضی دانی اور فنون ریاضی میں سے خاصکر موسیقی کے علم و عمل کی بہت شہرت تھی۔

سرسید کہتے تھے کہ "خواجہ فرید کے تصنیف کئے ہوئے چھوٹے چھوٹے متعدد رسالے علم ہیئات اور آلات رصد کے

---

[1] یعنی مولوی کرامت علی خلف مولوی حیات علی جو دلی کے مشہور عالم تھے اور اخیر کو حیدر آباد چلے گئے تھے ۱۲

[2] یعنی ارسطو جاہ مولوی سید رجب علیخاں جنہوں نے پنجاب گورنمنٹ میں نہایت رسوخ پایا تھا ۱۲

[3] یہ حضرت خواجہ میر درد کے سجادہ نشین تھے ۱۲

بہت مہربانی کرتے تھے۔ جب وہ ایران اور آوا کے سفر سے واپس آئے تو اُنہوں نے اپنی بڑی بیٹی عزیز النساء بیگم کی شادی میر متقی سے کردی اب میر متقی اپنے قدیم موروثی مکان سے اُٹھکر قلی خاں والی حویلی میں جو خواجہ فرید نے خرید لی تھی آرہے۔

میر متقی نہایت وضعدار اور راست باز آدمی تھے۔ معین الدین اکبر شاہ کے ایک بھائی مرزا شمس الدین تھے جن کی طرف سے بادشاہ کے دل میں نہایت رنج اور کچھ توہمات متعلق بہ دعوی سلطنت تھے۔ اتفاق یہ کہ میر متقی کو مرزا شمس الدین سے بھی نہایت خلوص تھا اور وہ اُن کے ہاں برابر آتے جاتے تھے۔ مرزا شمس الدین بھی اُن کی بہت عزت کرتے تھے۔ اُن کو اپنی مسند کے برابر بٹھاتے تھے اور خاص اپنا حقہ اپنے کو عنایت کرتے تھے۔ اکبر شاہ نے لوگوں کی در اندازی سے ایک بار اُن کو مرزا شمس الدین سے ملنے سے منع کردیا۔ میر متقی نے ہاتھ باندھکر کہا کیا حضور کو فدوی کی جان نثاری میں کچھ تردد ہوا ہے ؟ بادشاہ نے ہنسکے فرمایا نہیں نہیں۔ میر متقی نے عرض کیا تو پھر میں اپنے قدیم طریقہ کو چھوڑ کر منت میں کیوں روسیاہی لوں۔ بادشاہ نے پھر کبھی اُن سے اس بات کا ذکر نہیں کیا اور وہ بدستور مرزا شمس الدین سے ملتے رہے۔

اکبر شاہ کے اخیر زمانہ میں وزارت کے اختیارات مرزا سلیم کے ہاتھ میں جو بادشاہ کے چاہیتے بیٹے تھے چلے گئے تھے اور اس لئے راجہ سوہن لال جو مرزا سلیم کی سرکار میں دیوان تھے وزارت کا کام کرنے لگے تھے چونکہ میر متقی کی راجہ سوہن لال سے موافقت نہ تھی اس لئے اُنہوں نے دربار کا جانا بہت کم کردیا تھا۔ اکثر ضروری موقعوں پر سرسید جایا کرتے تھے۔ جب بہادر شاہ تخت پر بیٹھے اور تمام ستیا دربار کی بدل گئی تو میر متقی کا دربار میں جانا بالکل موقوف ہوگیا تھا۔ مگر جو تنخواہ قلعہ سے مقرر تھی وہ اور نوروز کو بادشاہ کی طرف سے سنہری رُپہلی چھلوں کے آنے کی رسم اور اسی قسم کی اور اعزازی رسمیں ان کی وفات تک بدستور جاری رہیں

سرسید کی ننھیال

سرسید کی ننھیال کا حال کسی قدر تفصیل کے ساتھ سیرۃ فریدیہ میں جو خود سرسید نے اپنے نانا خواجہ فرید الدین احمد کے حالات میں لکھی ہے مندرج ہے یہاں ہم اُس کا خلاصہ ایک یادداشت سے جو سرسید نے سیرۃ فریدیہ لکھنے سے پہلے لکھوائی تھی اخذ کرکے لکھتے ہیں۔

سرسید کے نانا خواجہ فرید الدین احمد جو خواجہ محمد یوسف ہمدانی کی اولاد میں ہیں اول اُن کے دادا خواجہ عبدالعزیز بعنوان تجارت دلّی میں آئے تھے جو کشمیری شال کی تجارت کرتے تھے اور اُنہوں نے یہیں سکونت اختیار کرلی تھی۔ اُن کے بیٹے خواجہ اشرف تھے جن کے آٹھ بیٹے ہوئے۔ ازاں جملہ دو شخصوں نے مختلف حیثیتوں سے بہت امتیاز حاصل کیا تھا اول خواجہ نجیب الدین جو نواح دہلی میں شاہ فدا حسین کے نام سے مشہور ہیں سہروردی خاندان میں ایک نیا فرقہ رسول شاہ کے پیرووں کا پیدا ہوگیا تھا۔

شاہ فدا حسین اس فرقہ میں ابتدائی عمر سے داخل ہو گئے تھے اور رسول شاہ کے جانشین مولوی محمد حنیف کے چیلے بن گئے تھے شاہ فدا حسین نے تمام درسی کتابیں اپنے مرشد مولوی محمد حنیف سے پڑھیں اور جب تحصیل پوری ہو گئی تو مرشد کے حکم سے کل کتابیں کنوئیں میں ڈال دیں وہ خاص کر حقائق و معارف میں بہت بڑی دستگاہ رکھتے تھے۔ فصوص الحکم، فتوحات مکیہ، اور دیگر تصنیفات شیخ اکبر اور دیگر قائلین وحدت وجود کی بہت خوبی سے پڑھاتے تھے۔ مگر وضع یہ تھی چار ابرو کا صفایا کئے ایک لنگوٹی باندھے اور سارے بدن پر بھبوت ملے بیٹھے رہتے تھے۔ جب حجرہ سے باہر نکلتے تو تہمد گھٹنوں تک لپیٹ لیتے اور سر پر ایک مثلث رومال باندھ لیتے تھے۔ ایک بار اکبر شاہ نے اُن کے پاس آنا چاہا مگر انہوں نے ملنے سے انکار کر دیا۔ سرسید کہتے تھے کہ وہ "نہایت خوش بیان اور خوش تقریر تھے۔ جب میرے والد کا انتقال ہوا تو میری والدہ کو کہ جو اُن کی بھتیجی تھیں اپنے پاس بُلا کر ایسی عمدہ تقریر کی کہ اب تک اُس کا لطف میرے دل سے نہیں بھولا۔ دلّی میں اُن کے دیکھنے والے اب تک موجود ہیں۔ وہ آخر عمر میں الور چلے گئے تھے اور ۱۲۵۹ھ میں وہیں انتقال کیا اور وہیں رسول شاہیوں کے تکیہ میں جو چنبیلی باغ کہلاتا ہے اُن کا ڈھیر ہے"

دوسرے سرسید کے حقیقی نانا دبیر الدولہ امین الملک خواجہ فریدالدین احمد خاں بہادر مصلح جنگ جو اپنے خاندان میں سب سے زیادہ با اقبال لائق دانشمند صاحب علم و فضل اور خاصکر ریاضیات میں وحید عصر تھے۔ انہوں نے لکھنؤ جا کر علامہ تفضل حسین خاں سے جب کہ آصف الدولہ زندہ تھے ریاضی کی تحصیل اور تکمیل کی تھی۔ خواجہ فرید ریاضی میں مجسطی اور رسائل متوسطات جو اُکُس کے نام سے مشہور ہیں نہایت تحقیق سے پڑھاتے تھے اور زیچ اور آلات رصد کے علم میں اپنا نظیر نہ رکھتے تھے۔ وہ خود آلات رصد کے بنانے اور رصد کرنے پر قادر تھے۔ بہت سے لوگوں نے اُن سے ریاضی کی تحصیل کی اور اُس میں کمال بہم پہونچایا اور نامور ہوئے ازاں جملہ مولوی[1] کرامت علی، مولوی[2] رجب علی خاں، خواجہ[3] محمد ناصر جاں، اور حکیم رستم علی خاں اُن کے مشہور شاگردوں میں سے تھے۔ خود اُن کے چھوٹے بیٹے نواب زین العابدین خاں جو فنون ریاضی میں ید طولے رکھتے تھے انہیں کے شاگرد تھے۔ ۱۸۵۲ء میں جب طالب علمی کے ارادہ سے پہلی ہی بار میرا دلی جانا ہوا اُس وقت زین العابدین خاں زندہ تھے اور دلّی میں اُن کی ریاضی دانی اور فنون ریاضی میں سے خاصکر موسیقی کے علم و عمل کی بہت شہرت تھی۔

سرسید کہتے تھے کہ "خواجہ فرید کے تصنیف کئے ہوئے چھوٹے چھوٹے متعدد رسالے علم ہیئات اور آلات رصد کے

---

[1] یعنی مولوی کرامت علی خلف مولوی حیات علی جو دلّی کے مشہور عالم تھے اور اخیر کو حیدر آباد چلے گئے تھے ۱۲

[2] یعنی ارسطو جاہ مولوی سید رجب علیخاں جنہوں نے پنجاب گورنمنٹ میں نہایت رسوخ پایا تھا ۱۲

[3] یہ حضرت خواجہ میر درد کے سجادہ نشین تھے ۱۲

باب میں تھے جو ایام غدر میں ضائع ہوگئے۔ مگر اُن میں سے تین رسالے خود اُنھیں کے ہاتھ کے لکھے ہوئے خلیفہ سید محمد حسن خاں مرحوم وزیر اعظم ریاست پٹیالہ کی عنایت سے دستیاب ہوئے ہیں جن کو مدرسۃ العلوم کے کتب خانہ میں داخل کردیا ہے۔"

اُنھیں میں سے ایک رسالہ ہے فوائد الافکار فی اعمال الفرجار[1] جس کے دیباچہ میں اُنھوں نے

---

[1] سیرۃ فریدیہ جس میں سرسید نے اپنے نانا خواجہ فرید کا حال لکھا ہے اُس میں یہ دیباچہ بھی نقل کیا ہے چونکہ اس کا مضمون دلچسپی سے خالی نہیں ہے اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کا خلاصہ اُردو زبان میں اس مقام پر لکھ دیا جائے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "کتب ریاضی کی کسی حاشیہ میں میری نظر سے گزرا تھا کہ "آلات ریاضی میں سے ایک آلہ تھا جس کو پرکار تناسب کہتے تھے۔ اس سے اکثر اعمال نجومی اور بعض اشکال ہندسی اور مسائل حسابی آسانی سے حل ہو جاتے تھے۔ مگر چونکہ اب وہ آلہ مفقود ہے اس لئے اُس کا علم اور عمل بھی باقی نہیں رہا۔" اس کے سوا میں نے اپنے بعض اساتذہ سے بھی ایسا ہی سُنا تھا۔ اُس آلہ کے دیکھنے کا مجھے کمال اشتیاق تھا جس ریاضی داں سے اُس کا ذکر کرتا وہ لاعلمی بیان کرتا تھا۔ اور اکثر یہ کہتے تھے کہ اس معمولی پرکار کے سوا جو کہ دائرہ کھینچنے اور خطوں کے ناپنے میں استعمال ہوتا ہے اور کوئی پرکار نہیں ہے۔ جب ۱۲۱۲ھ میں میرا لکھنؤ جانا ہوا وہاں جنرل مارٹین اور مسٹر گورداوسلی سے ملاقات ہوئی۔ اُن کے پاس میں نے ایک عجیب آلہ پیتل اور لوہے کا بنا ہوا دیکھا میں نے اُس کا حال پوچھا۔ اُنھوں نے کہا یہ پرکار تقسیم ہے اس سے خطوط و دوائر و سطوح و اجسام مختلفہ کی تقسیم آسانی سے ہو جاتی ہے۔ یہ آلہ جنرل مارٹین کا تھا میں نے ان سے مستعار لے لیا اور مجھے یقین ہو گیا کہ پرکار تناسب یہی ہے۔ چونکہ مسٹر گورداوسلی نے اُس آلہ سے چاروں عمل مذکورۂ بالا میرے سامنے کئے تھے مجھے خیال ہوا کہ دیکھیں اس سے کوئی عمل نجومی بھی استخراج ہوتا ہے یا نہیں۔ آخر جب اُس سے کوئی عمل نہ ہو سکا میں نے سمجھا کہ یہ پرکار تناسب نہیں ہے۔ مگر چند روز غور کرنے کے بعد میں نے اصول کے موافق اُس کے بنانے کا طریقہ ذہن نشین کر کے ویسا ہی ایک پرکار چاندی کا تیار کیا۔ مسٹر گور اوسلی نے اُس کو مجھ سے لے کر نواب سعادت علی خاں کی خدمت میں پیش کیا اور نہایت تعجب ظاہر کیا کہ اکثر لوگ اس پرکار کے عمل سے بھی واقف نہیں ہیں چہ جائیکہ ایسا پرکار خود بنا لینا کہ ولایت میں ہر شخص نہیں بنا سکتا۔ سر گور اوسلی نے کہا کہ مجھکو صرف اس قدر معلوم ہے کہ پرکاروں کے گنج میں ایک آلہ ایسا بھی ہے جس سے یہ پرکار تیار ہوتا ہے۔ مگر میں یہ نہیں جانتا کہ کس طرح تیار ہوتا ہے۔ تم نے بغیر اس آلہ کے یہ پرکار کیونکر بنا لیا۔ چونکہ میں نے کبھی گنج پرکار نہ دیکھا تھا میں نے اُس کے دیکھنے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ سر گور اوسلی نے اپنے بکس میں سے گنج نکال کر وہ آلہ مجھکو دکھایا۔ اُس پر بہت سے خطوط اور ہندسے کندہ تھے۔ میں نے اُن کا حال پوچھا۔ اُنھوں نے دو تین عمل کر کے دکھائے اور کہا کہ میں اس سے زیادہ نہیں جانتا۔ لیکن میں نے سُنا ہے کہ اس سے بہت سے اعمال ہندسی اور حسابی اور اکثر اعمال نجومی ہو سکتے ہیں۔ مگر میں بلکہ ہندسوں کے سوا کوئی انگریز نہیں جانتا۔" خواجہ فرید لکھتے ہیں کہ وہ گنج چونکہ نہایت عمدہ اور نفیس تھا گو میرا جی بہت للچایا مگر میں نے اُس کو مستعار مانگنا مناسب نہ سمجھا۔ اس کے بعد میں نے کئی پرکار تقسیم پیتل کے تیار کر کے اور انگریزی ہندسوں کی جگہ فارسی ہندسے کندہ کر کے اپنے دوستوں کو دیئے۔ چند روز کے بعد جب میرا کلکتہ جانا ہوا وہاں جا کر میں نے ایک گنج پرکار خریدا جس میں وہ آلہ مطلوبہ بھی تھا۔ میں نے نہایت کوشش اور فکر و غور سے اُس کے اعمال دریافت کئے اور عمل استخراج ظل اور اکثر اعمال نجومی اور ہندسی نکالے۔ اور مجھکو یقین ہو گیا کہ یہ پرکار تناسب جو کبھی عرب و عجم میں مروج تھا وہ یہی ہے اور اب یورپ کے سوا کہیں اس کا رواج نہیں رہا۔ چونکہ اس تحقیقات اور تفتیش میں مسودے بہت سے جمع ہو گئے تھے میں نے ان سب کو مرتب اور صاف کر کے اس رسالہ کی صورت میں جمع کر دیا۔" اس رسالہ کا ترجمہ سرسید نے اُردو میں کر دیا ہے اور اُس میں مثالیں اپنی طرف سے اضافہ کر دی ہیں۔ یہ ترجمہ بھی اُن کی تصانیف کی فہرست میں شامل ہے۔۱۲

ایک واقعہ لکھا ہے جس سے اُن کی اعلیٰ ذہانت اور ریاضی کے ساتھ جو اُن کو فطری مناسبت تھی اُس کا کافی ثبوت ملتا ہے۔

خواجہ فرید لکھنؤ کے پہلے سفر میں دو تین برس وہاں رہکر ریاضی کی تکمیل کے بعد دلّی واپس چلے آئے تھے یہ زمانہ نواب آصف الدولہ کا تھا۔ سنہ ۱۲۱۲ھ میں وہ پھر لکھنؤ گئے اُن کے جانے کے بعد اُسی سال آصف الدولہ نے قضا کی اور سعادت علی خاں اُن کے جانشین ہوئے۔ اسی زمانہ میں مدرسہ کلکتہ کے لئے جس کو انگریزوں نے قائم کیا تھا۔ ایک سپرنٹنڈنٹ کی ضرورت ہوئی اور لکھنؤ کے یورپین عہدہ داروں کی سفارش سے خواجہ فرید اس عہدہ پر مشاہرہ سات سو روپیہ ماہوار مقرر ہوکر کلکتہ پہنچ گئے۔

اس کے بعد مارکوئس اوف ولزلی کو جو اُس زمانہ میں گورنر جنرل تھے ایک خاص مقصد کے لئے جس کی تفصیل سیرت فریدیہ میں درج ہے ایران میں سفارت بھیجنے کی ضرورت ہوئی سنہ ۱۸۰۳ء میں مسٹر لوٹ کا اور اُن کے ساتھ خواجہ فرید کا بھیجنا تجویز ہوا مگر راہ میں مسٹر لوٹ بیمار ہوکر واپس چلے آئے۔ اور گورنر جنرل کے حکم سے اکیلے خواجہ فرید بطور مستقل سفیر کے بوشہر ہوتے ہوئے طہران پہنچے۔ اور فتح علی شاہ قاچار کے دربار میں حاضر ہوئے۔ اور مقاصد سفارت کو جن میں سب سے زیادہ اہم یہ امر تھا کہ ایران کی طرف سے ہندوستان میں بجائے حاجی خلیل خاں مقتول کے دوسرا سفیر بھیجا جائے بخوبی انجام دیا۔ اور محمد نبی خاں کا ایران کی طرف سے بطور سفیر کے ہندوستان میں بھیجا جانا تجویز ہوگیا۔

اس کے بعد گورنمنٹ انگریزی نے خواجہ فرید کو آوا واقع برہما میں ایک پولٹیکل معاملہ کے طے کرنے کو بطور ایجنٹ مقرر کرکے بھیجا وہاں سے آنے کے بعد جب کہ تمام بندیلکھنڈ فتح ہوچکا تھا پرگنات اگاسی وغیرہ میں۔ جو کہ اب ضلع باندہ میں شامل ہیں مال گزاری وصول کرنے کے لئے عہدۂ تحصیلداری پر مقرر ہوئے اُس زمانہ میں تحصیلداروں کو تنخواہ نہیں ملتی تھی بلکہ زر مال گزاری میں سے کچھ فی صدی حق التحصیل ملتا تھا۔ جب یہ انتظام نہ رہا اور زمانہ حال کے موافق تحصیلدار مقرر ہونے لگے تو وہ اس عہدہ سے کنارہ کش ہوکر بارہ تیرہ برس بعد دلّی میں واپس آئے۔ مگر چند روز رہ کر پھر کلکتہ چلے گئے۔

سنہ ۱۲۳۱ھ (۱۸۱۵ء) میں اکبر شاہ ثانی نے اُن کو کلکتہ سے بلا کر خلعت وزارت اور خطاب دبیر الدولہ امین الملک مصلح جنگ عنایت کیا۔ اُنھوں نے ایام وزارت میں۔ اس وجہ سے کہ بادشاہ بہت قرضدار ہوگئے تھے قرضہ ادا کرنے اور آمدنی و خرچ برابر کرنے میں بہت کوشش کی۔ شاہزادوں اور بیگمات اور عملہ شاہی کی تنخواہوں میں سے دس فی صدی تنخواہ کم کردی۔ بڑا خاصہ[1] اور چھوٹا خاصہ۔ جن میں زر کثیر صرف ہوتا

---

[1] بڑا خاصہ وہ کھانا کہلاتا تھا جو تمام ملازموں عہدہ داروں خواصوں اور سرکاری درباریوں کو بادشاہ کی طرف سے ہر روز دونوں وقت دیا جاتا تھا
چھوٹا خاصہ وہ کھانا کہلاتا تھا جو ہر روز تیار ہوکر محل میں بھیجا جاتا تھا اور بادشاہی امیر بیگم جو اپنی باندی یا کسی اور ضرورت سے قلعہ میں بجائے

تھا۔ اور بعضے اور غیر ضروری کارخانے یک قلم موقوف کردیئے۔ اس کے سوا دیوان عام کی تانبے کی چھت جو شاہ عالم کے عہد میں بھاؤ مرہٹے نے سنہری ملمع کے سبب خالص سونے کی سمجھ کر اُکھڑوا ڈالی تھی اور وہ اُس وقت سے اُکھڑی پڑی تھی۔ اُس کا سونا الگ اور تانبا الگ کرکے جتنا تانبا نکلا اُس کے شاہی ٹکسال میں پیسے بنوا ڈالے اور سونا فروخت کر دیا۔ ان تدبیروں سے کئی لاکھ روپیہ کا قرضہ ادا کیا۔ اب آمدنی و خرچ برابر ہوگیا اور سب کی تنخواہیں جو کئی کئی مہینے بعد ملتی تھیں ماہ بماہ ملنے لگیں۔ لیکن قلعہ میں اُس سے عام ناراضی پھیل گئی اور آخر کار اُن کو عہدۂ وزارت سے کنارہ کش ہونا پڑا اور وہ پھر کلکتہ چلے گئے۔

ایک بار پھر خواجہ فرید کو بادشاہ نے کلکتہ سے بلا کر عہدۂ وزارت پر مامور کیا مگر اس دفعہ بھی چند وجوہات سے تین یا ساڑھے تین برس وزارت کا کام انجام دے کر بہ صلاح جرنیل اختر لونی کے جو دلی میں رزیڈنٹ تھے آخر کار استعفٰی دیدیا۔ دوسری بار وزارت سے علٰحدہ ہونے کے بعد مہاراجہ رنجیت سنگھ نے معقول سفر خرچ اور اپنا معتمد بھیج کر خواجہ فرید کو لاہور بلایا۔ مگر جیسا کہ آگے ذکر کیا جائیگا وہ اپنی بڑی بیٹی یعنی سرسید کی والدہ کے سمجھانے سے لاہور نہیں گئے اور سفر خرچ واپس کر دیا۔ اور پھر اخیر وقت تک باوجودیکہ قلعہ کی طرف سے ایک دفعہ پھر بلاوا ہوئی۔ انھوں نے کوئی تعلق اختیار نہیں کیا اور ۱۲۴۴ھ مطابق ۱۸۲۸ء میں انتقال کیا ان کی تاریخ وفات اس جملہ سے کہ "جا بہ بہشت یافتم" بے کم و کاست نکلتی ہے۔

دبیر الدولہ خواجہ فرید الدین احمد ایک حکیم مشرب باصوفی منش آدمی تھے۔ ایک زمانہ میں وہ بھی اپنے بھائی شاہ فدا حسین کی طرح رسول شاہیوں میں داخل ہوگئے تھے اور منگا شاہ جو رسول شاہ کے ایک ممتاز چیلے تھے اُن کے مرید ہوگئے تھے۔ چونکہ اس طریقہ میں یہ ضرور نہیں ہے کہ خواہ مخواہ چار ابرو کا صفایا کریں بلکہ دنیادار اور متاہل لوگ بھی اس طریقہ میں داخل ہوتے ہیں اس لئے دبیر الدولہ نے مرنے سے دو برس پہلے تک کبھی ڈاڑھی مونچھ نہیں منڈوائی۔ مگر مرنے سے دو برس پہلے اُن کو یہ خیال ہوا کہ ایک دفعہ تو مرشد کی پوری پوری پیروی بھی کرنی چاہیئے۔ آخر ایک دن چار ابرو کا صفایا کرا دیا۔ شہر میں اس کا بڑا چرچا ہوا اور لوگوں نے بہت کچھ طعن و تعریض کی۔ مگر انھوں نے اس کی کچھ پروا نہیں کی۔ لیکن ایک دفعہ کے سوا پھر کبھی ایسا نہیں کیا۔ سرسید کہتے تھے کہ "جب انتقال ہوا تو اُن کی ڈاڑھی کسی قدر بڑی ہوگئی تھی"

دبیر الدولہ کے دو بیٹے تھے جو سرسید کے ماموں ہوتے ہیں۔ بڑے وحید الدین خاں جو مرزا جہانگیر کے بیٹے تیمور شاہ کی سرکار میں مختار تھے۔ یہ بعد فتح دہلی کے فوج کے کسی سپاہی کی گولی سے نماز پڑھتے ہوئے مارے گئے۔ دوسرے نواب زین العابدین خاں جن کو اُن کے والد کی وفات کے بعد دبیر الدولہ کا

خطاب بادشاہ نے دیا تھا۔ ان کو قدیم ریاضی میں اعلیٰ درجہ کی دستگاہ تھی۔ یہ تمام آلات رصد اپنے ہاتھ سے بناتے تھے۔ انہوں نے ایک بہت بڑے قطر کا برنجی کرہ اور برنجی اصطرلاب نہایت عمدہ بنایا تھا۔ نیز بہت سے آلات جن کی تفصیل سیرۃ فریدیہ میں مندرج ہے۔ اُن کے ہاتھ کے بنائے ہوئے موجود تھے اُن میں ایجاد و اختراع کا بڑا ملکہ تھا۔ انہوں نے پتنگ بنانے کے اصول وضع کئے تھے اور اس باب میں ایک رسالہ لکھا تھا جو غدر میں ضائع ہو گیا۔

سرسید کی والدہ کا حال جو سیرۃ فریدیہ میں لکھا ہے یا ہم نے دلی میں سرسید کے رشتہ داروں سے اور خود سرسید سے سنا ہے۔ چونکہ اُس کو سرسید کی تربیت اور اُن کے اخلاق و عادات بلکہ اُن کے تمام واقعاتِ زندگی میں بہت بڑا دخل ہے۔ اس لئے ہم اس کو کسی قدر زیادہ تفصیل سے بیان کرنا چاہتے ہیں سرسید کے والد میر متقی جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا۔ ایک نہایت آزاد منش آدمی تھے خصوصاً جب سے شاہ غلام صاحب کے مرید ہو گئے تھے اُن کی طبیعت میں اور بھی زیادہ بے تعلقی پیدا ہو گئی تھی۔ اس لئے اولاد کی تعلیم و تربیت کا مدار زیادہ تر بلکہ بالکل سرسید کی والدہ پر تھا۔ سرسید سے ایک دفعہ اُن کے بچپن کے حالات پوچھے گئے تو انہوں نے یہ جواب دیا کہ میری تمام سرگزشت کے بیان کو یہ ایک شعر کافی ہے۔

طفلی و دامانِ مادر خوش بہشتے بودہ است
چوں بپائے خود رواں گشتیم سرگرداں شدیم

سرسید کی والدہ خواجہ فرید کی تینوں بیٹیوں میں سب سے بڑی تھیں۔ اُن میں قدرتی قابلیت معمولی عورتوں سے بہت زیادہ تھی۔ وہ صرف قرآن مجید پڑھی ہوئی تھیں اور ابتدا میں کچھ فارسی کی ابتدائی کتابیں بھی پڑھی تھیں مگر اولاد کی تربیت کا اُن میں خداداد ملکہ تھا۔ سرسید کہتے تھے کہ "جب میں اُن کو سبق سناتا یا اپنے سبق کا مطالعہ اُن کے پاس بیٹھ کر دیکھتا تو ایک لکڑی جس میں سوت کی گندھی ہوئی تین لڑیں باندھ رکھی تھیں اپنے پاس رکھ لیتیں۔ وہ خفا تو اکثر ہوتی تھیں مگر اُن سوت کی لڑوں سے کبھی مجھے مارا نہیں"

سرسید لکھتے ہیں کہ "جس زمانہ میں میری عمر گیارہ بارہ برس کی تھی میں نے ایک نوکر کو جو بہت پرانا اور بڈھا تھا کسی بات پر تھپڑ مارا۔ والدہ کو بھی خبر ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد جب میں گھر میں آیا تو انہوں نے نہایت ناراض ہو کر کہا کہ گھر سے نکال دو۔ جہاں اس کا جی چاہے چلا جائے۔ یہ گھر میں رہنے کے لائق نہیں رہا۔ چنانچہ ایک ماما میرا ہاتھ پکڑ کر گھر سے باہر لے گئی۔ اور سڑک پر لا کر چھوڑ دیا۔ اسی وقت میری خالہ کے گھر سے جو بہت قریب تھا دوسری ماما نکلی اور خالہ پاس لے گئی انہوں نے کہا دیکھو آپا جی تم سے بہت ناراض ہیں۔ میں تم کو کوٹھے پر ایک مکان میں چھپا دیتی ہوں وہاں سے باہر نہ نکلنا ورنہ وہ ہم سے بھی ناراض ہو جائیں گی۔ میں تین دن تک وہاں چھپا رہا۔ تیسرے دن خالہ صاحب مجھے والدہ کے پاس لے گئیں

تھا۔ اور بعضے اور غیر ضروری کارخانے یک قلم موقوف کردیئے۔ اس کے سوا دیوان عام کی تانبے کی چھت جو شاہ عالم کے عہد میں بھاؤ مرہٹے نے سنہری ملمع کے سبب خالص سونے کی سمجھکر اکھڑوا ڈالی تھی اور وہ اُس وقت سے اکھڑی پڑی تھی۔ اُس کا سونا الگ اور تانبا الگ کرکے جتنا تانبا نکلا اُس کے شاہی ٹکسال میں پیسے بنوا ڈالے اور سونا فروخت کردیا۔ ان تدبیروں سے کئی لاکھ روپیہ کا قرضہ ادا کیا۔ اب آمدنی و خرچ برابر ہوگیا اور سب کی تنخواہیں جو کئی کئی مہینے بعد ملتی تھیں ماہ بماہ ملنے لگیں۔ لیکن قلعہ میں اُس سے عام ناراضی پھیل گئی اور آخرکار اُن کو عہدۂ وزارت سے کنارہ کش ہونا پڑا اور وہ پھر کلکتہ چلے گئے۔

ایک بار پھر خواجہ فرید کو بادشاہ نے کلکتہ سے بلاکر عہدۂ وزارت پر مامور کیا مگر اس دفعہ بھی چند وجوہات سے تین یا ساڑھے تین برس وزارت کا کام انجام دے کر بہ صلاح جرنیل اختر لونی کے جو دلی میں رزیڈنٹ تھے آخرکار استعفٰی دیدیا۔ دوسری بار وزارت سے علیحدہ ہونے کے بعد مہاراجہ رنجیت سنگھ نے معقول سفر خرچ اور اپنا معتمد بھیج کر خواجہ فرید کو لاہور بلایا۔ مگر جیسا کہ آگے ذکر کیا جائیگا وہ اپنی بڑی بیٹی یعنی سرسید کی والدہ کے سمجھانے سے لاہور نہیں گئے اور سفر خرچ واپس کردیا۔ اور پھر اخیر وقت تک۔ باوجودیکہ قلعہ کی طرف سے ایک دفعہ پھر بلاؤ ہوئی۔ انھوں نے کوئی تعلق اختیار نہیں کیا اور ۱۲۴۴ھ (۱۸۲۸ء) میں انتقال کیا ان کی تاریخ وفات اس جملہ سے کہ "جا بہ بہشت یافتم" بے کم و کاست نکلتی ہے۔

دبیرالدولہ خواجہ فرید الدین احمد ایک حکیم مشرب با صوفی منش آدمی تھے۔ ایک زمانہ میں وہ بھی اپنے بھائی شاہ فدا حسین کی طرح رسول شاہیوں میں داخل ہوگئے تھے اور منگا شاہ جو رسول شاہ کے ایک ممتاز چیلے تھے اُن کے مرید ہوگئے تھے۔ چونکہ اس طریقہ میں یہ ضرور نہیں ہے کہ خواہ مخواہ چار ابرو کا صفایا کریں بلکہ دنیادار اور متاہل لوگ بھی اس طریقہ میں داخل ہوتے ہیں اس لئے دبیرالدولہ نے مرنے سے دو برس پہلے تک کبھی ڈاڑھی مونچھ نہیں منڈوائی۔ مگر مرنے سے دو برس پہلے اُن کو یہ خیال ہوا کہ ایک دفعہ تو مرشد کی پوری پوری پیروی بھی کرنی چاہیئے۔ آخر ایک دن چار ابرو کا صفایا کرادیا۔ شہر میں اس کا بڑا چرچا ہوا اور لوگوں نے بہت کچھ طعن و تعریض کی۔ مگر انھوں نے اس کی کچھ پروا نہیں کی، لیکن ایک دفعہ کے سوا پھر کبھی ایسا نہیں کیا۔ سرسید کہتے تھے کہ "جب انتقال ہوا تو اُن کی ڈاڑھی کسی قدر بڑی ہوگئی تھی"

دبیرالدولہ کے دو بیٹے تھے جو سرسید کے ماموں ہوتے۔ بڑے وحیدالدین خاں جو مرزا جہانگیر کے بیٹے تیمور شاہ کی سرکار میں مختار تھے۔ یہ بعد فتح دہلی کے فوج کے کسی سپاہی کی گولی سے نماز پڑھتے ہوئے مارے گئے۔ دوسرے نواب زین العابدین خاں جن کو اُن کے والد کی وفات کے بعد دبیرالدولہ کا

خطاب بادشاہ نے دیا تھا۔ ان کو قدیم ریاضی میں اعلیٰ درجہ کی دستگاہ تھی۔ یہ تمام آلات رصد اپنے ہاتھ سے بناتے تھے اُنھوں نے ایک بہت بڑے قطر کا برنجی کُرہ اور برنجی اصطرلاب نہایت عمدہ بنایا تھا۔ نیز بہت سے آلات جن کی تفصیل سیرۃ فریدیہ میں مندرج ہے۔ اُن کے ہاتھ کے بنائے ہوئے موجود تھے اُن میں ایجاد و اختراع کا بڑا ملکہ تھا۔ اُنھوں نے پتنگ بنانے کے اصول وضع کئے تھے اور اس باب میں ایک رسالہ لکھا تھا جو غدر میں ضائع ہو گیا۔

سرسید کی والدہ کا حال جو سیرۃ فریدیہ میں لکھا ہے یا ہم نے دلّی میں سرسید کے رشتہ داروں سے اور خود سرسید سے سنا ہے۔ چونکہ اُس کو سرسید کی تربیت اور اُن کے اخلاق و عادات بلکہ اُن کے تمام واقعاتِ زندگی میں بہت بڑا دخل ہے۔ اس لئے ہم اس کو کسی قدر زیادہ تفصیل سے بیان کرنا چاہتے ہیں سرسید کے والد میر متقی جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا۔ ایک نہایت آزاد منش آدمی تھے خصوصاً جب شاہ غلام صاحب کے مرید ہو گئے تھے اُن کی طبیعت میں اور بھی زیادہ بے تعلقی پیدا ہو گئی تھی۔ اس لئے اولاد کی تعلیم و تربیت کا مدار زیادہ تر بلکہ بالکل سرسید کی والدہ پر تھا۔ سرسید سے ایک دفعہ اُن کے بچپن کے حالات پوچھے گئے تو اُنھوں نے یہ جواب دیا کہ میری تمام سرگزشت کے بیان کو یہ ایک شعر کافی ہے۔

طفلی و دامانِ مادر خوش بہشتے بودہ است چوں بپائے خود رواں گشتیم سرگرداں شدیم

سرسید کی والدہ خواجہ فرید کی تینوں بیٹیوں میں سب سے بڑی تھیں۔ اُن میں قدرتی قابلیت معمولی عورتوں سے بہت زیادہ تھی۔ وہ صرف قرآن مجید پڑھی ہوئی تھیں اور ابتدا میں کچھ فارسی کی ابتدائی کتابیں بھی پڑھی تھیں مگر اولاد کی تربیت کا اُن میں خداداد ملکہ تھا۔ سرسید کہتے تھے کہ "جب میں اُن کو سبق سنا تا یا نئے سبق کا مطالعہ اُن کے پاس بیٹھ کر دیکھتا تو ایک لکڑی جس میں سوت کی گندھی ہوئی تین لڑیں باندھ رکھی تھیں اپنے پاس رکھ لیتیں۔ وہ خفا تو اکثر ہوتی تھیں مگر اُن سوت کی لڑوں سے کبھی مجھے مارا نہیں۔"

سرسید لکھتے ہیں کہ "جس زمانہ میں میری عمر گیارہ بارہ برس کی تھی میں نے ایک نوکر کو جو بہت پرانا اور بڈھا تھا کسی بات پر تھپڑ مارا۔ والدہ کو بھی خبر ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد جب میں گھر میں آیا تو اُنھوں نے نہایت ناراض ہو کر کہا کہ اس کو گھر سے نکال دو جہاں اس کا جی چاہے چلا جائے۔ یہ گھر میں رہنے کے لائق نہیں رہا۔ چنانچہ ایک ماماں میرا ہاتھ پکڑ کر گھر سے باہر لے گئی۔ اور سڑک پر لا کر چھوڑ دیا۔ اسی وقت میری خالہ کے گھر سے جو بہت قریب تھا دوسری ماماں نکلی اور خالہ پاس لے گئی اُنھوں نے کہا دیکھو آپا جی تم سے بہت ناراض ہیں۔ میں تم کو کوٹھے پر ایک مکان میں چھپا دیتی ہوں وہاں سے باہر نہ نکلنا ورنہ وہ ہم سے بھی ناراض ہو جائیں گی۔ میں تین دن تک وہاں چھپا رہا۔ تیسرے دن خالہ صاحب مجھے والدہ کے پاس لے گئیں

تاکہ قصور معاف کرائیں۔ انھوں نے کہا اگر اس نوکر سے قصور معاف کرائیگا تو میں بھی معاف کر دوں گی۔ جب میں نے ڈیوڑھی میں جا کر نوکر کے آگے ہاتھ جوڑے تب قصور معاف ہوا۔"

سرسید کی والدہ کی دانشمندی اور دوراندیشی ذیل کی حکایت سے بخوبی ثابت ہوتی ہے۔ سرسید کہتے تھے کہ "جب دبیر الدولہ نے وزارت سے دوسری بار استعفیٰ دیدیا تو کچھ دنوں بعد مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اپنا معتمد اور ایک معقول رقم سفرخرچ کے لئے اُن کے پاس بھیجی اور لاہور بلایا۔ سارا کنبہ چاہتا تھا کہ وہ منظور کرلیں مگر اُن کی بڑی بیٹی یعنی میری والدہ نے کہا کہ خدا نے آپ کو اس قدر دیا ہے کہ جس طرح چاہیں آپ آرام سے بسر کرسکتے ہیں اور اُس سے کچھ اور زیادہ ہوجائے تو بھی آپ کے آرام و آسائش میں کچھ زیادتی نہیں ہوسکتی۔ آپ کا مہاراجہ رنجیت سنگھ کی عملداری میں جانا اور اُس سلطنت کے اختیارات لینے اور ہم سب کا انگریزی عملداری میں رہنا اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ میں تو ہرگز صلاح نہیں دیتی کہ اس ضعیفی کے زمانہ میں کہ آپ کی طبیعت بھی اکثر علیل رہتی ہے آپ لاہور کا ارادہ کریں۔" دبیر الدولہ کے دل پر اُن کے کہنے کا ایسا اثر ہوا کہ لاہور جانے سے انکار اور سفرخرچ واپس کردیا اور پھر کبھی کوئی تعلق اختیار نہیں کیا۔

سرسید کا بیان ہے کہ "میرے بڑے بھائی کے مرض الموت میں والدہ ہر وقت اُن کے پاس بیٹھی رہتی تھیں۔ ایک مہینہ تک یہی حال رہا۔ جب ان کا انتقال ہوگیا سب لوگ گریہ و زاری کرنے لگے۔ والدہ کی آنکھوں سے بھی آنسو جاری تھے اتنے میں صبح کی نماز کا وقت ہوگیا۔ انہوں نے وضو کرکے نماز پڑھی اور اشراق تک مصلے ہی پر بیٹھی رہیں۔ انھیں دنوں میں ایک رشتہ دار کی بیٹی کی شادی ہونے والی تھی۔ تمام سامان شادی کا ہوچکا تھا صرف چار دن تاریخ عقد میں باقی رہے تھے جب یہ حادثہ ہم پر گزرا تو اُن لوگوں نے دستور کے موافق شادی ملتوی کرنی چاہی۔ میری والدہ نے جب یہ سنا تو اس واقعہ کے تیسرے دن اُن کے گھر گئیں اور کہا میں شادی میں آئی ہوں۔ ماتم تین دن سے زیادہ نہیں ہوتا۔ اور شادی کے ملتوی کرنے سے تمہارا بڑا نقصان ہوگا۔ جو خدا کو منظور تھا وہ ہوچکا۔ تم شادی کو ہرگز ملتوی مت کرو۔ جب کہ میں خود تمہارے گھر آئی ہوں اور شادی کی اجازت دیتی ہوں تو اور کوئی کیا کہہ سکتا ہے۔"

سرسید کہتے تھے کہ "جو کچھ آمدنی ہوتی تھی اُس میں سے پانچ فیصدی کے حساب میری والدہ ہمیشہ الگ رکھتی جاتی تھیں اور اس سرمایہ کو حسن انتظام کے ساتھ نیک کاموں میں صرف کرتی تھیں۔ کئی جوان لڑکیوں کا اُن کی امداد سے نکاح ہوا۔ اکثر پردہ نشین عورتیں جو معاش سے تنگ ہوتیں اُن کی پوشیدہ خبرگیری کرتیں۔ غریب خاندانوں کی جوان لڑکیاں جو بیوہ ہوجاتیں اُن کو دوسرا نکاح کرنے کی نصیحت کرتیں اور دوسرے نکاح کو برا سمجھنے والوں سے نفرت کرتیں۔ غریب رشتہ داروں کے گھر جاتیں اور خفیہ یا کسی حیلہ سے اُن کی امداد کرتیں۔ بعض رشتہ دار مردوں نے ایسی عورتوں سے نکاح کرلیا تھا جن سے ملنا معیوب سمجھا جاتا تھا مگر وہ اُن کے گھر برابر جاتیں اور اُن کی اولاد کے ساتھ شفقت سے پیش آتیں۔"

سرسید کہتے تھے کہ "میری تمام ننہیال کو شاہ عبدالعزیز اور اُن کے خاندان سے عقیدت تھی مگر میری والدہ کو

شاہ غلام علی صاحب سے بیعت اور عقیدت تھی شاہ صاحب کے ہاں منت اور نذر و نیاز کا کہیں پتا نہ تھا۔ اُن کی عادت تھی کہ جب کوئی اپنی حاجت لیجاتا تو سب حاضرین سے کہتے کہ دعا کرو خدا اس کی حاجت پوری کرے۔ یہی عقیدہ میری والدہ کا تھا۔ اُنھوں نے خود کوئی منت یا نذر و نیاز کبھی نہیں مانی۔ تعویذ یا گنڈے پر اور تاریخوں یا دنوں کی سعادت و نحوست پہ اُن کو مطلق اعتقاد نہ تھا۔ لیکن اگر کوئی کرتا تو اُس کو منع بھی نہ کرتیں اور کہتیں کہ اگر اُن کو منع کیا جائے اور اتفاق سے وہی امر پیش آجائے جس کے خوف سے وہ ایسا کرتے ہیں تو اُن کو یقین ہوجائے گا کہ ایسا نہ کرنے سے یہ ہوا اگر ایسا کیا جاتا تو نہ ہوتا۔"

سرسید کا بیان ہے کہ "میری ننہیال والے اگرچہ عام توہمات میں مبتلا نہ تھے مگر شاہ عبدالعزیز کے ہاں جو کچھ ہوتا تھا اُس پر سب اعتقاد رکھتے تھے۔ شاہ عبدالعزیز اور اُن کے ہاں کے اور بزرگ بچوں کو ایک گنڈا دیا کرتے تھے اور اُس کے ساتھ ایک تعویذ ہوتا تھا جس میں ایک ہندسہ یا حرف سفید مرغ کے خون سے لکھا جاتا تھا۔ اور جس بچہ کو دیا جاتا اُس کو بارہ برس کی عمر تک انڈا یا مرغی کھانے کی ممانعت ہوتی تھی۔ سید حامد اور سید محمد کو بھی اُن کی ننہیال والوں نے وہ گنڈے پہنائے تھے۔ باوجود اس کے میری والدہ جب کبھی وہ اُن کے ساتھ کھانا کھاتے تھے اور کھانے میں انڈا یا مرغی ہوتی تو بے تامل اُن کو کھلا دیتیں۔" سرسید کہتے تھے کہ "اس زمانہ میں جب کہ میرے مذہبی خیالات اپنی ذاتی تحقیق پر مبنی ہیں اب بھی میں اپنی والدہ کے عقائد میں کوئی ایسا عقیدہ جس پر شرک یا بدعت کا اطلاق ہو سکے نہیں پاتا۔ البتہ وہ یہ سمجھتی تھیں کہ قرآن پڑھکر بخشنے یا فاتحہ دلاکر کھانا تقسیم کرنے کا ثواب مردہ کو پہنچتا ہے مگر میں ان دونوں باتوں کا قائل نہیں ہوں۔ عبادت بدنی میں تو نیابت کا مطلق قائل نہیں اور عبادت مالی میں بھی سوا اس کے کہ متوفی اپنی زندگی میں کچھ مال کسی کار خیر کے لئے کسی کے سپرد کر جائے اور کسی صورت میں نیابت کا قائل نہیں ہوں۔" سرسید کا بیان ہے کہ "جب میں دلّی میں منصف تھا تو میری والدہ کی یہ نصیحت تھی کہ جہاں تم کو ہمیشہ جانا ضروری ہو وہاں کبھی سواری پر جایا کرو اور کبھی پیادہ پا جایا کرو۔ زمانہ کا کچھ اعتبار نہیں کبھی کچھ ہے اور کبھی کچھ۔ پس ایسی عادت رکھو کہ ہمیشہ اُس کو نباہ سکو۔ چنانچہ میں نے جامع مسجد اور درگاہ میں جانے کا یہی طریقہ رکھا تھا کہ اکثر پیدل اور کبھی کبھی سواری پر جاتا تھا۔" سرسید کی والدہ جیسی سمجھدار اور دانشمند تھیں اُس سے زیادہ نیک دل اور پاک سرشت تھیں۔ سرسید کا بیان ہے کہ "مسماۃ زین ایک لاوارث بڑھیا تھی۔ میری والدہ اُس کی خبرگیری کرتی تھیں جب میں دلّی میں منصف تھا اتفاق سے میری والدہ اور زین دونوں ایک ساتھ بیمار ہوئیں اور دونوں کی بیماری بھی ایک ہی سی تھی۔ حکیم نے والدہ کے لئے کسی قدر افاقہ کے بعد ایک معجون کا نسخہ جو قیمتی تھا تجویز کیا۔ مگر جس قدر تیار ہوا تھا وہ مقدار میں ایک ہی بیمار کی چند روزہ خوراک تھی۔ میں اُس معجون کو تیار کرا کے والدہ کے پاس لے گیا اور اُن سے کہدیا کہ یہ اتنے دنوں کی خوراک ہے۔ اُنھوں نے لے لی۔ مگر اس خیال سے کہ یہ زین کو بھی مفید ہوگی لیکن اُس کو کون بنوا کے دیگا۔ اُنھوں نے خود اُس معجون کو نہیں کھایا اور برابر زین کو کھلاتی رہیں۔ زین کو اُس سے بہت فائدہ ہوا۔ مگر والدہ بھی بغیر اُس معجون کے استعمال کے اچھی ہوگئیں۔ چند روز بعد میں نے

کہا کہ معجون نے آپ کو بہت فائدہ کیا وہ ہنسیں اور کہا کیا بغیر دوا کے خدا صحت نہیں دے سکتا؟ آخر معلوم ہوا کہ وہ ساری معجون زمین ہی کو کھلائی مگر خدا نے دونوں کو صحت عنایت کی۔" سرسید کہتے تھے کہ "میرے بھائی سید محمد خاں اور حکیم غلام نجف خاں میں بہت دوستی تھی۔ ایک دوسرے کو بھائی بھائی کہتے تھے۔ میں بھی حکیم صاحب کو بڑے بھائی کے برابر سمجھتا تھا۔ مگر بھائی کے انتقال کے بعد ایک دفعہ حکیم صاحب کچھ مجھ سے ناراض ہو گئے اور ہمارے ہاں آنا چھوڑ دیا۔ مگر میں بدستور اُن کے ہاں جاتا رہا۔ اور مدت تک میں نے کچھ خیال نہ کیا لیکن آخر کو میں نے بھی اُن کے ہاں جانا بہت کم کر دیا۔ جب والدہ کو اس بات کی خبر ہوئی تو بہت افسوس کیا اور مجھ سے کہا کہ جس بات کو تم خود اچھا نہیں سمجھتے وہی بات آپ کرتے ہو۔ اگر وہ نہیں ملتے تو نہ ملیں مگر تم بدستور ملتے رہو۔" سرسید نے ایک شخص کا ہم سے ذکر کیا کہ "جب میں صدر امین تھا تو اُس کے ساتھ میں نے کچھ سلوک کیا تھا اور اُس کو ایک سخت مواخذہ سے بچایا تھا۔ مگر ایک مدت کے بعد اُس نے درپردہ میرے ساتھ بُرائی کرنی شروع کی اور مدت تک میری شکایت کی گمنام عرضیاں صدر میں بھیجتا رہا۔ آخر تمام وجہ ثبوت جس سے اُس کو کافی سزا مل سکتی تھی میرے ہاتھ آ گئی اور اتفاق سے اُس وقت مجسٹریٹ بھی وہ شخص تھا جو اُس کے پھانسنے کی فکر میں تھا۔ میرے نفس نے مجھ کو انتقام لینے پر آمادہ کیا۔ میری والدہ کو جب میرا یہ ارادہ معلوم ہوا تو انہوں نے مجھ سے کہا کہ "سب سے بہتر تو یہ ہے کہ درگزر کرو۔ اور اگر بدلا ہی لینا چاہتے ہو تو اُس زبردست حاکم کے انصاف پر چھوڑ دو جو ہر بدی کی پوری سزا دینے والا ہے۔ اپنے دشمنوں کو دنیا کے کمزور حاکموں سے بدلا دلوانا بڑی نادانی کی بات ہے۔" اُن کے اس کہنے کا مجھ پر ایسا اثر ہوا کہ اُس دن سے آج تک مجھ کو کبھی کسی اپنے دشمن یا بدخواہ سے انتقام لینے کا خیال نہیں آیا اور اُمید ہے کہ کبھی نہ آئے گا۔ بلکہ اُنہیں کی نصیحت کی بدولت میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ آخرت میں خدا اُس سے میرا بدلا لے۔"

سرسید کی بہن صفیۃ النسا بیگم تھیں۔ جن کا انتقال دسمبر ۱۸۹۲ء میں جب کہ سرسید محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی تقریب سے دلی میں موجود تھے کچھ کم نوے برس کی عمر میں ہوا۔ عورتوں میں ممتاز اور قابل تھیں۔ اکثر مذہبی کتابیں اور کچھ حدیث کی عربی کتابیں بھی مع ترجمہ کے پڑھی تھیں اور اُن کے گھر میں کنبے کی اکثر لڑکیاں جمع ہوتیں اور اُن سے پڑھتی تھیں۔

سرسید کے بڑے بھائی سید محمد خاں نے صرف معمولی تعلیم پائی تھی مگر بہت زندہ دل اور شگفتہ مزاج تھے۔ اُن کو بھی شاہ غلام علی صاحب سے بیعت تھی مگر وضع اُس کے خلاف تھی۔ اکثر اُن کے والد کے ملنے والے اُن سے کہتے کہ بیٹے کو سمجھاؤ کہ اپنی وضع درست کرے اور داڑھی نہ منڈایا کرے۔ وہ یہ جواب دیتے کہ عمر کا تقاضا ہے جو اُس کا دل چاہے کرنے دو۔ کبھی نہ کبھی خود درست ہو جائیگا۔ آخر ایک مدت کے بعد اُن کا طریقہ خود بخود بدل گیا۔ داڑھی رکھ لی اور نماز کے سخت پابند ہو گئے۔ یہاں تک کہ تہجد اور اشراق کی نماز بھی ترک نہ ہوتی تھی اور قرآن مجید کی تلاوت بھی کرنے لگے۔

وہ ہتگام ضلع فتح پور میں منصف تھے۔ ۱۸۴۵ء میں سرسید فتحپور سیکری سے جہاں وہ خود منصف تھے۔ اور سید محمد خاں ہتگام سے دسہرہ کی تعطیل میں دلی آئے۔ وہاں اُس وقت بخار کی فصل تھی سید محمد خاں کو بخار آنے لگا تعطیل کے بعد جب سرسید جانے لگے تو رخصت کے وقت اُن کے بھائی نے ایسے کلمات کہے جن سے معلوم ہوتا تھا کہ اُن کو اپنے زندہ رہنے کی اُمید نہیں ہے۔ اس کے بعد فی الواقع اُن کا مرض بڑھنے لگا۔ وہ اسی حالت میں خواجہ باقی باللہ گئے اور وہاں اپنی قبر کے لئے خود جگہ تجویز کی۔ ہر چند لوگ کہتے تھے کہ ایسی بیماری نہیں ہے تم کیوں اس خیال میں پڑے ہو۔ مگر اُن کو مرنے کا یقین ہو گیا تھا۔ جب قبر تیار ہو گئی تو سوار ہو کر وہاں پہنچے اور قبر میں اُتر کر لیٹے اور قبر کو پسند کیا۔ وہاں سے آکر دوسرے دن کفن کے لئے کپڑا منگوایا اور اُس کو سلوا کر پہنا اور بہت پسند کیا۔ اب مرض اور بھی زیادہ ہو گیا۔ ایک دن شاہ احمد سعید صاحب کو جو اُس وقت خانقاہ میں سجادہ نشین تھے بلایا اور اُن کے ہاتھ پر تجدید بیعت کی اور تیسرے دن انتقال کیا۔ مفتی صدرالدین خاں نے جو سرسید کو اُن کی تعزیت کا خط بھیجا تھا اُس میں یہ شعر لکھا تھا۔

"قسمت نگر کہ کشتۂ شمشیر عشق یافت مرگے کہ زندگاں بہ دعا آرزو کنند"

سرسید کے خاندان کا حال جس قدر کہ ہم نے لکھا ہے شاید ناظرین کتاب اس کو قدر ضرورت سے زیادہ خیال کریں لیکن بائیوگرفی کا اصل مقصد جو ہیرو کے اخلاق و عادات و خیالات کا دنیا پر منکشف کرنا ہے وہ اُس وقت تک پورا نہیں ہو سکتا جب تک یہ نہ دکھایا جائے کہ ہیرو میں یہ اخلاق و عادات اور خیالات کہاں سے آئے؟ اور اُن کی بنیاد اُس میں کیونکر پڑی؟ انسان میں کچھ خصلتیں جبلّی ہوتی ہیں جو آبا و اجداد سے بطور میراث کے اُس کو پہنچتی ہیں۔ اور زیادہ تر وہ اخلاق و عادات ہوتے ہیں جو بچپن میں نامعلوم طور پر وہ اپنے خاندان کی سوسائٹی سے اکتساب کرتا ہے اور جو رفتہ رفتہ اس درجہ تک پہنچ جاتے ہیں جن کی نسبت حدیث میں آیا ہے کہ پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل جائے تو ٹل جائے لیکن آدمی اپنی جبلت سے نہیں ٹل سکتا۔ پس ہیرو کے خاندان کا حال جس میں وہ پیدا ہوا اور اُس سوسائٹی کا حال جس میں اُس نے نشو و نما پائی درحقیقت ہیرو کے اخلاق و عادات پر ایک ایسی روشنی ڈالتا ہے جس کے بعد کسی اور ثبوت کے پیش کرنے کی چنداں ضرورت باقی نہیں رہتی۔

پیدائش

سرسید کے پیدا ہونے سے پہلے اُن کی بہن صفیۃ النسا بیگم اور اُن کے بھائی سید محمد خاں پیدا ہو چکے تھے۔ سید محمد خاں کی ولادت کے بعد چھ برس تک اُن کے والدین کے ہاں کوئی بچہ پیدا نہیں ہوا اس لئے سید احمد خاں کے پیدا ہونے کی اُن کو نہایت خوشی ہوئی سرسید سے

چند مہینے پہلے اُن کے ماموں نواب زین العابدین خاں کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا تھا جس کا نام حاتم علی خاں تھا۔ سرسید کو اول حاتم علی خاں کی والدہ نے دودھ پلایا اور پھر خود سرسید کی والدہ نے۔ وہ اپنے خاندان کے اکثر بچوں کی نسبت زیادہ قوی اور توانا اور ہاتھ پاؤں سے تندرست پیدا ہوئے تھے۔ وہ اپنی ماں کی زبانی بیان کرتے تھے کہ جب اُن کے نانا دوسری بار کلکتہ سے دلی میں آئے اور ان کو پہلے ہی بار دیکھا تو یہ کہا کہ "یہ تو ہمارے گھر میں جاٹ پیدا ہوا ہے"

سرسید کے بیان سے معلوم ہوتا تھا کہ اُن کے بچپن میں جسمانی صحت اور فزیکل قابلیت کے سوا کوئی ایسی خصوصیت نہیں سے اُن کے بچپن کو معمولی لڑکوں کے بچپن پر بے تعلق فوقیت دی جا سکے نہیں پائی جاتی تھی یعنی جیسے کہ بعض بچے ابتدا میں نہایت ذکی اور طباع اور اپنے ہمجولیوں میں سب سے زیادہ تیز اور ہوشیار ہوتے ہیں سرسید میں کوئی اس قسم کا صریح امتیاز نہ تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے قوائے ذہنیہ کو محض دماغی ریاضت اور لگاتار غور و فکر سے بتدریج ترقی دی تھی اور اسی لئے اُن کی لائف کا آغاز معمولی آدمیوں کی زندگی سے کچھ زیادہ چمکدار معلوم نہیں ہوتا۔ لیکن جس قدر آگے بڑھتے جائیے اُسی قدر اس میں زیادہ عظمت پیدا ہوتی جاتی ہے یہاں تک کہ ہیرو کو معمولی آدمیوں کی سطح سے بالاتر کر دیتی ہے۔ اسی لئے بعض حکما کی یہ رائے ہے کہ محنت سے آدمی جو چاہے سو کر سکتا ہے

الغرض جب سرسید پیدا ہوئے تو اُن کے والد نے شاہ غلام علی صاحب سے نام رکھنے کی درخواست کی۔ شاہ صاحب ہی نے بڑے بھائی کا نام محمد رکھا تھا ان کا نام احمد رکھا۔ سرسید کے دادا اُن کے والد کی شادی ہونے سے پہلے قضا کر چکے تھے۔ اور یہ اور اُن کے بہن بھائی شاہ صاحب ہی کو دادا حضرت کہا کرتے تھے۔ سرسید کہتے تھے کہ "شاہ صاحب کو بھی ہم سب سے ایسی ہی محبت تھی جیسی حقیقی دادا کو اپنے پوتوں سے ہوتی ہے۔ شاہ صاحب نے تاہل اختیار نہیں کیا تھا اور وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ گو خدا تعالیٰ نے مجھے اولاد کے جھگڑوں سے آزاد رکھا ہے لیکن متقی کی اولاد کی محبت ایسی دیدی ہے کہ اُس کے بچوں کی تکلیف یا بیماری مجھکو بے چین کر دیتی ہے۔

سرسید کو مسماۃ ماں بی بی نے جو ایک قدیم خیر خواہ خادمہ اُن کے گھرانے کی تھی پالا تھا۔ اس لئے اُن کو ماں بی بی سے نہایت محبت تھی۔ وہ پانچ برس کے تھے جب ماں بی بی کا انتقال ہوا۔ اُن کا بیان ہے کہ "مجھے خوب یاد ہے ماں بی بی مرنے سے چند گھنٹے پہلے فالسہ کا شربت مجھکو پلا رہی تھی۔ جب وہ مر گئی تو مجھے اُس کے مرنے کا نہایت رنج ہوا۔ میری والدہ نے مجھے سمجھایا کہ وہ خدا کے پاس گئی ہے۔ بہت اچھے مکان میں رہتی ہے۔ بہت سے نوکر چاکر اُس کی خدمت کرتے ہیں۔ اور اُس کی بہت آرام سے گزرتی ہے۔ تم کچھ رنج مت کرو

مجھکو اُن کے کہنے سے پورا یقین تھا کہ فی الواقع ایسا ہی ہے۔ مدت تک ہر جمعرات کو اُس کی فاتحہ ہوا کرتی تھی اور کسی محتاج کو کھانا دیا جاتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ یہ سب کھانا ماں بی بی کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ اُس نے مرتے وقت کہا تھا کہ میرا تمام زیور سیّد کا ہے مگر میری والدہ اُس کو خیرات میں دینا چاہتی تھیں۔ ایک دن اُنھوں نے مجھ سے پوچھا کہ اگر تم کہو تو یہ گہنا ماں بی بی کے پاس بھیجدوں۔ میں نے کہا ہاں بھیجدو۔ والدہ نے وہ سب گہنا مختلف طرح خیرات میں دیدیا۔"

بچپن میں سرسید پر نہ تو ایسی قید تھی کہ کھیلنے کودنے کی بالکل بندی ہو اور نہ ایسی آزادی تھی کہ جہاں چاہیں اور جن کے ساتھ چاہیں کھیلتے کودتے پھریں۔ اُن کی بڑی خوش نصیبی یہ تھی کہ خود اُن کے ماموں اُن کی خالہ اور دیگر نزدیکی رشتہ داروں کے چودہ پندرہ لڑکے اُن کے ہم عمر تھے جو آپس میں کھیلنے کودنے کے لئے کافی تھے۔ اس لئے اُن کو نوکروں اور اجلافوں کے بچوں اور اشرافوں کے آوارہ لڑکوں سے ملنے جلنے اور اُن کے ساتھ کھیلنے کا کبھی موقع نہیں ملا۔ اُن کے بزرگوں نے یہ اجازت دے رکھی تھی کہ جب کھیل کو تمھارا جی چاہے شوق سے کھیلو مگر کسی کھیل کو چھپا کر مت کھیلو۔ اس لئے سب لڑکے جو کھیل کھیلتے تھے اپنے بڑوں کے سامنے کھیلتے تھے۔ اُن کے کھیلوں میں کوئی بات ایسی نہ ہوتی تھی جو اپنے بزرگوں کے سامنے نہ کر سکیں۔ خواجہ فرید کی حویلی جس میں وہ اور اُن کے ہم عمر لڑکے رہتے تھے اُس کا چوک اور اُس کی چھتیں ہر قسم کی بھاگ دوڑ کے کھیلوں کے لئے کافی تھیں۔ ابتدا میں وہ اکثر گیند بلا کبڈی گیڑیاں آنکھ مچوّل۔ چیل چلو وغیرہ کھیلتے تھے۔ اگرچہ گیڑیاں کھیلنے کو اشراف معیوب جانتے تھے مگر اُن کے بزرگوں نے اجازت دے رکھی تھی کہ آپس میں سب بھائی مل کر گیڑیاں کھیلو تو کچھ مضائقہ نہیں۔ سرسید کہتے تھے کہ "کھیل میں جب کچھ جھگڑا ہو جاتا تو بڑوں میں سے کوئی آکر تصفیہ کر دیتا۔ اور جس کی طرف سے چیند معلوم ہوتی اُس کو بُرا بھلا کہتا اور شرمندہ کرتا کہ چیند کرنا بے ایمانی کی بات ہے۔ کبھی چیند مت کرو اور جو چیند کرے اُس کو ہرگز اپنے ساتھ مت کھیلنے دو۔"

اُن کا بیان تھا کہ "باوجود اس قدر آزادی کے بچپن میں مجھے تنہا باہر جانے کی اجازت نہ تھی۔ جب میری والدہ نے اپنے رہنے کی جدا حویلی بنائی اور وہاں آرہیں تو باوجودکہ اُس حویلی میں اور نانا صاحب کی حویلی میں صرف ایک سڑک درمیان تھی۔ جب کبھی میں اُن کی حویلی میں جاتا تو ایک آدمی میرے ساتھ جاتا۔ اسی لئے بچپن میں مجھے گھر سے باہر جانے اور عام صحبتوں میں بیٹھنے یا آوارہ پھرنے کا بالکل اتفاق نہیں ہوا۔"

سرسید اپنے کھیل کود کے زمانہ میں بہت مستعد اور چالاک اور کسی قدر شوخ بھی تھے۔ اپنے ساتھیوں کے ساتھ اکثر شوخی کیا کرتے۔ وہ کہتے تھے کہ "ایک بار میں نے اپنے ایک رشتہ دار بھائی کو جو استنجا کر رہا تھا چپکے چپکے اُس کے پیچھے جا کر چت کر دیا۔ اُس کے سارے کپڑے خراب ہو گئے۔ وہ تھرے کر کے مجھے

مارنے کو دوڑا اور کئی پتھر پھینکے مگر میں بچ بچ گیا۔ آخر سب بھائیوں نے بیچ بچاؤ کر کے صلح کرا دی اسی طرح ایک بار میں شطرنج کھیلنے میں ایک اپنے رشتہ دار بھائی سے لڑ پڑا۔ میرے مکّے سے اس کے ہاتھ کی انگلی اتر گئی اور کئی دن بعد اچھی ہوئی۔ ہمیشہ یونہیں لڑائی بھڑائی مار کٹائی ہوتی تھی مگر آخر کو سب ایک ہو جاتے تھے۔"

سرسید لکھتے ہیں کہ "میرے نانا صبح کا کھانا اندر زنانہ میں کھاتے تھے ایک چوڑا چکلا دسترخوان بچھتا تھا بیٹے بیٹیاں پوتے پوتیاں نواسے نواسیاں اور بیٹوں کی بیویاں سب اُن کے ساتھ کھانا کھاتے تھے۔ بچّوں کے آگے خالی رکابیاں ہوتی تھیں۔ نانا صاحب ہر ایک سے پوچھتے تھے کہ کون سی چیز کھاؤ گے؟ جو کچھ وہ بتاتا وہی چیز چمچے میں لے کر اپنے ہاتھ سے اُس کی رکابی میں ڈال دیتے۔ تمام بچے بہت ادب اور صفائی سے اُن کے ساتھ کھانا کھاتے تھے۔ سب کو خیال رہتا تھا کہ کوئی چیز گرنے نہ پائے، ہاتھ کھانے میں زیادہ نہ بھرے، اور نوالا چبانے کی آواز مُنہ سے نہ نکلے۔ رات کا کھانا وہ باہر دیوان خانہ میں کھاتے تھے۔ زنانہ ہو جاتا تھا۔ میری والدہ اور میری چھوٹی خالا کھانا کھلانے آتی تھیں۔ ہم سب لڑکے اُن کے سامنے بیٹھتے تھے۔ ہم کو بڑی مشکل پڑتی تھی کیسی کے پاؤں کا دھبّا سفید چاندنی پر لگ جاتا تھا تو نہایت ناراض ہوتے تھے۔ روشنائی وغیرہ کا دھبّا کسی کے کپڑے پر ہوتا تھا تو اُس سے بھی ناخوش ہوتے تھے۔ شام کو چراغ جلنے کے بعد اُن کے پوتے اور نواسے جو مکتب میں پڑھتے تھے اور جن میں سے ایک میں بھی تھا۔ ان کو سبق سُنانے جاتے تھے۔ جس کا سبق اچھا یاد ہوتا اُس کو کسی قسم کی عمدہ مٹھائی ملتی اور جس کو یاد نہ ہوتا اُس کو کچھ نہ دیتے اور گھرک دیتے۔"

گرمی اور برسات کے موسم میں اب بھی دلّی کے اکثر باشندے سہ پہر کو جمنا پر جا کر پانی کی سیر دیکھتے ہیں اور تیرنے والے تیرتے ہیں۔ مگر پچاس برس پہلے وہاں اشراف تیرنے والوں کے بہت دل چسپ جلسے ہوتے تھے۔ سرسید کہتے تھے "میں نے اور بڑے بھائی نے اپنے والد سے تیرنا سیکھا تھا ایک زمانہ تو وہ تھا کہ ایک طرف دلّی کے مشہور تیراک مولوی علیم اللہ کا غول ہوتا تھا جن میں مرزا معغل اور مرزا طغل بہت سربر آوردہ اور نامی تھے۔ اور دوسری طرف ہمارے والد کے ساتھ سو سوا سو شاگردوں کا گروہ ہوتا تھا۔ یہ سب ایک ساتھ دریا میں کودتے تھے اور مجنوں کے ٹیلے سے شیخ محمد کی باؤلی تک یہ سارا گروہ تیرتا جاتا تھا۔ پھر جب ہم دونو بھائی تیرنا سیکھتے تھے اُس زمانہ میں بھی تیس چالیس آدمی والد کے ساتھ ہوتے تھے۔ انھیں دنوں میں نواب اکبر خاں اور چند اور رئیس زادے بھی تیرنا سیکھتے تھے۔ زینۃ المساجد کے پاس نواب احمد بخش خاں کے باغ کے نیچے جمنا بہتی تھی۔ وہاں سے تیرنا شروع ہوتا تھا۔ مغرب کے وقت سب تیراک زینۃ المساجد میں جمع ہو جاتے تھے اور مغرب کی نماز جماعت سے پڑھ کر اپنے اپنے گھر چلے آتے تھے۔ میں ان جلسوں میں اکثر شریک ہوتا تھا۔"

تیر اندازی کی صحبتیں بھی سرسید کے ماموں نواب زین العابدین خاں کے مکان پر ہوتی تھیں

وہ کہتے تھے کہ "مجھے اپنے ماموں اور والد کے شوق کا وہ زمانہ جب کہ نہایت دھوم دھام سے تیر اندازی ہوتی تھی یاد نہیں۔ مگر جب دوبارہ تیر اندازی کا چرچا ہوا وہ بخوبی یاد ہے۔ اُس زمانہ میں دربار کا جانا موقوف ہو گیا تھا ظہر کی نماز کے بعد تیر اندازی شروع ہوتی تھی۔ نواب فتح اللہ بیگ خاں، نواب سید عظمت اللہ خاں، نواب ابراہیم علی خاں اور چند شاہزادے اور رئیس اور اور شوقین اس جلسہ میں شریک ہوتے تھے۔ نواب شمس الدین خاں رئیس فیروز پور جھرکہ جب دلی میں ہوتے تھے تو وہ بھی آتے تھے۔ میں نے بھی اسی زمانہ میں تیر اندازی سیکھی اور مجھکو خاصی مشق ہو گئی تھی۔ مجھے خوب یاد ہے کہ ایک دفعہ میرا نشانہ جو تودے میں نہایت صفائی اور خوبی سے جا کر بیٹھا تو والد بہت خوش ہوئے اور کہا "مچھلی کے جائے کو کون تیرنا سکھائے"۔ یہ جلسہ برسوں تک رہا پھر موقوف ہو گیا۔"

اہل اللہ اور مقدس لوگوں کی عظمت کا خیال بچپن سے سرسید کے دل میں بٹھایا گیا تھا وہ اپنے والد کے ساتھ اکثر شاہ غلام علی صاحب کی خدمت میں جاتے تھے۔ اور شاہ صاحب سے اُن کی عقیدت کا رنگ اپنی آنکھ سے دیکھتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ "مرزا صاحب کے عرس میں شاہ صاحب ایک روپیہ اُن کے مزار پر چڑھایا کرتے تھے اور اُس روپیہ کے لینے کا حق میرے والد کے سوا اور کسی کو نہ تھا۔ ایک دفعہ عرس کی تاریخ سے کچھ پہلے ایک مرید نے شاہ صاحب سے اجازت لے لی کہ اب کی بار نذر کا روپیہ مجھے عنایت ہو۔ میرے والد کو بھی خبر ہو گئی جب شاہ صاحب نے روپیہ چڑھانے کا ارادہ کیا تو والد نے عرض کی کہ حضرت! میرے اور میری اولاد کے جیتے جی آپ نذر کا روپیہ لینے کی اوروں کو اجازت دیتے ہیں؟ شاہ صاحب نے فرمایا نہیں نہیں تمہارے سوا کوئی نہیں لے سکتا میں اُس وقت صغیر سن تھا جب شاہ صاحب نے روپیہ چڑھایا والد نے مجھ سے کہا جاؤ روپیہ اُٹھا لو میں نے آگے بڑھکر روپیہ اُٹھا لیا۔"

دلی سے سات کوس مغل پور ایک جاٹوں کا گانو ہے وہاں سرسید کے والد کی کچھ ملک بطور معافی کے تھی۔ اگر کبھی فصل کے موقع پر اُن کے والد مغلپور جاتے تو اُن کو بھی اکثر اپنے ساتھ لے جاتے اور ایک ہفتہ گانو میں رہتے۔ سرسید کہتے تھے کہ "اُس عمر میں گانو میں جا کر رہنا، جنگل میں پھرنا، عمدہ دودھ اور دہی اور تازہ تازہ گھی اور جاٹنیوں کے ہاتھ کی پکی ہوئی باجرے یا مکئی کی روٹیاں کھانا نہایت ہی مزہ دیتا تھا۔"

سرسید کے والد کو اکبر شاہ کے زمانہ میں ہر سال تاریخ جلوس کے جشن پر پانچ پارچہ اور تین رقوم جواہر کا خلعت عطا ہوتا تھا۔ مگر اخیر میں جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا اُنہوں نے دربار کا جانا کم کر دیا تھا۔ اور اپنا خلعت سرسید کو باوجود کہ اُن کی عمر کم تھی دلوانا شروع کر دیا تھا۔

سرسید کہتے تھے کہ "ایک بار خلعت ملنے کی تاریخ پر ایسا اتفاق ہوا کہ والد بہت سویرے اُٹھ کر قلعہ چلے گئے اور میں بہت دن چڑھے اُٹھا۔ ہر چند بہت جلد گھوڑے پر سوار ہو کر وہاں پہنچا مگر پھر بھی دیر ہو گئی۔ جب

لال پردہ کے قریب پہنچا تو قاعدہ کے موافق اول دربار میں جاکر آداب بجالانے کا وقت نہیں رہا تھا۔ داروغہ نے کہا کہ بس اب خلعت پہنکر ایک ہی دفعہ دربار میں جانا۔ جب خلعت پہن کر میں نے دربار میں جانا چاہا تو دربار برخاست ہوچکا تھا۔ اور بادشاہ تخت پر سے اُٹھکر ہوادار پر سوار ہوچکے تھے۔ بادشاہ نے مجھے دیکھ کر والد سے - جو اُس وقت ہوادار کے پاس ہی تھے - پوچھا کہ "تمہارا بیٹا ہے؟" اُنھوں نے کہا "حضور کا خانہ زاد" بادشاہ چپکے ہو رہے لوگوں نے جانا کہ بس اب محل میں چلے جائینگے - مگر جب تسبیح خانہ میں پہنچے تو وہاں ٹھیر گئے - تسبیح خانہ میں بھی ایک چبوترہ بنا ہوا تھا جہاں کبھی کبھی دربار کیا کرتے تھے - اُس چبوترہ پر بیٹھ گئے - اور جواہر خانہ کے داروغہ کو کشتی جواہر حاضر کرنیکا حکم ہوا - میں بھی وہاں پہنچ گیا تھا - بادشاہ نے مجھے اپنے سامنے بُلایا اور کمال عنایت سے میرے دونوں ہاتھ پکڑ کر فرمایا کہ دیر کیوں کی؟ حاضرین نے کہا عرض کرو کہ تقصیر ہوئی - مگر میں چپکا کھڑا رہا - جب حضور نے دوبارہ پوچھا تو میں نے عرض کیا کہ سوگیا تھا - بادشاہ مسکرائے اور فرمایا بہت سویرے اُٹھا کرو - اور ہاتھ چھوڑ دیئے - لوگوں نے کہا آداب بجالاؤ - میں آداب بجالایا - بادشاہ نے جواہرات کی معمولی رقمیں اپنے ہاتھ سے پہنائیں - میں نے نذر دی اور بادشاہ اُٹھکر قاصی ڈیوڑھی سے محل میں چلے گئے تمام درباری میرے والد کو بادشاہ کی اس عنایت پر مبارک سلامت کہنے لگے" سر سید کہتے تھے کہ "اُس زمانہ میں میری عمر آٹھ نو برس کی ہوگی - تقریباً انھیں دنوں میں راجہ رام موھن رائ جو برہمو سماج کے بانی تھے - اُن کو اکبر شاہ نے کلکتہ سے بُلایا تھا تاکہ اضافہ پنشن بادشاہی کے لئے اُن کو لندن بھیجا جائے - چنانچہ وہ بادشاہ کی طرف سے لندن بھیجے گئے اور ۱۸۳۱ء میں وہاں پہنچے" سرسید نے لندن جانے سے پہلے اُن کو متعدد دفعہ دربار شاہی میں دیکھا تھا -

بسم اللہ

سرسید کہتے تھے کہ "مجھکو اپنی بسم اللہ کی تقریب بخوبی یاد ہے سہ پہر کا وقت تھا اور آدمی کثرت سے جمع تھے خصوصاً حضرت شاہ غلام علی صاحب بھی تشریف رکھتے تھے مجھکو لاکر حضرت کے سامنے بٹھا دیا تھا میں اس مجمع کو دیکھ کر ہکّا بکّا سا ہوگیا میرے سامنے تختی رکھی گئی اور غالباً شاہ صاحب ہی نے فرمایا کہ پڑھو بسم اللہ الرحمن الرحیم مگر میں کچھ نہ بولا اور حضرت صاحب کی طرف دیکھتا رہا اُنھوں نے اُٹھا کر مجھے اپنی گود میں بٹھالیا اور فرمایا کہ ہمارے پاس بیٹھکر پڑھینگے اور اول بسم اللہ پڑھکر اقراء کی اول آیتیں ما لم یعلم تک پڑھیں میں بھی اُن کے ساتھ ساتھ پڑھتا گیا" سرسید نے جب یہ ذکر کیا تو بطور فخر کے اپنا یہ فارسی شعر جو خاص اسی موقع کے لئے اُنھوں نے کبھی کہا تھا - پڑھا -

"بہ مکتب رفتم و آموختم اسرار یزدانی | زفیض نقشبند وقت جانِ جان جانانی"

سر سید کہتے تھے کہ "شاہ صاحب اپنی خانقاہ سے کبھی نہیں اُٹھتے تھے اور کسی کے ہاں نہیں جاتے تھے الا ماشاء اللہ - صرف میرے والد پر جو غایت درجہ کی شفقت تھی اس لئے کبھی کبھی ہمارے گھر قدم رنجہ فرماتے تھے"

بسم اللہ ہونے کے بعد سرسید نے قرآن مجید پڑھنا شروع کیا۔ اُن کی ننہیال میں قدیم سے کوئی نہ کوئی اُستانی نوکر رہتی تھی۔ سرسید نے اُستانی ہی سے جو ایک اشراف گھر کی پردہ نشین بی بی تھی سارا قرآن ناظرانہ پڑھا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ "میرا قرآن ختم ہونے پر ہدیہ کی مجلس جو زمانہ میں ہوئی تھی وہ اس قدر دلچسپ اور عجیب تھی کہ پھر کبھی ایسی مجلس اس کیفیت میں نے نہیں دیکھی۔" قرآن پڑھنے کے بعد وہ باہر مکتب میں پڑھنے لگے۔ مولوی حمید الدین ایک ذی علم اور بزرگ آدمی اُن کے نانا کے ہاں نوکر تھے جنہوں نے اُن کے ماموؤں کو پڑھایا تھا۔ اُن سے معمولی کتابیں کریما خالق باری آمدنامہ وغیرہ پڑھیں جب مولوی حمید الدین کا انتقال ہوگیا تو اور لوگ پڑھانے پر نوکر ہوتے رہے۔ اُنہوں نے فارسی میں گلستاں، بوستاں اور ایسی ہی ایک آدھ اور کتاب سے زیادہ نہیں پڑھا پھر عربی پڑھنی شروع کی۔ عربی میں شرح مُلّا۔ شرح تہذیب، میبذی، مختصر معانی، اور مطوّل ما أنا قلتُ تک پڑھی، مگر طالب علموں کی طرح نہیں بلکہ نہایت بے پروائی اور کم توجہی کے ساتھ۔ اس کے بعد اُن کو اپنے خاندانی علم یعنی ریاضی پڑھنے کا شوق ہوا جس میں اُن کی ننہیال کے لوگ دلی میں اپنا مثل نہ رکھتے تھے اُنھوں نے اپنے ماموں نواب زین العابدین خاں سے حساب کی معمولی درسی کتابیں، تحریر اقلیدس کے چند مقالے، ہیأت میں شرح چغمینی تک، اور ایک آدھ رسالہ متوسطات کا (جو مجسطی سے پہلے پڑھائے جاتے ہیں) پڑھا۔ مگر تمام رسالے متوسطات کے نہیں پڑھے اور نہ مجسطی کے پڑھنے کی نوبت پہنچی کیونکہ آلات رسد کا زیادہ شوق ہوگیا تھا۔ چنانچہ آلات رصد برجندی، اور چند رسالے مثل اعمال کرہ اعمال اصطرلاب رسالہ صنعت اصطرلاب، ربع مقنطر، ہلزون، جریب الساعۃ، پرکار تقسیم، پرکار تناسب اپنے ماموں سے پڑھے۔ اُسی زمانہ میں طب پڑھنے کا شوق ہوگیا۔ حکیم غلام حیدر خاں سے جو ایک خاندانی حکیم تھے طب کی ابتدائی کتابیں مثل قانونچہ اور موجز وغیرہ پڑھنے کے بعد معالجات سدیدی شرح اسباب اور نفیسی امراض عین تک پڑھی اور چند ماہ تک اُن کے پاس مطب بھی کیا۔ پھر پڑھنا چھوڑ دیا۔ جب اُنھوں نے پڑھنا چھوڑا ہے اُس وقت ان کی عمر اٹھارہ انیس برس کی تھی اس کے بعد بطور خود کتابوں کے مطالعہ کا برابر شوق رہا۔ اور دلّی میں جو اہل علم اور فارسی دانی میں نامآور تھے جیسے صہبائی، غالب، اور آزردہ وغیرہ اُن سے ملنے کا اور علمی مجلسوں میں بیٹھنے کا اکثر موقع ملتا رہا۔ ۱۸۴۶ء میں جب کہ وہ فتحپور سیکری سے بدل کر دلّی کی منصفی پر آئے اُس وقت جیسا کہ آگے ذکر کیا جاوے گا۔ اُنھوں نے کسی قدر تحصیل علم میں ترقی کی۔

عنفوانِ شباب

سرسید کا عنفوان شباب نہایت زندہ دل اور رنگین صحبتوں میں گزرا تھا۔ وہ راگ رنگ

کی مجلسوں میں شریک ہوتے تھے۔ باغوں کی سیر کو دوستوں کے ساتھ جاتے تھے۔ اور وہاں راگ رنگ اور دعوتوں کے جلسوں میں شامل ہوتے تھے۔ ہولی کے جلسوں اور تماشوں میں جاتے تھے۔ پھول والوں کی سیر میں خواجہ صاحب پہنچتے تھے۔ اور وہاں کی صحبتوں میں شریک ہوتے تھے۔ دلّی میں بسنت کے میلے جو موسم بہار کے آغاز میں درگاہوں پر ہوتے تھے وہاں جاتے تھے۔ خود اُن کے نانا خواجہ فرید کی قبر پر جو نسٹھ کھمبے میں جو بسنت کا میلا ہوتا تھا اُس میں وہ اپنے اور بھائیوں کے ساتھ منتظم و مہتمم ہوتے تھے۔

اُس زمانہ میں خواجہ محمد اشرف ایک بزرگ دلی میں تھے۔ اُن کے گھر پر بسنت کا جلسہ ہوتا تھا۔ شہر کے خواص وہاں مدعو ہوتے تھے۔ نامی نامی طوائف زرد لباس پہنکر وہاں آتی تھیں۔ مکان میں بھی زرد فرش ہوتا تھا۔ دالان کے سامنے ایک چبوترہ تھا جس میں حوض تھا۔ اُس حوض میں زرد ہی پانی کے فوارے چھوٹتے تھے۔ صحن میں جو چمن تھا اُس میں ہزاراں زرد پھول کھلے ہوئے ہوتے تھے۔ اور طوائف باری باری بیٹھکر گاتی تھیں۔ سرسید کہتے تھے کہ "میں ہمیشہ وہاں جاتا تھا اور اس جلسہ میں شریک ہوتا تھا۔"

خود سرسید کے ماموں نواب زین العابدین خاں کے مکان پر بڑے بڑے نامی گویّے دہرپت اور خیال گانے والے جمع ہوتے تھے۔ میرناصر احمد جو دلی میں مشہور بین بجانے والے تھے وہ آتے تھے گانا ہوتا تھا اور بین بجتی تھی۔ اسی طرح خواجہ میر درد کے سجادہ نشین ہر مہینے کی چوبیسویں کو رات کے وقت ایک درویشانہ جلسہ کیا کرتے تھے۔ اُس میں بھی بڑے بڑے نامی گویّے آتے تھے۔ دہرپت اور خیال گاتے تھے۔ اور میرناصر احمد جو اُسی خاندان میں بیعت تھے بین بجانے میں اپنا کمال دکھاتے تھے۔ ان سب جلسوں میں سرسید اکثر شریک ہوتے تھے۔

ایک اور جلسہ رائے پران کشن کے مکان پر ہوتا تھا جو ایک معزز رئیس اور نہایت وضعدار تھے۔ جنّا نامی ایک طوائف نہایت خوش آواز دہرپت اور خیال گانے اور بین بجانے میں مشہور تھی۔ وہ اپنا پیشہ چھوڑ کر رائے پران کشن کے گھر میں پڑگئی تھی۔ اُس کی خاطر سے وہ ہر مہینہ کی سترہویں کو ایک جلسہ کیا کرتے تھے۔ شہر کے رئیس جن سے اُن کی دوستی تھی بلائے جاتے تھے۔ بڑے بڑے گویّے بہادر خاں، تارن اور میرناصر احمد سب جمع ہوتے تھے۔ سرسید کہتے تھے کہ "میرے ماموں نواب زین العابدین خاں ہمیشہ اس جلسے میں جاتے تھے۔ میں بھی بارہا اُن کے ہمراہ گیا ہوں۔"

جب وہ نوکر ہوکر آگرہ آگئے ہیں یہ وہ زمانہ ہے کہ صدر دیوانی عدالت آگرہ میں موجود ہی اور وہاں منشی امیر علی خاں، مولوی غلام امام شہید، مولوی غلام جیلانی، مولوی محمد شفیع۔ اور اور بہت سے

اشراف خاندانوں کے نامی وکیلوں اور عہدہ داروں کا مجمع ہے۔ یہ سب لوگ نہایت زندہ دل مرنج و مرنجان اور زندگی بے فکری و فارغ البالی کے ساتھ ہنسی اور خوشی میں گزارنے والے تھے۔ تاج گنج، اعتماد الدولہ اور نور افشاں میں وہ آئے دن عیش و نشاط کے جلسے کرتے تھے۔ سرسید نے بھی اُن جلسوں کی کیفیتیں دیکھی تھیں اور اُن میں شریک ہوئے تھے۔

سرسید جیسے بڑھاپے میں بذلہ سنج تھے جوانی میں اُس سے بھی زیادہ ظرافت اور حاضر جوابی اُنکی طبیعت میں تھی۔ دلی میں ایک مشہور طوائف شیریں جان نامی نہایت حسین تھی مگر سُنا ہے کہ اُس کی ماں بھدی اور سانولے رنگ کی تھی۔ ایک مجلس میں جہاں وہ اپنی ماں کے ساتھ مجرے کے لئے آئی تھی سرسید بھی موجود تھے اور وہیں اُن کے ایک قندھاری دوست بھی بیٹھے تھے۔ وہ اُس کی ماں کو دیکھکر بولے "مادرش بسیار تلخ ست" سرسید نے یہ مصرع پڑھا "گرچہ تلخ ست ولیکن برشیریں دارد"

سرسید کا مذکورہ بالا جلسوں اور صحبتوں میں شریک ہونا آخر کار رنگ لائے بغیر نہ رہا۔ اگرچہ اُس وقت تک دلی کے مسلمانوں میں قدیم سوسائٹی کی بہت سی خوبیاں باقی تھیں لیکن چونکہ اُن کے اقبال کا خاتمہ ہو چکا تھا اس لئے اُن کی سوسائٹی میں اُن خرابیوں کی آہستہ آہستہ بنیاد پڑتی جاتی تھی جن کو تنزل اور ادبار کا پیش خیمہ سمجھنا چاہیئے۔ طبیعتیں عموماً عیش و نشاط اور راگ رنگ کی طرف مائل ہوتی جاتی تھیں بے فکر امیرزادے عیاشی اور لہو و لعب کی مثالیں قائم کرتے جاتے تھے اور خربوزوں کو دیکھ کر خربوزے رنگ پکڑتے جاتے تھے۔ اگرچہ سرسید سترہ یا اٹھارہ برس کی عمر میں متاہل ہو گئے تھے پھر بھی وہ اس متعدی مرض کے اثر سے اپنے تئیں نہ بچا سکے۔ لیکن۔ جیسا کہ معتبر ذریعوں سے معلوم ہوا ہے۔ باوجود غایت دلبستگی کے جو جنون سے کسی طرح کم نہ تھی۔ سرسید نے جس حیرت انگیز طریقہ سے اپنے تئیں اس دلدل سے نکالا وہ درحقیقت اُن کی زندگی کا ایک بہت بڑا کارنامہ ہے جس کو اُن کی اخلاقی طاقت کا سب سے پہلا کرشمہ سمجھنا چاہیئے۔ گویا یہ شعر اُس وقت اُن کے حسب حال تھا۔

ہزار دام سے نکلا ہوں ایک جنبش میں — جسے غرور ہو آئے کرے شکار مجھے

مولانا جلال الدین رومی کے سامنے ایک زاہد کی اس طرح تعریف کی گئی کہ اُس نے تمام عمر میں کسی بُرے کام کا ارتکاب نہیں کیا۔ مولانا نے یہ سُن کر فرمایا "کاش کردے وگزشتے" یعنی نسبت اس کے کہ آدمی عمر بھر کوئی بُرا کام نہ کرے اور ایک حالت پر ٹھیرا رہے یہ بہت بہتر ہے کہ وہ بُرے کام کا ارتکاب کرکے حالت موجودہ سے ترقی کر جائے۔ مولانا کا یہ ارشاد جیسا سرسید کے حال پر منطبق ہوتا ہے اُس سے بہتر شاید ہی کوئی اُس کا مصداق ہو سکے۔

منجملہ دیگر اسباب کے جو اس تبدیلی حالت کے باعث ہوئے سب سے بڑا سبب سرسید کے بڑے بھائی کا قبل از وقت انتقال کرنا تھا دونوں بھائیوں میں محبت اور اتحاد اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ شہر میں اُس کی نظیر دی جاتی تھی۔ سرسید کے بھائی کا یہ قول تھا کہ "کیسی ہی عیش ونشاط کی مجلس ہو اگر سید وہاں نہ ہو تو مجھکو وہ مجلس جہنم معلوم ہوتی ہے" ایسا ہی حال سرسید کا اپنے بھائی کے ساتھ تھا چنانچہ بھائی کے مرتے ہی ان کا دل رنگین صحبتوں سے بالکل اُچاٹ ہو گیا۔ لباس اور وضع میں جو اُس وقت بانکپن سمجھا جاتا تھا یک قلم ترک کر دیا۔ سر گھٹوا لیا، داڑھی چھوڑ دی، پائچے تشرع کر لئے، کرتا پہن لیا، رنگین طبع نوجوانوں کی صحبت رفتہ رفتہ کم ہونے لگی اور روز بروز مولویت کا رنگ چڑھنے لگا کہ اُس وقت قوم میں یہی اعلیٰ درجہ ترقی انسانی کا سمجھا جاتا تھا، اور اگر غور کر کے دیکھا جائے تو اصلی ترقی تک پہنچنے کے لئے اس مرحلہ کا طے کرنا نہایت ضروری ہے جیسا کہ کہا گیا ہے۔

حور و جنت جلوہ بر زاہد کند در راہِ دوست   اندک اندک عشق در کار آورد بیگانہ را

سرسید نے بھی اپنی ایک تحریر میں اُس نوجوانی کی لغزش کی طرف اشارہ کیا ہے وہ قوم کی غفلت و بدمستی کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں "ہم بھی اسی رنگ میں مست تھے ایسی گہری نیند سوتے تھے کہ فرشتوں کے بھی اُٹھائے نہ اُٹھتے تھے۔ کیا کیا خیالات ہماری قوم کے ہیں جو ہم میں نہ تھے اور کونسی کالی گھٹائیں ہماری قوم پر چھا رہی ہیں جو ہم پر چھائی ہوئی نہ تھیں۔ جب رند تھے تو فرہاد سے بڑھکر تھے۔ جب زاہد خشک تھے تو نہایت ہی اکھڑ تھے۔ جو صوفی تھے تو رومی سے برتر تھے۔ اب خاکسار ہیں اور اپنی قوم کے غمخوار"

مگر سرسید کے بعض نہایت ثقہ رشتہ داروں سے سنا گیا ہے کہ اُنہوں نے جو کچھ اس غفلت کے زمانہ میں کیا اُس سے معدودے چند کے سوا کوئی متنفس واقف نہیں ہوا۔ وہ خود اسی معاملہ کے متعلق اپنی ایک تحریر میں لکھتے ہیں۔ "وہ ایک عجیب قسم کا زمانہ تھا۔ اُس زمانہ کے اشراف خاندانوں کے نوجوان جو کچھ کرتے تھے ایسی طرح پر کرتے تھے کہ کوئی اُس سے واقف نہ ہوتا تھا اور پردہ ڈھکا رہتا تھا۔ کوئی حرکت علانیہ بر ملا ہونے نہیں پاتی تھی۔ اُس زمانہ کے اشراف نوجوانوں کا مدار آمد اس مقولہ پر تھا کہ "اپنے جسم کے زخم کو ڈھانکے رکھو تاکہ لوگ اُسے دیکھکر نفرت نہ کریں" یہ ایک ایسی اچھی نصیحت ہے کہ گو انسان سے کوئی برائی ہو مگر اُس برائی کا بُرا ہونا دل سے نہیں جاتا اور انسان کے لئے یہی راستہ بُرائی سے نکلنے کا ہے"

دوسرا باب

سنہ ۱۸۳۸ء سے سنہ ۱۸۵۷ء تک

ملازمت، تالیف رسائل مذہبی تاریخی و علمی، خطاب بادشاہی، ترتیب آثار الصنادید، ترتیب تاریخ ضلع بجنور، تصحیح و تکمیل آئین اکبری

ملازمت

سنہ ۱۸۳۸ء میں جب کہ سرسید کے والد کا انتقال ہوا اُن کی عمر کچھ کم بائیس سال کی تھی۔ قلعہ سے اُن کے والد کو کئی جگہ سے تنخواہ ملتی تھی۔ چونکہ اُن کے والد اور راجہ سوہن لال میں اَن بَن تھی اور اُن کی زندگی ہی میں اُن کی تنخواہ میں کاٹ پھانس ہونے لگی تھی اب انتقال کے بعد قلعہ کی آمدنی میں سے صرف کچھ قدر قلیل تو سرسید کی والدہ کے نام جاری رہا باقی سب تنخواہیں بند ہوگئیں۔ اور چند ملکیں جو معافی کی تھیں وہ بھی بسبب حین حیات ہونے کے ضبط ہوگئیں۔ اس لیے سرسید کو گورنمنٹ کی نوکری کا خیال پیدا ہوا۔ ہر چند اُن کے رشتہ دار قلعہ سے قطع تعلق کرنے پر راضی نہ تھے مگر اُنھوں نے قلعہ کا سہارا یکقلم چھوڑ کر گورنمنٹ انگریزی کی نوکری اختیار کرنے کا مصمم ارادہ کرلیا۔ اُس وقت وہ عدالت کی کارروائیوں سے اور انگریزی قوانین سے محض ناواقف تھے۔ سب سے پہلے اُنھوں نے عدالت کی کارروائی سے اطلاع حاصل کرنی چاہی انکے خالو مولوی خلیل اللہ خاں اُس وقت دلّی میں صدر امین تھے۔ اُن سے درخواست کی کہ وہ اپنی کچہری میں اُن کو کام سیکھنے کی اجازت دیں۔ اُنھوں نے خوشی سے اجازت دیدی۔ اور سرسید نے وہاں کام سیکھنا شروع کیا چند مہینے اُن کو کام سیکھتے گزرے تھے کہ مولوی خلیل اللہ خاں نے اُن کو فوجداری کے خفیف مقدمات کا جو کہ فیصلہ کے لیے صدر امینی میں آتے تھے اپنی کچہری میں سرشتہ دار مقرر کردیا۔ سرسید کو اس کام پر کچھ بہت دن نہ گزرے تھے کہ مسٹر رابرٹ ہملٹن (جو کہ آخر کو سر رابرٹ ہملٹن ہوئے) دلّی میں جج ہوکر آئے۔ سرسید کو وہ پہلے سے جانتے تھے اس لیے یہ اُن سے ملنے کو گئے اور نوکری کی درخواست کی اُنھوں نے اُن کو عدالت سشن کا سرشتہ دار مقرر کرنا چاہا۔ لیکن اُنھوں نے اس کام کو مشکل جانکر انکار کیا۔ ہر چند صاحب جج نے بہت اصرار اور دلدہی کی کہ کچھ تردد کی بات نہیں ہے ہم تم سے

بہ سہولت کام لیں گے اور ہر ایک بات بتاتے رہیں گے مگر سرسید نے کہا کہ جس کام کی میں اپنے میں لیاقت نہیں پاتا اُس کو کیونکر قبول کر سکتا ہوں۔ غرضکہ بدستور صدر امینی میں کام کرتے رہے اتفاق سے اُنھیں دنوں میں مسٹر ہملٹن آگرہ کے کمشنر ہوگئے اور چلتے وقت سرسید کو ایک چٹھی کے ذریعہ سے اپنے جانشین مسٹر لینڈزی کے سپرد کر گئے۔ لیکن ابھی مسٹر لینڈزی سرسید کو کوئی عہدہ دینے نہیں پائے تھے کہ مسٹر رابرٹ ہملٹن نے اُن کو آگرہ میں بلا لیا اور فروری ۱۸۳۹ء میں کمشنری کے دفتر میں جو عہدہ نائب منشی کا خالی ہوا اُس پر مقرر کر دیا۔

یہاں سرسید نے بہت جلد قوانین مال سے واقفیت حاصل کر لی۔ اُس وقت کمشنری آگرہ کے ماتحت چند ضلعوں میں بندوبست کا کام جاری تھا اور بندوبست ہی کے متعلق بہت سا کام کمشنری میں تھا سرسید نے ترتیب دفتر کا ایک دستور العمل بنایا جس کے موافق تمام دفتر کمشنری کا مرتب کیا گیا۔

اُنھیں دنوں میں اُنھوں نے فارسی زبان میں ایک فہرست بطور نقشہ کے مرتب کی تھی جس کا نام جام جم رکھا تھا اور جو ۱۸۴۰ء میں چھپ کر شائع ہوئی۔ اس میں امیر تیمور صاحبقران سے لیکر ابوظفر سراج الدین بہادر شاہ تک مختلف خاندانوں کے ۴۳ بادشاہوں کا حال مختصر طور پر سترہ سترہ خانوں میں قلمبند کیا ہے۔

اسی زمانہ میں اُنھوں نے قوانین دیوانی متعلقہ منصفی کا ایک خلاصہ اس غرض سے تیار کیا کہ وہ عہدۂ منصفی ملنے کا ایک ذریعہ ہو۔ جب وہ خلاصہ تیار ہو چکا تو صاحب کمشنر نے اُس کو گورنمنٹ میں پیش کیا اور سرسید کے لیے عہدۂ منصفی کی سفارش کی۔ گورنمنٹ نے اُس پر یہ حکم دیا کہ جہاں منصفی خالی ہو سرسید احمد خاں کو اُس پر مقرر کیا جائے۔ لیکن ابھی اُن کو یہ عہدہ ملنے نہ پایا تھا کہ عہدہ منصفی کے لیے قواعد امتحان جاری ہوگئے۔ صاحب کمشنر نے اُن کو امتحان دینے کی ہدایت کی۔ اُنھوں نے خود بھی امتحان کی تیاری کی اور اپنے بڑے بھائی سید محمد خاں اور ماموں زاد بھائی حاتم علیخاں کو بھی امتحان دینے پر آمادہ کیا۔ سید محمد خاں نے پہلی دفعہ قانون کی طرف کم توجہ کی تھی اسلیئے وہ دوسرے سال امتحان میں پاس ہوئے مگر سرسید اور حاتم علی خاں نے پہلی ہی بار امتحان دے کر ڈپلوما حاصل کر لیا۔

امتحان کے بعد سرسید نے وہ خلاصہ چھاپ دیا اور اپنے بھائی کا نام بھی اُس میں شامل کر کے اس کا نام انتخاب الاخوین رکھا جس کو اُس زمانہ کے بعض ظریف دونوں بھائیوں کے اتحاد کی وجہ سے دم الاخوین کہتے تھے۔ خان بہادر منشی غلام نبی خاں اور میرے بھائی مرحومین کہتے تھے

کہ "یہ انتخاب منصفی کے امیدواروں کے لیے ایسا مفید نکلا کہ چند روز میں تمام صوبہ میں شائع ہوگیا - لوگوں کو اس سے بہت فائدہ پہنچا اور بہت سے امیدوار اُسی کی بدولت منصف ہو گئے"۔ ۱۸۸۴ء میں انجمن اسلامیہ لاہور نے جو سرسید کو ایڈریس دی تھی اُس میں بھی سرسید کے اِس احسان کا ذکر کیا تھا۔

دسمبر ۱۸۴۱ء میں مَین پوری کی منصفی خالی ہوئی اور ۲۴ - دسمبر کو وہ مَین پوری کے منصف مقرر ہوگئے - مگر ۱۰ - جنوری ۱۸۴۲ء کو مَین پوری سے تبدیل ہو کر فتحپور سیکری[۱] میں آ گئے اور اِس شہر میں چار برس تک منصف رہے - فتحپور میں جہاں اکبر کی خوابگاہ تھی حُسنِ اتفاق سے وہی عالیشان مکان سرسید کو رہنے کے لیے ملا تھا، یہ چاروں برس اُسی مکان میں گزرے -

رسائل مذہبی

اس زمانہ میں سرسید نے تین رسالے تالیف یا طبع کرائے ہیں (۱) جلاء القلوب بذکر المحبوب مؤلفہ ۱۲۵۵ء یہ مختصر رسالہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت، وفات، معجزات، اور دیگر حالات کے بیان میں اس لیئے لکھا تھا کہ مولود کی مجلسوں میں جتنے رسالے شائع تھے اُن میں صحیح روایتیں بہت کم تھیں - سرسید نے اس رسالہ میں اُس زمانہ کے خیالات کے موافق محض صحیح روایتوں پر اکتفا کیا تھا (۲) تحفۂ حسن[۲] مولفہ ۱۲۶۰ ہجری، یہ ترجمہ ہے تحفۂ اثنا عشریہ کے باب دہم اور باب دوازدہم کا، باب دہم میں وہ مطاعن جو شیعہ صدیق اکبر پر کرتے ہیں مع اُن کے جوابات کے مذکور ہیں اور باب دوازدہم میں تولّا اور تبرّا کا بیان ہے (۳) تسہیل فی جرِّ الثقیل مطبوعہ ۱۸۴۴ء یہ اُردو ترجمہ ہے بوعلی نام ایک عالم کے ترجمۂ فارسی موسوم بہ معیار العقول کا جو ابو ذریمنی کے عربی رسالہ سے فارسی میں ترجمہ کیا گیا تھا - اس رسالہ میں مصنف نے جرِّ ثقیل کے پانچ اُصول بیان کیے ہیں یعنی بھاری چیزوں کے اُٹھانے، سخت چیزوں کے چیرنے، اور جن چیزوں کا دبانا یا نچوڑنا دشوار ہو اُن کے دبانے یا نچوڑنے کے لیئے پانچ کلیں بتائی ہیں اور اُن کے بنانے اور استعمال کرنے کا طریقہ اور مختلف ترکیبیں بیان کی ہیں -

خطاب بادشاہی

اسی زمانہ میں بہادر شاہ نے سرسید کو اُن کا موروثی خطاب عنایت کیا - ۱۸۴۲ء میں جب وہ مَین پوری سے تبدیل ہو کر فتحپور میں آئے تو چند روز کے لیے بتقریب رخصت یا تعطیل دلّی آئے تھے - اُس زمانہ میں حکیم احسن اللہ خاں بادشاہ کے ہاں نیابت کا

---

[۱] یہ مشہور شہر اکبر نے ۹۸۰ ہجری میں جبکہ وہ دکن اور خاندیس فتح کرکے واپس آیا ہے آباد کیا تھا جو مدت دراز تک اکبر کا دار السلطنت رہا ہے ۱۲

[۲] اس ترجمہ کے سوا کبھی سرسید نے کوئی کتاب یا رسالہ یا آرٹیکل ایسا نہیں لکھا جس سے شیعوں پر اعتراض کرنا یا اُن کے اعتراضوں کا جواب دینا مقصود ہو ۱۲

کام کرتے تھے۔ اُنھوں نے بادشاہ سے سرسید کی تقریب کی کہ اُن کے دادا کا خطاب اُن کو ملنا چاہیئے، بادشاہ نے منظور کر لیا۔ اگرچہ سرسید کے دادا کا خطاب صرف جوادالدولہ تھا اور یہی خطاب لکھ کر حکیم احسن اللہ خاں نے پیش کیا تھا۔ مگر بادشاہ نے اُس میں عارف جنگ کا لفظ اپنی طرف سے اضافہ کر کے جوادالدولہ سید احمد خاں عارف جنگ کا خطاب سرسید کو عنایت کیا اور خطاب ملنے کی تمام رسمیں حسب قاعدہ ادا کی گئیں۔

۱۸۔ فروری ۱۸۴۶ء کو سرسید فتحپور سیکری سے دلی تبدیل ہو گئے۔ اُنھیں دنوں میں اُن کے بڑے بھائی کا عین عالم شباب میں انتقال ہوا تھا اور اُن کی والدہ پر یہ صدمہ نہایت سخت گزرا تھا۔ اس لئے اُنھوں نے خود درخواست کر کے اپنی بدلی کرالی تھی۔ ۱۸۴۶ء سے ۱۸۵۴ء تک تک کہ وہ مستقل صدرامین مقرر نہیں ہوئے دلی ہی میں رہے۔ اس عرصہ میں صرف دو دفعہ یعنی ایک بار ۱۸۵۰ء میں اور دوسری بار ۱۸۵۳ء میں قائم مقام صدرامین مقرر ہو کر رہتک جانے کا اتفاق ہوا۔

جس وقت وہ فتحپور سے بدل کر دلی میں آئے تھے اُس وقت اُن کی عمر انتیس برس کی تھی۔ یہاں آکر اُن کو یہ خیال ہوا کہ جو کتابیں ابتدا میں نہایت کم توجہی اور بے پروائی سے پڑھی تھیں اور اب بالکل نسیاً منسیا ہو گئی تھیں اُن کو از سر نو غور اور توجہ سے پڑھیئے۔ مولوی نوازش علی مرحوم جو دلی میں مشہور واعظ تھے اور تمام درسی کتابیں پڑھاتے تھے اُن سے کچھ پچھلی پڑھائی کو تازہ کیا اور کچھ فقہ میں مثل قدوری، شرح وقایہ، اور اُصول فقہ میں شاشی، نورالانوار، اور ایک آدھ اور کتاب پڑھی، مولوی فیض الحسن مرحوم سے مقامات حریری کے چند مقامے اور سبعہ معلقہ کے چند قصیدے پڑھے۔ اور مولانا مخصوص اللہ سے جو شاہ عبدالعزیز کے بھتیجے اور شاہ رفیع الدین کے خلف الصدق تھے حدیث پڑھنی شروع کی۔ مشکوۃ اور ایک حصہ جامع ترمذی کا اور کسی قدر اجزا صحیح مسلم کے پڑھے اور پھر قران مجید کی سند لی۔ بس اس سے زیادہ جیسا کہ سرسید خود اقرار کرتے تھے اُستاد سے اُنھوں نے کچھ نہیں پڑھا۔

آثار الصنادید

اُسی زمانہ میں جب کہ وہ دلی میں منصف تھے اُن کو عمارات شہر اور نواح شہر کی تحقیقات کا خیال ہوا، وہ کہتے تھے کہ "میں اپنی کل تنخواہ والدہ کو دیدیتا تھا، وہ اُس میں سے صرف پانچ روپیہ مہینہ اوپر کے خرچ کے لیئے مجھکو دیتی تھیں، باقی میرے تمام اخراجات اُنکے ذمہ تھے، جو کپڑا وہ بنادیتی تھیں پہن لیتا تھا اور جیسا کھانا وہ کھلاتی تھیں کھالیتا تھا"، اس کا سبب یہ تھا کہ اُن کی آمدنی گھر کے اخراجات کو مشکل سے مکتفی ہوتی تھی؛

اُن کے بڑے بھائی کا انتقال ہو چکا تھا جس سے سو روپیہ ماہوار کی آمدنی کم ہوگئی تھی۔ قلعہ کی تنخواہیں تقریباً کُل بند ہوگئی تھیں، باپ کی ملک بھی بسبب حین حیات ہونے کے ضبط ہوگئی تھی، کرایہ کی آمدنی بہت قلیل تھی، صرف سرسید کی تنخواہ کے سو روپیہ ماہوار تھے اور سارے کنبے کا خرچ تھا، سرسید ابتدا سے نہایت فراخ حوصلہ اور کشادہ دل تھے، خرچ کی تنگی کے سبب اکثر منقبض رہتے تھے، لہٰذا اُن کو یہ خیال ہوا کہ کسی تدبیر سے یہ تنگی رفع ہو۔ سید الاخبار جو اُن کے بھائی کا جاری کیا ہوا اخبار تھا کچھ تو اُس کو ترقی دینی چاہی اور کچھ عمارات دہلی کے حالات ایک کتاب کی صورت میں جمع کر کے شائع کرنے کا ارادہ کیا۔

سید الاخبار کا اہتمام اگرچہ برائے نام ایک اور شخص کے سپرد کر رکھا تھا مگر زیادہ تر سرسید خود اُس میں مضامین لکھا کرتے تھے، لیکن یہ اخبار ایک مدت جاری رہ کر بند ہوگیا، مگر عمارتوں کی تحقیقات نہایت محنت اور عجلت کے ساتھ برابر جاری رہی، سرسید ہمیشہ تعطیلوں میں عمارات بیرون شہر کی تحقیقات کے لیے شہر کے باہر جاتے تھے، اور جب کئی دن کی تعطیل ہوتی تھی تو رات کو بھی اکثر باہر رہتے تھے۔ اُن کے ساتھ اکثر اُن کے دوست اور ہمدم مولانا امام بخش صہبائی مرحوم ہوتے تھے۔

باہر کی عمارتوں کی تحقیقات کرنی ایک نہایت مشکل کام تھا بیسیوں عمارتیں ٹوٹ پھوٹ کر کھنڈر ہوگئی تھیں۔ اکثر عمارتوں کے کتبے پڑھے نہ جاتے تھے، بہت سے کتبوں سے ضروری حالات معلوم نہ ہو سکتے تھے، اکثر کتبے ایسے خطوں میں تھے جن سے کوئی واقف نہ تھا، بعض قدیم عمارتوں کے ضروری حصے معدوم ہوگئے تھے، اور جو متفرق و پراگندہ اجزا باقی رہ گئے تھے اُن سے کچھ پتا نہ چلتا تھا کہ یہ عمارت کیوں بنائی گئی تھی اور اُس سے کیا مقصود تھا، کتبوں میں جن بانیوں کے نام لکھے تھے اُن کا مفصل حال دریافت کرنے کے لیئے تاریخوں کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت تھی، بعض عالی عمارتوں کی حالت ایسی متغیر ہوگئی تھی کہ اُن کی ماہیت معلوم ہونی مشکل تھی، پھر اکثر عمارتوں کے عرض و طول وارتفاع کی پیمائش کرنی، ہر ایک عمارت کی صورتِ حال قلمبند کرنی، کتبوں کے چربے اتارنے، اور ہر ایک کتبہ کو بعینہٖ اُس کے اصلی خط میں دکھانا، ہر ٹوٹی پھوٹی عمارت کا نقشہ جوں کا توں مصور سے کھچوانا، اور اسی طرح کچھ اوپر سوا سو عمارتوں کی تحقیقات سے عہدہ برآ ہونا، فی الحقیقہ نہایت دشوار کام تھا، سرسید کہتے تھے کہ وہ قطب صاحب کی لاٹھ کے بعضے کتبے جو زیادہ بلند ہونے کے سبب پڑھے نہ جا سکتے تھے اُن کے پڑھنے کو ایک چھینکا دو بلیوں کے بیچ میں ہر ایک کتبے کے محاذی بندھوا لیا جاتا تھا، اور میں خود اوپر چڑھ کر اور چھینکے میں بیٹھ کر ہر کتبے کا چربا اُتارتا تھا۔ جس وقت میں چھینکے میں بیٹھتا تھا تو مولانا صہبائی فرطِ محبت کے سبب بہت گھبراتے تھے

اور خوف کے مارے اُن کا رنگ متغیر ہو جاتا تھا۔" سر سید کی آیندہ ترقیات کی گویا یہ پہلی سیڑھی تھی اور اُنکی یہ حالت بالکل ابو تمام کے اس شعر کی مصداق تھی ؏

ویصعد حتی یظن الوری بان لہ حاجۃ فی السماء

(یعنی وہ ایسے شوق سے اوپر چڑھ رہا ہو کہ لوگ سمجھتے ہیں اُس کو آسمان پر کچھ کام ہے)

باوجود اس قدر مشکلات کے آثار الصنادید کا پہلا اڈیشن ڈیڑھ برس کے اندر اندر چھپکر تیار ہو گیا اس اڈیشن میں چار باب تھے پہلا باب عمارات بیرون شہر کے بیان میں دوسرا باب لال قلعہ اور اُس کی عمارتوں کے بیان میں تیسرا باب خاص شہر شاہجہاں آباد کی عمارتوں وغیرہ کے بیان میں چوتھا باب دلی کے مشہور اور نامور لوگوں کے ذکر میں جو سر سید سے کچھ پہلے یا اُن کے زمانہ میں موجود تھے پہلے باب میں تقریباً ۱۳۰ عمارتوں کا بیان ہے جن میں ہندو اور مسلمان دونوں کی عمارتیں شامل ہیں۔ اور چند کے سوا باقی ہر عمارت کا کتبہ اور نقشہ اُس کے ساتھ دیا گیا ہے۔ دوسرے باب میں ۲۲ عمارتوں کا بیان اور اُس کے نقشے اور کتبے مندرج ہیں۔ تیسرے باب میں تقریباً ۷۰ حویلیوں، مسجدوں، مندروں، بازاروں، باولیوں، اور کوؤں وغیرہ کا بیان ہے۔ چوتھے باب میں اول کسی قدر اُن شہروں، قلعوں اور محلوں وغیرہ کا بیان ہے جو سمت ۱۰۸۷ بکرمی سے لیکر آخر تک وقتاً فوقتاً اس سرزمین میں آباد ہوئے۔ اُس کے بعد یہاں کی آب و ہوا اور زبان اُردو کا ذکر ہے۔ پھر مشاہیر اہل دہلی کا حال لکھا ہے جس میں ایکسو بیس مشائخ، علما، فقرا، مجاذیب، اطبا، قرا، شعرا، خوشنویس، مصور، موسیقی داں وغیرہ کا بیان ہے۔ اگرچہ اس اڈیشن کی عبارت قدیم طرز کی رنگینی اور مبالغہ اور تکلفات باردہ کے سبب آج کل کے مذاق کے موافق بہت پھیکی اور بے مزہ ہو گئی تھی اور اُس کے سوا اُس میں اور بھی بہت سی کسریں اور فروگزاشتیں رہ گئی تھیں مگر مضمون کے لحاظ سے نہایت عبرت خیز تھی، اول کے تین باب پڑھکر سرزمین دہلی کی قدیم شان و شوکت اور عظمت کی تصویر آنکھوں کے آگے پھر جاتی ہے، اور تھوڑی دیر کو دنیا سے دل سرد ہو جاتا ہے، اور پچھلے باب سے دلی کا اخیر جھمکڑا آنکھوں کے روبرو آجاتا ہے اور تعجب ہوتا ہے کہ جس شہر میں پچاس ساٹھ برس پہلے قوم کے اس قدر اہل اللہ، اہل علم، اور اہل ہنر موجود تھے آج وہاں چاروں طرف سناٹا نظر آتا ہے۔

الغرض یہ اڈیشن ۱۸۴۷ء میں چھپکر شائع ہوا۔ اُسی زمانہ میں مسٹر ابرس کلکٹر و مجسٹریٹ شاہجہاں آباد ولایت جاتے تھے، وہ ایک نسخہ آثار الصنادید کا ساتھ لے گئے۔ اور وہاں جاکر اُس کو رائل ایشیاٹک سوسائٹی میں پیش کیا۔ ممبران سوسائٹی نے اُس کو بہت پسند کیا اور کورٹ آف ڈائرکٹرز

کے بعض ممبروں نے مسٹر رابرٹس سے کہا کہ اگر اس کتاب کا ترجمہ انگریزی میں ہو جائے تو بہت بہتر ہے۔ جب مسٹر رابرٹس ولایت سے واپس آئے تو اُنھوں نے سرسید کی شرکت سے اُس کا انگریزی ترجمہ کرنا چاہا۔ اُس وقت سرسید کو یہ خیال ہوا کہ جو کسریں پہلے اڈیشن میں رہ گئی ہیں اُن کی درستی اور اصلاح کی جائے۔ چنانچہ اُنھوں نے کتاب پر نظر ثانی کرکے اُس کو از سرِ نو مرتب کیا۔ جو کچھ ترمیم یا اصلاح یا اضافہ اُنھوں نے پہلے اڈیشن میں کیا ہے اُس کا مفصل ذکر طبع ثانی کے دیباچہ میں مندرج ہے، بڑی خوبی اِس نئے اڈیشن میں یہ ہے کہ اُس کی عبارت میں بہ نسبت پہلے اڈیشن کے نہایت سادگی ہے۔ اور اُس کا بیان ایشیائی مبالغوں اور تکلفات بارده سے بالکل پاک ہے۔ اس اڈیشن کے لیئے سرسید نے نقشے بھی از سرِ نو کمال اہتمام سے نہایت عمدہ تیار کرائے تھے، مگر ابھی چھپنے نہ پائے تھے کہ غدر ہوگیا اور وہ سب نقشے تلف ہوگئے۔ کچھ نقشے جو اَب ملے ہیں وہ محمدن اینگلو اورینٹل کالج کی لائبریری میں محفوظ ہیں، البتہ چوتھا باب جس میں دلّی کے مشاہیر کا حال لکھا گیا تھا وہ اس اڈیشن میں نہیں ہے۔ اس ترمیم و اصلاح کے باعث مسٹر اڈورڈ طامس ہوئے تھے جو اُس وقت دلّی میں سشن جج تھے۔ اُن کو پُرانی چیزوں کی تحقیقات کا نہایت شوق تھا اُنھیں کے کہنے سے سرسید نے آثار الصنادید کو از سرِ نو مرتب کیا تھا۔

یہ اڈیشن ۱۸۵۴ء میں چھپکر تیار ہوگیا تھا مگر نہ اس اڈیشن سے اور نہ پہلے اڈیشن سے سرسید کو جیسا کہ خیال تھا کچھ فائدہ نہیں ہوا۔ دوسرے اڈیشن کے تقریباً تمام نسخے غدر میں تلف ہوگئے۔ اور پہلے اڈیشن میں بھی ایک شخص کی بدعہدی کے سبب جو اُس کے چھاپنے کا ذمہ دار ہوا تھا سر نقصان رہا۔

مسٹر رابرٹس کلکٹر و مجسٹریٹ دہلی نے سرسید کی شرکت سے اُس کا ترجمہ کرنا شروع کیا تھا۔ مگر ابھی بہت کچھ ترجمہ کرنا باقی تھا کہ مسٹر رابرٹس کی دلّی سے تبدیلی ہوگئی، پھر معلوم نہیں کہ وہ ترجمہ پورا ہوا یا نہیں۔ اور کسی نے اُس کا ترجمہ انگریزی میں کیا یا نہیں۔ لیکن فرانس کے مشہور اورینٹلسٹ موسیو گارسن دتاسی نے ۱۸۶۱ء میں اُس کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں کرکے مشتہر کیا جس کی ایک جلد سرسید کو بھی بھیجی تھی۔ اسی ترجمہ کو دیکھکر لندن کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی نے سرسید کو سوسائٹی مذکور کا آنریری فیلو مقرر کیا تھا۔ چنانچہ ۱۸۶۴ء میں اول مسٹر رین ہولڈ راسٹ سکرٹری سوسائٹی موصوف کی چٹھی مورخہ ۲۰۔ جون ۱۸۶۴ء سرسید کے نام اس مضمون کی پہنچی کہ یورپ میں آپ کی کتاب کی بہت قدر کی گئی ہے اور بہ اتفاق رائے چند ممبران سوسائٹی آپ اس سوسائٹی کے آنریری ممبر مقرر ہوگئے ہیں۔ اس کے بعد جو ڈپلوما سوسائٹی نے سرسید کو بھیجا اُس کا ترجمہ ذیل میں لکھا جاتا ہے

لندن ۴ - جولائی ۔ ۱۸۶۴ء

گریٹ برٹن اور آئرلینڈ کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی نے زیر سرپرستی ہر موسٹ اکسلنٹ مجسٹی وکٹوریا آج کی تاریخ سید احمد خاں کو اس سوسائٹی کی آنریری ممبری کے ساتھ نامزد کیا جس کی سند میں یہ ڈپلوما ان کو ارسال کیا جاتا ہے۔

دستخط　　اڈورڈ کول بروک پریسیڈنٹ

دستخط　　ایچ رالنس ڈائرکٹر

دستخط　　رین ہولڈر اسٹ سکرٹری

اسی زمانہ میں جب کہ وہ دلی میں منصف تھے آثار الصنادید کے علاوہ اُنھوں نے اور بھی کئی رسالے لکھے ہیں جن کی تفصیل یہ ہے (۱) فوائد الافکار فی اعمال الفرجار مترجمہ ۱۸۴۶ء۔ یہ رسالہ ترجمہ ہے اُن فارسی مسودات کا جو کہ سرسید کے نانا نواب دبیر الدولہ نے پرکار متناسبہ کے اعمال پر (جو اُنھوں نے خود سوچ سوچ کر نکالے تھے) فارسی میں قلمبند کئے تھے۔ یہ مسودات سرسید کے ہاتھ آگئے تھے۔ اُنھوں نے دو انگریز عالموں کے کہنے سے ان مسودات کا ترجمہ اُردو میں کیا اور اس میں مثالیں اپنی طرف سے اضافہ کیں۔ (۲) قول متین در ابطال حرکت زمین۔ اس رسالہ میں قدیم خیالات کے موافق سرسید نے زمین کی حرکت کو جس کا اب تمام یوروپ قائل ہے غلط ثابت کرنا چاہا تھا۔ لیکن اب بہت مدت سے حرکت زمین کا انکار نہیں کرتے تھے بلکہ اُس کو یقینی جانتے تھے (۳) کلمۃ الحق مؤلفہ ۱۸۴۹ء۔ یہ رسالہ پیری مریدی اور بیعت کے طریقہ مروجہ کے برخلاف لکھا ہے (۴) راہ سنت در رد بدعت مولفہ ۱۸۵۰ء۔ یہ رسالہ وہابیت کے جوش کے زمانہ میں اہل بدعت کے برخلاف متبعین سنت کی تائید میں لکھا ہے (۵) نمیقہ در بیان مسئلہ تصور شیخ مرقومہ ۱۸۵۲ء۔ یہ رسالہ فارسی زبان میں بطور ایک فرضی یا واقعی مکتوب کے لکھا ہے جس میں تصور شیخ مصطلح مشائخ نقشبندیہ کو وسیلہ محبت خدا و محبت رسول و انبوب رحمت الٰہی بتایا ہے (۶) سلسلۃ الملوک مرتبہ ۱۸۵۲ء۔ یہ ایک مختصر مگر مفید اور صحیح فہرست اُن راجاؤں اور بادشاہوں کی ہے جو دلی میں پانچ ہزار برس سے نوبت بہ نوبت فرمانروا ہوتے چلے آئے۔ اُس میں راجہ جدھشٹر سے لیکر ملکہ معظمہ قیصر ہند تک ۲۰۲ فرمانرواؤں کا نام، باپ کا نام، سنہ جلوس، دار السلطنت، اور یہ کہ اُس کا عہد کس زمانہ میں تھا نہایت تحقیق اور جانفشانی سے لکھا ہے۔ اصل میں یہ وہی فہرست ہے جو آثار الصنادید کے دوسرے اڈیشن میں پہلے باب کے ساتھ اضافہ کی گئی ہے۔ اسی کو کسی قدر اصلاح کے بعد علحدہ چھاپ کر اُس کا نام سلسلۃ الملوک رکھ دیا ہے (۷)

آغاز کیمیائے سعادت کے چند اوراق کا ترجمہ مرقومہ ۱۸۵۳ء۔ بس اس کے سوا دلّی کی منصفی کے زمانہ میں سرسید نے اور کوئی کتاب یا رسالہ نہیں لکھا۔

دلّی سے بجنور کو تبدیل ہونا

سرسید دلّی میں۔ جب کہ آثارالصنادید کو ترتیب دے رہے تھے۔ درجہ اول کے منصف ہو گئے تھے اور اب اُن کا نمبر صدر امینی کا تھا۔ لیکن کچھ تو اس وجہ سے کہ اُس وقت دلّی میں ہر قسم کے اہلِ کمال اور اہلِ علم موجود تھے اور مسلمانوں کی سوسائٹی میں کسی قدر جان باقی تھی، اور کچھ عمارتوں کی تحقیقات کے ذوق و شوق میں۔ وہ دلّی سے باہر جانا پسند نہیں کرتے تھے، ایک آدھ بار جو اُن کو قائم مقام صدر امین مقرر کر کے کہیں باہر بھیجنا چاہا تو اُنھوں نے انکار کر دیا۔ رہتک میں جب وہ قائم مقام صدر امین ہوگئے اُس کا سبب یہ تھا کہ وہ چند روز کے لیے ایک خاص کام پر بھیجے گئے تھے۔ ۱۸۵۴ء میں جب آثارالصنادید کا دوسرا اڈیشن بھی نکال چکے تھے۔ اتفاق سے مسٹر اڈورڈ طامس۔ جو دلّی میں جج رہ چکے تھے اور جن کے ایما سے آثارالصنادید کی دوبارہ اصلاح کی گئی تھی۔ کہیں سے آگرہ میں وارد ہوئے۔ اور صدر بورڈ کے حکام سے ملنے کو بورڈ میں چلے گئے۔ اُس وقت بجنور کی صدر امینی خالی تھی اور صدر امینی کے امیدواروں کی فہرست بورڈ میں پیش تھی۔ طامس صاحب نے سرسید کا نام یاد دلایا۔ بورڈ کے ممبروں نے کہا کہ وہ دلّی سے باہر جانا نہیں چاہتے۔ اس لیے ان کا نام امیدواروں کی فہرست سے خارج کر دیا گیا ہے طامس صاحب نے کہا کہ وہ قدیم عمارات دہلی کی تحقیقات میں مصروف تھے سو وہ کام ختم ہو گیا ہے، اب اُن کو دلّی سے باہر جانے میں کچھ عذر نہ ہوگا۔ اور ایک چٹھی سرسید کو لکھی کہ تم کو بجنور میں صدر امینی پر بھیجنے کی تجویز ہو گئی ہے اب تم ہرگز انکار نہ کرنا، اسلیے سرسید کو لاچار دلّی چھوڑنی پڑی۔ چنانچہ ۱۲۔ جنوری ۱۸۵۵ء کو وہ مستقل صدر امین مقرر ہو کر دلّی سے بجنور کو تبدیل ہو گئے۔ بجنور میں سوا دو برس اُن کو گزرے تھے کہ غدر ہو گیا۔ اس تھوڑے سے عرصہ میں اُنھوں نے اپنے فرائضِ منصبی کے علاوہ فرصت کے وقتوں میں دو کام نہایت سخت محنت کے کیے جو ذکر کے قابل ہیں، ایک ضلع بجنور کی تاریخ کا مرتب کرنا، دوسرے آئینِ اکبری کی تصحیح اور تکمیل۔

ضلع بجنور کی تاریخ

جس زمانہ میں سرسید بجنور کو تبدیل ہو کر گئے اُنھیں دنوں میں ایک سرکلر محکمۂ صدر بورڈ سے تمام صاحبانِ ضلع کے نام اس مضمون کا جاری ہوا تھا کہ جس ضلع کا بند و بست ختم ہو جائے اُس ضلع کی ایک مفصل تاریخ لکھوائی جائے، یہ سرکلر پہلے سے صاحب کلکٹر کے دفتر میں آیا ہوا تھا مگر ابھی تک اُس پر کچھ عملدرآمد نہ ہوا تھا۔ ایک روز صاحب کلکٹر نے سرسید سے اُس کا ذکر کیا۔ اُنھوں نے کہا کہ اس ضلع کی تاریخ میں لکھوں گا۔ صاحب کلکٹر بہت خوش ہوئے اور محکمۂ بند و بست میں

حکم بھیجا کہ جس پرگنہ یا گاؤں کے کاغذات صدر امین صاحب طلب کریں فوراً اُن کے پاس بھیجدیئے جائیں اور اسی طرح تمام تحصیلداروں کو ہدایت کی گئی کہ جس قانونگو یا پٹواری کو وہ بلائیں یا جو کاغذات وہ منگوائیں اُن کے حکم کی تعمیل کی جائے۔ سرسید نے یہ تاریخ بھی اپنی جبلی عادت کے موافق نہایت تحقیق اور کاوش اور محنت کے ساتھ لکھی، اُن کا بیان یہ ہے کہ "گو اس تاریخ میں ضلع کے حالات کے سوا کوئی عام دلچسپی کی بات نہ تھی مگر اثنائے تحقیقات میں بعض قانونگویوں کے پاس اکبر اور عالمگیر کے زمانہ کے ایسے کاغذات ملے جن سے نہایت عمدہ نتیجے نکلتے تھے۔ اُن سب کاغذات کی نقلیں اپنے اپنے موقع پر اُس تاریخ میں درج تھیں۔ جب یہ تاریخ لکھی جا چکی تو صاحب کلکٹر نے اُس کو ملاحظہ کے لیے صدر بورڈ میں بھیجدیا۔ ابھی وہ بورڈ سے واپس نہ آئی تھی کہ غدر ہو گیا اور آگرہ میں تمام دفتر سرکاری کے ساتھ وہ بھی ضائع ہو گئی۔ مسٹر شیکسپیر کلکٹر ضلع بجنور اسی تاریخ کی نسبت اپنی چٹھی مورخہ ۵۔ جون ۱۸۵۸ء میں لکھتے ہیں کہ "سید احمد خاں ان باتوں کی طرف بھی متوجہ ہوتے ہیں جو اُن کے خاص کام سے علاقہ نہیں رکھتیں۔ چنانچہ انھوں نے اس ضلع کی تاریخ بھی بہت محنت کے ساتھ تیار کی تھی کہ غدر سے چند روز پہلے ہم نے یہ کتاب گورنمنٹ میں بھیجی تھی۔ اگر وہ اس وقت یہاں میرے پاس موجود ہوتی تو بہت بکار آمد ہوتی، مگر غالب ہے کہ آگرہ میں بباعث غدر کے تلف ہو گئی ہوگی،،

اسی تاریخ میں سرسید نے ایک لمبی بحث سنہ فصلی کے متعلق لکھی تھی اور جو غلطی سنہ فصلی اور سنہ عملی میں فرق نہ کرنے اور دو کو ایک سمجھنے سے سرکاری دفتروں میں ہمیشہ سے چلی آتی تھی اُس کو نہایت وضاحت کے ساتھ گورنمنٹ پر ظاہر کیا تھا اور جو مشکلات کہ اُس غلطی سے لازم آتی تھیں اُنکو جتایا تھا۔ گو یقیناً نہیں کہا جا سکتا کہ گورنمنٹ نے سرسید کی اُسی تحریر پر لحاظ کر کے اس غلطی کی اصلاح کی کیونکہ وہ تاریخ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں تلف ہو گئی تھی مگر واقعہ یہ ہے کہ صدر بورڈ کا ایک سرکلر ۱۸۶۰ء میں اور دوسرا ۱۸۶۱ء میں بہ منظوری گورنمنٹ جاری ہوا جن کی رو سے علاوہ سنہ فصلی اور سنہ حسابی کے ایک اور سنہ سنہ مالی کے نام سے مقرر کیا گیا جو بالکل سنہ عملی کے مطابق ہے اور جس سے وہ تمام مشکلات رفع ہو گئیں جو سرسید نے اپنی تاریخ میں جتائی تھیں، کچھ تعجب نہیں ہے کہ جو کچھ سرسید نے تاریخ بجنور میں اس امر کے متعلق لکھا تھا وہ بورڈ کے کسی ممبر کے ذہن میں محفوظ رہا ہو اور غدر کے دو تین برس بعد اُسی بنا پر سنہ مالی مقرر کیا گیا ہو، سرسید نے اسی سنہ فصلی کے مضمون پر ۱۸۶۶ء میں ایک نہایت مفید اور مفصل لکچر سائنٹفک سوسائٹی علیگڑھ میں دیا تھا جو ۹ جون ۱۸۶۶ء کے اخبار میں درج ہے۔ اس لکچر میں اُنھوں نے تقریباً وہ تمام خیالات ظاہر کیے ہیں جو سنہ فصلی کے متعلق تاریخ بجنور میں تحریر کیے گئے تھے۔

آئین اکبری کی تصحیح

جب سرسید دلّی میں منصف تھے۔ تو حاجی قطب الدین مرحوم نے جو دلّی کے ایک مشہور تاجر تھے اُن سے درخواست کی کہ اگر آپ آئین اکبری پر ایک تفصیلی نظر ڈال کر اُسکی تصحیح اور درستی کر دیں تو میں اُس کو چھپوا دوں اور اُس کے معاوضہ میں آئین اکبری کے چھپے ہوئے نسخے قیمتی ۱۷۰۰ سو لہ سو روپیے کے آپ نذر کروں گا۔ سرسید نے منصفی دہلی کی حالت میں وہیں کے ایک تاجر سے ایسا معاہدہ کرنا جائز نہ سمجھا۔ مگر چونکہ ایسے مفید اور دشوار کاموں میں اُن کا جی بہت لگتا تھا بجنور پہنچکر اُنھوں نے یہ کام شروع کیا۔

آئین اکبری اول تو زبان اور طرز بیان کے لحاظ سے ایک نئی طرح کی کتاب دوسرے جس قسم کے مضامین اُس میں بیان کیے گئے ہیں فارسی لٹریچر میں کبھی اُس قسم کے مضامین بیان نہیں ہوئے تھے اس لیے اُس کے پڑھنے سے جی اُلجھتا تھا۔ پھر آئین اکبری کے نسخے کاتبوں کے سہو و خطا سے اکثر مسخ ہو گئے تھے اس لیے اُس کا صحیح کرنا سخت دشوار تھا۔ سرسید نے اول جہاں تک مل سکے اُس کے متعدد نسخے بہم پہنچائے، اس میں ایک دو نسخہ صحیح بھی ملگیا اور اس طرح غلط اور صحیح نسخوں کے باہم مقابلہ کرنے سے ایک نسخہ سب سے زیادہ صحیح تیار ہو گیا۔ اس کے بعد اُنھوں نے فارسی، عربی، ترکی، ہندی، اور سنسکرت کے اکثر غریب الفاظ کی شرح کی۔ جو اصطلاحیں اکبر کے زمانہ میں ہر ایک آئین کے متعلق مستعمل تھیں یا خود ابوالفضل نے اختراع کی تھیں اُن کی جابجا تشریح کی۔ اُس زمانہ کے اوزان اور نقود کی اِس زمانہ کے اوزان و نقود سے مطابقت کی، جن جدولوں میں مصنف نے کچھ خانے خالی چھوڑ دیئے تھے اور تمام نسخوں میں وہ خانے خالی پائے گئے اُن کو اور کتابوں سے تحقیق کر کے معمور کیا۔ کہیں کہیں جدولوں میں جو خود مصنف نے غلطی کی تھی اُس کو بہت کوشش سے تحقیق کر کے صحیح کیا۔ بعض جدولوں میں ہندسوں کی جگہ حرف لکھے ہوئے تھے اُن کی قیمت ہندسوں میں بھی ظاہر کر دی۔ بعض جدولیں جو تمام نسخوں میں مختلف پائی گئیں وہ آئین کے انگریزی ترجمہ کے مطابق جس میں ہر جدول نہایت صحت کے ساتھ لکھی گئی تھی کتاب میں داخل کیں۔ اکثر جدولوں میں ایک خانہ اپنی طرف سے آخر میں اس لیے اضافہ کیا کہ اُس سے پہلے خانہ کا مفہوم ہر شخص بآسانی سمجھ جائے۔ جہاں آئین میں سکوں کا بیان ہے وہاں چند اوراق بطور حاشیہ کے اپنی طرف سے بڑھائے، اور اکبر کے زمانہ کے جس قدر سکے ابوالفضل نے بیان کیے تھے اُن میں سے ہر ایک سکہ کی دو دو تصویریں دے کر دونو طرف جو عبارت یا الفاظ تھے اُن کو دکھایا اور اکبر ہی کے زمانہ کے آٹھ سونے اور چاندی کے اُن کے علاوہ اور نشان دیئے۔ اس کے سوا اور بہت سی مفید باتیں اضافہ کیں۔

پھر اصل آئین میں خال خال تصویریں تھیں۔ سرسید نے نہایت محنت و جانفشانی اور حسن اہتمام سے بیشمار تصویریں دلی کے لائق مصوروں سے کھچوا کر کتاب میں اپنے اپنے موقع پر داخل کیں۔ مثلاً ٹکسال کے متعلق تقریباً پچاس پچپن تصویروں کے دو بڑے بڑے مرقع کھچوائے جن میں مختلف کاریگر اپنے اپنے آلات اور ظروف اوزار لیے ہوئے جدا جدا کام کر رہے ہیں۔ اسی طرح فلزات کے متعلق ترازوے ہوائی اور ترازوے آبی کی تصویر، شکار اور یورش کے موقع پر خیمہ گاہ بادشاہی کی تصویر، آئین چراغ خانہ کے متعلق اکبر کی آتش پرستی اور اُس کے تمام لوازمات کی تصویر، آئین شکوہ سلطنت کے متعلق تمام سامان تورک و احتشام کی تصویریں، فیلخانہ اور ہاتھیوں کی پوشش اور ہاتھیوں کی کشتی کی تصویریں، علیٰ ہذا القیاس تمام پھلدار اور پھولدار درختوں کی اور ہر ایک درخت کے ساتھ اُس کی شاخ اور برگ و ثمر یا پھول اور پتے کی تصویریں، اوراق گنجفۂ قدیم اور گنجفۂ مخترعۂ اکبری کی تصویریں اور تمام ہتیاروں اور زیوروں کی تصویریں، اور اُن کے سوا اور بہت سی تصویریں کھچوا کر کتاب میں شامل کیں، چنانچہ مسٹر ایچ بلاک مین پرنسپل کلکتہ کالج نے جو ۱۸۷۳ء میں آئین کا از سرِ نو ترجمہ کر کے چھاپا ہی اُس میں اُنھیں تصویروں کی نقل لی ہی جو سرسید نے فارسی آئین اکبری میں داخل کی تھیں۔

پہلی اور تیسری دو جلدیں اس طرح صحیح اور درست کر کے مطبع میں چھپنے کو بھیجدی گئیں۔ مگر دوسری جلد کی تصحیح میں یہ مشکل پیش آئی کہ ابو الفضل نے آئین خراج کے متعلق جو تمام ہندوستان کا محاصل لکھا تھا وہ حصہ تمام نسخوں میں مختلف پایا گیا اور کوئی ذریعہ اُس کی تصحیح کا نہ تھا۔ اتفاق سے دلی میں سرسید کے نانا نواب دبیر الدولہ کے وقت کی ایک کتاب نکل آئی جس میں سلطنت مغلیہ کے کل بادشاہوں کے عہد کا محاصل نہایت مفصل اور صحیح طور پر درج تھا۔ اس کتاب سے تمام محاصل جو اکبر کے زمانہ کا تھا نقل کر کے دوسری جلد بھی مکمل کی گئی اور ایک لمبا دیباچہ جو گویا آئین اکبری پر ایک مفصل ریویو تھا تحریر کر کے دوسری جلد کے ساتھ دلی میں چھپنے کو بھیجا، لیکن افسوس ہی کہ یہ جلد ابھی چھپنے نہ پائی تھی کہ غدر ہو گیا اور اُس کے جس قدر فرمے چھپے تھے وہ اور تمام مسودہ اور دیباچہ سب تلف ہو گئے۔ اب اُس آئین اکبری کی جو سرسید نے تصحیح کی تھی صرف پہلی اور تیسری دو جلدیں مطبوعہ ۱۲۷۲ھ ہجری کہیں کہیں پائی جاتی ہیں۔

دہلی کے جن نامور لوگوں کی تقریظیں آثار الصنادید کے آخر میں درج ہیں اُنھوں نے آئین اکبری پر بھی نظم یا نثر میں تقریظیں لکھی تھیں۔ مگر آئین کے آخر میں صرف مولانا صہبائی کی تقریظ چھپی ہے

مرزا غالب کی تقریظ جو ایک چھوٹی سی فارسی مثنوی ہی وہ کلیات غالب میں موجود ہی مگر آئین اکبری میں سرسید نے اُس کو قصداً نہیں چھپوایا۔ اس تقریظ میں مرزا نے یہ ظاہر کیا ہی کہ ابو الفضل کی کتاب اس قابل نہ تھی اُس کی تصحیح میں اس قدر کوشش کی جائے چنانچہ کہتے ہیں۔

مژدہ یاراں را کہ این دیرین کتاب یافت از اقبال سید فتح باب
دیدہ بینا آمد و بازو قوی کہنگی پوشید تشریف نوی
دین کہ در تصحیح آئین رای اوست ننگ و عار ہمت والای اوست

اس کے بعد بہت سے اشعار اس مضمون کے لکھے ہیں کہ تعریف کے قابل انگریزوں کے آئین و ایجاد و اختراع ہیں نہ کہ اکبر اور ابو الفضل کے۔ اور تمثیلاً انگریزوں کے بہت سے ایجادات بیان کیے جب یہ تقریظ مرزا نے سرسید کو بھیجی اُنھوں نے اُس کو مرزا کے پاس واپس بھیجدیا اور لکھا کہ ایسی تقریظ مجھے درکار نہیں،[۵] ایک عربی تقریظ نواب مصطفے خاں مرحوم کی بھی ہی مگر وہ بھی شاید دیر میں پہنچنے کے سبب نہیں پائی، اُنھوں نے بھی اپنی تقریظ کے آخر میں ایک فارسی شعر ایسا لکھا ہی جس سے معلوم ہوتا ہی کہ اُن کے دل میں بھی آئین اکبری کی کچھ زیادہ وقعت نہ تھی۔

مگر اہل یورپ اس کتاب کو ہندوستان کی تاریخوں میں ایک بے نظیر کتاب سمجھتے ہیں سنہ ۱۷۷۶ء سے اہل فرانس اور انگریز اس کی طرف متوجہ ہوئے ہیں اُس وقت سے سنہ ۱۸۷۳ء تک اُس کے متعدد ترجمے اور خلاصے فرنچ اور انگلش میں ہو چکے ہیں، مسٹر بلاک مین جنھوں نے سنہ ۱۸۷۳ء میں انگریزی میں نہایت احتیاط کے ساتھ اُس کا ترجمہ کر کے شائع کیا تھا اُسکی نسبت لکھتے ہیں کہ "یہ کتاب مسلمانوں کی تاریخوں میں

---

[۵] سرسید کہتے تھے کہ جب میں مرادآباد میں تھا اُسوقت مرزا صاحب نواب یوسف علی خاں مرحوم سے ملنے کو رام پور گئے تھے اُنکے جانے کی تو مجھے خبر نہیں ہوئی مگر جب دلی کو واپس جاتے تھے میں نے سنا کہ وہ مرادآباد میں سرائے میں آکر ٹھیرے ہیں میں فوراً سرائے میں پہنچا اور مرزا صاحب کو مع اسباب اور تمام ہمراہیوں کے اپنے مکان پر لے آیا ظاہراً جب سے کہ سرسید نے تقریظ کے چھاپنے سے انکار کیا تھا وہ مرزا سے اور مرزا اُن سے نہیں ملے تھے اور دونو کو حجاب دامنگیر ہو گیا تھا اور اسی لیئے مرزا نے مرادآباد میں آنیکی اُن کو اطلاع نہیں دی تھی۔ الغرض جب مرزا سرائے سے سرسید کے مکان پر پہنچے اور پالکی سے اُترے تو ایک بوتل اُن کے ہاتھ میں تھی اُنھوں نے اُسکو مکان میں لاکر ایسے موقع پر رکھدیا جہاں ہر ایک آتے جاتے کی نگاہ پڑتی تھی سرسید نے کسوقت اُسکو وہاں سے اُٹھا کر اسباب کی کوٹھری میں رکھدیا مرزا نے بوتل کو وہاں نہ پایا تو بہت گھبرائے سرسید نے کہا آپ خاطر جمع رکھیے میں نے اُسکو بہت احتیاط سے رکھدیا ہی مرزا صاحب نے کہا بھئی مجھے دکھا دو تم نے کہاں رکھی ہی اُنھوں نے کوٹھری میں لیجا کر بوتل دکھا دی آپ نے اپنے ہاتھ سے بوتل اُٹھا کر دیکھی اور مسکرا کر کہنے لگے کہ بھئی اسمیں تو کچھ خیانت ہوئی ہی سچ بتاؤ کس نے پی ہی شاید اسی لیئے تم نے کوٹھری میں لاکر رکھی تھی حافظ نے سچ کہا ہی ؏ واعظاں کایں جلوہ در محراب و منبر میکنند + چوں بخلوت میروند آں کار دیگر میکنند + سرسید ہنسکے چپ ہو رہے اور اسطرح وہ رکاوٹ جو کئی برس سے چلی آتی تھی مرتفع ہو گئی مرزا دو ایک دن وہاں ٹھیر کر دلی چلے آئے۔ ۱۲

جو ہندوستان میں لکھی گئی ہیں اپنا نظیر نہیں رکھتی یہ فی الواقع اُس سلطنت کی جو ۱۵۹۰ء کے قریب تھی ایک ایڈمنسٹریشن رپورٹ اور نقشہ جات ہیں جن میں اکبر کے عہد کے وہ تمام حالات اور واقعات درج ہیں جن کے لئے ہم اس زمانہ میں ایڈمنسٹریشن رپورٹوں، نقشوں، اور گزیٹیروں کی طرف رجوع کرتے ہیں۔"

پس سرسید کا ایک ایسی نادر الوجود کتاب کی تصحیح و تہذیب میں کوشش بلیغ کر کے اُس کو از سر نو زندہ کرنا صرف یہی نہیں کہ وہ کوئی فضول کام نہ تھا بلکہ فی الحقیقہ پبلک پر ایک بہت بڑا احسان تھا اور مسلمانوں کے ایک نامور مصنف اور نامور بادشاہ کے کارنامہ کو دنیا کے سامنے ایک دلنشین صورت میں پیش کرنا تھا۔

غدر سے پہلے صرف سوا دو برس سرسید کا بجنور میں رہنا ہوا اسی قلیل عرصہ میں مذکورۂ بالا کاموں کے سوا اور اپنے فرائض منصبی کے علاوہ اور بھی چھوٹے چھوٹے مفید کام کرتے رہے۔ چونکہ اُن کی طبیعت کو تعمیر کے کام سے ایک خاص قسم کا لگاؤ تھا اس لیے صاحب کلکٹر نے کمیٹی رفاہ عام کا تمام کام اُن کے سپرد کر دیا تھا۔ وہی اُس کی رپورٹ لکھتے تھے اور وہی ضروری کاموں کے لئے روپیہ منگواتے تھے۔ اور ہر ایک کام کی خود نگرانی کرتے تھے۔ منجملہ اور کاموں کے ایک مفید کام اُنھوں نے یہ کیا کہ بجنور کی آبادی کے متصل شارع عام کے بیچوں بیچ مدت سے ایک نہایت چوڑا چکلا گڑھا پڑا ہوا تھا۔ اُسی رستے سے تمام گاڑیاں، گھوڑے، پیدل، اور سوار گزرتے تھے۔ بعض اوقات گاڑیاں اُلٹ جاتی تھیں، بیلوں کو نقصان پہنچتے تھے، برسات میں پانی بھر جاتا تھا، جس سے طرح طرح کی تکلیفیں لوگوں کو ہوتی تھیں، مدت سے یہ گڑھا چلا آتا تھا مگر کسی کو کچھ خیال نہ تھا۔ سرسید نے خاص اپنے اہتمام سے وہاں ایک پُل بندھوایا اور بجنور سے دارانگر تک ایک سڑک بنوا دی جس سے مسافروں کو بہت آسانی ہو گئی۔

تیسرا باب

سنہ ۱۸۵۷ء سے سنہ ۱۸۶۹ء تک

ایام غدر کی خدمات و واقعات، مراد آباد کی تبدیلی اور تاریخ سرکشی بجنور کی اشاعت، مراد آباد میں مدرسہ قائم کرنا، رسالہ اسباب بغاوت لکھکر اور چھپوا کر ولایت بھیجنا، ملکہ معظمہ کے اشتہار کا شکریہ، ایک میگزین موسوم بہ "لائل محمڈنز آف انڈیا" اردو اور انگریزی میں نکالنا، تحقیق لفظ نصاری پر ایک مختصر رسالہ لکھنا، انتظام قحط ضلع مراد آباد، تصحیح تاریخ فیروز شاہی، تفسیر توریت و انجیل، بی بی کا انتقال، غازیپور کی تبدیلی، غازیپور ہی میں سائنٹفک سوسائٹی قائم کرنا، غازیپور میں مدرسہ قائم کرنا، علیگڑھ کی تبدیلی، برٹش انڈین ایسوسیئشن قائم کرنا، اضلاع شمال مغرب میں تعلیمی کمیٹیوں کا مقرر کرنا، سائنٹفک سوسائٹی اخبار کا علیگڑھ سے نکلنا، ورنیکلر یونیورسٹی کے لئے تحریک، بنارس کی تبدیلی، اردو زبان اور فارسی خط کی حمایت، رسالہ طعام اہل کتاب، رسالہ علاج ہیضہ بموجب اصول ہومیوپیتھک

ایام غدر کا حال

جس واقعہ نے ہندوستان کی تاریخ میں سنہ ۱۸۵۷ء کے نام پر ایک سیاہ دھبا چھوڑا ہے۔ اور جو ہندوستان کی قوموں کی قسمت کا فیصلہ کرنے والا اور سرسید کے خیالات میں ایک انقلاب عظیم پیدا کرنیوالا تھا۔ وہ سرسید کو بجنور میں دیکھنا پڑا۔ اُن کو اس ضلع میں دو برس اور چار مہینے گزرے تھے کہ ۱۰۔ مئی سنہ ۵۷ء کو دلی میں بغاوت ہوئی اور ۱۲۔ کو یہ خبر بجنور میں پہنچ گئی، وہاں اُسوقت بیس یوروپین اور یوریشین عورتوں اور بچوں سمیت تھے، سرسید نے اس موقع پر اپنا پہلا فرض یہ قرار دے لیا تھا کہ جب تک دم میں دم باقی ہے ان بیس جانوں کے بچانے میں جہانتک ممکن ہو کوشش کی جائے، جو واقعات اور مصائب وہاں پیش آئے وہ نہایت دردانگیز ہیں۔ اور سرسید کی تاریخ سرکشی بجنور میں مفصل مذکور ہیں۔ اُن کی تفصیل دوبارہ لکھنی گویا اُن مصیبتوں کا پھر یاد دلانا اور رنج کو دوبالا کرنا ہے ع مصائب اُخری ذکرتلک المصائب

خلاصہ یہ ہے کہ سرسید نے اُس خطرناک موقع پر نہایت دلیری اور جوانمردی سے تمام مصیبت کے زمانہ میں یوروپین حاکموں کا جو وہاں موجود تھے ساتھ دیا۔ ہر ایک نازک وقت میں اُنکے ساتھ شریک اور گورنمنٹ کی وفاداری اور خیرخواہی میں شب و روز مستعد اور سرگرم رہے، جو لوگ گورنمنٹ

کے خیر خواہ تھے اپنی مستعدی اور سرگرمی سے اُن کے دل بڑھائے، اور جن کی نیتوں میں تزلزل اور تذبذب پایا اُن کو نیک صلاحیں دیں اور جہاں تک ممکن تھا اُن کے خیالات کی اصلاح کی۔ اور جیسا کہ اُس زمانہ کے دیکھنے والے بیان کرتے ہیں اور جیسا کہ خود یورپین افسروں نے اقرار کیا ہے۔ صرف سرسید ہی کی حسن تدبیر، دانائی، اور نیک دلی سے تمام یورپین اور عیسائی مرد اور عورتیں اور بچے صحیح و سالم وہاں سے نکل کر رُڑکی میں پہنچ گئے۔

مسٹر شکسپیر جو اُس زمانہ میں بجنور کے کلکٹر و مجسٹریٹ تھے گو سرسید کو باعتبار عہدہ کے اُن سے کچھ تعلق نہ تھا مگر مسٹر شکسپیر اور مسس شکسپیر سے اُن کی بہت راہ و رسم تھی۔ جب بجنور میں بغاوت کے آثار نمودار ہونے لگے اور حالت خطرناک ہوئی تو مسس شکسپیر بہت گھبرائیں۔ سرسید کو جب یہ حال معلوم ہوا تو جا کر اُن کی تشفی کی اور کہا کہ "جب تک ہم زندہ ہیں آپ کو گھبرانا نہیں چاہیئے جب آپ دیکھیں کہ ہماری لاش کوٹھی کے سامنے پڑی ہے اُس وقت گھبرانے کا مضائقہ نہیں"۔ مسٹر شکسپیر ہمیشہ سرسید کی اس شریفانہ تقریر کے شکرگزار رہے۔

سرسید کا یہ کہنا صرف زبانی نہ تھا بلکہ اُنھوں نے اپنے افعال سے اس قول کو سچ کر دکھایا تھا وہ تمام رات مسلح مع اور ہندوستانی افسروں کے صاحب کلکٹر کی کوٹھی پر پہرا دیتے تھے اور ہر طرح عورتوں اور بچّوں کی ڈھارس بندھواتے تھے، ساری رات کرسیوں پر بیٹھے یا کوٹھی کے آگے ٹہلتے یا شہر میں گشت کرتے گزر جاتی تھی، پلٹن نمبر ۲۹ کی تلنگوں کی ایک کمپنی سہارنپور سے بطور بدلی کے مراد آباد کو جاتی تھی، جب وہ بجنور میں پہنچی اور صوبہ دار اور کچھ تلنگے صاحب کلکٹر کی کوٹھی پر گئے سرسید سے کسی نے یہ کہدیا کہ یہ کمپنی بگڑ کر آئی ہے اور کچھ تلنگے اور صوبہ دار بہ ارادۂ فساد کلکٹر کی کوٹھی پر گئے ہیں۔ سرسید کو یقین ہو گیا کہ انگریزوں کی خیر نہیں، وہ اُسی وقت مسلح ہو کر کوٹھی کو روانہ ہو گئے اور اپنے صغیرسن بھتیجے کو جو تنہا چچا کے پاس تھا چلتے وقت اپنے آدمی کے سپرد کر گئے اور کہہ گئے کہ اگر میں مارا جاؤں تو لڑکے کو کسی امن کی جگہ پہنچا دیجیو، مگر کوٹھی پر پہنچکر معلوم ہوا کہ کمپنی مذکور بدلی پر مراد آباد جاتی تھی۔

وہ رات۔ جبکہ کلکٹر کی کوٹھی میں تمام یوروپین اور یوریشین مرد عورتیں اور بچے جمع تھے اور ایک جماعت کثیر جو بظاہر اُن کی حفاظت کے لیئے فراہم ہوئی تھی اُن کی نیتیں بگڑ گئی تھیں۔ اور کچھ فوج اور توپخانہ باغیوں کا اُن کی کمک کے لیئے مراد آباد سے عنقریب آنیوالا تھا۔ نہایت سخت تھی۔ اُس روز

۵۱ یعنی سید محمد احمد خاں سب جج سیتاپور حال پنشنر ۱۲

سب کے مارے جانے میں کچھ شبہ نہ تھا۔ ایسے نازک وقت میں سرسید تنہا اُس خود سر جماعت کے
مجمع میں گئے۔ اور نواب محمود خاں سے جو اُن کا سرغنہ تھا گفتگو کی، اور کہا کہ چند انگریزوں کے مار ڈالنے
سے کیا ہاتھ آئے گا؟ بہتر ہے کہ اُن کو صحیح و سالم یہاں سے جانے دو اور تم ملک کے مالک ہو جاؤ۔
ایسے ٹیڑھے وقت میں سرسید کے ہوش و حواس بالکل بجا اور درست رہے، اور محمود خاں سے ایسی
عمدہ گفتگو کی اور اس معاملہ کے متعلق تمام نشیب فراز ایسی خوبی سے سمجھائے کہ اُس نے فوراً منظور
کرلیا۔ اور سب انگریزوں کو اُسی رات اُس خونخوار مجمع سے نکال کر رڑکی روانہ کر دیا۔ اس موقع پر
کلکٹری کی طرف سے جو تحریر سرسید نے لکھکر نواب محمود خاں کو دی تھی اگر وہ اُس کے موافق عملدرآمد
کرتا تو اُس کو کسی طرح کا اندیشہ نہ تھا۔ بلکہ انگریزی تسلط ہو جانیکے بعد ضرور اُسکے ساتھ وہی سلوک کیا جاتا
جو اور خیرخواہوں کے ساتھ ہوا۔ مگر افسوس ہے کہ اُس نے انگریزوں کے چلے جانے کے بعد اُس پر کچھ لحاظ نہ کیا۔

انگریزوں کے رڑکی روانہ ہو جانے بعد سرسید اور اُن کے دوست میر تراب علی جو اُس زمانہ
میں بجنور کے تحصیلدار تھے اُسی رات کو لسی کوٹلہ جو بجنور سے چھ سات کوس ہے چلے گئے، مگر نواب
نے سوار بھیجکر اُن کو وہاں سے بُلایا، مجبوراً اُن کو پھر بجنور میں آنا اور نواب سے ملنا پڑا، اور ڈپٹی
رحمت خاں بھی ہلدور سے آپہنچے، نواب کی خواہش تھی کہ "یہ لوگ جب مجھسے ملنے آئیں تو نذریں پیش
کریں، مگر اُنھوں نے نذریں پیش نہیں کیں، نواب نے مکدر ہوکر اُن کو رخصت کر دیا اور کہا کہ بدستور بجنور میں اپنا اپنا
کام کرو۔ سرسید نے دیوانی کا کام اُسی طرح جس طرح کہ انگریزوں کے سامنے کرتے تھے کرنا شروع کیا، جو روبکاریاں
اور رپورٹیں صاحب جج کے ہاں بھیجنے کے قابل ہوتی تھیں اُن کی نسبت علی الاعلان کچہری میں یہ حکم تحریر
کرتے رہے کہ بحضور صاحب جج بہادر بھیجی جائیں۔ مطلب اس سے یہ تھا کہ عوام کو یہ خیال ہو کہ سرکار
انگریزی کا تسلط اور عملداری بدستور قائم ہے، مگر محمود خاں کو یہ امر ناگوار گذرتا تھا۔ محمود خاں نے پھر
ایک وزرات کے وقت سرسید کو بلایا۔ اُس وقت نواب اور اُس کا بھانجہ جو اُس کے مزاج پر بہت
حاوی تھا دونو موجود تھے۔ اُنھوں نے سرسید سے کہا کہ ہم چاہتے ہیں تم ہمارے ساتھ شریک ہو جاؤ
اور ہم سے اس بات پر حلف کر لو، جو جاگیر چاہو بعد نسلٍ ہم سے ٹھیرالو اور ہم سے حلف لے لو نہ
وہ جاگیر بحال رہیگی۔ سرسید کو اول تو جواب دینے میں تامل ہوا، مگر آخر کار اُن سے صاف کہدیا کہ
"میں اس بات پر بلا شبہ حلف کر سکتا ہوں کہ میں ہر حال میں تمہارا خیرخواہ رہونگا اور کسی وقت تمہاری بدخواہی نکرونگا
لیکن اگر تمہارا ارادہ ملک گیری کا اور انگریزوں سے لڑنے کا ہے تو میں تمہارے ساتھ شریک نہیں ہوں" سرسید
نے قسم یاد کر کے نواب سے کہا کہ "میں صرف تمہاری خیرخواہی کے لیے کہتا ہوں۔ آپ اس ارادہ کو دل سے

نکال ڈالیں، انگریزوں کی عملداری ہرگز نہیں جائیگی، اگر فرض کر لیا جائے کہ تمام ہندوستان سے انگریز چلے جائینگے تو بھی انگریزوں کے سوا ہندوستان میں کوئی عملداری نہ کر سکیگا، آپ سرکار کی اطاعت کو ہاتھ سے نہ دیں، اگر بالفرض انگریز جاتے رہے تو آپ نواب بنے بنائے ہیں آپ کی نوابی کوئی نہیں چھینتا، اور اگر میرا خیال صحیح ہے اور انگریزی سلطنت بدستور قائم رہی تو آپ خیرخواہ سرکار بنے رہینگے اور سرکار آپ کی نہایت قدر کریگی، اگر آپ مجھ کو انتظام میں شریک کرنا چاہتے ہیں تو صاحب کلکٹر سے اجازت منگا لیجئے اور یہ اقرار کیجئے کہ کوئی کام جب تک اُس کی منظوری صاحب کلکٹر سے نہ منگا لیں ہرگز نہ کرینگے" مگر نواب نے اُس کو منظور نہیں کیا، بلکہ وہ ناراض ہوا اور میں بہ جیں ہو کر سرسید کو رخصت کیا، اور ہر طرح اُن کی اور اُن کے ساتھیوں کی بُرائی کے درپے ہو گیا۔ جس مکان میں سرسید رہتے تھے اُس کو بہ جبر چھین لیا اور اپنی فوج کے افسروں کو دیدیا، جو اسباب سرسید کا اُس میں بند تھا وہ سب فوج کے افسروں نے لے لیا، اسی طرح میر تراب علی کا گھوڑا بہ جبر چھین لیا۔

اُنہیں دنوں میں ایک شخص منیر خاں نامی مع جمعیت چار سو آدمی کے نگینے سے بجنور میں آیا اور سرسید میر تراب علی اور ڈپٹی رحمت خاں کے قتل کے درپے ہوا اُن کو بہ جبر و تحکم طلب کیا اور کہلا بھیجا کہ اگر حاضر نہ ہوگے تو بہتر نہ ہوگا، سرسید اور میر تراب علی اُس کے پاس گئے، منیر خاں نے سرسید سے مسئلہ جہاد کے باب میں گفتگو کی۔ اُنھوں نے نہایت سنجیدگی سے اُس کو سمجھایا کہ شرع کے بموجب ہرگز جہاد نہیں ہے۔ اُس نے اُن کو رخصت کیا اور مولوی علیم اللہ رئیس بجنور کے پاس خود جا کر یہی مسئلہ پوچھا اُنھوں نے بڑی دلیری سے اُس کے ساتھ گفتگو کی اور بہت سی دلیلوں سے اُس کو قائل کیا کہ مذہب کی رو سے جہاد نہیں ہے۔ اُس روز مولوی علیم اللہ قتل ہوتے ہوتے بچے، دوسرے دن منیر خاں وہاں سے دلی چلا گیا اور وہاں جا کر لڑائی میں مارا گیا۔

سرسید برابر اس فکر میں تھے کہ کسی طرح بجنور سے نکلکر میرٹھ پہنچ جائیں، مگر کوئی موقع نہ ملتا تھا۔ اسی عرصہ میں ہلدور کے چودھریوں نے ایک انبوہ کثیر جمع کر کے محمود خاں کی فوج پر حملہ کیا۔ اور نواب شکست کھا کر بجنور سے نجیب آباد چلا گیا۔ سرسید نے اُس کی مفصل کیفیت اسپشل کمشنر میرٹھ کو لکھ بھیجی، وہاں سے حکم آگیا کہ تم سرکار کی طرف سے ضلع کا انتظام کرو اور ڈپٹی رحمت خاں اور میر تراب علی کو اپنے ساتھ شریک کر لو۔ اُنھوں نے ایک مہینے تک بہت اچھا انتظام رکھا، مگر باوجو سخت ممانعت اور روک تھام کے ہلدور کے چودھری نے نگینے پر حملہ کر کے کچھ آدمی مار ڈالے اور کچھ محلے لوٹ لیے۔ اب نواب محمود خاں کے گرد پھر ایک جمعیت کثیر جمع ہو گئی۔ نواب نے بجنور پر

حملہ کیا اور چودہری شکست کھاکر بھاگے۔ چونکہ سرسید کو نواب کی طرف سے خدشہ تھا وہ بھی ہلدور چلے گئے۔ مگر نواب نے ہلدور پر بھی حملہ کیا اور چودہریوں کو شکست دیکر ہلدور کے بہت سے مکانات جلادیئے سرسید اور ڈپٹی رحمت خاں رات کو ہلدور سے پیادہ پا اس ارادہ سے نکلے کہ میرٹھ چلے جائیں۔ رستے میں موضع پلانہ کی سرحد پر دو ہزار گنوار مسلح اُن کے لوٹنے اور مار ڈالنے کے ارادہ سے دوڑے۔ مگر بخشی نامی ایک پدہان نے اُن کو بچایا۔ جب وہاں سے چاندپور پہنچے تو کئی ہزار آدمیوں نے بندوقوں اور ہتیاروں سے اُن کو گھیر لیا۔ یہاں تک کہ میر صادق علیخاں رئیس چاندپور وہاں پہنچے اور سرسید اور ڈپٹی رحمت خاں کو اُس انبوہ سے نکال کر اپنے مکان پر لے گئے، دوسرے روز میر صادق علی نے خود ساتھ ہو کر اُن کو موضع چھولہ تک پہنچا دیا۔ وہاں سے سرسید نے بچھڑا اڈن پہنچکر بسبب علالت اور رستے کی کوفت کے چند روز مولوی محمود عالم کے مکان پر جو اُن کے دوست تھے مقام کیا۔ اور اپنی مفصل سرگذشت حکام انگریزی کو لکھ بھیجی اور چند روز بعد خود بھی میرٹھ چلے گئے۔ جس وقت وہ میرٹھ پہنچے ہیں اُن کے پاس چھ پیسے اور اُس پھٹے ہوئے کرتے کے سوا جو وہ پہنے ہوئے تھے اور کچھ نہ تھا۔

میرٹھ میں اُن کے پہنچنے اور بیمار ہونے کا حال سُنکر مسٹر کری کرافٹ ولسن جو کہ وہاں جج اور اسپشل کمشنر تھے اُن کے دیکھنے کو آئے اور سرسید سے کہا کہ "تم ایسے نمک حلال نوکر ہو کہ ایسے نازک وقت میں تم نے سرکار کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ باوجودیکہ ضلع بجنور میں ہندو مسلمانوں میں کمال عداوت تھی مگر جب تم کو اور ڈپٹی رحمت خاں کو ضلع سپرد کرنا چاہا تو تمہاری نیک خصلت اور اچھے چلن اور سرکار کی نہایت طرفداری کے سبب تمام ہندوؤں نے جو ضلع میں نامی چودہری اور بڑے رئیس تھے کمال خوشی اور آرزو سے تم مسلمانوں کا اپنے اوپر حاکم بننا قبول کیا بلکہ درخواست کی کہ تمہیں سب ہندوؤں پر ضلع میں حاکم بنائے جاؤ۔ سرکار نے بھی تم کو اپنا خیرخواہ اور نمک حلال نوکر جان کر کمال اعتماد کے ساتھ ضلع کی حکومت تم کو سپرد کی اور تم اسی طرح نمک حلال اور وفادار سرکار رہے۔ اسکے صلہ میں اگر تمہاری ایک تصویر بناکر پشت با پشت کی یادگاری اور تمہاری اولاد کی عزت اور فخر کے لیے رکھی جائے تو بھی کم ہے"

کچھ اوپر پانچ مہینے سرسید کو میرٹھ میں ٹھیرنا پڑا۔ میرٹھ میں اُن کو معلوم ہوا کہ دلی میں سرکاری فوج کے سپاہیوں نے اُن کا گھر اور تمام اسباب لوٹ لیا ہے۔ جب دلی میں سرکاری فوج پھیلنی شروع ہوئی اور کشمیری دروازہ فتح ہو چکا تو شہر کے تمام زن و مرد شہر چھوڑ چھوڑ کر چلدیئے تھے اور سرسید کا کنبا بھی جب کہ اُن کے ماموں وحیدالدین خاں اور اُن کے ماموں زاد بھائی ہاشم علیخاں سپاہیوں کے

ہاتھ سے مارے گئے سلطان نظام الدین چلا گیا تھا، مگر اُن کی والدہ اور خالہ دلّی ہی میں رہیں لیکن جب اُن کا گھر سارا لٹ گیا تو وہ حویلی کو چھوڑ کر جلو خانہ کی ایک کوٹھری میں جہاں زین نامے ایک لاوارث بڑھیا رہتی تھی چلی آئیں، اور آٹھ دن نہایت تکلیف سے اُس کوٹھری میں بسر کیے۔ اس عرصہ میں سرسید بھی وہاں پہنچ گئے۔ معلوم ہوا کہ تین دن سے اُن کے پاس کچھ کھانے کو نہ تھا کسی قدر گھوڑے کا دانہ مل گیا تھا اسی کو کھاتی رہیں۔ دو دن سے پانی بھی ہو چکا تھا اور پیاس کی نہایت تکلیف تھی۔ سرسید کہتے تھے کہ "جب میں نے کوٹھری کا دروازہ کھٹکھٹایا اور آواز دی تو اُنھوں نے کواڑ کھولے اور پہلا لفظ جو اُن کی زبان سے نکلا وہ یہ تھا کہ "یہیں! تم یہاں کیوں چلے آئے؟ یہاں تو لوگوں کو مار ڈالتے ہیں تم چلے جاؤ، ہم پر جو گزریگی گذر جائیگی"، میں نے کہا آپ خاطر جمع رکھیے میرے پاس حاکموں کی چٹھیاں ہیں اور میں ابھی قلعہ کے انگریزوں سے اور دلّی کے گورنر سے ملکر آیا ہوں، تب اُن کی خاطر جمع ہوئی، جب یہ مجھے معلوم ہوا کہ دو دن سے پانی نہیں پیا تو پانی کی تلاش میں نکلا۔ کوؤں پر کوئی ایسی چیز نہ ملی جس سے پانی نکالا جاسکے اور چاروں طرف سناٹے کا عالم تھا، میں سیدھا پھر قلعہ میں گیا اور وہاں سے ایک صراحی پانی کی لیکر چلا۔ جب اپنے گھر کے پاس پہنچا تو دیکھا کہ وہی زین بڑھیا سڑک پر بیٹھی ہے اور اُس کے ہاتھ میں مٹّی کی صراحی اور آبخورہ ہے اور کسی قدر دم تو اس ہے، وہ بھی پانی کی تلاش میں نکلی تھی۔ تھوڑی دور چلکر بیٹھ گئی، پھر اُٹھا نہ گیا، میں نے اُس کے آبخورہ میں پانی دیا اور کہا کہ پانی پی لے، اُس نے کپکپاتے ہاتھوں سے آبخورہ کا پانی صراحی میں ڈالا اور پھر گرا دیا اور گھر کی طرف اشارہ کرکے کچھ کہا، مطلب یہ تھا کہ بیوی پیاسی ہیں اُن کے لیے پانی لیجاؤں گی اور اسی لیے صراحی میں پانی ڈالا تھا میں نے کہا میرے پاس پانی بہت ہے تو پانی پی لے۔ پھر آبخورہ میں پانی دیا وہ پی کر لیٹ گئی، میں دوڑا ہوا گھر کی طرف گیا اور والدہ اور خالہ کو تھوڑا پانی پینے کو دیا۔ اُنھوں نے خدا کا شکر کیا۔ میں گھر سے نکلا کہ سواری کا بندوبست کروں اور والدہ اور خالہ کو میرٹھ لیجاؤں باہر آکر کیا دیکھتا ہوں کہ زین مری پڑی ہے، پھر سارے شہر میں باوجودیکہ حکام نے بھی احکام جاری کیے کہیں سواری نہ ملی۔ آخر قلعہ کے حکام نے اجازت دی کہ شکرم جو سرکاری ڈاک میرٹھ کو لیجاتی ہے وہ ان کو ملجائے، میں وہ شکرم لیکر گھر پر آیا اور والدہ اور خالہ کو اُس میں بٹھا کر میرٹھ لے گیا"، میرٹھ میں منشی الطاف حسین مرحوم سررشتہ دار کمشنری میرٹھ نے جو سرسید کے قدیم دوست تھے ان کے رہنے کو ایک مکان خالی کر دیا۔ سرسید کی والدہ کو بھوک اور پیاس کی تکلیف سے صفرا کا بہت غلبہ ہو گیا تھا، کوئی دوا یا غذا پچتی نہ تھی، آخر کچھ دن بیمار رہکر ہفتم ربیع الثانی ۱۲۷۴ھ کو میرٹھ ہی میں انتقال کیا، سرسید کہتے تھے کہ "اُنکے انتقال سے چند روز پہلے تمام کنبے کی عورتیں اور مرد اور بچے جو مختلف مقامات میں تھے سب اُن کے پاس میرٹھ میں جمع ہو گئے تھے اس لیے وہ مرتے وقت بہت خوش تھیں۔

الغرض ۱۶۔ فروری ۱۸۵۸ء کو سکرٹری گورنمنٹ کی چٹھی مسٹر شکسپیر کے نام پہنچی کہ تم مع عملہ ضلع بجنور رڑکی کو روانہ ہو جاؤ، اور رڑکی میں انتظام رہیلکھنڈ کے لیے فوج کے لام باندھنے کا حکم بھیجا گیا۔ چنانچہ مسٹر شکسپیر اس فوج کے ساتھ روانہ ہو گئے، سرسید اور تمام عملہ جو وہاں موجود تھا اور چند رئیسان ضلع بجنور سب اُن کے ہمراہ گئے۔

بجنور سے انگریزوں کے چلے جانے کے بعد جیسا کہ اوپر مذکور ہوا بہت لڑائیاں اور خانہ جنگیاں ہوئی تھیں، کبھی ہندوؤں نے مسلمانوں پر حملے کیے اور کبھی مسلمانوں نے ہندوؤں پر، اور آخر کو محمود خاں سب پر غالب آ گیا تھا۔ اس لیے کچھ ہندو رئیس نواب سے شکست کھا کر میرٹھ چلے آئے تھے اور کچھ نواب نے قید کر لیے تھے۔ پس جب انگریزی فوج رڑکی میں پہنچ لی اور رہیلکھنڈ پر چڑھائی کرنے کو تیار ہوئی تو وہاں یہ بحث پیش آئی کہ ضلع بجنور میں جو کہ رہیلکھنڈ کا سب سے پہلا ضلع ہے اور جہاں سب سے پہلے فوج جانیوالی ہے کون لوگ باغی تصور کیے جائیں؟ مسلمانوں کی نسبت اُس وقت نہ تو حکام ضلع کا خیال اچھا تھا اور نہ افسران فوج کا، اور ہندو رئیس جنہوں نے مسلمانوں سے شکست پائی تھی اور جو اپنی باہمی خانہ جنگیوں کو سرکار کی خیرخواہی کے لباس میں ظاہر کرنا چاہتے تھے اور اُن میں سے کسی قدر وہاں موجود بھی تھے وہ یہ چاہتے تھے کہ جو لوگ مسلمانوں کے اُن حملوں میں شریک تھے جو اُنہوں نے ہندو رئیسوں پر کیے وہ سب باغی قرار دیے جائیں، اگر اُس وقت یہی فیصلہ ہو جاتا تو ضلع بجنور خاک سیاہ اور مسلمانوں سے خالی ہو جاتا۔

سرسید نے مسٹر شکسپیر اور بعض افسران فوج سے اس باب میں گفتگو کی اور کہا کہ "سرکار کے نزدیک باغی صرف وہی لوگ قرار پانے چاہئیں جو اب سرکار سے مقابلہ کے ساتھ پیش آئیں۔ باقی جو لڑائیاں اور فسادات رعایا نے ایک دوسرے سے کیے قانون کی رو سے اُن کی نسبت جو کچھ تجویز ہو سو ہو مگر اُن کی وجہ سے کسی کو سرکار کے مقابلہ میں باغی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ میرے نزدیک بروقت داخل ہونے سرکاری فوج کے اگر کوئی مقابلہ نہ کرے اور سب لوگ مع نواب محمود خاں کے حاضر ہو جائیں تو ضلع بجنور کے کسی شخص کو باغی قرار دینا نہیں چاہیئے" اس پر بہت بحث ہوئی اور آخر یہ بات قرار پا گئی کہ جو لوگ سرکاری فوج کے مقابلہ میں آئیں وہی باغی قرار دیے جائیں۔ لیکن بدنصیبی سے ام سوت، نجیب آباد اور نگینے پر احمد خاں اور ماڑے خاں وغیرہ نے خفیف خفیف مقابلے کر کے ہزاروں کو لڑائی میں قتل کرایا اور تمام ضلع کی طرف سے سرکاری افسروں کو بدظن کر دیا۔

اگرچہ جو لوگ ضلع بجنور میں اپنی بغاوت کا پورا پورا ثبوت دے چکے تھے اور سرکار سے کھلم کھلا

بے وفائی کر چلے تھے سرسید نے اُن کی حمایت ہرگز نہیں کی، لیکن جو لوگ کسی مجبوری یا دباؤ کے سبب باغیوں کے ساتھ ہو گئے تھے اور اسی لیے مجرم ٹھیر گئے تھے، یا جنہوں نے آپس کی خانہ جنگیوں میں کسی گروہ کا ساتھ دیا تھا مگر وہ اُن کو سرکار کے برخلاف نہیں سمجھتے تھے، یا جن لوگوں نے سرسید کو ذاتی طور پر تکلیف پہنچائی تھی اور سرکار کے برخلاف کوئی کارروائی نہیں کی تھی۔ جہاں تک ممکن ہوا اُن کی بریت میں کوشش کی اور اُن کی صفائی کرائی۔ ایک تحریر[1] میں جو نواب محسن الملک نے لکھوائی اور مولانا نذیر احمد نے جو خاص بجنور کے رئیس ہیں اپنے قلم سے لکھی اور جو کہ گویا ان دونو نامور اور معزز شخصوں کے خیالات کا مجموعہ ہے اُس میں سے ہم ذیل کا فقرہ نقل کرتے ہیں۔

"سید احمد خاں کو سرکار انگریزی کی طرف سے ضلع بجنور کا نظم و نسق سپرد تھا۔ اور وہاں کے ہندو مسلمانوں کی خانہ جنگیاں یادگار غدر ہیں۔ اس عموم بے تمیزی میں خود سید احمد خاں کے ساتھ بھی لوگ نہایت درجہ کی گستاخی اور بے توقیری سے پیش آئے اور قریب تھا کہ ہلاک کریں، عَوْدِ تسلط کے بعد اُس ضلع کے تمام باشندوں کی جان سید احمد خاں کی مٹھی میں تھی، اگر اُن کے سے اختیارات کسی دوسرے کو ہوتے تو بجنور کے حصہ میں قیامت آگئی ہوتی، مگر یہ معاملہ فہم، منصف مزاج، نرم دل، نیک طبیعت آدمی اُس وقت بھی فرق کرتا تھا بغاوت اور خانہ جنگیوں میں مخالفت اور جہالت میں، حملہ اور حفاظت میں، اور سید احمد خاں کی بدولت بجنور ہی ایک ضلع تھا جو عواقب[2] و تبعات غدر سے محفوظ رہا"

سرسید کی رائے جو اُس وقت عام رعایائے ضلع بجنور کی نسبت تھی اور جس پر حکام ضلع کو پورا بھروسا تھا وہ تاریخ سرکشی بجنور میں اُنھوں نے صاف صاف لکھدی۔ وہ کہتے ہیں کہ "ضلع کے لوگوں کا میری رائے میں یہ حال تھا کہ اُن لڑائیوں میں نواب کے ساتھ ہو کر چودہریوں سے لڑنے کو سرکار سے لڑنا یا برخلاف سرکار کے لڑائی کرنی نہیں سمجھتے تھے، سب کے خیال میں چودہریوں کا اور نواب کا مقابلہ تھا جس میں گویا سرکار بیچ میں سے علیحدہ تھی، اور اس میں شک نہیں کہ جو لوگ چودہری صاحبوں کے ساتھ لڑائیوں میں شریک تھے وہ اپنے

---

[1] آنریبل حاجی اسمٰعیل خاں نے ۱۸۹۸ء میں سرسید کی یادگار قائم کرنے کے لیے ایک خط نواب محسن الملک کے نام حیدرآباد بھیجا تھا اُس زمانہ میں محسن الملک بیمار تھے اُنھوں نے شمس العلما مولوی نذیر احمد سے اسکا جواب لکھوا کر بھیجا تھا جو علیگڈھ گزٹ میں چھپ گیا تھا۔ اس تحریر میں سرسید کی نسبت دونوں کے خیالات مندرج ہیں ۱۲

[2] عواقب و تبعات غدر سے وہ بد نتایج مراد ہیں جو اکثر اضلاع ہندوستان میں انگریزی تسلط کے بعد باشندگانِ اضلاع کو بھگتنے پڑے کیونکہ بجنور میں سوا ان لوگوں کے جو باہم خانہ جنگیوں میں یا سرکاری فوج کے مقابلہ میں مارے گئے یا فتح کے بعد فوراً بغاوت کے جرم میں سزایاب ہوئے۔ پھر بہت ہی کم لوگوں سے تعرض کیا گیا ۱۲

تئیں جو دہری صاحبوں کا حامی سمجھتے تھے سرکار انگریزی سب کے دلوں سے الگ تھی" سرسید ہی کی رائے کا یہ نتیجہ تھا کہ امن ہوجانے کے بعد ضلع کے عام باشندوں سے بہت کم مواخذہ کیا گیا۔

خدمات غدر کا صلہ

جو شخص سرسید کی طبیعت اور جبلت سے واقف ہوگا وہ اس بات کو بآسانی باور کرے گا کہ جو غدر کے زمانہ میں گورنمنٹ کی خیرخواہی اور وفاداری اُن سے ظہور میں آئی وہ کسی خلعت یا انعام وغیرہ کی توقع پر مبنی نہ تھی۔ وہ بڑا انعام اپنی خدمت کا یہی سمجھتے تھے کہ اس نازک وقت میں اُن سے کوئی امر اخلاق اور شرافت اور اسلام کی ہدایت کے خلاف سرزد نہیں ہوا مگر گورنمنٹ نے خود اُن کی خدمات کی قدر کی اور اُن کے صلہ میں ایک خلعت قیمتی ایک ہزار روپیہ کا اور دو سو روپیہ ماہوار کی پولٹکل پنشن دو نسلوں تک مقرر کی۔

میر صادق علی اور میر رستم علی رئیسان چاند پور ضلع بجنور کا تعلقہ۔ اس جرم میں کہ اُنکی عرضی بادشاہ دہلی کے دفتر سے برآمد ہوئی تھی۔ سرکار نے ضبط کرلی تھی۔ اور جس طرح کہ دیگر خیرخواہان سرکار کو باغیوں کی ضبط شدہ جائدادیں دی گئی تھیں مسٹر شکسپیر رپورٹ کرنی چاہتے تھے کہ منجملہ تعلقہ چاندپور کے ایک معقول جائداد سید احمد خاں کو بعوض خدمات ایام غدر کے ملنے چاہیئے۔ مگر جب اُنھوں نے سرسید سے اس بات میں استمزاج لیا تو اُنھوں نے اُسکے لینے سے انکار کیا اور کہا کہ میرا ارادہ ہندوستان میں رہنے کا نہیں ہے مسٹر شکسپیر نے اس قاعدہ کے موافق کہ کسی کو اُسکی نصف تنخواہ سے زیادہ پنشن نہیں مل سکتی تھی۔ سرسید سے کہا کہ نقد پنشن بہت قلیل مقرر ہوگی۔ اُنھوں نے کہا کہ جو کچھ سرکار عنایت کرے اُس کا احسان ہے مگر مجھکو یہ جائداد لینی ہرگز منظور نہیں۔ اس واقعہ کو اُسی تحریر میں جو نواب محسن الملک کی طرف سے مولانا نذیر احمد نے حیدرآباد میں لکھی تھی اس طرح بیان کیا ہے "سید احمد خاں کو حسن خدمات غدر کے صلہ میں ضلع بجنور کے ایک بڑے مسلمان رئیس باغی کا بڑا بھاری علاقہ سرکار نے دینا تجویز کیا تھا۔ مگر سید احمد خاں نے صرف اسی وجہ سے اُسکے لینے سے انکار کیا کہ ایک مسلمان بھائی کے خون سے اپنی پیاس بجھانی اُن کو کسی طرح گوارا نہیں ہوسکتی تھی۔"

خود سرسید نے بھی اپنے ایک لکچر میں جو ۲۸۔ دسمبر سنہ ۱۸۸۹ء کو ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسہ میں مدرسۃ العلوم کے تاریخی حالات پر دیا تھا اس واقعہ کو بیان کیا ہے۔ اُنھوں نے کہا کہ "غدر میں جو حال انگریزوں اور اُن کے بچوں اور عورتوں پر گذرا اور جو حال ہماری قوم کا ہوا اور نامی خاندان برباد اور تباہ ہوئے ان دونو واقعات کا ذکر دل کو شق کرنے والا ہے۔ غدر کے بعد نہ مجھکو اپنا گھر لٹنے کا رنج تھا نہ مال و اسباب کے تلف ہونے کا، جو کچھ رنج تھا اپنی قوم کی بربادی کا اور ہندوستانیوں کے ہاتھ سے جو کچھ انگریزوں پر گذرا اُس کا رنج تھا۔ جب ہمارے دوست مرحوم شکسپیر نے، جن کی مصیبتوں میں ہم اور ہماری مصیبتوں

میں وہ شریک تھے۔ بعوض اُس وفاداری کے تعلقہ جہاں آباد جو سادات کے ایک نامی خاندان کی ملکیت اور لاکھ روپیہ سے زیادہ مالیت کا تھا مجھکو دینا چاہا تو میرے دل کو نہایت صدمہ پہنچا۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ مجھ سے زیادہ کوئی نالائق دنیا میں نہ ہوگا کہ قوم پر تو یہ بربادی ہو اور میں اُن کی جائداد لیکر تعلقہ دار بنوں میں نے اُس کے لینے سے انکار کیا۔ اور کہا کہ میرا ارادہ ہندوستان میں رہنے کا نہیں ہے۔[۱] اور درحقیقت یہ بالکل سچ بات تھی، میں اُسوقت ہرگز نہیں سمجھتا تھا کہ قوم پھر پنپیگی اور کچھ عزت پائے گی اور جو حال اُسوقت قوم کا تھا مجھ سے دیکھا نہیں جاتا تھا، چندروز میں اسی خیال اور غم میں رہا۔ آپ یقین کیجئے کہ اس غم نے مجھے بڈھا کردیا اور میرے بال سفید کردیئے۔ جب میں مرادآباد آیا جو ایک بڑا غمکدہ ہماری قوم کے رئیسوں کی بربادی کا تھا اس غم کو کسی قدر اور ترقی ہوئی۔ مگر اُس وقت یہ خیال پیدا ہوا کہ نہایت نامردی اور بے مروتی کی بات ہے کہ اپنی قوم کو اس تباہی کی حالت میں چھوڑ کر میں خود کسی گوشۂ عافیت میں جا بیٹھوں۔ نہیں! اُسکی مصیبت میں شریک رہنا چاہیئے اور جو مصیبت پڑے اُس کے دور کرنے میں ہمت باندھنی قومی فرض ہے۔ مینے ارادہ ہجرت موقوف اور قومی ہمدردی کو پسند کیا"

مرادآباد کی تبدیلی

اپریل ۱۸۵۸ء میں وہ بجنور سے صدرالصدوری کے عہدہ پر ترقی پاکر مرادآباد گئے۔ اور ۱۸۵۹ء میں وہی جب کہ باغیوں کی جائداد منضبطہ کے متعلق عذرداریاں ہونے لگیں اور اُنکی سماعت اور تحقیقات کے لیے ایک اسپشل کمیشن بیٹھا۔ اُس میں دو یورپین ممبر ایک کمشنر روہیلکھنڈ، دوسرے جج مرادآباد، اور ایک ہندوستانی ممبر یعنی سرسید مقرر ہوئے۔ چنانچہ دو برس تک وہ اپنے عہدہ کے علاوہ یہ کام بھی انجام دیتے رہے۔

گورنمنٹ نے یہ نہایت دانائی کی تھی کہ اکثر ضلع میں منضبطہ جائداد کی تحقیقات کے لیے جو اسپشل کمیشن مقرر کیے گئے تھے اُن میں یورپین افسروں کے ساتھ ایک ایک ہندوستانی ممبر بھی شامل کردیا تھا کیونکہ جائدادیں اکثر ادنیٰ ادنیٰ شبہ پر ضبط ہوگئی تھیں اور انگریزی حکام نیچرل طور پر ہندوستانیوں کی طرف سے عموماً بدگمان اور نہایت غیظ و غضب میں بھرے ہوئے تھے۔ خصوصاً ضلع مرادآباد پر گورنمنٹ کا سخت عتاب تھا، اور انگریز افسروں کا یہاں اعتدال پر رہنا دشوار تھا۔ اگرچہ سرسید نے اپنی زبان سے کمیشن مذکور کی کارروائی کے متعلق کبھی ہمارے سامنے کچھ بیان نہیں کیا لیکن مرادآباد کے معتبر اشخاص سے سنا گیا ہے کہ سرسید کی شرکت کے سبب یہاں کے کمیشن نے عذرداریوں کی تحقیقات نہایت اعتدال اور انصاف کے ساتھ کی اور صوبہ شمال مغرب میں ضبط شدہ جائدادیں جس قدر ضلع مرادآباد میں واگذاشت ہوئیں ایسی کسی ضلع میں نہیں ہوئیں۔

---

[۱] غدر کے بعد سرسید کا ارادہ مصمم ہوگیا تھا کہ پنشن لیکر مصر میں جاکر سکونت اختیار کریں ۱۲

ایک بہت بڑا فائدہ سرسید کے مراد آباد میں ہونے سے خاصکر یہ پہنچا کہ مولانا عالم علی مرحوم رئیس مراد آباد۔ جو رُہیلکھنڈ کے ایک مشہور عالم اور طبیب اور نامور محدث تھے۔ اُنھوں نے چند یورپین عورتوں اور بچوں کو باغیوں کے ظلم سے بچانے کیلئے اپنے مکان میں چھپا لیا تھا، مگر اتفاق سے باغی سپاہیوں کو خبر ہو گئی اور اُنھوں نے مولوی صاحب کے مکان میں گھس کر اُن سب کو قتل کر ڈالا۔ مولانا موصوف اس خیال سے کہ یہ حادثہ عظیم اُن کے مکان میں گزرا تھا اور اُن کا کوئی عزیز یا رشتہ دار اُن مظلوموں کے ساتھ نہیں مارا گیا تھا۔ سرکاری تسلط کے وقت مراد آباد سے کہیں چلے گئے تھے اور حکام ضلع کو اُن کی تلاش درپیش تھی، اور اُن کی نسبت یہ گمان تھا کہ باغیوں کے ساتھ اُن کی ضرور سازش تھی ورنہ اُن کے آدمی بھی مقتولوں کے ساتھ یقیناً مارے جاتے، مگر سرسید کو معلوم ہو گیا تھا کہ مولوی عالم علی محض بے قصور تھے اور اُنھوں نے نہایت نیک نیتی سے یورپین عورتوں اور بچوں کو اپنے گھر میں رکھا تھا۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ باغیوں کو مولوی صاحب سے کوئی وجہ عداوت کی نہ تھی کہ وہ اُن کو یا اُن کے رشتہ داروں کو بھی مار ڈالتے۔ اور خود اُن میں اتنی طاقت نہ تھی کہ باغی سپاہ کا مقابلہ کرتے۔ چنانچہ سرسید نے مولوی صاحب کی بریّت کے لیے صاحب ضلع سے۔ باوجودیکہ وہ نہایت افروختہ تھے۔ بڑی دلیری سے گفتگو کی، اور یہ کہا کہ میں مولوی عالم علی کو آپ کے سامنے حاضر کر سکتا ہوں لیکن جب تک کہ آپ وعدہ نہ کریں کہ اُن سے کچھ مواخذہ نہ کیا جائے گا اُس وقت تک میں اُن کے بلانے کی جرأت نہیں کر سکتا، آخر صاحب ضلع نے اُن سے یہ وعدہ کر لیا کہ ہم ضابطہ کی تحقیقات تو ضرور کرینگے لیکن چونکہ تمہارے نزدیک شاہ بے قصور ہیں بعد ضابطہ کی کارروائی کے اُن کو بَری کر دیا جائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ سرسید نے مولوی صاحب کو بلا کر عدالت میں پیش کر دیا اور ضابطہ کی کارروائی کے بعد وہ بالکل بری کر دیے گئے۔

تاریخ سرکشی بجنور

مراد آباد ہی میں آ کر سرسید نے تاریخ سرکشی بجنور چھاپ کر شائع کی۔ اس تاریخ میں مئی ۱۸۵۷ء سے لیکر اپریل ۱۸۵۸ء تک کے حالات اور واقعات غدر جو ضلع بجنور میں گزرے بقید تاریخ نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کیے ہیں۔ تمام خط کتابت جو کہ وہ حکام ضلع کے ساتھ رُڑکی میں کرتے تھے اور وہ تمام تحریریں جو اُنھوں نے نواب محمود خاں اور چودھریوں کے نام، یا نواب اور چودھریوں نے اُن کے نام، یا آپس میں ایک دوسرے نام بھیجیں، اور اُس کے سوا اور بہت سی تحریرات جو اس معاملہ سے تعلق رکھتی تھیں لفظ بہ لفظ اس کتاب میں درج ہیں۔ ان میں سے بہت سی تحریریں اور اکثر یادداشتیں ایسی ہیں جن کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سرسید ابتدا سے اخیر تک اس کتاب کے لیے میٹریل جمع کرتے رہے تھے۔ ایسی حالت میں جب کہ جانوں کے لالے پڑے ہوئے تھے، انگریزی عملداری

بالکل اُٹھ گئی تھی، لوگوں کے گھر بار لٹ رہے تھے، اور خود سر سید نہایت خوف و ہراس کی حالت میں تھے۔ وہ ان کاغذات اور یادداشتوں کو بحفاظت رکھتے جاتے تھے، اس سے دو باتیں بخوبی ثابت ہوتی ہیں ایک یہ کہ انگریزی عملداری کے پھر قائم ہو جانے کا ان کو کامل یقین تھا، دوسرے یہ کہ ضلع کی اُس خوفناک حالت میں بدحواسی یا خوف و ہراس نے اُن کی طبیعت میں مطلق راہ نہیں پائی۔

اس کتاب میں غدر کے زمانہ کے حالات جو ضلع بجنور سے متعلق تھے بلا رو و رعایت اور بے کم و کاست لکھے گئے ہیں، جن مسلمانوں نے باوجود متواتر فہمائشوں اور نصیحتوں اور تمام نشیب و فراز سمجھانے کے اور باوجود گورنمنٹ کے احسانات کے سرکار سے بیوفائی کی تھی اور اُس سے مقابلہ کے ساتھ پیش آئے تھے اُن کے حالات جوں کے توں بیان کر دیے ہیں اور باوجودیکہ ہندو چودہریوں یا اُن کے ساتھیوں کی طرف سے مسلمانوں پر سخت ظلم اور زیادتیاں ہوئی تھیں اس پر بھی چونکہ وہ فی الواقع بغاوت کے الزام سے بری تھے اس لیے اس الزام سے اُن کی بریت کی ہے، مگر جو کچھ اُنھوں نے مسلمانوں پر تشدد اور سختیاں کی تھیں اُن کو بھی اچھی طرح ظاہر کر دیا ہے، غرضکہ واقعات کے بیان کرنے میں مذہبی یا قومی تعصبات کو مطلق دخل نہیں دیا۔

مدرسہ مراد آباد

اس کے بعد اُنھوں نے سنہ ۱۸۵۹ء میں ایک فارسی مدرسہ مراد آباد میں قائم کیا جہاں اُس سے پہلے کوئی مدرسہ نہ تھا۔ کچھ دنوں یہ مدرسہ بدستور اپنی حالت پر رہا مگر جب کہ اسٹریچی صاحب وہاں کلکٹر ہو کر آئے اور اُنھوں نے ایک تحصیلی مدرسہ قائم کیا اُسی تحصیلی مدرسہ میں اس فارسی مدرسہ کے طلبا بھی داخل ہو گئے۔

رسالہ در باب تعلیم

اُنھیں دنوں میں اُنھوں نے ایک رائے تعلیم کے باب میں اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں لکھ کر شائع کی جس میں گورنمنٹ کے ورنیکلر سکولوں پر سخت اعتراض تھا اور ہندوستانیوں کو انگریزی زبان میں تعلیم دینے کا سرکار کو مشورہ دیا تھا، ہم اُس مضمون میں دو تین فقرے اس مقام پر نقل کرتے ہیں۔

"گزشتہ چند سالوں سے گورنمنٹ نے جو انتظام رعایائے ہندوستان کی تعلیم کا کیا ہے سب سے اول اُس میں یہ بات قابل لحاظ کے ہے کہ آیا فی نفسہٖ انتظام ایسا ہے یا نہیں ؟ کہ رعایا کا اُس سے ناراض ہونا اور خواہ نخواہ بدگمانی کرنا ضرور ہو، ہماری رائے یہ ہے کہ بلاشبہ ایسا ہی ہے۔ گورنمنٹ نے یہ خیال کیا کہ جب کسی قوم کی تربیت کا ارادہ کیا جائے تو جو اُس قوم کی زبان ہے اُسی میں اُس کی تربیت ہو تو بہت آسان ہو گی اور دوسری زبان کے لغت اور محاورے سیکھنے میں جو وقت ضائع ہوتا ہے وہ بچیگا۔ بظاہر اُسکی نظیریں بھی موجود تھیں کیونکہ تمام اہل یورپ اور اہل عرب نے اپنی ہی زبانوں

میں علم سیکھے ہیں، مگر یہ رائے غلط تھی، کل زبانوں پر ایسا خیال کرلینا صحیح نہیں ہے، بلکہ ہم کو چاہیے کہ اس بات پر بھی غور کریں کہ جس زبان میں ہم کسی قوم کی تعلیم چاہتے ہیں آیا اُس زبان کی حالت ایسی ہے یا نہیں کہ اُس زبان میں تعلیم کا ہونا ممکن ہونا،،

"ہمیشہ تعلیم سے یہ مقصود رہا ہے کہ انسان میں ایک ملکہ اور اُس کی عقل اور ذہن میں ایک جودت پیدا ہوتا کہ جو اُمور پیش آئیں اُن کے سمجھنے کی، بُرائی بھلائی جاننے کی، اور عجائب قدرت الٰہی پر فکر کرنے کی اُس کو طاقت ہو، اُسکے اخلاق درست ہوں، معاملات معاش کو نہایت صلاحیت سے انجام دے۔ اور امور معاد پر غور کرے۔ گورنمنٹ کا یہ کہنا کہ "ہم کو اس قدر تربیت سے کچھ علاقہ نہیں بلکہ ہم اُسی قدر تعلیم کے خواہاں ہیں جو امور معاش سے علاقہ رکھتی ہے اور جو منحصر ہے صرف جغرافیہ حساب اور ہندسہ پر،، نہایت بیجا ہے"

"سررشتہ تعلیم جو چند سال سے جاری ہے وہ تربیت کے لیے ناکافی نہیں نہیں بلکہ خراب کرنیوالا تربیت اہل ہند کا ہے اُردو زبان جس کے وسیلہ سے اکثر جگہ تعلیم جاری ہے اُس کی حالت ایسی نہیں ہے جس سے تعلیم ہونا ممکن ہو کیونکہ جس زبان میں ہم کسی قوم کی تعلیم کا ارادہ رکھتے ہیں اُس زبان کی نسبت ہم کو اول یہ دیکھنا چاہیے کہ اُس میں علمی کتابیں کافی موجود ہیں یا نہیں ؟ کیونکہ اگر یہ نہ ہو تو تعلیم ممکن نہیں۔ دوسرے یہ کہ وہ زبان فی نفسہ اس قابل ہے یا نہیں کہ اُس میں علمی کتابیں تصنیف ہو سکیں ؟ کیونکہ پہلی بات کا تو علاج ہو سکتا ہے مگر دوسری بات لا علاج ہے تیسرے یہ کہ آیا وہ ایسی زبان ہے یا نہیں کہ اُس میں علوم پڑھنے سے جودت طبع، حدت ذہن، سلامت فکر، ملکۂ عالی قوت ناطقہ، پختگی تقریر، اور ترتیب دلائل کا سلیقہ پیدا ہو سکے ؟ ان تینوں باتوں میں سے اُردو زبان میں کوئی بات نہیں، پس گورنمنٹ پر واجب ہے کہ اس طریقہ تعلیم کو۔ جو درحقیقت تربیت انسان کو خراب کرنیوالا اور خود بخود لوگوں کے دلوں میں بدگمانی پیدا کرتا ہے۔ بالکل بدل دے، اور اُس زبان میں تربیت جاری کرے جس سے تربیت کا جو اصلی نتیجہ ہے وہ حاصل ہو"

"میری صاف رائے ہے کہ اگر گورنمنٹ اپنی شرکت دیسی زبان میں تعلیم دینے سے بالکل اُٹھا دے اور صرف انگریزی مدرسے اور اسکول جاری رکھے تو بلاشبہ یہ بدگمانی جو رعایا کو گورنمنٹ کی طرف سے ہو جاتی ہے۔ صاف صاف لوگ جان لیں کہ سرکار۔ انگریزی زبان کے وسیلہ سے تربیت کرتی ہے۔ اور انگریزی زبان بلاشبہ ایسی ہے کہ انسان کی ہر قسم کی علمی ترقی اُس میں ہو سکتی ہے"

یہاں ان فقروں کے نقل کرنے سے ہمارا صرف یہ مدعا ہے تاکہ لوگوں کو معلوم ہو کہ انگریزی زبان کی تعلیم کو دیسی زبان کی تعلیم پر ترجیح دینے کی نسبت جو کچھ سرسید رائے اس زمانہ میں تھی یہی رائے اب سے ۲۶ برس پہلے تھی، مگر ۲۶ برس کے تجربہ سے اُن کو اس قدر ضرور معلوم ہوا ہو گا کہ انگریزی زبان

میں بھی ایسی تعلیم ہو سکتی ہے جو دیسی زبان کی تعلیم سے بھی زیادہ نکمی فضول اور اصلی لیاقت پیدا کرنے سے قاصر ہو۔

مراد آباد و سرسید

مراد آبادہی میں سرسید نے گورنمنٹ کی، ملک کی، اور خاصکر اپنی قوم کی وہ جلیل القدر خدمت انجام دی جو اُن کے اور بڑے بڑے کاموں کی طرح ہمیشہ یادگار رہیگی، وہ بجنور میں مسلمانوں کی تباہی اپنی آنکھ سے دیکھ کر آئے تھے، جب مراد آباد میں پہنچے تو اُن کی تباہی بربادی کا اور بھی زیادہ عبرت انگیز نقشہ اُن کی نظر سے گزرا جس سے ایک درچوٹ اُن کے دل پر لگی، گورنمنٹ کا غصہ خاصکر مسلمانوں کے حال پر بدستور چلا جاتا تھا، ہندوستانی خیر خواہی سرکار کی آڑ میں مسلمانوں سے دل کھول کھول کر بدلے لے رہے تھے، اور اگلے پچھلے بعض نکال رہے تھے، مسلمانوں کو مجرم قرار دینے کے لیے کوئی ثبوت درکار نہ تھا، اُن کا مسلمان ہونا ہی اُن کے مجرم ٹھیرانے کے لیے کافی تھا، مسلمانوں کے ساتھ بے قاعدہ رعایت یا ہمدردی کرنا سرکاری عہدہ داروں کی قدرت سے باہر تھا۔ اس لیے سرسید اپنے منصب کے لحاظ سے کوئی سلوک اُن کے ساتھ نہیں کر سکتے تھے، اگرچہ اُن کے مراد آباد میں آنے سے کسی قدر اُن ناگفتہ بہ بے اعتدالیوں کا انسداد ہوا جو خاص مراد آباد میں بعض ناخدا ترس لوگ سرکار کی خیر خواہی کے پردہ میں کرتے تھے، کیونکہ حسن اتفاق سے اُنھیں دنوں میں اسٹریچی صاحب مراد آباد کے کلکٹر و مجسٹریٹ مقرر ہو گئے تھے اور اُن کو سرسید کی رائے اور مشورہ پر پورا اعتماد تھا، مگر سرسید اسی پر قانع نہ تھے، بلکہ وہ اس فکر میں تھے کہ انگریزوں کے دل میں جو غلطی سے ایک بدگمانی تمام ہندوستان کے مسلمانوں کی طرف سے پیدا ہو گئی ہے وہ کس طرح رفع کی جائے۔

زمانہ نہایت نازک تھا، خیالات ظاہر کرنے کی آزادی مطلق نہ تھی، مارشل لا کا دورہ دورہ تھا، اور حاکموں کی زبان ہی قانون تھی، جو شخص گورنمنٹ کا خیر خواہ اور وفادار تسلیم کر لیا گیا ہو اُس کو ایسا کام کرنا جس سے اچھے دل بُرے ہوں اور بھی زیادہ دشوار تھا، گورنمنٹ نے مسلمانوں کو اپنا مخالف خیال کر لیا تھا اور ایسا خیال کرنے کے اسباب پہلے ہی سے موجود تھے، اگر ہندوستانیوں کی عادت، طبیعت اور طرز خیالات سے ناواقف تھے، ملک کی حکومت اُنھوں نے مسلمانوں سے لی تھی اور اُنھیں کو وہ اپنا حریف اور سلطنت کا مدعی سمجھتے تھے، اور بدقسمتی سے بقول سرسید کے بھُس بھری ہوئی مردہ کھال دلّی میں موجود تھی، مسلمانوں کے مذہبی تعصبات کی شہرت تھی، اور ان تمام باتوں کا یہ لازمی نتیجہ تھا کہ وہ انگریزوں کی غلط فہمی کے شکار ہو جائیں۔

سرسید کو اس بات کا دل سے یقین تھا کہ انگریزوں نے بغاوت کے سمجھنے میں غلطی کی ہے

وہ کہتے تھے کہ انگریزوں کا یہ سمجھنا کہ غدر ایک ملکی بغاوت تھی اور اُس کی بنیاد انگلش گورنمنٹ کی حکومت اُٹھا دینے کے لیے کسی سازش پر تھی۔ محض غلط ہے۔ اور اسی غلطی کا نتیجہ تھا کہ وہ ملک کے ساتھ اس طرح پیش آئے جیسے باغی ملک کے ساتھ پیش آنا چاہیئے ان کے نزدیک نہ یہ ملکی بغاوت تھی نہ کسی قسم کی سازش بلکہ صرف سپاہیوں کی عدول حکمی تھی، وہ بھی نہ بہ ارادہ بغاوت کے بلکہ بسبب جہالت اور مذہبی توہمات کے۔ چنانچہ سرولیم کے نے بھی۔ جو غدر کے بعد انڈیا آفس میں انڈر سکرٹری تھے۔ نہایت انصاف سے اس ہنگامہ کو سیپائے وار سے تعبیر کیا ہے نہ ملکی بغاوت سے، اور لارڈ لارنس نے بھی آخر کو یہی فیصلہ کیا کہ صرف کارتوس کے سبب سے سپاہیوں کا ایک ہنگامہ تھا نہ کوئی عام سازش تھی نہ ملکی

اسی بنا پر اُنھوں نے مراد آباد میں آکر اسباب بغاوت ہند پر ایک رسالہ لکھا جس میں رعایائے ہندوستان کو اور خاصکر مسلمانوں کو جن پر سارا نچوڑ انگریزوں کی بدگمانی کا تھا بغاوت کے الزام سے بَری کیا ہے۔ اور اُس خطرناک اور نازک وقت میں وہ تمام الزامات جو لوگوں کے خیال میں گورنمنٹ پر عائد ہوتے تھے نہایت دلیری اور آزادی کے ساتھ پوست کندہ بیان کیے ہیں۔ اور جو اسباب کہ عموماً انگریزوں کے ذہن میں جاگزیں تھے اُن کی تردید کی ہے اُن کو غلط بتایا ہے۔

یہ رسالہ غالباً اُنھوں نے مراد آباد میں پہنچتے ہی لکھنا شروع کر دیا تھا۔ اُس کے ختم ہونے کے بعد بغیر اس کے کہ اُس کا انگریزی میں ترجمہ کرائیں اُردو ہی میں اُس کو مطبع مفصلیٹ گزٹ آگرہ میں چھپنے کو بھیجدیا، اور ۱۸۵۹ء میں اُس کی پانسو جلدیں چھپ کر اُن کے پاس پہنچ گئیں۔ جب سرسید نے اُنکو پارلیمنٹ اور گورنمنٹ انڈیا میں بھیجنے کا ارادہ کیا تو اُن کے دوست مانع آئے۔ اور ماسٹر رام چند کے چھوٹے بھائی رائے شنکر داس جو اُس وقت مراد آباد میں منصف اور سرسید کے نہایت دوست تھے۔ اُنھوں نے کہا کہ ان تمام کتابوں کو جلادو اور ہرگز اپنی جان کو معرض خطر میں نہ ڈالو۔ سرسید نے کہا "میں ان باتوں کو گورنمنٹ پر ظاہر کرنا ملک اور قوم اور خود گورنمنٹ کی خیر خواہی سمجھتا ہوں۔ پس اگر ایک ایسے کام پر جو سلطنت اور رعایا دونو کے لیے مفید ہو مجھ کو کچھ گزند بھی پہنچ جائے تو گوارا ہے۔ رائے شنکر داس نے جب سرسید کی آمادگی بہ درجہ غایت دیکھی اور اُن کے سمجھانے کا کچھ اثر نہوا تو وہ آبدیدہ ہو کر خاموش ہو رہے سرسید نے اوّل دو رکعتیں بطور نفل کے ادا کیں اور دعا مانگی اُوسیوقت کچھ کم پانسو جلدوں کا ایک پارسل ولایت کو روانہ کیا۔ اور ایک جلد گورنمنٹ انڈیا میں بھیجدی، اور چند جلدیں اپنے پاس رکھ لیں۔

گورنمنٹ انڈیا میں جب یہ کتاب پہنچی اور انگریزی میں ترجمہ ہو کر کونسل میں پیش ہوئی تو لارڈ کیننگ گورنر جنرل اور سر بارٹل فریر نے جو کونسل میں ممبر تھے اُس کے مضمون کو محض خیر خواہی پر محمول کیا۔

مگر مسٹر سسل بیڈن نے جو اُس وقت فارن سکرٹری تھے اُس کے خلاف بہت بڑی اسپیچ دی اور یہ رائے ظاہر کی کہ "اس شخص نے نہایت باغیانہ مضمون لکھا ہے۔ اس سے حسب ضابطہ بازپرس ہونی چاہیے اور جواب لینا چاہیے۔ اور اگر کوئی معقول جواب نہ دے سکے تو سخت سزا دینی چاہیے"، لیکن چونکہ کوئی ممبر اُن کا ہم رائے نہ تھا اس لیے ان کی اسپیچ سے کوئی مضر نتیجہ پیدا نہیں ہوا۔

مگر چند روز بعد جب کہ لارڈ کیننگ نے فرخ آباد میں دربار کیا اور سرسید بھی اُس دربار میں بلائے گئے تو وہاں ایک موقع پر مسٹر سسل بیڈن فارن سکرٹری گورنمنٹ انڈیا سے مٹ بھیڑ ہو گئی جب اُن کو معلوم ہوا کہ سید احمد خاں یہی شخص ہے اور اسی نے اسباب بغاوت پر وہ مضمون لکھا ہے تو سرسید سے دوسرے روز علیحدہ ملکر اپنی نہایت رنجش ظاہر کی اور بہت دیر تک تلخ گفتگو ہوتی رہی۔ اُنھوں نے کہا کہ "اگر تم گورنمنٹ کی خیر خواہی کے لیے یہ مضمون لکھتے تو ہرگز اُس کو چھپوا کر ملک میں شائع نہ کرتے، بلکہ صرف گورنمنٹ پر اپنے یا رعایا کے خیالات ظاہر کرتے"، سرسید نے کہا "میں نے اس کتاب کی پانسو جلدیں چھپوائی تھیں جن میں سے چند جلدیں میرے پاس موجود ہیں اور ایک گورنمنٹ میں بھیجی ہے اور کچھ کم پانسو جلدیں ولایت روانہ کی ہیں جنکی رسید میرے پاس موجود ہے، میں جانتا تھا کہ آجکل بسبب غیظ و غضب کے حاکموں کی رائے صائب نہیں رہی اور اسلیے وہ سیدھی باتوں کو بھی اُلٹی سمجھتے ہیں اس لیے جس طرح میں نے اُس کو ہندوستان میں شائع نہیں کیا اسی طرح انگریزوں کو بھی نہیں دکھایا۔ صرف ایک کتاب گورنمنٹ میں بھیجی ہے۔ اگر اس کے سوا ایک جلد بھی کہیں ہندوستان میں ملجائے تو میں فی جلد ایک ہزار روپیہ دونگا۔ مسٹر بیڈن کو اس بات کا یقین نہ آیا اور اُنھوں نے کئی بار سرسید سے پوچھا کہ کیا فی الواقع اُس کا کوئی نسخہ ہندوستان میں شائع نہیں ہوا؟ جب اُن کا اطمینان ہو گیا پھر اُنھوں نے اُس کا ذکر نہیں کیا۔ اور اُس کے بعد ہمیشہ سرسید کے دوست اور حامی و مددگار رہے۔

اس کتاب کے سرکاری طور پر متعدد ترجمے ہوئے۔ انڈیا اوفس میں اُس کا ترجمہ ہوا اور اُس پر متعدد دفعہ بحثیں ہوئیں گورنمنٹ انڈیا میں بھی اُس کا ترجمہ کرایا گیا۔ پارلیمنٹ کے بعض ممبروں نے بھی اُس کا ترجمہ کیا۔ مگر کوئی ترجمہ پبلک میں شائع نہیں کیا گیا۔ لیکن اُسی زمانہ میں ایک مدبر حاکم نے اشاعت کی نظر سے اُس کا ترجمہ کرنا شروع کیا تھا جس کو کرنل گریہم نے۔ جو سرسید کے بڑے دوست ہیں پورا کیا۔ اور ۱۸۷۳ء میں چھپکر شائع ہوا اس کتاب کی نسبت مدبران سلطنت وغیرہ کی رائیں اور جو نتایج اُس سے پیدا ہوئے وہ دوسرے حصہ میں لکھے جائیں گے۔

مراد آباد میں مسلمانوں کی درخواست

سرسید ابھی اپنی کتاب اسباب بغاوت ختم کرنے نہیں پائے تھے کہ ملکہ معظمہ کا اشتہار معافی اور امن و امان کا مشتہر ہوا۔ اس اشتہار کے مشتہر ہونے پر سرسید نے مراد آباد کے مسلمانوں کو

مطلع کیا کہ ملکہ معظمہ کی اس عنایت و مہربانی کا شکریہ ادا کرنا لازم ہے۔ تمام مسلمانوں نے بہت خوشی سے قبول کیا، اور اس غرض کے لیے سب کا ایک جگہ ہونا قرار پایا، شہر کے متصل ایک مشہور درگاہ شاہ بلاقی صاحب کی ہے اس کام کے لیے وہ جگہ تجویز ہوئی، شہر کے مسلمانوں نے آپس میں چندہ کیا اور ۲۸۔ جولائی ۱۸۵۹ء کو قریب پندرہ ہزار مسلمانوں کے وہاں جمع ہوئے، غریبوں اور مسکینوں کو عمدہ کھانا تقسیم کیا گیا۔ عصر کے وقت سب لوگوں نے شاہ بلاقی صاحب کی مسجد میں نماز پڑھی نمازیوں کی اس قدر کثرت تھی کہ مسجد کے باہر میدان تک جماعتیں کھڑی ہوئی تھیں۔

نماز کے بعد سرسید نے صحن مسجد میں ایک اونچی جگہ کھڑے ہو کر اردو زبان میں ایک مناجات پڑھی جس میں نہ شاندار الفاظ ہیں، نہ رنگینی ہے، نہ تصنع ہے، محض سیدھے سادھے الفاظ اور بیساختہ جملے ہیں مگر اُس کے ہر جملہ اور فقرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی تباہی و بربادی نے اُس شخص کے دل میں ایک بے چینی پیدا کر رکھی تھی جو کسی طرح کم نہ ہوتی تھی بلکہ روز بروز زیادہ ہوتی جاتی تھی، اور گویا اس بات کی خبر دیتی تھی کہ وہ سرسید کو آخر دم تک اس چینک سے خالی نہ رہنے دیگی اگر کسی کو اُن کے دل کی حالت کا جو اُس زمانہ میں اُن پر طاری تھی اندازہ کرنا ہو تو اُن تینوں مناجاتوں کو جن میں سے ایک اس موقع پر، دوسری بمقام آگرہ وہاں کی جامع مسجد کے ضبطی سے چھوٹنے پر اور تیسری بنارس میں پرنس آف ویلز کے شکریہ صحت پر اُنھوں نے پڑھی تھی۔ اُن کے لکچروں کے مجموعہ میں جو ۱۸۹۰ء میں بمقام لاہور چھپ کر شائع ہو چکا ہے ملاحظہ کرے۔

رسالہ لائل محمڈنز آف انڈیا

مراد آباد ہی میں سرسید نے خاصکر مسلمانوں کی بھلائی کے لیے ایک اور مفید کام کی بنیاد ڈالی۔ رسالہ اسباب بغاوت جیسا کہ اوپر مذکور ہوا اُنھوں نے محض گورنمنٹ ہند اور پارلیمنٹ کی اطلاع کے لیے لکھا تھا۔ چنانچہ ایک مدت تک اُس کے مضامین سے ہندوستان کے حکام اور افسر اور خود ہندوستان کے باشندے کیا ہندو اور کیا مسلمان مطلع نہیں ہوئے، اور جو نتائج اس پر مترتب ہوئے وہ پارلیمنٹ کے مباحثوں کے بعد آہستہ آہستہ بتدریج ظاہر ہوتے رہے۔ اس لیے سرسید کے دل کی بے چینی اور درد میں کچھ افاقہ نہ ہوا۔ خصوصاً اس وجہ سے کہ بغاوت پر جتنے آرٹکل، رسالے، اور کتابیں انگریز لکھتے تھے اُن میں سے اکثر میں مسلمانوں کے برخلاف رائیں ظاہر کی جاتی تھیں جنسے اُن کی بے چینی اور زیادہ ہوتی تھی۔ مسلمانوں پر کہیں یہ الزام لگایا جاتا تھا کہ اُن کو بالذات اپنے مذہب کے بموجب عیسائیوں سے عداوت ہے۔ کوئی یہ لکھتا تھا کہ شاہ نعمت اللہ ولی کی پیشین گوئی سے تمام مسلمانوں کو یقین تھا کہ اب عیسائیوں کی عملداری نہیں رہنے کی، اور سب سے بڑا درعام

الزام جو اُن پر عائد کیا جاتا تھا وہ یہ تھا کہ مسلمانوں کے مذہب کی رو سے انگریزوں پر جہاد کرنا واجب تھا اور اسی لیے مسلمان سب سے زیادہ بغاوت کے مرتکب تھے۔

برخلاف اس کے سرسید نے نہایت تحقیقات اور چھان بین سے بیشمار شہادتیں اس بات کی بہم پہنچائی تھیں کہ جس قدر گورنمنٹ کی خیرخواہی میں جانبازی اور جان نثاری کے کام مسلمانوں سے ظہور میں آئے وہ تمام ملک میں کسی قوم سے ظہور میں نہیں آئے، اور مذکورۂ بالا تینوں الزام جو مسلمانوں پر لگائے جاتے ہیں وہ فی الواقع انگریزوں کی غلط فہمی پر مبنی ہیں۔ اسی بنا پر اُنھوں نے ایک مبسوط کتاب لکھنے کا ارادہ کیا جو پارہ پارہ کرکے وقتاً فوقتاً اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں چھپوائی جائے۔ اور ہندوستان اور انگلستان دونوں ملکوں میں شائع کی جائے۔

اس کتاب کا موضوع یہ قرار دیا تھا کہ اطراف ہندوستان میں جس قدر مسلمانوں نے گورنمنٹ کی خیرخواہیاں اور انگریزوں کی حمایت کے لیے جانبازیاں کی ہیں اُن میں سے ہر شخص کا حال مفصل اور مشرح نہایت صحت کے ساتھ قلمبند کیا جائے، اور ہر شخص کے متعلق گورنمنٹ، حکام، اور افسروں کی تمام چٹھیاں اور سرٹیفکٹ بہم پہنچا کر اُس کی سرگذشت کے ذیل میں نقل کیجائیں۔ اور جو کچھ اُن کی خدمات کے صلہ میں گورنمنٹ نے جاگیر یا پنشن یا انعام یا خلعت وغیرہ عنایت کیا ہو وہ سب بیان کیا جائے۔

ظاہر ہے کہ ایسی کتاب لکھنے کے لیے بے انتہا سامان اور مٹیریل درکار تھا جس کا جمع کرنا دقت سے خالی نہ تھا۔ پھر اُردو سے انگریزی میں ترجمہ کرنے کی اُجرت بھی اُس زمانہ نہایت گراں تھی اور ٹائپ کے چھاپہ کا خرچ بھی بہ نسبت پتھر کے چھاپہ کے بہت زیادہ تھا۔ اس لیے سرسید نے یہ قاعدہ قرار دیا تھا کہ جس خیرخواہ مسلمان کا حال جتنے صفحوں پر چھپے اُس قدر صفحوں کے چھاپہ وغیرہ کی لاگت وہی شخص ادا کرے۔ مگر افسوس ہے کہ معدودے چند کے سوا کسی نے اس تدبیر کے پورا کرنے کی طرف توجہ نہ کی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صرف تین نمبر بقدر ۲۷۳ صفحہ کے چھپ کر رہ گئے۔ ۱۸۶۰ء میں یہ رسالہ جاری ہوا اور ۱۸۶۱ء میں بند ہو گیا۔

پہلے نمبر کو اُنھوں نے اس طرح شروع کیا ہے "سچ ہے انقلاب زمانہ ایک ایسا بڑا حادثہ ہے کہ آدمی کو نہایت زبون و درماندہ کر دیتا ہے، ایسے وقت میں انسان کا فضل و کمال، عقل و ہنر، علم و عمل، کچھ کام نہیں آتا ہے وہ حادثہ ہے جس سے انسان کا یاپلٹ ہو جاتا ہے، کوئی کام اُس کا اعتبار کے لائق نہیں رہتا، کسی شخص کو اُس کی قدر و منزلت کا خیال نہیں رہتا، جو کام انسان سے بُرا سرزد ہوتا ہے وہ تو

بُرا ہی ہی مگر اس کمبخت وقت کا مقتضا یہ ہوتا ہی کہ اُس کا اچھا کام بھی بُرائی اور ظاہرداری پر محمول ہوتا ہی ہر ایک قوم میں اچھے بُرے سب قسم کے آدمی ہوتے ہیں۔ ایک مثل مشہور ہی کہ "ایک مچھلی سارے جل کو گندا کرے" یہ خاص ایسے ہی بُرے وقت کے لیے کہی گئی ہی، اس کمبخت وقت کا یہ خاصہ ہی کہ اگر ایک آدمی بھی برا کام کرے تو ساری قوم کی قوم رسوا اور بدنام ہو جاتی ہی، گو اُسی قوم میں صدہا آدمیوں نے اچھے کام کیے ہوں مگر اُن خوبیوں پر کسی کو خیال نہیں ہوتا"

"برخلاف اس کے جن لوگوں پر یہ بدبختی کے دن نہیں ہوتے اُن کا برا کام بھی آنکھوں نہیں کھٹکتا اُن میں سے ہزاروں نے کیسے ہی بُرے کام کیے ہوں مگر اُن کی بُرائی پر دھیان نہیں ہوتا، یہ بدبختی کا زمانہ وہ ہی جو ۱۸۵۷ء و ۱۸۵۸ء میں ہندوستان کے مسلمانوں پر گذرا، کوئی آفت ایسی نہیں ہی جو اُس زمانہ میں ہوئی ہو، اور یہ نہ کہا گیا ہو کہ مسلمانوں نے کی، گو رام دین اور ماتا دین ہی نے کی ہو، کوئی بلا آسمان پر سے نہیں چلی جس نے زمین پر پہنچنے سے پہلے مسلمانوں کا گھر نہ ڈھونڈا ہو۔

ہر بلائے کز آسماں آید	گرچہ بر دیگرے قضا باشد
بر زمیں نارسیدہ می پُرسد	خانۂ مسلماں کجا باشد

"اس گذشتہ زمانہ کے حالات پر میں نے بھی بہت غور کی، اور جو اصلی حالات مجھکو معلوم ہوئے ہیں اُنپر میں یقین رکھتا ہوں، اور اسی سبب سے میرا دل خوش ہی کہ بالفعل جو ایک غوغا مسلمانوں کی بُرائی اور مفسدہ اور بدذاتی کا چاروں طرف پھیل رہا ہی یہ بالکل مٹ جائیگا، اگرچہ کچھ کچھ حالات فساد کے کھُلتے چلے ہیں مگر روزبروز زیادہ کھلتے جاوینگے، اور جب اصلی حال بالکل روشن ہو جائیگا تو جن لوگوں کی زبانیں مسلمانوں کی نسبت دراز ہو رہی ہیں سب بند ہو جاوینگی، اور تحقیق ہو جائیگا کہ ہندوستان میں اگر کوئی قوم مذہب کی روسے عیسائیوں سے محبت اور اخلاص اور ارتباط اور یگانگت کر سکتی ہی تو مسلمان ہی کر سکتے ہیں اور کوئی نہیں مگر ان دنوں میں جو میری نگاہ سے انگریزی اخبارات کثرت سے گذرے اور جو کتابیں اس ہنگامہ کی بابت تصنیف ہوئیں وہ بھی میں نے دیکھیں تو ہر ایک میں یہی دیکھا کہ ہندوستان میں مفسد اور بدذات کوئی نہیں مگر مسلمان! مسلمان! مسلمان! کوئی کانٹوں دار درخت اس زمانہ میں نہیں اُگا جسکی نسبت یہ نہ کہا گیا ہو کہ اُس کا بیج مسلمانوں نے بویا تھا اور کوئی آتشیں بگولا نہیں اُٹھا جو یہ نہ کہا گیا ہو کہ مسلمانوں نے اُٹھایا تھا، مگر میں اس کے برخلاف سمجھتا ہوں، میں نہیں دیکھتا کہ مسلمانوں کے سوا ایسا اور کوئی ہو جس نے خالص سرکار کی خیرخواہی میں اپنی جان، مال، عزت، آبرو، کھوئی ہو، زبانی بات چیت کی خیرخواہیاں ملا دینے اور جھوٹے سچے ایک دو پرچے لکھ بھیجنے بہت آسان ہیں مگر مسلمانوں کے سوا وہ کون شخص ہی جس نے صرف سرکار کی خیرخواہی میں

اپنی اور اپنے کنبے کی جان دی ہو، اور ہر وقت ہاتھ پاؤں اور دل و جان سے جان نثاری کو حاضر رہا ہو''

''جن مسلمانوں نے سرکار کی نمک حرامی اور بدخواہی کی میں اُن کا طرفدار نہیں ہوں۔ میں اُن سے بہت زیادہ ناراض ہوں اور اُن کو حد سے زیادہ بُرا جانتا ہوں، کیونکہ یہ ہنگامہ ایسا تھا کہ مسلمانوں کو اپنے مذہب کے بموجب عیسائیوں کے ساتھ رہنا چاہیئے تھا جو اہل کتاب اور ہمارے مذہبی بھائی بند ہیں، انبیوں پر ایمان لائے ہیں، خدا کے دیے احکام اور خدا کی دی ہوئی کتاب اپنے پاس رکھتے ہیں جس کا تصدیق کرنا اور جس پر ایمان لانا ہمارا عین ایمان ہے، پس اس ہنگامہ میں جہاں عیسائیوں کا خون گرتا وہیں مسلمانوں کا بھی خون گرنا چاہیئے تھا، پھر جس نے ایسا نہیں کیا اُس نے علاوہ نمک حرامی اور گورنمنٹ کی ناشکری کے۔ جو کسی حال میں رعیت کو جائز نہ تھی۔ اپنے مذہب کے بھی برخلاف کیا۔ اس لیے بلاشبہ وہ اس لائق ہیں کہ زیادہ اُن سے ناراض ہوا جائے، مگر عموماً اخباروں اور بغاوت کی کتابوں میں جو رائے اُن کی نسبت چھاپی جاتی ہے اُس میں اور میری رائے میں اتنا فرق ہے کہ جو تمہید اور بنا اور جو منشا کہ وہ لوگ اُن کی نسبت لگاتے ہیں میں اُن کو قبول نہیں کرتا، اور کچھ شک نہیں کہ میں اپنی رائے کو بہت درستی اور انصاف سے کام میں لایا ہوں''

''اگرچہ چاروں طرف سے مسلمانوں پر یہ شور و غل ہو رہا ہے مگر مسلمانوں کو کسی طرح رنجیدہ خاطر ہونا نہیں چاہیئے، کیونکہ ہماری نہایت منصف اعلیٰ گورنمنٹ مسلمانوں کی طرف ہے، ہماری گورنمنٹ نے اصلی حالات فساد پر بخوبی غور کیا ہے اور یقین ہے کہ ہماری گورنمنٹ کی ہرگز یہ رائے نہیں ہے جو تم اخباروں یا بغاوت کی کتابوں میں دیکھتے ہو، پس جب کہ مسلمانوں کی طرف خود گورنمنٹ ہے تو پھر اس شور و غوغا کا اُن کو کیا غم ہے۔

نمیگویم دریں گلشن گل و باغ و بہار از من   بہار از یار و باغ از یار و گل از یار و یار از من

''ہم جو یہ بات لکھتے ہیں کہ ہماری منصف گورنمنٹ مسلمانوں کے ساتھ ہے اسکی بہت روشن دلیل یہ ہے کہ ہماری قدردان گورنمنٹ نے خیرخواہ مسلمانوں کی کیسی قدر و منزلت اور عزت اور آبرو کی ہے، انعام و اکرام اور جاگیر اور پنشن سے نہال کر دیا ہے، ترقی عہدہ اور افزونی مراتب سے سرفراز کیا ہے، پھر کیا یہ ایسی بات نہیں ہے کہ مسلمان نازاں ہوں اور دل و جان سے اپنی گورنمنٹ کے شکرگزار و ثناخواں رہیں''

''مگر میں دیکھتا ہوں کہ مسلمانوں نے جو خیرخواہیاں کیں اُن کا ذکر اخباروں میں بہت کم چھپا ہے، اور بغاوت کی جو کتابیں چھپی ہیں اُن میں تو اس کا ذکر ہی نہیں، اسیلے میں نے ارادہ کیا ہے کہ مسلمان خیرخواہوں کا تذکرہ اس رسالہ میں لکھنا شروع کروں، اور جن مسلمانوں نے علی الخصوص مسلمان ملازمان گورنمنٹ نے جو جو خیرخواہیاں گورنمنٹ کی کی ہیں اُن کا بیان جہاں تک مجھکو معلوم ہے لکھوں، اور جو انعام و اکرام ہماری منصف و قدردان گورنمنٹ نے بعوض اسکے مسلمانوں کو دیئے وہ سب بیان کروں، تاکہ گورنمنٹ کی سخاوت اور منصفی اور قدردانی

زیادہ تر مشہور ہو، اور تمام مسلمان رعایا اپنے ہم قوموں کے ساتھ گورنمنٹ کی مروت اور سلوک اور رعایت اور قدردانی دیکھکر اُس کی دل سے شکرگزار ہو۔ اور ہر ایک کو یہ حوصلہ پیدا ہو کہ جس طرح ہمارے ہم قوموں نے گورنمنٹ کی رفاقت سے عزت اور نیکنامی حاصل کی اسی طرح ہم بھی حاصل کریں، اور یہ بھی جان لیں کہ ہماری گورنمنٹ ہمیشہ اپنی مطیع رعایا پر دل سے مہربان اور انکی قدر و منزلت کرنے کو تیار ہے"

"مگر چونکہ مسلمان خیرخواہ بہت کثرت سے ہیں اور اُنکی رپورٹیں بھی بہت لمبی لمبی ہیں اسلیے اُن سب کا ایک کتاب میں جمع کرنا اور چھاپنا خالی از وقت نہ تھا اس واسطے یہ تجویز کی ہے کہ مناسب مناسب وقت پر چند لوگوں کا حال مختصر مختصر رسالوں میں چھاپا جائے"

"جو لوگ بسبب تعصب یا عدم واقفیت کے حالات ملکی سے، یا جو اُصول سیاست مدن کے ہیں ان پر صحیح رائے نہ پہنچنے کے سبب میری رائے کے برخلاف ہیں وہ لوگ میری اس رائے کو دیکھکر حب الوطنی کا الزام مجھ پر لگائیں گے، ہاں یہ بات تو مجبوری کی ہے کہ میری پیدائش ہندوستان میں ہوئی اور میں بلا شبہہ مسلمان ہوں اور مسلمانوں ہی کا ذکر خیر اس کتاب میں لکھتا ہوں پھر نامنصفی سے جو کوئی چاہے یہ الزام مجھ پر لگائے، مگر جو لوگ انصاف دوست ہیں وہ خیال کرینگے کہ اُن حالات و واقعات کی تحریر میں میں نے کسی جگہ انصاف کو ہاتھ سے نہیں دیا۔ جس مسلمان کی خیرخواہی کا ذکر لکھا ہے اُسکے ساتھ بجنسہ حکام متعدد کی رپورٹیں جو اُنکے حق میں ہوئیں اور سارٹیفکٹ جو اُن کو دیے گئے، اور گورنمنٹ سے جو انعام و اکرام اُن کو ملے، وہ سب لفظ بہ لفظ اس میں مندرج ہیں جو میری اس تحریر پر گواہ عادل ہیں اور تمام متعصبوں کو الزام لگانے سے بند کرتے ہیں"

اسکے بعد سرسید نے اول اس بات کا اقرار کیا ہے کہ میری خدمات بمقابلہ بڑے بڑے خیرخواہ مسلمانوں کے کچھ حقیقت نہیں رکھتیں اور اسلیے وہ ذکر کرنے کے قابل نہیں ہیں، مگر صرف اس امید پر کہ جو انگریز مسلمانوں سے بدگمان ہیں وہ مؤلف کو گورنمنٹ کا خیرخواہ سمجھکر ان تحریرات کو توجہ کے قابل سمجھیں سب سے پہلے اپنا اور میر تراب علی اور ڈپٹی رحمت خاں کا حال لکھا ہے اور تینوں رسالوں میں تقریباً سترہ یا اٹھارہ شخصوں کا نہایت مفصل حال درج کیا ہے جن میں سے بعضے خود بھی مارے گئے اور اُن کے ساتھ دس دس بارہ بارہ آدمی اُنکے کُنبے کے بھی باغیوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے۔ دوسرے رسالہ میں خیرخواہان سرکار کے ذکر کے علاوہ ایک لمبی بحث اُن تینوں الزاموں کے متعلق بھی کی ہے جو عموماً مسلمانوں اور اُن کے مذہب پر لگائے جاتے تھے، اور قرآن حدیث اور فقہ کے حوالوں سے نہایت صفائی کے ساتھ اُن کو غلط اور محض بے اصل و بے بنیاد ثابت کیا ہے، تیسرے رسالہ میں کانس لنٹاڈین نام ایک قدیم عیسائی مصنف کی کتاب سے۔ جو کہ اُس نے ۱۶۹۰ء میں اسلام کے ابتدائی حالات پر

لکھی تھی۔ ایک عہدنامہ نقل کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلعم نے عیسائیوں کے ساتھ جو عہد و پیمان کیا تھا اُس میں اُن کی قوم کو تقریباً مسلمانوں ہی کے برابر حقوق دیئے تھے، اور مسلمانوں کو تاکید کی تھی کہ اُس پر ہمیشہ کاربند رہیں، ورنہ خدا سے منحرف سمجھے جائیں گے۔

افسوس ہے کہ یہ رسالے مسلمانوں کی معمولی بے پروائی اور کم ہمتی سے صرف تین نمبروں سے آگے نہ چل سکے، اگر یہ تذکرہ مکمل ہو جاتا تو مسلمانوں کے حق میں ایک نہایت مفید اور بکار آمد چیز ہوتی، اور اُن دعوؤں کا ایک عملی اور قطعی ثبوت ہوتا جن کے ثابت کرنے کے لیے اُصول اسلام کے موافق دلیلیں اور شہادتیں پیش کرنے کی ضرورت ہوئی۔

تحقیق لفظ نصارٰی

سرسید مراد آباد ہی میں تھے کہ اُن کو معلوم ہوا کہ بعض اضلاع میں مسلمانوں کی بعض تحریریں ایام غدر کی ایسی پیش ہوئیں جن میں انگریزوں کو لفظ نصارٰی سے تعبیر کیا تھا۔ حکام نے اس لفظ کو بھی بغاوت کا لفظ سمجھا، اور اُن کے لکھنے والوں کو وہ سزائیں دی گئیں جو اُن کی قسمت میں لکھی تھیں۔ اُس وقت۔ جیسا کہ سرسید نے لکھا ہے۔ مسلمانوں کی ہر ایک بات بُرے پہلو پر ڈالی جاتی تھی، انگریزوں نے جو بعض مسلمانوں کی تحریروں میں اپنی نسبت نصارٰی کا لفظ دیکھا تو انھوں نے یہ خیال کیا کہ جس طرح یہودی حضرت عیسٰیؑ کو حقارت سے ناصری (یعنی قریۂ ناصرہ کا رہنے والا) کہتے تھے اسی طرح مسلمانوں نے انگریزوں کو نصارٰی کے لفظ سے یاد کیا ہے۔[1]

سرسید نے اس غلطی کے رفع کرنے کو فوراً ایک مختصر رسالہ تحقیق لفظ نصارے میں لکھا، اور اُس کو اردو اور انگریزی میں چھپوا کر حکام اور گورنمنٹ کو اُس کے مضمون سے مطلع کیا، ہم کو اس کتاب کے لکھتے وقت وہ رسالہ دستیاب نہیں ہوا، مگر جو کچھ سرسید نے زبانی بیان کیا اُس کا خلاصہ یہ ہے کہ نصارے کا لفظ ناصرہ سے مشتق نہیں بلکہ نصر سے مشتق ہے، اور مسلمان اس وجہ سے کہ قرآن سے ایسا ہی ثابت ہوتا ہے۔ اُس کو نصر سے مشتق سمجھتے ہیں نہ ناصرہ سے، کیونکہ قرآن میں صاف آیا ہے کہ جب حضرت عیسٰیؑ نے کہا "مَنْ انصاری اِلَی اللّٰہ" تو حواریوں نے کہا "نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰہ"، اور اسی لیے حواریوں کی پیروی کرنے والوں اور عیسٰیؑ پر ایمان لانے والوں کو اُسی صفت کے ساتھ۔ جس کی حواریوں نے حامی بھری تھی۔ موصوف کیا گیا ہے۔ اور اُن پر نصارٰی کا اطلاق کیا گیا ہے۔ قرآن میں کہیں قریۂ ناصرہ

---

[1] غدر کے چند سال بعد دلی میں بھی ایک سی قسم کا اشتباہ پیدا ہوا اتفاقاً دلی کالج کے ایک مسلمان پروفیسر نے ایک ایڈریس کے مسودہ میں عیسائی کی جگہ ترسا کا لفظ لکھ دیا تھا جو فارسی میں راہب یعنی منک کو کہتے ہیں کالج کے ایک یورپین افسر نے اس کو حقارت کا لفظ سمجھا اور نہایت ناراضی ظاہر کی اور اُس لفظ کو مسودہ میں سے کٹوا دیا ۱۲

کا ذکر نہیں آیا، اور نہ کہیں حضرت عیسیٰؑ کو ناصری کہا گیا ہے، اس کے سوا قرآن سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ عیسائی آنحضرتؐ کے زمانہ میں خود اپنے تئیں نصاریٰ کہتے تھے جیسا کہ سورۂ مائدہ کی اس آیت میں بیان ہوا۔ " وَلَتَجِدَنَّ أَقْرَبَهُم مَّوَدَّةً لِّلَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ قَالُوا إِنَّا نَصَارَىٰ (یعنی اے محمدؐ تو پائیگا اہل کتاب میں سب سے زیادہ مسلمانوں کا دوست اُن کو جن کا قول ہے کہ ہم نصاریٰ ہیں)

جہاں تک معلوم ہوا ہے اس رسالہ کی اشاعت کے بعد پھر کسی سے اس لفظ پر مواخذہ نہیں ہوا ہم نے سُنا ہے کہ جب یہ رسالہ شائع ہوا تو کسی انگریزی اخبار میں یہ لکھا گیا تھا کہ سید احمد خاں کا بیان غلط ہے، کیونکہ کسی شخص کو نصاریٰ کا لفظ لکھنے پر سزا نہیں ہوئی، اس پر ایک معزز یورپین افسر نے اُس کا جواب دیا اور یہ لکھا کہ خود ہمارے سامنے ایک شخص کو اسی جرم میں کانپور میں پھانسی دی گئی۔

قحط مراد آباد ۱۸۶۰ء

۱۸۶۰ء میں جب کہ اضلاع شمال مغرب میں ایک عام قحط پڑا تھا اُس وقت سر سید مراد آباد ہی میں صدر الصدور تھے۔ مسٹر جان اسٹرچی نے جو اُس وقت وہاں کلکٹر تھے اپنے ضلع کے قحط کا انتظام سر سید کے سپرد کر دیا تھا، اُس موقع پر قطع نظر لیاقت اور سلیقہ انتظام کے جو انسانی ہمدردی سر سید سے ظہور میں آئی وہ ہندوستانیوں کے لیے ایک عمدہ مثال ہے۔ سر سید کے ایک قدیم دوست خود مراد آباد کے رہنے والے جو اُس وقت وہاں ملازم تھے اُن کا خیال ہے کہ سید احمد خاں کو جو اُس قدر عزت اور نیکنامی تمام ہندوستان میں حاصل ہوئی یہ اُسی بھلائی اور نیکی کا ثمرہ ہے جو قحط کے انتظام میں اُن سے ظاہر ہوئی۔

محتاج خانہ کے حسن انتظام کا یہ حال تھا کہ چودہ ہزار محتاجوں کو گھنٹہ بھر میں کھانا تقسیم ہو جاتا تھا بیماروں کے لیے شفا خانہ اور ڈاکٹر موجود تھا، بیماروں کو پرہیزی کھانا ملتا تھا، زچاؤں اور شیر خوار بچوں کو دودھ یا کھیر ملتی تھی، مسلمانوں کے لیے مسلمان اور ہندؤں کے لیے ہندو کھانا پکاتے تھے۔ جو ہندو اپنے سوا کسی کے ہاتھ کا پکا ہوا نہیں کھاتے تھے اُنکے لیے علحدہ چوکے بنے ہوئے تھے، شہر کی پردہ نشین اور عزت دار عورتیں جو محتاج خانہ میں نہیں آسکتی تھیں اُنکے پاس سوت کاتنے کے لیے آٹھ آٹھ آنہ فی اسم اور ایک ایک پٹاری روئی کے گالوں کی محلوں کی معرفت بھیجدی جاتی تھی جب سوت کتکر آجاتا تھا تو اور روئی اور کاتنے کی اُجرت بھیجدیتے تھے، سر سید کے مراد آبادی دوست بیان کرتے ہیں کہ اُس زمانہ کی عورتیں جو اب تک جیتی ہیں وہ سید احمد خاں کو اب تک دعائیں دیتی ہیں۔

سر سید صبح و شام دونوں وقت بلا ناغہ محتاج خانہ میں خود جاتے تھے۔ ایک ایک بیمار کو دیکھتے تھے جن کنگلوں کی صورت اور حالت آنکھ سے دیکھی نہ جاسکتی تھی، جن کے دست جاری ہوتے تھے، اور

کپڑے بول و براز میں لتھڑے ہوئے ہوتے تھے، اُن کو سرسید خود اپنی گود میں اُٹھا کر دوسری صاف جگہ احتیاط سے جا کر لٹا دیتے تھے۔ اُنکے کپڑے بدلواتے تھے، سر منڈواتے تھے، ہاتھ منہ دُھلواتے تھے، دوا پلواتے تھے، اور نہایت شفقت سے اُنکے ساتھ پیش آتے تھے۔ راجہ جیکشن داس صاحب سی اس آئی، کی جو آخر کو سرسید کے نہایت گہرے دوست ہوگئے اُس وقت تک اُن سے ملاقات نہ تھی، اُن کا بیان ہے کہ "جب سرسید نے رسالہ "لائل محمڈنز آف انڈیا" نکالنا شروع کیا تو اُس کے بعض فقروں سے مجھے خیال ہوا کہ سید احمد خاں نہایت متعصب آدمی ہیں اور ہندوؤں سے اُن کو ہمدردی نہیں ہے، اُس وقت میرا مصمم ارادہ ہوگیا تھا کہ اسی طرح ایک سالہ ہندو خیرخواہوں کے تذکرہ میں نکالا جائے۔ اُنہیں دنوں میں میرا مرادآباد جانا ہوا محتاج خانہ راہ میں پڑتا تھا۔ وہاں سرسید سے مُٹ بھیڑ ہوگئی۔ میں نے اُن فقروں کا ذکر کیا جنسے اُن کے تعصب کا خیال پیدا ہوا تھا، اُنھوں نے معذرت کی اور اپنے قلم کی لغزش کا اقرار کیا۔ خیر یہ تو ایک اخلاقی جواب تھا مگر جس شفقت اور ہمدردی سے وہ اُس وقت ہر مذہب اور ہر قوم کے محتاجوں کے ساتھ پیش آرہے تھے اُس کو دیکھکر میرا دل بالکل صاف ہوگیا، اور مجھے حیرت ہوگئی کہ یہ شخص کیسی پاک طبیعت کا آدمی ہے؟ وہ دن ہے اور آج کا دن اُن کے ساتھ میری محبت روز بروز بڑھتی گئی اور اب جو کچھ میرا اور اُن کا معاملہ ہے وہ سب پر ظاہر ہے"

محتاج خانہ میں شام کا کھانا سب محتاجوں کو دن چھپنے سے پہلے بٹ جاتا تھا، مگر جو بھلے مانس علانیہ محتاج خانہ میں آنے سے شرماتے تھے اُن کو عام اجازت تھی کہ رات کو اندھیرے میں آکر کھانا کھا جایا کریں۔ محتاجوں کے کھانے کے لیے ہر ایک جنس عمدہ اول درجہ کی منگوائی جاتی تھی، کھانے کے سوا اُن کے لیے ضروری کپڑا بھی تیار کرایا جاتا تھا۔

باوجود ایسے اچھے انتظام کے جس قدر کم روپیہ ضلع مرادآباد میں خرچ ہوا ایسا کسی ضلع میں نہیں ہوا سبب یہ تھا کہ جتنے آدمی عورت اور مرد محتاج خانہ میں کام کے لائق تھے سب سے کام لیا جاتا تھا، بان اور رسیاں بٹتے تھے، سوت کاتتے تھے، سڑکوں پر کام کرتے تھے، اور اَور طرح طرح کے کام جو اُن سے ہوسکتے تھے کرتے تھے، اور اس طرح اُن کے کام کی اُجرت سے ہر روز ایک قسم کثیر جمع ہوجاتی تھی جو محتاج خانہ میں صرف ہوتی تھی۔

محتاج خانہ کے علاوہ خود سرسید اپنی ذات سے اور نیز اُن کی نیک بی بی جو اُن سے بھی زیادہ خدا ترس تھیں غریبوں اور محتاجوں کی خبرگیری کرتے تھے، اُن کے مکان پر ہر روز ایک دیگ سالن کی اور روٹیاں محتاجوں کو تقسیم ہوتی تھیں۔

جب اس محتاج خانہ کی رپورٹ اسٹریچی صاحب نے گورنمنٹ میں بھیجی تو یہ انتظام ایسا پسند آیا کہ اور اضلاع کے حکام کو بھی ایسا ہی انتظام کرنے کی ہدایت ہوئی، اور اسٹریچی صاحب کا نہایت شکریہ اور تعریف کی گئی، مگر اسٹریچی صاحب نے صاف لکھ بھیجا کہ یہ تمام کارروائی سید احمد خاں سب جج نے کی ہے، اگر شکریہ اور تعریف کا مستحق ہے تو سید احمد خاں ہے۔

سرسید کو جب اسٹریچی صاحب نے قحط کا انتظام سپرد کیا تھا تو سرسید نے صاف کہدیا تھا کہ میں اس شرط پر انتظام کرتا ہوں کہ جتنے لاوارث بچے آئینگے اُن میں جتنے مسلمان ہونگے وہ مسلمانوں کو اور جتنے ہندو ہونگے وہ ہندوؤں کو سپرد کیے جائینگے، چنانچہ اُنھوں نے ایسا ہی کیا، جتنے لاوارث بچے آئے وہ ہندو مسلمانوں کے سوا کسی مشنیری کو نہیں لینے دیے، مگر حسب ہدایت اسٹریچی صاحب کے جو بچہ جس کے سپرد کرتے تھے اُس سے ایک اقرار نامہ لکھوا لیتے تھے کہ ہم اس کو لونڈی یا غلام نہیں بنائینگے۔ ہوشیار ہونے کے بعد جہاں اُس کا جی چاہے رہے اور جہاں چاہے چلا جائے۔

لیکن ہنوز قحط کا انتظام ختم نہیں ہونے پاتا تھا کہ جان اسٹریچی مراد آباد سے بدل گئے اور مسٹر پاور اُن کی جگہ آئے، مشنیریوں نے اسٹریچی صاحب کے سامنے تو دم نہ مارا، مگر اُن کے جاتے ہی مسٹر پاور سے سرسید کی شکایت کی اور یہ چاہا کہ تمام لاوارث بچے جو ہندو مسلمانوں کو دیئے گئے ہیں وہ واپس لیے جائیں، اُس زمانہ میں مسٹر الگزنڈر شکسپیر جو سرسید کے نہایت دوست تھے مراد آباد میں جج تھے۔ اُنھوں نے سرسید کو ہرچند سمجھایا کہ جتنے لڑکے اور لڑکیاں خاص تمہارے سپرد کی گئی ہیں وہ تم سے نہیں لی جائینگی مگر اور لوگوں پر اعتماد نہیں ہو سکتا کہ وہ اُنکو لونڈی غلام نہ بنائیں گے مگر سرسید نے ہرگز نہ مانا اور یہ کہا کہ "میں نے اس شرط پر قحط کا انتظام اپنے ذمہ لیا تھا کہ لاوارث بچے مشنیریوں کو نہیں دیے جائینگے، اور اسٹریچی صاحب گورنمنٹ میں رپورٹ کر چکے ہیں کہ لاوارث بچوں کا اس طرح بندوبست کیا گیا ہے پس اسکے خلاف کیونکر ہو سکتا ہے، مجھے جس طرح یہ گوارا نہیں کہ ایک سید کا بچہ مشنیریوں کو دیا جائے اسی طرح یہ بھی گوارا نہیں کہ ایک چمار کا بچہ اُن کو دیا جائے۔

مسٹر پاور کو جب سرسید کی ناراضی کا حال معلوم ہوا تو اُنھوں نے اس معاملہ پر غور کرنے کے لیے انگریزوں اور ہندوستانیوں کی ایک کمیٹی مقرر کی، چونکہ اُس زمانہ میں ہندوستانی حد سے زیادہ ڈرے ہوئے اور سہمے ہوئے تھے اور انگریزوں کے خلاف کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا تھا سرسید اور ایک دو اور ممبروں کے سوا تمام کمیٹی کا اتفاق ہو گیا کہ جتنے بچے ہندو مسلمانوں کے سپرد کیے گئے ہیں وہ واپس لیے جائیں، کیونکہ اُن پر ہرگز اعتماد نہیں کہ وہ اُن کو لونڈی غلام نہ بنائیں گے۔ آخرکار

کمیٹی کی یہ رپورٹ منظور ہوگئی اور تمام لاوارث بچے ہندو مسلمانوں سے واپس لیکر مشنریوں کو دلوا دیے گئے۔ سرسید کے ہاں بھی پانچ چار لڑکے اور لڑکیاں رہتی تھیں۔ اور اُن کی بی بی اُن کو کمال شفقت سے رکھتی تھیں۔ سرسید نے پہلے اس سے کہ کوئی اُن سے مانگنے آئے فوراً کلکٹر کے پاس بھیج دیا جاتے ہوئے وہ بچے زار قطار روتے تھے اور ہرگز جانا نہیں چاہتے تھے، مگر مجبوراً ان کو بھیجنا پڑا۔

سرسید کہتے تھے کہ اُس وقت میرا مصمم ارادہ ہوگیا تھا کہ جب کبھی موقع ملے تمام ہندو مسلمانوں سے چندہ کر کے کسی صدر مقام میں ایک بہت بڑا یتیم خانہ قائم کیا جائے جہاں ہندوستان کے لاوارث بچوں کی پرورش ہو اور اُن کو تعلیم دی جائے، لیکن آخر کو یقین ہوگیا کہ جب تک ہندوستان میں تعلیم عام نہ ہوگی اُن خرابیوں کا کلی انسداد کسی طرح نہیں ہو سکتا۔

تصحیح تاریخ فیروز شاہی

مرادآباد ہی میں اُنھوں نے تاریخ فیروز شاہی ضیائی برنی کی تصحیح کی۔ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کو اس نایاب کتاب کا چھاپنا منظور تھا۔ اُس نے سرسید سے تاریخ مذکور کا ایک صحیح نسخہ نقل کے واسطے طلب کیا تھا۔ اُنھوں نے بہت جستجو سے اُس کا ایک نسخہ اسی غرض کے لیے خریدا۔ اور سوسائٹی سے وعدہ کرلیا کہیں اپنا نسخہ صحیح کر کے بھیجونگا۔ چنانچہ اُس کی تصحیح کے لیے ایک نسخہ کتب خانہ شاہ دلی کا، دوسرا وہ نسخہ جو مسٹر الیٹ نے تاریخ ہندوستان لکھتے وقت بہم پہنچایا تھا، تیسرا نسخہ مسٹر اڈورڈ ٹامس سے، اور چوتھا بنارس سے بڑی تلاش اور تجسس سے بہم پہنچا کر اپنی کتاب صحیح کی جس سے یہ تاریخ ۱۸۶۲ء میں ایشیاٹک سوسائٹی نے چھاپ کر شائع کی۔

یہ ایک نہایت معتبر اور مستند تاریخ ہے جس کا مصنف ضیاءالدین برنی (یعنی بلند شہر) کا رہنے والا بہت بڑا فاضل اور راست بیانی میں ضرب المثل ہے۔ سرسید نے اُس کی تصحیح کے وقت اس پر ایک دیباچہ بھی لکھا تھا جس میں۔ اُن تمام تاریخوں کا جو شاہان ہند کے حال میں اس تاریخ سے پہلے اور خاص فیروز شاہ کے حال میں اس کے بعد لکھی گئی ہیں، اور نیز ضیاءالدین برنی کا حال درج ہے، یہ دیباچہ سائنٹفک سوسائٹی اخبار کی پہلی جلد میں چھپا ہوا موجود ہے۔

تبیین الکلام

۱۸۵۷ء سے پہلے جب کہ دہلی آگرہ وغیرہ میں مشنریوں کے کاروبار زیادہ پھیلنے لگے اور مسلمانوں کے ساتھ اُن کے جابجا مباحثے ہونے لگے۔ اُس وقت سرسید کو بھی یہ خیال ہوا تھا کہ اسلام کی حمایت میں مشنریوں کے اعتراضات کے جواب لکھے جائیں۔ چنانچہ غدر سے پہلے بجنور میں اُنھوں نے کچھ بطور یادداشت کے لکھا بھی تھا۔ اور اپنے بھتیجے سید محمد احمد خاں کو۔ جو اُس وقت صغیر سن تھے۔ جو کچھ لکھتے تھے بطور سبق کے پڑھاتے جاتے تھے۔

دفعتاً غدر ہوگیا اور وہ تمام یادداشتیں جاتی رہیں۔ غدر کے بعد جب اطمینان ہوا تو اس خیال نے دوسری صورت میں ظہور کیا۔ جس کا ذکر دوسرے حصہ میں کیا جائیگا۔ مگر ساتھ ہی یہ ذہن میں آیا کہ اس کام کے لیے اوّل عیسائی مذہب، اور بائبل کی حقیقت، اور اُس کی تاریخ سے، اور جو کچھ بائبل پر موافق یا مخالف لکھا گیا ہے اُس سے، واقفیت حاصل کرنی ضرور ہے اُن کو یہ بھی خیال تھا کہ اب تک جس قدر مباحثے یا مناظرے پادریوں کے ہیں یا دریوں کے ساتھ ہوئے ہیں وہ بغیر ان تمام باتوں کی واقفیت کے ہوئے ہیں، اعجاز عیسوی وغیرہ میں جو تحریف لفظی ہونے کا دعوی کیا گیا تھا اس سے سرسید کو اختلاف تھا، نسخ کے متعلق جو مسلمانوں اور عیسائیوں میں نزاع تھا اُس کو وہ محض نزاع لفظی سمجھتے تھے، بہت سی باتیں جو عیسائی لوگ بائبل سے اصول اسلام کے خلاف نکالتے تھے اُن کو سرسید عیسائیوں کی غلط فہمی سے منسوب کرتے تھے۔

لیکن ان تمام باتوں کی تحقیقات اور تصفیہ کے لیے بہت کچھ سامان درکار تھا، اتفاق سے اُنہیں دنوں میں غدر کے زمانہ کی چڑھی ہوئی تنخواہوں کا، اور جو اسباب بجنور میں لٹ گیا تھا اُسکے معاوضہ کا، بہت سا روپیہ سرسید کو سرکار سے ملا۔ اوّل اُنھوں نے عیسائی مذہب کی تمام ضروری کتابیں بائبل کی تفسیریں، اور یونی ٹیرین مذہب کی کتابیں، خریدیں۔ اور نیز لامذہبوں کی کتابیں جو بائبل کے خلاف لکھی گئی تھیں وہ بھی بہم پہنچائیں۔ ایک انگریزی خواں نوکر رکھا جو ان کتابوں کے ضروری مقامات ترجمہ کرکے سُناتا تھا۔ اور کتب احادیث وتفسیر وغیرہ سے سندیں بہم پہنچانے کے لیے ایک عربی داں عالم کو نوکر رکھا۔ اور بائبل کے متعلق جو عام واقفیت اور اطلاع مذکورہٴ بالا ذریعوں سے حاصل ہوئی اُس کو اوّل دس مقدموں اور دو قسموں میں بیان کیا، اس کے بعد بائبل کی تفسیر لکھنے اور قرآن وحدیث سے اُسکی تطبیق کرنے کا ارادہ کیا۔ مطلب یہ تھا کہ اصول اسلام اور اصول اہل کتاب میں جہانتک ممکن ہو مطابقت ثابت کی جائے، اور جہاں جہاں اختلاف پایا جائے وہاں اختلاف کی وجہ بیان کی جائے۔ اسلام کی نسبت جو بدگمانیاں عیسائیوں کو ہیں وہ رفع کی جائیں۔ اور مسلمان جو موجودہ بائبل کو مطلقاً استناد کے قابل نہیں سمجھتے اور اُس میں تحریف لفظی کے قائل ہیں اُن غلطی کو دور کیا جائے۔ اُن کو بائبل اور اُس کی تفسیروں وغیرہ کے مطالعہ سے اس بات کا یقین ہوگیا تھا کہ بائبل کی تفسیر بالکل حدیث اور قرآن کے مطابق ہوسکتی ہے۔

یہ کام نہایت مشکل تھا اور سلف میں کسی نے کبھی ایسا ارادہ نہیں کیا تھا۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ نہ کسی کو پہلے اس زمانہ کی سی ضرورتیں پیش آئی تھیں اور نہ اگلے زمانہ میں آج کل کا سامان

اور مٹیریل میسر آسکتا تھا بایںہمہ یہ کام دشواریوں سے خالی نہ تھا۔ اُنھوں نے صرف اس تفسیر کے چھاپنے کو کئی ہزار روپیہ کا پریس رُڑکی سے منگوایا۔ اور اُردو ٹائپ کے علاوہ عبرانی اور انگریزی ٹائپ کے حروف بھی منگوائے۔ ابھی کام شروع ہونے نہیں پایا تھا کہ اُن کی بدلی غازیپور کی ہوگئی۔ وہ تمام سامان اپنے ساتھ غازیپور لے گئے۔ اور وہاں اس کام میں نہایت سرگرمی اور توجہ کے ساتھ مصروف ہوئے۔

غازی پور میں اُنھوں نے سالم نام ایک یہودی کو نوکر رکھا اور اُسی سے عبرانی پڑھنی شروع کی۔ غازی پور کے ضلع میں جو مولوی عنایت رسول صاحب چڑیاکوٹی ایک بہت بڑے عالم عربی اور عبرانی کے ہیں اُنکی اعانت سے سرسید کے ارادہ کو اور بھی زیادہ تقویت ہوئی، الغرض عہد عتیق میں سے کتاب پیدائش کے گیارہویں باب تک اور عہد جدید میں سے انجیل متی کے پانچویں باب تک تفسیر اُسی التزام کے ساتھ جس کا اُنھوں نے ارادہ کیا تھا لکھی گئی۔ اور ساتھ کے ساتھ چھپتی بھی گئی۔ جو کچھ سرسید لکھتے تھے اُس کا ترجمہ انگریزی میں ایک یوروپین۔ جس کو سو روپیہ ماہوار تنخواہ دیتے تھے۔ ہر روز دو گھنٹے کرتا تھا۔ وہ ترجمہ بھی اُردو کے ساتھ چھپتا تھا۔ ایک کالم میں عبرانی توریت کی عبارت عبری خط میں، اور اُس کا اُردو ترجمہ اور انگریزی ترجمہ اُسکے نیچے لکھا جاتا تھا۔ دوسرے کالم میں اُسی مضمون کی کوئی آیت قرآنی یا حدیث اور اُس کا ترجمہ اُردو اور انگریزی اُسکے نیچے لکھا جاتا تھا۔ اسکے بعد تفسیر لکھی جاتی تھی۔

اس کتاب میں تفسیر شروع کرنے سے پہلے سرسید نے دس مقدمے جن میں سے اکثر بہت طولانی ہیں بڑی محنت اور تحقیق اور تلاش سے لکھے ہیں، جن میں مسلمانوں اور عیسائیوں دونوں کے لیے نہایت عمدہ اور قیمتی اطلاعیں مندرج ہیں۔ یہ مقدمے درحقیقت تمہید ہیں اُس مذہبی تنافر کے دور کرنیکی جو دونوں قوموں کے تعصب، لاعلمی، اور ایک دوسرے کے مذہب سے ناواقفیت کے سبب طرفین کے دلوں میں روز بروز بڑھتا جاتا تھا، اور بمنزلۂ بنیاد کے ہیں ایک ایسی تفسیر کے لیے جو بائیبل پر اُصول اسلام کے موافق لکھی جائے۔

ان مقدموں میں دکھایا گیا ہے کہ اہل اسلام کے نزدیک بھی انبیا کا مبعوث ہونا ویسا ہی ضروری ہے جیسا کہ اہل کتاب کے نزدیک ضروری ہے، اور اہل اسلام بھی تمام اگلے نبیوں اور اُنکی کتابوں اور صحیفوں پر ایمان لانا ویسا ہی ضروریات دین سے سمجھتے ہیں جیسے اہل کتاب سمجھتے ہیں، یہ بھی ثابت کیا گیا ہے کہ جن اگلی کتابوں اور صحیفوں کا ذکر قرآن میں آیا ہے یہی کتابیں آنحضرت صلعم کے زمانہ

میں موجود تھیں۔ اور آج اُن کتابوں کے معتبر اور غیر معتبر ہونے کا عقلی معیار مسلمانوں کے نزدیک بھی وہی امر قرار پا سکتا ہے جو عیسائیوں کے ہاں قرار پایا ہے، نیز محققین اور اکابر اہل اسلام مثل امام اسمٰعیل بخاری، امام فخر الدین رازی، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی وغیرہم کے اقوال سے یہ بھی ثابت کیا گیا ہے کہ جس طرح عیسائی کتب مقدسہ میں تحریف لفظی کے قائل نہیں ہیں اسی طرح محققین اہل اسلام بھی اُسکے قائل نہیں ہیں اور جس قسم کی تحریف کو عیسائی محققوں نے تسلیم کیا ہے صرف اسی قسم کی تحریف آیات قرآنی اور احادیث نبوی سے کتب مقدسہ میں پائی جاتی ہے۔ پھر جس قدر کوششیں یہودی اور عیسائی عالموں اور بزرگوں نے عہد عتیق اور عہد جدید کی حفاظت، تنقید، اور تصحیح میں ابتدا سے آج تک کی ہیں، اُن کی تمام ہسٹری، اور نتائج اُن کوششوں پر مترتب ہوئے وہ مفصل بیان کیے ہیں، پھر ترجموں کا حال اور یہ کہ اختلاف تراجم سے اصل بائبل کا محرف ہونا لازم نہیں آتا نہایت شرح و بسط کے لکھا ہے۔ پھر نسخ کی بابت جو نزاع مسلمانوں اور عیسائیوں میں تھا اُس کو محض نزاع لفظی پر محمول کیا ہے اور اس طرح اُس بون بعید کو جو علمائے فریقین کے تعصب یا لاعلمی و ناواقفیت سے اسلام اور اصلی عیسائیت کے اُصول میں پایا جاتا تھا اُس کو بہت کچھ رفع کیا ہے۔ اسکے بعد ایک دیباچہ عہد عتیق پر اور دوسرا کتاب پیدائش پر لکھا ہے پھر تفسیر شروع کی ہے۔

یہ تفسیر اس لحاظ سے کہ اُس میں تحریف لفظی کا انکار کیا گیا تھا اور نیز اسلیے کہ سر سید سے پہلے کسی مسلمان نے اُس کے لکھنے پر توجہ نہیں کی موجودہ علمائے اسلام کے خلاف تھی۔ اور اس وجہ سے کہ وہ اسلام اور خالص عیسائیت میں اتحاد ثابت کرتی تھی اور موجودہ عیسائیت کو جسکی بنیاد تثلیث، کفارہ، اور تکذیب خاتم النبیینؐ پر ہے غلط ٹھیراتی ہے۔ عیسائیوں کے برخلاف تھی۔ نیز اسکے لکھنے، ترتیب دینے اور چھپوانے میں بے انتہا محنت اور روپیہ صرف ہوتا تھا، اور کتاب کے بکنے کی بالکل امید نہ تھی، ان وجوہات سے وہ آگے نہ چل سکی۔ اگرچہ اس بات کا افسوس ہے کہ یہ تفسیر پوری نہ ہو سکی اور سر سید کا ایک نہایت مفید اور ضروری کام ادھورا رہ گیا مگر جو مقاصد اس تفسیر کے ذریعہ سے بیان کرنے منظور تھے اُن میں سے بعضے اہم اور ضروری مقصد خطبات احمدیہ میں کمال شرح و بسط کے ساتھ بیان ہو گئے ہیں، جیسے انبیائے سابقین کی پیشین گوئیاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت، یا مسئلہ تعدد ازدواج، یا مسئلۂ طلاق وغیرہ،

عیسائیوں کے ساتھ زبانی یا تحریری مباحثہ کرنیکا مخاصمانہ طریقہ۔ جو مسلمانوں میں غدر سے پہلے جاری تھا۔ اُسکا نتیجہ اگرچہ ایک لحاظ سے حق مسلمانوں کے حق میں اچھا ہو کہ مسلمان اور قوموں

کی طرح مشنیریوں کے زیادہ شکار نہیں ہوئے۔ مگر عیسائیوں کے دل میں اسلام کی طرف سے کوئی عمدہ خیال پیدا نہ ہوا۔ وہ اسلام کو بدستور ظلم، خونریزی، تعصب، اور دیگر برائیوں کا سرچشمہ سمجھتے رہے اور مسلمانوں کو عیسائیوں کا دشمن اور عیسائی قوم حکومت کا بدخواہ خیال کرتے رہے۔ پس جس طرح مسلمانوں کو مشن کی زد سے بچانے کے لیے مناظرہ کا طریقہ جاری رکھنا ضرور تھا اسی طرح یہ بھی ضرور تھا کہ مناظرہ کے مخاصمانہ طریقہ کو چھوڑ کر آشتی اور مصالحت کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ اور عیسائیوں کو دکھایا جائے کہ دنیا میں اگر کوئی مذہب عیسائی مذہب کا دوست ہو سکتا ہے تو وہ صرف اسلام ہی ہو سکتا ہے اور بس۔ ظاہر ہے کہ اس مطلب کے حاصل ہونے کے لیے کوئی طریقہ اس سے بہتر نہ تھا کہ توریت اور انجیل کی تفسیر ایک مسلمان کے ہاتھ سے لکھی جائے۔ اور جو امور فی الواقع دونوں مذہبوں میں مابہ الاجتماع یا مابہ الافتراق ہیں اُن کو اپنی اپنی جگہ صاف طور پر بیان کیا جا اور اس طرح اُس بیگانگی اور وحشت کو جو دونوں قوموں کی غلط فہمی سے پیدا ہو گئی ہے رفع کیا جائے سید احمد خاں پہلے شخص ہیں جنکے دل میں یہ خیال پیدا ہوا مگر چونکہ اس کا پورا کرنا بغیر قوم کی تائید کے اُن کی طاقت اور بوسلتے سے باہر تھا اسلیے وہ اپنے منصوبہ کو پورا نہ کر سکے۔ مگر جو نمونہ اُن کے زبردست ہاتھوں سے تیار ہو گیا ہے اُسکے موافق اُس تفسیر کا پورا کرنا اب ایسا مشکل نہیں ہے جیسا ابتدا میں نظر آتا تھا۔

جان میولسن ارنلڈ نے اپنی کتاب قرآن اینڈ بائبل مطبوعہ ۱۸۶۶ء میں سرسید کی ایک چٹھی چھاپی ہے جو اُنھوں نے اپنی تفسیر کی پہلی جلد کے متعلق مصنف موصوف کی چٹھی کے جواب میں اُنکے پاس بھیجی تھی، چونکہ اس چٹھی سے تفسیر مذکور کے لکھنے کا اصل منشا، اور اُسکی نسبت مسلمانوں اور عیسائیوں کے خیالات جو اُس وقت تھے، اور خود سرسید کا اپنے ارادہ پر ثابت قدم رہنا، اور لوگوں کی مخالفت کا کچھ خیال نہ کرنا، بخوبی واضح ہوتا ہے اسلیے یہاں اُس کا نقل کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

وہ جان میولسن ارنلڈ کو لکھتے ہیں کہ "بیشک آپ کا خیال صحیح ہے کہ کسی مسلمان نے آجتک بائبل مقدس کی تفسیر نہیں لکھی۔ خواہ کچھ ہی وجوہ ہوں جن کی وجہ سے ہمارے آبا و اجداد نے اس کام کو نہیں اُٹھایا مگر جو امر کہ موجودہ زمانہ کے ہندوستانی مسلمانوں کو جو اس کام سے مانع رہا ہے اور بہت کچھ مانع رہا ہے وہ یہ ہے کہ مسلمان عیسائی مذہب کی کتابوں کو ہمیشہ ایک بیکار اور لغو اور جھوٹے قصوں کا مجموعہ سمجھتے اور یقین کرتے رہے ہیں، اور اُنکے اس متفق یقین کو اکثر اوقات بعض پادریوں کی ناعاقبت اندیشی اور بے سمجھی کے دلائل سے بہت قوت اور مدد ملی ہے۔ ان دلائل سے بجز اس کے کہ جانبین میں ناپسندیدہ جھگڑے اور تعصب اور مخالفت اور دشمنی پیدا ہو، اور دونوں کے دل بُرے ہوں۔ اور کوئی نتیجہ حاصل نہیں ہوتا"

"جب کہ فریقین کی یہ حالت ہو تو آپ بآسانی خیال کر سکتے ہیں اور نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ اگر کوئی مسلمان ایسی تصنیف کرے جس کا مقصد انجیل مقدس کی تفسیر لکھنا، اُسکی تائید کرنا، اور اُس کو آسانی کتاب ماننا ہو تو اُسکی حالت اور منزلت اُسکے ہم مذہب لوگوں میں کیا ہو گی؟ بلاشبہ اُس سے سب لوگ متنفر ہونگے اور اُسکو بُرا کہینگے یہی حالت میری ہوئی۔ اس کام کے شروع میں میرے ساتھ بھی یہی برتاؤ ہوا۔ مگر میں نے اُن کی بے جا تضحیک، بے بنیاد دہمکیوں، اور اسی قسم کی زیادتیوں کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا۔ اور اُس بات کے کہنے میں جس کو میں حق سمجھتا تھا کسی چیز سے اندیشہ نہیں کیا، جو انعام کہ مجھکو عیسائیوں سے میرے کام کے آغاز میں ملا وہ بھی اُس سے کم نہ تھا جو میرے ہم مذہبوں نے مجھکو دیا۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ میری تفسیر کا اول حصہ چھپنے کے بعد مسلمانوں کو معلوم ہو گیا کہ جو کچھ میں انجیل کی تائید میں لکھتا تھا وہ خود قرآن پاک اور دیگر مستند کتابوں کی بنا پر تھا بہت سے میری تعریف کرنے لگے اور انجیل مقدس پر اعتقاد رکھنے اور اُس کا ادب کرنے میں میرے ہم خیال ہو گئے۔ اور بہت سے توہمات اور خیالاتِ فاسد جو اُن کو انجیل کی بابت مدتوں سے تھے کم ہو گئے۔ جیسا کہ آپ کو ذیل کے فقرات سے معلوم ہو گا جنکو میں ایک بڑے مولوی[1] کے خط سے جو میرے نام تھا نقل کرتا ہوں "میں نے آپ کی تفسیر کو پڑہا اور میں برملا اقرار کرتا ہوں کہ بلاشک وہ بے مثل کتاب ہے۔ اور مذہب اسلام کی تائید اور حمایت کرتی ہے۔ خدا کا شکر ہے اور بیحد شکر ہے کہ اس زمانہ میں آپ ایک ایسے شخص ہیں جو راہ راست کی رہنمائی کرتے ہیں، آپکی تصنیف ہر شنبہ کو پڑھی جاتی ہے۔ اور اُس کے قابل تعریف فقروں کے پڑھنے سے خدا کا شکر اور آپ کے واسطے دعا دل سے نکلتی ہے"

"بائیبل مقدس میں بعض مقامات ایسے ہیں جن کی وجہ سے مسلمان اُس سے بہت بد اعتقاد ہو گئے ہیں۔ مثلاً ابراہیم علیہ السلام کی طرف مصر میں جھوٹ بولنے کی نسبت کرنا، عیسائی مفسروں نے ان مقامات کی پوری تفسیر نہیں لکھی، لیکن میں برخلاف اُنکے کہتا ہوں کہ خود بائیبل سے، ان فقروں کے یہ معنی نہیں نکلتے جو عموماً مانے جاتے ہیں۔ اس بنا پر مجھکو امید ہے کہ میری تفسیر کا دوسرا حصہ چھپنے کے بعد مسلمانوں کا تعصب بائیبل کے ساتھ بہت کم ہو جائے گا،،

"بایں ہمہ مجھکو یقین ہے کہ میری زندگی میں عام[2] مسلمانوں کی گالیوں اور نفرت سے مجھے نجات نہ ملیگی عیسائی بھی میری تفسیر سے خوش نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ جس طرح میں انجیل کی تعلیم کو صحیح اور درست سمجھتا ہوں اسی طرح تثلیت کے مسئلہ کا قائل نہیں ہوں۔ اسلئے کہ میں انجیل میں کہیں اس مسئلہ کی تائید یا وجود نہیں پاتا ہوں۔

---

[1] غالباً یہ خط مولانا محمد فصیح مرحوم غازی پوری یا مولوی تراب علی صاحب مرحوم کا تھا ۱۲

[2] اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جو کام سرسید نے اس تفسیر کے لکھنے کے بعد عام مسلمانوں کے خیالات کے برخلاف کیے وہ سب پہلے ہی سے اُن کے مکنونِ خاطر تھے ۱۲

مجھکو یقین ہی کہ مذہب اسلام صحیح ہی اور اُس کی صحت اور وجود دونوں انجیل سے ثابت ہیں۔ اسلیے مجھے کچھ پروا نہیں کہ میں کسی گروہ کے لوگوں کو خواہ وہ مسلمان ہوں یا عیسائی خوش کروں، میں حق پر ہوں، اور اُس خدا کو خوش کرنا چاہتا ہوں جس کے روبرو سب کو ایک دن جانا ہی، البتہ میری یہ خواہش ہی ہے کہ مسلمان اور عیسائیوں میں محبت پیدا۔ کیونکہ قرآن مجید کے موافق اگر کوئی فرقہ ہمارا دوست ہو سکتا ہے تو وہ عیسائی ہیں۔ میری یہ خواہش اُن چند رسالوں کے پڑھنے سے آپ پر بخوبی ظاہر ہو جائیگی جو میں نے اس باب میں لکھے ہیں، اور جن کو اب آپ کی خدمت میں بھیجتا ہوں۔ میں نے آپ کے نام اپنی تفسیر کا پہلا حصہ بھی روانہ کیا ہی جس کا قبول کرنا میری عزت افزائی کا باعث ہوگا۔ دوسرا حصہ جب تیار ہو جائیگا آپ کی خدمت میں ارسال کرونگا،،

”یقیناً میں بھی بائبل کا اتنا ہی طرفدار اور مؤید ہوں جس قدر کہ آپ ہیں، میرا قصد ہی کہ میں ڈاکٹر کلنز کے اعتراضات کا اپنی تفسیر کے مناسب حصوں میں جب اُن کا موقع آئے جواب دوں،،

جان میولسن آرنلڈ سر سید کی یہ چٹھی اپنی کتاب میں نقل کرکے اُس پر یہ ریمارک کرتے ہیں۔ کہ ”اگر یہ خیالات عام ہو جائیں اور معلوم ہوتا ہی کہ وہ ہندوستان کے مسلمانوں میں پھیلتے جاتے ہیں تو اُن کی وجہ سے وہ نہ صرف وفادار ہو جائینگے بلکہ رفتہ رفتہ وہ دشمنی جو اسلام کے پھیلنے سے قوموں میں ہو گئی ہی دور ہو جائیگی۔ یہ تفسیر جو انجیل کو بجاے لغو سمجھنے کے۔ جیسا کہ ابتک خیال تھا۔ واجب التعلیم بیان کرتی ہی، اور اُس کا ثبوت خود قرآن سے دیتی ہی۔ اس قابل ہی کہ اُس کا ترجمہ مسلمانوں کی ہر زبان میں اور بالخصوص عربی میں ہو۔ کیونکہ مسلمانوں کے واسطے اس سے زیادہ مفید اور کوئی بات نہیں ہو سکتی کہ وہ انجیل کو اُسی عزت کی نگاہ سے دیکھنے لگیں جس نگاہ سے کہ وہ قرآن کو دیکھتے ہیں،،۔

اسکے بعد جان میولسن آرنلڈ نے ایک ایسا فقرہ لکھا ہی جس پر بے اختیار ہنسی آتی ہی وہ فرماتے ہیں کہ ”اگر یہ کام مسلمانوں ہی کے ہاتھ سے ہو جائے تو پھر عیسائیوں کو یہ بات ثابت کرنا کچھ دشوار نہو گا کہ اگر انجیل صحیح ہی تو (نعوذ باللہ) قرآن ضرور جھوٹ ہی،، معلوم نہیں کہ یہ نتیجہ اُنھوں نے کہاں سے نکالا؟ اگر وہ ذرا غور اور امعان نظر کو کام فرماتے تو یہ نتیجہ ہرگز نہ نکالتے بلکہ یہ کہتے کہ اگر انجیل اور قرآن میں مطابقت ثابت ہو گئی تو مسلمانوں کو یہ ثابت کرنا دشوار نہو گا کہ اگر انجیل صحیح ہی تو موجودہ عیسائی مذہب بالکل غلط اور انجیل کے برخلاف ہی۔ سولہ برس کا عرصہ ہوا کہ مصر میں ایک عیسائی عالم نے جس کا نام کرسٹوفر جبارہ ہی اور جو وہاں کے مشہور عیسائی اخبار شہادۃ الحق کا اڈیٹر ہی۔ مذاہب ثلاثہ یعنی یہودیت عیسائیت اور اسلام کی آسمانی کتابوں پر غور کرکے یہ رائے قرار دی تھی کہ فی الحقیقہ تینوں مذہبوں اور تینوں کتابوں کی توفیق اور تطبیق ہو سکتی ہی اور ان میں کوئی اصلی اور حقیقی اختلاف

نہیں ہے، چنانچہ اُس نے اسی موضوع پر ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام وحدۃ الادیان و وحدۃ الایمان فی التوراۃ والانجیل والقرآن ہے۔ اس کتاب میں اُس نے تینوں فرقوں کے مذہبی عقائد میں توفیق و تطبیق کی ہے اور اُس کی رائے ہے کہ عموماً اختلاف غلط فہمی سے ہوا ہے۔ اُس نے اس کتاب میں یہ بھی لکھا ہے کہ تثلیث کا مسئلہ بائیبل میں کہیں نہیں ہے۔ اس لیے عیسائیوں کی ہٹ دھرمی ہے کہ مسلمانوں کے عمدہ عقیدۂ توحید کو نہ مانیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ قرآن اور بائیبل کی مطابقت کا پہلا نتیجہ یہ ہے کہ موجودہ عیسائی مذہب کا جسکی بنیاد تثلیث پر ہے بالکل خاتمہ ہو جائے۔

آج کل ایک اور اخبار موسوم بہ اتحاد اسلامی موسیو کلافیل ایک فرنچ بیرسٹر نے مصر میں جاری کیا ہے جس کا ایک کالم عربی میں اور دوسرا اُسی مضمون کا فرنچ میں ہوتا ہے اور جس کا مقصد صرف یہ ہے کہ عیسائیوں اور مسلمانوں میں جو مذہبی یا پولٹکل غلط فہمیاں مدت سے چلی آتی ہیں اور جنہوں نے اُن کے سوشل اور پولٹکل تعلقات میں تلخی پیدا کر دی ہے اُن کو رفع کیا جائے۔ اور اسی لیے اُس نے اخبار کو ایسی دو زبانوں میں شائع کیا ہے جو تقریباً دنیا کے تمام حصوں میں کم و بیش بولی یا سمجھی جاتی ہیں۔ پس جو ضرورت کہ اس فرانسیسی عالم کو اب محسوس ہوئی ہے اُس کو سرسید نے اب سے ۳۵ برس پہلے بخوبی ذہن نشین کر لیا تھا۔ اور یہ بات ایک ہندوستانی مسلمان سے جس نے ایک قدیم اسلامی دارالخلافہ کی سوسائٹی میں نشو و نما اور پرانے اسکول میں تعلیم پائی ہو۔ کچھ کم تعجب انگیز نہیں۔

فرانس کا مشہور اورینٹلسٹ گارسن دتاسی جس نے اُردو لٹریچر کی تحقیقات میں صرف کی تھی وہ ۱۸۶۳ء کے لکچر میں سرسید کی اس تفسیر کی نسبت لکھتا ہے "ایک نئی کتاب جس کی طرف میں توجہ دلاتا ہوں وہ سید احمد خاں کی تصنیف ہے جو زمانۂ حال کے ہندوستانی مصنفوں میں سب سے زیادہ مشہور مصنف ہے۔ یہی وہ مصنف ہے جسکی کتاب آثار الصنادید کا میں نے پیرس کے ایشیاٹک جرنل میں ترجمہ کیا تھا۔ میں اس کتاب (یعنی تبیین الکلام) کے عنقریب چھپنے کی پہلی خبر دی تھی۔ اور اب میں خوشی سے اطلاع دیتا ہوں کہ اس کا پہلا حصہ چھپ گیا ہے۔ جسکی ایک کاپی میرے پاس موجود ہے جو مصنف نے مہربانی کر کے مجھے ہدیۃً بھیجی ہے۔ اس کتاب سے صرف یہی نہیں پایا جاتا کہ سید احمد خاں کو قرآن شریف اور ہماری کتب مقدسہ کا پورا پورا علم ہے۔ بلکہ بہت سی ایشیائی تصنیفات اور طرفہ تر یہ کہ بہت سی یورپین تصانیف سے اُن کو پوری پوری واقفیت ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان سب کو اُنھوں نے غور و خوض کے ساتھ مطالعہ کیا ہے۔ مگر تعجب کی بات ہے کہ اس قدر یورپ کی تصانیف تک اُن کو کس طرح رسائی حاصل ہوئی۔ حقیقت میں یہ کتاب وسیع علم کا نتیجہ ہے اور میں اپنے تئیں مبارکباد دیتا ہوں کہ یہ کتاب اُس زبان میں لکھی گئی ہے جس کا سکھانا میرا[1] فرض ہے۔ کیونکہ مجھے یقین ہے کہ یہ پہلا ہی موقع ہے کہ کسی مسلمان نے نہ صرف اُردو میں بلکہ ایشیا

[1] یہ شخص پیرس کی یونیورسٹی میں اردو لٹریچر کا پروفیسر تھا اور ہمیشہ اس سبجکٹ پر لکچر دیا کرتا تھا۔۱۲

کی کسی زبان میں اس موضوع پر ایسی مبسوط اور مکمل بحث کی ہو"۔

وفاتِ بی بی

سنہ ۱۲۷۸ ہجری مطابق سنہ ۱۸۶۱ء میں سرسید کی بی بی کا انتقال مراد آباد ہی میں ہو گیا جنھوں نے سید حامد اور سید محمود دو بیٹے اور ایک بیٹی صغیر سن چھوڑی تھی۔ اُس وقت سرسید کی عمر چوالیس برس کی تھی اور قوائے جسمانی نہایت عمدہ تھے، اُن کے دوست نہایت اصرار کرتے تھے کہ دوسری شادی کر لو اور نیز تقاضائے سن بھی یہی تھا مگر جو تعلق کہ اُن کو بی بی کے ساتھ اُن کی زندگی میں تھا اُسکے نباہ کا خیال اور صغیر سن اولاد کی پرورش کا خیال اور سب سے زیادہ بڑے بڑے ارادے جن کی دُھن اُس زمانہ میں اُن کو لگی ہوئی تھی اس امر سے مانع ہوئے اور اپنی تمام باقی زندگی محض تجرد میں کمال عفت و پارسائی کے ساتھ گذار دی اور اپنے تمام قوے اور اپنی عمر کا افضل ترین حصہ قومی خدمات کے لیے وقف کر دیا۔

تبدیلی غازی پور اور سائنٹفک سوسائٹی

۱۲- مئی سنہ ۱۸۶۲ء کو سرسید کی تبدیلی مراد آباد سے غازی پور کو ہو گئی ہم اوپر لکھ آئے ہیں کہ انتظام قحط کے بعد اُن کو ایک بہت بڑا یتیم خانہ کھولنے کا خیال ہوا تھا اور قحط سے پہلے وہ متعدد تدبیریں ملک اور قوم کی بھلائی کی کر چکے تھے، مگر بہت جلد یہ سب خیالات اُنکے دل سے محو ہو گئے اُن کو پختہ یقین ہو گیا کہ جب تک ہندوستان میں عام طور پر علم کی روشنی نہ پھیلے گی اُس وقت تک ہندوستانیوں کی بھلائی کی تمام تدبیریں بیکار اور فضول ہیں، باوجودیکہ وہ غازی پور میں سرکاری کاموں کے علاوہ بہت سا وقت تبیین الکلام کی ترتیب اور اُس کے چھپوانے کے اہتمام میں جو نہایت سخت کام تھا صرف کرتے تھے اُسی حالت میں اُنھوں نے ایک اور تدبیر اپنے ہموطنوں کی بھلائی کی سوچی۔ اُنھوں نے خیال کیا کہ ملک میں علوم جدیدہ کی عام اشاعت اُس وقت نہیں ہو سکتی جب تک کہ علمی کتابیں دیسی زبان میں ترجمہ نہ کی جائیں۔ اُنھوں نے اس بات کو انگریزی تعلیم کے پھیلانے سے بھی زیادہ ضروری اور مقدم سمجھا، کیونکہ مسلمان انگریزی پڑھنے کو گناہ سمجھتے تھے اور مسلمانوں کے سوا اور قوموں کے لیے بھی کوئی ایسی ترغیب نہ تھی جس سے وہ انگریزی تعلیم کی طرف مائل ہوں۔ تمام عدالتوں میں دیسی زبان مروج تھی۔ اعلیٰ سے اعلیٰ عہدوں کے لیے جو اُس وقت تک ہندوستانیوں کو مل سکتے تھے مشرقی زبانوں کی تعلیم کافی تھی، جن اعلیٰ عہدوں کے لیے انگریزی تعلیم کی ضرورت تھی اگرچہ ملکہ معظمہ کے اشتہار میں اُن کے ملنے کی ہندوستانیوں کو اُمید دلائی گئی تھی مگر ابھی تک عملی طور پر اُن وعدوں کا چنداں ظہور نہ ہوا تھا۔

سرسید کو یہ خیال ہوا کہ مسلمان جو انگریزی تعلیم سے نفرت اور وحشت کرتے ہیں اور ہندو جو انگریزی تعلیم کو محض نوکری کے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔ دونوں کے دل میں انگریزی تعلیم کا نقش جمانے کے

لیے ضروری ہے کہ کچھ علمی اور تاریخی کتابیں انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کرائی جائیں تاکہ مغربی لٹریچر اور مغربی علوم کی وقعت اُن کے دل میں پیدا ہو۔ اس کے علاوہ اُن کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ انگریزوں اور ہندوستانیوں میں میل جول اور ربط و اتحاد پیدا ہو جس کا نہ ہونا انگریزوں اور ہندوستانیوں کے حق میں نہایت مضر ثابت ہو چکا تھا۔ اور یہ تمام مقصد بغیر اسکے۔ کہ ایک علمی سوسائٹی قائم کی جائے جس کے ممبر انگریز اور ہندوستانی ہوں اور جو سائنس اور انگلش لٹریچر کی کتابیں اُردو میں ترجمہ کرا سکے کسی طرح حاصل نہیں ہو سکتے تھے۔

۱۸۶۳ء میں اُنھوں نے ایک تحریر اس عنوان سے کہ "التماس بخدمت ساکنان ہندوستان اور باب ترقی اہل ہند" چھاپکر مشتہر کی جس کا خلاصہ مضمون یہ تھا کہ ہندوستان میں علم کے پھیلانے اور ترقی دینے کے لیے ایک مجلس مقرر کرنی چاہیئے جو اپنے مصنفوں کی عمدہ کتابیں اور انگریزی کی مفید کتابیں اُردو میں ترجمہ کرا کے چھاپے۔ اسکے بعد وہ عملی طور پر لوگوں کو ادھر مائل کرنے کی طرف متوجہ ہوئے۔ غرض کہ اسی سنہ میں سائنٹفک سوسائٹی غازی پور میں قائم ہو گئی۔ تمام قواعد منضبط کیے گئے۔

ڈیوک اوف ارگائل جو اُس وقت وزیر ہند تھے اُنھوں نے سوسائٹی کا پیٹرن ہونا منظور کیا۔ اور ڈرمینڈ صاحب لفٹنٹ گورنر شمال مغرب اور مکلوڈ صاحب لفٹنٹ گورنر پنجاب وایس پیٹرن قرار پائے اور دور و دراز صوبوں کے بہت سے رئیس اور ذی عزت ہندو اور مسلمانوں نے اُسکی ممبری قبول کی۔ اور غازی پور میں ترجمہ کا کام باقاعدہ طور پر شروع ہو گیا۔

سرسید نے۔ جو اس سوسائٹی کے آنریری سکرٹری قرار پائے تھے اور درحقیقت وہی اُس کا ہیولے اور وہی اُسکی صورت تھی۔ سوسائٹی کے اغراض اور مقاصد مشتہر کرنے اور اُس کے ساتھ پبلک کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے کلکتہ کا سفر اختیار کیا۔ اور ۶۔ اکتوبر ۱۸۶۳ء کو مجلس مذاکرۂ علمیہ میں ایک لمبا لکچر فارسی زبان میں سوسائٹی کے مقاصد پر دیا جو کہ اُنکی اُردو اسپیچوں اور لکچروں کے ساتھ چھپ گیا ہے اور کلکتہ سے آتے جاتے جس شہر میں اُن کا گذر ہوا وہاں سوسائٹی کا چرچا کیا۔

مدرسۂ غازی پور

اسی سنہ میں اُنھوں نے غازی پور میں ایک مدرسہ قائم کرنے کی فکر کی، اگرچہ ضلع غازی پور کے اکثر ہندو مسلمان رئیسوں کی خود یہ خواہش تھی کہ غازی پور میں ایک مدرسہ قائم ہو لیکن اول تو کوئی شخص ایسا نہ تھا کہ مدرسہ کے انتظام اور حفاظت زرچندہ کی طرف سے لوگوں کو مطمئن کرے دوسرے مسلمان عموماً انگریزی کے نام سے بدکتے تھے۔ سرسید نے ان دونو مشکلوں کو حل کیا اور تھوڑا تھوڑا چندہ جمع ہونے لگا۔ اس مدرسہ کی عمارت اور اُسکے قیام کے

لیے اسّی ہزار کا تخمینہ ہوا تھا۔ جب چندہ کی مقدار سترہ ہزار تک پہنچ گئی تو اوّل مدرسہ کے لیے ایک مکان بنانا تجویز ہوا اور ۱۸۶۴ء میں ایک عام مجمع میں جس میں ہندوستانی اور تمام ضلع کے حکام شریک تھے اس کی بنیاد کا پتھر رکھا گیا اور تعمیر شروع ہو گئی۔

اس موقع پر سرسید نے ایک لمبی اسپیچ دی تھی جو اُن کی اسپیچوں اور لکچروں کے ساتھ چھپ گئی ہے یہاں ہم صرف وہ جملے جو بنیاد کا پتھر رکھے جانے کے بعد اُن کی زبان سے نکلے تھے نقل کرتے ہیں۔ "اے خدا کے بندو خدا کی مناجات کرو۔ خدا کے نام کی مدح کرو۔ خدا کا نام اس دم سے ابد تک مبارک ہووے آفتاب کے مطلع سے لے کر اُسکے مغرب تک خدا کا نام ممدوح ہو۔ ہمارا خدا غریبوں کو خاک سے اُٹھا لیتا ہے۔ محتاجوں کو کوڑے پر سے اُٹھا کر بلند کرتا ہے۔ ہمکو اپنے خدا سے محبت رکھنی چاہیئے۔ اُس نے ہماری آواز سُنی۔ اُس نے ہماری غریبی اور درماندگی پر نظر کی۔ سو جب تک ہم جیتے ہیں ہمارا بدن اور ہماری جان اور ہمارا دل اور مرنے کے بعد ہماری روح خدا کی ستایش کرے گی"۔

"اے خدا ہم میں روز بروز علم کی کمی اور جہالت کی تاریکی کی ترقی ہوتی جاتی تھی، تو نے ہمارے دلوں کو پھیرا کہ ہم علم کی روشنی پھیلانے پر مستعد ہوئے۔ بیشک سب کے دل تیری انگلیوں میں ہیں؛ جس طرف تو چاہتا ہے پھیرتا ہے۔ ہم سب تیرا شکر کرتے ہیں کہ تو نے ہمارے دلوں کو ایسے کاموں کی طرف پھیرا جو صرف ہمارے ہی لیے مفید نہیں۔ بلکہ ہمارے بعد جو بہت سی نسلیں آنے والی ہیں اُنکے لیے ایک روشنی ہے۔ تیرے سوا کسی کا مقدور نہ تھا کہ ہمارے دلوں کو جو تمام تر گناہوں اور بُرائیوں میں پھنسے ہوئے ہیں ایسے نیک کام کی طرف پھیرتا۔ اے خدا تو خوب جانتا ہے کہ یہ مدرسہ جس کا پتھر آج ہم نے تیرے نام پر رکھا ہے تیری غریب مخلوق کے فائدہ کے لیے رکھا ہے۔ تو اپنے فضل سے اپنے نام پر اس کو قبول کر۔ اور جیسا کہ تو نے خوبی سے اُس کا آغاز کیا ہے اسی طرح بخیر اُس کا انجام کر۔ ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم۔

یہ مدرسہ بھی مثل مدرسۃ العلوم کے محض قومی چندہ سے سلف ہلپ کے اُصول پر قائم کیا گیا تھا اور اُسکی ابتدائی کارروائیوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس کو ایک بڑا کالج بنانے کا ارادہ تھا۔ راجہ ہردیو نراین سنگھ اُسکے پیٹرن اور وزٹر قرار دیے گئے تھے۔ متعدد کمیٹیاں اُسکے انتظام کے لیے قرار پائی تھیں۔ انگریزی اُردو فارسی عربی اور سنسکرت پانچ زبانوں کی تعلیم کا اُس میں انتظام کیا گیا تھا۔ اگر سرسید کا چند سال وہاں اور قیام ہوتا تو کچھ عجب نہیں کہ وہ کالج کے درجہ تک پہنچ جاتا۔ مگر اُسی سال یعنی ۱۸۶۴ء ہی میں اُنکی تبدیلی علیگڈھ کی ہوگئی۔ با اینہمہ اُسکی بنیاد ایسے مستحکم اُصول پر رکھی گئی تھی کہ وہ مدرسہ آج تک وکٹوریہ اسکول کے نام سے غازی پور میں جاری ہے اور ہائی اسکول تک کی پڑھائی اُس میں برابر ہوتی ہے۔



۱۸۶۴ء میں سرسید غازی پور سے تبدیل ہو کر علیگڈھ میں جس کی عزت اور شہرت خدا تعالےٰ نے اُن کی ذات سے وابستہ کی تھی۔ آ گئے۔ چونکہ غازیپور میں سائنٹفک سوسائٹی کا اُنکی غیبت میں چلنا ناممکن تھا اسلیے سوسائٹی کا تمام سامان اور اسٹاف وہ اپنے ساتھ علیگڑھ میں لے آئے اور مسٹر ولیم جنکس بریلی جو اُس زمانہ میں علیگڑھ کے جج تھے سوسائٹی کے پریسیڈنٹ قرار پائے۔ اُنکی توجہ سے سوسائٹی کے کاروبار کو نہایت ترقی ہوئی اور یوروپین ممبروں کی تعداد بہت بڑھ گئی۔ اور سوسائٹی کے لیے ایک مستقل مکان بننے کی تجویز ہوئی جو اُس وقت تک ایک عالیشان عمارت دلکشا چمن اور وسیع احاطہ کی صورت میں موجود ہے اور تقریباً تیس ہزار کی لاگت سے خاص سرسید کے اہتمام اور نگرانی میں تیار ہوا ہے۔ اسکی بنیاد کا پتھر آنریبل ڈرمنڈ لفٹنٹ گورنر اضلاع شمال مغرب کے ہاتھ سے رکھوایا گیا تھا چنانچہ دو کتبے ہز آنر اور مسٹر بریلی جج علیگڑھ کے نام کے اُسکے سب سے بڑے ہال میں ابتک لگے ہوئے ہیں۔

۱۴۔ فروری ۱۸۶۶ء کو مسٹر ولیمس کمشنر قسمت میرٹھ کے ہاتھ سے اُسکے افتتاح کی رسم ادا ہوئی صاحب ممدوح نے افتتاح کے وقت جو تقریر کی تھی اُسکے چند جملے یہاں نقل کیے جاتے ہیں۔ اُنھوں نے کہا کہ "سید احمد خاں کے اس کام کی عظمت میں مبالغہ کرنا فضول ہے۔ تم سب صاحبوں کو معلوم ہے کہ یہ اُنہیں کا کام ہے اور وہی اس جلسہ کے بڑی ترقی دینے والے ہیں اور اس عمدہ عمارت کے جس کے کھولنے کے لیے ہم سب جمع ہوئے ہیں وہی بانی ہیں۔ اخیر کلام میرا یہ ہے کہ سید احمد خاں نے جو محبت لوگوں کے ساتھ ظاہر کی ہے سبکے دلوں پر اُس کا اثر ضرور ہوگا۔ خدا کرے کہ یہ انسٹیٹیوٹ اس بات کا سبب ہووے کہ ہم سب ہندوستانی اور انگریز ایسے بھلے کاموں میں دل سے شریک ہوا کریں اور یہی سید احمد خاں کی بڑی خواہش ہے۔ پس آؤ ہم سب اُن کی مدد کریں اور اُن کا شکر بھی ادا کریں۔ اے خدا! اس انسٹیٹیوٹ کو سرسبز کر"

اس مکان میں ہر مہینے متعدد جلسے ہوتے تھے اور مختلف مضامین پر جنسے لوگوں کو نئی نئی اطلاعیں حاصل ہوتی تھیں لکچر دیے جاتے تھے۔ ڈاکٹر کلکلی ہر مہینے ایک لکچر نیچرل سائنس پر دیتے تھے اور علمی آلات سے جو کہ سوسائٹی میں موجود تھے حاضرین کو تجربے دکھاتے تھے۔ مترجم مولوی، پریسمین، چپراسی اور مالی وغیرہ تقریباً پانسو[۵] روپیہ ماہوار کے تنخواہ دار سوسائٹی میں ملازم تھے، چند برس کے عرصہ میں بہت سی مفید کتابیں سوسائٹی نے انگریزی سے ترجمہ کرا کے چھاپیں مثلاً الفنسٹن کی تاریخ ہندوستان، رولن کی تاریخ مصر قدیم،

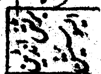
---

[۵] عملہ ترجمہ ۲۴۵ روپیہ ماہوار اور عملہ مطبع ۹۴ روپیہ ماہوار پاتا تھا اور درستی و انتظام مکان سوسائٹی کے لیے ۱۸ روپیہ ماہوار مقرر تھا (سوسائٹی اخبار مورخہ ۱۳ ستمبر ۱۸۶۶ء جلد ۲) ۱۲

تاریخ یونان قدیم، اسکاٹ برن کا رسالہ علم فلاحت، سپنسر کا رسالہ سیاست مدن، سرجان میلکم کی تاریخ ایران ریورنڈ ایکسوس کی تاریخ چین کا فارسی ترجمہ وغیرہ وغیرہ اس کے سوا اخبار بھی مدت تک بہت کثرت سے اس سوسائٹی میں آتے رہے چنانچہ ۱۸۶۶ء میں ۱۸۔ اخبار اور میگزین انگریزی اور ۲۶۔ اخبار اُردو، فارسی، عربی، اور سنسکرت کے ہندوستان اور ممالک غیر سے یہاں آتے تھے۔

سرسید نے قطع نظر اپنی ذاتی کوشش اور محنت کے جس پر فی الحقیقۃ سوسائٹی کا دارمدار تھا اور علاوہ ڈونیشن اور سالانہ چندہ کے اور طرح طرح سے سوسائٹی کو فائدہ پہنچایا، اپنا ذاتی پریس۔ جو اُنھوں نے آٹھ ہزار روپیہ خرچ کر کے تبیین الکلام کے چھاپنے کو خریدا تھا اور سوسائٹی کی تمام روئدادیں اور تمام انگریزی اور اُردو کاغذات ابتدا سے اسی پریس میں چھپتے تھے۔ جب تبیین الکلام کی چھپائی موقوف ہوگئی تو کل سامان پریس کا ایک عام جلسہ میں سوسائٹی کو مفت دیدیا۔ چنانچہ جارج ہنری لارنس نے جو اُس جلسہ میں چیرمین تھے سرسید کی نسبت یہ الفاظ کہے کہ "اگرچہ سوسائٹی سید احمد خاں کی فیاضی کی پہلے ہی سے مقروض ہے مگر اب اُس احسان کو اس عالیشان عطیہ نے اور زیادہ کردیا ہے"، نواب سکندر بیگم صاحبہ مرحومہ رئیسہ بھوپال نے جب یہ سنا کہ سید احمد خاں کی کوشش سے ہندوستانیوں کی بھلائی کے لیے یہ سوسائٹی قائم ہوئی ہے تو جون ۱۸۶۶ء میں اُنھوں نے بطور اظہار خوشنودی کے ایک الماس کی انگوٹھی قیمتی ایکہزار روپیہ خاص سرسید کے واسطے بھیجی۔ سرسید نے جلسۂ عام میں وہ انگوٹھی سوسائٹی کے اخراجات کے لیے سوسائٹی کو دیدی۔ اسکے سوا اُنھوں نے محض سوسائٹی کی امداد کے لیے فوجداری اور کلکٹری کے مختاروں کو قانون پر لکچر دینا اختیار کیا اور جو فیس اُن سے وصول ہوتی رہی وہ سوسائٹی کی نذر کرتے رہے۔

۳۰۔ دسمبر ۱۸۶۵ء کو اُنھوں نے سوسائٹی کی طرف سے گورنمنٹ شمال مغرب میں یہ درخواست بھیجی کہ سوسائٹی کا ارادہ ہے کہ اضلاع شمال مغرب کے طریقہ کشتکاری پر کتابیں تالیف کرے۔ اگر گورنمنٹ کچھ سالانہ امداد کرنی چاہے تو سوسائٹی اُسکے معاوضہ میں کتابیں دیا کریگی۔ اور کتابوں کا تالیف کرنا سرسید نے خود اپنے ذمہ لیا۔ چنانچہ گورنمنٹ نے اگست ۱۸۶۶ء میں سوسائٹی پانسو روپیہ سالانہ کی کتابیں خریدنی منظور کرلیں۔ مگر یہ کتابیں لکھی نہیں گئیں صرف مضامین کی طولانی فہرست جو سرسید نے سوسائٹی میں پیش کی تھی وہ سوسائٹی اخبار کے پرچہ نمبر ۳۲ جلد اول میں درج ہے اس فہرست کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک نہایت مشکل کام تھا۔ اور اگر سرسید اس کے سرانجام کرنے میں مصروف ہوجاتے تو اُن کو مدت تک کسی اور کام کی فرصت نہ ملتی۔



۱۰۔ مئی ۱۸۶۶ء کو سرسید کی تحریک سے بہت سے رئیس ضلع علیگڑھ اور اُس کے نواح

کے اور چند یوروپین افسر سوسائٹی کے مکان میں جمع ہوئے اور سرسید نے ایک لمبی اسپیچ کی جس کا ماحصل یہ تھا کہ "ہندوستانیوں کو گورنمنٹ سے اپنے حقوق حاصل کرنے کے لیے پارلیمنٹ سے تعلق پیدا کرنا چاہیے ایسٹ انڈیا کمپنی کی عملداری میں بڑی دقت ہندوستان کو یہ تھی کہ اُسکے تقریباً تمام معاملات صرف کورٹ آف ڈائرکٹرز تک پہنچتے تھے اور پارلیمنٹ سے بہت ہی کم تصفیہ پاتے تھے۔ مگر اب حکومت ہندوستان کی ملکہ معظمہ نے اپنے ہاتھ میں لی ہے اور اب ہندوستان کے امورات کو زیادہ تر پارلیمنٹ سے تعلق رہے گا۔ پس اس غرض کے لیے کہ پارلیمنٹ کے ممبر ہمارے حالات اور معاملات سے بخوبی واقفیت حاصل کریں۔ ہم کو ایسی تدبیر کرنی چاہیئے جس سے ہم اپنے صحیح حالات اور مناسب خواہشوں سے اُن کو مطلع کر سکیں۔ اور جس طرح اُن انگریزوں نے جو ہندوستان میں رہتے ہیں ایک ایسوسیئشن انگلستان میں قائم کرنی چاہی ہے اسی طرح ہم بھی تمام اضلاع شمال مغرب کی طرف سے ایک ایسوسیئشن اپنے ملک میں قائم کریں اور اُس کے ذریعہ سے اپنے تمام مطالب اور مقاصد گورنمنٹ اور پارلیمنٹ تک پہنچائیں"

اس تجویز کو تمام حاضرین نے پسند کیا اور اُسی وقت تو معزز ہندو اور مسلمان اُسکے ممبر مقرر ہوئے اور اس جماعت کا نام "علیگڑھ برٹش انڈین ایسوسیئشن" رکھا گیا

اس ایسوسیئشن نے چند مفید کام جب تک کہ سرسید علیگڑھ میں رہے انجام دیئے مدت تک اُس کی خط کتابت انگلستان کی ایسٹ انڈیا ایسوسیئشن کے ساتھ رہی۔ اُس نے گورنمنٹ ہند کو ایک نہایت مفصل عرضداشت بھیجکر مسافران ریل کی اُن تکلیفوں کے تدارک کی طرف متوجہ کیا جو ابتدا میں اُن کو حد سے زیادہ اُٹھانی پڑتی تھیں۔ چنانچہ اس عرضداشت پر بہت سی شکائتیں رفع کی گئیں۔ نیز اُس نے گورنمنٹ کو اس طرف توجہ دلائی کہ جس قانون کی رو سے کتابوں کی روانگی کا محصول دو چند کیا گیا ہے اُس سے ہندوستان کی علمی ترقی کو صدمہ پہنچتا ہے اسلیے ایک آنہ فی دس تولہ محصول جو بک پیکٹوں پر لیا جاتا ہے بجائے اُسکے آدھ آنہ فی دس تولہ مقرر کیا جائے۔ اسی طرح اور بعض مفید تحریکیں اُسکی طرف سے ہوئیں مگر ۱۸۶۷ء میں جب سرسید کی تبدیلی بنارس کو ہوگئی اُسی وقت اس ایسوسیئشن کی زندگی کا خاتمہ ہو گیا۔

تعلیمی کمیٹی اضلاع شمال و مغربی

۱۸۶۶ء ہی میں سرسید کی تحریک سے زمینداران علیگڑھ نے ایک درخواست گورنمنٹ میں بھیجی کہ جب کہ علاوہ جمع مالگزاری کے ایک روپیہ واسطے خرچ تعلیم کے ہم سے لیا جاتا ہے تو قرین انصاف یہ ہے کہ تعلیم کے انتظام اور نگرانی اور اخراجات میں ہم لوگوں کو بھی دخل دیا جائے اور ہر ضلع میں ایک تعلیمی کمیٹی قائم ہو جس میں حکام ضلع اور افسران سرشتہ تعلیم کے علاوہ ضلع کے رئیس اور زمیندار بھی شامل ہوں، نواب لفٹنٹ گورنر نے اوّل امتحاناً ضلع علیگڑھ اور اٹاوہ

میں تعلیمی کمیٹیوں کا مقرر ہونا منظور کیا۔ اور آخر کار تمام اضلاع شمال مغرب میں تعلیمی کمیٹیاں مقرر ہو گئیں۔ پھر جب معلوم ہوا کہ کمیٹیوں میں ہندوستانی ممبروں کا عدم اور وجود برابر ہے اور یورپین حاکموں اور افسروں کے سامنے وہ آزادی اور دلیری سے کہیں اُنکے خلاف دم نہیں مار سکتے تو ۱۸۶۲ء میں سرسید نے ایک یادداشت لکھی جس کا خلاصہ یہ تھا کہ "جس غرض سے یہ کمیٹیاں قائم ہوئی تھیں وہ اُنکے قیام سے پوری نہیں ہوئی۔ کیونکہ یورپین ممبر ہندوستانی ممبروں کو ایک مخالف فریق سمجھتے ہیں جنکو شکست دینا اپنا قدرتی حق جانتے ہیں۔ اور ہندوستانی ممبر کمیٹی میں اُن موم کی مورتوں کی مانند معلوم ہوتے ہیں جو میڈم ٹساڈ کی نمائشگاہ میں تھیں"

اگرچہ ۱۸۶۳ء میں ایجوکیشنل کمیٹیوں کے قواعد ترمیم ہو کر از سر نو جاری کیے گئے مگر چونکہ اُن سے بھی ہندوستانیوں کی مداخلت کو کچھ وسعت نہ ہوئی تو سرسید نے ۱۸۸۲ء میں ایجوکیشن کمیشن کے سامنے اُن شکایتوں کا پھر اعادہ کیا۔ اور کہا کہ جن مقاصد کے واسطے ان کمیٹیوں کے تقرر کی ضرورت تھی وہ حاصل نہ ہوئی اور اپنی رائے کے موافق کمیشن میں بہت سی ایسی اصلاحیں پیش کیں جن سے ورنیکلر تعلیم کے موجودہ انتظام کی اصلاح کی جائے۔

سائنٹفک سوسائٹی کا اخبار

۱۸۶۶ء ہی میں سرسید نے سائنٹفک سوسائٹی سے اخبار نکالا جو آخر کو علیگڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ کے نام سے اُنکے اخیر دم تک جاری رہا۔ یہ اخبار پہلے ہفتہ وار نکلتا تھا پھر ہفتہ میں دوبار نکلنے لگا۔ اس اخبار کا اڈیٹوریل اہتمام ابتدا سے اخیر تک سوائے اُن ایام کے جب کہ سرسید علیگڑھ میں نہیں رہے اُنہیں کے ہاتھ میں رہا۔ گو ایک مدت سے بسبب اسکے کہ مدرسہ کا کام حد سے زیادہ بڑھ گیا تھا اور سرسید کی تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جاری تھا اُن کو اُس میں کسی بڑے آرٹکل کے لکھنے کا موقع کم ملتا تھا۔ مگر تعلیم کے متعلق یا خاص اپنے کالج کے متعلق یا جب کبھی ملک یا قوم میں کوئی مہتم بالشان واقعہ پیش آتا تھا۔ وہ ہمیشہ اُس میں کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے تھے۔

اول اول سرسید زیادہ تر اُس میں پولٹکل معاملات پر مضامین اور نوٹ لکھتے تھے؛ اس لیے اُسکی ابتدائی جلدوں کو اُن کے پولٹکل ورکس کا ایک مجموعہ کہا جا سکتا ہے۔ اس اخبار کی بڑی خصوصیت یہ بھی کہ اُس کا ایک کالم انگریزی میں اور ایک اردو میں ہوتا تھا اور بعض مضامین اُردو میں الگ اور انگریزی میں الگ چھاپے جاتے تھے؛ اسلیے اُس سے انگریز اور ہندوستانی یکساں فائدہ اُٹھا سکتے تھے۔ اُسکا خاص مقصد گورنمنٹ اور انگریزوں کو ہندوستانیوں کے حالات اور معاملات اور خیالات سے آگاہ کرنا اور ہندوستانیوں کو انگریزی طرز حکومت سے آشنا کرنا اور اُن میں پولٹکل خیالات اور قابلیت اور مذاق پیدا کرنا تھا۔ اُسکی ابتدائی جلدوں کے دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ انگریزی خیالات کو ہندوستانی

لباس میں اور ہندوستانی خیالات کو انگریزی لباس میں ظاہر کرکے دونوں قوموں کو ملانا چاہتا ہے اگر ہمارا قیاس غلط نہ ہو تو آج کوئی پرچہ ہندوستان میں اس اخبار کے سوا ایسا نہیں نکلا جس سے یہ دونوں مقصد پورے ہو سکیں۔

اس میں سوشل، اخلاقی، علمی اور پولٹکل ہر قسم کے مضامین برابر چھپتے تھے۔ جب تک سرسید کی توجہ دوسری جانب مائل نہیں ہوئی علاوہ ان لیڈنگ آرٹکلوں کے۔ جو وہ خود لکھتے تھے انگریزی اخباروں سے عمدہ عمدہ آرٹکل جو معاملات ہندوستان سے علاقہ رکھتے تھے برابر ترجمہ ہو کر اس میں چھاپے جاتے تھے۔ ہندوستان کے طریق معاشرت، یا تعلیم، یا کسی علمی یا تاریخی تحقیقات کے متعلق جتنے لکچر سوسائٹی میں دیے جاتے تھے وہ سب اسکے ذریعہ سے شائع ہوتے تھے۔

اگرچہ یہ اخبار ملک کی سوشل اصلاح کا ہمیشہ ایک عمدہ آلہ رہا ہے اور اول اول کئی سال تک جسقدر زمانہ حال کی نئی اطلاعیں اسکی بدولت ہندوستان کو حاصل ہوتی رہی ہیں اُنکے لحاظ سے یہ کہنا کچھ مبالغہ نہیں ہے کہ کم سے کم شمالی ہندوستان میں عام خیالات کی تبدیلی اور معلومات کی ترقی اسی پرچے کے اجرا سے شروع ہوئی ہے مگر اس کے ساتھ ہی پولٹکل معاملات میں جو وقعت اور اعتبار اس پرچہ نے گورنمنٹ اور حکام کی نظر میں حاصل کیا وہ آج تک کسی دیسی اخبار نے حاصل نہیں کیا۔

جو ماٹو اُسنے اپنے لیے اختیار کیا تھا اُس کو ہمیشہ نصب العین رکھا۔ وہ ہمیشہ رعیت کو آزادی اور اطاعت سکھاتا تھا۔ اور اُن کی خیر خواہی اور وفاداری کے خیالات گورنمنٹ پر ظاہر کرتا تھا۔ اسکی آواز ہمارے عام دیسی اخباروں کی طرح کوئی معمولی آواز نہ تھی۔ بلکہ جن معاملات پر وہ بحث کرتا تھا اور دخل دیتا تھا ہمیشہ اُسکی آواز پر کان لگائے جاتے تھے اور اُس کو غور سے سنا جاتا تھا۔ اور اس کا سبب اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ اُس کا لکھنے والا اور اہتمام کرنے والا سید احمد خاں تھا۔ گورنمنٹ اور حکام اس بات کو تسلیم کیے ہوئے تھے کہ علیگڑھ کا اخبار تمام ہندوستان کے تعلیم یافتہ اور سمجھدار مسلمانوں کے خیالات کا آرگن ہے۔ کتاب "پلزاوف دی انڈین امپائر" کا مصنف اپنی کتاب میں ایک خاص موقع پر لکھتا ہے کہ "علیگڈھ انسٹیٹوٹ گزٹ سے جو مسلمانوں کا خاص آلہ ہے اگر پچھلے دو سال کے مضامین جمع کیے جائیں تو ہندوستان کے قابل اور معزز مسلمانوں کی رائے کا۔ اگرچہ وہ تعداد میں کم ہیں۔ ایک عجیب اور مفید مجموعہ نسبت جنگ روم وروس، اور روس و افغانستان، اور روس و ہندوستان کے ہمائیگا"

اسی کتاب میں علیگڑھ گزٹ کی وقعت اور اعتبار کو مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ "علیگڑھ گزٹ جسکے اڈیٹر سید احمد خاں تھے اور اب بھی وہی معلوم ہوتے ہیں شمالی ہندوستان میں سب سے عمدہ اخبار ہے"

اس کے بعد اخبار کے بعض مضامین کا خلاصہ لکھکر خاص ملکی معاملات پر مسلمانوں کی رائے کا موازنہ کیا ہے۔

جس قدر مضامین ۱۸۶۶ء سے اخیر تک اس اخبار میں خاص سرسید کے قلم سے لکھے ہوئے نکلے اگر ان کو ایک جگہ فراہم کیا جائے تو بلا مبالغہ چند ضخیم جلدیں مرتب ہو سکتی ہیں۔

ایک خاص وصف۔ جو اس اخبار کے ساتھ مخصوص تھا اور جو اُس کو ہندوستانیوں کی عام انگریزی اور دیسی اخباروں سے ممتاز ٹھیراتا تھا۔ وہ یہ تھا کہ اُس نے اپنی طرز تحریر میں برخلاف اپنے تمام ہمعصروں کے کبھی کسی قوم یا فرقہ یا کسی خاص شخص کی دل آزاری روا نہیں رکھی۔ اُس نے اپنے گاہکوں کے خوش کرنے کے لیے۔ جو ہمیشہ نوک جھوک اور چھیڑ چھاڑ سے خوش ہوتے ہیں۔ سنجیدگی اور متانت کو کبھی ہاتھ سے نہیں دیا۔ اُس نے ہندوستان کی کسی قوم کی نسبت دوستی اور خیر خواہی کے خلاف کبھی ایک حرف نہیں لکھا۔ کبھی کسی غیر قوم کے عہدہ دار کی ترقی سے ناراضی یا ناخوشی ظاہر نہیں کی۔ کبھی کسی ہندو یا مسلمان ریاست یا اُسکے اہلکاروں پر زہر نہیں اُگلا۔ ہندو مسلمانوں کے مذہبی جھگڑوں سے وہ ہمیشہ بے تعلق رہا اور اگر کبھی کچھ بولا تو دونوں کو صلح و آشتی کی نصیحت کی۔ وہ جس طرح اپنی قوم کے اکابر اور نامور لوگوں کے مرنے پر افسوس کرتا رہا اسی طرح غیر قوموں کے مشہور اور نامور لوگوں کی وفات پر ہمیشہ اُس میں دردناک اور افسوسناک مضمون نکلتے رہے، باوجودیکہ وہ گورنمنٹ اور اُسکے مدبروں پر اکثر نکتہ چینی کرتا تھا مگر اعتدال، ادب، اور تعظیم کو جو ایک محکوم قوم کا زیور ہے اُسنے ہمیشہ محفوظ رکھا اُسنے برخلاف اپنے ہمعصروں کے۔ جن کی زبان درازی سے اول لارڈ لٹن کے زمانہ میں اور اب لارڈ ایلگن کے عہد میں اُنکی آزادی چھین لی گئی۔ اپنے معتدل رویہ سے سب پر ظاہر کر دیا کہ سچی آزادی اپنی آزادی کو ہمیشہ کے لیے برقرار رکھنا ہے نہ اپنی بے اعتدالیوں کی بدولت اُسکو اپنے ہاتھ سے کھو بیٹھنا۔

ایک اور خصوصیت اس اخبار کی اُسکی باقاعدگی۔ جو اکثر دیسی اخباروں میں مفقود ہے۔ اور اُسکی خبروں کا نہایت معتبر ذریعوں سے لیا جانا تھا۔ وہ ہمیشہ بے اصل قصوں اور بے سر و پا خبروں سے مبرا دیکھا گیا۔ اُسکی خبروں کا ماخذ ہمیشہ معتبر اور مستند انگریزی اخبار رہے۔ کبھی کوئی خبر کسی نامعتبر کاغذ سے (الا ماشاء اللہ) اُسمیں نہیں لی گئی۔ دنیا کے ہر ایک بڑے واقعہ کی نسبت شروع سے اخیر تک اُسمیں تمام خبریں مسلسل اور ترتیب وار درج ہوتی تھیں جنسے اُس واقعہ کی ایک مختصر ہسٹری یعنی تاریخ مرتب ہو سکتی تھی۔ اُس کی باقاعدگی کا یہ حال تھا کہ وہ بتیس برس برابر جاری رہا اس عرصہ

میں شاید ہی کوئی نمبر ایسا ہوگا جو اپنی تاریخ معین پر نہ نکلا ہو۔ باوجودیکہ چندہ کی آمدنی سوسائٹی میں مدت سے بالکل نہیں رہی تھی اور اس لیے پچھلے برسوں میں وہ کئی ہزار کی مقروض ہوگئی تھی مگر سرسید نے جس طرح ہوسکا اخبار کو کبھی بند ہونے نہیں دیا۔

تبدیلی بنارس

۱۵۔ اگست ۱۸۶۷ء کو سرسید عہدۂ جج سمال کاز کورٹ پر ترقی پاکر علیگڑھ سے بنارس چلے گئے یہاں سے چلتے وقت وہ تمام کاروبار سوسائٹی کے راجہ جیکشن داس سی۔ اس۔ آئی کو کہ وہ اُسوقت علیگڑھ میں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ سپرد کر گئے۔ اُنھوں نے نہایت توجہ اور دلسوزی سے سوسائٹی کے کام انجام دیے اور سوسائٹی کی جو عمارتیں سرسید کے زمانہ میں پوری نہیں ہوئی تھیں اُنکو پورا کیا۔ سرسید بنارس میں بھی سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ کو برابر تقویت دیتے رہے اور اُنکے مفید آرٹکل اور مضامین اُسی طرح سوسائٹی کے اخبار میں برابر چھپتے رہے۔ اگرچہ سرسید کا تعلق ملازمت کے اخیر زمانہ یعنی جولائی ۱۸۷۶ء تک بنارس کے ساتھ رہا لیکن چونکہ وہ یکم اپریل ۱۸۶۹ء کو بنارس سے ولایت چلے گئے تھے اسلیے پہلی بار بنارس میں اُن کا قیام ایک برس اور ساڑھے سات مہینے سے زیادہ نہیں ہوا۔ اُن کے اس قلیل زمانہ کے بھی چند کام ذکر کے قابل ہیں۔

درخواست دیسی یونیورسٹی

یکم اگست ۱۸۶۷ء کو جب کہ سرسید علیگڑھ ہی میں تھے اُنھوں نے ایک درخواست برٹش انڈین ایسوسیئشن اضلاع شمال مغرب کی طرف سے ویسرائے و گورنر جنرل کشور ہند کی خدمت میں بھیجی تھی جس کا خلاصہ یہ تھا "(۱) یہ کہ اعلیٰ درجہ کی تعلیم کا ایک ایسا سرشتہ قائم کیا جائے جسمیں بڑے بڑے علوم و فنون کی تعلیم دیسی زبان میں ہوا کرے (۲) یہ کہ دیسی زبان میں اُنہیں مضمونوں کا سالانہ امتحان ہوا کرے جنمیں کہ اب طلبہ کلکتہ یونیورسٹی میں انگریزی میں امتحان دیتے ہیں (۳) جو سندیں انگریزی خواں طلبہ کو اب علم کی مختلف شاخوں میں بجلدوی تحصیل لیاقت عطا ہوتی ہیں وہی سندیں طلبہ کو عطا ہوا کریں جو اُنھیں مضمونوں کا دیسی زبان میں امتحان دیکر کامیاب ہوں (۴) یہ کہ یا تو اُردو فیکلٹی کلکتہ یونیورسٹی میں قائم کیجائے یا شمال مغربی اضلاع میں ایک جدا یونیورسٹی دیسی زبان کی قائم ہو" اس درخواست میں یہ بھی لکھا تھا کہ اس غرض کے لیے انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرنیکا کام جہانتک کہ ممکن ہوگا سائنٹفک سوسائٹی علیگڑھ انجام دیگی۔

اس درخواست پر گورنمنٹ ہند نے بڑی توجہ ظاہر کی۔ چنانچہ جو چٹھی سکرٹری گورنمنٹ ہند کی مورخہ ۵۔ ستمبر ۱۸۶۷ء سرسید کے نام بمقام بنارس موصول ہوئی اُسمیں لکھا تھا کہ "نواب گورنر جنرل اور تمام لوکل گورنمنٹیں نہایت خوشی سے اُن تمام کوششوں کی قدر کرینگے۔ جو ایسی سوسائٹیاں جیسی کہ آپ کی سوسائٹی

ہی یا خاص خاص آدمی اس مقصد (یعنی انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کرنے) کو ترقی دینے کے لیے کرینگے جو آپکی سوسائٹی کو اور گورنمنٹ کو برابر منظور ہی"، اس چٹھی میں یہ بھی لکھا تھا کہ "ہمارا مقصد صرف یہی نہیں ہے کہ فقط یونیورسٹی کے کورس کی کتابیں دیسی زبان میں ترجمہ ہوجائیں بلکہ علوم و فنون کے وسیع دائرہ میں طلبہ کو مستعد اور تیار کرنا چاہتے ہیں۔ اور چونکہ اس مطلب کے لیے کافی ذخیرہ دیسی زبان میں ابتک موجود نہیں ہی اس لیے کچھ عرصہ تک ہندوستان کے باشندوں کو انگریزی زبان کے ذریعے یہ بات حاصل کرنی ہوگی"، اسی چٹھی میں یہ بھی لکھا تھا کہ "نواب گورنر جنرل بہادر با جلاس کونسل اُن تدبیروں سے خاص رضامندی ظاہر کرتے ہیں جو علیگڑھ کی سائنٹفک سوسائٹی نے یورپ کے علوم و فنون کو دیسی زبان میں ترجمہ کرنے کے لیے اختیار کی ہیں"۔

اس چٹھی کے آنے سے بڑے بڑے لائق تعلیم یافتہ ہندوستانیوں نے ترجمہ کرنے کی ہامی بھری تھی جن میں تین نامور آدمی دلّی کے بھی تھے؛ ماسٹر پیارے لال، مولوی ذکاء اللہ، اور پنڈت دھرم نراین اور جب ان لوگوں کی آمادگی گورنمنٹ ہند کو معلوم ہوئی تو اُس نے اس بات پر اپنی رضامندی ظاہر کی۔ اس کے بعد وزیر ہند کی چٹھی مورخہ ۳۱- جنوری ۱۸۶۸ء بنام گورنر جنرل کشور ہند صادر ہوئی جس میں ایسوسئیشن کی تجویزوں سے پسندیدگی ظاہر کی گئی تھی۔

معلوم ہوتا ہی کہ اس یونیورسٹی کا چرچا شمالی ہندوستان کے تعلیم یافتہ گروہ میں بہت پھیل گیا تھا اور وہ لوگ اُس کو بہت پسند کرتے تھے۔ چنانچہ اپریل ۱۸۶۸ء میں اس یونیورسٹی کے متعلق [دلّی] سوسائٹی میں جبکہ ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم پنجاب بھی وہاں موجود تھے ایک مباحثہ ہوا اور گورنمنٹ پنجاب میں اس مضمون کا ایک میموریل بھیجا گیا کہ "یہ یونیورسٹی لاہور میں اور ترجمہ کرنے اور کتابیں بنانے کے لیے ایک کمیٹی میں قائم کیجائے اور اگر دونوں صوبوں کے لیے ایک یونیورسٹی قائم کیجائے تو اُس کا مقام دلی ہونا چاہیئے"،

اول اول سرسید بہت سرگرمی کے ساتھ اپنی عادت کے موافق اس یونیورسٹی کے قیام کی تدبیروں میں مصروف رہے۔ گورنمنٹ ہند میں اُنھوں نے اطلاع دی کہ "ترجمہ کا بوجھ سوسائٹی اپنے اوپر گوارا کرتی ہی مگر گورنمنٹ سے یہ درخواست کرتی ہی کہ جو روپیہ وہ اشاعت تعلیم کی غرض سے ہندوستان میں خرچ کرتی ہی اُسمیں سے اگر کسی قدر مناسب ہوا کرے تو سوسائٹی کی اعانت او[ر تقویت] کرے"۔ یہ بھی لکھا کہ "سوسائٹی صرف یونیورسٹی کے کورس کا ترجمہ کرنا نہیں بلکہ علوم و فنون کے دائرہ کو فراخ کرنا چاہتی ہی اور امیدوار ہی کہ اگر کاپی رائٹ کا ایکٹ ۱۸۴۲ء سوسائٹی کے مقصد میں حارج ہو تو اُس قانون کی ترمیم کیجائے اور اگر نہو اُسکی تشریح کیجائے"،

مگر معلوم ہوتا ہی کہ گورنمنٹ کا ارادہ کلکتہ یونیورسٹی توڑ کر اُسکی جگہ ورنیکلر یونیورسٹی قائم کرنیکا تھا اور انگریزی کو صرف بطور سکنڈ لینگوج کے تعلیم میں رکھنا چاہتی تھی چنانچہ سرسید نے بنارس انسٹیٹیوٹ کے

ایک جلسہ میں جو اسی معاملہ پر غور کرنے کے لیے منعقد ہوا تھا یہ تقریر کی تھی کہ "مسٹر کیمپسن (ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم اضلاع شمال مغرب) نے ایسوسئیشن کا مطلب غلط سمجھا ہے۔ ایسوسئیشن کی ہرگز یہ رائے نہیں ہے کہ انگریزی صرف بطور ایک زبان کے سکھائی جائے اور اُس کو اعلیٰ تعلیم و تربیت کا ذریعہ نہ گردانا جائے بلکہ اُسکی یہ خواہش ہے کہ انگریزی تعلیم کا طریقہ بدستور جاری رہے مگر اُسکے ساتھ ایک اور سررشتہ قائم کیا جائے جس سے انگریزی علوم و فنون اور خیالات دیسی زبان کے ذریعہ سے بہ کثرت عام ہندوستانیوں میں پھیلائے جائیں۔ پس یا تو کلکتہ یونیورسٹی میں ایک شعبہ قائم ہو یا ایک جداگانہ ورنیکلر یونیورسٹی خاص ان اضلاع میں قائم ہو"۔ اس کے بعد اپریل ۱۸۶۸ء میں جبکہ نواب لفٹنٹ گورنر بھی بنارس انسٹیٹیوٹ میں موجود تھے سرسید نے پھر اُسی تقریر کا اعادہ کیا اور کہا کہ "مجوزہ ورنیکلر یونیورسٹی کے حامی انگریزی تعلیم کا تنزل ہرگز نہیں چاہتے بلکہ اس بات کی فکر ہے کہ ہند کے کروڑہا آدمیوں کو تعلیم کا فائدہ کیونکر پہنچے"۔

غالباً زیادہ تر اسی وجہ سے گورنمنٹ کا ارادہ تعلیم کو گھٹا دینے کا تھا سرسید نے ورنیکلر یونیورسٹی کا خیال چھوڑ دیا ہوگا؛ مگر اس کے سوا خود ورنیکلر یونیورسٹی کے قائم کرنے میں بعض مشکلات ایسی تھیں جنکا حل کرنا نہایت دشوار تھا، چنانچہ سرسید نے اسی باب میں جب مسٹر پیرسن انسپکٹر مدارس حلقہ راولپنڈی سے رائے دریافت کی تو اُنھوں نے اُس کے جواب میں ایک مفصل تحریر بھیجی جس میں ترجمہ کرنے کی اصلی اور حقیقی مشکلات نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کی تھیں۔ اس تحریر نے بھی ضرور انکے ارادوں میں تزلزل واقع ہوا ہوگا، پھر انہیں دنوں میں اُن کو سفر انگلستان کا خیال پیدا ہو گیا جس میں طرح طرح کی مشکلات حائل تھیں اور اُن کا حل کرنا بجائے خود ایک بہت بڑا کام تھا۔ ان وجوہ سے سرسید اور اُن کے ساتھ جتنے آمین کہنے والے تھے سب ورنیکلر یونیورسٹی کے خیال سے دستبردار ہو گئے۔

جو موانع اس یونیورسٹی کے قائم ہونے میں پیش آئے اگر اُن میں سے کوئی امر پیش نہ آتا تو بھی یہ بیل منڈھے چڑھتی نظر نہیں آتی تھی۔ ہندوستانیوں کے اختلافات ضرور اس میں رخنہ ڈالتے۔ دہلی سوسائٹی کے ممبر یہ چاہتے تھے کہ یونیورسٹی کا مقام دہلی ہونا چاہیے اور سائنٹفک سوسائٹی اور بنارس انسٹیٹیوٹ کی ضرور یہ خواہش ہوتی کہ اس کا مقام شمال مغربی اضلاع کا کوئی شہر ہو۔ اسکے سوا اردو زبان کے مخالفوں نے اخباروں میں اس بات کی چھیڑ چھاڑ شروع کر دی تھی کہ اس یونیورسٹی میں مسلمانوں کے لیے اُردو زبان اور ہندوؤں کے لیے ہندی زبان مخصوص کی جائے۔ اور باوجود تسلیم کرنے اس بات کے کہ ہندی زبان سردست ترجمہ کی قابلیت نہیں رکھتی اس امر پر زور دیا جاتا تھا کہ اسکی ترقی میں کوشش کرکے اُس کو ترجمہ کے لائق بنایا جائے۔ اگر یہ اصرار زیادہ بڑھتا اور ضرور بڑھتا

تو گورنمنٹ آخرکار یہ فیصلہ کرتی کہ کیوں اندھا نیوتی اور کیوں دو بلائے۔

سوسائٹی کی مستقل آمدنی کی تدبیر ۱۸۶۷ء

۱۸۶۷ء ہی میں سرسید بتقریب تعطیل دسہرہ بنارس سے علیگڑھ میں آئے اور ضلع علیگڑھ کے اکثر زمینداروں پر اس بات کو ظاہر کیا کہ ابتک سوسائٹی کی کوئی مستقل آمدنی نہیں ہے ا کوئی ایسی تدبیر کرنی چاہیے کہ اُسکی آمدنی مستقل ہو جائے۔ بہت سے زمینداروں نے یہ تجویز کی کہ اس ضلع کے تمام دیہات سے کم ازکم ایک روپیہ سالانہ ہمیشہ کے لیے سوسائٹی کے قیام کے واسطے مقرر کیا جائے۔ اور اُسکی شرائط واجب العرض میں بروقت بندوبست کے درج ہو جائیں؛ تاکہ نسلاً بعد نسل ہمارے وارثوں میں کوئی عذر نہ کرنے پائے۔ چنانچہ ۱۲۔ اکتوبر ۱۸۶۷ء کو سوسائٹی کے جلسہ میں سرسید نے یہ تجویز پیش کی؛ اور ایک فہرست زمینداران درخواست دہندہ کی مع اُنکی عرضیوں کے اور مع تفصیل ۱۳۲ دیہات کے جارج ہنری لارنس کلکٹر ضلع علیگڈھ کی خدمت میں اپنی چھٹی کے ذریعے بھیجدی تاکہ وہ اُسکی تصدیق کرکے گورنمنٹ میں رپورٹ کریں؛ اور صاحب کلکٹر نے وہ تمام کاغذات گورنمنٹ میں اپنی رپورٹ کے ذریعے روانہ کردیئے۔ اُس کا نتیجہ سوا اسکے اور کچھ معلوم نہیں ہوا کہ اُس کے جواب میں جو چھٹی پرائیوٹ سکرٹری گورنمنٹ انڈیا مورخہ ۱۸۔ اکتوبر ۱۸۶۷ء بنام سرسید کے موصول ہوئی اُس میں حضور وائسرائے کی طرف سے رضامندی ظاہر کی گئی تھی۔

ہومیو پیتھک علاج کی حمایت

غالباً بنارس ہی میں پہنچکر اُنکو یہ خیال پیدا ہوا کہ ہومیوپیتھک علاج کے طریقہ سے بہتر کوئی طریقہ علاج کا عمدہ اور بے خطرہ نہیں ہے۔ اور جیسا کہ اُنکی طبیعت کا خاصہ تھا کہ جو بات یا جو کام یا جو تجویز ملک کے لیے مفید سمجھی اُسکے پورا کرنے میں ہمہ تن مصروف ہوگئے۔ اُنھوں نے ہومیوپیتھک علاج کی حمایت کرنے اور تقویت دینے کا ارادہ کیا۔ اسی ۱۸۶۷ء میں اُنھوں نے ایک کمیٹی قائم کی جس کا مقصد ہومیوپیتھک طبابت کا ہندوستان میں پھیلانا اور ہندوستانیوں کو اُسکی طرف مائل کرنا تھا۔ اس کمیٹی کے پریزیڈنٹ مہاراجہ بنارس اور سکرٹری سرسید قرار پائے۔ اور کمیٹی کی تجویز سے ۲۵۔ ستمبر ۱۸۶۷ء کو بنارس میں ایک شفاخانہ بنام "ہومیوپیتھک ڈسپنسری اینڈ ہوسپٹل" کھولا گیا۔ سرسید نے ہر طریقہ سے جو اُنکے اختیار میں تھا لوگوں کو اُسکی طرف توجہ دلائی۔ اُنھوں نے بعضے اپنے دوستوں کو جو کسی مرض مزمن میں مبتلا تھے بنارس میں بلانے کے لیے خط لکھے۔ اور جو وہاں نہ پہنچ سکے اُن کے لیے دوائیں بھجوائیں۔ اس طرح اُس شفاخانہ کا چرچا چند روز میں نزدیک دور ہو گیا۔ پایونیر کے پرچہ مورخہ ۳۔ دسمبر ۱۸۶۷ء میں اس شفاخانہ کی نسبت یہ چھپا تھا کہ "پہلے ہی مہینے میں پانسو سولہ بیمار معالجہ کے لیے ہوسپٹل میں آئے؛ حالانکہ اس سے پہلے کوئی اس طریقۂ علاج سے مطلق واقف نہ تھا"۔ ۱۷۔ دسمبر ۱۸۶۷ء

کو سرسید نے ایک طول طویل لیکچر ہومیوپیتھک طبابت کی تاریخ اور اُسکے اُصول پر اور اس بات پر کہ یہ طریقہ علاج تمام طریقوں سے زیادہ مفید اور بے خطر ہی کمیٹی کے عام جلسہ میں دیا۔ اور ۶۸ء میں ایک رسالہ ہیضہ کے علاج پر بموجب اُصول ہومیوپیتھک کے لکھا۔ یہ لیکچر اور رسالہ سوسائٹی اخبار کی جلدوں میں چھپا ہوا موجود ہے۔

اردو زبان اور ہندی جھگڑا

سرسید ہمیشہ سے جیسا کہ اُنکی مذکورۂ بالا ملکی خدمات سے ظاہر ہوتا ہی اس اصول کے پابند تھے کہ ہندوستان کی بھلائی بغیر اسکے کہ ہندو مسلمان بطور ایک قوم مل جلکر رہیں کسی طرح ممکن نہیں۔ چنانچہ اُنکے تمام پچھلے کاموں میں اس اُصول کی جھلک نمایاں طور پر نظر آتی ہی۔ مگر بدقسمتی سے ایسے اسباب جمع ہوگئے تھے کہ دونوں قوموں کا متفق رہنا ممکن نہ تھا۔

انگریزی مدارس کی تعلیم میں جس سے زیادہ تر ہندو مستفید ہوتے تھے تاریخ ہندوستان کی وہ کتابیں یا اُنکے ترجمے داخل تھے جو نہایت تعصب آمیز طریقہ پر لکھی گئی تھیں اور جن میں مسلمانوں کی بُرائیاں اور ظالمانہ کارروائیاں دانستہ یا نادانستہ نہایت تفصیل کے ساتھ درج کی گئی تھیں۔ اس تعلیم کا ضروری نتیجہ یہ تھا کہ ہندوؤں کے دل میں مسلمانوں کی طرف سے نفرت اور ناگواری کا تخم جم جائے اور وہ رفتہ رفتہ ایک نہایت گھنا اور عظیم الشان درخت ہو جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ جو روابط دوستی اور اتحاد بلکہ یگانگت کے قدیم ہندو مسلمانوں میں تھے وہ تعلیم یافتہ ہندوؤں میں بالکل باقی نہ رہے۔ اور اس کا ظہور آج ہر شخص علانیہ تمام ہندوستان میں اپنی آنکھ سے دیکھ رہا ہی۔

اسکے سوا مسلمانوں کا وقار جو ہندوستان کی قوموں کے دل میں مدت سے چلا آتا تھا وہ باقی نہ رہا تھا اور نہ رہ سکتا تھا۔ جو عزت اور جاہ منصب اور امور سلطنت میں شرکت تعلیم کی بدولت ہندوؤں نے حاصل کی تھی مسلمان اپنے غرور اور تعصب یا غفلت و بے پروائی یا افلاس کے سبب اس سے محروم تھے؛ اور واقعہ ۱۸۵۷ء نے اُنکو بھی مٹا دیا تھا۔ ان تمام باتوں کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ غالب پارٹی اپنے نئے اقتدار کا جو اُسنے مدت کے بعد حاصل کیا تھا اور جس میں بہت کچھ چاؤ اور اُمنگیں بھری ہوئی تھیں مغلوب پارٹی پر امتحان کرے، اور اگر کوئی اور حیلہ ہاتھ نہ آئے تو اسی بہانہ سے کہ دریا میں خاک کیوں اُڑاتے ہو اُس سے دست و گریباں ہو جائے۔ اُردو زبان جو درحقیقت ہندی بھاشا کی ایک ترقی یافتہ صورت ہی اور جس میں عربی و فارسی کے صرف کسی قدر اسما اُس سے زیادہ شامل نہیں ہیں جتنا کہ آٹے میں نمک ہوتا ہی اُس کو ہمارے ہموطن بھائیوں نے صرف اس بنا پر مٹانا چاہا کہ اُس کی ترقی کی بنیاد مسلمانوں کے عہد میں پڑی تھی۔

چنانچہ ۱۸۶۷ء میں بنارس کے بعض سربرآوردہ ہندوؤں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ جہانتک ممکن ہو تمام سرکاری عدالتوں میں سے اُردو زبان اور فارسی خط کے موقوف کرانے میں کوشش کیجائے اور بجائے اُسکے بھاشا زبان جاری ہو جو دیوناگری میں لکھی جائے۔

سرسید کہتے تھے کہ یہ پہلا موقع تھا جبکہ مجھے یقین ہوگیا کہ اب ہندو مسلمانوں کا بطور ایک قوم کے ساتھ چلنا اور دونوں کو ملا کر سب کے لیے ساتھ ساتھ کوشش کرنا محال ہی اُنکا بیان ہی کہ "انہیں دنوں میں جبکہ یہ چرچا بنارس میں پھیلا ایک دن مسٹر شکسپیر سے جو اُسوقت بنارس میں کمشنر تھے میں مسلمانوں کی تعلیم کے باب میں کچھ گفتگو کر رہا تھا اور وہ متعجب ہو کر میری گفتگو سن رہے تھے۔ آخر اُنہوں نے کہا کہ آج یہ پہلا موقع ہی کہ میں نے تم سے خاص مسلمانوں کی ترقی کا ذکر سُنا ہی۔ اس سے پہلے تم ہمیشہ عام ہندوستانیوں کی بھلائی کا خیال ظاہر کرتے تھے۔ میں نے کہا اب مجھے یقین ہو گیا ہی کہ دونو قومیں کسی کام میں دل سے شریک نہو سکینگی۔ ابھی تو بہت کم ہے آگے آگے اس سے زیادہ مخالفت اور عناد اُن لوگوں کے سبب جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں بڑھتا نظر آتا ہی۔ جو زندہ رہیگا وہ دیکھے گا۔ اُنھوں نے کہا اگر آپکی پیشین گوئی صحیح ہو تو نہایت افسوس ہی میں نے کہا مجھے بھی نہایت افسوس ہی مگر اپنی پیشین گوئی پر مجھے پورا یقین ہی"

غرضکہ ہندوؤں کی ایک قومی مجلس میں جو اُسوقت بابو فتح نرائن سنگھ کے مکان پر بنارس میں قائم تھی اس بات کی چھیڑ چھاڑ شروع ہوئی۔ اور رفتہ رفتہ جا بجا اُسکے لیے کمیٹیاں، مجلسیں، اور سبھائیں مختلف ناموں سے قائم ہوگئیں۔ اور ایک صدر مجلس الہ آباد میں قائم کی گئی جسکے ماتحت تمام مذکورہ بالا مجلسیں اور سبھائیں تھیں۔

یہاں یہ فکریں ہو رہی تھیں کہ اُنھیں دنوں میں لفٹنٹ گورنر بنگال بھاگلپور کی سائنٹفک سوسائٹی میں آئے۔ اور سوسائٹی کی طرف سے اُن کو ایڈریس اُردو میں دیا گیا جس میں عبارت آرائی کی غرض سے عربی اور فارسی کے الفاظ کثرت سے داخل کیے گئے تھے۔ اور اُس کا سمجھنا ایک ایسے یوروپین حاکم کو جو ہمیشہ بنگالہ میں رہا ہو آسان نہ تھا۔ بہار کے تعلیم یافتہ ہندو پہلے ہی سے تحریک کر رہے تھے کہ جس طرح بنگالہ میں بنگلہ زبان اور بنگلہ خط عدالتوں میں جاری ہو گیا ہی اسی طرح صوبہ بہار میں بہاری زبان اور کیتھی حرف جاری کیے جائیں۔ چونکہ ہز آنر ایڈریس کے بہت ہی کم الفاظ سمجھے تھے اُنہوں نے کہا کہ جس زبان میں یہ ایڈریس پڑھا گیا ہی یہ ہرگز ملکی زبان نہیں ہی اور یہ زبان بہار میں جاری نہیں رہ سکتی چنانچہ اُنھوں نے چند روز بعد حکم دیدیا کہ بہار کی تمام عدالتوں میں کیتھی حرف اور جو زبان کیتھی حرفوں میں لکھی جاتی ہی جاری ہو۔ ہر چند مسلمانوں نے اور بہت سے قدیم وضع کے ہندوؤں نے بھی

کوشش کی کہ وہ حکم ملتوی رہے مگر کچھ فائدہ نہ ہوا۔

اس واقعہ سے شمال مغربی اضلاع کے ہندوؤں کا زیادہ حوصلہ بڑھا اور اُن کی کوششیں زیادہ تیزی کے ساتھ ہونے لگیں الہ آباد کی صدر مجلس میں چند جلسے اس مسئلہ تحریک کے لیے منعقد ہوئے اور آخر کار مجلس کے سکرٹری بابو سردوا پرشاد سنڈیال نے اس باب میں سرسید سے خط کتابت شروع کی۔ سکرٹری کی متعدد چٹھیاں آئیں اور سرسید بطور اختلاف رائے کے ہر ایک کا جواب دیتے رہے اور یہ مباحثہ اخباروں میں مشتہر ہوتا رہا۔ آخر سرسید نے اس کمیٹی کی صریح مخالفت کی اور سوسائٹی اخبار میں متعدد آرٹیکل شائع کیے۔ الہ آباد کمیٹی نے بھی کئی درخواستیں اور بڑے بڑے محضر جن پر بے شمار ہندوؤں کے دستخط تھے گورنمنٹ میں بھیجے۔ سنا گیا ہے کہ مسٹر کیمپسن ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم نے بھی اس کمیٹی کی تائید کی مگر کمیٹی کو کامیابی نہوئی۔ اور غالباً سر جان اسٹریچی کی گورنمنٹ میں یہ تحریک اس بنا پر نامنظور ہوگئی کہ فارسی خط اور اُردو زبان کی اشاعت بہ نسبت ناگری اور بھاشا کے بہت زیادہ تھی۔

۱۸۸۲ء میں جبکہ سرسید وایسرائے کی لیجس لیٹو کونسل میں ممبر تھے ایجوکیشن کمیشن میں ہندوؤں کو اردو کی مخالفت کا پھر موقع ملا۔ اس دفعہ پہلے سے بھی زیادہ زور شور کے ساتھ شمال مغربی اضلاع اور پنجاب کے ہندوؤں نے اُردو زبان اور فارسی خط کی مخالفت میں کوشش کی تھی۔ دونوں صوبوں میں بے شمار سبھاؤں اور انجمنوں کی طرف سے بڑے بڑے طولانی محضر اور میموریل کمیشن میں پیش کیے گئے چنانچہ سرسید کے بعض مسلمان دوستوں نے بھی پنجاب میں انجمن حمایت اُردو قائم کی اور میموریل اور محضر کمیشن میں بھیجے، مگر کمیشن نے دونو پارٹیوں کی درخواست پر کچھ رائے نہیں دی، ہم نے سنا ہے کہ سرسید نے ایک باقاعدہ طریقہ سے کمیشن پر یہ ظاہر کر دیا تھا کہ یہ مسئلہ ایجوکیشن کمیشن سے کچھ علاقہ نہیں رکھتا بلکہ ایک بہت بڑا پولٹکل مسئلہ ہے جسکے ساتھ گورنمنٹ کے مصالح ملکی وابستہ ہیں۔ پس اسکی بحث ایجوکیشن کمیشن سے کچھ علاقہ نہیں رکھتی۔

اسکے بعد مارچ ۱۸۹۸ء میں جسکی ستائیسویں کو سرسید نے دنیا سے رحلت کی۔ حضور سر انیٹونی مگڈانل لفٹنٹ گورنر اضلاع شمال مغرب و اودھ کی خدمت میں دونوں صوبوں کے بڑے بڑے معزز اور سربرآوردہ ہندوؤں نے پھر ایک میموریل اس غرض سے گزرانا کہ تمام سرکاری عدالتوں اور کچہریوں میں بجائے اُردو زبان اور فارسی خط کے ہندی بھاشا اور ناگری خط جاری کیا جائے۔ اگرچہ سرسید پر اس زمانہ میں ہجوم رنج والم کے سبب لیاسکتہ کا سا عالم طاری تھا کہ وہ بالکل نقش دیوار بن گئے تھے مگر اُسی حالت میں اُنھوں نے اس مضمون پر آرٹیکل لکھا جو ۱۹۔ مارچ کے انسٹیٹیوٹ گزٹ میں سرسید کی وفات سے

نو دن پہلے شائع ہوا۔ اور جو کمیٹی مسلمانوں نے الہ آباد میں اُردو کی حمایت کے لیے قائم کی تھی اُس کو اس باب میں بذریعہ تحریر کے کچھ مشورے دیے اور لکھا کہ اگرچہ مجھ سے اب کچھ نہیں ہو سکتا لیکن جہانتک ممکن ہوگا میں ہر قسم کی مدد دینے کو موجود ہوں۔ اُن کو یقین ہو گیا تھا کہ ہندوؤں کا یہ کام درحقیقت محض قومی تعصب پر مبنی ہے اسلیے وہ اپنے ہندو دوستوں کی ناراضی کی مطلق پرواہ نہیں کرتے تھے جسطرح وہ ہندوستانیوں کے انگریزی لباس اور انگریزی طرز معیشت پر انگریزوں کے اعتراضات کو ہمیشہ اُنکی تنگدلی اور غرور پر محمول کرتے تھے اور کبھی اُنکے اعتراضوں کا جواب دینے سے نہ چوکتے تھے اسی طرح اُنھوں نے اُردو زبان کی مخالفت پر کبھی سکوت اختیار نہیں کیا یہانتک کہ مرتے مرتے بھی وہ اس ڈیوٹی کو ادا کیے ہوئے بغیر نہیں رہے۔ وہ اپنے آرٹکل کے شروع میں لکھتے ہیں کہ "غالباً اُسوقت اُنکے (یعنی ہندوؤں کے) اس جوش کے اُٹھنے کا سبب یہ ہے کہ اس صوبہ کے ہز آنر لفٹنٹ گورنر بہادر اُس زمانہ میں جبکہ صوبہ بہار میں کیتھی حرف اور بہاری زبان بعوض اُردو زبان اور فارسی خط کے جاری ہوئی تھی، کلکٹر و مجسٹریٹ اور معاون اُس تجویز کے تھے۔ پس ان صوبوں میں بھی ہندی و ناگری حروف جاری ہونے میں تامل نہ فرمائینگے۔ اور شاید یہ غلط خیال بھی اس پُرانے مردہ مضمون کے اُٹھانے کا باعث ہوا ہو کہ ان دنوں میں گورنمنٹ کی نظر عنایت مسلمانوں کی نسبت کم ہے اور وہ اُنکو ناشکرا سمجھتی ہے"، اسکے بعد اُنھوں نے میموریل کے خلاف اردو زبان اور فارسی خط کی ترجیح پر دلیلیں پیش کی ہیں۔ اگرچہ اُسوقت ہز آنر نے کورٹ کی زبان میں کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں سمجھی تھی مگر جو کچھ اُنھوں نے میموریل کے جواب میں فرمایا اُس سے صاف پایا جاتا تھا کہ آیندہ ایسی تبدیلی ہونی ممکن ہے۔ چنانچہ سرسید کے انتقال کے بعد ۱۸۔ اپریل ۱۹۰۰ء کو وہ مشہور رزولیوشن پاس ہوا جو دونوں قوموں کو سر انیٹونی مکڈانل کا عہد حکومت ہمیشہ یاد دلائیگا۔

اس بات کا کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ ہندوستان میں کوئی زبان اُردو سے بڑھکر عام زبان ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔ اگرچہ ملک کے بعض حصوں میں بہ نسبت بعض کے کم بولی جاتی ہے مگر ایسا کوئی حصہ نہیں جہاں اُردو کے بولنے اور سمجھنے والے نہ ہوں۔ خود گورنمنٹ اس بات کو تسلیم کر چکی ہے کہ ہندوستان کی قومی زبان اُردو ہے اور اسی بنا پر ۱۸۳۲ء میں سرکاری دفتروں اور عدالتوں کی زبان اُردو قرار دیگئی۔ اگر اور صوبوں کی نسبت کسی کو کچھ تامل بھی ہو تو شمال مغربی اضلاع کی نسبت کسی کو بھی تامل نہیں ہو سکتا کہ یہاں کی قومی زبان اردو ہے۔ یہ صوبہ اُن دو شہروں سے گھرا ہوا ہے جو اُردو زبان کے سرچشمے سمجھے جاتے ہیں، یعنی دلی اور لکھنؤ اس صوبہ کے ہندو عموماً اُردو سے ایسے ہی مانوس ہیں جیسے مسلمان۔ مگر حضرت تعصب وہ ذات شریف ہیں جن کا مقولہ ہے کہ "من

بجہنم لیکن تختۂ یاراں تباہ گردد" فرانس کے مشہور اورینٹلسٹ گارسن وتاسی جنہوں نے اُردو زبان کی تحقیقات میں اپنی عمر صرف کی ہے وہ اسی متنازع فیہ مسئلہ کی نسبت اپنے ایک لکچر میں لکھتے ہیں کہ "ہندو اپنے تعصب کی وجہ سے ہر ایک ایسے امر کے مزاحم ہوتے ہیں جو اُن کو مسلمانوں کی حکومت کا زمانہ یاد دلائے" اسپین والوں نے بھی مسلمانوں کے زوال سلطنت کے بعد اسی طرح مسلمانوں کی نشانیاں مٹائی تھیں مگر اُنھوں نے اپنی حکومت کے زمانہ میں ایسا کیا تھا اور ہمارے ہموطن بھائی محکوم ہونے کی حالت میں ایسے ارادے رکھتے ہیں۔ لیکن ہم کو اطمینان رکھنا چاہیے کیونکہ جس تعلیم نے ہمارے ہندو نوجوانوں کو مسلمانوں سے تعصب اور نفرت کرنا سکھایا ہے وہی آگے چل کر اُن کو یہ سبق دیگی کہ جب تک ہندو مسلمان مل جل کر نہ رہیں گے اور ایک دوسرے کے مصالح کو ملحوظ نہ رکھیں گے تب تک برٹش انڈیا میں اصلی عزت حاصل نہیں کر سکتے۔

انگریزوں کے ساتھ کھانا

۱۸۶۶ء میں سرسید کے پاس ایک سوال استفتا کے آیا تھا کہ مسلمانوں کو انگریزوں کے ساتھ بشرطیکہ کھانے پر کوئی حرام چیز نہ ہو کھانا پینا درست ہے یا نہیں؟ سرسید نے اُس کا جواب آیات و احادیث کے حوالہ سے لکھدیا کہ جائز ہے؛ اور ہندوستان کے سوا تمام دنیا کے مسلمان انگریزوں کے ساتھ برابر کھاتے پیتے ہیں۔ یہ جواب ۱۴ دسمبر ۶۶ء کے سوسائٹی اخبار میں چھپا۔ اس پر ایک سید صاحب نے اڈیٹر کے نام لکھنؤ سے ایک چٹھی لکھی اور سرسید کے جواب پر نہایت خوشی ظاہر کی۔ اور لکھا کہ "میں اُس دن کے دیکھنے کا نہایت مشتاق ہوں جب یہ سنوں کہ سید احمد خاں نے اپنے قول کے موافق عمل بھی کیا" اسکے جواب میں سرسید نے لکھا کہ "میں نے اسلام کو ماں باپ کی تقلید سے نہیں بلکہ بقدر اپنی طاقت کے خود تحقیق کر کے تمام مذاہب معلومہ سے اعلیٰ اور عمدہ اور سچا یقین کیا ہے۔ اور اسی سچے مذہب نے مجھے سکھایا ہے سچ کہنا اور سچ کرنا۔ نہایت کمینہ وہ آدمی ہے جو کہتا کچھ ہو اور کرتا کچھ ہو۔ اور اُس سے زیادہ کمینہ وہ شخص ہے جو شریعت کے حکم سے واقف ہو اور پھر رسم و رواج کی شرم سے یا لوگوں کے لعن و طعن کے ڈر سے اُسکے کرنے میں تامل کرے۔ ایسلیے میں کسی انگریز کے ساتھ کھانے پینے میں بشرطیکہ شراب اور سُؤر یا اور کوئی حرام چیز نہو۔ کچھ تامل نہیں کرتا۔ میرے انگریز دوست میرے ہاں مہمان ہوتے ہیں میں اُنکے ہاں مہمان ہوتا ہوں۔ اور ہم اور وہ ایک میز اور ایک دسترخوان پر کھاتے ہیں جس چیز میں ہمکو خدا کے حکم سے شرم نہیں اُسمیں دنیا کی لوگوں سے کیا ڈر ہو"

معلوم ہوتا ہے کہ اس واقعہ سے بہت پہلے سرسید نے انگریزوں کے ساتھ کھانے پینے کا پرہیز چھوڑ دیا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ "بجنور فتح ہونے کے بعد میں اور مسٹر پامر مجسٹریٹ ضلع بجنور نجیب آباد سے بجنور کو آتے تھے۔ رستہ میں ایک جگہ ہم دونو اُترے۔ اور ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ مسٹر پامر نے مجھ سے پوچھا کہ چاے پیو گے؟ میں نے کہا کہ یہاں چاے کہاں؟ اُنھوں نے کہا کہ ہمارے ساتھ بنی ہوئی بوتل میں موجود ہے۔ میں نے کہا بہت بہتر۔ غرضکہ ہم نے چاے پی اور ایک دو توس کھایا۔ وہاں سے چلکر نگینے میں مقام ہوا۔ عصر کے وقت سب لوگ جماعت سے نماز پڑھ

ہوئے تھے۔ پوچھا کہ صدر امین نے تو انگریز کے ہاں کی بنی ہوئی چائے پی ہے اور توس کھائے ہیں پھر یہ نماز میں کیونکر شریک ہوئے۔ جب مجھے معلوم ہوا تو میں نے اُن کو سمجھایا کہ قرآن مجید کی رو سے انگریزوں کے ہاں کا کھانا اور اُن کے ساتھ کھانا درست ہے۔ اُن لوگوں نے میری اُس روز کی تقریر کو نہایت تعجب سے سنا۔ پھر ایک روز مجھ کو میں رات کو مسٹر پامر کے ہاں جانے کا اتفاق ہوا۔ وہ کھانے پر جانے والے تھے اُنھوں نے کہا کہ تم بھی کھانا یہیں کھالو۔ اور خانساماں کو اشارہ کیا کہ میرے سامنے بھی رکابی لگا دے۔ خانساماں کو اس بات سے ایسا تعجب ہوا کہ کئی دفعہ اشارہ کرنے پر بھی نہ سمجھا کہ آج ایک مسلمان انگریز کے ساتھ کھانا کھائے گا"

اگرچہ سرسید انگریزوں کے ساتھ مدت سے کھانے پینے لگے تھے لیکن ابھی تک اُن کو مسلمانوں میں اس خیال کے زیادہ پھیلانے کا کچھ خیال نہیں تھا۔ مگر جب اُنھوں نے دیکھا کہ رسم و رواج کی قیدیں ایک آدمی کے اُٹھا دینے سے نہیں اُٹھتیں، اور مسلمانوں کا انگریزوں سے خوف اور وحشت کرنا اور انگریزوں کا مسلمانوں سے بدگمان اور متنفر رہنا اُس وقت تک موقوف نہ ہوگا جب تک کہ دونو قوموں میں میل جول اور ربط ضبط نہ ہو اور ہر ایک قوم کو دوسری قوم کے اصلی خیالات بلا واسطہ معلوم کرنے کا موقع نہ ملے۔ اسلیے اُنھوں نے ایک مبسوط اور مفصل تحریر ۱۸۶۸ء میں بنام "رسالہ احکام طعام اہل کتاب" بنارس میں لکھکر شائع کی جس میں آیات قرآنی اور احادیث نبوی اور روایات فقہی سے اور خاصکر شاہ عبدالعزیزؒ کے فتوے سے جسپر تمام ہندوستان کے مسلمانوں کو اعتبار ہے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ مسلمانوں کو انگریزوں کے ہاں خود اُنکے ساتھ اُنہیں کے ہاتھ کا پکا ہوا اُنہیں کے برتنوں میں اور اُنہیں کا ذبیحہ جس طرح کہ اُنھوں نے کیا ہو کھانا درست ہے۔ صرف سُؤر اور شراب اور حرام چیزوں سے پرہیز کرنا لازم ہے۔

اس رسالہ میں اُن تمام شبہات کا جواب۔ جو ہندوستان کے علماے اسلام مواکلت اہل کتاب پر کرتے تھے اور جن شبہات کی وجہ سے مسلمانوں کو انگریزوں کے ہاں کی ہر ایک کھانے پینے کی چیز اور اُنکے ساتھ کھانا کھانے سے اجتناب تھا۔ نہایت شافی طور پر جو ایک منصف مزاج آدمی کی تسلی کیلئے کافی دوافی ہو لکھا ہے۔ جب یہ رسالہ چھپا تو اول اوّل بہت شور و غل ہوا۔ سرسید کو کرسٹان کہا گیا۔ اُنکے ساتھ کھانا کھانے سے احتراز کیا گیا۔ اُن کے رسالہ کے جواب لکھے گئے بعضوں نے اس باب میں کوشش کی کہ سرسید کے ساتھ سب مسلمان کھانا پینا چھوڑ دیں۔ مگر بقول سرسید کے وہ سب باتیں ایسی تھیں جیسے آندھی کا ایک بگولا اُٹھا اور خاک اُڑا کر چلا گیا پھر مطلع صاف ہو گیا۔ اب وہی لوگ جو سخت معترض تھے خود انگریزوں کے جاکر اور اُن کو اپنے ہاں بلاکر ساتھ کھانے کو اپنا فخر سمجھتے ہیں۔ البتہ جن لوگوں کی انگریزوں تک رسائی نہیں وہ اپنے تقوے اور طہارت پر بدستور قائم ہیں۔

چوتھا باب

۱۸۶۹ء سے ۱۸۷۰ء تک

سفرِ انگلستان، سفرنامہ، لندن کے عمائد سے ملنا، جلسۂ سنٹونین سوسائٹی اوف سول انجنیرس میں شریک ہونا، سی ایس آئی کا خطاب اور تمغا ملنا، ملکۂ معظمہ کی لوی میں شریک ہونا، پرنس اوف ویلز کی لوی میں بلایا جانا، اتھینیم کلب کی ممبری، کیمبرج یونیورسٹی میں جاکر وہاں کے طریقۂ تعلیم و تربیت پر غور کرنا، تعلیم ہندوستان پر پمفلٹ لکھنا، خطبات احمدیہ لکھکر شائع کرنا، جان ڈیون پورٹ کی کتاب چھپواکر شائع کرنا

سرسید نے غدر ۱۸۵۷ء کے بعد جن دو باتوں کو مسلمانوں کی آیندہ بہبودی کے لیے ضروری سمجھا تھا اُن کے لیے انگلستان کا سفر کرنا نہایت ضروری تھا۔ اُن کا یہ خیال تھا کہ جب تک مسلمانوں میں مغربی تعلیم نہ پھیلے گی؛ اور جب تک مسلمانوں اور انگریزوں میں موانست اور میل جول پیدا نہ ہوگا؛ اُس وقت تک مسلمانوں کا پنپنا، اور ہندوستان میں عزت سے رہنا دشوار ہے۔ گو وہ اب تک ان دو تدبیروں میں برابر سرگرم رہے؛ مگر جس حد تک وہ اپنا منصوبہ پورا کرنا چاہتے تھے اُس کے لحاظ سے اُن کو ولایت کا سفر کرنا ضروری معلوم ہوا۔ اس کے علاوہ سر ولیم میور کی کتاب "لائف اوف محمد" کا جواب لکھنے کے لیے۔ جس کا اُن کو حد سے زیادہ خیال تھا۔ بہت سی ایسی کتابوں اور نوشتوں کی ضرورت تھی جو ہندوستان میں نایاب تھیں؛ اور صرف برٹش میوزیم، یا انڈیا اوفس کے کتب خانوں میں اُن کے ملنے کی امید تھی۔

مگر اُس وقت ولایت جانا آسان نہ تھا۔ اول تو ایک ایسا شخص جس کی آمدنی ہمیشہ خرچ سے شرمندہ رہے۔ اُس کو ولایت جانا اور وہاں جاکر اپنے تمام مقاصد پورے کرنے کے لیے ایک مدت تک قیام کرنا سخت مشکل تھا۔ پھر جیسا کہ آج کل ہندوستانی مسافروں کا انگلستان تک برابر تانتا بندھا ہوا ہے؛ اُس زمانہ میں یہ حال نہ تھا۔ ہندوستانی اس دور و دراز سفر سے ہچکچاتے تھے؛ اور بمبئی و بنگال کے معدودے آدمیوں کے سوا کسی نے یہ سفر اختیار نہیں کیا تھا۔

حسنِ اتفاق سے اُنہیں دنوں میں گورنمنٹ ہند نے ہندوستانیوں کو تعلیم کی غرض سے ولایت بھیجنے کے لیے علاوہ تین ہزار روپیہ خرچ آمد و رفت کے چھ چھ ہزار سالانہ کی نو سکالرشپیں چند

صوبوں کے واسطے منظور کی تھیں۔ خوش قسمتی سے گورنمنٹ اضلاع شمال مغرب نے اپنے صوبہ کی سکالر شپ کے لیے سید محمود کو انتخاب کیا۔ اگرچہ یہ روپیہ صرف سید محمود کے بھیجنے کے لیے بھی کافی نہ تھا؛ مگر گورنمنٹ کی اس امداد سے سرسید کے ارادہ کو بہت تقویت ہوئی۔ اُنھوں نے فوراً ولایت جانے کی دل میں ٹھان لی۔ جس نیت اور جس ارادہ سے اُنھوں نے سید محمود کے ساتھ خود ولایت جانے کا ارادہ کیا تھا وہ کسی قدر اُن کی درخواست رخصت سے جو ۱۵ فروری سنہ ۱۸۶۹ء کے سوسائٹی اخبار میں چھپی تھی؛ معلوم ہوتی ہے۔ درخواست کا مضمون یہ ہے۔

"یہ بات بخوبی میرے ذہن نشین ہے کہ ہندوستان کی فلاح وبہبودی کو کامل ترقی دینے اور گورنمنٹ انگریزی کے مطلب کو جسکی ملازمت کا فخر مجھکو حاصل ہے بخوبی استحکام و پائداری بخشنے کے واسطے اسکے سوا اور کسی امر کی ضرورت نہیں ہے کہ اہل یورپ اور ہندوستان کے درمیان ربط وضبط کو ترقی دیجائے۔ پس اس مقصد کی تکمیل کے واسطے ہندوستانیوں کو میری رائے میں یوروپ کے سفر کی ترغیب دینی چاہیے تاکہ وہ مغربی ملکوں کی شائستگی کے عجیب وغریب نتیجوں اور اُس کی ترقی کو بچشم خود مشاہدہ کریں؛ اور اس بات کا اندازہ کر سکیں کہ انگلستان کے لوگ کیسے دولتمند، طاقت ور اور دانا ہیں؛ اور اُن مفید اور عمدہ باتوں کو ہندوستان کی بھلائی کے واسطے سیکھیں جو اس امر کے نتیجے ہیں کہ تجارت کے باب میں انگلستان کے باشندے کیسے مستعد ہیں؛ اور کارخانوں اور کاشتکاری اور شفاخانوں اور خیرات اور اُس کے شہروں کی صفائی اور اُس کی دولت اور علم سے روز بروز زیادہ کام لیا جاتا ہے"۔

"پس اس خواہش سے میں یہ بات چاہتا ہوں کہ خود انگلستان جاکر اپنے ہموطنوں کے لیے ایک نظیر قائم کروں مجھکو یقین ہے کہ صرف مجھکو ہی اس سفر سے فائدہ نہ ہوگا؛ بلکہ امید ہے کہ اپنے سفر کے نتیجوں سے اُن کو مطلع کر کے اُنکو بھی فائدہ پہنچا سکوں؛ اور اس طرح پر جو عمدہ باتیں میں نے سیکھی ہوں اُنکو بھی سکھاؤں؛ اور اُن کو بھی اپنی پیروی کی ترغیب دوں"

مولوی سید مہدی علیخاں اپنی ایک تحریر میں لکھتے ہیں کہ "جب سید احمد خاں لندن جانے کو تھے تو مالی مشکلات اس قسم کی تھیں کہ اگر کوئی دوسرا شخص ہوتا تو اس ارادہ کو پورا نہ کر سکتا۔ اُنھوں نے اپنے کتب[1] خانہ کو بیچا، گھر اور کوٹھی کو رہن رکھا اور سفر کی تیاری کی۔ اُنھوں نے بارہا مجھسے اس بارہ میں پیشتر ذکر کیا تھا کہ میرا مقصود پورا نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں بذات خود اصول وطرز تعلیم سے واقفیت حاصل نہ کر لوں"۔

الغرض یکم اپریل سنہ ۱۸۶۹ء کو وہ بنارس سے ولایت کو روانہ ہوئے۔ اُن کے ساتھ دونوں بیٹے

---

[1] مثلاً توزک جہانگیری جسکو اُنھوں نے بڑے اہتمام سے ٹائپ میں چھپوایا تھا اور دس روپیہ فی جلد اُس کی قیمت رکھی تھی ولایت جاتے وقت اُس کی تمام جلدیں ایک روپیہ فی جلد کے حساب سے فروخت کر دیں اور اُن کے جلنے کے بعد وہ تمام کاپیاں پانچ روپیہ فی کاپی کے حساب سے ہاتھوں ہاتھ بک گئیں۔ ۱۲

سید حامد مرحوم اور سید محمود اور تیسرے مرزا خداداد بیگ اور چوتھا انکا قدیم خدمتگار چھجو یہ چار آدمی تھے۔ بنارس سے لندن تک پہنچنے کے حالات انہوں نے بطور ایک سفرنامہ کے نہایت عمدگی سے بیان کیے ہیں؛ جو سوسائٹی اخبار اور تہذیب الاخلاق میں چھپ گئے ہیں۔

اس سفرنامہ میں ہر ایک دلچسپ حال جو اثنائے راہ میں اُن کو پیش آیا ہے قلمبند کیا ہے اور سفر کی ضروریات جو ہر مسافر کو پیش آتی ہیں مفصل بیان کی ہیں۔ اور وقتاً فوقتاً جو خیالات اپنے خاص مقصد یعنی وطن کی بھلائی کے اُن کے دل میں گذرے ہیں انکو ہر موقع پر ظاہر کیا ہے۔ جا بجا ایشیا اور یورپ کی سوشل اور مورل حالتوں کا مقابلہ کیا ہے۔ یورپ کے عجائبات ایسے طور پر بیان کیے ہیں جس سے پڑھنے والوں کو یورپ کے سفر کی ترغیب ہو۔

جس دُھن میں سرسید نے یہ سفر اختیار کیا تھا اُس کا ثبوت اس سفرنامہ میں نہایت وضاحت کے ساتھ ملتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ سفرنامہ لکھنے والا وطن اور قوم کی خیرخواہی اور ہمدردی میں شوربور ہے۔ بمبئی میں پہنچکر کہیں وہ میمن مسلمانوں کے اخلاق، نام و نمود پر مرنے، جھوٹی شیخی کرنے، مفید تعلیم پر متوجہ نہونے اور گھروں پر مدرس نوکر رکھنے پر افسوس کرتا ہے؛ اور پارسیوں کی عمدہ حالت سے انکا مقابلہ کرتا ہے۔ کہیں پارسیوں کے صاف اُردو بولنے پر حیران ہوتا ہے؛ اور اُن لوگوں پر تعجب کرتا ہے جو اُردو کو ہندوستان کی قومی زبان نہیں مانتے۔ کہیں گجراتی زبان کی کچھ عبارت نقل کرتا ہے؛ اور بتاتا ہے کہ اُس میں بھی فارسی، اور عربی الفاظ ملے ہوئے ہیں؛ اور پھر سوال کرتا ہے کہ الہ آباد ایسوسی ایشن کون کون سی زبان سے فارسی و عربی الفاظ نکالکر قدیم بھاشا جاری کریگی؟ مصر کی ریل کی تعریف کرکے افسوس کرتا ہے کہ ریل کا تمام سامان فرانس اور انگلستان کا بنا ہوا ہے؛ مصریوں کی کوئی چیز بنائی ہوئی نہیں۔ مسٹر ڈینیس، فٹز پیٹرک سے جہاز میں ملتا ہے؛ اور پنجاب کی طرز حکومت کے ذکر میں اُسکو ایک ڈسپاٹک گورنمنٹ کا نمونہ بتلاتا ہے؛ اور دلّی کو قانونی اضلاع میں سے نکالکر پنجاب میں داخل کرنے کو غدر کی سزاؤں میں سے ایک سزا قرار دیتا ہے؛ فرانس کے نامور انجنیر ایم۔ دی لیسپس سے (جسنے نہر سوئز نکالی ہے) جہاز میں ملنے پر بے انتہا خوشی اور فخر ظاہر کرتا ہے، اور اس بات کا ذکر کرتا ہے کہ جب انگریزوں نے اُسکو ایڈریس دیتے وقت کہا کہ اس نہر کا نام نہر لیسپس رکھنا زیبا ہے تو ایم دی لیسپس نے جواب دیا کہ میرا فخر اس میں ہے کہ اس کا نام نہر فرانس رکھا جائے وہاں اُس کی وطن پرستی پر ہزار ہزار آفریں کرتا ہے اور اپنی قوم پر نفریں کہ انکا کام سوائے حسد، بغض، تشخص اور جھوٹی شیخی کرنے کے کچھ نہیں؛ اور اسی لیے وہ بدبختی اور ذلت میں گرفتار ہیں۔ اس بات پر افسوس کرتا ہے کہ جس آبنائے پر محب وطن "گیری بالڈی" کا گھر ہے وہاں سے جہاز رات کو گذرا

اور اُس پھونس کے جھونپڑے کی جو شہنشاہوں کے محلوں سے زیادہ ادب اور تعظیم کے قابل ہے۔ زیارت میسر نہ آئی۔ پیرس کی عمارتوں کی خوبی کا ذکر کرتے وقت روضۂ تاج گنج اور قطب کی لاٹ کو یاد کرتا اور اُس پر فخر کرتا ہے۔ وارسیل کے شہنشاہی محل میں حوض اور نہریں اور فوارے اور درختوں کی موزونیت دیکھکر قلعہ دہلی کی نہر بہشت اور مہتاب باغ کا حوض۔ جسکے کناروں سے کبھی تین سو ساٹھ فوارے چھوٹتے تھے۔ اور ساون بھادوں کی کیفیت یاد کرتا ہی۔ وارسیل میں تصویروں کا عالم دیکھکر حیران ہوتا ہے؛ مگر الجزائر کے محاربات کی تصویروں میں ایک مُرقع دیکھکر اُس کے دل پر سخت چوٹ لگتی ہی؛ جس کی وجہ سے وہ فرانس اور اُس کی بہادری وسویلزیشن کو قابل نفرین سمجھتا ہے۔ اُسنے ایک تصویر دیکھی ہے کہ سید عبدالقادر جزائری کی عورتیں گرفتار ہیں؛ فرانسیسی سپاہیوں نے اُنکے اونٹ بٹھاکر کجاوہ کو گرا دیا ہے ؛ اور عورتیں اُسمیں سے نکل پڑی ہیں؛ اور اُنکے بدن سے کپڑا ہٹ گیا ہے؛ سپاہی سنگینیں اُٹھائے ہوئے اور اُنکی نوکیں عورتوں کی طرف کیے ہوئے۔ کہ گویا اب مارینگے۔ اردگرد کھڑے ہیں۔ اس تصویر کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہی کہ ایک غیرتمند مسلمان کے لیے اُن عورتوں کا ایسی بیکسی کے عالم میں دیکھنا آنکھوں سے خون ٹپکانے کے لیے کافی ہے؛ اور کہتا ہے کہ اس تصویر کو فرنچ سپاہ کی بہادری کی یادگار سمجھنا اور عورتوں کا کپڑا تصویر میں بدن پر سے ہٹا ہوا بنانا فرانس کے لیے قابل شرم ہے؛ اور اُس کی شائستگی کو دھبا لگاتا ہے۔ پھر کہتا ہے کہ "اس تصویر سے امام عبدالقادر کی حقارت نہیں ہوتی؛ بلکہ اُس کی ویسی ہی عزت دل میں پیدا ہوتی ہے جیسی الجزائر کی بادشاہت کے زمانہ میں تھی۔ وہ بیس برس تک تن تنہا فرانس جیسی سلطنت سے نہایت بہادری اور سچّائی سے بغیر دغا و فریب کے لڑتا رہا؛ اور شکست کے بعد ان شرطوں پر صلح کی اُن کو اخیر عمر تک نباہ دیا" پھر ایک دوسرے موقع کی تصویر دیکھتا ہے جس میں نپولین۔ امام عبدالقادر کو قید سے چھوڑ رہا ہے؛ اور اُس کی ماں سے جو باہر پھرنے کا پورہ پردہ دار لباس پہنے کھڑی ہے۔ مصافحہ کر رہا ہی اس تصویر کو دیکھکر نپولین کی فیاضی، دانائی اور ہمت کی تعریف کرتا ہے۔

اس کے بعد وہ لندن پہنچتا ہے اور اپنے سفرنامہ کے خاتمہ پر ہندوستان کے تمام سنّی شیعہ اور ہندوؤں کو آگاہ کرتا ہے کہ سب ہندوستانی اپنے اپنے مذہب کی پابندی کے ساتھ یہ سفر طے کر سکتے ہیں۔ پھر اپنے جان پہچان انگریزوں کی ملاقات کا ذکر کرنے کے بعد کلفٹن کے لٹکواں پُل کے بننے کی تاریخ بیان کرتا ہے جو مدت سے ناتمام پڑا تھا؛ اور جسکو سول انجنیرس انسٹیٹیوٹ کے ممبروں نے ایک ممبر کی بدنامی کے خیال سے باہم اتفاق کرکے اپنی فیاضی سے بنا دیا۔ پھر اپنے ہموطنوں کی طرف مخاطب ہوتا ہے اور کہتا ہے کہ اے میرے ہموطنو! بتاؤ کہ انسان یہ لوگ ہیں یا ہم جو حیوانوں کی طرح اپنی خود غرضیوں میں مُبتلا ہیں؛ اور اپنے

ہر ایک کام کا بندوبست گورنمنٹ سے چاہتے ہیں کہ ہمارے لڑکوں کو بھی وہی پڑھائے، ہماری مذہبی تعلیم کا بھی وہی انتظام کرے۔ پھر ایک رصدگاہ کا ذکر لکھ کر کہ ایک عورت اُسکا تمام کام انجام دیتی ہے اپنے ملک کے مدعیانِ علم و فلسفہ و منطق کو شرمندہ کرتا ہے۔

یہ سفرنامہ نہایت دلچسپ طریقہ سے لکھنا شروع ہوا تھا؛ مگر جب اُس کے کچھ حصے ہندوستان میں شائع ہوئے تو مسلمانوں کی طرف سے اُس پر اعتراضوں کی بوچھار پڑنی شروع ہوئی۔ اور سرسید کو بھی لندن ہی میں لوگوں کی مخالفت کا حال معلوم ہوا۔ ابھی حضرت کے کان ایسی مخالف صداؤں سے زیادہ آشنا نہ تھے؛ اس لیے اُنھوں نے ناراض ہو کر سفرنامہ لکھنا موقوف کر دیا۔ مگر زمانہ بہ آواز بلند کہہ رہا تھا۔

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا　　آگے آگے دیکھنا ہوتا ہے کیا

لندن کا قیام

الغرض سرسید بمبئی سے چوبیس دن میں لندن پہنچے؛ اور میکلن برگ اسکوائر میں ایک مکان کرایہ لیکر ٹھیرے؛ اور اپنے تمام دوستوں اور آشناؤں سے ملے۔ لارڈ لارنس سب سے زیادہ مہربانی مروت اور خلق سے اُن کے ساتھ پیش آئے؛ جیسے کہ وہ ہمیشہ ہندوستان کے مسافروں کے ساتھ پیش آتے تھے۔ وہ ہندوستان میں سرسید اور اُن کے خاندان کو اچھی طرح جانتے تھے؛ اور اُن کی خدمات سے آگاہ تھے۔ لندن میں وہ اکثر اُن کو اپنے گھر ڈنر پر بلاتے تھے؛ اور مہینے میں ایک بار ہمیشہ اُن سے ملنے کو آتے تھے۔ اُنھوں ہی نے سرسید کو لندن کے اکثر اُمرا و مشاہیر سے ملوایا تھا۔ لارڈ اسٹینلی اوف بلڈرلی جو قسطنطنیہ میں بطور سفیر انگریزی کے رہتے تھے وہ بھی جب لندن میں آتے تھے تو سرسید سے ملتے رہتے تھے۔ سرجان ولیم کے انڈر سکرٹری وزیر ہند کے ساتھ بھی سرسید کو زیادہ خصوصیت ہو گئی تھی۔ ملکہ معظمہ کے سمدھی ڈیوک اوف آرگائل جو اُس وقت وزیر ہند تھے اور سائنٹفک سوسائٹی علیگڑھ کے پیٹرن بھی تھے وہ بھی سرسید سے بڑے اخلاق اور تپاک کے ساتھ ملتے رہے؛ اور اپنے بیٹے مارکوئس اوف لارن سے بھی جو ملکہ معظمہ کے داماد ہیں اُنکو ملایا۔

علمی سوسائٹیوں اور جلسوں میں شرکت

سرسید نے پورے سترہ مہینے لندن میں قیام کیا اور شب و روز اُن کاموں میں، جنکے لیے یہ سفر اختیار کیا تھا، مصروف رہے۔ بایں ہمہ اُن کو خاص خاص تقریبوں میں بھی جانا پڑتا تھا۔ جہاں اُنکا اعزاز ظاہر کرنے کے لیے اُن کو بلایا جاتا تھا۔ ۳ جون سنہ ۶۹ کو وہ لارڈ لارنس کے ہاں ایک بہت بڑے ڈنر پر بلائے گئے۔ اور ۱۳ جولائی کو ہمٹونین سوسائٹی اوف سول انجنیرس کے ایک عظیم الشان جلسہ میں اور اُس کے بعد جو اُسی کے متعلق گرینچ میں ڈنر ہوا

اُس میں شریک ہوئے۔ اس جلسہ کی کیفیت ڈیلی نیوز مورخہ ۲۱۔ جولائی میں مفصل درج ہوئی تھی۔ خلاصہ یہ ہے کہ مسٹر ین نے جو سوسائٹی مذکور کے پریسیڈنٹ تھے، سرسید کو اس جلسہ میں شریک ہونے کے لیے مدعو کیا تھا اور لکھا تھا کہ آپ وقت معین پر میرے اسٹیمر میں جو پارلیمنٹ ہوس کے سامنے موجود ہوگا آئیں مگر خود لارڈ لارنس سرسید کے مکان پر آئے اور اُن کو اپنے ساتھ سوار کرا کے لے گئے۔ سید حامد اور سید محمود بھی ساتھ اسٹیمر میں جا کر حاضری کھائی اور ٹیمز کے کنارے پر جو بڑے بڑے کارخانے تھے دیکھے۔ پھر خاص اجازت سے ایک جنگی جہاز اور اُس میں توپیں بھرنے اور چلانے کا تماشا دیکھا۔ وہاں سے گرینچ میں جا کر ڈنر کھایا اس ڈنر میں کئی ڈیوک اور بہت سے لارڈ اور بڑے بڑے انجینیر شریک تھے۔ کھانے میں طرفہ بات جیسا کہ ڈنر مذکور کی مینیو[1] میں مندرج ہے۔ یہ تھی کہ تیس طرح کے کھانے صرف دریائی پیداوار اور دریائی جانوروں سے تیار کیے ہوئے تھے، خشکی کی پیداوار سے کوئی چیز میز پر نہ تھی۔ تمام انجینیروں نے جو اس جلسہ میں شریک تھے کھانے کے بعد سپیچیں دیں اور سال گذشتہ کے مختلف ترقیات کا جو انجینیرنگ میں ہوئیں ذکر کیا۔ سب کے بعد پریسیڈنٹ نے سپیچ دی اور آخر میں لارڈ لارنس اور سرسید کا ذکر کر کے اُن کے شامل ہونے پر فخر ظاہر کیا۔ اس کے شکریہ میں لارڈ لارنس نے تقریر کی (سرسید کے پاس ایک ترجمان کو اس غرض سے بٹھا دیا تھا کہ جلسہ کی تمام کارروائی اُنکو اُردو میں سمجھاتا جائے) لارڈ لارنس کے بعد سرسید اُٹھے۔ ایک ایسے جلسہ میں جہاں انگلستان کے نامور انجینیر جمع ہوں اور جلسہ کا موضوع انجینیرنگ کے سوا اور کوئی مضمون نہو، سرسید کو گفتگو کرنا نہایت دشوار تھا، باوجود اس کے ڈیلی نیوز نے اُسی زمانہ میں لکھا تھا کہ سید احمد خاں کی اسپیچ شاندار اور دلچسپ تھی۔ پریزیڈنٹ نے لارڈ لارنس کو سیویر اوف انڈیا کہا تھا، سرسید نے اُن کو فادر اوف انڈیا کہکر یاد کیا۔ سرسید کی اسپیچ کا خلاصہ یہ تھا کہ "ہندوستان میں انگریزی سلطنت کا رعب و داب اور دبدبہ پیدا ہونے کے بہت سے ذریعے ہیں، مثلاً تعلیم، ہتھیار اور عدل و انصاف وغیرہ، مگر یہ سب چیزیں ایسی ہیں جن سے صرف اُنہیں لوگوں کے دل میں اُسکی وقعت پیدا ہوئی ہے جن کو اُنسے کام پڑا ہے یا جن کو اُنسے فائدہ اُٹھانے کا موقع ملا ہے۔ لیکن وہ چیز جس نے خاص عام سب کے دل میں انگلش گورنمنٹ کی عظمت پیدا کی ہے وہ فن انجینیری کے نتائج ہیں، جیسے ریل، بڑے بڑے دریاؤں کے پُل، نہریں، اور بڑے بڑے پہاڑی چھتے جن میں سے ریل گذرتی ہے۔ ان چیزوں کو ہر شخص دیکھتا ہے اور اُس کے دل میں خود بخود انگریزی سلطنت

---

[1] مینیو ایک خوبصورت چھپا ہوا کاغذ ہوتا ہے جس پر ڈنر کے تمام کھانوں کی تفصیل ہوتی ہے اور کھانے کے وقت ہر ایک مہمان کے سامنے رکھدیا جاتا ہے۔ اس ڈنر کا مینیو سرسید کے کاغذات میں ہم کو ملا تھا جس میں تیس[30] کھانوں کے نام لکھے تھے۔ ۱۲

کا رُعب و داب اور اُس کی بڑائی پیدا ہوتی ہے"۔ اس پر جلسہ میں نہایت زور سے چیرز دی گئیں اور جب لارڈ لارنس نے اُس کو انگریزی میں ترجمہ کرکے سُنایا تو پہلے سے بھی زیادہ چیرز کا عمل ہوا۔ سرسید کہتے تھے کہ میرا ارادہ اسپیچ کرنے کا پہلے سے نہ تھا مگر چونکہ میری نسبت ایسے الفاظ کہے گئے تھے جن کا شکریہ ادا کرنا ضرور تھا اس لیے مجھکو بھی کھڑا ہونا پڑا۔

خطاب اور تمغا ملنا

۶۔ اگست ۱۸۶۹ء کو انڈیا آفس میں ڈیوک آف آرگائل کے ہاتھ سے اُن کو سی۔ اس۔ آئی کا خطاب اور تمغا ملا۔ اس کی تحریک لارڈ لارنس نے کی تھی۔ تاریخ معین پر سرسید انڈیا آفس میں گئے۔ وہاں سر جان ڈبلیو کے انڈر سکرٹری وزیر ہند آئے اور سرسید سے ہاتھ ملا کر اُن کو اپنے ہمراہ اُس کمرے میں لے گئے جہاں ڈیوک آف آرگائل اُنکے منتظر تھے۔ ڈیوک کھڑے ہو کر چند قدم آگے بڑھے اور سرسید سے ہاتھ ملا کر پھر اپنے بیٹے مارکوئس آف لارن سے ملاقات کرائی اور تھوڑی دیر باتیں کرنے کے بعد تمغا اپنے ہاتھ سے پہنایا اور مبارکباد کہکر سرسید کو رخصت کیا۔ اُسی روز چار اور شخصوں کو بھی یہی تمغا ملنے والا تھا، جب سب کو تمغے مل چکے تو ڈیوک موصوف نے سرسید کو کھانے پر بُلایا جہاں بہت سے معزز لوگ اور پارلیمنٹ کے ممبر آئے تھے۔ سرسید کو اس موقع پر ڈیوک کے برابر بائیں جانب جگہ دی گئی تھی۔ **لطیفہ** جس زمانہ میں سرسید کو ولایت میں سی۔ ایس۔ آئی کا خطاب ملا اُس کے کچھ دنوں بعد راجہ جیکشن داس صاحب کو یہی خطاب ہندوستان میں بمقام علیگڑھ ملا تھا اور اُس کے تمام مراسم سوسائٹی کے بڑے ہال میں عمل میں آئے تھے۔ جب جلسہ برخاست ہوا اور راجہ صاحب کے تمام دوست اُنکو مبارکباد دینے لگے سوسائٹی کا ایک ملازم ہر ایک کی زبان سے سی۔ اس۔ آئی کا لفظ سنتا تھا اور نہایت تعجب کرتا تھا باہر آکر اَور نوکروں سے کہنے لگا ارے یارو عجب تماشا ہے سید احمد خاں تو خیر لندن گئے تھے وہاں جاکر عیسائی ہوئے کسی نے جانا کسی نے نہ جانا ان راجہ صاحب کو کیا ہوا تھا کہ یہ ہندوستان ہی میں بھرے جلسہ کے اندر عیسائی بن گئے۔ لوگوں کی زبان سے جو بار بار سی ایس آئی کا لفظ نکلتا تھا وہ اُس کو عیسائی سمجھتا تھا۔

ملکۂ معظمہ کی لیوی میں پیش ہونا

۶۔ نومبر ۱۸۶۹ء کو ملکۂ معظمہ کے ہاتھ سے بلیک فرائر ز برج، ہالبورن اور وایڈکٹ کے افتتاح کا جلسہ ہونے والا تھا، جلسہ کی انتظامی کمیٹی نے سرسید کو بھی خاص طور پر وہاں مدعو کیا تھا۔ سرسید کہتے تھے کہ یہ جلسہ نہایت شان و شوکت کا تھا۔

پھر ۱۱۔ مارچ ۱۸۷۰ء کو ملکۂ معظمہ کی لیوی میں اُنکو بُلایا گیا۔ سرسید کہتے تھے کہ حسب معمول لیوی سے محل میں مجھکو اور درباریوں کے ساتھ بٹھا دیا گیا تھا جب ملکۂ معظمہ تشریف لائیں تو میں نے بھی شخ درباریوں

کے اپنے نمبر پر سامنے جا کر سلام کیا۔ سلام کرنے کا دستور یہ ہے کہ ملکہ معظمہ سے ہاتھ ملا کر اور بایاں گھٹنا ٹیک کر حضور ممدوحہ کے ہاتھ پر بوسہ دیتے ہیں۔ جب تک تمام درباریوں کا اس طرح سلام نہیں ہو لیتا اُس وقت تک ملکہ کھڑی رہتی ہیں۔

پرنس آف ویلز کی لِوی میں جانا

اس کے بعد ۱۸۷۰ء میں پرنس اوف ویلز کی لِوی میں اُن کو شریک کیا گیا یہ لِوی صرف فوجی افسروں کے لیے تھے؛ کسی سویلین کو اُس میں شریک ہونے کی اجازت نہ تھی؛ مگر چونکہ سرسید ولایت سے جلد واپس آنے والے تھے اور ممکن تھا کہ اُن کو پھر پرنس اوف ویلز کی کسی لِوی میں شریک ہونے کا موقع نہ ملے، اس لیے اُن کو خاص اجازت لِوی میں شریک ہونے کی مِل گئی تھی۔

ایتھینیم کلب کی ممبری

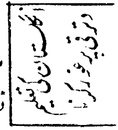
لندن کی علمی مجلسوں میں بھی سرسید شریک ہوتے رہے۔ لندن جانے سے پہلے جیسا کہ دوسرے باب میں ذکر ہو چکا ہے وہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن کے فیلو مقرر ہو چکے تھے، جب لندن میں گئے تو اُس کے کئی اجلاسوں میں شریک ہوئے۔ وہ کہتے ہیں کہ چارلس ڈکنس کی آخری ریڈنگ پر بھی میں وہاں موجود تھا۔ لیکن سب سے بڑا امتیاز جو اُن کو لندن میں ایک علمی حیثیت سے ملا وہ ایتھینیم کلب کا آنریری ممبر مقرر ہونا تھا۔ یہ کلب لندن میں سب سے زیادہ نامی اور معزز ہے کہ اس سے بڑھ کر کوئی کلب معزز خیال نہیں کیا جاتا۔ کوئی شخص جو مشہور مصنف یا کسی دوسرے کمالِ علمی میں ممتاز نہ ہو وہ اس کلب میں ممبر نہیں ہو سکتا۔ اس کے ممبروں کی تعداد بارہ سو تک محدود ہے۔ سیکڑوں آدمی درخواستیں دے دیکر برسوں ممبری کے امیدوار رہتے ہیں۔ سرسید کہتے تھے کہ ۱۸۷۰ء میں جبکہ میں وہاں موجود تھا تین ہزار سے زیادہ امیدواروں کا نام درج رجسٹر تھا اور دس دس بارہ بارہ برس اُمیدواری پر گذر گئے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ جو شخص اس کلب کا ممبر مقرر ہوتا ہے اُس کے دوست اُس کو مبارکبادی چٹھیاں لکھتے ہیں اور اُس کو ایسا فخر ہوتا ہے کہ ویسا فخر اکثر خطابوں کے ملنے پر بھی نہیں ہوتا۔

غرض کہ سرسید خاص قاعدہ سے جو نامور اور مشہور با کمال لوگوں کے لیے مقرر ہے دو دفعہ ایتھینیم کلب کے آنریری ممبر مقرر ہوئے اور جب تک لندن میں رہے اُس کے ممبر رہے۔ اس کلب کی ممبری کی تحریک مسٹر اڈورڈ ٹامس نے کی تھی جو سرسید کے منصفی کے زمانہ میں دلّی کے جج تھے اور جنھوں نے اُن کو آثار الصنادید کے دوبارہ لکھنے اور ترمیم کرنے کی صلاح دی تھی۔

سفر یورپ کی اصلی غرض

مگر یہ تمام اعزاز و امتیاز اور خاطر و مدارات جن کا ہندوستان سے چلتے وقت سرسید کو سان گمان بھی نہ تھا، یہ سب ضمنی اور غیر متوقع امور تھے۔ اُن کے اصلی مقاصد میں سے ایک بڑا مقصد انگلستان

کے طریقۂ تعلیم کو دیکھنا اور اُس پر غور کرنا تھا۔ چنانچہ اُنھوں نے اس غرض سے کیمبرج یونیورسٹی کو خود جا کر دیکھا اور بڑی سے بڑی اور چھوٹی سے چھوٹی چیز پر جو یونیورسٹی سے علاقہ رکھتی تھی غور کی اور اُس کا تمام نقشہ ذہن نشیں کر لیا۔ پھر ملک کی عام تعلیمی حالت کا اندازہ کیا، تعلیم نسواں کو غور کی نگاہ سے دیکھا اور تعلیم کے مختلف طریقوں میں سے جو طریقہ ہندوستان کے مسلمانوں کی حالت کے مناسب سمجھا اُس کو نگاہ میں رکھا۔
اگرچہ انگریزی زبان کی ناواقفیت کی وجہ سے ضرور ہے کہ اُن کو ہر ایک بات کے سمجھنے اور دریافت کرنے میں سخت دقتیں اُٹھانی پڑی ہونگی۔ اور شاید اُن کو پوری واقفیت حاصل نہو سکی ہو؛ مگر جو نتیجے اُن کی اس ادھوری واقفیت سے ہندوستان میں ظاہر ہوئے وہ بلکہ اُنکا عشر عشیر آج تک اُن ہندوستانیوں کی پوری واقفیت سے بھی ظہور میں نہیں آیا جو ولایت سے اعلیٰ درجہ کی تعلیم پا کر آئے ہیں۔



انگلستان کے طریقۂ تعلیم پر غور کرنے کے بعد سرسید نے لندن ہی میں ایک پمفلٹ انگریزی میں شائع کیا جس میں ہندوستان کے طریقۂ تعلیم کے نقصانات تفصیل کے ساتھ ظاہر کیے تھے۔ تعلیم کے سوا یورپ کی عام شائستگی اور طرز تمدن اور حسن معاشرت اور ہر قسم کی ترقیات کے اسباب جیسا کہ اُن کی تحریروں سے ثابت ہوتا ہے ملاحظہ کیے۔ اور جہاں تک ممکن تھا اپنی معلومات کو وسعت دی یوروپ کے طریق معاشرت کو دیکھا۔ وہاں کے اُمرا کے محل اور مکانات اور طرز ماندوبود پر نظر کی عجائب خانوں اور کتب خانوں میں علوم اور تحقیقات کے ذخیرے ملاحظہ کیے۔ انجینیری کے عجائبات، جہازوں کی تیاری، توپوں کا ڈھلنا، سمندری تار کا بننا، انجینیروں اور عالموں کی سوسائٹیاں، عام کاریگروں اور اہل حرفہ کے کام اور عموماً اہل انگلستان کے علمی ذوق شوق اور علمی ترقیات کو دیکھا۔ جس سرگرمی کے ساتھ اہل مذہب، مذہب کی حمایت کرتے ہیں اور باوجود اس کے نہایت بے تعصبی سے غیر مذہب والوں کے ساتھ پیش آتے ہیں اور جو اخلاق کہ وہ پردیسیوں اور مہمانوں کے ساتھ برتتے ہیں۔ یہ سب کچھ دیکھا اُنکے عیبوں سے قطع نظر کی اور اُن کی خوبیوں کو چُنا؛ اور یہ سب کچھ ایک تماشائی کی طرح سیر تماشے اور دل لگی کے درپے نہیں بلکہ ایک وطن دوست کی طرح دلسوزی، غیرت اور عبرت کی نگاہ سے دیکھا، اور انگلستان کی حالت کو اپنے ملک کی حالت سے مقابلہ کر کے اپنے درد دل کو بڑھایا اور اُس درد کو دوسروں کے دلوں میں درد پیدا کرنے کا ایک ذریعہ بنایا۔ وہ مولوی سید مہدی علیخاں کو ایک خط میں ولایت سے لکھتے ہیں "میرے ایک معزز دوست نے ایک بہت بڑے جلسہ میں جہاں نہایت تکلف کی پوشاک پہنے کئی سو مرد اور لیڈیاں خوبصورت، خوش کلام اور قابل جمع تھیں۔ پوچھا کہ "کہو لندن بہشت ہے؟ اور حوروں کا ہونا سچ ہے یا نہیں؟ مگر ہماری قسمت میں وہی جلتا ہے۔ یہاں کا حال دیکھ دیکھ اپنے ملک اور قوم کی حماقت، بیجا تعصب، موجودہ تنزل اور آیندہ ذلت

کے خیال سے رنج و غم زیادہ بڑھ گیا اور کوئی تدبیر اپنے ہموطنوں کے ہوشیار کرنے کی نہیں معلوم ہوتی "

اُن کا ارادہ تھا کہ انگلستان اور ہندوستان کی حالت میں جو زمین و آسمان کا فرق ہے اُس کو اپنے سفرنامہ میں مفصل بیان کر کے اہل وطن کو خبردار کریں، مگر اہل وطن نے اُس کو برداشت نہ کیا؛ وہ اپنی پستی کی دردانگیز داستان نہ سُن سکے؛ اور اس لیئے جو سلسلہ سرسید نے اپنے سفر کے حالات کا لکھنا شروع کیا تھا وہ منقطع ہو گیا۔ باایں ہمہ وہ وقتاً فوقتاً اپنے سفر کے جستہ جستہ حالات لکھنے سے دست بردار نہیں ہوئے؛ اور جب کبھی موقع ملا اُنھوں نے کوئی نہ کوئی بات اہل وطن کے کان میں ڈال دی۔

۱۵- اکتوبر ۱۸۶۹ء کو اُنھوں نے ایک لمبی تحریر سوسائٹی اخبار میں چھپنے کو بھیجی جس میں چھ مہینے کے حالات مختصر طور پر بیان کیے تھے، اور یوروپ کی ترقی اور اپنے ملک کے ادبار و تنزل کی مثالیں پیش کر کے اہل وطن کو غیرت دلائی تھی۔ جب اس تحریر کا نتیجہ بھی سوا اس کے کہ لوگ برافروختہ ہوں اور بُرا بھلا کہیں۔ کچھ حاصل نہ ہوا تو ۲۲- مارچ ۱۸۷۰ء کو ایک دوسری تحریر بعنوان "عذر از طرف گنہگار سید احمد" ہندوستان میں بھیجی۔ پھر ایک اور تحریر بعنوان "عرضداشت سید احمد بخدمت اہل وطن" اخبار میں چھپنے کے لیے روانہ کی۔ ان تمام تحریروں کے دیکھنے سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ اُس زمانہ میں سرسید کو اہل وطن کی بھلائی کا کس قدر خیال تھا۔ گو ان تحریروں سے قوم و ملک کے کان پر جُوں نہیں چلی؛ مگر درحقیقت یہ سب تمہیدیں تھیں اُن کارروائیوں کی جو آخرکار ہندوستان میں پہنچکر سرسید کے ہاتھ سے ظہور میں آنے والی تھیں۔

خطبات احمدیہ

ان سب باتوں کے سوا سرسید کا سب سے زیادہ ضروری اور اہم مقصد ولایت کے سفر سے ایک ایسی کتاب کا لکھنا اور انگریزی میں اُس کا ترجمہ کرا کر شائع کرنا تھا جس سے اسلام کی اصلیت عیسائی قوموں پر ظاہر ہو اور جو غلطیاں اکثر عیسائی مصنفوں نے اور خاصکر سر ولیم میور نے اپنی کتاب "لائف آف محمدؐ" میں اسلام کی حقیقت اور بانی اسلام کے کیرکٹر ظاہر کرنے میں دانستہ یا نادانستگی ہیں اُن کو رفع کیا جائے۔ سر ولیم میور کی کتاب کی نسبت اکثر انگریزوں کا یہ خیال تھا کہ اسلام کے متعلق جو ٹھیک اطلاعیں سر ولیم نے اہل یوروپ کو دی ہیں وہ پہلے کسی دوسرے ذریعہ سے اُن کو حاصل نہیں ہوئی تھیں۔ مگر درحقیقت یہ کتاب صرف عیسائیوں ہی کو اسلام اور بانی اسلام کی طرف سے گمراہ کرنے والی نہ تھی بلکہ انگریزی تعلیم یافتہ نوجوان مسلمانوں کو بھی اسلام کی طرف سے شک میں ڈالنے والی تھی۔

اس کتاب کے مضامین کی تفصیل اور جو دقتیں سرسید کو اُس کے لکھنے اور چھپوانے میں پیش آئیں اور جس جوش و اُمنگ سے اُنھوں نے یہ کتاب لکھی، اور جو رائیں انگریزوں نے اُس پر دیں۔ یہ سب امور اختصار کے ساتھ ہم دوسرے حصہ میں بیان کرینگے۔ یہاں صرف اسقدر لکھتے ہیں کہ ولایت میں سرسید نے

کتاب کی لاگت بڑھ جانے کے خوف سے صرف اپنی اُردو یادداشتوں کا خلاصہ انگریزی میں ترجمہ کراکے چھپوایا تھا مگر ہندوستان میں پہنچنے کے بہت بعد اُنھوں نے اُس کو اُردو میں بھی اپنی پوری یادداشتوں سے از سرِ نو مرتب کرکے تصانیف احمدیہ کے ساتھ بڑی تقطیع پر ٹائپ میں چھپوایا جس میں ہر ایک مضمون بہ نسبت انگریزی کے زیادہ وسعت کے ساتھ بیان ہوا ہے مگر چونکہ اس کی جلدیں بہت ہی کم چھپوائی گئی تھیں اس لیے اُس کی زیادہ اشاعت نہیں ہوسکی لیکن ان کی وفات کے بعد ڈیوٹی شاپ کے ممبروں نے اُس کو از سرِ نو چھپوایا ہی جو پہلے کی نسبت بہت کم قیمت پر فروخت ہوتا ہے۔ خطبات احمدیہ لکھنے کے سوا اُنھوں نے ولایت ہی میں اور بھی اسلام کی بعض خدمتیں انجام دی ہیں جن کا ذکر دوسرے حصہ میں کیا جائیگا۔

سچ یہ ہے کہ سرسید نے جس تحریر کے ذریعہ سے ولایت جانے کے لیے گورنمنٹ سے اجازت چاہی تھی، جو کچھ اُس تحریر میں لکھا تھا۔ اس سے بہت زیادہ اپنے ارادوں کو پورا کرکے دکھایا۔ وہ لندن سے نہایت قیمتی اطلاعیں لیکر ہندوستان میں آئے جنسے اُنھوں نے ملک اور قوم کو بے انتہا فائدہ پہنچایا شمالی ہندوستان میں اُنسے پہلے ظاہراً کسی ہندو یا مسلمان نے اپنی اولاد کو تعلیم کے لیے ولایت نہیں بھیجا تھا۔ غالباً سید محمود شمالی ہندوستان میں پہلے شخص ہیں جو ولایت سے بیرسٹری کا ڈپلوما لیکر آئے محض اُنہیں کی ریس سے اس ملک کے ہندو مسلمانوں کو اپنی اولاد کے ولایت بھیجنے کا حوصلہ پیدا ہوا اور اُنہیں کی دیکھا دیکھی ولایت جانے والے دیسی طالب علموں کا ہندوستان سے انگلستان تک تانتا بندھ گیا۔

جس زمانہ میں سرسید ولایت گئے ہیں انھیں دنوں میں سائنٹفک سوسائٹی اخبار علیگڑھ میں چھپا تھا کہ "سید احمد خاں کے ولایت جانے سے ہندوستانیوں کے واسطے ایک عمدہ مثال قابل تقلید قائم ہوگئی ہے چنانچہ کلکتہ کے ایک نوجوان مسلمان سید امیر علی (جو اب آنریبل سید امیر علی سی۔ اس۔ آئی۔ بیرسٹر ایٹ لا اور جج ہائی کورٹ کلکتہ ہیں) لندن روانہ ہوئے ہیں اور بہت سے ولایت جانے کو تیار ہو رہے ہیں" سید امیر علی نے صرف ولایت کا سفر کرنے ہی میں سرسید کی تقلید نہیں کی بلکہ اسلام کی خدمت کرنے میں اور اُس کی خوبیاں یوروپین قوموں پر ظاہر کرنے میں بھی اُنھوں نے سرسید کا پورا پورا اتباع کیا ہے۔ اُنکی دو باوقعت کتابیں "لائف آف محمد" اور "اسپرٹ آف اسلام" جو انگریزی میں شایع ہو چکی ہیں اس دعوے کی شاہد ہیں۔

نواب محسن الملک اپنی ایک تحریر میں آنریبل حاجی اسمٰعیل خاں کو لکھتے ہیں کہ "سید احمد خاں وہ ولایت گئے؛ مگر اس مطلب سے کہ اپنی آنکھ سے اُس قوم کو جو اس وقت تمام اقوام روے زمین پر شرف رکھتی ہے اُنھیں کے گھروں میں اور اُنھیں کے ملک میں دیکھیں؛ اور جو کچھ وہاں دیکھا ہے واپس آکر اپنی قوم میں پھیلائیں۔ لوگ ولایت میں جاکر تماشا گاہ، تھیٹر، پارک، میوزیم اور عمارات کی سیر کرتے ہیں، اور یہ حامی دین اسلام کتب خانوں میں بیٹھا ہوا خطبات احمدیہ

کی تصنیف میں منہمک تھا، اور کالجوں اور یونیورسٹیوں کے انتظام پر غور کر رہا تھا۔ اس شخص کا ولایت جانا قوم کے واسطے تھا، رہنا قوم کے واسطے، اور واپس آنا قوم کے واسطے۔"

الغرض سر سید ایک سال اور پانچ مہینے لندن میں قیام کرنے کے بعد ۴۔ ستمبر ۱۸۷۰ء کو مع سید حامد مرحوم کے لندن سے ہندوستان کو روانہ ہوئے۔ اُن کی روانگی کے بعد ایک لمبا مضمون ہندوستان کے ایک مسلمان مقیم لندن سید عبداللہ نام نے اخبار ہوم ورڈ میل مورخہ ۲۶۔ ستمبر ۱۸۷۰ء میں سر سید کی نسبت چھپوایا تھا جو سوسائٹی اخبار مورخہ ۱۱۔ نومبر ۱۸۷۰ء میں بھی نقل کیا گیا تھا۔ اس مضمون میں سے چند فقرے مختلف مقامات سے یہاں لکھے جاتے ہیں " جن انگریزوں سے یہاں (یعنی انگلستان میں) اُن کی ملاقات ہوئی اُن پر اُن کی عام لیاقت کا اور اس بات کا کہ جن شخصوں نے اُن سے ہندوستان کی بابت گفتگو کی اُن سب کو ہر ایک امر سے بخوبی آگاہ کر دیا؛ بہت عمدہ اثر ہوا۔ یہاں کے بہت سے مدبّران سلطنت کی رائے ہے کہ " اگر ہم ایسے لائق اور واقف کار ہندوستانی مسلمان سے جیسے کہ سید احمد خاں ہیں؛ نہ ملتے تو ہندوستانیوں کی لیاقت کی نسبت ہماری رائے ہمیشہ ضعیف اور بودی (پور) ہوتی۔ اس مضمون کے لکھنے سے میری یہ غرض ہے کہ ہندوستان کے لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ جو ہندوستانی تربیت یافتہ اور مہذب ہوتا ہے اُس کی اہل یوروپ کیسی بڑی قدر و منزلت کرتے ہیں۔ سید احمد خاں کی بدولت اس بات کا ثبوت حاصل ہونے سے بڑی خوشی حاصل ہوتی ہے کہ اس ملک میں ہندوستان کے ایک شریف آدمی کی بڑی قدر و منزلت ہوتی ہے اور اعلیٰ درجہ کے انگریز اُس سے بڑی محبت اور تواضع و تکریم سے پیش آتے ہیں۔"



پانچواں باب

۱۸۷۰ء سے ۱۸۷۸ء تک

ولایت سے واپس آنا۔ تہذیب الاخلاق جاری کرنا۔ کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان۔ کمیٹی خزنۃ البضاعۃ۔ ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب پر ریویو۔ ابتدائی مدرسہ علیگڑھ میں قائم کرنا۔ کالج فونڈیشن سٹون۔ چندہ وصول کرنے کی تدبیریں۔ عمارات کالج۔ کالج کلاس کا قائم ہونا۔ تفسیر القرآن۔

ولایت سے ہندوستان واپس آنا

۲۔ اکتوبر ۱۸۷۰ء کو سرسید مع سید حامد مرحوم کے ولایت سے بمبئی پہنچے اور اسی مہینے میں بنارس پہنچکر اپنے عہدہ کا چارج لیا۔ یہاں آتے ہی اُنہوں نے اُس بڑے کام کی بنیاد ڈالنی شروع کی جس کے لیے درحقیقت ولایت کا سفر اختیار کیا تھا۔ مسلمانوں کی تعلیم کا منصوبہ جو اُنہوں نے ولایت جانے سے بہت پہلے باندھا تھا اُس کے پورا کرنے میں ظاہرا اُنکو دو سخت مزاحمتیں نظر آتی تھیں۔ اول مسلمانوں کے مذہبی اوہام، انگریزی تعلیم سے اُن کی نفرت، اور ایجوکیشن کے مفہوم سے ناواقفیت۔ اس مزاحمت کے دور کرنے کے لیے اُنہوں نے ولایت پہنچتے ہی چھیڑ چھاڑ شروع کردی تھی۔ سفر کے حالات اور متعدد آرٹکل جو اُنھوں نے لندن سے لکھکر بھیجے اور سائنٹفک اخبار میں شائع ہوئے اُن میں طرح طرح سے مسلمانوں کو غیرت دلائی تھی اور جابجا اُن کے تنزل پر افسوس ظاہر کیا تھا اور انگریزی تعلیم کی ضرورت بیان کی تھی۔ لیکن ان تحریروں کا اثر مسلمانوں پر کچھ نہیں ہوا۔ دوسری مزاحمت اُن کو یہ معلوم ہوتی تھی کہ اُنکا ارادہ جیسا کہ آگے مفصل بیان کیا جائیگا فی الواقع ہندوستان میں پہنچکر ایک محمدن یونیورسٹی قایم کرنے کا تھا؛ کیونکہ ہندوستان کی موجودہ یونیورسٹیوں کے نظام تعلیم سے ہندوستانیوں میں حقیقی لیاقت پیدا ہونے کی اُن کو ہرگز اُمید نہ تھی۔ اس لیے ضرور تھا کہ گورنمنٹ کے طریقہ تعلیم کو مسلمانوں کے لیے ناکافی اور ہندوستان کے ایجوکیشنل سسٹم کو غیر مفید قرار دیا جاوے۔ چنانچہ اسی بنا پر اُنہوں نے ولایت میں ایک پمفلٹ انگریزی زبان میں شائع کیا تھا جس کا عنوان "ہندوستان کے موجودہ نظام تعلیمی پر اعتراضات" تھا مگر چونکہ اُس میں سرسید نے اپنی ذاتی رائے لکھی تھی اس لیے اُس سے بھی کسی نتیجے کے پیدا ہونے کی اُمید نہ تھی۔ ان دونوں رکاوٹوں کے دور کرنے کے لیے اُنھوں نے ہندوستان میں پہنچکر دو بڑے بڑے کام ایک ساتھ شروع کیے۔

تہذیب الاخلاق

اول مسلمانوں کے مذہبی خیالات کی اصلاح اور اُن کو ترقی کی طرف مائل کرنے کے لیے پرچۂ تہذیب الاخلاق جاری کیا۔ اُنہوں نے اس پرچہ کے نکالنے کا ارادہ ولایت ہی میں کر لیا تھا چونکہ تہذیب الاخلاق کی پیشانی پر جو اسکا نام اور بیل چھپتی تھی اُس کا ٹائپ وہ لندن ہی سے بنوا کر اپنے ساتھ لائے تھے۔ الغرض سرسید اور اُنکے دوستوں کی ایک کمیٹی قائم ہوئی جس کے ہر ایک ممبر سے تہذیب الاخلاق کے اخراجات کے لیے ساٹھ روپیہ سالانہ اور عام خریداروں سے ساڑھے چار روپیہ سالانہ لینا قرار پایا۔ یکم شوال ۱۲۸۷ ہجری مطابق ۲۴ دسمبر ۱۸۷۰ء کو اُس کا اول نمبر شائع ہوا؛ اور پہلی بار شوال ۱۲۸۷ ہجری سے رمضان ۱۲۹۳ھ یعنی پورے چھ برس تک برابر نکلتا رہا اور ہمیشہ اُس کے اڈیٹر اور منیجر خود سرسید رہے چونکہ یہ پرچہ کوئی تجارتی اخبار نہ تھا بلکہ محض قوم کی بھلائی کے لیے جاری کیا گیا تھا؛ اس لیے جو کچھ آمدنی ہوتی تھی وہ اُسی کی ترقی میں صرف کیجاتی تھی۔ اُس کی اخیر جلدوں میں ہر نمبر کی پیشانی پر بطور ماٹو کے یہ عربی فقرہ لکھا جاتا تھا "حب القوم من الایمان فمن یسعی فی اعزاز قومہ انما یسعی فی اعزاز دینہ"

تہذیب الاخلاق ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے تقریباً ویسا ہی پرچہ تھا جیسے اسٹیل اور اڈیسن نے دو میگزین یعنی ٹیٹلر اور اسپکٹیٹر نوبت بہ نوبت لندن میں نکالے تھے اور ۱۷۰۹ء سے ۱۷۱۳ء تک جاری رہے ان دونوں پرچوں کی نسبت کہا جاتا ہے کہ اُنسے انگریزوں کے اخلاق، عادات، رسم و رواج، اور قومی خیالات پر بہت بڑا اثر ہوا تھا۔ اگرچہ اُس وقت انگلستان کی حالت کیا باعتبار اخلاق و معاشرت کے اور کیا باعتبار عقلی ترقیات کے آجکل کی حالت سے کچھ نسبت نہ رکھتی تھی مگر مذہبی خیالات اُس عام ریفارمیشن کی بدولت۔ جو لوتھر اور کالون نے کی۔ بہت کچھ اصلاح پا چکے تھے اس لیے ان دونوں پرچوں میں مذہبی چھیڑ چھاڑ بہت کم ہوتی تھی اور اسی وجہ سے وہاں ان پرچوں کی کچھ مخالفت نہیں ہوئی۔ لیکن تہذیب الاخلاق کا حال ایسا نہ تھا؛ اُس میں مذہبی بحث کرنی لازم آپڑی تھی۔ کیونکہ جو باتیں مسلمانوں کی دنیوی ترقی کی مانع تھیں وہ زیادہ تر مذہبی خیالات پر مبنی تھیں۔ اگرچہ اس پرچہ میں مضمون لکھنے والے بہت سے لوگ تھے مگر سب سے زیادہ سرگرم خود سرسید، پھر مولوی سید مہدی علی خاں، اور پھر مولوی چراغ علی تھے۔ سرسید مذہب کے سوا اخلاق و معاشرت و تمدن پر بھی اکثر مضامین لکھتے تھے مگر پچھلے دونوں شخص زیادہ تر مذہب پر لکھنے والے تھے۔

اس پرچہ کے دو ہی تین نمبر نکلنے پائے تھے کہ چاروں طرف سے اُس کی مخالفت ہونی شروع ہوئی اور ساتھ ہی اُس مدرسہ سے بھی جس کو سرسید قائم کرنا چاہتے تھے عموماً سوءِ ظن پیدا ہونے لگا۔ بہت سے اخباروں میں مخالفانہ مضمون چھپنے لگے؛ اور چند پرچے جن میں سے کانپور کا نور الآفاق اور نور الانوار زیادہ مشہور تھا۔ تہذیب الاخلاق کے توڑ پر جاری کیے گئے۔ رسالہ اشاعۃ السنۃ جو خاص اہلِ حدیث

کی تائید کے لیے جاری ہوا تھا اُس میں بھی تہذیب الاخلاق کے برخلاف مضمون نکلنے لگے، اور سرسید کی تکفیر کے فتوے جابجا لکھے جانے لگے؛ یہاں تک کہ اُن کے ساتھ اُن کے دوست اور اعوان و انصار بھی نیچری بلکہ کرسٹان کہلانے لگے۔

باایںہمہ تہذیب الاخلاق کے جاری ہونے سے رفتہ رفتہ ایک معتدبہ گروہ مسلمانوں میں ایسا بھی پیدا ہوگیا جو اس پرچہ کا ویسا ہی دلدادہ تھا جیسے اہلِ انگلستان ٹٹیلر اور اسپکٹیٹر کے دلدادہ تھے۔ وہ اُس کے مضامین پر وجد کرتے تھے؛ اور تاریخ معین پر اُس کے انتظار میں ہمہ تن چشم رہتے تھے اور اُس کے مخالفوں کو تعجب سے دیکھتے تھے۔ جو نتائج اس پرچہ سے مسلمانوں کے حق میں پیدا ہوئے اُن کو دوسرے حصہ میں بیان کیا جائیگا۔ یہاں صرف اس قدر لکھا جاتا ہے کہ اگر سرسید یہ پرچہ جاری نہ کرتے اور مسلمانوں کے خیالات کی اصلاح کا خیال چھوڑ دیتے بلکہ صرف اُن کی تعلیم کا انتظام کرتے تو ظاہر اُن کی مخالفت کم ہوتی بلکہ شاید نہ ہوتی، مگر اُس کے ساتھ ہی اعانت اور امداد بھی کم ہوتی؛ اور جو تحریک چند سال میں مسلمانوں میں پیدا ہوگئی اُس کا صدیوں تک کہیں نام و نشان نہ ہوتا۔

اس پرچہ کی تمام تر کوشش اس بات میں تھی کہ جو خیالات مسلمانوں کی ترقی اور تمدّن کے مذہبی مانع سمجھے جاتے ہیں اور درحقیقت مذہب سے کچھ علاقہ نہیں رکھتے اُن کو جہانتک ہوسکے رفع کیا جائے اور اسلام پر جو عیسائیوں کا یہ اعتراض ہے کہ وہ ترقی اور تمدّن کا دشمن ہے۔ اس غلطی کا اصل منشا ظاہر کیا جائے اس کے سوا یوروپ کی سویلزیشن کے اصول و فروع سے اور اُن اسباب سے جو یوروپ کی ترقی کے باعث ہوئے ہیں قوم کو آگاہ کیا جائے۔ بیہودہ اور مضر رسموں سے اُن کو نفرت دلائی جائے۔ اخلاق و عادات میں جو بسبب قومی تنزل کے خرابیاں پیدا ہوگئی ہیں وہ بیان کی جائیں۔ علوم قدیمہ کی عظمت جو لوگوں کے دلوں میں حد سے زیادہ بیٹھی ہوئی ہے جہانتک اُسمیں غلطی ہو اُس کو ظاہر کیا جائے۔ علوم جدیدہ جن سے نفرت کی جاتی ہے اُنکی اصلی اور واقعی خوبیاں اور جو بدیہی نتائج دُنیا میں اُن سے پیدا ہوئے ہیں جتائے جائیں اور بجائے نفرت کے اُنکی طرف رغبت دلائی جائے۔ اسلام میں مخالفوں نے جو باتیں تاریخی اور علمی تحقیقات کے خلاف بیان کی ہیں اُن کو تاریخ اور علم کے ساتھ منطبق کیا جائے یا اسلام کا دامن اُنسے پاک ثابت کیا جائے مسلمانوں کے دلوں میں اُن کے اکابر و اسلاف کی عظمت کا خیال پیدا کیا جائے؛ اُنکی قدیم علمی اور عملی ترقیات اُن کو یاد دلائی جائیں اور اسطرح قوم کے مردہ دلوں کو از سرِ نو زندہ کرنے میں کوشش کیجائے۔

ان تمام اغراض و مقاصد کے پورا کرنے کے لیے سرسید اور اُن کے دوستوں نے صرف اپنی رائے اور اجتہاد ہی سے کام نہیں لیا بلکہ جو کچھ مذہب کے متعلق لکھا وہ زیادہ تر قوم کے محققین کی تصنیفات سے استناد کرکے

تہذیب الاخلاق

اول مسلمانوں کے مذہبی خیالات کی اصلاح اور اُن کو ترقی کی طرف مائل کرنے کے لیے پرچۂ تہذیب الاخلاق جاری کیا۔ اُنہوں نے اس پرچہ کے نکالنے کا ارادہ ولایت ہی میں کر لیا تھا چونکہ تہذیب الاخلاق کی پیشانی پر جو اسکا نام اور بیل چھپتی تھی اُس کا ٹائپ وہ لندن ہی سے بنوا کر اپنے ساتھ لائے تھے۔ الغرض سرسید اور اُنکے دوستوں کی ایک کمیٹی قائم ہوئی جس کے ہر ایک ممبر سے تہذیب الاخلاق کے اخراجات کے لیے ساٹھ روپیہ سالانہ اور عام خریداروں سے ساڑھے چار روپیہ سالانہ لینا قرار پایا۔ یکم شوال ۱۲۸۷ہجری مطابق ۲۴ دسمبر ۱۸۷۰ء کو اُس کا اول نمبر شائع ہوا؛ اور پہلی بار شوال ۱۲۸۷ہجری سے رمضان ۱۲۹۳ یعنی پورے چھ برس تک برابر نکلتا رہا اور ہمیشہ اُس کے اڈیٹر اور منیجر خود سرسید رہے چونکہ یہ پرچہ کوئی تجارتی اخبار نہ تھا بلکہ محض قوم کی بھلائی کے لیے جاری کیا گیا تھا؛ اس لیے جو کچھ آمدنی ہوتی تھی وہ اُسی کی ترقی میں صرف کیجاتی تھی۔ اُس کی اخیر جلدوں میں ہر نمبر کی پیشانی پر بطور ماٹو کے یہ عربی فقرہ لکھا جاتا تھا "حب القوم من الایمان فمن یسعیٰ فی اعزاز قومه انما یسعیٰ فی اعزاز دینه"

تہذیب الاخلاق ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے تقریباً ویسا ہی پرچہ تھا جیسے اسٹیل اور اڈیسن نے دو میگزین یعنی ٹیٹلر اور اسپکٹیٹر نوبت بہ نوبت لندن میں نکالے تھے اور ۱۷۰۹ء سے ۱۷۱۳ء تک جاری رہے ان دونوں پرچوں کی نسبت کہا جاتا ہے کہ اُنسے انگریزوں کے اخلاق، عادات، رسم و رواج، اور قومی خیالات پر بہت بڑا اثر ہوا تھا۔ اگرچہ اُس وقت انگلستان کی حالت کیا باعتبار اخلاق و معاشرت کے اور کیا باعتبار عقلی ترقیات کے آجکل کی حالت سے کچھ نسبت نہ رکھتی تھی مگر مذہبی خیالات اُس عام ریفارمیشن کی بدولت۔ جو لوتھر اور کالون نے کی۔ بہت کچھ اصلاح پا چکے تھے اس لیے ان دونوں پرچوں میں مذہبی چھیڑ چھاڑ بہت کم ہوتی تھی اور اسی وجہ سے وہاں ان پرچوں کی کچھ مخالفت نہیں ہوئی۔ لیکن تہذیب الاخلاق کا حال ایسا نہ تھا؛ اُس میں مذہبی بحث کرنی لازم آپڑی تھی۔ کیونکہ جو باتیں مسلمانوں کی دنیوی ترقی کی مانع تھیں وہ زیادہ تر مذہبی خیالات پر مبنی تھیں۔ اگرچہ اس پرچہ میں مضمون لکھنے والے بہت سے لوگ تھے مگر سب سے زیادہ سرگرم خود سرسید، پھر مولوی سید مہدی علی خاں، اور پھر مولوی چراغ علی تھے۔ سرسید مذہب کے سوا اخلاق و معاشرت و تمدن پر بھی اکثر مضامین لکھتے تھے مگر پچھلے دونوں شخص زیادہ تر مذہبی بحث لکھنے والے تھے۔

اس پرچہ کے دو ہی تین نمبر نکلنے پائے تھے کہ چاروں طرف سے اُس کی مخالفت ہونی شروع ہوئی اور ساتھ ہی اُس مدرسہ سے بھی جس کو سرسید قائم کرنا چاہتے تھے عموماً سوءِ ظن پیدا ہونے لگا۔ بہت سے اخباروں میں مخالفانہ مضمون چھپنے لگے؛ اور چند پرچے جن میں سے کانپور کا نور الآفاق اور نور الانوار زیادہ مشہور تھا۔ تہذیب الاخلاق کے توڑ پر جاری کیے گئے۔ رسالۂ اشاعۃ السنۃ جو خاص اہلِ حدیث

کی تائید کے لیے جاری ہوا تھا اُس میں بھی تہذیب الاخلاق کے برخلاف مضمون نکلنے لگے، اور سرسید کی تکفیر کے فتوے جابجا لکھے جانے لگے؛ یہاں تک کہ اُن کے ساتھ اُن کے دوست اور اعوان و انصار بھی نیچری بلکہ کرسٹان کہلانے لگے۔

با اینہمہ تہذیب الاخلاق کے جاری ہونے سے رفتہ رفتہ ایک معتدبہ گروہ مسلمانوں میں ایسا بھی پیدا ہوگیا جو اس پرچہ کا ویسا ہی دلدادہ تھا جیسے اہل انگلستان ٹٹیلر اور اسپکٹیٹر کے دلدادہ تھے۔ وہ اُس کے مضامین پر وجد کرتے تھے؛ اور تاریخ معین پر اُس کے انتظار میں ہمہ تن چشم رہتے تھے اور اُس کے مخالفوں کو تعجب سے دیکھتے تھے۔ جو نتائج اس پرچہ سے مسلمانوں کے حق میں پیدا ہوئے اُن کو دوسرے حصہ میں بیان کیا جائیگا۔ یہاں صرف اس قدر لکھا جاتا ہے کہ اگر سرسید یہ پرچہ جاری نہ کرتے اور مسلمانوں کے خیالات کی اصلاح کا خیال چھوڑ دیتے بلکہ صرف اُن کی تعلیم کا انتظام کرتے تو ظاہراً اُن کی مخالفت کم ہوتی بلکہ شاید نہ ہوتی، مگر اُس کے ساتھ ہی اعانت اور امداد بھی کم ہوتی؛ اور جو تحریک چند سال میں مسلمانوں میں پیدا ہوگئی اُس کا صدیوں تک کہیں نام و نشان نہ ہوتا۔

اس پرچہ کی تمام تر کوشش اس بات میں تھی کہ جو خیالات مسلمانوں کی ترقی اور تمدن کے مذہبی مانع سمجھے جاتے ہیں اور درحقیقت مذہب سے کچھ علاقہ نہیں رکھتے اُن کو جہانتک ہو سکے رفع کیا جائے اور اسلام پر جو عیسائیوں کا یہ اعتراض ہے کہ وہ ترقی اور تمدن کا دشمن ہے۔ اس غلطی کا اصل منشا ظاہر کیا جائے اس کے سوا یوروپ کی سویلزیشن کے اصول و فروع سے اور اُن اسباب سے جو یوروپ کی ترقی کے باعث ہوئے ہیں قوم کو آگاہ کیا جائے۔ بیہودہ اور مضر رسموں سے اُن کو نفرت دلائی جائے۔ اخلاق و عادات میں جو بسبب قومی تنزل کے خرابیاں پیدا ہوگئی ہیں وہ بیان کی جائیں۔ علوم قدیمہ کی عظمت جو لوگوں کے دلوں میں حد سے زیادہ بیٹھی ہوئی ہے جہانتک اُسمیں غلطی ہو اُس کو ظاہر کیا جائے۔ علوم جدیدہ جن سے نفرت کی جاتی ہے اُنکی اصلی اور واقعی خوبیاں اور جو بدیہی نتائج دُنیا میں اُن سے پیدا ہوئے ہیں جتائے جائیں اور بجائے نفرت کے اُنکی طرف رغبت دلائی جائے۔ اسلام میں مخالفوں نے جو باتیں تاریخی اور علمی تحقیقات کے خلاف بیان کی ہیں اُن کو تاریخ اور علم کے ساتھ منطبق کیا جائے یا اسلام کا اُن سے پاک ثابت کیا جائے مسلمانوں کے دلوں میں اُن کے اکابر و اسلاف کی عظمت کا خیال پیدا کیا جائے؛ اُنکی قدیم علمی اور عملی ترقیات اُن کو یاد دلائی جائیں اور اسطرح قوم کے مردہ دلوں کو از سر نو زندہ کرنے میں کوشش کیجائے۔

ان تمام اغراض و مقاصد کے پورا کرنے کے لیے سرسید اور اُن کے دوستوں نے صرف اپنی رائے اور اجتہاد ہی سے کام نہیں لیا بلکہ جو کچھ مذہب کے متعلق لکھا وہ زیادہ تر قوم کے محققین کی تصنیفات سے استناد کرکے

تھا اور اخلاق و معاشرت و ترقی و تمدن کے متعلق یورپ کے مصنفین کے خیالات بھی جہاں تک ہو سکا اپنی زبان میں بیان کیے۔

چونکہ یہ پرچہ اسلام کو ایک ایسی صورت میں ظاہر کرتا تھا جو مسلمانوں کے عام خیالات کے برخلاف تھی اور اُن کے کان میں وہ صدائیں پہنچاتا تھا جو اُنھوں نے پہلے کبھی نہ سنی تھیں؛ اس لیے اول اول لوگ اُس سے بہت بھڑکے، مگر رفتہ رفتہ مسلمانوں کے محدود دائرہ میں اُسکا اثر پھیل گیا۔ اَن پڑھ مسلمان جن کی تعداد ہمیشہ ایک گری ہوئی قوم میں پڑھے لکھوں کی نسبت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ وہ تو یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ تہذیب الاخلاق کس جانور کا نام ہے۔ مولویوں اور واعظوں پر بھی اُس کا منتر نہیں چل سکتا تھا کیونکہ وہ اُس کو نہ صرف مذہب کے حق میں بلکہ شاید اپنے حق میں بھی مُضر جانتے تھے۔ اُمرا تک اُسکی رسائی ہونی سخت دشوار تھی کیونکہ انکو مسلمانوں کے تنزل کا یقین دلانا ایسا ہی مشکل تھا جیسا مرغابی کو طوفان سے خوف دلانا۔ اسی لیے تہذیب الاخلاق کا اثر صرف متوسط درجہ کے لوگوں میں محدود رہا جو نہ محض جاہل تھے اور نہ جامع علوم عقلیہ و نقلیہ؛ اور مقدور کے لحاظ سے نہ نہایت پست حالت میں تھے اور نہ اعلیٰ درجہ میں۔ پھر خاصکر دلّی اور لکھنؤ اور اُن کے نواح میں جہاں مسلمانوں کی قدیم شائستگی کے کچھ دھندلے نشان باقی تھے اُس کا اثر بہت کم ہوا۔ باوجود اسکے چونکہ اس کی آواز زمانہ کی گونج کے موافق تھی اُس نے توقع سے بہت زیادہ کامیابی حاصل کی۔

زیادہ تر اُس کے مقبول ہونے کا سبب یہ تھا کہ اُس کے مضامین کا جزو اعظم سرسید کی دلنشین تحریریں اور سید مہدی علیخاں کے دلکش آرٹکل تھے۔ سرسید کی تحریر کی نسبت یہ بات مشہور ہوگئی تھی کہ اُس کے دیکھنے کے بعد آدمی اپنے عقیدے پر قائم نہیں رہ سکتا۔ سید مہدی علی خاں کی تحریروں پر بھی لوگ سر دھنتے تھے۔ اس کے سوا اُس میں ہر ایک بات نرمی اور سنجیدگی سے برخلاف اُس قدیم دلآزار طریقہ کے جو مسلمانوں کے مناظرات و مجادلات میں جاری تھا۔ بیان کی جاتی تھی۔ کسی شخص کی طرف روے سخن بہت کم ہوتا تھا؛ بلکہ ہمیشہ قوم کی عام حالت پر بطور دلسوزی کے نہ بطور طعن و تعریض کے گفتگو کیجاتی تھی۔ اُس میں ظرافت بھی ہوتی تھی، مگر نہ ایسی کہ کسی کو ناگوار گذرے۔ اُس میں مخالفوں کے اعتراضات کے جواب نہایت سخت ضرورت کے سوا کبھی نہ دیے جاتے تھے اور اسلیے مناظرہ کے بے مزہ ردّ و بدل اور جواب اور ردّ جواب و کدّ جواب و حدّ جواب کے ناگوار تسلسل سے وہ بالکل پاک تھا کیونکہ اُس کے جاری کرنے سے صرف یہ مقصود تھا کہ جو بات سچ معلوم ہو وہ لوگوں کے کان میں ڈال دی جائے نہ یہ کہ اُن سے زبردستی منوائی جائے۔

تہذیب الاخلاق میں عام خبریں درج نہیں ہوتی تھیں مگر مدرسۃ العلوم کے متعلق کمیٹی خزنۃ البضاعۃ کی روئدادیں اور تمام حالات اُس میں کئی برس تک برابر چھپتی رہیں۔ اس لیے مدرسۃ العلوم کو اُس سے

بہت تقویت پہنچی۔ ادہر تو اُس کے مضامین لوگوں کے خیالات میں انقلاب پیدا کر رہے تھے اور اُدھر خدمت کی روز افزوں ترقی، بانیان کالج کی سرگرمی، اور سرسید کی کوششوں کے عملی نتائج اُس کے ذریعہ سے دریافت ہوتے تھے اور اس لیے روز بروز مدرسۃ العلوم کی عظمت کا خیال لوگوں کے دلوں میں زیادہ ہوتا جاتا تھا۔

۱۸۷۶ء میں جب سرسید پنشن لیکر علیگڑھ میں آ گئے تو اُن کو ہمہ تن مدرسہ کی تکمیل، اُس کی عمارتیں تیار کرنے، اور ہر طرح سے کالج کی زمین کو آباد و سرسبز کرنے کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ اس کے سوا اُنکے وہ دوست جو تہذیب الاخلاق کے سرگرم معاون تھے وہ زیادہ اہم کاموں میں مصروف ہو گئے۔ نیز تہذیب الاخلاق اپنا کام بہت کچھ کر چکا تھا اور مسلمانوں میں جس قدر کہ اُبال آنے کی قابلیت تھی اُس قدر اُن میں اُبال پیدا کر چکا تھا۔ ان تمام وجوہات سے اُس کو بند کرنا پڑا اور یکم رمضان ۱۲۹۳ھ کے پرچہ پر اُس کا خاتمہ ہو گیا۔ چھ برس کے عرصہ میں ۲۲۶ مضمون تہذیب الاخلاق میں چھپے جن میں سے چھوٹے بڑے ۱۱۲ مضمون صرف سرسید کے لکھے ہوئے ہیں اور باقی اور لوگوں کے۔

جن لوگوں کو تہذیب الاخلاق کا چسکا لگ گیا تھا اُن کو اس کا بند ہونا شاق گذرا اور اُن کی طرف سے برابر تحریکیں ہوتی رہیں کہ اُس کو پھر جاری کیا جائے۔ آخر جمادی الاولی ۱۲۹۶ھ میں دوسری بار جاری کیا گیا جو دو برس پانچ مہینے جاری رہکر بند ہو گیا۔ اس دفعہ چونکہ سرسید کی توجہ زیادہ تر تفسیر لکھنے کی طرف مصروف رہی اور اُن کے سرگرم معاونوں کو اُس میں مدد دینے کی فرصت یا موقع نہ تھا اسلیے اُس میں پہلے کی نسبت عمدہ مضامین کم نکلے۔ ابکی بار کُل ۷۶ مضمون چھپے جن کے لکھنے والے مختلف آٹھ شخص تھے۔ ازانجملہ ۴۳ مضمون سرسید کے اور باقی اَور لوگوں کے تھے۔ شوال ۱۳۱۱ ہجری میں سرسید نے نواب محسن الملک کی تحریک سے اُس کو پھر جاری کیا مگر اس دفعہ اُس کا دار و مدار بالکل سرسید کی ذات پر رہا اَور لوگوں نے اُس میں بہت کم مدد دی آخر تین برس جاری رہکر بند ہو گیا۔

کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان ۱۸۷۲ء

تہذیب الاخلاق ہی کے ساتھ سرسید نے دوسرا کام یہ کیا کہ مسلمانوں کی ترقی تعلیم پر غور کرنے کے لیے اُنہوں نے بنارس ہی میں ایک دوسری کمیٹی قائم کی۔ وہ لندن ہی سے ایک اشتہار۔ تدابیر ترقی تعلیم مسلمانان کی نسبت اُردو اور انگریزی میں چھپوا کر اپنے آنے سے پہلے مولوی سید مہدی علی خاں کے پاس جو اُس زمانہ میں مرزاپور میں تحصیلدار تھے اشاعت کی غرض سے بھیج چکے تھے۔ مگر اُنھوں نے اُسکی تمام کاپیاں ایک صندوق میں ڈال دیں اور معمولی اشتہاروں کی طرح اُس کی اشاعت کو محض بے سود خیال کیا۔ جب سرسید ولایت سے واپس آئے اور مولوی صاحب سے ملے تو اُنھوں نے تمام اشتہار سرسید کے سامنے رکھدیے اور یہ کہا کہ ہر شخص سید احمد خاں نہیں ہے جو اس کام کو کر سکے۔ اب سرسید

نے خود اس کام کو شروع کیا - وہی اشتہار جس کا عنوان یہ تھا "التماس بخدمت اہل اسلام وحکام ہند درباب ترقی تعلیم مسلمانانِ ہندوستان" جہاں جہاں مناسب سمجھا، بھیجا اور اخبار کے ذریعہ سے بھی اُس کو شائع کیا اور خلاصہ التماس کا یہ تھا کہ "انگریزی حکومت سے جو تعلیم کے فائدے لوگ عام طور پر اُٹھا رہے ہیں اور مسلمان اُس سے مستفید نہیں ہوتے؛ اس کے اسباب دریافت کرنے کی طرف خود مسلمانوں کو متوجہ ہونا چاہیے کیونکہ جو اسباب اور لوگوں نے اب تک بیان کیے ہیں اُنپر کافی بھروسہ نہیں ہو سکتا؛ اور بالیقین نہیں کہا جا سکتا کہ درحقیقت وہی اصلی اسباب ہیں۔ نیز یہ کہ اس بیماری کی اصل جڑ دریافت کرنی گورنمنٹ کو بھی ضروری ہے۔ پس مناسب ہے کہ ایک انعامی اشتہار جاری کیا جائے اور مسلمانوں کو اس مسئلہ پر مضامین لکھنے کی ترغیب دی جائے اور اس کام کے لیے مسلمانوں اور انگریزوں سے چندہ جمع کیا جائے۔ جب چندہ بقدر ضرورت جمع ہو جائے اُس وقت چندہ دہندگان میں سے ممبر منتخب کر کے ایک کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان منعقد کی جائے۔"

اس چندہ میں سب سے پہلے سرسید نے ایک رقم اپنی طرف سے پیش کی اور باتفاق مولوی مہدی علیخاں کے چندہ جمع کرنا شروع کیا۔ دسمبر ۱۸۷۱ء میں یہ اشتہار جاری ہوا تھا اُسی مہینے میں ایکہزار ایکسو دو روپیہ جمع ہو گیا اور اس کے بعد رفتہ رفتہ جمع ہوتا رہا۔ نواب کلب علیخاں مرحوم رئیس رامپور، کنور وزیر علیخاں مرحوم رئیس دانپور ضلع بلندشہر اور سر ولیم میور لفٹنٹ گورنر شمال مغرب نے اس کام کی طرف خاص توجہ ظاہر کی تھی۔ الغرض ۲۶ دسمبر کو بمقام بنارس "کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان ہندوستان" منعقد ہو گئی جس کے سکرٹری سرسید قرار پائے۔ اس کمیٹی کا کام یہ تھا کہ وہ جہاں تک ہو سکے اس بات کے دریافت کرنے میں کوشش کرے کہ سرکاری کالجوں اور اسکولوں میں مسلمان طالب علم کس لیے کم پڑھتے ہیں، علوم قدیمہ اُن میں کیوں گھٹ گئے اور علوم جدیدہ کیوں نہیں رواج پاتے۔ اور جب یہ تمام موانع ٹھیک ٹھیک دریافت ہو جائیں تو اُنکے رفع کرنے کی تدبیریں دریافت کرے اور اُن تدبیروں پر عمل درآمد کرنے میں کوشش کرے۔ نواب محسن الملک کا بیان ہے کہ "جس تاریخ کمیٹی مذکور کے انعقاد کے لیے جلسہ قرار پایا تھا اُس سے ایک روز پہلے میں بنارس میں پہنچ گیا تھا۔ رات کو سرسید نے میرا پلنگ بھی اپنے ہی کمرے میں بچھوایا تھا۔ گیارہ بارہ بجے تک مسلمانوں کی تعلیم کے متعلق باتیں ہوتی رہیں۔ اس کے بعد میری آنکھ لگ گئی۔ دو بجے کے قریب جو آنکھ کھلی تو میں نے سرسید کو اُنکے پلنگ پر نہ پایا۔ میں اُنکے دیکھنے کو کمرے سے باہر نکلا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ برآمدے میں ٹہل رہے ہیں اور زار و قطار روتے جاتے ہیں۔ میں نے گھبرا کر پوچھا کہ کیا خدانخواستہ کہیں سے کوئی افسوسناک خبر آئی ہے؟ یہ سنکر اور زیادہ رونے لگے اور کہا کہ "اس سے زیادہ اور کیا مصیبت ہو سکتی ہے کہ مسلمان بگڑ گئے اور بگڑتے جاتے ہیں اور کوئی صورت اُن کی بھلائی کی نظر نہیں آتی۔ پھر آپ ہی کہنے لگے کہ جو جلسہ کل ہونے والا ہے مجھے امید نہیں کہ اُس سے کوئی عمدہ نتیجہ پیدا ہو۔ ساری رات اسی اُدھیڑبن میں گذر گئی ہے کہ دیکھیے کل کے جلسہ کا کیا انجام ہوتا ہے اور کسی کے کان پر جوں چلتی ہے یا نہیں۔" نواب محسن الملک

کہتے ہیں کہ "سرسید کی یہ حالت دیکھکر جو کیفیت میرے دل پہ گذری اُس کو بیان نہیں کرسکتا اور جو عظمت اس شخص کی اس دن سے میرے دل میں بیٹھی ہوئی ہے اُسکو میں ہی خوب جانتا ہوں۔"

اُسی تاریخ انعامی اشتہار جس میں تین انعام پانسو، تین سو اور ڈیڑھ سو روپیہ کے مقرر ہوئے تھے جاری کیا گیا اور میعاد معین تک ۳۲ مضمون مختلف لوگوں کے لکھے ہوئے سکرٹری کے پاس پہنچے۔ مولوی مہدی علی خاں کا مضمون سب سے عمدہ تھا مگر اُنکی خواہش سے وہ انعام کی فہرست سے خارج رکھا گیا اور پہلا انعام مولوی سید اشرف علی ام اے کو جو اُس زمانہ میں بنارس کالج کے طالب علم تھے، دوسرا نواب انتصار جنگ مولوی مشتاق حسین کو اور تیسرا مولوی عبدالودود کو ملا۔ سرسید نے ان مضامین سے ایک عمدہ رپورٹ اُردو اور انگریزی میں تیار کی، جس میں تمام رسالوں کا خلاصہ کرکے اُن سے مفصلۂ ذیل نتائج استخراج کیے تھے (۱) ہندوستان کے سمجھدار مسلمان اُن تعصبات کو جو پُرانے خیال کے مسلمان انگریزی تعلیم کی نسبت رکھتے ہیں لغو اور مسلمانوں کے حق میں مضر جانتے ہیں (۲) مسلمانوں کی تعداد سرکاری مدارس میں بمقابلہ ہندو طالبعلموں کے جتنی ہونی چاہیے اُس سے بہت کم ہے (۳) جن خیالات سے مسلمان سرکاری مدارس میں اپنی اولاد کو نہیں بھیجتے اُن میں سے کچھ واجب اور اکثر واہی ہیں اور سرکاری طریقۂ تعلیم مسلمانوں کی ضرورتوں کے لیے کافی نہیں ہے (۴) اگر گورنمنٹ مسلمانوں کے لیے اپنے طریقۂ تعلیم میں کچھ تبدیلی بھی کردے تو بھی اُن کی تمام ضرورتیں رفع نہیں ہوسکتیں (۵) مسلمانوں کو اپنے علوم قدیمہ کے محفوظ رکھنے علوم جدیدہ سے مستفید ہونے اور اپنی تمام ضرورتوں کے موافق اپنی اولاد کو تعلیم و تربیت کرنے کے لیے اس کے سوا کچھ چارہ نہیں کہ اپنی تعلیم کا فکر آپ کریں۔ اسی رپورٹ میں مجوزہ کالج کی سکیم اور طریقۂ تعلیم بھی مندرج تھا جو سرسید نے کمیٹی کے سامنے پیش کیا۔

مسلمانوں کی ترقی تعلیم کے موانع جو سرسید نے اس رپورٹ میں تمام رسالوں سے استنباط کرکے لکھے تھے اُنکی نسبت شمس العلما مولوی محمد ذکاءاللہ اپنی ایک تحریر میں لکھتے ہیں کہ "ایجوکیشن کمیشن نے بھی ۱۸۸۲ء میں تمام ہندوستان کے معتبر گواہوں کی شہادت کے بعد مسلمانوں کی تعلیم کے وہی موانع تسلیم کیے ہیں جو سرسید نے ۱۸۷۲ء میں اپنی رپورٹ میں درج کیے تھے۔"

اس رپورٹ کی ایک ایک جلد گورنمنٹ ہند اور تمام لوکل گورنمنٹوں میں بھیجی گئی تھی۔ چنانچہ مدراس بنگال اور بمبئی کی لوکل گورنمنٹوں نے مسلمانوں کی تعلیم کے متعلق جو جو تدبیریں اور کارروائیاں ابتک کی تھیں اُن کے تمام کاغذات سکرٹری کے پاس بھیجدیے اور گورنمنٹ شمال مغرب نے اس رپورٹ کی کچھ جلدیں تعلیمی کمیٹیوں کو تقسیم کرنے کی غرض سے طلب کیں اور یہ وعدہ کیا کہ اگر کمیٹی کی کوشش سے کالج مجوزہ

قائم ہوگیا تو گورنمنٹ علوم دنیوی کی تعلیم کے لیے بموجب قواعد گرینٹ اِن ایڈ کے اس مدرسہ کو مدد دیگی اس کے بعد سکریٹری گورنمنٹ ہند کی چھٹی مورخہ ۹- اگست ۱۸۷۲ء اس مضمون کی پہنچی کہ "نواب گورنر جنرل بہادر بہ اجلاس کونسل کو تجویز مندرجہ رپورٹ کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم کی اطلاع سے جو بابت قائم کرنے اینگلو اورینٹل کالج کے ہے، نہایت خوشی ہوئی ہے اور وہ دل سے امید رکھتے ہیں کہ اس تجویز میں جیسی کامیابی ہونی چاہیے ویسی ہی ہوگی، شمال مغربی اضلاع کے مسلمانوں کی یہ تدبیر اس بات کی مستحق ہے کہ جہاں تک ممکن ہو گورنمنٹ اس میں مدد دے اور سید احمد خاں بہادر اور اُن صاحبوں کی کوششیں جو اس عمدہ کام میں اُن کے شریک ہیں نہایت تحسین و آفرین کے قابل ہیں" ان دونوں چٹھیوں کے آنے سے کمیٹی کو حد سے زیادہ تقویت ہوئی۔

کمیٹی خزنۃ البضاعۃ

ایک دوسری کمیٹی اس غرض سے کہ قیام مدرسۂ مجوزہ کے لیے وقتاً فوقتاً چندہ وصول کرتی رہے مقرر کی گئی جس کا نام "کمیٹی خزنۃ البضاعۃ لتاسیس مدرسۃ المسلمین" رکھا گیا اور اُس کے لائف سکریٹری سرسید قرار پائے اور یہ ٹھیرا کہ جب تک مدرسہ قائم کرنے کے لائق سرمایہ جمع نہ ہوجائے تب تک اس کمیٹی کا مقام وہیں رہے جہاں لائف سکریٹری کا قیام ہو۔ چنانچہ جب تک مدرسہ علیگڑھ میں قائم نہ ہولیا تب تک کمیٹی مذکور کا دفتر بنارس ہی میں رہا جہاں سرسید جج سمال کاز کورٹ تھے۔

جولائی ۱۸۷۲ء میں سرسید نے کمیٹی خواستگار تعلیم کی طرف سے ایک اشتہار جاری کیا جس میں مسلمانوں سے پوچھا گیا تھا کہ مدرسۃ العلوم کون سے شہر میں قائم کیا جائے اس اشتہار کے جاری کرنے کی یہ ضرورت تھی کہ بعض لوگ جو پرامیسری نوٹ خریدنے کے برخلاف تھے چندہ اس شرط سے دیتے تھے کہ ہمارے روپیہ سے جائداد خریدی جائے۔ پس تاوقتیکہ مدرسہ کے لیے کوئی جگہ قرار نہ پالے جائداد نہیں خریدی جاسکتی تھی کیونکہ جائداد کا مقام مدرسہ کے قریب خریدا جانا ضروری تھا۔ اس اشتہار پر مختلف رائیں لوگوں نے ظاہر کیں مگر سب سے زیادہ تعداد اُن لوگوں کی تھی جنہوں نے علیگڑھ کو ترجیح دی تھی اُن کو معلوم تھا کہ سرسید نے مدت سے ارادہ کر رکھا ہے کہ پنشن لینے کے بعد دلی کی سکونت ترک کرکے علیگڑھ میں بودوباش اختیار کریں۔ کیونکہ غدر کے بعد دلی کے مسلمانوں کی جو حالت ہوگئی تھی وہ اُن سے دیکھی نہیں جاسکتی تھی۔ اُنکو پنجاب کی طرز حکومت پر بھی اعتراض تھا۔ اس کے سوا مسلمانوں کی تعلیم کا جو اعلیٰ منصوبہ سرسید نے باندھا تھا اُس کا دلی میں پورا ہونا ناممکن معلوم ہوتا تھا۔

کمیٹی کو سب سے زیادہ تقویت اس بات سے ہوئی کہ لارڈ نارتھ بروک وائسرائے و گورنر جنرل ہند نے بعض شرائط کے ساتھ مغربی لٹریچر اور مغربی علوم کی شاخ میں اسکالرشپ دینے کے لیے دس ہزار روپیہ اپنی جیب خاص سے دینے کا وعدہ فرمایا اور سر ولیم میور لفٹننٹ گورنر اضلاع شمال مغربی نے ایکہزار

روپیہ کا چندہ اور اسی طرح مسٹر اسپنکی جج ہائی کورٹ الہ آباد نے ایک معقول رقم مدرسہ کے لیے عنایت کی۔ ان عطیوں نے سرسید کی کوششوں میں جان ڈالدی اور کمیٹی کی ڈھارس سی بندھ گئی جب اس طرح سے چندہ میں ترقی ہونے لگی تو سرسید نے کمیٹی میں تحریک کی کہ کمیٹی خازن البضاعۃ کی بموجب ایکٹ ۲۱ ۱۸۶۰ء کے رجسٹری ہونی چاہیے۔ ورنہ تمام جائداد اور پرامیسری نوٹ سکریٹری کے یعنی میرے نام سے خریدے جائینگے اور میرے اور میرے وارثوں کے نام سے منتقل ہوسکیں گے۔ چنانچہ کمیٹی مذکور کی رجسٹری حسب ضابطہ عمل میں آئی اور تمام مسلمانوں کو چھاپہ کے ذریعہ سے مطلع کیا گیا کہ جو سرمایہ مدرستہ العلوم کے لیے جمع ہوا ہے یا آیندہ جمع ہوگا اس کی حفاظت کے لیے یہ انتظام کیا گیا ہے۔

فروری ۱۸۷۳ء میں سید محمود نے ایک اسکیم انتظام و سلسلۂ تعلیم کی جو ولایت کے اسکولوں اور کالجوں اور یونیورسٹیوں کا انتظام اور طریقۂ تعلیم دیکھکر مرتب کی تھی مجوزہ کالج کے لیے پیش کی۔ موجودہ ممبروں نے اُس کو پسند کیا اور منظوری کے لیے اُس کی کاپیاں چھپ کر تمام ممبروں کے پاس بھیجی گئیں اور نیز لوکل گورنمنٹوں اور گورنمنٹ ہند میں بھی اُس کی نقلیں ارسال کی گئیں۔ تاکہ اگر گورنمنٹ اُس اسکیم کو پسند کرے تو گرینٹ ان ایڈ سے حسب عدہ امداد کرے۔ نیز ایک استفتا مع اُس اسکیم کے علمائے وقت کے پاس بھیجا گیا جس میں اُن سے پوچھا گیا تھا کہ جس مدرسہ میں اس اسکیم کے موافق تعلیم دیجائیگی اُس میں چندہ دینا جائز ہے یا نہیں۔

جب یہ استفتا شائع ہوا تو کانپور سے مولوی امداد العلی نے جو اُس وقت وہاں ڈپٹی کلکٹر تھے ایک دوسرا استفتا شائع کیا جس میں بنارس کے استفتا کو غلط اور رد ہو کا دینے والا بنایا تھا اور لکھا تھا کہ جو لوگ مدرستہ العلوم قائم کرنا چاہتے ہیں وہ درحقیقت مسلمان نہیں ہیں۔ یہ پہلی مخالفت تھی جو علانیہ مدرستہ العلوم کے ساتھ کی گئی۔ اس کے بعد دھڑا دھڑ مخالفتیں ہونی شروع ہوئیں۔ بعضوں نے مشہور کیا کہ مدرسہ میں سید احمد خاں کا بت اور اُن کے معاونوں کی تصویریں قد آدم یا نصف قد آدم رکھی جائینگی۔ بعضے کہتے کہ وہاں نیچریوں کے عقائد کے موافق کتابیں پڑھائی جائینگی۔ اور طلبہ کو گردن مروڑی مرغی کھانی پڑیگی۔ بعضے کہتے تھے کہ وہاں شیعوں کے مذہب کی کتابیں بھی پڑھائی جائینگی اور اسطرح باطل کی اعانت کیجائیگی۔ بعضے کہتے تھے کہ جس شخص کے ایسے اور ایسے عقائد و اقوال ہوں اُسکے قائم کیے ہوئے مدرسہ میں چندہ دینا یا اس میں اپنی اولاد کو تعلیم دلوانا مسلمان کا کام نہیں۔ بعض کا یہ اعتراض تھا کہ جو روپیہ چندہ سے جمع ہوگا وہ سود میں لگایا جائیگا اور اُس کے پرامیسری نوٹ خریدے جائینگے اور مدرسہ میں لڑکوں کو انگریزی لباس پہننا پڑیگا۔ بعضے کہتے تھے کہ یہ تمام شور و غل سید احمد خاں کے دم تک ہے اسکے بعد کوئی ایسا نظر نہیں آتا جو اس کام کو سرانجام کرسکے اور یہ ایک ایسی بات تھی جسکو سنکر سمجھدار آدمیوں کے دل بھی افسردہ

ہو جاتے تھے۔ یہ تمام باتیں اخباروں میں شائع ہوتی تھیں۔ چند دیسی اخبار ہمیشہ سرسید اور مدرستہ العلوم کے خلاف مضمون لکھتے تھے۔ ایک آدھ مضمون انڈین آبزرور میں بھی مدرسہ کے خلاف نہایت سخت لکھا گیا تھا مگر اودھ اخبار، پنجابی اخبار، اردو گائڈ، پٹیالہ اخبار اور انگریزی اخباروں میں پاینیر ہمیشہ مدرسہ کی تائید کرتے تھے۔

جب اس قسم کی مخالفتیں ہونے لگیں اور اتفاق سے انھیں ایام میں چندہ کی آمد بھی سست پڑ گئی تو سرسید کے دوست مایوس ہونے لگے۔ انھوں نے دوستوں کی ہمت بندھوانے اور مسلمانوں کے دل سے غلط خیالات اور مخالفوں کے اعتراض رفع کرنے کے لیے ایک نہایت مفصل مضمون تہذیب الاخلاق میں چھاپا اور دیگر اخبارات سے بھی اس کے شائع کرنے کی درخواست کی۔ اس کے اخیر کے چند فقرے ہم یہاں نقل کرتے ہیں "اب وہ وقت نہیں رہا کہ صرف کاغذ کے گھوڑے دوڑانے سے کام چلے بلکہ ہماری کمیٹی کے ممبروں کو خود شہر بہ شہر اور ضلع بہ ضلع دورہ کرنے، اسپیچیں سنانے، اور لوگوں کے دلوں کو جوش میں لانے کا وقت ہے۔ اس کام کے لیے علاوہ فرصت کے روپیہ بھی درکار ہے کہ بدون خرچ کے دورہ نہیں ہوسکتا۔ کمیٹی کی تھیلی میں جو گیا ہے نہیں نکلتا پس دورہ کرنیکا وقت، اسکی محنت اور اس کا خرچ سب ہمکو اپنی گرہ سے کرنا ہے۔ اگر خدا کی مرضی ہے تو ہم سب کچھ کرینگے۔ اگر زندہ ہیں اور خدا کو بھی منظور ہے تو اپنے مخالفوں کو دکھا دینگے کہ خدا نے کیا کیا اور اگر اس میں آنکھ بند ہوگئی اور لحد میں جا سوئے تو یہ امید رکھیں گے کہ "مردے از غیب بروں آید و کارے بکند""

اب سرسید نے چندہ جمع کرنے کے لیے زیادہ کوشش کرنی شروع کی۔ جہاں جہاں اُن کے دوست اور مددگار رہتے تھے وہاں اس غرض کے لیے سب کمیٹیاں قائم کیں، جیسے مرزاپور، علیگڑھ، کانگڑہ، پٹیالہ، وغیرہ اور خود سرسید نے مع اپنے اکثر دوستوں کے اسی مطلب کے لیے پٹنہ، لاہور، گورکھپور وغیرہ کا سفر کیا اور ہر ایک مقام پر نہایت زبردست اسپیچیں اور لکچر دیئے۔ تمام سب کمیٹیوں نے توقع سے زیادہ چندہ کیا اور سرسید کے ہر ایک سفر میں معتدبہ کامیابی ہوئی۔ اُنھیں دنوں میں سرسید نے ایک سرکلر بحیثیت سکرٹری ہونے کے انگلستان کو بھی روانہ کیا تھا جس میں اپنے یورپین دوستوں سے درخواست کی تھی کہ وہاں بھی مدرستہ العلوم کے لیے چندہ جمع کرنے کے واسطے ایک کمیٹی قائم کیجائے۔ اور لارڈ لارنس گورنر جنرل سابق ہندوستان لارڈ اسٹینلی آف ایلڈرلی، سر بارٹل فریر، سر چارلس ٹریولین اور لارڈ ورڈ تامس وغیرہم کے نام پرائیوٹ چٹھیاں روانہ کی تھیں کہ اس کمیٹی کے قائم کرنے کی طرف متوجہ ہوں مگر جہانتک ہمکو معلوم ہے اس تحریک کا کوئی نتیجہ ظاہر نہیں ہوا۔ اس مقام پر ایک لطیفہ ذکر کرنے کے لائق ہے۔

جب دوسری بار سید محمود تحصیل علم کے لیے انگلستان کو گئے اور کیمبرج میں اپنے دوستوں سے ملے تو معلوم ہوا

کہ یونیورسٹی کا سرمایہ بہت بڑھ گیا ہے اور آجکل یہ ارادہ ہو رہا ہے کہ جو متعلقہ ٹرینٹی کالج کو منہدم کر کے ایک نہایت عظیم الشان عمارت از سرِ نو بنائی جائے اور دس لاکھ روپیہ اُس میں صرف کیا جائے۔ سید محمود نے اپنے ایک دوست سے یہ تذکرہ کرکے کہا کہ اچھی خاصی عمارت کو توڑ کر اُس میں روپیہ ضائع کرنے سے کیا فائدہ ہے؟ اگر یونیورسٹی کا سرمایہ اُس کی ضرورتوں سے زیادہ بڑھ گیا ہے تو دو چار لاکھ روپیہ مدرسۃ العلوم ہی کی امداد کے لیے دیدیں۔ اُن کے دوست نے کہا کہ ہندوستان میں کتنے مسلمان رہتے ہیں؟ سید محمود نے کہا چھ کروڑ۔ وہ سُنکر نہایت متعجب ہوا اور یہ کہا کہ "جس قوم کے لوگ ایسے پست ہمت اور کم حوصلہ ہیں کہ چھ کروڑ آدمی اپنی اولاد کی تعلیم کے لیے ایک مدرسہ قائم نہیں کر سکتے اُن کی اعانت کرنی گناہ ہے اُنکو تباہ ہونے دو"

> ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب ۱۸۷۱ء

۱۸۷۱ء میں ڈاکٹر ہنٹر نے جو ہندوستان کے مدبّران سلطنت میں شمار ہوتے ہیں ایک کتاب ہندوستان کے مسلمانوں کے مذہبی خیالات پر لکھکر شائع کی جسکا نام "اور انڈین مسلمانز" تھا اس کتاب میں اُنھوں نے اپنی دانست میں یہ ثابت کیا تھا کہ مسلمان ایک ایسی قوم ہے جو گورنمنٹ سے لڑنا اور جہاد کرنا اپنا مذہبی فرض سمجھتی ہے اور گورنمنٹ کی کسی طرح خیر خواہ نہیں بن سکتی۔ نیز وہابیت اور بغاوت مترادف الفاظ ہیں۔ پس گورنمنٹ کو اُنکی طرف سے مطمئن اور بے فکر نہیں رہنا چاہیے۔ اس کتاب کے عنوان کی عبارت یہ تھی "کیا ہمارے ہندوستان کے مسلمانوں پر از روے ایمان کے ملکۂ معظمہ سے بغاوت کرنا فرض ہے؟" آگے چلکر اُنھوں نے ایک مقام پر لکھا تھا کہ "اس بیان سے معلوم ہوا کہ تمام مسلمان اپنے بغاوت سکھانے والے پیغمبر کی زہر آمیز نصیحتوں کو نہایت ذوق و شوق سے سنتے ہیں، اور ایسے بہت تھوڑے ہیں جو اپنی تیزی طبیعت سے اپنی شریعت کا کچھ اور مطلب ٹھیرا کر بغاوت کے بڑے فرض سے بچ جاتے ہیں" پھر اس کے بعد لکھا تھا کہ "ہندوستان کے مسلمان اب بھی ہندوستان میں گورنمنٹ انگریزی کے لیے موجب خطر ہیں جیسے کہ ایک مدت سے موجب خطر چلے آتے ہیں" پس اگرچہ ڈاکٹر ہنٹر نے اپنی کتاب کے شروع میں یہ ظاہر کیا تھا کہ "اس کتاب کے مطالب صرف بنگالہ کے مسلمانوں سے متعلق ہیں؛ کیونکہ میں صرف اُنہیں سے زیادہ واقف ہوں" لیکن جو فقرے ان کی کتاب کے اوپر نقل کیے گئے اُنسے صاف پایا جاتا ہے کہ اُنھوں نے تمام ہندوستان کے مسلمانوں سے گورنمنٹ کو بدگمان اور غیر مطمئن کرنا چاہا تھا۔

جس زمانہ میں ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب شائع ہوئی یہ وہ زمانہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ انگریزوں کو ابھی تک فراموش نہیں ہوا تھا؛ دوسرے بنگالہ کے وہابیوں کے مقدمات کا سلسلہ جاری تھا تیسرے اُنھیں دنوں میں مسٹر نارمن چیف جسٹس بنگال کا ایک مسلمان کے ہاتھ سے قتل ہونا اُسپر اور طرہ ہوگیا تھا؛ ایسے وقت میں بخوبی قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر ہنٹر جیسے معزز شخص کی کتاب نے انگریزوں کے

دلپر کیا اثر کیا ہوگا اور مسلمانوں کی طرف سے اُن کی بدگمانی کو کس حد تک پہنچا دیا ہوگا۔

جس وقت یہ کتاب شائع ہوئی اُسوقت سرسید کو اپنے منصبی فرائض کے علاوہ دو ایسے مہتم بالشان کام درپیش جن کو چھوڑ کر ان کا دوسری طرف متوجہ ہونا نہایت دشوار تھا؛ ایک تہذیب الاخلاق کا اہتمام جس کا زیادہ تر دارومدار صرف انکی ذات پر تھا؛ دوسرے مدرستہ العلوم کے قیام کی فکر۔ پھر ڈاکٹر موصوف کی کتاب پر ریویو لکھنے کے لیے بہت سے ایسے میٹریل کی ضرورت تھی جس کا اُس زمانہ میں ہم پہنچانا سرسید ہی کا کام تھا۔ وہابیت کی تاریخ کے متعلق بیشمار واقعات کا بقید تاریخ و سنہ لکھنا نہایت ضرور تھا حالانکہ اُس کے ذریعے بظاہر مفقود نظر آتے تھے۔ بایںہمہ جونہی اُن کے کان میں اس کتاب کی بھنک پڑی اُنھوں نے فوراً اُس کو منگوا کر دیکھا اور اُسپر ایک مفصل اور مبسوط ریویو بہت جلد لکھکر پاینیر کے متعدد پرچوں میں شائع کرایا، جو آخر کو سوسائٹی اخبار میں ۲۴ رنومبر ۱۸۷۱ء سے ۲۳۔ فروری ۷۲ء تک ۱۴ نمبروں میں مع اردو ترجمہ کے برابر چھپتا رہا۔

سرسید اپنے ریویو میں لکھتے ہیں کہ "میں نے یہ سمجھکر کہ یہ کتاب ایسے شخص کی لکھی ہوئی ہے جو مسلمانوں کا بڑا دوست ہے؛ نہایت شوق سے دیکھنی شروع کی تھی۔ مگر افسوس ہے کہ مجھکو اُس کے پڑھنے سے بڑی مایوسی ہوئی اور بے اختیار مونہ سے نکلا کہ خدا مجھکو میرے دوستوں سے بچائے" اُنھوں نے اس ریویو میں بہت صاف اور روشن شہادتوں سے ڈاکٹر ہنٹر کی غلطیاں ظاہر کی ہیں اور وہابیوں کی مختصر تاریخ اول سے آخر تک اور وہابیت کے اصول مشرح بیان کیے ہیں؛ اور صاف اقرار کیا ہے کہ میں خود وہابی ہوں اور وہابی ہونا جرم نہیں ہے؛ بلکہ گورنمنٹ کی بدخواہی اور بغاوت جرم ہے۔ جو شخص اس جرم کا مرتکب ہوگا خواہ وہ وہابی ہو یا عیسائی، ہندو ہو یا مسلمان یا اور کوئی مذہب والا، بلاخیال مذہب کے مجرم قرار پائیگا۔ اُنھوں نے جہاد کے مسئلہ کی حقیقت اور جو غلط فہمیاں اُس کی نسبت تھیں اُنکو اچھی طرح ظاہر کیا ہے؛ اور بتایا ہے کہ جو مسلمان انگریزی گورنمنٹ کی رعایا اور مستامن ہیں اور اپنے فرائض مذہبی بلامزاحمت ادا کرتے ہیں وہ شریعت اسلام کی

---

[1] سنا ہے کہ جن دنوں بنگال میں وہابیوں کی تحقیقات اور تلاش ہو رہی تھی ایک یورپین معزز افسر سے جو اسی کام پر مامور تھا ایل ہی سرسید سے مٹ بھیڑ ہوگئی دونوں آگرہ جاتے تھے اور سرسید کو کسی ذریعہ سے معلوم ہو گیا تھا کہ یہ افسر وہابیوں کی تلاش پر مامور ہے۔ اُس افسر نے اُنسے پوچھا کہ آپ کا کیا مذہب ہے؟ اُنھوں نے کہا وہابی مسلمان ہوں۔ پھر اُس نے سرسید کا سارا پتہ دریافت کیا اُنھوں نے صحیح صحیح بیان کر دیا۔ جب آگرہ میں پہنچے دونوں اُترکر اپنے اپنے ٹھکانے چلے گئے۔ پھر سرسید مٹن صاحب کمشنر آگرہ سے ملنے کو گئے۔ اتفاق سے وہ افسر انھیں کے ہاں ٹھیرا ہوا تھا اور اُن سے ذکر کر چکا تھا کہ اس حلیہ اور اس نام کا ایک وہابی مسلمان فلاں جگہ ٹھیرا ہوا ہے۔ اب صاحب کمشنر نے افسر مذکور کو بلا کر کہا کہ لو یہ تمہاری آسامی حاضر ہے۔ جب اس کو معلوم ہوا کہ یہ شخص باوجود وہابی ہونیکے بڑا خیر خواہ سرکار ہے تو اسے نہایت تعجب ہوا اور سب بہت دیر تک اس بات پر ہنستے رہے۔ ۱۲

رو سے بمقابلہ انگریزوں کے نہ جہاد کر سکتے ہیں نہ بغاوت اور نہ کسی قسم کا فساد - ان کو ہندوستان میں انگریزی گورنمنٹ کے زیر حکومت اسی اطاعت اور فرمانبرداری سے از روئے مذہب اسلام کے رہنا واجب ہے جیسا کہ ہجرت اولے میں مسلمان حبش میں جا کر عیسائی بادشاہ کے زیر حکومت رہتے تھے -

سرسید کے ریویو نے تمام انگریزی حکام کے دل اور نیز انگلستان کے لوگوں پر نہایت عمدہ اثر کیا - اُس زمانہ میں حافظ احمد حسن مرحوم وکیل ٹونک لندن میں تھے جب اُنھوں نے دیکھا کہ ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب سے لندن میں نہایت جوش اور بُرے خیالات مسلمانوں کی نسبت پیدا ہو گئے ہیں اُنھوں نے تمام ریویو پاینیر کے پرچوں سے نقل کرا کے جدا بطور پمفلٹ کے چھپوا دیا اور لندن میں جا بجا تقسیم کر دیا تھا کہ جب وہ لندن سے آئے تو اُنھوں نے بیان کیا کہ اس ریویو کے شائع ہونے سے لندن میں لوگوں کی طبیعتوں کا ایسا حال ہو گیا تھا جیسے کہ جلتی اور بھڑکتی آگ پر کوئی پانی ڈال دے - جو شخص اس کو پڑھتا تھا ڈاکٹر ہنٹر کی تحریر پر تعجب کرتا تھا اور جو کچھ اُنھوں نے مسلمانوں یا وہابیوں کی نسبت لکھا تھا اس کو صحیح نہیں سمجھتا تھا -

ہندوستان میں جب یہ ریویو پاینیر کے ذریعہ سے شائع ہوا اُنھیں دنوں میں پاینیر مورخہ ۲۴ نومبر سنہ میں ایک بہت مسودہ آرٹکل جو کسی بڑے لائق عربی داں انگریز کا لکھا ہوا تھا اور جس کی نسبت یقین کیا گیا ہے کہ وہ سر ولیم میور کا لکھا ہوا تھا ، ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب کے برخلاف گویا سرسید کی تائید میں چھپا اور پا یونیرسٹی سوسائٹی اخبار میں نقل ہوا - اس آرٹکل میں نہایت عالمانہ بیانات سے ڈاکٹر ہنٹر کے شبہات کا جواب دیا گیا تھا اور سرسید کی تائید کی گئی تھی - اُس کے آخر کے چند فقرے ہم اس مقام پر نقل کرتے ہیں -

”وہابی وہ ہے جو فالصاً خدا کی عبادت کرتا ہو ، موحد ہو ، اور اُس کا اسلام ہوائے نفسانی اور بدعت کی آمیزش سے پاک ہو مگر یہ کہنا کہ وہ چھپا ہوا پوشیدہ تخریب سلطنت کی فکر میں رہتا ہے اور چپکے چپکے منصوبے باندھا کرتا ہے اور غدر و بغاوت کی تحریک کرتا ہے ، محض تہمت ہے - ہم اسوقت بہت سے ایسے آدمی مسلمان گنا سکتے ہیں جو سرکار کے ایسے ملازم ہیں کہ اُن سے زیادہ سرکار کا خیر خواہ اور معتمد کوئی نہیں ، با ایں ہمہ وہ اپنے تئیں علی الاعلان اور بے تامل تحریراً طور پر وہابی کہتے ہیں - اور سرکار نے بے سوچے سمجھے اُنکو معتوب علیہ نہیں گردانا بلکہ غدر کے زمانہ میں جبکہ فتنہ کی آگ ہر طرف مشتعل تھی اُن کی وفاداری کا سونا اچھی طرح تایا گیا اور وہ خیر خواہی سرکار میں ثابت قدم رہے - اگر وہ جہاد کا وعظ کہتے ہوتے اور بغاوت وہابیت کی اصل ہوتی تو جو کچھ اُن سے ظہور میں آیا یہ کیونکر ظہور میں آتا - ہم ڈاکٹر ہنٹر کی آگاہی کے لیے ان لوگوں کے چال چلن کو پیش کرتے ہیں “

اس کے ایک مدت بعد انڈین آبزرور مورخہ ۱۶ - مارچ ۱۸۷۲ء میں خود اُس کے یورپین اڈیٹر کا

ایک زبردست آرٹکل سرسید کے رویو پر نکلا جو درحقیقت ہندوستان کے یوروپین حکام اور افسروں کی رائے کا آئینہ تھا۔ ہم اس آرٹکل کے چند مقام یہاں بجنسہ نقل کیے دیتے ہیں، تاکہ اچھی طرح معلوم ہو جائے کہ انگریز سچی بات کے قبول کرنے میں کس قدر غیر متعصب اور منصف مزاج ہوتے ہیں۔

آبزرور لکھتا ہے کہ "ہم سمجھتے ہیں کہ دنیا کے لوگوں نے یا دنیا میں سے اُس گروہ کے لوگوں نے جو اس قسم کی باتوں سے سروکار رکھتے ہیں ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب متعلقہ مسلمانان ہندوستان کی قدر و منزلت کی بابت۔ بلکہ ٹھیک ٹھیک یہ کہنا اچھا ہو کہ اُس کے لچر و پوچ ہونے کی بابت۔ بالاتفاق تصفیہ کر دیا ہے۔ جہاں تک ہم کو لٹریچر میں مداخلت ہے اُس کے اعتبار سے ہم ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب کو لاثانی سمجھتے ہیں، کیونکہ اُن کے سوا ہم نہیں جانتے کہ کسی مصنف نے دیدہ و دانستہ ایسے مضمون پر کتاب چھاپی ہو جس سے وہ بالکل ناواقف ہو۔ جس کسی کو کچھ بھی علم اُن باتوں کا ہو گا جن کی بحث اس کتاب میں ہے وہ ایک ہی نظر میں معلوم کر لیگا کہ ڈاکٹر ہنٹر مسلمانوں کے مذہب کی نسبت اور خاصکر وہابیوں کے مذہب کی نسبت کچھ بھی نہیں جانتے وہ شمال مغرب کی سرحد کے لوگوں کی حالت سے بالکل ناواقف ہیں، یہاں تک کہ جو قومیں اُس ملک میں بستی ہیں اُن کے نام تک نہیں جانتے اور امورات سلطنت کی پیچیدہ باتوں کی نسبت اور اس بات کی نسبت کہ سید احمد کے زمانہ میں سکھ اور افغانوں کے باہم کیا معاملہ تھا؛ نہایت دھندلے خیالات کے سوا انہوں نے اور کچھ حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اور جب سے کہ ملک پنجاب گورنمنٹ انگلشیہ کے قبضہ میں آیا ہے اُس کے بعد کی سرحدی تاریخ سے بھی ناواقف ہیں اور جو مسلمان خاص بنگالہ کی حد سے باہر رہتے ہیں اُن کے خیالات سے بالکل بے خبر ہیں؛ بلکہ جب اُن لوگوں کا ذکر کرتے ہیں تو اس میں ایک غلطی سے دوسری غلطی میں پڑتے ہیں اور جب وہ اپنے خیال اور قیاس کو اکبر کے زمانہ کے حالات کے تذکرہ سے ثابت کرنا چاہتے ہیں تو ایسی باتیں بیان کرتے ہیں جو ہنسی کے قابل اور بالکل غیر ممکن ہیں۔ اگرچہ وہ دارالاسلام اور دارالحرب کی بحث ایک مکہ کے مولوی کیسی فصاحت اور واقفیت کے ساتھ کرتے ہیں تاہم اُن کے مباحثہ کے ہر حصہ کے مانند ان باتوں کا علم بھی اُن کو اُن مہمل اور بے صرفہ خیالات سے کچھ بڑھکر نہیں ہے جو ہر ایسے تعلیم یافتہ اشخاص کے ہوتے ہیں جنہے کچھ سطری بھی پڑھی ہو۔"

"اسی بڑی ناواقفیت کے باعث ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب میں ایک ایسا وصف ہے جو اُسی کے ساتھ مخصوص ہے؛ یعنی جیسا ہم اوپر کہہ آئے ہیں یہ کتاب لٹریچر کے کتب خانہ میں بے نظیر ہے۔ ہر شخص جس نے سید احمد خاں کی تحریر کو پڑھا ہے ضرور یقین کریگا کہ ہم نے جو کچھ اوپر بیان کیا ہے اُس میں اس معاملہ کے اصل حالات کی نسبت کچھ مبالغہ نہیں کیا۔ ڈاکٹر ہنٹر کو یہ توقع تھی کہ اپنی فصاحت و بلاغت اور دلفریب عبارت کے ذریعہ سے کامیاب ہو جاوینگے؛ مگر ظاہرا انہوں نے اپنی ناواقفیت کی گہرائی کی تھاہ دریافت نہیں کی تھی؛ یا غالباً یہ سمجھا تھا کہ جس قدر میں جانتا ہوں اُس سے زیادہ کوئی واقف نہوگا، اس لیے کوئی میری باتوں کی اصلاح نہ کرسکیگا۔ وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ میرے میزبان میری کیسی مدارات کرینگے؟

اُن کی اس بات پر ہم سے زیادہ اور کسی کو افسوس نہ ہوگا۔ غالباً ڈاکٹر ہنٹر ابھی زندہ رہینگے اور بہت سی کتابیں لکھینگے جن کی عبارت بہت سے لوگوں کے دل بھائیگی مگر اصلی واقعات کے محقق ہونے کی ناموری اُنکے ہاتھ سے کھوئی گئی ہی کہ پھر کبھی میسر نہوگی۔ کتاب کا پڑھنے والا اُن کی کتابوں کو بغیر اس کے کہ کھولکر دیکھے بالاے طاق رکھدے گا۔ اور یہ سمجھے گا کہ قصہ کی دلچسپ کتابوں کے مانند ہیں جو اپنی طرز میں نہایت دلفریب ہوتی ہیں مگر کسی کام کی نہیں،،

"سید احمد خاں کا چھوٹا سا رسالہ سوائے ڈاکٹر ہنٹر کی تردید کے اور بھی خوبی اور عمدگی رکھتا ہی۔ یہ ایک ایسے شخص کی لکھی ہوئی کتاب ہی جو ہر طرح سے ہمارے اور اپنے ہم مذہبوں کے درمیان ترجمانی کے کام کے لیے بخوبی لائق ہی سید احمد خاں مذہب اسلام کو خاص خدا کا دیا ہوا ہونے پر نہایت پختہ یقین رکھتے ہیں اور اُن کو یہ بھی یقین ہی کہ آخر کار اور مذہبوں پر یہی غالب آئیگا۔ مگر اسی کے ساتھ وہ دل سے اور نہایت گرمجوشی سے انگریزی عملداری کے معاون ہیں۔ وہ اس بات کو خوب سمجھتے ہیں کہ اگر انسان وحشیانہ حالت کی طرف مراجعت نہ کرنی چاہے تو تبدیلیوں کا ہوتے رہنا نہایت ضرور ہی۔ بغیر کسی استثنا کے وہ تسلیم کرتے ہیں کہ اگر اسلام کو روحانی سلطنت حاصل کرنی ہی تو وہ تہذیب و شایستگی کے ساتھ ملا جلا ہے۔ کوئی انگریز اس قسم کی دلیل پر اعتراض نہیں کرسکتا، کیونکہ انکا دعویٰ اسقدر مدلل اور مستند ہے کہ کوئی انگریز اُن دلیلوں اور سندوں کا بیسواں حصہ بھی اپنے بیان کی تائید میں پیش نہیں کرسکتا۔ پس اگر سید احمد خاں یہ کہتے ہیں کہ وہابی یا پکے مسلمان کے دین کا یہ کوئی جزو نہیں ہے کہ گورنمنٹ انگلشیہ کا مقابلہ کرے، اور یہ کہ مسلمان پر جیسا اور غیر مذہب والوں کے ساتھ خاص خاص حالتوں میں جہاد کرنا فرض ہی ویسا ہی عیسائیوں کے ساتھ ہے اور ویسا ہی ہنود کے ساتھ؛ اور یہ کہ مسلمان حکمی فرض سمجھتے ہیں کہ وہ بھی اور مذہب والوں کی مانند تمام بنی آدم کے ساتھ برادرانہ طور پر یگانگت اور اتفاق سے رہیں تو گو اس قسم کے بیانات ہمارے اگلے خیالات کے کیسے ہی مخالف ہوں، جب تک کہ ہم کو اس قدر اعلیٰ درجہ کی واقفیت نہو کہ ہم سید احمد خاں پر غلطی کا الزام لگا سکیں اس وقت تک ہم کو ان باتوں کے تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے،،

"ہمارا یہ مطلب نہیں ہے کہ تعصب اور فساد کے مقابلہ میں ہم زیادہ احتیاط نہ کریں، لیکن اب ایسی باتوں کا خوف حد سے زیادہ بڑھ گیا ہے، کیونکہ انگریزوں کے دلوں میں علی العموم اس بات کا یقین ہے کہ مسلمان جس قدر زیادہ ایماندار ہوگا اسی قدر انتظام کا سخت دشمن ہوگا اور اُسی قدر اُس کا پکا ارادہ ہوگا کہ یا تو وہ اُسے توڑے یا خود اُس سے ٹوٹ جاے، اور اس میں کچھ شک نہیں کہ ایسے لوگ جن کو یہ یقین ہی کہ اگر ہم کسی انگریز کو حق یا ناحق مار ڈالیں تو ہم کو ثواب دائمی ملیگا۔ گورنمنٹ انگلشیہ کے لیے نہایت دقت کی چیز ہیں۔ پس یہ نہایت تسلی اور راحت کی بات ہے کہ ایسی عمدہ سند سے جسکی عمدگی حتی الامکان ثابت ہی یقین دلایا جائے کہ یہ خوف بے بنیاد ہے۔ ہم بھی اس قسم کی باتیں بار بار کہہ چکے ہیں مگر ہم کو امید نہ تھی کہ ایک انگریز اخبار نویس کی رائے ایسے معاملہ میں کچھ معتبر ہوگی"

اس کے بعد انڈین آبزرور کے اڈیٹر نے سرسید کے رسالہ سے چند فقرے نقل کرکے اُنکی تائید کی ہے اور ایک لمبی بحث کے بعد اپنے آرٹکل کو اس فقرہ پر ختم کیا ہے "ممکن نہیں کہ کوئی بیان اس سے (یعنی سرسید کے بیان سے) زیادہ صاف ہو۔ اس سے اُن لوگوں کا اطمینان ہونا چاہیے جو بزدل اور وہمی ہیں۔ سید احمد خاں کے مختصر رسالہ میں اور بھی بہت سی باتیں ہیں جنکا تذکرہ ہم کرتے اگر ہمارے اس پرچہ میں گنجائش ہوتی۔ ہم اور کسی کتاب سے واقف نہیں ہیں جس سے ایسی تھوڑی سی جگہ میں مسلمانوں کے خیالات کی نسبت اس قدر زیادہ اطلاع حاصل ہو۔ ہندوستان کے ہر انگریز کو اسے ضرور پڑھنا چاہیے؛ اور ہم امید کرتے ہیں کہ یہ بہت پھیلیگی۔ یہ ٹھیک اسی قسم کی کتاب ہے جسکی ضرورت آجکل ان تمام لوگوں کے دلوں کو تسلی اور قرار بخشنے کے لیے ہے جو اپنی ناواقفیت کے سبب سایہ سے بھی بھڑکتے ہیں۔ سر ولفرڈ لاسن اپنے ایک لیکچر میں۔ جو سرسید کے ریویو کے بعد تھیولوجیکل ریویو میں شائع ہوا تھا۔ ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب پر ریمارک کرتے ہوے لکھتے ہیں کہ "اس مصنف کو مبالغہ کا جن بسا اوقات نہایت پریشان کرتا ہے اور بہتر ہوتا اگر اس جن کو وہ اُتار دیتا"۔

سرسید کے ریویو پر اور بھی بعض مدبران سلطنت نے رائیں لکھی ہیں مگر ہم یہاں اسی قدر پر اکتفا کرتے ہیں یہ ریویو اخبارات میں شائع ہونے کے بعد کتاب کی صورت میں بھی اردو اور انگریزی دو زبانوں میں چھپا تھا اسکی پوری پوری کیفیت جب تک کہ وہ اول سے آخر تک نہ پڑھا جائے معلوم نہیں ہوسکتی؛ مگر ہم بطور نمونہ کے اُس کا ایک مختصر مقام اس موقع پر نقل کرتے ہیں۔

ڈاکٹر ہنٹر نے اپنی کتاب کے تیسرے باب کے خاتمہ پر یہ لکھا تھا کہ "مجھکو ہندوستان کے مسلمانوں سے دلی خیرخواہی اور محبت کی ہرگز توقع نہیں ہے بلکہ میں اُن کی ذات سے بڑی اُمید یہی کرسکتا ہوں کہ وہ حکومت انگریزی کے قبول کرنے میں سرد مہری کرینگے" سرسید اس پر یوں لکھتے ہیں کہ اگر ڈاکٹر صاحب کو ہم لوگوں کے مسلمان ہونے کے باعث اس قدر مایوسی ہے تو میں اولاً اُن سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ وہ قرآن شریف کی اس آیت کی طرف توجہ فرمائیں "ولتجدن اشد الناس عداوۃ للذین اٰمنوا الیھود والذین اشرکوا۔ ولتجدن اقربھم مودۃ للذین اٰمنوا الذین قالوا انا نصاریٰ ذلک بان منھم قسیسین و رھبانا وانھم لا یستکبرون" (یعنی اے محمد تم پاؤگے تمام آدمیوں میں سخت دشمن مومنین کا یہودیوں اور مشرکوں کو اور پاؤگے مومنین کا سب سے زیادہ دوست اُن لوگوں کو جو اپنے کو نصاریٰ کہتے ہیں اور اس کا سبب یہ ہے کہ نصاریٰ میں اکثر عالم اور عابد ہیں، وہ بہت گھمنڈ نہیں رکھتے)

"دوسرے یہ مسئلہ مشہور ہے کہ جیسا کوئی کرتا ہے ویسا ہی اُسکو نتیجہ ملتا ہے۔ پس اگر مسلمان بجز سرد مہری کے قوم حکمراں کی جانب سے اور کچھ سلوک نہیں دیکھتے ہیں تو ڈاکٹر صاحب کو مسلمانوں کی سرد مہری پر کچھ متحیر نہ ہونا چاہیے۔ ہم دونوں قوموں یعنی عیسائی اور مسلمانوں کو حضرت عیسیٰ کا یہ قول یاد رکھنا چاہیے کہ جس سلوک کے تم اور آدمیوں سے متوقع ہو تم کو بھی

اسی طرح اُنکے ساتھ سلوک کرنا چاہیئے"

پھر اسی باب کے خاتمہ پر ایک حاشیہ میں ڈاکٹر ہنٹر نے مندرجۂ ذیل سوال لکھا تھا "سوال اے علماء محققان شرع اسلام تمہاری اس معاملہ میں کیا رائے ہے کہ اگر کوئی مسلمان بادشاہ ہندوستان پر ایسے وقت میں حملہ کرے جب کہ وہ انگریزوں کے قبضہ میں ہو تو اس ملک کے مسلمانوں کو انگریزوں کی امان ترک کرنی اور اُس غنیم کی مدد دینی جائز ہے یا نہیں؟ اس سوال کے جواب میں سر سید نے اول اصول اسلام کی رو سے ایک لمبی تقریر کی ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ "جب تک مذہبی معاملات میں ہمکو ہر قسم کی آزادی ہندوستان میں حاصل ہے، اپنی مذہبی فرائض بے کھٹکے ادا کرتے ہیں، اور اس جسقدر رائے اور آزادی ہے جا ہیں سب دل میں رکھتے ہیں شائع عام میں دعوت اسلام کر سکتے ہیں یا دوسری جو اعتراض اہل اسلام پر کرتے ہیں انکا جواب بلا خوف و خطر دے سکتے ہیں، تو دوسرے مذہب پر اعتراض کر سکتے ہیں، اُس کے برخلاف کتابیں چھاپ سکتے ہیں اور عیسائیوں کو بلا کسی مزاحمت و بلا اندیشہ کے جیسے وہ مسلمان ہونا چاہیں مسلمان کر سکتے ہیں، اُس وقت تک انگریزی امان کو منہدم ہونا اور غنیم کو مدد دینا کسی مسلمان کا مذہبی فرض نہیں ہے، اور اگر مسلمان ایسا کریں تو وہ گنہگار خیال کئے جائینگے، کیونکہ ایسا فعل اُس پاک معاہدہ کا توڑنا ہوگا جو رعایا اور حکام کے درمیان ہے اور جس کی پابندی مرتے دم تک کرنا مسلمانوں پر فرض ہے"

اس کے بعد سر سید لکھتے ہیں کہ "البتہ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ اگر آیندہ کوئی مسلمان یا کوئی اور بادشاہ ہندوستان پر حملہ کرے تو اس صورت میں عملدرآمد کے ٹھیک ٹھیک مسلمان کیا کرینگے؟ کیونکہ وہ شخص درحقیقت نہایت دلیر ہے جو اپنے دلی دوستوں اور رشتہ داروں کے سوا عام شخصوں کی طرف سے بھی کچھ جواب دے، بلکہ میری دانست میں تو شاید رشتہ داروں اور دوستوں کی طرف سے بھی کچھ جواب دینا مشکل ہے چنانچہ جو ملکی لڑائیاں ہندوستان میں ہوئی ہیں اُن میں باپ بیٹوں سے اور بھائی بھائی سے لڑے تھے۔ پس کوئی شخص یہ بات نہیں کہہ سکتا کہ کسی بڑے ملکی ہنگامہ میں کل قوم کا کیا حال ہوگا، میں یقین کرتا ہوں کہ ایسی حالت میں مسلمان وہی کرینگے جو اُن کی پولٹکل حالت اُنسے کروائیگی، اور میری دانست میں یہ سخت سوال ہندوؤں سے بھی اسی طرح متعلق ہو سکتا ہے جیسا کہ مسلمانوں سے، پس اس لحاظ سے اُس کا دریافت کرنا دونوں قوموں سے ضرور ہے"

سر سید نے جو کچھ ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب پر لکھا تھا اُس کا حال بقدر ضرورت ہم نے بیان کر دیا ہے، مگر ہمارے نزدیک بڑی بے انصافی اور ناشکری ہوگی اگر اس مقام پر آنریبل ڈبلیو ڈبلیو ڈاکٹر ہنٹر کے اُس شریفانہ برتاؤ کا ذکر نہ کیا جائے جو اس واقعہ کے بعد سر سید اور مسلمانوں کے ساتھ اُن سے ظہور میں آیا۔ اُنھوں نے مدرسۃ العلوم کے تختہ بورڈنگ ہوس میں ایک کمرہ بنانے کے لئے ڈیڑھ ہزار روپیہ اپنی جیب خاص سے دیا اور ۱۸۸۲ء میں جب کہ وہ ایجوکیشن کمیشن کے پریسیڈنٹ تھے کمیشن کے دورہ کے وقت اضلاع شمال مغرب میں پہلا اجلاس علیگڈھ میں کیا اور اپنی اخیر اسپیچ محمدن کالج میں آکر دی جس میں نہایت بشاشت اور گرمجوشی کے ساتھ سر سید اور اُن کی کوششوں کی بے انتہا تعریف اور کالج کے سرسبز ہونے کی تمنا ظاہر کی تھی اور کہا تھا کہ اگر ایسی ہی چند مثالیں سلف ہلپ کی

اور یوں تو ہندوستان میں ایجوکیشن کمیشن کی ضرورت نہ رہے گی -

بنیاد مدرسۃ العلوم

فروری ۱۸۷۳ء میں جو جلسہ صدر کمیٹی کا بنارس میں ہوا تھا اُس میں سید محمود نے یہ بھی تحریک کی تھی کہ بہت جلد مقام مجوزہ میں ایک مدرسہ ماتحت مدرسۃ العلوم مجوزہ کے قائم کیا جائے - چنانچہ ۳۱-اگست ۱۸۷۳ء کو علیگڑھ میں جو سب کمیٹی کا جلسہ ہوا اور جس میں علیگڈھ اور بلند شہر کے اکثر رئیس اور معزز مسلمان شریک تھے وہاں مولوی سمیع اللہ خاں سکرٹری سب کمیٹی اور سید محمود نے اپنی اسپیچوں میں مدرسہ ماتحت قائم کرنے کی دوبارہ تحریک کی - پھر ۲- دسمبر ۱۸۷۳ء کو دوسرا جلسہ علیگڑھ ہی میں ہوا اور مولوی سمیع اللہ خاں نے تقریر کرتے وقت کہا کہ مدرسۃ العلوم کی مخالفت روز بروز بڑھتی جاتی ہے ؛ اس کے رفع کرنے کی کوئی تدبیر اس سے بہتر نہیں کہ ایک ماتحت مدرسہ بطور نمونہ کے علیگڑھ میں قائم کیا جائے ؛ جسکے طریقۂ تعلیم سے لوگوں پر ظاہر ہو جائے کہ جو تعلیم صدر کمیٹی بنارس نے تجویز کی ہے وہ کسی طرح اصول اسلام کے برخلاف نہیں ہے - اس تجویز کو سب نے پسند کیا اور بعض علمائے اہل اسلام نے جو اُس جلسہ میں شریک تھے طریقۂ تعلیم کو جو سکرٹری نے اُسوقت بیان کیا بلا محظور شرعی تسلیم کیا ؛ اس جلسہ میں اور سب کمیٹیوں کی نسبت چندہ کی رقم زیادہ لکھی گئی تھی اور جس شرط پر مدارس ماتحت مختلف مقامات میں جاری کرنے قرار پائے تھے اُس کی طرف سے علیگڑھ کی سب کمیٹی نے کافی اطمینان کر دیا تھا ؛ اسلیے صدر کمیٹی بنارس نے بھی علیگڑھ سب کمیٹی کی تجویز کو پسند کیا اور سکرٹری سے درخواست کی کہ علیگڑھ میں مدرسہ جاری کیا جائے - مولوی سمیع اللہ خاں سکرٹری سب کمیٹی نے جو اُس وقت علیگڑھ میں سب آرڈنٹ جج تھے نہایت دلی سعی اور کوشش سے صدر کمیٹی کے مقاصد کو انجام دیا اور ۲۴ - مئی ۱۸۷۵ء جو کہ ملکہ معظمہ کی سالگرہ کا دن تھا مدرسہ کے افتتاح کی تاریخ قرار پائی تاریخ مذکورہ پر سرسید بنارس سے علیگڑھ آ گئے اور ایک جلسہ میں جس کے صدر انجمن مولوی محمد کریم مرحوم ڈپٹی کلکٹر علیگڑھ تھے رسم[1] افتتاح عمل میں آئی اور یکم جون ۱۸۷۵ء سے جماعت بندی ہو کر تعلیم شروع ہو گئی تاریخ مذکور سے لیکر اب تک مدرسۃ العلوم کو قائم ہوئے ستائیس برس کا زمانہ گذرا ہے اس عرصہ کے تمام واقعات اور حالات جو مدرسۂ مذکور کے انتظام اور ترقی سے متعلق ہیں اُن کے لکھنے کے لیے ایک جدا کتاب کی ضرورت ہے ؛ اس لیے یہاں ہم صرف ضروری امور بیان کرینگے جو اس کتاب کے موضوع سے مناسبت رکھتے ہیں -

---

[1] افتتاح کے موقع پر مولوی محمد اکبر مرحوم اور مولوی محمد ہاشم نے عربی نظم و نثر بطور مبارکباد کے اور مولوی صفدر حسین نے فارسی و اُردو میں قطعات تاریخ لکھے تھے - چونکہ یہ سب تحریریں طولانی ہیں اس لئے صرف قطعہ تاریخ اُردو مرتبہ مولوی صفدر حسین جو مضمون اور مادہ تاریخ دونوں کے لحاظ سے نہایت لطیف و عمدہ ہے یہاں نقل کیا جاتا ہے قطعہ

(بقیہ بر صفحہ مابعد)

جس وسیع میدان میں اب محمڈن کالج علیگڑھ اور اُس کی تمام عمارتیں موجود ہیں۔ کسی زمانہ میں یہ چھاونی سے متعلق تھا اور یہاں فوج کی پریڈ ہوا کرتی تھی۔ مگر اب وہاں چھاونی نہیں رہی تھی اور اس میدان میں سے کچھ قطعات لوگوں کو سرکار سے کوٹھیاں بنانے کے واسطے مل گئے تھے لیکن اب بھی قریب ۷۴ ایکڑ کے زمین باقی تھی۔ سرسید نے مدرسہ کے لیے حسب ضابطہ کمیٹی کی طرف سے اُس زمین کے ملنے کی درخواست کی تھی اُس وقت ہنری لارنس علیگڑھ میں کلکٹر تھے اُنھوں نے اُس قطعہ کے ملنے کی رپورٹ گورنمنٹ میں بھیجی اور سر ولیم میور نے بھی جو اُس زمانہ میں لفٹنٹ گورنر تھے اُس قطعہ کے دینے کا وعدہ کرلیا مگر ابھی وہ قطعہ کمیٹی ملنے نہیں پایا تھا کہ مانٹی گیو صاحب علی گڑھ میں قائم مقام کلکٹر ہوگئے۔ اُنھوں نے اس بات کی سخت مخالفت کی کہ وہ قطعہ کمیٹی کو کالج کے لیے دیا جائے۔ اُن کے بعد جو مسٹر کالون مستقل کلکٹر و مجسٹریٹ مقرر ہو کر آئے اُنہوں نے بھی ویسی ہی مخالفت کی اور اس وقت تمام یوروپین حکام اُنکے ہم راے اور ہمزبان ہوگئے یہ ایسی سخت مزاحمت ہوئی تھی کہ بانیان کالج اس کے ملنے سے مایوس ہونے لگے تھے اور قریب تھا کہ وہ کالج کا خیال چھوڑ دیں اور تمام کوششیں برباد ہوجائیں۔

بقیہ صفحہ ماقبل

ہے مدرسہ علیگڑھ میں اک ہوا مقرر
سب مدرسوں سے اچھی سب کالجوں سے بہتر
تعلیم مذہبی ہی ہے جان مدرسہ کی
تعلیم مذہبی سے بہر نجات محشر
ہے جسم مدرسہ کا انگریزی اور اس میں
ثابت کرینگے ہم ہاں اس بات کو مقرر
شرع محمدی نے کی اعتدال اس میں
اس کو دُرا سمجھنا اسے وا غلط سمجھکر
تیلون و کوٹ اُنکا ملبوس ظاہری ہے
شرع محمدی کا خاکا ہے یہ مقرر
سرکار کی بڑھائی اسلامیوں میں الفت
اسلامیوں سے نفرت سرکار کی چڑا کر
تھا دشمنوں کا رُد لا اسیر بھی اُسنے لیکن
ہر بات کو ہماری پڑتا لیے ملا کر

جسکو کیا ہے جاری اسلامیوں نے مل کر
انگریزی عام ہوگی تعلیم میں مگر ہاں
ورنہ اثر نہ ہوتا اُس کا کسی کے دل پر
گر یہ نہ ہو تو وہ ہیچ اور وہ نہ ہو تو کیا
تعلیم مذہبی ہے بس جان کے برابر
تھا شرع موسوی میں افراط حد سے زائد
افراط کو گھٹا کر تفریط کو بڑھا کر
اس مدرسہ کے بانی کی وضع بھی ہے ایسی
پر شرع احمدی کا جبہ ہے جان کے اندر
سرکار کی بھلائی اسلامیوں کی خاطر
اسلامیوں کی الفت سرکار میں بڑھا کر
اسلام کی ترقی اسلامیوں کی شوکت
دکھلایا حبّ قومی یہ مدرسہ بنا کر
ظاہر میں عیسوی ہے باطن میں ہے وہ ہجری

ہر علم و ہر زباں کی تعلیم ہوگی اُس میں
مذہب کی خاص ہوگی تعلیم اے برادر
تعلیم دینوی ہے بہر معاش دنیا
بے اسکے ہے وہ بدتر بے اُسکے ہے یہ ابتر
عیسائی اور مسلماں ہیں مثل جسم اور جاں
تھی شرع عیسوی میں تفریط حد سے بڑھ کر
غالب ہیں وہ مذاہب شرع محمدی جاں
جس سے ثبوت ہوگا اس قاعدہ کا اکثر
توریت کا ہے عالم انجیل کا ہے ماہر
کیا کیا نہیں کیا ہے اُس نے سب سے مل ملا کر
سرکار سے چڑائی اسلامیوں کی نفرت
اس شخص کی بدولت ہم سب کو ہے میسر
تاریخ بھی لکھی ہے وہ ہم نے جس سے حضرت
اے سامعین سنیے للہ دل لگا کر

تھی فکر مجھکو اک دن تاریخ مدرسہ کی ٭ بولا یہ ملہم غیب اٹھارہ سے چھہتر
۱۲۹۲

مگر خوش قسمتی سے اُسی زمانہ میں سر جان اسٹریچی جن کا اس کالج پر سب سے زیادہ احسان ہے لفٹنٹ گورنر ہو گئے اور یہ معاملہ اُن کے سامنے پیش ہوا۔ وہ خود دورہ کے دنوں میں علیگڈھ آئے اور موقع کو ملاحظہ کیا۔ سرسید بھی بنارس سے علیگڈھ پہنچے اور بہت سی گفت و شنید کے بعد ہز آنر نے یہ فیصلہ کیا کہ زمین کالج کے لیے کمیٹی کو اس شرط پر دیجائے کہ جو عمارت اُس میں بنائی جائے اُس کے بننے سے پہلے اُسکا نقشہ گورنمنٹ کے ملاحظہ کیلئے بھیجا جایا کرے اور اگر بالفرض کبھی کوئی ایسا اتفاق پیش آئے کہ یہ کالج بالکل بند ہو جائے تو جس قدر عمارات کمیٹی کی بنائی ہوئی یہاں موجود ہونگی اُن سب پر سرکار کا قبضہ ہو جائیگا۔ کمیٹی نے یہ دونوں شرطیں منظور کرلیں اور سر جان اسٹریچی نے اُس کی منظوری گورنمنٹ ہند سے منگا کر سند عطائے اراضی کمیٹی کو عنایت کی اور حسب ضابطہ قطعۂ مذکور پر قبضہ دلا یا گیا۔ مدرسۂ ماتحت کے افتتاح سے پہلے یہ زمین کمیٹی کو مل چکی تھی اور جس بنگلہ میں اب تک محمڈن ہائی اسکول کی جماعتیں پڑھتی ہیں اسی بنگلہ میں ابتدائی مدرسہ قائم کیا گیا تھا۔

۱۲- نومبر ۱۸۷۵ء کو سر ولیم میور جو اُس زمانہ میں وائسرائے کی کونسل کے ممبر تھے مدرسہ کے ملاحظہ کو آئے اور ایک لمبی اسپیچ دی جسمیں کمیٹی کو مبارکباد دینے کے بعد سرسید کی نسبت کہا کہ میں خاصکر اپنے دوست کی دیرینہ خواہش کے پورا ہوتے اور اُنکے دلی مدعا کا پہلا پھل حاصل ہونے پر اُن کو مبارکباد دیتا ہوں۔

جب یہاں تک نوبت پہنچ گئی اور مدرسہ کو جاری ہوئے ایک سال گذر چکا تو سرسید کو ضروری معلوم ہوا کہ نوکری سے علیحدہ ہو کر مدرسہ کی تکمیل میں اطمینان اور کامل توجہ سے کوشش کیجائے۔ کچھ تو سرکاری کاموں کی مصروفیت مدرسہ کے کام میں حارج ہوتی تھی اور کچھ وہ اپنی جبلی احتیاط کے سبب سرکاری عہدہ دار ہونے کی حالت میں چندہ وصول کرنے سے ہچکچاتے تھے۔ وہ پنشن کی نقشہ تو مدرسہ کے جاری ہوتے ہی بھیج چکے تھے، جولائی ۱۸۷۶ء کے آخر میں پنشن کی منظوری بھی آگئی اور وہ اُسی وقت ملازمت سے کنارہ کش ہو کر علیگڈھ چلے آئے۔ وہ اپنی قدیم کوٹھی جو علیگڈھ میں تھی ولایت جاتے ہوئے رہن کر گئے تھے مگر جب یہ امر طے ہو گیا کہ مدرسۃ العلوم علیگڈھ میں قائم کیا جائے تو سید محمود نے اپنے اور سرسید کے رہنے کے لیے ایک اور کوٹھی خرید لی تھی اور پہلی کوٹھی کو فروخت کر دیا تھا۔ جب سرسید بنارس سے آئے تو اُس کوٹھی کو اپنی ضرورت کے موافق درست کیا اور اس میں سکونت اختیار کی۔

جب وہ بنارس سے آئے تو ضلع علیگڈھ کے رؤسا اور معزز لوگوں نے اُن کو دعوت دی اور ایک شاندار جلسہ منعقد ہوا جس میں اضلاع قرب و جوار کے رؤسا بھی شامل تھے۔ اس جلسہ میں سرسید کو ایڈریس بھی دیا گیا تھا جسمیں اُن کے احسانات کا ذکر تھا جو قوم کی بھلائی کے لیے اُن سے ظہور میں آئے۔ سرسید نے ایک فقرے کے جواب میں جو الفاظ کہے تھے وہ ہم بجنسہ یہاں نقل کرتے ہیں۔ اُنہوں نے کہا کہ "یہ بات سچ ہے

کہ میں نے اپنے اُس قدیم نامی اور پُرانے شہر کو جہاں میرے بزرگوں اور عزیزوں کی ہڈیاں اب تک مٹی میں مل رہی ہیں اور جہاں میرے بہت سے عزیز اب تک رہتے ہیں، جسکی مٹی سے لوگوں نے خیال کیا تھا میں بنا ہوں اور پھر اُسی میں میری خاک ملجائیگی؛ صرف مدرسۃ العلوم کی محبت، اپنی قوم کی بہلائی اور رئیسان ضلع علیگڑھ و بلند شہر کی محبت و عنایت کے خیال سے چھوڑا ہی اور یہاں ایک غریب مسافر کی طرح سکونت اختیار کی ہے۔ میں نے صرف اس خیال سے کہ کیا راہ ہے جس سے قوم کی حالت درست ہو؟ دور و دراز سفر اختیار کیا اور بہت کچھ دیکھا جو دیکھنے کے لائق تھا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جب میں نے کوئی عمدہ چیز دیکھی، جب کبھی عالموں اور مہذب آدمیوں کو دیکھا، جب کبھی علمی مجلسیں دیکھیں جہاں کہیں عمدہ مکانات دیکھے، جب کبھی عمدہ پھول دیکھے جب کبھی کھیل کود عیش و آرام کے جلسے دیکھے یہاں تک کہ جب کبھی کسی خوبصورت شخص کو دیکھا؛ مجھکو ہمیشہ اپنا ملک اور اپنی قوم یاد آئی اور نہایت رنج ہوا کہ ہائے ہماری قوم ایسی کیوں نہیں؟ جہانتک ہوسکا ہر موقع پر میں نے قومی ترقی کی تدبیروں پر غور کیا؛ سب سے اول یہی تدبیر سوجھی کہ قوم کے لیے قوم ہی کے ہاتھ سے ایک مدرسۃ العلوم قائم کیا جائے؛ جسکی بنا آپ کے شہر میں اور آپ کے زیر سایہ پڑی ہے"

الغرض سرسید علیگڑھ میں آکر ہمہ تن کالج کے کام میں مصروف ہوگئے۔ کالج کی عمارتوں میں جلد جلد ترقی ہونے لگی۔ ہندوستان کے اطراف میں چندہ کے واسطے زیادہ تحریکیں اور کوششیں ہونے لگیں اور علیگڑھ صرف دار العلوم ہی نہیں بلکہ رفتہ رفتہ قومی ہمدردی، قومی اتحاد، قومی مصالح اور قومی مقاصد کی تحریک کا صدر مقام اور مرکز بننے لگا۔ ۱۸۷۷ء کے شروع میں کالج کا بنیادی پتھر غیر معمولی اور غیر متوقع شان و شوکت کے ساتھ رکھا گیا۔ پہلے یہ تجویز ٹھیری تھی کہ لارڈ نارتھ بروک کے ہاتھ سے یہ رسم ادا کی جائیگی، لیکن لارڈ ممدوح کو کسی خانگی ضرورت کی وجہ سے پیش از وقت ہندوستان کو چھوڑنا پڑا۔ پھر سر جان اسٹریچی لفٹنٹ گورنر شمال مغرب نے اس رسم کے ادا کرنیکا وعدہ کیا، مگر سرکاری ضرورتوں کی وجہ سے وہ بھی وقت معین پر نہ آسکے۔ آخر لارڈ لٹن وایسرائے و گورنر جنرل کشور ہند کے ہاتھ سے اُس عظیم الشان دربار کے بعد جو ہندوستان کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہیگا۔ ادا ہوئی۔ لارڈ لٹن نے دربار قیصری کے بعد دلی سے مدرسۃ العلوم میں آنے کا وعدہ کرلیا تھا۔ چنانچہ ۸- جنوری ۱۸۷۷ء کو مع لیڈی لٹن کے علیگڑھ میں تشریف لائے اور سرسید کے ہاں مہمان ہوئے۔ سہ پہر کو وقت معین پر مع لیڈی صاحبہ کے فونڈیشن کے موقع پر تشریف لے گئے۔ اول سید محمود نے ایڈریس پڑھا اور وایسرائے نے اُسکا جواب نہایت شیریں زبانی اور اپنی مشہور فصاحت کے ساتھ دیا۔ پھر سرسید نے بنیاد کا پتھر رکھنے کی درخواست کی۔ چنانچہ حضور ممدوح نے بنیاد کا پتھر اُس موقع پر جہاں اسٹریچی ہال کے صدر مقام میں سنگ مرمر کا کتبہ بنیاد کے قریب لگا ہوا ہے۔ اپنے ہاتھ سے رکھا اور فونڈیشن کی تمام رسمیں یوروپین قاعدہ کے موافق ادا کی گئیں۔

کالج کی بنیاد کا پتھر

وائسرائے نے علیگڑھ سے چلتے وقت اپنی تصویر اور کئی جلدیں اپنی تصنیفات کی سر سید کو بطور یادگار عنایت کیں۔ اسکے بعد ۱۸۸۰ء میں اُن کو ایک کشتی نقرئی بطور تحفہ اور یادگار کے بھیجی جس پر یہ عبارت کندہ تھی۔

"بیادگار رکھنے بنیاد کالج کے بدستِ خاص وائسرائے بتاریخ ۸ جنوری ۱۸۷۷ء و نشان اعزاز بخشی و دوستی از جانب رائٹ آنریبل لارڈ لٹن جی۔ سی۔ بی وجی۔ ام۔ اس۔ ای وائسرائے و گورنر جنرل ہند بمولوی سید احمد خاں صاحب بہادر سی۔ اس۔ آئی۔ پریسیڈنٹ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج اہل اسلام مقام علیگڑھ۔ تاریخ یکم جنوری ۱۸۸۰ء"

سید محمود نے جو سکیم ۱۰۔ فروری ۱۸۷۳ء کو کمیٹی میں پیش کی تھی اُس میں اُنھوں نے صاف اس بات کی تصریح کی تھی کہ ہماری غرض صرف ایک مدرسہ یا کالج ہی قائم کرنا نہیں ہے بلکہ ایک یونیورسٹی قائم کرنی ہے؛ پس کمیٹی نے جو انگریزی میں اپنا نام "محمڈن اینگلو اورینٹل کالج فنڈ کمیٹی" رکھا ہے اس میں بجائے کالج کے یونیورسٹی کا لفظ ہونا چاہیے؛ اور اردو میں بجائے مدرسۃ العلوم کے دار العلوم نام رکھنا چاہیے؛ اور بجز اس کے کہ گورنمنٹ نگرانِ حال رہے اُس کی اور کسی قسم کی مداخلت اس دار العلوم میں نہ ہونی چاہیے۔ چنانچہ اس سکیم کی جو کاپی گورنمنٹ میں بھیجی گئی تھی۔ اُس میں بھی یونیورسٹی کا لفظ لکھا تھا لوکل گورنمنٹ سے اُس کا یہ جواب آیا کہ اگر کمیٹی محمڈن یونیورسٹی قائم کرنا چاہتی ہے تو گورنمنٹ اُس میں گرنیٹ ان ایڈ نہیں دیگی۔ باوجود اسکے سر سید کا ارادہ یہی تھا کہ یونیورسٹی قائم کیجائے۔ اُن کو یقین تھا کہ جب تک موجودہ یونیورسٹیوں کی تعلیم سے قطع نظر نہ کی جائیگی اور مسلمانوں کی تعلیم کے لیے اُن ضرورتوں کے موافق تعلیم و تربیت کا اپنے طور پر انتظام نہ کیا جائیگا۔ تب تک اصلی لیاقت قوم کے بچوں میں ہرگز پیدا نہو گی۔ وہ چاہتے تھے کہ اس دار العلوم میں کیمبرج یونیورسٹی کے موافق فیلو سسٹم جاری کیا جائے اور جو طالب علم فارغ التحصیل ہو جائے اُس کو کسی خاص علم میں جس سے وہ خاص مناسبت رکھتا ہو مصروف رہنے اور اُس میں کمال حاصل کرنے کے لیے فیلو شپ دیجایا کرے؛ اور اس طرح ایک گروہ عالموں اور محققوں کا قوم میں پیدا کیا جائے جو تمام قوم میں علم و کمال پھیلانے کے لیے بمنزلہ آلہ کے ہو لیکن قطع نظر اسکے کہ ایسی یونیورسٹی صرف قوم کے بھروسے پر قائم کرنا کوئی آسان کام نہ تھا؛ نہ طالب علم اور نہ اُن کے مربی کوئی اس بات پر رضامند ہونے والا نہ تھا کہ یونیورسٹیوں کی ڈگریوں سے جو گورنمنٹ کی نوکری کا ذریعہ ہیں قطع نظر کیجائے۔ اور فی الحقیقت مسلمانوں کی حالت اسی بات کی مقتضی تھی کہ صرف موجودہ یونیورسٹیوں کی ڈگریاں حاصل کرنے ہی کو فوز عظیم سمجھا جائے۔ الغرض سر سید کو اپنا منصوبہ پورا کرنے سے بالکل مایوسی ہو گئی۔ یونیورسٹی قائم کرنے کا خیال اُنھوں نے بالکل چھوڑ دیا اور مدرسۃ العلوم میں وہی کورس اختیار کرنا پڑا جو موجودہ یونیورسٹیاں تجویز کریں۔ اُنھوں نے اپنے دل کو یہ کہکر تسلی دے لی۔

نہ ہو تاب پرواز گر آسماں تک　　　تو واں تک اُڑیں ہو رسائی جہاں تک

چندہ وصول کرنے میں دقتیں

مدرسۃ العلوم کے متعلق سب سے زیادہ مشکل کام چندہ کا وصول کرنا تھا جنکی اولاد کی تعلیم کے لیے مدرسہ قائم کرنا منظور تھا اوّل تو لوگ پہلے ہی انگریزی تعلیم سے نفور تھے؛ دوسرے جس وقت مدرسے کے لیے تحریک شروع ہوئی اُسی کے ساتھ تہذیب الاخلاق جاری ہو گیا جس کے مضامین سے مسلمان عموماً نفرت کرتے تھے اور جسکی وجہ سے مدرسۃ العلوم میں چندہ دینے کو معصیت جاننے لگے تھے۔ اخبارات اور رسالوں میں مدرسۃ العلوم کے خلاف بے شمار مضامین چھپتے تھے؛ اور سرسید کی تکفیر کے فتوے شائع کیے جاتے تھے۔ مولوی وعظ کی مجلسوں میں لوگوں کو چندہ دینے سے روکتے تھے۔ شاید کسی کو یہ خیال ہو کہ منصبی دباؤ سے چندہ وصول کیا گیا ہوگا سو یہ خیال بھی صحیح نہیں ہے؛ سرسید نے مدرسہ قائم ہونے سے ایک ہی برس بعد ملازمت سے علیحدگی اختیار کر لی تھی اور اُس سے پہلے جسقدر چندہ ہوا وہ زیادہ تر علیگڑھ، لاہور، پٹنہ، مرزاپور اور پٹیالہ وغیرہ سے ہوا؛ بنارس میں جہاں وہ خود سرکاری عہدہ دار تھے اُنہوں نے چند ہندو یا مسلمان دوستوں کے سوا کسی سے چندہ مانگنا پسند نہیں کیا۔ اس کے سوا ہندوستانی اور خاصکر مسلمان قومی کاموں میں چندہ دینے کے مفہوم سے محض ناواقف تھے؛ جب تک کسی حاکم کا دباؤ یا اشارہ نہو تا تھا چندہ جمع ہونا نہایت مشکل تھا۔ میں نے سنا ہے کہ سرسید نے ولایت جانے سے پہلے ایک روز نواب امّو جان مرحوم سے جو اُن کے قریب رشتہ دار تھے بسبیل تذکرہ یہ کہا کہ کیوں حضرت آپکے نزدیک مسلمانوں کی تعلیم کے لیے دس لاکھ روپیہ جمع ہو سکتا ہے یا نہیں؟ اُنہوں نے نہایت تعجب سے کہا "تم کیا دیوانوں کی سی باتیں کرتے ہو؟ مسلمانوں سے دس لاکھ پیسے بھی وصول نہیں ہو سکتے"۔ اس حکایت سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اُس وقت چندہ جمع کرنے کی نسبت لوگوں کے کیسے خیالات تھے۔ باوجود اس کے یہ بات کچھ کم تعجب انگیز نہیں کہ ایک شخص کی تحریک یا کوشش سے بیس برس کے عرصہ میں سات آٹھ لاکھ کی عمارتیں تیار ہو گئیں اور مدرسہ کی آمدنی اس حد تک پہنچ گئی کہ اسی ہزار روپیہ سالانہ تک اُس میں خرچ ہونے لگا۔

ایک ایرانی سیاح نے مدرسہ کو دیکھکر خود ہمارے سامنے یہ الفاظ کہے "واللہ معجزہ ایست کہ بیکار یکہ از سلطنت بر نیاید چگونہ از یک فرد رعیت سرانجام شد"، مگر ہم سرسید کی اس کامیابی کو معجزہ نہیں سمجھتے بلکہ کامیابی کے اسباب پر نظر کرتے ہیں جن پر غور کرنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ایک دانشمند اور راست باز آدمی استقلال اور ہمت سے ہر قسم کی مشکلات پر غالب آ سکتا ہے۔

سرسید نے مدرسہ کے کام کو جس لیاقت اور باقاعدگی کے ساتھ شروع کیا اُس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ مدارا اور روشن خیال مسلمان اُس کی طرف گرویدہ ہو گئے اور سلطنت کے بڑے بڑے جلیل القدر رکن اُس کی

جانب التفات ظاہر کرنے لگے اور اُس کے معاون بن گئے؛ یہانتک کہ رفتہ رفتہ اُس کا اثر ذی مقدور لوگوں پر پڑنے لگا۔ اگرچہ مخالفتیں چلتی گاڑی میں برابر روڑا اٹکاتی رہیں مگر کام کی عظمت، اُس کی تائید کرنے والوں کا اعتبار اور اُن کی وجاہت، اور خود سرسید کا استقلال آہستہ آہستہ ہر ایک مخالفت کا مقابلہ کرتا رہا تہذیب الاخلاق نے مسلمانوں کی سقیم حالت اور انگریزی تعلیم کی ضرورت اُن پر ظاہر کرنی شروع کی اور مذہبی توہمات جو تبدیلِ حالت کے سدِّ راہ تھے شیئاً فشیئاً دور ہونے لگے۔ سرسید کی طرف سے اس بات کا اطمینان کہ جس کام کے لیے روپیہ دیا جاتا ہے وہ اُسی کام میں صرف ہوگا۔ سب سے زیادہ فراہمی چندہ کا باعث ہوا۔

سرسید کی سب سے بڑی تدبیر جسنے کالج کی عظمت کا نقش خاص و عام کے دل پر بٹھا دیا اور جس سے کالج کو بے انتہا مدد پہنچی۔ وہ یہ تھی کہ کالج اور بورڈنگ ہوس کی عمارتیں نامقدور اعلیٰ درجہ کے اسکیل پر بنانی تجویز کیں اور عمارات کے بنانے میں نہایت جرأت اور دلیری سے کام لیا۔ اگر روپیہ میں کمی ہوئی تو قرض لیکر عمارتوں کو پورا کیا۔ اس تدبیر سے ایک طرف تو کالج کی بڑائی کا خیال لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوا اور مسلمانوں کو قومیت کے بھولے ہوئے خواب یاد آنے لگے، حکام کے دل میں کالج کی وقعت زیادہ ہونے لگی اور ہر شخص کو اُس میں چندہ دینے کی ترغیب ہوئی؛ اور دوسری طرف کرایہ کی آمدنی روز بروز بڑھنی شروع ہوئی جو رفتہ رفتہ ۲۳ برس کے عرصہ میں تقریباً دس ہزار سالانہ تک پہنچ گئی۔ مگر بڑی بڑی عمارتوں کا بنوانا خود روپیہ کا محتاج تھا سو اُس کے لیے سرسید نے یہ تدبیر نکالی کہ کالج کی ہر ایک عمارت کا تخمینہ کرکے اُس کو متعدد حصوں میں تقسیم کر دیا اور اشتہار دیدیا کہ فی حصہ اسقدر روپیہ ہوتا ہے؛ جو شخص اتنا روپیہ دیگا اُس کا نام عمارت پر کندہ کیا جائیگا۔ مثلاً کالج کے بڑے احاطہ کی سنگین جالیوں کے لیے فی جالی بیس روپیے قرار دیئے اور اس طرح احاطہ کا ایک بڑا حصہ تیار ہوگیا؛ یا بورڈنگ ہوس کی پختہ بارگ کے لیے فی کمرہ پندرہ سو روپیہ مقرر کیا اور اسطرح ایک تعداد کثیر پختہ کمروں کی رفتہ رفتہ تیار ہوگئی احاطہ کے تین دروازے مقرر کیے اور جو شخص ایک دروازہ بنوائے اُسی کے نام سے اُس دروازہ کو نامزد کرنا تجویز کیا؛ اسٹریچی ہال کی لاگت کے بہت سے حصے کرکے فی حصہ پانسو روپیہ مقرر کیا اور جتنے آدمیوں نے پان پانسو روپیے دیئے اُن سب کے نام اُس میں سنگ مرمر پر کندہ کرا دیے۔ اس کے سوا بہت سی عالیشان عمارتیں کالج کے بڑے بڑے محسنوں کی یادگاریں بنانی تجویز کیں جن میں اُن کے دوستوں اور ہواخواہوں نے بطیب خاطر چندہ دینا قبول کیا۔ طالب علموں کے رہنے کے لیے بہت سے مکان قرض لیکر بنوائے اور انکے کرایہ کی آمدنی میں سے کسی قدر سود میں لگا دیا اور جب کہیں سے کچھ روپیہ بہم پہنچا فوراً قرضہ ادا کرکے اُن کی کل آمدنی

مدرسہ کے تحت میں لے لی۔

صیغۂ تعمیرات کے سوا کالج کے اخراجات کے لیے سرسید نے نئے نئے طریقوں سے روپیہ وصول کیا جسکو سنکر لوگ تعجب کرینگے۔ ایک دفعہ تیس ہزار کی لاٹری ڈالی ہرچند مسلمانوں کی طرف سے سخت مخالفت ہوئی مگر سرسید نے کچھ پروانہ کی اور بعد تقسیم انعامات کے بیس ہزار کے قریب کالج کو بچ رہا لطیفہ جن دنوں میں لاٹری کی تجویز درپیش تھی دو رئیس سرسید کے پاس آئے اور لاٹری کے ناجائز ہونے کی گفتگو شروع کی۔ سرسید نے کہا جہاں ہم اپنی ذات کے لیے ہزاروں ناجائز کام کرتے ہیں وہاں قوم کی بھلائی کے لیے بھی ایک ناجائز کام سہی۔ سرسید کے ایک دوست وہاں موجود تھے؛ انہوں نے کہا "لاٹری کا گناہ درحقیقت رئیسوں اور دولتمندوں پر ہوگا؛ اگر وہ مدرسہ کی مدد کرتے تو کیوں لاٹری کی ضرورت ہوتی"

لاٹری کے سوا انہوں نے اور بے شمار تدبیروں سے روپیہ جمع کیا۔ اپنی اور اپنے دوستوں کی کتابیں فروخت کرکے روپیہ پیدا کیا۔ اپنی تصویر کی کاپیاں بیچیں اور جو کچھ ملا کالج کو دیدیا۔ جب خلیفہ سید محمد حسن خاں مرحوم وزیر ریاست پٹیالہ کے پوتا پیدا ہوا اور انہیں دنوں میں سرسید کا پٹیالہ جانا ہوا تو وزیر صاحب سے پوتے کے ہونے کی خوشی میں چراغی کے پانچ روپیہ طلب کیے جس پر انہوں نے ایک معقول رقم انکی نذر کی۔ اُن کے ایک دوست کے قبائل دور دراز سفر سے علیگڑھ آئے۔ آپ سیادت کے دعوے سے اُن کے ہاں امام ضامن کا روپیہ مانگنے کے لیے پہنچے اور وہاں سے ایک اشرفی اور کچھ روپیے لیکر آئے۔

چندہ وصول کرنے کے موقع پر انہوں نے کبھی اس بات کا خیال نہیں کیا کہ میں کون ہوں؟ کس سے مانگتا ہوں؟ اور کس طرح مانگتا ہوں؟ نمایش گاہ علیگڑھ میں انہوں نے کتابوں کی دوکان لگائی اور خود کتابیں بیچنے کے لیے دوکان پر بیٹھے۔ بنشیل والنٹیر بنکر گلے میں جھولی ڈالی۔ پنی ریڈنگ کا جلسہ کیا اور اسٹیج پر کھڑے ہوکر غزلیں گائیں۔

پنی ریڈنگ کا جلسہ اس لیے قرار دیا گیا تھا غریب طالب علموں کے وظیفہ کے لیے کچھ سرمایہ جمع کیا جائے جب اس جلسہ کی تجویز ٹھیری تو دوستوں نے منع کیا کہ ایسا ہرگز نہ کیجیے گا؛ لوگ مطعون کرینگے اور تماشے والا کھینگے، اخباروں میں ہنسی اُڑائی جائیگی۔ سرسید نے کہا "اگر میں لوگوں کے کہنے کا خیال کرتا تو جو کچھ اب تک کیا ہے اُس میں سے کچھ بھی نہ کرسکتا۔ لوگوں کے کہنے کا کچھ خیال نہ کرو بلکہ یہ دیکھو کہ اس سے درحقیقت قوم کو فائدہ پہنچے گا یا نہیں" جس وقت وہ اسٹیج پر کھڑے ہوئے تو انہوں نے ایک نہایت مؤثر تقریر کی جس کے چند فقرے یہاں لکھے جاتے ہیں۔

"کون ہے جو آج مجھکو اس اسٹیج پر دیکھکر حیران ہوتا ہوگا؟ وہی جن کے دل میں قوم کا درد نہیں۔ وہی جن کا دل

جھوٹی شیخی اور جھوٹی مشیخت سے بھرا ہوا ہے۔ آہ اُس قوم پر جو شرمناک باتوں کو اپنی شیخی اور افتخار کا باعث سمجھیں اور جو کام قوم اور انسان کی بھلائی کے لیے نیک نیتی سے کیے جائیں اُن کو بے عزتی کے کام سمجھیں۔ آہ اُس قوم پر جو لوگوں کو دھوکا دینے کے لیے مکر و پندار کے کالے سوت سے بُنے ہوئے تقدس کے برقع کو اپنے مونہ پر ڈالے ہوئے ہوں مگر اپنی بدصورتی اور دل کی بُرائی کا کچھ علاج نہ سوچیں۔ آہ اُس پر جو اپنی قوم کو ذلت اور نکبت کے سمندر میں ڈوبتا ہوا دیکھے اور خود کنارے پر بیٹھا ہنستا رہے، اپنے گھر میں کُھلے خزانے ایسی بے شرمی اور بے حیائی کے کام کرے جن سے بے شرمی و بیحیائی بھی شرما جائے، لیکن قوم کی بھلائی کے کام کو شرم و نفرین کا کام سمجھے"

"اے رئیسو اور اے دولتمندو! تم اپنی دولت و حشمت پر مغرور ہو کر یہ مت سمجھو کہ گو قوم کی بُری حالت ہو مگر ہمارے بچوں کے لیے سب کچھ ہے، یہی ان لوگوں کا خیال تھا جو تم سے پہلے تھے مگر اب اُنہیں کے بچوں کی وہ نوبت ہے جسکے لیے ہم آج اس اسٹیج پر کھڑے ہیں۔ اے صاحبو! ہر کوئی تسلیم کرتا ہے کہ تعلیم نہ ہونے سے قوم کا حال روز بروز خراب ہوتا جاتا ہے۔ قوم کے بچے اخراجات تعلیم کے سرانجام نہونے سے ذلیل اور رذیل ہوتے جاتے ہیں۔ میں نے کوئی پہلو ایسا نہیں چھوڑا جس سے قوم کے غریب بچوں کے اخراجات تعلیم میں مدد پہنچے، مگر افسوس! کامیابی نہیں ہوئی۔ خود لوگوں سے بھیک مانگی، قلیل ملی۔ والنٹیر بنانے چاہے، مگر بہت کم بنے۔ اور جو بنے اُنسے کچھ بن نہ آئی۔ پس آج میں اسٹیج پر اس لیے آیا ہوں کہ قوم کے بچوں کی تعلیم کے لیے کچھ کرسکوں" اس کے بعد سرسید نے کچھ اور تقریر کی اور آخر کو خواجہ حافظ کی یہ غزل بہ اضافۂ دو اشعار حسب حال جلسہ میں پڑھی۔

ساقیا برخیز و درده جام را		خاک بر سر کن غمِ ایام را		ساغرِ مے برکفم نہ تا ز بر
برکشم ایں دلق ازرق فام را		گرچہ بدنامی ست نزد عاقلاں		ما نمی خواہیم ننگ و نام را
بادہ دردہ۔ چند ازیں باد غرور		خاک بر سر نفس نافرجام را		دودِ آہِ سینۂ نالانِ من
سوخت ایں افسردگانِ خام را		محرم رازِ دلِ شیدائے خود		کس نمے بینم ز خاص و عام را
با دلآرامی مرا خاطر خوش ست		کز دلم یکبارہ برد آرام را		ننگرد دیگر بسرو اندر چمن
ہر کہ دید آں سرو سیم اندام را		کیست آں سرو سہی کاندر سرش		باختیم دین و دل و آرام را
قوم ما اے قوم ما کز بہرِ تو		دادہ ام بر باد ننگ و نام را		صبر کن احمد بہ سختی روز و شب
عاقبت روزے بیابی کام را

مدرسہ کے لیے قلیل سے قلیل چندہ کو بھی وہ ویسی ہی خوشی اور کشادہ پیشانی سے قبول کرتے تھے جیسے بڑی بڑی رقموں کو لیتے تھے لوگ دو دو آنے اور چار چار آنے دیتے تھے اور وہ چوم چاٹ کر رکھ لیتے تھے۔ ایک صاحب نے ناچ کی محفل میں اہل محفل سے چندہ جمع کیا، یہانتک کہ طوائف اور سازندوں نے

بھی مدرسہ کی حقیقت سُنکر خوشی سے چندہ دیا اور اسطرح سوسوا سو روپیہ جمع ہوگیا۔ اُنہوں نے سید کو اطلاع کی کہ ایسا اور ایسا روپیہ ہے اگر کہیے تو بھیج دیا جائے۔ سرسید نے کچھ پس و پیش نہیں کی اور فوراً روپیہ منگوا لیا۔

مدرسہ کے لیے اُنہوں نے بڑے بڑے لمبے سفر کیے، پٹنہ، گورکھپور، الہ آباد، مرزاپور، لاہور، امرتسر، پٹیالہ، حیدرآباد، ڈنیلگری، بھوپال، جبل پور اور دیگر مقامات میں وہ صرف مدرسہ کی دُھن میں گئے لاہور اور حیدرآباد متعدد دفعہ اسی غرض سے جانا ہوا۔ ہزارہا روپیہ ان سفروں میں اُن کا صرف ہوا۔ اگرچہ اُن کے دوست اور رفیق بھی جو اُنکے ہمراہ جاتے تھے اپنا اپنا خرچ اپنی گرہ سے اُٹھاتے تھے لیکن وہ اکثر بدلتے رہتے تھے اور سرسید کا ہر سفر میں ہونا ضروری تھا، اسکے سوا ہمیشہ رزرو ڈگاڑیوں میں سفر ہوتا تھا اور جسقدر سواریاں کم ہوتی تھیں اُن کی کمی زیادہ تر سید کو پوری کرنی پڑتی تھی۔ ایک بار اُنکے مونہ سے نکلا کہ جب آپ کالج کے واسطے سفر کرتے ہیں تو آپکا سفر خرچ کمیٹی کو دینا چاہیے۔ سرسید نے کہا میں اس بات کو ہرگز گوارا نہیں کرسکتا۔ مدرسہ چلے یا نہ چلے مگر میں اُسی حالت میں مدرسے کے لیے سفر کرسکتا ہوں جب سفر کے کل اخراجات اپنے پاس سے اُٹھاسکوں۔

ایک اور طریقہ انہیں سفروں میں چندہ جمع کرنے کا اُنہوں نے یہ نکالا تھا کہ جو احباب دعوت کرنی چاہتے تھے اُن سے نقد روپیہ لے لیتے اور کالج کے چندہ میں جمع کردیتے تھے۔ جب وہ دوسری بار پنجاب کو جانے لگے تو اُنہوں نے خان بہادر برکت علیخان کو ایک خط لکھا جسکا خلاصہ یہ تھا کہ "آپ سے اور سب دوستوں سے درخواست ہے کہ جو کچھ آپ یا اور احباب میری مہمانداری میں صرف کرنا چاہیں ازراہ عنایت اُس کی لاگت نقد عنایت فرمائیں۔ میں نے اکثر دوستوں سے اسی طرح دعوت کے بدلے نقد روپیہ لیا ہے اور اُسکو کالج کے چندہ میں جمع کردیا ہے اس میں خوبی یہ ہے کہ امیر اور غریب سب دعوت کرسکتے ہیں۔ ایک دفعہ ایک دوست نے مجھے دعوت کی بابت ایک روپیہ عنایت کیا۔ میں نہایت خوش ہوا کہ مدرسۃ العلوم کے کئی مزدوروں کی مزدوری ملی۔ وہ دوست بھی خوش ہوئے کہ دعوت ٹھکانے لگی۔ آپ جانتے ہیں کہ میرے ساتھ چند دوست بھی ہونگے پس اگر یہ طریقہ دعوت کا اختیار نہ کیا جائے گا تو جنکے ہاں ٹھیروں گا اُن پر خرچ کثیر پڑجائیگا اور وہی مثل ہوگی 'گدھے کا کھایا کھیت جس کا پاپ نہ پن'"

حیدرآباد کے پہلے سفر میں جو ۱۸۸۲ء میں سرسید نے کیا تھا جسقدر روپیہ دعوت میں آیا وہ سب اُنہوں نے چندہ میں جمع کردیا تھا۔ جب وہاں سے واپس آئے تو علیگڑھ میں اُن کے احباب نے فی کس ایک روپیہ کے حساب سے دو سو بیس روپیے اسلیے جمع کیے کہ سرسید کو شکرگذاری کے طور پر دعوت دیجائے۔ سرسید نے کہا اس کا انتظام میں خود کرونگا۔ وہ سب روپیے اُن سے لیکر اور بیس روپیے اپنے حصے کے اُسمیں ملاکر دو سو

چالیس روپیہ کی دو اسکالرشپیں دس دس روپیہ ماہوار کی غریب طالب علموں کے لیے مقرر کر دیں۔ اُنکے دوستوں نے کہا کہ آپنے اپنے ساتھ ہم کو بھی دعوت سے محروم رکھا اب ہم آپ سے دعوت لینگے۔ اسپر مولوی محمد کریم مرحوم نے کہا کہ سید صاحب کی طرف سے میں سب صاحبوں کو دعوت دونگا۔ چنانچہ اُنھوں نے بڑی دھوم سے سب کی دعوت کی۔

سید محمود کی شادی میں نواب انتصار جنگ نے سو روپیہ بطور اظہار مسرت کے اس غرض سے بھیجے تھے کہ کالج میں صرف کیے جائیں۔ اسپر سرسید نے نہایت خوشی ظاہر کی اور اخبار میں لکھا کہ "ہمارے بعض دوست نیوتا نہ لینے سے ناراض ہوئے مگر ہم نیوتا لینے کو موجود تھے اگر اُس کا روپیہ اسی طرح مدرسۃ العلوم میں خرچ کرنیکو دیا جاتا" پھر لکھا کہ "بعض دوستوں نے شکایت کی ہے کہ شادی میں دعوت ولیمہ نہیں کی؛ مگر ہم نہ جاگیردار ہیں نہ رئیس ہیں؛ اگر دعوت ولیمہ کرتے تو زیادہ سے زیادہ پانسو روپیہ لگا سکتے تھے؛ سو ہم نے پانسو روپیہ مدرسہ میں دیدیا"۔ پوتے کی بسم اللہ کی تقریب میں بھی جو ۱۸۹۳ء کی کانفرنس کا اجلاس ختم ہونے کے بعد سب ممبروں کی موجودگی میں ہوئی تھی سرسید نے ایک نہایت عمدہ تقریر کے بعد اسی طرح پانسو روپیہ مدرسہ کی نذر کیے تھے۔

حیدرآباد کے اخیر سفر میں جب کہ وہ ایک ڈپوٹیشن لیکر حضور نظام میں ایڈریس پیش کرنے کو گئے تھے چونکہ تمام ڈپوٹیشن سرکار عالی کا مہمان تھا سرسید کے دوستوں نے جو کچھ اُنکی دعوت میں دیا وہ سب مدرسہ کے چندہ میں جمع کیا گیا۔ نواب انتصار جنگ نے تو غالباً ہزار روپیہ نقد دیدیے تھے مگر نواب محسن الملک نے بڑی دھوم کی ایک گارڈن پارٹی دینی چاہی تھی۔ سرسید نے انکار کیا اور کہا کہ نقد دلواؤ۔ محسن الملک نے کہا نقد بھی لیجیے اور پارٹی بھی ہوتے دیجیے سرسید نے ہرگز نہ مانا اور کہا کہ نقد اور پارٹی دونوں میں جسقدر خرچ ہو وہ سب نقد ہی دیدو۔ آخر پارٹی موقوف رہی اور ایک ہزار روپیہ نقد نواب محسن الملک نے سرسید کی نذر کیا۔

ابتدائے قیام مدرسہ کے وقت جس طریقہ سے سرسید نے نواب مختار الملک مرحوم کو مدرسۃ العلوم کی طرف متوجہ کیا وہ یادگار رکھے قابل ہے۔ اُنھوں نے مُصوّر سے ایک تصویر بنوائی جس میں مسلمانوں کی حالت اور اُن کے تنزل کی کیفیت محض تصویر کے ذریعہ سے ظاہر کی گئی تھی۔ اُس کی صورت یہ تھی کہ سرسید سمندر کے کنارے ایک درخت سے کمر لگائے حیران اور فکرمند کھڑے ہیں اور اُس سے کسی قدر فاصلہ پر مختار الملک مع دو مصاحبوں کے استادہ ہیں۔ سمندر میں طوفان آرہا ہے۔ جہاز جس میں بہت سے مسافر سوار ہیں اُس کا مستول ٹوٹ گیا ہے اور وہ ڈوبا چاہتا ہے۔ کچھ آدمی پانی میں گر پڑے ہیں اور ڈبکیاں لے رہے ہیں۔ ایک کشتی جس میں کچھ آدمی سوار ہیں اُن ڈوبتوں کے بچانے کو جہاز کی طرف جارہی ہے۔ اُس کی جھنڈی کے پھریرے پر انگریزی

میں یہ الفاظ لکھے ہیں " دَن لَکھ رُوپیز " سرسید اُس حیرت اور تشویش کی حالت میں کہہ رہے ہیں کہ " ناٹ سفیشنٹ " (یعنی یہ روپیہ کافی نہیں ہے) ایک فرشتہ آسمان سے اُترا ہے جو ہوا میں معلق ہے اور ایک ہاتھ سے سرسید کا ہاتھ پکڑ کر دوسرے ہاتھ کی اُنگلی سے نواب مختار الملک کی طرف اشارہ کر رہا ہے اور سرسید سے کہتا ہے " لُک ایٹ دِس نوبل مین " یعنی اُس شریف آدمی کی طرف دیکھو۔

اس تصویر میں سمندر سے زمانہ مراد ہے اور جہاز سے مسلمانوں کی قوم۔ کشتی جو جہاز والوں کی دستگیری کے لیے جا رہی ہے اُس سے مدرستہ العلوم مراد ہے۔ اُس کے پھریرے پر جو " ایک لاکھ روپیہ " کا لفظ لکھا ہے اس سے وہ لاکھ روپیہ مُراد ہے جو اُس وقت تک مدرسہ کے لیے جمع ہوا تھا۔ سرسید گویا مسلمانوں کی سقیم حالت دیکھکر اپنے دل میں یہ کہہ رہے ہیں کہ مسلمانوں کے اُبھارنے کے لیے ایک لاکھ روپیہ کافی نہیں ہے! اُس وقت خدا کی طرف سے اُن کے دل میں یہ القا ہوتا ہے کہ نواب مختار الملک سے مدد مانگنی چاہیے۔ فرشتہ کا اُنگلی سے اشارہ کرنا اسی مضمون پر دلالت کرتا ہے۔

یہ تصویر نواب مختار الملک سید تراب علی خاں مرحوم کی خدمت میں بھیجی گئی اور وہ اُسکو دیکھکر نہایت متاثر ہوئے۔ سنا ہے وہ ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ اس تدبیر کے سوا کوئی دوسری تدبیر روپیہ مانگنے کی میرے دل پر مؤثر نہیں ہو سکتی تھی۔ اُنھوں نے سو روپیہ ماہوار اپنی خاص جاگیر سے اور اول تین سو اور پھر پانسو ماہوار سرکار عالی نظام سے مقرر کیے۔ اُس کے بعد جب حضور نظام نے عنان اختیار اپنے ہاتھ میں لی تو پانسو روپیے ماہوار کا دو دفعہ کر کے اور اضافہ ہوا۔ پھر ۱۸۹۱ء میں جب سرسید ڈیپوٹیشن لیکر حیدر آباد گئے تو حضور نظام نے بجائے ایکہزار کے دفعۃً دو ہزار روپیے ماہوار ہمیشہ کے لیے مقرر کیا اور اُس کی سند سرسید کو عنایت فرمائی۔ درحقیقت یہ اُسی تصویر کا نتیجہ تھا جو رفتہ رفتہ اس درجہ تک پہنچ گیا۔

غرض کہ اسی قسم کی بیشمار تدبیروں سے سرسید نے مدرسے کے لیے سرمایہ جمع کیا ہے۔ ولایت سے واپس آکر وہ اٹھائیس برس زندہ رہے اس عرصہ میں برابر اُن کو یہی اُدھیڑ بُن لگی رہی کہ کس طرح روپیہ فراہم ہو اور کیونکر مسلمانوں کے لیے اعلیٰ درجہ کی تعلیم و تربیت کا سامان مدرستہ العلوم میں مہیا کیا جائے۔ اسکے حالات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جب سے اُن کو مسلمانوں کی تعلیم کا خیال پیدا ہوا اُنھوں نے چند اصول گویا اپنے اوپر لازم کر لیے تھے۔ اولاً اُنھوں نے ہر قسم کی داد و دہش سے اپنا ہاتھ روک لیا۔ مدرستہ العلوم کے سوا رفاہِ عام کے اور کاموں میں چندہ دینا، شادی اور غمی کی رسموں میں روپیہ صرف کرنا اپنے کنبے کے حقداروں کے سوا عموماً مساکین و غربا کی امداد کرنا اور اسی قسم کے تمام ابواب یکقلم بند کر دیئے اور جہانتک ہو سکا مدرسہ کے چندوں میں آپ بھی دیا اور اپنے عزیزوں اور دوستوں سے بھی لیا

اور اپنے دل میں یہ ٹھان لی کہ جو لوگ مدرسہ کی اعانت کریں وہی دوست ہیں اور وہی عزیز و رشتہ دار ہیں۔ اگر غیروں نے اعانت کی تو اُن کو دوست اور عزیز سمجھا اور اگر دوستوں اور عزیزوں نے پہلو تہی کی تو اُن کو سو غیروں کا غیر جانا۔ انہوں نے ایکبار اپنے بچپن کے ایک نہایت گاڑھے دوست کو جو ذی مقدور آدمی تھے مگر مدرسہ کے کچھ سرگرم معاون نہ تھے صاف یہ کہلا بھیجا تھا کہ بغیر مدرسہ کی اعانت کے دوستی قائم نہیں رہ سکتی۔

دوسرے جب سے اُنہوں نے مدرسہ کے لیے چندہ جمع کرنا شروع کیا مروت اور لحاظ کو جو اُنکی ایک جبلی خصلت تھی بالکل بالائے طاق رکھدیا۔ جنسے بے تکلفی اور خالص دوستی تھی اکثر اُنکا نام اور اُنکی رقم چندہ کی فہرست میں بغیر اُن کے استمزاج کے لکھدی جاتی تھی اور اُنکو صرف اُس وقت خبر ہوتی تھی۔ جب اُن سے روپیہ مانگا جاتا تھا۔ بعض اوقات وہ انکار کرتے تھے اور ادھر سے سخت اصرار کیا ناراضی کا اظہار ہوتا تھا اور آخر کار بغیر دیے کچھ بن نہ آتا تھا۔ سرسید کے دوست دیتے دیتے تھک گئے مگر وہ مانگتے مانگتے نہ تھکے۔ وہ ایک آرٹیکل میں لکھتے ہیں کہ "ہمارا تو اب یہ حال ہوگیا ہے کہ ہمارے دوست بھی ہم سے ملتے ہوئے ڈرتے ہیں کہ کچھ سوال نہ کر بیٹھیں۔ ہماری صورت ہی اب سوال ہوگئی ہے۔ میں نے ایک دوست سے کہا کہ بھائی میری قسمت میں بھیک مانگنا لکھا تھا سو اُس لکھے کی بدلا تا ہوں مگر شکر ہے کہ اپنے لیے نہیں بلکہ قوم کے لیے۔ اس پر سعدی کا ایک شعر یاد آیا اور دل نے چاہا کہ اس میں کچھ مصرعے لگ جائیں تا کہ حسب حال ہو جائے۔ سوا ایک خدا کے بندہ نے مصرعے لگا دیئے اور اب اُس شعر کی یہ صورت ہو گئی۔

پیش ازیں سعدی روشن دل آزاد منش	گفت در باب گدایان سخن از صدق و یقیں
"گر گدا پیشہ و لشکر اسلام بود	کافر از بیم توقع برود تا در چین"
لیک در نوبت ما کار بجائے برسید	کہ بہ کافر چہ رسد۔ خود بتواں گفت چنیں
گر گدا پیشہ رو لشکر اسلام بود	ہم مسلماں رود از بیم سوالش تا چیں

ایک بار مدرسہ کے کسی کام کے لیے چندہ کھولا گیا۔ سرسید نے اپنے قدیم دوست مولوی سید زین العابدین خاں سے چندہ کا تقاضا کیا۔ اُنھوں نے بدمزہ ہو کر کہا "صاحب ہم تو چندہ دیتے دیتے تھک گئے"۔ سرسید نے کہا "ارے میاں اب کوئی دن میں ہم مرجائینگے، پھر کون تم سے چندہ مانگیگا"۔ یہ الفاظ کچھ ایسے طور پر کہے گئے کہ دونوں آبدیدہ ہوگئے اور چندہ فوراً ادا کیا گیا۔

چندہ کے علاوہ جب کبھی اُن کو دوستوں سے کچھ اُچک لینے کا موقع ملا اُنھوں نے اُس موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ وہ ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ "خانۂ دوستاں بروب و در دشمناں مکوب" ایک روز مسٹر

تھیوڈورپک کے والد جو سیاحت کے لیے ہندوستان میں آئے ہوئے تھے ایک خاص سکہ کی اشرفی دوستانہ طور پر مولوی زین العابدین خاں کو دینی چاہتے تھے اور وہ اُس کے لینے سے انکار کرتے تھے آخر دونوں صاحب سرسید پاس آئے اور واقعہ بیان کیا۔ سرسید نے بہت بدمزہ ہوکر مولوی صاحب سے کہا کہ دوستوں کے ہدیہ کو رد کرنا نہایت بد اخلاقی کی بات ہے۔ اُنہوں نے وہ اشرفی لے لی۔ سرسید نے کہا دیکھوں کس سکہ کی اشرفی ہے اور اُن سے لیکر مدرسہ کے کھاتہ میں جمع کر دی۔ اسی طرح ایک دن سید محمود نے قاضی رضا حسین مرحوم سے کسی بات پر پچاس روپیہ کی شرط بدی اور یہ ٹھیرا کہ جو ہارے پچاس روپیہ مدرسہ میں دے۔ اتفاق سے سید محمود ہار گئے۔ وہ سو روپیہ کا نوٹ لیکر آئے اور قاضی صاحب سے کہا کہ پچاس روپیہ دیجیے اور نوٹ لیجیے۔ اُنہوں نے کہا وہ تو ہنسی کی بات تھی، کیسی شرط اور کیسا روپیہ؟ دوسرے شرط بدنا جائز بھی نہیں ہے، سرسید بھی وہیں موجود تھے جب اُنہوں نے دیکھا کہ روپیہ مدرسہ میں آتا ہے فرمایا کہ جس شرط میں اپنا فائدہ ملحوظ نہ ہو وہ جائز ہے اور فوراً اُس میں سے پچاس روپیے نکال کر سید محمود کو دیدیئے اور نوٹ لے لیا۔

اس قسم کے صدہا واقعات روزمرہ گذرتے تھے۔ ان چھوٹی چھوٹی باتوں کے بیان کرنے سے مدعا یہ ہے کہ جس قوم میں عام طور پر تعلیم کی قدر نہو، جہاں ہر کام کا مدار شخصیت اور ذاتی اغراض پر ہو، جہاں قومی ترقی اور قومی فلاح کے نتائج سے لوگ بے خبر ہوں، جہاں امیر بے پروا، دولتمند مسرف یا بخیل، علما زمانہ کی ضرورتوں سے ناواقف اور عوام الناس جاہل اور مفلس ہوں، وہاں ایک ایسا کام جس سے تمام قوم کی بھلائی منصور ہو کوئی شخص نہیں کر سکتا جب تک کہ وہ سرسید کی طرح اپنے تئیں اُس کام میں فنا نہ کردے۔ اور جو فائدے کہ وہ اپنی عقلمندی، شہرت، لیاقت، وجاہت، دوستی، کوشش، اور محنت سے خود اُٹھا سکتا ہے اُن سے آپ دست بردار ہو کر اُس کام پر وقف نہ کردے۔

دوستوں کے علاوہ اجنبی اور انجان آدمی جن سے کچھ وصول ہونے کی امید ہوتی تھی، شاید پہلی ایک آدھ ملاقات میں اُنکی باری نہ آتی ہو ورنہ اکثر صاحب سلامت ہوتے ہی سوال ڈالا جاتا تھا۔ اور اس میں کچھ مسلمانوں ہی کی خصوصیت نہ تھی بلکہ انگریزوں سے بھی بعض اوقات یہی برتاؤ ہوتا تھا۔ ایک بار سرسید نے ایک محض اجنبی مسافر انگریز سے جو ڈاک بنگلہ میں ٹھیرا تھا چندہ طلب کیا۔ اُس نے بہت روکھے پن سے یہ جواب دیا کہ آپ کو اس کام کے لیے صرف اپنی قوم سے مانگنا چاہیے۔ سرسید نے کہا "بیشک ہم کو قوم کی پست ہمتی سے غیروں کے سامنے ہاتھ پسارنا پڑتا ہے۔ مگر یاد رکھنا چاہیے کہ اگر یہ انسٹیٹیوشن بغیر انگریزوں کی اعانت کے قائم ہوگیا تو انگریزوں کے لیے کوئی ذلت کی بات اس سے زیادہ نہوگی کہ وہ باوجودیکہ ہندوستان

کی حکومت سے بے انتہا فائدہ اُٹھاتے ہیں مگر ہندوستانیوں کی بھلائی کے کاموں میں مطلق شریک نہیں ہوتے" وہ انگریز یہ سُنکر شرمندہ ہوا اور اُسی وقت ایک نوٹ بیس روپیے کا سرسید کی نذر کیا۔

سرسید نے مدرسہ کی خاطر اس بات کو بھی اپنے اوپر لازم کر لیا تھا کہ کوئی سعی اور کوئی کوشش کسی ایسے کام میں صرف نہ کی جائے جو مدرسۃ العلوم سے کچھ علاقہ نہ رکھتا ہو۔ جو کوششیں بظاہر وہ خاص اپنی ذاتی اغراض کے لیے کرتے تھے اُن سے بھی اگر غور کر کے دیکھا جائے تو خود اُن کو اسقدر فائدہ نہیں پہنچا تھا جس قدر کہ مدرسۃ العلوم کو پہنچتا تھا۔ یہ بات مشہور ہے کہ وہ کبھی کسی اپنے یا پرائے کی سفارش کسی سے نہیں کرتے تھے۔ درحقیقت اس کا سبب یہ تھا کہ وہ اپنی ملاقات یا دوستی یا وجاہت سے جس قدر فائدہ اُٹھا سکتے تھے وہ مدرسۃ العلوم کے سوا کسی کو پہنچانا نہیں چاہتے تھے۔ معاویہ ابن ابی سفیان نے اپنے ایک جلیس سے کہا کہ "تو اوروں کے فائدہ کے لیے سفارش مت کیا کر کیونکہ اس سے تیرے فائدوں میں کمی پڑیگی"۔ اگرچہ یہ نصیحت جن معنوں میں کی گئی تھی اسکو کوئی کریم النفس آدمی قبول نہیں کر سکتا، مگر جن معنوں میں سرسید نے اُس پر عمل کیا وہ ایک ایسی جوانمردانہ خصلت تھی جو سرسید کے سوا کسی میں نہیں دیکھی گئی۔ وہ محض قوم کی خاطر دوستوں اور عزیزوں کا بُرا ماننا گوارا کرتے تھے اور جو خوشی لوگوں کی سفارش اور اُن کی حاجت روائی کرنے سے انسان کو حاصل ہوتی ہے اُس کی کچھ پروا نہیں کرتے تھے۔ سرسید کے ایک معزز ہموطن نے ایک رفاہ عام کے کام میں اُنکو شریک کرنا اور اپنی کمیٹی کا ممبر بنانا چاہا۔ اُنہوں نے صاف کہدیا کہ میں صلاح و مشورہ سے مدد دینے کو آمادہ ہوں لیکن چندہ نہ خود دونگا اور نہ اوروں سے دلوانے میں کوشش کرونگا اگر اس شرط پر ممبر بنانا ہو تو مجھکو ممبری سے کچھ انکار نہیں۔ **لطیفہ** ایک شخص نے جس سے کچھ واقفیت نہ تھی سرسید سے سفارش کی درخواست کی اور لکھا کہ "میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ ایک بزرگ ہیں جنکی لوگ بے انتہا تعریف کرتے ہیں کہ اُن کی تمام عمر قوم کی خیر خواہی میں گذری ہے۔ جب میری آنکھ کھلی تو مجھکو یقین ہوگیا کہ ہوں نہوں وہ بزرگ آپ ہی ہیں اور میری مشکل آپ ہی سے آسان ہوگی" سرسید نے اُس کا یہ جواب لکھ بھیجا کہ "جس باب میں آپ سفارش چاہتے ہیں اُس سے مجھکو کچھ تعلق نہیں ہے۔ اور جن بزرگ کو آپنے خواب میں دیکھا ہے وہ غالباً شیطان تھا"

عمارات کالج

ہم چاہتے تھے کہ کالج کی عمارات کا حال اور اُنکی تفصیل مفصل طور پر بیان کیجائے کیونکہ ان تمام عمارتوں کا اس قدر جلد اور ایسی خوبی کے ساتھ تیار کرا دینا اور ایک ویران قطعۂ زمین کو چند سال میں محض قومی چندہ سے گلزار بنا دینا اور سیکڑوں پردیسی طلبہ کی تمام ضروریات اور آسائش اور تعلیم و تربیت اور ہر قسم کی ریاضت کا سامان مہیا کر دینا یہ بھی سرسید کی زندگی کے اُنہیں بڑے بڑے کاموں میں سے ایک کام ہے جن کا ذکر اُن کی لائف میں کرنا ضرور ہے۔ لیکن ہم کو معلوم ہوا ہے کہ نواب

محسن الملک کا ارادہ کالج کی مفصل تاریخ لکھنے کا ہے اور اُمید ہے کہ اُس میں عمارات کا حال نہایت تفصیل کے ساتھ درج کیا جائیگا اس لیے ہم اس موقع پر تمام کالج اور بورڈنگ کی عمارتوں کا مفصل حال بیان کرنا ضروری نہیں سمجھتے مگر جو اصول کہ سرسید نے ان عمارتوں کے بنانے میں ملحوظ رکھے ہیں اور جس کوشش اور توجہ سے اُنھوں نے یہ دشوار کام آسان کیا ہے اور جن مصالح سے وہ برخلاف اکثر ممبران کمیٹی کی رائے کے تعمیر کے کام کو سب کاموں سے مقدم سمجھتے رہے ہے اُن کو کسی قدر بیان کرنا ضرور ہے۔

کالج کمیٹی کے سرگرم ممبر جو کالج کے کاروبار سے زیادہ دلبستگی رکھتے تھے اُن میں بہت ہی کم ایسے ہونگے جو کالج بلڈنگ میں زیادہ روپیہ صرف کرنے کے روادار ہوں؛ کیونکہ ابتدا میں تعلیم ہی کے اخراجات کے لیے کافی روپیہ بہم پہنچانا دشوار معلوم ہوتا تھا چہ جائیکہ لاکھوں روپیہ کی عمارتیں تیار کرائی جائیں۔ مگر سرسید نے کالج کی ترقی بلکہ اُس کا قیام ودوام اسی پر منحصر سمجھا تھا کہ جہاں تک ممکن ہو اعلیٰ درجہ کی اسکیل پر عمارتیں بنائی جائیں۔ وہ جانتے تھے کہ کالج کے اصلی نتائج علی الاعلان ظاہر ہونے کے لیے جس سے عام لوگوں کو اُس کی طرف ترغیب ہو ایک مدت دراز درکار ہے؛ تعلیم وتربیت کی خوبی کے سمجھنے والے لاکھوں بلکہ کروروں میں ہمیشہ معدود آدمی ہوتے ہیں۔ البتہ عمارات کی شان وشوکت ایک ایسی چیز ہے جس کا اثر فوراً خاص وعام کے دل پر پڑتا ہے۔ سرسید کا یہ خیال جہاں تک دیکھا جاتا ہے بالکل صحیح نکلا۔ فی الواقع کالج کی عظمت کا خیال باوجود سخت مخالفتوں کے جس قدر سرعت کے ساتھ تمام ملک میں پھیل گیا یہ زیادہ تر اُسکی شاندار عمارتوں کا نتیجہ تھا۔ خصوصاً گورنمنٹ اور انگریزوں کی نظر میں جتنی توجہ اور التفات سے کالج کو نہایت فائدہ پہنچا ہے اُس کی وقعت بہت کچھ اسی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔ ۱۸۸۲ء میں جبکہ ایجوکیشن کمیشن نے علیگڑھ میں اپنا اجلاس کیا تھا اُس وقت علی گڑھ انسٹیٹیوٹ ہال میں مسٹر وارڈ نے جو کمیشن کی لوکل کمیٹی کے ممبر تھے علیگڑھ کے ہندوؤں کے ایڈریس کے جواب میں بورڈنگ ہوس محمدن کالج کی پختہ بارک کی نسبت یہ الفاظ کہے تھے کہ "جس وقت میں نے کمروں کی اُس قطار کو دیکھا جو بعد مکمل ہونے کے تمام دنیا میں شاید اپنی قسم کی سب سے عمدہ عمارت ہوگی تو مجھکو اس بات کا خیال ہوا کہ کوئی شخص ایسا نہیں ہے جس کے دل میں ان مکانات کو دیکھکر آیندہ کی نسبت نئی ہمت پیدا نہو" صاحبزادہ آفتاب احمد خاں اسکوائر بیرسٹرایٹ لا کا بیان ہے کہ "انگلستان کے نامور سیاح ریورنڈ کینن بارنٹ جب چین، جاپان اور امریکہ کی سیاحت کے بعد لندن میں آئے تو اُنہوں نے مجھسے کہا کہ میں نے کیمبرج یا اکسفورڈ کے کالجوں کے نمونہ کا کالج سوا محمدن کالج کے نہیں دیکھا"

سرسید کو کالج کی زیادہ شاندار عمارتیں بنانیکا خیال اس نظر سے بھی ضرور ہونا چاہیے تھا کہ آیندہ نسلوں کو اپنے قومی انسٹیٹیوشن کا عظم وشان دیکھکر اُس کے قائم رکھنے کا زیادہ خیال ہو۔ ایشیائی قوموں میں بخلاف

اہل یورپ کے یہ خیال کبھی پیدا نہیں ہوا کہ اگلوں نے جو کام ادنیٰ درجہ کی حالت میں چھوڑا ہے اُس کو اعلیٰ درجہ تک پہنچائیں یا جو کام وہ ادھورا چھوڑ گئے ہیں اُن کو پورا کر دیں۔ ہم ایسے بہت سے مدرسے اور خانقاہیں نشان دے سکتے ہیں جن کے بانی اُن کو ناتمام چھوڑ کر مر گئے اور وہ چند روز میں کھنڈر ہو گئیں۔ لیکن اکثر اوقات عمارت کا عظم وشان ان ملکوں میں بھی لوگوں کو اس بات پر مجبور کر دیتا ہے کہ اُس کو جس طرح ہو سکے قائم اور آباد رکھیں۔ ہم کو اسٹریچی ہال کی نسبت جبکہ وہ بالکل مرتب اور تیار ہو چکا تھا ایک معزز مسلمان کا یہ کہنا یاد رہے گا کہ "جب تک یہ عمارت قائم ہے مسلمان یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ ہم مرے ہوئے بھی ایسے کام کر گذرتے ہیں جو زندوں سے نہیں ہو سکتے"۔ بہرکیف اس انسٹیٹیوشن کے قائم و برقرار رہنے کی اگر کچھ امید ہو سکتی ہے تو انہیں عمارتوں کی بدولت ہو سکتی ہے جنکی نسبت کمیٹی نے گورنمنٹ سے یہ اقرار کر لیا ہے کہ اگر (خدانخواستہ) کالج بند ہو جائے تو عمارتیں گورنمنٹ کے قبضہ میں چلی جائیں۔

سرسید نے ان عمارتوں میں آیندہ نسلوں کے فخر و مباہات کے لیے ایک نہایت موثر طریقہ یہ اختیار کیا ہے کہ تمام سنگین اور پختہ عمارتوں پر اُن کے بانیوں کے اور کالج کے محسنوں، مربیوں اور مددگاروں کے نام جن میں زیادہ تر مسلمان ہیں بڑے اہتمام سے کندہ کرا لیے ہیں۔ ان میں بہت سی عمارتیں بن چکی ہیں، کچھ زیر تعمیر ہیں، کچھ ناتمام پڑی ہیں اور بہت سی قوم کی فیاضی کی منتظر ہیں۔ اگر قوم میں کچھ جان باقی ہے تو وہ ضرور ان معزز ناموں اور معزز کتبوں کی لاج رکھیگی اور اس قومی یادگار کو صفحۂ روزگار سے مٹنے نہ دیگی۔ سُنا ہے کہ کالج کے احاطہ کی جالیوں پر مسلمانوں کے نام کھدے ہوئے دیکھکر ایک یورپین افسر نے کہا تھا کہ "یہ احاطہ اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ گویا مسلمان ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے ہوئے اس کالج کو چاروں طرف گھیرے کھڑے ہیں کہ کوئی آفت اس پر نہ آنے پائے"۔

کتبوں کے علاوہ اور بھی بہت سی ایسی باتیں اُن عمارتوں میں ملحوظ رکھی گئی ہیں جن سے مسلمانوں کے دل میں کالج کی طرف ایک کشش پیدا ہو۔ مثلاً اکثر محرابیں سیرسنک اسٹائل پر بنوائی گئی ہیں۔ بورڈنگ ہوس کے صدر دروازہ کی پیشانی پر کھجور کا درخت جو عرب کی خصوصیات میں سے ہے اور ہلال و تاج کا نشان جو مسلمانوں کا برٹش حکومت کے ساتھ تعلق ظاہر کرتا ہے ثبت کرایا گیا ہے۔ بعض انگریزوں کی اسپیچیں جن میں مسلمانوں کو غیرت اور اُن کے اسلاف کی عظمت یاد دلائی گئی ہے پتھروں پر کندہ کرا دی ہیں۔ جن یوروپین افسروں اور حاکموں نے کالج کی مدد کی ہے اُن کی عالیشان یادگاریں بنوائی گئی ہیں تاکہ مسلمانوں کو آیندہ زمانہ میں اس بات پر فخر کرنے کا موقع ملے کہ اُن کے اسلاف اپنے محسنوں کے کیسے شکر گذار اور دل سے قدر کرنے والے تھے۔

بعض ممبروں کی یہ رائے تھی کہ تعمیر کے لیے ماہواری یا سالانہ ایک رقم معین ہونا چاہیے کہ اُس سے زیادہ کبھی صرف نہ ہونے پائے۔ بیشک یہ ایک نہایت روی کی چال تھی۔ لیکن اگر ایسا ہوتا تو سرسید نے جو ہتیلی پر سرسوں جمائی ہے یہ ہرگز ظہور میں نہ آتا اور کالج کی وقعت جو دفعتہً تمام زمانہ کے دل میں پیدا ہوگئی اُس کے لیے ایک مدت دراز تک انتظار کرنا پڑتا اور سرسید کے بعد کسی سے یہ اُمید نہ تھی کہ تعمیر کا کام ایسے چاؤ اور اُمنگ سے سرانجام کرتا جیسے کوئی اپنا محل تیار کرتا ہے۔ حالانکہ سرسید کا سب سے زیادہ دلچسپ مشغلہ ہمیشہ تصنیف و تالیف و مضمون نگاری کا کام رہا ہے اور ایسے لوگوں کا کسی دوسرے کام کی طرف متوجہ ہونا نادرات سے ہے باوجود اس کے اُنھوں نے اس قطعۂ زمین کے آباد و سرسبز کرنے میں فوق العادۃ کوشش اور توجہ کی ہے۔ برسوں بلاناغہ دو دوپہر اور تمام تمام دن سخت سے سخت موسموں میں وہ خود مدد پر جا کر بیٹھے ہیں اور اپنے سامنے راج مزدوروں اور سنگ تراشوں سے کام لیا۔ باوجود اس تن و توش کے وہ کالج کے باغ کی تیاری میں پھروں دھوپ اور لوؤں میں پھرتے تھے، روشیں بنواتے تھے، دور دور سے ہر قسم کی پود منگواتے تھے جو اُن کے روبرو باغ میں لگائی جاتی تھی۔ باوجود ان تمام باتوں کے تعمیر وغیرہ کے متعلق ہر ایک کام اُنکو اپنی رائے سے کرنا پڑتا تھا۔ نہ کوئی انجینیر یا اورسیر تھا جس سے صلاح لیجائے نہ کوئی لائق مستری تھا جس کی تجویز اور رائے پر اطمینان ہو جن دیہاتی معماروں سے یہ کام لیے گئے اُنھوں نے کبھی اس قسم کی عمارتیں نہیں بنائی تھیں اس لیے سرسید کو ہر ایک عمارت کا نقشہ خود ہی تجویز کرنا پڑتا تھا اور خود ہی اُس کے تمام نشیب و فراز سوچنے پڑتے تھے۔ معماروں اور سنگتراشوں کو خود بیٹھکر ایک ایک بات بتانی پڑتی تھی اور پھر جب تک وہ کام ختم ہو خود ہی اُس کی نگرانی کرنی پڑتی تھی کہ جس طرح بتایا گیا ہے اسی طرح کا بنتا ہے یا نہیں۔

ہم نے سنا ہے کہ بعض یوروپین انجینیروں نے کالج اور بورڈنگ ہوس کی عمارتوں کو دیکھکر تعجب ظاہر کیا ہے اور جب اُن کو یہ معلوم ہوا کہ بغیر کسی تعلیم یافتہ انجینیر کی صلاح اور مشورہ کے یہ عمارتیں تیار ہوئی ہیں تو وہ اور بھی زیادہ متعجب ہوئے ہیں۔ بایں ہمہ ممکن ہے کہ ان عمارتوں میں انجینیرنگ کے اصول کے موافق یا طلبہ کے آرام و آسائش کے لحاظ سے کوئی کمی یا نقص رہ گیا ہو لیکن ہم کو اس قومی انسٹیٹیوشن کے لیے ایسا انجینیر ملنا ناممکن تھا جو خود ہی تعمیر کے لیے روپیہ فراہم کرے، خود ہی عمارت بنوائے، ایک کوڑی تنخواہ کی نہ لے، نہایت دیانت داری سے اپنا کام انجام دے اور ہر ایک عمارت کو ایسے شوق سے بنوائے کہ گویا اپنا گھر بنواتا ہے۔

بعضے لوگ کہتے ہیں کہ تعمیر پر جتنا روپیہ صرف ہونا چاہیے تھا اس سے بہت زیادہ صرف ہوا ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ ایسی عالیشان عمارتیں بنانی کیا ضرور تھیں۔ بعض کہتے ہیں کہ بیسیوں عمارتیں ناتمام پڑی ہیں انکے شروع کرنے کی کیا ضرورت تھی، جس قدر روپیہ آتا جاتا اُسی قدر عمارتیں بنتی جاتیں۔ بعضے اور اعتراض کرتے ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ نہ اُنھوں نے خود کسی قومی عمارت کا نمونہ اس سے بہتر بنا کر دکھایا ہے اور نہ کوئی ایسی عمارت نشان دیتے ہیں جو قوم سے بھیک مانگ کر اس سے بہتر کسی نے بنائی ہو۔

مشکلے دارم ز دانشمند مجلس باز پرس کار فرمایاں چرا خود کار کمتر می کنند

عمارات کے متعلق اخیر بات جو سرسید کی لائف میں ذکر کے قابل ہے وہ یہ ہے کہ سرسید نے باوجود اسکے کہ کالج کے بانی ہونیکا فخر درحقیقت اُنہیں کو حاصل تھا ہمیشہ اس بات سے انکار کیا ہے کہ کالج میں اُن کے نام کا کوئی کتبہ یا نشان خصوصیت کے ساتھ قائم کیا جائے۔ جب اول ہی اول کالج کے قائم ہونے کی تجویز ہوئی تو اُن کے دوستوں نے اس بات پر اصرار کیا کہ کالج کا نام مدرسۂ احمدیہ رکھا جائے بلکہ کلکتہ کے اخبار اُردو گائڈ نے ایک دفعہ یہ نام اپنے پرچہ میں چھاپ بھی دیا۔ مگر سرسید نے اس کی سخت مخالفت کی اور ہرگز اس بات کو منظور نہیں کیا کہ کالج اُن کے نام سے موسوم کیا جائے۔ اس کے بعد ۱۸۸۴ء میں آنریبل حاجی محمد اسمٰعیل خاں نے سرسید کی اطلاع اور مرضی بغیر ایک عمارت اُن کی یادگار میں بنانے کے لیے چندہ کھولا اور کالج کا دروازہ اُنکی یادگار میں بنانا اور اُس پر سرسید کے نام کا کتبہ لگانا تجویز کیا۔ اُنھوں نے اسکی بھی مخالفت کی اور یہ کہا کہ مُسلمان جن سے میری یادگار کا چندہ وصول کرنے کی آپ اُمید رکھتے ہیں انکی نظر میں میری اور میرے کاموں کی مطلق وقعت نہیں ہے پس آپ چندہ کس سے وصول کرینگے مگر جب حاجی صاحب نے کسی طرح نہ مانا تو سرسید دو شرطوں پر راضی ہوئے۔ ایک یہ کہ دروازہ کی پیشانی پر جو کتبہ لگایا جائے اُس پر یہ لکھا جائے کہ قوم نے قومی بھلائی کے لیے یہ کالج بنایا ہے۔ دوسرے یہ کہ جو کتبہ دروازہ کے اندرونی جانب لگایا جائے اُس پر مولوی سمیع اللہ خاں اور حاجی اسمٰعیل خاں کا نام بھی جو اس عمارت کے بنانے کے محرک ہوئے ہیں کندہ کرایا جائے۔ حاجی صاحب نے پہلی شرط تو بہ اکراہ قبول کر لی، مگر دوسری شرط کی نسبت یہ کہا کہ آجتک کہیں ایسا نہیں دیکھا گیا کہ کسی خاص شخص کی یادگار میں اوروں کے نام بھی شریک کیے جائیں۔ سرسید نے کسی طرح نہ مانا اور دونوں شرطیں قبول کرنی پڑیں چنانچہ دروازہ کے پیش طاق پر چند عربی اشعار کندہ کرلیے گئے جن میں کسی خاص شخص کے نام کی تصریح نہیں ہے اور اندرونی جانب حاجی محمد اسمٰعیل خاں اور مولوی سمیع اللہ خاں کا نام بھی شامل کیا گیا۔

قطع نظر اس کے کہ حاجی صاحب کے اصرار نے سرسید کو مجبور کر دیا تھا بڑی وجہ سرسید کے راضی ہوجانے کی یہ تھی کہ اُن کو اپنی یادگار کے حیلہ سے احاطۂ بورڈنگ ہوس اور کالج کا صدر دروازہ

جو ایک نہایت ضروری عمارت تھی اور بورڈنگ ہوس کے چھ پختہ کمرے تیار ہوتے نظر آتے تھے جنکا بغیر اس حیلے کے تیار ہونا نہایت دشوار تھا۔ چنانچہ ۲۶- جون ۱۸۸۱ء کے جلسۂ "کمیٹی یادگار سید احمد خاں" میں مولوی سید فریدالدین احمد خاں نے صاف کہا تھا کہ اگر حاجی صاحب اس چندہ سے بورڈنگ ہوس کی ایک ضروری عمارت کا بنانا تجویز نہ کرتے تو سید احمد خاں اسکی شدید مخالفت کرتے۔

اسی طرح ایک دفعہ کالج کے بعض یوروپین پروفیسروں نے یہ تحریک کی کہ یہاں بھی ولایت کے کالجوں کی طرح فونڈرز ڈے (یعنی بانی مدرسہ کی سالگرہ کا دن) بطور ایک خوشی کے دن کے قرار دیا جائے جس میں ہر سال کالج کے ہوا خواہ اور دوست اور طالب علم جمع ہو کر ایک جگہ کھانا کھایا کریں اور کچھ تماشے تفریح کے طور پر کیے جایا کریں۔ سرسید نے اس کو بھی منظور نہیں کیا اور یہ کہا کہ "ہمارے ملک کی حالت انگلستان کی حالت سے بالکل جداگانہ ہے۔ وہاں ایک ایک شخص لاکھوں کروڑوں روپیہ اپنے پاس سے دیکر کالج قائم کر دیتا ہے اور یہاں سوا اس کے کہ ہزاروں لاکھوں آدمیوں سے چندہ جمع کرکے کالج قائم کیا جائے اور کوئی صورت ممکن نہیں۔ پس کوئی وجہ نہیں کہ جو کالج قوم کے روپیہ سے قائم ہو سکے کسی خاص بانی کے نام پر ایسی رسم ادا کیجائے۔ اسلیے میرے نزدیک بجائے فونڈرز ڈے کے فونڈیشن ڈے (یعنی کالج کی سالگرہ کا دن) مقرر ہونا چاہیے۔" چنانچہ اسی تجویز کے موافق کئی سال تک یہ رسم ادا کی گئی۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ سرسید نے کس لیے اپنی یادگار قائم کرنے کی مخالفت کی تھی؟ تمام دنیا میں- اور خاصکر اُن ملکوں میں جہاں ہمیشہ ایسے قومی رفاہ کے کام ہوتے رہتے ہیں- یہ عام دستور ہے کہ ہر قوم کے افراد اُن لوگوں کی شکرگذاری کے طور پر جن سے کوئی قوم کی بھلائی کا کام ہوتا ہے اُن کی یادگاریں قائم کرتے ہیں اور اُس سے بڑا مقصد یہ ہوتا ہے کہ قوم کو ناشکری و احسان فراموشی کا دھبہ نہ لگے اور آیندہ نسلوں میں بھی قوم کی خیرخواہی کا حوصلہ پیدا ہو- پھر کیا وجہ تھی کہ ایسے مفید کام کے کرنے سے سرسید لوگوں کو مانع آتے تھے؟

اس کا جواب بہت صاف ہے- جن ملکوں میں قومی بھلائی کے کام کرنے اور محض قوم کی خیرخواہی میں اپنی عمریں صرف کر دینے کا عام دستور ہے اور جہاں ہر زمانہ میں ایسی مثالیں بکثرت پائی جاتی ہیں وہاں کبھی ایسے لوگوں پر جو ایسے کام کرتے ہیں خودغرضی کا گمان کسی کو نہیں ہوتا بلکہ بادشاہ سے لے کر علما اور جاہل سے لیکر عالم تک سب دل سے اُن کی عزت کرتے ہیں، اُن کا احسان مانتے ہیں، اُن کو مدد دیتے ہیں اور اُن کی شکرگذاری اور آیندہ نسلوں کا دل بڑھانے کے لیے اُنکی یادگاریں قائم کرتے ہیں- مگر ہمارے ملک کا حال اس کے برخلاف ہے- یہاں ایسی مثالیں کمیاب بلکہ نایاب

ہیں کہ کوئی شخص بے شائبہ غرض محض قوم کی بھلائی میں اپنی عمر صرف کر دے، رات دن اسی اُدھیڑ بُن میں لگا رہے اور قوم ہی کو اپنا اوڑھنا اور بچھونا بنا لے۔ اس سبب اگر حسن اتفاق سے قرنوں اور صدیوں کے بعد کوئی ایسا شخص پیدا ہو جاتا ہے تو اُس کو یہ مشکل پیش آتی ہے کہ جس قسم کے کام کا وہ ارادہ ظاہر کرتا ہے اُس کا نمونہ قوم میں موجود نہیں ہوتا۔ اس لیے اُس کو اپنی طرف سے بدگمانی کے تمام رستے بند کرنے پڑتے ہیں تاکہ قومی رفاہ کے کام میں خلل واقع نہ ہو اور لوگ اس کا ذاتی کام سمجھ کر امداد اور اعانت سے پہلو تہی نہ کریں۔ چنانچہ ایک آدھ موقع پر جس کا ذکر دوسرے حصہ میں کیا جائیگا۔ کسی وجہ سے جو سرسید اس مصلحت کا لحاظ نہ کر سکے تو نہ صرف اُن کے مخالف بلکہ نہایت عزیز دوست اُن کی طرف سے کھٹک گئے اور طرح طرح کی بدگمانیاں لوگوں میں پیدا ہو گئیں۔

[margin: ۱۶ کالج]

کالج میں اول دو ڈپارٹمنٹ قائم کیے گئے تھے ایک انگریزی ڈپارٹمنٹ جس میں یونیورسٹی کا کورس پڑھایا جانا تجویز ہوا تھا۔ دوسرا اورنٹیل ڈپارٹمنٹ جس کی پڑھائی مقرر کرنی کمیٹی کے اختیار میں تھی اور اُردو میں علوم جدیدہ اور فارسی و عربی میں ادب اور علوم قدیمہ پڑھائے جانے قرار پائے تھے اور انگریزی کے لیے بطور سکنڈ لینگویج کے صرف ایک گھنٹہ مقرر کیا گیا تھا۔ اس ڈپارٹمنٹ کے لیے سرسید انگلستان سے بڑے بڑے نامور علماء و فضلاء سے مختلف علوم و فنون کی کتابوں کی ایک فہرست لکھوا کر اپنے ساتھ لائے تھے جس میں ہر فن کے علما نے اپنے اپنے فن کی نہایت مستند اور معتبر کتابیں لکھی تھیں۔ مطلب یہ تھا کہ ہندوستان میں اُن کا ترجمہ کرا کر اورنٹیل ڈپارٹمنٹ کی پڑھائی میں داخل کریں۔ مگر سوا اس کے کہ شمس العلما مولوی محمد ذکاء اللہ نے اُس فہرست کی اکثر کتابوں کا ترجمہ بطور خود کر دیا اور کوئی نتیجہ اُس سے پیدا نہیں ہوا۔ کچھ عرصہ تک دونوں ڈپارٹمنٹ جاری رہے مگر اورنٹیل ڈپارٹمنٹ روز بروز تنزل کرتا جاتا تھا یہاں تک کہ بلا مبالغہ طلبہ کی تعداد سے اُستادوں کی تعداد زیادہ ہو گئی تھی۔ چونکہ طالب علموں اور اُن کے مربیوں کو مشرقی زبانوں کی تعلیم میں کوئی امید دنیوی فائدہ کی نہ تھی اسلیے اورنٹیل ڈپارٹمنٹ کو کوئی پسند نہ کرتا تھا۔ آخر مجبور ہو کر اُس کو توڑ دیا گیا مگر انگلش ڈپارٹمنٹ جیسا کہ آگے کسی موقع پر بیان کیا جائیگا۔ روز بروز ترقی کرنے لگا۔

[margin: کالج کلاس کا مقرر ہونا]

۲۴ مئی سنہ ۱۸۷۵ء کو جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ابتدائی مدرسہ کھولا گیا اور یکم جنوری سنہ ۱۸۷۸ء کو کالج کلاس قائم ہو گئی۔ نیز اسی سال محمڈن کالج فرسٹ آرٹس کے امتحان تک اور سنہ ۱۸۸۱ء میں بی اے اور ایم اے کے امتحان تک اور سنہ ۱۸۸۳ء سے قانونی امتحان میں کلکتہ یونیورسٹی کے ساتھ، اور اسی طرح سائنس اور آرٹس کی اعلیٰ تعلیم میں اور نیز قانونی تعلیم میں الہ آباد یونیورسٹی کے ساتھ الفلیٹ ہو گیا۔ جو ترقی گذشتہ ۲۳ سال میں تعلیم و تربیت کے لحاظ سے اس کالج نے کی ہے اُس کے متعلق مفصل حالات کالج کی سالانہ

رپورٹوں سے معلوم ہو سکتے ہیں۔ یہاں ہم صرف اس قدر دکھانا چاہتے ہیں کہ اس کالج کی بدولت صوبہ شمال مغرب و اودھ کے[1] مسلمان گریجوٹس کی تعداد میں بمقابلہ ہندو گریجوٹس کے کس قدر اضافہ ہوا ہے۔

سنہ ۱۸۹۲ء میں جو لکچر آنریبل سید محمود نے ایجوکیشنل کانفرنس میں بمقام علیگڑھ دیا تھا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صوبہ مذکور کے سوا ہندوستان کے ہر ایک صوبہ میں سنہ مذکور تک مسلمان گریجوٹس کی تعداد بمقابلہ ہندو گریجوٹس کے اس قدر گھٹی ہوئی تھی کہ اس کو صفر سے زیادہ وقعت نہیں دی جا سکتی۔ مثلاً بنگال میں جہاں مردم شماری کے لحاظ سے مسلمان گریجوٹس فیصدی ۹ء۵۲ ہونے چاہئیں وہاں اُن کی تعداد ۳ء۴ سے زیادہ نہیں نکلی اسی طرح مدراس میں بجائے ۸ء۶ کے صرف ۹ء۱ اور بمبئی میں بجائے ۵ء۱۲ کے ۲ء۱ اور پنجاب میں بجائے ۹ء۵۱ کے ۲ء۵ فیصدی برآمد ہوئی تھی۔ برخلاف اضلاع شمال مغرب و اودھ کے جہاں نسبتہً مسلمان گریجوٹس کی تعداد ۲ء۱۱ ہونی چاہیے تھی لیکن معلوم ہوا کہ سنہ مذکور تک اُن کی تعداد ۶ء۱۷ تھی۔ اس سے صاف پایا جاتا ہے کہ محمڈن کالج نے قطع نظر اور فوائد کے جن کا ذکر دوسرے حصہ میں کیا جائے گا خاصکر ترقی تعلیم کے لحاظ سے بھی مسلمانوں کو اس قلیل عرصہ میں کچھ کم فائدہ نہیں پہنچایا۔

معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت سرسید کو مسلمانوں میں انگریزی تعلیم پھیلانے کا خیال پیدا ہوا اُسی وقت سے اُنکو اس بات کی فکر تھی کہ جس طرح دنیوی عزت کے لیے مسلمانوں کو تعلیم کی طرف مائل کرنا ضرور ہے اسی طرح یہ بھی ضرور ہے کہ اُن کو تعلیم کے اُن مضر نتائج سے جو مذہب کے حق میں اُس سے پیدا ہوتے نظر آتے ہیں جہاں تک ممکن ہو بچایا جائے۔ وہ دیکھتے تھے کہ جو لوگ انگریزی تعلیم پاتے ہیں خواہ ہندو ہوں، خواہ مسلمان اور خواہ عیسائی۔ اُن کے دل میں مستثنے صورتوں کے سوا عموماً مذہب کی وقعت باقی نہیں رہتی۔ وہ مذہب کی کوئی بات جو بظاہر یا فی الحقیقۃ عقل یا قانون قدرت کے خلاف ہو اُس کو تسلیم نہیں کرتے۔ وہ ریاضی اور علم طبیعی کی ممارست سے مذہبی باتوں کا بھی ویسا ہی ثبوت چاہنے لگتے ہیں جیسا ریاضی اور سائنس کے ہر ایک مسئلہ پر اُن کو ملتا رہا ہے۔ اُن کے عقیدے نبوت اور معاد بلکہ الوہیت کی طرف سے بھی متزلزل ہو جاتے ہیں اور مذہبی احکام کا استخفاف اُن کے دلوں میں بیٹھ جاتا ہے۔ اُن کو معلوم تھا کہ مغربی علوم اور مغربی لٹریچر کی بدولت اکثر ممالک یوروپ میں روز بروز

[1] صوبہ شمال مغرب و اودھ کے گریجوٹس سے وہ لوگ مراد ہیں جنہوں نے اُس صوبہ کے کسی کالج میں تعلیم پاکر یونیورسٹی کی ڈگری حاصل کی ہو نہ صرف وہ گریجوٹ جو خاص صوبہ مذکور کے باشندے ہوں کیونکہ اُن میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جنھوں نے پنجاب سے آکر محمڈن کالج میں تعلیم پائی اور کسی یونیورسٹی کی ڈگری حاصل کی ہے ۱۲

دہریت اور الحاد پھیلتا جاتا ہے اور عیسائی مذہب مضمحل ہوتا جاتا ہے۔ اسی لیے اُن کو اندیشہ تھا کہ انگریزی تعلیم سے جس کو وہ قوم میں پھیلانا چاہتے ہیں کہیں ویسے ہی مضر نتائج اسلام کے حق میں بھی نہ پیدا ہوں جیسے یورپ میں عیسائی مذہب کے حق میں پیدا ہوئے ہیں۔ چنانچہ ۱۸۷۷ء میں کہ یہی زمانہ اُن کی تفسیر شروع کرنے کا معلوم ہوتا ہے اُنھوں نے ایک اسپیچ میں خاصکر مدرسۃ العلوم کے طالب علموں کی طرف مخاطب ہو کر کہا تھا کہ "یاد رکھو سب سے سچا کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہے۔ اسی پر یقین کرنے سے ہماری قوم ہماری قوم ہے۔ اگر تم نے سب کچھ کیا اور اس پر یقین نہ کیا تو تم ہماری قوم نہ رہے۔ پھر اگر تم آسمان کے تارے ہو گئے تو کیا؟ پس اُمید ہے کہ تم ان دونوں باتوں (یعنی علم اور اسلام) کے نمونے ہوگے۔ اور جبھی ہماری قوم کو عزت ہو گی۔"

لیکن باوجود اس اندیشہ کے وہ مغربی تعلیم کو مسلمانوں کے لیے نہایت ضروری اور ناگزیر جانتے تھے اور اسی کے ساتھ جیسا کہ اُنھوں نے اپنی اکثر تحریروں اور اسپیچوں میں ظاہر کیا ہے اُن کو یہ بھی یقین تھا کہ خالص اسلام جسکو وہ ہمیشہ ٹھیٹ اسلام سے تعبیر کرتے تھے۔ اُس کو انگریزی تعلیم سے وہ صدمہ ہرگز نہیں پہنچ سکتا جو یورپ میں عیسائی مذہب کو پہنچا ہے اُنکا ہمیشہ یہ قول رہا ہے کہ جو لوگ مغربی تعلیم یا مغربی علوم کو اسلام کے حق میں خطرناک تصور کرتے ہیں۔ اور اسلیے مسلمانوں میں اُنکا پھیلنا نہیں چاہتے۔ وہ درحقیقت اسلام کو بہت بودا اور کمزور مذہب خیال کرتے ہیں جو علم و حکمت کے مقابلہ کی تاب نہیں لا سکتا اُنھوں نے ایک موقع پر کہا تھا کہ "اگر یہ حکمت فلسفہ جو اس زمانہ میں سچا مانا جاتا ہے اگر آیندہ غلط ثابت ہو جیسے کہ یونانی حکمت اب ثابت ہوئی ہے اور حکمت و فلسفہ کے بالکل نئے اصول سچے ثابت ہوں تو بھی میں دعوی کرتا ہوں کہ قرآن مجید ایسا ہی سچا ثابت ہوگا جیسا کہ اب سچا ہے، اور غور کرنے کے بعد ثابت ہوگا کہ جو کچھ غلطی تھی وہ ہمارے ہی علم کا نقصان تھا مگر قرآن ویسا ہی سچا تھا" البتہ وہ یہ ضرور کہتے تھے کہ جس مجموعۂ مسائل و احکام و اعتقادات وغیرہ پر فی زمانا اسلام کا لفظ اطلاق کیا جاتا ہے وہ یقیناً مغربی علوم کے مقابلہ میں قائم نہیں رہ سکتا۔

الغرض اُن کو مدت سے یہ خیال تھا کہ انگریزی تعلیم سے اسلام کے حق میں جن مضر نتائج کے پیدا ہونے کا اندیشہ ہے اُن کا انسداد کیا جائے۔ لیکن جو طریقہ استدلال کا زمانہ گذشتہ میں یونانی فلسفہ کے مقابلہ کے لیے ہمارے علمائے متکلمین نے اختیار کیا تھا اور جس سے رفتہ رفتہ ایک نیا فلسفہ بنام علم کلام کے پیدا ہو گیا وہ کسی طرح فلسفۂ حال کے مقابلہ میں کچھ کام نہیں دیسکتا تھا۔ کیونکہ برخلاف یونانی فلسفہ کے جس کا مدار محض قیاس اور ظن و تخمین پر تھا۔ فلسفۂ حال کا ہر ایک مسئلہ تجربہ اور مشاہدہ سے ثابت کیا جاتا ہے۔ پس ضرور تھا کہ جس طرح مسائل حکمیہ کے ثبوت کا طریقہ بدل گیا ہے اُسی طرح اُس کے مقابلہ کے لیے ایک نئے علم کلام کی بنیاد ڈالی جائے۔

ہمارے علما جو فلسفۂ قدیم اور علوم دینیہ میں تمام قوم کے نزدیک مسلم الثبوت ہیں اور جن کا یہ منصب تھا کہ فلسفۂ جدیدہ کے مقابلہ میں اسلام کی حمایت کے لیے کھڑے ہوتے۔ اُن کو یہ بھی خبر نہ تھی کہ یونانی فلسفہ کے سوا کوئی اور فلسفہ اور عربی زبان کے سوا کوئی اور علمی زبان بھی دنیا میں موجود ہے۔ وہ اس بات سے بالکل بے خبر تھے کہ علوم جدیدہ نہ صرف کرسچینٹی یا صرف اسلام کی بلکہ تمام دنیا کے مذاہب کی جڑ کاٹ رہے ہیں۔ اور اگر بالفرض وہ اسلام کی حمایت کا کوئی نیا طریقہ مقتضائے وقت کے موافق اختیار کرنے کا ارادہ بھی کرتے تو ہرگز امید نہ تھی کہ وہ اپنے ارادہ میں کم و بیش کامیابی حاصل کر سکتے۔ اُن کو تقلید کی عادت نے ہرگز اس قابل نہیں رکھا کہ وہ قدما کی پیروی کے دائرہ سے قدم باہر رکھ سکیں، اور طعن و ملامت کے خوف اور مرجع خاص و عام بننے کی خواہش نے آزادی کا جوہر اُن طبیعتوں میں بالکل نہیں چھوڑا۔

بہرکیف سرسید کو اس طرف سے بالکل مایوسی تھی کہ ہمارے مسلم الثبوت علما اس ضروری کام کی طرف توجہ کریں گے۔ پس اُنھوں نے اس خیال سے کہ مسلمانوں میں انگریزی تعلیم پھیلانے کا باعث میں خود ہوا ہوں۔ اس کام کو اپنا ایک ضروری فرض سمجھ کر اپنے ذمہ لیا۔ اُنھوں نے اپنی ایک اسپیچ میں اس معاملہ کے متعلق اپنے تمام خیالات مفصل طور پر بیان کیے ہیں جن سے چند فقرے مختلف مقامات سے یہاں نقل کیے جاتے ہیں۔

اُنھوں نے کہا کہ "جو لوگ بلا فلسفی دلیل و حجت کے اسلام پر یقین رکھتے ہیں بلاشک اُنکا ایمان اور اُنکا یقین بہ نسبت اُن لوگوں کے جو دلیل و حجت سے اپنے عقیدہ کو مستحکم کرتے ہیں بہت زیادہ مستحکم ہے۔ کیونکہ اُن کے دل میں کسی قسم کے شک و شبہہ نے راہ نہیں پائی اور نہ راہ پانے کی اُس میں گنجایش ہے۔ ۔ ۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ اُن کے ایمان کو (میں اور کسی سے کیوں کہوں) اپنے ایمان سے تو بہت زیادہ مستحکم جانتا ہوں ۔ ۔ ۔ خدا کے ماننے اور رسول پر یقین کرنے کے لیے اُنکو کسی منطقی دلیل اور فلسفی برہان کی حاجت نہیں کیسی ہی کوئی بات خارج از عقل و ناقابل یقین صحیح یا غلط اُن کے سامنے یہ کہکر کہ خدا و رسول نے فرمایا ہے" بیان کیجائے۔ وہ فوراً اُس پر یقین کرینگے۔ پس ایسے لوگ ہماری بحث سے بالکل خارج ہیں۔ میں اُنکو یقین کا ستارہ اور اسلام پر یقین کرنے کا نمونہ سمجھتا ہوں اور ٹھیک مسلمان جانتا ہوں"

"مگر اُن کے سوا ایک اور فرقہ بھی ہے جو ہر چیز کی صداقت کے لیے دلیل چاہتا ہے اور اس بات کا خواہشمند ہے کہ اسلام کے عقائد فلسفی دلائل سے اسکو بتائے جائیں اور اُس کے دل کے شبہے مٹائے جائیں تاکہ اُس کے دل کو تشفی ہو ۔ ۔ ۔ وہ یہ نہیں چاہتا کہ دل میں تو دھکڑ پکڑ ہو اور وہ زبان سے لوگوں کے ڈر یا سوسائٹی کے دباؤ سے ہاں ہاں کرے یہی وہ لوگ ہیں جو ہمارے مخاطب ہیں اور جنسے ہمکو بحث ہے"

"جس زمانہ میں خلفاے عباسیہ کی سلطنت رونق پر تھی ۔ ۔ ۔ اُس وقت مسلمانوں میں فلسفہ یونانی اور علم طبیعی نے کثرت سے رواج پایا تھا۔ اُس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے مسائل میں جو اسلام سے متعلق تھے لوگوں کو

شبہ پیدا ہوا ہے کیونکہ جو لوگ اُن مسائل فلسفہ و علم طبیعی کو سچ جانتے تھے اور اُن میں اور اسلام کے مسائل میں اختلاف پاتے تھے انکو اسلام کی نسبت شبہہ پیدا ہوتا تھا۔۔۔ وہ زمانہ اسلام پر ایسا سخت تھا کہ اسلام کے سخت سے سخت دشمن کے حملہ سے بھی اس سے زیادہ نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہ تھا۔ علما کو اُس وقت اسلام کی حمایت کی ضرورت پڑی اور انھوں نے اُس کی حمایت اور نصرت میں کوشش کی۔ خدا اُنکی کوششوں کو قبول کرے۔۔۔ پس میرا یہ خیال ہو کہ جس زمانہ میں اسلام کی ایسی حالت ہوا اور اُس پر ایسا ہی حملہ ہو جیسا کہ اُس زمانہ میں ہوا تھا تو ہم کو بقدر اپنی لیاقت کے ویسی ہی کوشش کرنی چاہیے۔"

"اے دوستو تم خوب جانتے ہو کہ اس زمانہ میں جدید فلسفہ و حکمت نے شیوع پایا ہو جس کے مسائل اُن اگلے مسائل سے بالکل مختلف ہیں اور وہ مروجہ مسائل اسلام کے ایسے ہی برخلاف ہیں جیسے کہ اُس زمانہ میں تھے۔۔۔ مگر اس زمانہ کی تحقیقات اور یونانی حکمت کے مسائل میں ایک بڑا فرق یہ ہے کہ اُس زمانہ کے مسائل حکمیہ زیادہ تر عقلی اور قیاسی دلیلوں پر مبنی تھے۔۔۔ ہمارے بزرگوں کو نہایت آسانی تھی کہ قیاسی مسائل کو قیاسی دلائل سے اور عقلی مسائل کو عقلی براہین سے توڑ دیں اور اُن کو تسلیم نہ کریں۔ مگر اس زمانہ میں۔۔۔ مسائل علم طبیعی تجربہ سے ثابت کیے جاتے ہیں اور وہ دکھلا دیئے جاتے ہیں۔ یہ مسائل ایسے نہیں ہیں کہ قیاسی دلائل سے اُٹھا دیئے جائیں یا اُن تقریروں اور اصولوں سے جو اگلے زمانہ کے عالموں نے قرار دیئے ہیں ہم اُن کا مقابلہ کر سکیں۔"

"اس لیے اس زمانہ میں۔۔۔ ایک جدید علم کلام کی حاجت ہو جس سے یا تو ہم علوم جدیدہ کے مسائل کو باطل کر دیں، یا مشتبہ ٹھیرا دیں، یا اسلامی مسائل کو اُن سے مطابق کر دکھائیں۔ اس وقت جو بزرگ اس جلسہ میں موجود ہیں میں اُن سب سے واقف نہیں ہوں مگر میں یقین کرتا ہوں کہ یہاں بہت سے ذی علم لوگ بھی موجود ہیں۔ میں سچ کہتا ہوں کہ میرے نزدیک جو لوگ ایسا کرنے کے لائق ہیں اور وہ پوری کوشش حال کے علم طبیعی و فلسفہ کے مسائل کو اسلامی مسائل سے تطبیق دینے یا اُنکا بطلان ثابت کرنے میں نہ کرینگے وہ سب گنہگار ہیں اور یقیناً گنہگار ہیں"

"میں ایک شخص ہوں جس کا یہ یقین ہے کہ کوئی شخص ایسا نہیں ہے جو جدید فلسفہ اور جدید علم طبیعی سے بخوبی واقف ہو اور اُن تمام اسلامی مسائل پر جو اس زمانہ میں اسلامی مسائل کہلاتے ہیں یقین رکھتا ہو۔ انگریزی خواں نوجوان مجھے معاف کرینگے۔ میں نے کوئی انگریزی خواں جس کو انگریزی علوم کا مذاق بھی حاصل ہو گیا ہو ایسا نہیں دیکھا جس کو پورا پورا یقین ہمارے زمانہ کے مروجہ مسائل اسلام پر ہو۔ میں یقین کرتا ہوں کہ جس قدر یہ علوم پھیلینگے۔ اور اِنکا پھیلنا ضروری ہے۔ اور میں خود بھی اُن کے پھیلانے میں معین و مددگار ہوں۔ اُسی قدر لوگوں کے دلوں میں مروجہ اسلام کی جانب سے بدظنی بے پروائی بلکہ روگردانی ہوتی جائیگی۔ میرا یہ بھی یقین ہے کہ اصلی مذہب کا یہ نقصان نہیں ہے بلکہ یہ اُن غلطیوں کا سبب ہے جو اسلام کے نورانی چہرہ پر لگ گئی ہیں یا نادانستہ لگا دی گئی ہیں"

"میں ہرگز اس لائق نہیں ہوں کہ اسلام کے نورانی چہرہ پر سے اُن غلطیوں کے سیاہ دھبوں کے چھڑانے کا

دعویٰ کروں یا حمایت اسلام کا کام اپنے ذمہ لوں۔ یہ منصب اور یہ فرض دوسرے مقدس و باعلم لوگوں کا ہے۔ مگر جب کہ میں مسلمانوں میں اُن علوم کے پھیلانے کا ساعی ہوں جنکی نسبت میں نے ابھی بیان کیا کہ وہ اسلام کے کیسقدر مخالف ہیں تو میرا فرض تھا کہ جہانتک مجھسے ہو سکے صحیح یا غلط جو کچھ میرے امکان میں ہو اُس طرح اسلام کی حمایت کروں اور اُس کے اصلی نورانی چہرہ کو لوگوں کو دکھلاؤں۔ میرا کانشنس مجھسے کہتا تھا کہ اگر میں ایسا نہ کرونگا تو خدا کے سامنے گنہگار ہوں گا"

"اے میرے دوستو میں یہ نہیں کہتا کہ جو کچھ میری تحقیقات ہے وہی صحیح ہے مگر جب مجھکو۔ بجز اس کے کہ جو کچھ مجھ سے ہو سکے وہ کروں۔ اور کچھ چارہ نہ تھا تو مجھکو ضرور وہی کرنا تھا جو میں نے کیا یا کرتا ہوں۔ میری نیت خالص خدا کے ساتھ ہے؛ اگر میں نے بُرا کیا ہے وہ چاہے گا معاف کریگا چاہے گا نہ کرے گا۔ اگر میں نے اچھا کیا ہے تو میں اُس کا صلہ کسی بندے سے نہیں چاہتا اور یہی وجہ ہے کہ نہ میں لوگوں کے کافر یا نیچری کہنے سے ڈرتا ہوں نہ بُرا مانتا ہوں۔ جو لوگ میری ان کوششوں کے سبب بُرا کہتے ہیں کافر بتلاتے ہیں میں اُن سے اپنی شفاعت کا خواستگار نہیں ہوں اور نہ ہونگا۔ جو بھلا یا بُرا میرا معاملہ ہے وہ خدا کے ساتھ ہے۔ اگر مجھسے کچھ غلطی ہوئی ہے یا آیندہ ہوگی خدا سے مجھے اُمید ہے کہ وہ مجھپر رحم کریگا"

الغرض سرسید نے مذکورۂ بالا مقصد کے پورا کرنے کے لیے اول اسلام کی سچائی ثابت کرنے کا ایک ایسا معیار قرار دیا جو ہر مذہب کی سچائی دریافت کرنے کا پیمانہ قرار پا سکے؛ یعنی یہ کہ اُس میں کوئی بات قانون فطرت کے برخلاف نہو۔ کیونکہ قانون فطرت درحقیقت خدا کا فعل ہے اور جو مذہب فی الواقع خدا کا بھیجا ہوا ہوگا وہ خدا کا قول ہوگا؛ پس اُس کے فعل اور اُس کے قول میں مطابقت ہونی ضرور ہے۔

اس کے بعد اُنھوں نے اس امر پر غور کی کہ اسلام جسکی نسبت ہمارا دعویٰ ہے کہ اُس میں کوئی بات علم و حکمت و صداقت کے برخلاف نہیں اور وہ بالکل قانون فطرت کے مطابق ہے اُس سے کیا مراد ہے؟ اور اُسکی حد کیا ہے؟ اور اُس کے ثبوت کی بابت ہم کہانتک ذمہ دار ہو سکتے ہیں؟ اس امر کے متعلق اُنھوں نے قطعی فیصلہ کر لیا کہ اسلام کے متعارف مجموعہ میں سے وہ حصہ جسکو تمام مسلمان ملہم من عند اللہ سمجھتے ہیں اور جس کی نسبت یقین رکھتے ہیں کہ وہ جس طرح خدا کی طرف سے نبی آخرالزماں کے دل میں القا ہوا ہے اُسی طرح بے کم و کاست نبی سے ہاتھوں ہاتھ ہم تک پہنچا ہے۔ صرف وہی حصہ اس بات کا استحقاق رکھتا ہے کہ اُسمیں جو بات مسائل فلسفہ و حکمت کے خلاف معلوم ہو اُس میں اور مسائل حکمت میں تطبیق کی جائے یا مسائل حکمیہ کی غلطی ثابت کی جائے۔ پس اُنھوں نے جیسا کہ حضرت عمرؓ سے منقول ہے کہ حَسْبُنَا كِتَابُ اللّٰهِ اپنے جدید علم کلام کا موضوع اور اسلام کا حقیقی مصداق محض قرآن مجید کو قرار دیا؛ اور اُس کے سوا

تمام مجموعہ احادیث کو اس دلیل سے کہ اُن میں کوئی حدیث مثل قرآن کے قطعی الثبوت نہیں ہے اور تمام علما و مفسرین کے اقوال و آرا اور تمام فقہا و مجتہدین کے قیاسات و اجتہادات کو اس بنا پر کہ انکے جوابدہ خود علما و مفسرین اور فقہا و مجتہدین ہیں نہ اسلام۔ اپنی بحث سے خارج کر دیا۔

یہ دونوں اصول ملحوظ رکھکر سرسید نے قرآن مجید کی تفسیر لکھنے کا مصمم ارادہ کرلیا۔ اول اول جب تک کہ تہذیب الاخلاق جاری رہا کبھی کبھی بلا لحاظ ترتیب کے وہ متفرق آیتوں کی تفسیریں بطور آرٹکل کے تہذیب الاخلاق میں چھاپتے رہے، مگر جب تہذیب الاخلاق کا پرچہ پہلی دفعہ بند ہوگیا اور سرسید سرکاری خدمات سے سبکدوش ہوکر بنارس سے علیگڑھ چلے آئے تو اُنہوں نے ابتدا سے قرآن مجید کی تفسیر ترتیب وار لکھنی شروع کی اور اُس وقت سے اخیر دم تک جب کبھی اُن کو اور کاموں سے فرصت ملی برابر اُس کے لکھنے میں مصروف رہے اور قریب دو خمس کے تفسیر لکھی باقی تھی کہ پیغام اجل پہنچا۔

جس اصول پر سرسید نے یہ تفسیر لکھنی شروع کی تھی یہ ایک ایسا مشکل کام تھا کہ اگر کوئی اور شخص ایسا کام شروع کرتا تو چند روز بعد اُس کا خیال بالکل چھوڑ دیتا۔ یہ کہدینا تو بہت آسان ہے کہ اسلام میں کوئی بات قانون فطرت کے خلاف نہیں ہے مگر اُس کی تمام جزئیات کو قانون فطرت پر منطبق کرنا خصوصاً اُس حالت میں جبکہ سلف کی تصنیفات میں کوئی ایسا نمونہ موجود نہ ہو نہایت مشکل کام تھا۔ باوجود اسکے سرسید نے کبھی ہمت نہیں ہاری اور باوصف سخت مخالفتوں کے جو قوم کی طرف سے ہوئیں۔ اور باوجود اُن بے شمار مشکلات کے جو تفسیر لکھتے وقت اُن کو پیش آتی تھیں نہایت استقلال کے ساتھ اس کام کو اپنے مذہبی فرائض میں سب سے زیادہ اہم اور ضروری فرض سمجھکر انجام دیتے رہے۔

اس تفسیر کے مضامین پر ہم دوسرے حصہ میں بحث کرینگے یہاں صرف اس قدر لکھا جاتا ہے کہ اگرچہ سرسید نے اس تفسیر میں جا بجا ٹھوکریں کھائی ہیں اور بعض بعض مقامات پر اُن سے نہایت رکیک لغزشیں ہوئی ہیں باینہمہ اس تفسیر کو ہم اُنکی مذہبی خدمات میں ایک نہایت جلیل القدر خدمت سمجھتے ہیں جس سے اسلام کی محبت اور ہمدردی

---

[1] سرسید کا دعویٰ اسلام کی حمایت کے موقع پر صرف اسقدر ہے کہ کوئی اعتراض سائنس کی رو سے قرآن مجید پر وارد نہیں ہوسکتا؛ اس لیے اُنہوں نے اپنی بحث کا موضوع محض قرآن مجید کو قرار دیا ہے۔ اور مجموعہ احادیث وغیرہ کو اس بحث سے الگ رکھا ہے۔ لیکن جو لوگ مذہب اسلام کا اطلاق مجموعۂ کتاب و سنت و اجماع و قیاس پر کرتے ہیں اُن کو اسلام کی حمایت کے لیے ضرور ہے کہ وہ اس تمام مجموعہ کو سائنس کے حملے سے بچائیں؛ عام اس سے کہ اُسکو سائنس کے مسائل پر منطبق کریں؛ یا اُس کے مقابلہ میں سائنس کے مسائل کا بطلان ثابت کریں یا اُن کو غیر محقق ٹھہرائیں ۱۲

کے علاوہ اُنکی لٹریری لیاقت کا ایک حیرت انگیز کرشمہ ظاہر ہوتا ہے۔

اس تفسیر کے برخلاف اکثر مولویوں نے تفسیریں لکھی ہیں جنمیں تفسیر حقانی سب سے زیادہ مشہور ہے مگر اُنکے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُنکے لکھنے والوں میں سے ایک شخص بھی یہ نہیں سمجھا کہ سید احمد خاں نے کس غرض سے یہ تفسیر لکھی ہے اور کس بنا پر اُنہوں نے اکثر جگہ تمام مفسرین سے اختلاف کیا ہے جس طرح بعضے چالاک وکیل کسی حیلہ سے جج کو فریق مخالف پر افروختہ کرکے اپنا کام نکال لیتے ہیں اسی طرح ان مولویوں نے اپنی تفسیروں کے خریدار پیدا کرنے کا یہ گُر نکالا ہے کہ سرسید کو کہیں شیطان کا منکر، کہیں فرشتوں کا منکر، کہیں معجزات کا منکر، کہیں نبوت کا منکر، کہیں جنت و دوزخ کا منکر قرار دیکر مسلمانوں کو اُن سے اور اوران کی تفسیر سے نہایت بدگمان اور متنفر کر دیا ہے۔ اگر یہ لوگ فی الواقع حمایت اسلام کی نظر سے سرسید کی تفسیر کا جواب لکھتے تو اُنکو سب سے پہلے اس بات کا فیصلہ کرنا چاہیئے تھا کہ انگریزی تعلیم مذہب کے حق میں فی الواقع کوئی خطرہ کی چیز ہے یا نہیں اور اگر ہے تو آیا اُسکا علاج یہ ہے کہ انگریزی تعلیم کو قوم میں رواج نہ دیا جائے یا یہ کہ تعلیم سے جو شبہات اسلام کے حق میں پیدا ہوتے نظر آتے ہیں اُن کا جہانتک ممکن ہو استیصال کیا جائے۔ اسکے بعد اُن کو یہ دیکھنا چاہیئے تھا کہ سرسید نے جو طریقہ شبہات کے استیصال کرنیکا اختیار کیا ہے وہ ٹھیک ہے یا نہیں اگر ٹھیک ہے تو اُنہوں نے کہانتک قرآن کی تفسیر اُس طریقہ کے موافق کی ہے اور کہاں کہاں اُس سے انحراف کیا ہے اور اگر وہ طریقہ ٹھیک نہیں ہے تو پھر کونسا طریقہ ہے جسکو اس مقصد کے لیئے اختیار کرنا چاہیئے اور کس طرح اُس طریقہ سے اُن شبہات کا جو علوم جدیدہ کے تعلیم یافتہ گروہ کے دل میں پیدا ہوتے ہیں استیصال کیا جائے۔ مگر افسوس ہے کہ اُنہوں نے مراتب مذکورہ بالا میں سے ایک بات کا بھی اپنی تفسیروں میں لحاظ نہیں کیا بلکہ اپنی تمام ہمت اسبات میں صرف کی ہے کہ سرسید کی نسبت لوگوں کے تعصبات کو اور زیادہ بھڑکائیں تاکہ اُنکی تفسیروں کی زیادہ قدر ہو اور اُن کو لوگ بہت بڑا حامی دین اسلام سمجھیں۔

لطیفہ ایک شخص نے سرسید کو اس مضمون کا خط لکھا کہ "میں بہت کثیر العیال ہوں اور معاش کی طرف سے تنگ رہتا ہوں۔ آپ کسی ریاست میں یا سرکار انگریزی میں میری نوکری کے لیے سفارش کر دیجئے۔ میں نے انگریزی کی تعلیم تو نہیں پائی مگر عربی کی کتب درسیہ پڑھی ہیں۔ جو کام آپ میرے لائق سمجھیں اُسکے واسطے سفارش کر دیں۔" سرسید نے اُنکو لکھ بھیجا کہ "میری عادت کسی کی سفارش کی نہیں ہے اور وجہ معاش کی تدبیر میرے نزدیک اس سے بہتر نہیں ہے کہ آپ میری تفسیر کا رد لکھکر چھپوائیں خدا چاہے تو خوب بکیگی اور آپ کو تنگی معاش کی شکایت نہیں رہیگی۔"

چھٹا باب

۱۸۷۸ء سے ۱۸۹۸ء تک

وائسرائے کی کونسل کی ممبری، ایجوکیشن کمیشن میں شہادت، محمڈن سول سروس فنڈ ایسوسی ایشن محمڈن ایسوسی ایشن علیگڈھ، محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس، پبلک سروس کی ممبری، انڈین نیشنل کانگریس کی مخالفت، پیٹریاٹک ایسوسی ایشن کے سی ایس آئی کا تمغہ ملنا، ایل ایل ڈی کی ڈگری، ٹرسٹی بل پر اختلافات، کالج کے روپیہ کا غبن ہونا، سرسید کی وفات

۱۸۷۸ء میں سرسید کو لارڈ لٹن نے ویسریگل لیجسلیٹو کونسل کا ممبر مقرر کیا، اور اُنکے بعد دوسری دفعہ لارڈ رپن نے اُن کو ممبری کونسل کے لیئے انتخاب کیا۔ قانونی کونسل میں ہندوستانیوں کے شریک کرنے کی تحریک جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے سب سے اول سرسید ہی نے کی تھی، انہوں نے اپنے رسالہ رسالہ اسباب بغاوت میں سب سے بڑا سبب بغاوت کا کونسل میں ہندوستانیوں کی بھرتی نہ ہونے اور انتظام سلطنت سے بالکل بیخبر رہنے کو قرار دیا تھا۔ پس جس عزت و امتیاز کا دروازہ انہوں نے اپنے ہموطنوں کے لیئے کھولا تھا اُس کا استحقاق فی الواقع سرسید سے زیادہ کوئی نہیں رکھتا تھا۔ بمبئی گزٹ میں اُنکے انتخاب کی نسبت یہ ریمارک کیا گیا تھا کہ "گورنمنٹ اُن نقصوں کے پورا کرنے سے جو سید احمد خاں نے (اسباب بغاوت میں) ظاہر کیئے تھے غافل نہیں تھی، خود اُسکو لارڈ لٹن اور لارڈ رپن کا ممبری کے لیئے منتخب اور نامزد کرنا اسبات کی عمدہ ضمانت ہے کہ گورنمنٹ اپنی رعایا کے ایک عمدہ حصہ کی ضروریات اور خواہشات سے آگاہ ہو"

ہندوستانیوں میں سرسید پہلے شخص ہیں جنہوں نے ممبری کونسل کے زمانہ ہندوستانیوں کی بھلائی کے لیئے قانون بنایا۔ وہ چار برس متصل ویسریگل کونسل کے ممبر رہے: اس عرصہ میں اُنہوں نے دو مسودے کونسل میں پیش کیئے، چیچک کے ٹیکے کا قانون اور قاضیوں کے تقرر کا قانون۔ یہ دونوں مسودے پاس ہوگئے، اور اُسوقت سے آجتک اُنکے موافق ہندوستان کے اکثر حصوں میں عمل درآمد چلا آتا ہے۔

چیچک کے ٹیکے کا قانون جسکا مسودہ ستمبر ۱۸۷۹ء میں پیش ہوا۔ اس غرض بنایا گیا تھا کہ ٹیکے کا قاعدہ اضلاع شمال و مغرب، اودہ، ممالک متوسط، برٹش برہما، آسام، اجمیر اور کرگ میں، اور نیز فوجی چھاونیوں میں لازمی کردیا جائے۔ چونکہ ایسا جبری قانون جاری کرنیسے رعایا کی شخصی آزادی میں

ایک نوع کی مداخلت کرنی پائی جاتی تھی اسلیئے سرسید نے مسودہ پیش کرتے وقت جو اُسپر ایک ریمارک کیا تھا، اُس میں اس قانون کے جاری کرنیکی ضرورت بہت خوبی سے ثابت کی ہے کہ "شخصی آزادی کی حمایت اُس مضرت کو جائز نہیں رکھ سکتی جو مرض چیچک کے متعدی ہونے سے اور دنکو پہنچتی ہے - اور نیز چیچک کا ضرر بالخصوص اُن بے گناہ بچوں کو پہنچتا ہے جو اپنی جانوں کی خود حفاظت نہیں کرسکتے - پس ٹیکے کے لازمی کر دینے سے جسطرح بڑی عمر کے آدمی ہمسایوں کی جہالت یا بے پروائی کے مضر نتائج سے محفوظ رہینگے، اسی طرح معصوم بچوں کی جانوں کی حفاظت اُنکے والدین کی بیوقوفی کے نتائج سے عمل میں آویگی" پھر یہ بھی ثابت کیا ہے کہ "جسطرح پہلے زمانہ میں لوگ عموماً ٹیکے سے ڈرتے تھے اب ایسا حال نہیں رہا، اس ملک میں ایک بہت بڑی جماعت تعلیم یافتہ لوگوں کی ایسی موجود ہو گئی ہے جو ٹیکے کا لازمی ہونا پسند کرتے ہیں"

مع ذلک ٹیکا لگانے کے قواعد میں جہانتک کہ ممکن تھا ہر طرح کی آسانی اور نرمی کا لحاظ رکھا ہے، اولاً لوکل گورنمنٹوں کو اُسمیں اختیار دیا گیا ہے کہ جن میونسپلٹی سے مناسب سمجھیں اسکو متعلق کریں۔ اسکے سوا ٹیکا لگوانے والوں کو اور بہت طرح سے آسانیاں دی گئی ہیں، مثلاً یہ کہ بچوں کے مکانوں پر جا کے ٹیکا لگایا جائے میونسپل کمشنروں میں سے کوئی ممبر خود جا کے اپنے سامنے ٹیکا لگوائے، پولیس کی دست اندازی جہانتک ممکن ہو نہ ہونے پائے، اطفال غیر محفوظ کی تحقیقات اور اُنکے رجسٹر کی ترتیب میونسپل کمشنروں اور سپرنٹنڈنٹ ویکسینیٹروں سے متعلق رہے تاکہ بچوں اور اُنکے مربیوں کو مجسٹریٹ کے روبرو جبراً حاضر کرانے کی ضرورت نہ رہے، کسی بچے کے بازو سے مادہ نہ لیا جائے بلکہ جہانتک ممکن ہو حیوانی مادہ سے ٹیکا لگایا جائے اور قانون کی خلاف ورزی کی سزائیں صرف جرمانہ پر محدود رہیں۔

باوجود ان سب باتوں کے یہ بل اختلاف رائے سے محفوظ نہیں رہ سکا، خصوصاً نواب لفٹنٹ گورنر پنجاب اسکے سخت مخالف تھے، مگر کونسل کے اکثر لیجسلیٹو ممبر اُس سے اتفاق رکھتے تھے - آخر ایک آدھ دفعہ کی جزوی ترمیم کے بعد ۱۸۸۰ء میں پاس ہو گیا۔

قاضیوں کے تقرر کا قانون بھی ۱۸۸۰ء میں کسیقدر اختلاف کے بعد کثرت رائے سے پاس ہو گیا - اس قانون کے بنانے کا منشا یہ تھا کہ گو عہدہ قضا کی وہ حیثیت جو اہل اسلام کے عہد میں ایک جج یا مجسٹریٹ کے برابر تھی انگریزی عملداری میں باقی نہ رہی تھی، مگر پھر بھی انگلش گورنمنٹ نے اپنے عہد حکومت میں اس عہدہ کو بالکل موقوف نہیں کر دیا تھا بلکہ بعض قوانین کے ذریعہ سے جو ۱۷۹۳ء سے ۱۸۶۴ء تک وقتاً فوقتاً جاری ہوتے رہے بنگالہ، اڑیسہ، بہار، بمبئی اور مدراس میں ایک عدالتی اختیارات کے سوا باقی تمام کام جو قاضیوں سے متعلق چلے آتے تھے قائم رکھے تھے، جیسے دستاویزات کا تیار اور تصدیق کرنا، نکاح خوانی اور

طلاق کی مجلسوں میں صدر نشین ہونا، انواع واقسام کے آداب رسومات مذہبی کا انجام دینا، قرق شدہ جائداد کے نیلام کی دیدبانی، زرِ خیرات و پنشن و وظائف کا تقسیم کرنا وغیرہ وغیرہ۔ پھر رفتہ رفتہ حسب مقتضائے وقت اُن کی خدمات محدود ہوتی گئیں، یہانتک کہ ۱۸۶۴ء میں جملہ قوانین جو قاضیوں کے تقرر اور اُنکے کاموں سے متعلق تھے منسوخ کئے گئے۔ اور یہ قرار پایا کہ قاضیوں کا تقرر بذریعۂ گورنمنٹ کے عمل میں آنا قرین مصلحت نہیں ہے، اور قاضیونکو اجازت دی گئی کہ جسوقت لوگ اُن سے کسی رسم مذہبی وغیرہ کے انجام دینے کے خواستگار ہوں تو وہ بطور خود اُسکو انجام دیں۔

مگر جس طبقہ کے لوگوں کو ایسے کاموں کے لیئے قاضیوں کو ضرورت ہوتی تھی اُنکے ذریعہ سے عموماً اور مسلمانانِ صوبۂ مدراس کے ذریعہ سے خصوصاً بارہا گورنمنٹ کی اطلاع میں آچکا تھا کہ بغیر ایسے قاضیوں کے جو گورنمنٹ کی طرف سے مقرر ہوں لوگوں کے کاموں میں حرج واقع ہوتا ہے اسلئے سر سید نے یہ مسودہ تیار کیا، جسکا مقصد صرف اسقدر ہے کہ گورنمنٹ نے جو قاضیوں کے تقرر کا اختیار اپنے ہاتھ میں نہیں رکھا اس کو پھر اپنے ہاتھ میں لے، اور اول صوبۂ مدراس میں اُس کو نافذ کرے اور تمام لوکل گورنمنٹوں کو اختیار دے کہ جس صوبہ کے مسلمان اس قانون کو اپنے صوبہ میں جاری کرانا چاہیں وہاں اس قانون کو جاری کریں۔ اُمید ہے کہ جہاں جہاں یہ قانون جاری ہو چکا ہے یا آئندہ جاری ہوگا وہاں کے قدیم قاضیوں کے خاندان جو سرکاری عہدہ دار نہ ہونے کی وجہ سے ایک کس مپرسی حالت میں تھے اُن کی قدر و پرسش زیادہ ہونے لگیگی اور خاص خاص طبقوں کے مسلمانوں کو نکاح خوانی وغیرہ میں اُن سے مدد ملے گی۔

قانون وقف خاندانی

ان دونوں قانونوں کے علاوہ سر سید نے ممبری کونسل کے زمانہ میں ایک اور نہایت مفید خدمت اپنی قوم کی کرنی چاہی تھی، مگر افسوس ہے کہ بعض موانع کے سبب وہ تدبیر پوری نہ ہو سکی۔ اُنہوں نے ایک مسودہ قانون وقف خاندانی کے نام سے تیار کیا تھا جس سے مسلمان خاندانوں کو تباہی اور بربادی سے بچانا مقصود تھا۔ اُنہوں نے دیکھا کہ مسلمان خاندانوں کی حالت روز بروز تباہ و برباد ہوتی جاتی ہے، جو امیر اور ذی مقدور خاندان تھے اُنکی اولاد مفلس ہوتی جاتی ہے اور جنمیں ابھی کچھ جان باقی ہے دو تین پشتوں کے بعد اُنکی جائدادی اور ریاستیں بھی سب برباد اور چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم اور قرضہ میں فروخت ہو جائینگی، اسلیئے اُنکو یہ خیال پیدا ہوا کہ کوئی ایسی تدبیر کیجائے جس سے مسلمانوں کے معزز خاندان بنے رہیں اور اُن میں کچھ ایسے ذی مقدور اور رئیس دکھائی دیں جنسے مسلمانوں کی قوم کی عزت اور امتیاز قائم رہے۔

اول اُنھوں نے نہایت اور جانفشانی سے سُنّی اور شیعہ دونوں کی فقہی کتابوں سے اسکا ثبوت بہم پہنچایا کہ ہر شخص کو اختیار رہے کہ اپنی جائداد کو اپنے لیئے اور اپنے بعد اپنی اولاد اور اپنی نسل کے لیئے ہمیشہ کو وقف کرے جسکی رو سے وہ جائداد نہ کبھی بیع ہو سکے اور وراثت میں تقسیم ہو سکے اور ہمیشہ قائم و برقرار رہے، پھر جہاں جہاں ہندوستان میں مسلمان رئیسوں نے اپنی جائدادیں اس طرح پر اپنے خاندان کے لیئے وقف کی تھیں اُن کی بہت سی مثالیں بہم پہنچائیں تاکہ مسلمانوں کے عمل درآمد سے مسئلہ شرعی کو اور زیادہ تقویت ہو۔ اسکے بعد اُنھوں نے دیکھا کہ جو لوگ خانگی طور پر بلا مداخلت سرکار اپنی جائدادیں اپنے خاندان کے لیئے وقف کرتے ہیں ایسے وقف سے کچھ فائدہ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اول تو یہ امید نہیں کہ وہ جانشینی کا ایسا قاعدہ کلیہ مقرر کر سکیں جس میں آخر کار خلشیں پیدا نہوں اور نزاع کا احتمال باقی نہ رہے۔ دوسرے اس صورت میں ہمیشہ وقف کے فرضی اور فریبی ہونے کا الزام لگا کر اُسکی منسوخی کے دعوے۔ جیسا کہ اکثر ہوتا رہتا ہے۔ عدالت میں دائر ہو سکتے ہیں۔ تیسرے چونکہ اکثر جائدادیں دیہات مالگذاری سرکار ہوتے ہیں اسلیئے جب کوئی نالائق متولی یا جانشین زر مالگذاری سرکار ادا نہیں کرتا تو امر شرعی یا قانونی اسباب کا مانع نہیں ہوتا کہ وہ جائداد بعلت باقی نیلام ہو جائے اسلیئے اُنھوں نے ضروری سمجھا کہ یہ مسئلہ شرعی بذریعہ ایک قانون کے گورنمنٹ کی منظوری سے استحکام پا جائے۔

اس غرض سے اُنھوں نے ایک مسودہ نہایت لیاقت کے ساتھ تیار کیا اور کونسل میں پیش کرنے سے پہلے وایسرائے سے پرائیوٹ طور پر اُسکے مشتہر کرنے اور مسلمانوں کی رائیں اُسکی نسبت دریافت کرنے کی اجازت لے کر تہذیب الاخلاق، علیگڈہ گزٹ اور دیگر اخبارات میں مشتہر کرایا۔ بہت سے مسلمانوں نے خطوں کے ذریعہ سے اُسکے ساتھ اتفاق ظاہر کیا، بعضے شہروں میں وہاں کے رئیسوں اور ممتاز لوگوں نے جلسے کیئے اور تجویز کو نہایت پسند کیا، بعض نہایت مستند عالموں نے وقف خاندانی کے مسئلہ کو تسلیم کیا اور اُسکے جواز پر فتوے لکھدیا مگر بہت سے مسلمانوں نے اور خاصکر مولوی ابوسعید عظیم آبادی اور اُنکے پیرووں نے سخت مخالفت کی۔ چنانچہ وقف خاندانی کے عدم جواز پر فتوے لکھے گئے اور گورنمنٹ میں اُسکے برخلاف عرضیاں اور میموریل بھیجی گئی۔

جس زمانہ میں اس مسودے کے برخلاف مولویوں کے فتوے شائع ہو رہے تھے کسی انصاف پسند مسلمان نے ان فتووں کے خلاف ایک آرٹکل لکھا تھا جس پہلا فقرہ یہ تھا "انگلستان کا ایک مصنف لکھتا ہے کہ جو شخص اپنے ملک یا اپنی قوم کا بدخواہ ہو اُسکی زیارت کرنی چاہیئے۔ کیونکہ وہ دُنیا میں ایک عجائب چیز ہے" ہم کہتے ہیں

کہ یہ مسنف چونکہ یورپ میں پیدا ہوا تھا اسلئے شاید اسنے عمر بھر میں کوئی قوم کا بدخواہ نہ دیکھا ہوگا۔ اور اسی لیئے وہ قوم کے بدخواہ کو ایک عجیب چیز سمجھا تھا۔ لیکن اگر وہ ہماری قوم میں پیدا ہوتا تو بجائے اس قول کے شاید یہ جملہ اُسکی زبان سے نکلتا کہ جو شخص مسلمان مولوی ہوکر اپنی قوم کا بدخواہ نہو اُس کی زیارت کرنی چاہیئے کیونکہ دُنیا میں کوئی چیز اُس سے زیادہ عجیب نہیں ہے۔"

بہرحال سرسید نے یہ تدبیر مسلمان رئیسوں کے لیئے نہایت عمدہ سوچی تھی مگر افسوس ہے کہ وہ اس مسودہ کو کونسل میں پیش نہ کرسکے، نہ اسلیئے کہ مسلمانوں نے اُسکی مخالفت کی تھی کیونکہ وہ قانون لازمی نہ تھا اور اُسکی پابندی محض مالک جائداد کی مرضی پر منحصر تھی۔ بلکہ اسلیئے کہ وہ اصول قانون کی رو سے پاس نہیں ہوسکتا تھا۔ بات یہ ہے کہ وہ قانون بالکل فریقین کی روایات فقہیہ کے مطابق بنایا گیا تھا۔ اور فقہ کی رو سے ضرور تھا کہ جو وقف اس طرح اولاد کے لیئے کیا جائے وہ وقف دوامی ہو نہ میعادی مگر ولایت کے مقننوں کی یہ رائے قطعی طور پر قرار پاچکی تھی کہ کسی جائداد کو ہمیشہ کے لیئے ناقابل انتقال بنا دینا۔ ملک کو نقصان پہنچانا ہے پس سرسید کے بعض دوستوں نے جو کونسل میں تھے اُنکو یہ صلاح دی کہ موجودہ صورت میں مسودہ قانون پیش کرنا عبث ہے۔ کیونکہ اُسکے منظور ہونے کی اُمید نہیں۔ ہاں اگر وقف کی کوئی میعاد مقرر کردیجائے جس سے جائداد ایک مدت معین تک ناقابل انتقال رہے اور اُسکے بعد موجودہ وارثوں میں تقسیم ہوجائے تو البتہ یہ قانون پاس ہوسکتا ہے لیکن چونکہ ایسے وقف کو میعادی قرار دینا شرعاً جائز نہ تہا اسلئے لاچار اُس سے دست بردار ہونا پڑا۔

سرسید نے ان تینوں مسودوں کے تیار کرنے کے سوا اور اکثر موقعوں پر جب تک کہ وہ کونسل میں ممبر رہے غیر معمولی لیاقت ظاہر کی ہے۔ باوجود انگریزی نہ جاننے کے ہر ایک اہم معاملہ پر جو کونسل میں پیش ہوتا تھا وہ گفتگو کرتے تھے اور اسلئے اُنکو تمام کاغذات جو اس معاملہ سے متعلق اور بالکل انگریزی میں ہوتے تھے سمجھنے پڑتے تھے اور اسطرح کافی اطلاع حاصل کرنے کے بعد وہ کونسل میں اسپیچ کرتے تھے اکثر چھوٹی چھوٹی اسپیچیں وہ اول خود اردو میں لکھکر اُن کا انگریزی میں ترجمہ کراتے تھے۔ اور پھر انگریزی الفاظ کو فارسی حرفوں میں لکھکر خود کونسل میں اسپیچ دیتے تھے اور بڑی بڑی اسپیچیں جو وہ تیار کرکے لیجاتے تھے اُنکو اکثر کونسل کا سکریٹری پڑھکر سُناتا تھا۔ اُنکی ایک اسپیچ پر جو فارسی حرفوں میں لکھکر دی تھی لارڈ لٹن نے بڑا تعجب ظاہر کیا تھا سرسید کہتے تھے کہ جب میں اجلاس ختم ہونے کے بعد کونسل کے ہال سے اپنے کمرے کی طرف جانے لگا تو لارڈ لٹن بھی پیچھے پیچھے چلے آئے اور مہربانی سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھکر کہنے لگے کہ میں نے ایسی قابلانہ اسپیچ کبھی نہیں سُنی تھی یہ اسپیچ غالباً مسودہ قانون مزارعان دکن پر تھی۔ جسکا انتخاب کرنل گراہم نے سرسید کی لائف میں چھاپ دیا ہے

ایک اور اسپیچ مسودہ قانونِ انتقال جائداد کی رپورٹ پیش ہونے پر سرسید نے ۲۰ جنوری ۱۸۷۸ء کو بل کی تائید میں کی تھی۔ اُس بل پر انگلشمین میں ایک لمبا آرٹکل چھپا تھا جسمیں سرسید کی اسپیچ کی نسبت لکھا تھا کہ "کسی ہندوستانی جنٹلمین نے ابتک اس مسئلہ کی تائید کہ ملک کا قانون کوڈیفکیشن (یعنی مجموعہ احکام بنانے) کا محتاج ہے اور اُسمیں کوڈیفکیشن کی گنجایش ہے۔ اور ملک کے دونوں فرقوں کی تاریخ اور لٹریچر ایک قومی ضرورت کی طرف بڑے استحکام کے ساتھ اشارہ کرتی ہے۔ ایسی صراحت کے ساتھ نہیں کی ہے جیسی کہ آنریبل سید احمد خاں نے کی ہے۔"

اسی طرح قانون حقوق استفادہ اور قانون ترمیم مجموعہ ضابطۂ فوجداری جو ہندوستان میں ہمیشہ یادگار رہیگا اور نیز دیگر قوانین پر اُنہوں نے بہت یادگار اسپیچیں کی ہیں۔ خصوصاً وہ اسپیچ جو قانون لوکل سلف گورنمنٹ متعلقہ اضلاع متوسط پر ۱۲ جنوری ۱۸۸۳ء کو لارڈ رپن کے زمانہ میں کی تھی وہ خاص توجہ کے لائق ہے۔ قانون مذکور میں جو کہ خاص اضلاع متوسط کے لیئے بنایا گیا تھا اس صوبہ کی حالت کے لحاظ سے لوکل بورڈوں میں دو ثلث ممبر الکشن سے اور ایک ثلث گورنمنٹ کے انتخاب سے مقرر ہونے تجویز کیے گئے تھے مگر لارڈ رپن کی پالسی سے اسبات کا یقین تھا کہ شمالی ہندوستان میں کل ممبر الکشن سے مقرر ہوا کرینگے۔ چونکہ سرسید کی راے اسکے برخلاف تھی اور اُن کو یہ امید نہ تھی کہ وہ اُسوقت تک جبکہ ان صوبوں کے لیئے قانون بنایا جائیگا کونسل میں ممبر رہینگے۔ اسلیئے انہوں نے اپنی اسپیچ میں نہایت مدلل طور پر بیان کیا ہے کہ تمام ہندوستان میں اسی اصول کے موافق دو ثلث ممبر الکشن سے اور ایک ثلث نومنیشن سے مقرر ہوا کریں۔ چنانچہ اُنہیں کی اسپیچ پر لارڈ رپن نے شمالی ہندوستان میں ایک ثلث ممبروں کا تقرر گورنمنٹ کے ہاتھ میں رکھا اور دو ثلث کے لیئے الکشن کا قاعدہ مقرر کیا۔

یہ اسپیچ سرسید کی اور اسپیچوں اور لکچروں کے ساتھ ایک مجموعہ میں چھپ گئی ہے۔ اسلیئے یہاں اُسکے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔ مگر اُسکے بعض فقرات ہم اُس موقع پر نقل کرینگے جہاں انڈین نیشنل کانگریس کی مخالفت کا مفصل ذکر کیا جائیگا۔

لارڈ رپن کے عہد میں جسقدر زمانہ کہ سرسید کے کونسل میں شریک رہنے کا تھا اُسکے پورا ہونے میں ابھی چند روز باقی تھے اور اُنکے پورا کرنے کے لیئے کلکتے جانے میں مدرسہ وغیرہ کے کاموں میں حرج واقع ہوتا تھا اسلیئے انہوں نے بذریعہ تار کے ممبری کونسل سے استعفا بھیجدیا۔ مگر اُسکے بعد جب کہ اضلاع شمال مغرب میں کونسل قائم ہوئی اُنکو لوکل گورنمنٹ نے اپنی کونسل کے لیئے پھر انتخاب کیا مگر یہاں بھی آخرکار اُنکو مدرسہ ہی کے کاروبار کی ضرورت اور نیز ضعیفی کی وجہ سے استعفا دینا پڑا۔

کرنل گریہم سرسید کی لائف میں اُنکی ممبری کونسل کی نسبت لکھتے ہیں کہ "جب سر جان سٹریچی کو بورڈ آف

ڈاکٹر کیرز نے عہدہ گورنری پر مقرر کیا تو اس تقریب میں گریٹ ڈیوک آف ولنگٹن نے سر جان مالکم کو ایک ڈنر دیا تھا۔ اس موقع پر جو تقریر ڈیوک نے کی تھی۔ اگر اس تقریر میں بجائے انگلستان کے ہندوستان اور بجائے انگریز کے مسلمان کا لفظ بنا دیا جائے تو وہ تقریر سید احمد خاں کے ممبر کونسل ہونے پر خوب چسپاں ہوتی ہے اور وہ فقرہ یہ ہے" ایک ایسا تقرر جیسا کہ یہ ہے عمل کرنے والا ہے انگلستان کے تمام عرض و طول پر اور کم سے کم عمر کا نوجوان انگریز اس میں ایک مثال پاتا ہے جسکی وہ تقلید کرے، اور ایک کامیابی پاتا ہے جسکو وہ حاصل کرے۔ اور ایسے فیلنگز کے جوش سے جو ہلالی ملک کو حاصل ہوتی ہیں اُسکی کچھ انتہا نہیں۔"

[illegible]

۱۸۸۲ء میں جب کہ سرسید لیجسلیٹو کونسل میں ممبر تھے انکی شہادت بھی ایجوکیشن کمیشن میں کی گئی تھی۔ اُنکا طولانی اظہار علی گڈہ گزٹ کے متعدد پرچوں میں چھپا ہوا موجود ہے جس سے اُن کا ایک بڑا تجربہ کار ایجوکیشنسٹ ہونا ثابت ہوتا ہے۔

سرسید اول کمیشن مذکور کے ممبر مقرر ہوئے تھے۔ مگر جو طریقہ کمیشن کی کارروائی کا تھا وہ انکی رائے کے خلاف تھا۔ اول تو ممبرونکو کسی کارروائی کی اطلاع پہلے سے نہیں دیجاتی تھی۔ تمام رزولیوشن دفعتاً پیش کئے جاتے تھے۔ اور ممبرونکو اُنپر کافی غور اور بحث کرنیکا موقع نہ ملتا تھا۔ دوسرے جو مباحثہ ہر ایک رزولیوشن پر ہوتا تھا وہ قلمبند نہیں کیا جاتا تھا۔ اسلیے اُنہوں نے ایک آدہ اجلاس کے بعد پریسیڈنٹ سے کہا کہ میرے نزدیک ممبروں کو پہلے سے اطلاع ہونی چاہیئے کہ کس تاریخ کیا کارروائی ہوگی۔ تاکہ اُنکو غور کرنیکا موقع ملے۔ دوسرے جو مباحثہ کمیشن میں ہو وہ بالکل قلمبند ہونا چاہیئے مگر پریسیڈنٹ نے ان دونوں باتوں کو منظور نہیں کیا اور کہا کہ موجودہ حالت میں بھی کام کی کثرت بہت ہے اگر ایسا کیا جائیگا تو کام بہت بڑھ جائیگا۔ سرسید نے کہا کہ اس صورت میں کمیشن کی شرکت سے مجھکو معاف رکھا جائے۔ جب لارڈ رپن کو اسکی اطلاع ہوئی تو اُنہوں نے سرسید سے کہا کہ اگر آپ ممبری سے علٰحدہ ہوتے ہیں تو سید محمود کو اپنی جگہ ممبری قبول کرنے پر راضی کر دیجیئے اور آپ خود کمیشن میں شہادت دیجیئے۔ چنانچہ سید محمود اُن کی جگہ مقرر کیے گئے اور سرسید نے شہادت دی

---

[1] سید محمود نے اپنی ممبری کے زمانہ میں ۸ رزولیوشن کمیشن میں ایسے پاس کرائے تھے جو خاص مسلمانوں کی ترقی تعلیم اور بہبودی سے علاقہ رکھتے تھے مگر گورنمنٹ سے اُنکی نسبت حکم ہوا کہ اُنکے اجرا یا عدم اجرا کا اختیار لوکل گورنمنٹوں کو ہونا چاہیئے جس تجویز کو وہ اپنے صوبہ میں مناسب سمجھیں جاری کریں اور جسکو مناسب نہ سمجھیں جاری نہ کریں وہ رزولیوشن یہ ہیں (۱) مسلمانوں کی تعلیم کی خاص تقویت اور ترقی کا بار لوکل میونسپل اور پراونشیل فنڈوں پر جائز سمجھا جائے (۲) جو دیسی مدرسے مسلمانوں کے ہیں اُنکو ترغیب دیجائے کہ اپنے ہاں کی زندگی میں خالص دنیوی تعلیم اضافہ کریں (۳) مسلمانوں کے پرائمری اسکولوں کے واسطے خاص سٹینڈرڈ مقرر کئے جا دیں (۴) پرائمری اور مڈل اسکولوں میں سوائے

سرسید کے اظہارات میں سے چند دلچسپ جواب جو اُنہوں نے بعض عام سوالات یا جرح کے سوالات پر کمیشن میں دیئے اس مقام پر بطور خلاصہ کے نقل کئے جاتے ہیں تاکہ تعلیم کے متعلق جو اہم سوالات ہیں اُن کی نسبت اُن کی اصلی رائے جو انہوں نے ہر ایک موقع پر نہایت آزادی سے ظاہر کی ہے ناظرین کو معلوم ہو جائے۔

انہوں نے اس سوال کے متعلق کہ آیا مغربی علوم کی تعلیم دلیسی زبانوں میں بہ نسبت انگریزی زبان کے زیادہ مفید ہوگی؟ اسطرح جواب دیا کہ "اُن ورنیکلر و انگریزی پرائمری اور مڈل اسکولوں میں جن کا

بقیہ حاشیہ صفحہ ما قبل

اُن مقامات کے جہاں اسلامی جماعتیں کسی اور زبان کی خواہش کریں اصل زبان مسلمانوں کی تعلیم کیلئے اُردو ہونی چاہیئے (۵) جہاں دفاتر کی زبان اُردو نہیں ہے وہاں بطور اختیاری مضمون کے پرائمری اور مڈل اسکولوں میں جو مسلمانوں کے لیئے پبلک فنڈ سے قایم ہیں دفاتر کی زبان خواندگی میں پڑہائی جائے اور نیز حساب اور سیاق اسی زبان میں سکھایا جائے (۶) جن مقامات میں مسلمانوں کی نسبتی تعداد بلحاظ آبادی کے معتد بہ ہے وہاں پرائمری اور مڈل اسکولوں میں جو کہ پبلک فنڈ سے قایم ہیں ایسا انتظام کیا جائے کہ اُردو اور فارسی زبان کی تعلیم دیجائے (۷) مسلمانوں کی اعلیٰ تعلیم کی ترقی کے لیئے خوب اچھی طرح ترغیب عمل میں لائی جائے۔ کیونکہ یہ ایسی تعلیم ہے جسمیں اس جماعت کو خاص مدد کی ضرورت ہے (۸) جہاں جہاں ضرورت ہو ایک درجہ وار طریقہ خاص اسکالرشپوں کا مسلمانوں کے واسطے جاری کیا جائے جو انعام میں دیئے جائیں یعنی ا جو پرائمری اسکولوں کی کامیابی پر مڈل اسکولوں میں دے جائیں ب جو مڈل اسکولوں کی کامیابی پر ہائی اسکولوں دیے جائیں ج جو انٹرنیس اور ایف اے کے امتحانات کے نتائج پر کالجوں میں دئے جائیں (۹) ہر قسم کے اسکولوں میں جو پبلک فنڈ سے قایم ہیں ایک خاص نسبتی تعداد وظیفوں کی بالتخصیص مسلمان طلبا کے لیئے کیجائے (۱۰) جن مقامات میں تعلیمی اوقاف مسلمانوں کے فائدے کے واسطے ہیں اور گورنمنٹ کے زیر انتظام ہیں وہاں اوقاف کی آمدنی صرف مسلمانوں کی ترقی تعلیم میں صرف ہونی چاہیئے (۱۱) جہاں مسلمانوں کے اوقاف پرائیوٹ لوگوں یا جماعتوں کے زیر انتظام ہیں وہاں فیاضی سے گرانٹ ان ایڈ دیں جائیں اور (پرائیوٹ لوگوں کو) ترغیب دیجائے کہ گرانٹ ان ایڈ کے قاعدہ کے موافق انگریزی تعلیم کے لیے اسکول اور کالج قایم کریں (۱۲) جہاں ضرورت ہو نارمل اسکول یا کلاسیں مسلمان معلموں کی تربیت کے لیئے قایم کیجائیں (۱۳) جن مسلمانی مدرسوں میں (جو اوقاف سے قایم ہیں) اُردو میں درس ہوتا ہو وہاں کوشش کیجائے کہ حتی الامکان مسلمان معلم تعلیم دیں (۱۴) افسران معائنہ جو مسلمان ہوں وہ ان پرائمری اسکولوں کا معائنہ جو مسلمانوں کے لیئے ہیں موجودہ دستور سے زیادہ کیا کریں (۱۵) ترقی تعلیم مسلمانان کے واسطے جو ایسوسی الیشن ہیں اُنکو تسلیم کیا جائے اور اُنکی ہمت بڑہائی جائے (۱۶) پبلک انسٹرکشن کی سالانہ رپورٹوں میں ایک خاص باب مسلمانوں کی تعلیم پر ہوا کرے (۱۷) لوکل گورنمنٹوں کی توجہ اُس نسبت کی طرف مائل کرائی جائے جو تعلیم یافتہ مسلمانوں اور دیگر اقوام کے لوگوں میں نوکریاں تقسیم کرنے میں ملحوظ رکھی جاتی ہے (۱۸) اُصول مذکورہ بالا جو سفارش میں بیان کئے گئے ہیں وہ دیگر اقوام پر بھی جو حالات مذکورہ میں مسلمانوں کے برابر ہوں عائد ہوں ۱۲

مقصد طالب علموں کو اعلیٰ درجہ کی تعلیم کے واسطے تیار کرنے کا نہیں ہے مغربی علوم کا جہاں تک کہ وہ اُن میں پڑھائے جاتے ہیں ورنیکلر زبان میں پڑھایا جانا بے شک ملک کے حق میں بہتر ہوگا - مگر انگریزی ابتدائی اسکولوں میں جو اس غرض سے قائم کئے گئے ہیں کہ اعلیٰ تعلیم کے واسطے بطور ایک زینہ کے کام دیں ورنیکلر زبان کے ذریعہ سے یوروپین علوم کو پڑھانا تعلیم کو برباد کرنا ہے - میں اقرار کرتا ہوں کہ میں وہی شخص ہوں جس نے سب سے پہلے اس بات کا گمان کیا تھا کہ یوروپین علوم کا ورنیکلر زبان کے ذریعہ سے تحصیل کرنا ملک کے حق میں زیادہ سودمند ہوگا - میں وہی شخص ہوں جس نے لارڈ مکالے کے منٹ ۱۸۳۵ء پر نکتہ چینی کی تھی کہ انہوں نے مشرقی تعلیم کے نقص کو ظاہر کیا اور مغربی علوم کی تعلیم پر توجہ دلائی ، اور اسباب کے خیال کرنے سے قاصر رہا تھا کہ دیسی زبانوں کی وساطت سے یوروپین علوم کی اشاعت اہل ہند کو کوئی فائدہ پہنچا سکتی ہے یا نہیں ؟ میں نے اپنی رائے کو صرف بیان ہی پر محدود نہیں کیا بلکہ اُسکو عمل میں لانے کی کوشش کی بہت سے مباحثے مختلف جلسوں میں کئے - اس مضمون پر متعدد رسالے اور مضامین لکھے ، اوکل اور سپریم گورنمنٹوں کو عرضداشتیں بھیجیں اور اسی غرض سے ایک سوسائٹی موسوم بہ سائنٹفک سوسائٹی علیگڈھ قایم کی گئی جسنے کئی علمی اور تاریخی کتابوں کا انگریزی سے ورنیکلر زبان میں ترجمہ کیا - مگر انجام کار میں اپنی رائے کی غلطی کے اعتراف سے باز نہ رہ سکا مجھکو ایک مشہور لبرل سٹیٹسمین کے قول کو تسلیم کرنا پڑا جسنے کہا تھا کہ "جو کچھ ہمارے زمانہ کے ہندوستانیوں کو درکار ہے - خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان وہ یہ ہے کہ وہ اُس علم وحکمت پر نظر ڈالیں جو اُن کے زمانہ کی اور اُس قومی قوم کی جان ہے اور جو اُسکے نزدیک تمام علوم اور تمام طاقت کا مخزن ہے "، میں لارڈ ولیم بنٹنگ کی اس پالیسی کی صحت اور سچائی کو سمجھ گیا کہ "ہندوستان کی قوموں میں یوروپ کے علم وحکمت کو ترقی دینا گورنمنٹ کا مقصد اعلیٰ ہونا چاہیئے "

خیال کیا جاتا ہے کہ کسی ملک نے کسی علم میں ترقی نہیں کی تاوقتیکہ وہ علم خود اُس ملک کی زبان میں نہ آگیا ہو - مگر اس دلیل میں ایک بڑے جزو کو جسے اُس کی جان کہنا چاہیئے چھوڑ دیا گیا ہے - درحقیقت نہایت موزونیت کے ساتھ یوں کہا جا سکتا ہے کہ کسی ملک نے کسی علم میں ترقی نہیں کی تاوقتیکہ وہ علم اس زبان میں نہ آگیا ہو جو اُس ملک پر حکمران ہے - ہندوستان میں جو زبان حکمران ہے وہ ورنیکلر نہیں ہے بلکہ انگریزی زبان ہے - اسلئے اس ملک میں ورنیکلر کے ذریعہ سے کسی علم کو ترقی نہیں ہوسکتی تاریخ میں کوئی نظیر اسبات کی نہیں پائی جاتی کہ کسی ایسی زبان کی وساطت سے جو حکمران قوم کی زبان نہو کسی قوم میں کسی علم نے ترقی پائی ہو "

پھر اس سوال پر کہ کونسی تدبیر سے تعلیم کی آزادی اور اُسکا اختلاف نوعی محفوظ رکھا جا سکتا ہے ؟ اس طرح جواب دیا کہ "تعلیم کی آزادی اور اُسکے اختلاف نوعی کا محفوظ رکھنا اُس طریقہ پر منحصر ہے جو کسی ملک کی یونیورسٹی نے مختلف علوم میں ڈگریاں عطا کرنے کے لئے قرار دیا ہو - پس ہم کو دیکھنا چاہیئے

کہ اس ملک کی یونیورسٹیوں نے اس باب میں کیا کیا ہے۔ میں یہاں صرف کلکتہ یونیورسٹی کی نسبت جو اس ملک کی سب سے بڑی یونیورسٹی ہے گفتگو کرونگا یہ یونیورسٹی لا، انجنیرنگ، مڈیسن اور آرٹس میں ڈگریاں عطا کرتی ہے اور ہر شخص کو اسبات کی بالکل آزادی ہے کہ اُن میں سے جس مضمون کو چاہے اختیار کرے وہ بلاشبہہ تعلیم کی آزادی اور اختلاف نوعی کو لوگوں کے حق میں جہانتک کہ اُسکو علم کی ان چار مختلف شاخوں سے تعلق ہے محفوظ رکھتی ہے۔ لیکن آرٹس کا سبجکٹ ایک وسیع سبجکٹ ہے اور آزادی و اختلاف نوعی کو جو ابتک اُس میں محفوظ نہیں رکھا گیا، یا نہایت محدود کر دیا ہے۔ اُسکا محفوظ رکھنا نہایت ضرور ہے۔ جو کورس آرٹس کے امتحان کے واسطے ہماری یونیورسٹی نے اختیار کیا ہے وہ لندن کی یونیورسٹی کی ایک ناممل تقلید پر قرار دیا گیا ہے، جسکا نتیجہ یہ ہے کہ اُسکے گریجوٹ کسی سبجکٹ میں ایک کامل علم حاصل نہیں کرتے ہیں۔ پس میں طریقۂ مروجہ کے برخلاف ہوں۔ مگر چونکہ یہ بحث کمیشن کے احاطۂ تحقیقات سے خارج ہے۔ اسلئے میں خیال کرتا ہوں کہ مجھکو اُسکی نسبت کچھ زیادہ بیان کرنا مناسب نہیں۔ میں صرف ہز اکسلنسی وایسرائے کی اسپیچ میں سے جو کلکتہ یونیورسٹی کے پچھلے سالانہ جلسہ میں حضور ممدوح نے ارشاد فرمائی تھی انتخاب مندرجۂ ذیل کمیشن کی اطلاع کے واسطے پیش کرتا ہوں۔ "جس بات کی سب سے اول تعلیم میں ضرورت ہے وہ علم کی تکمیل ہے۔ قوائے عقلیہ کو چیزوں کے کامل طور پر سیکھنے سے بہ نسبت اسکے کہ بہت سی باتیں بالائی طور پر سیکھی جائیں زیادہ تر عمدہ طور پر تربیت ہوتی ہے۔ اسکے بعد فرمایا کہ "ایک مضمون کو کامل طور پر سیکھنے سے بہ نسبت اسکے کہ سو علم ناکامل طور پر سیکھی جائیں زیادہ تر اصلی عقلی تربیت حاصل ہوتی ہے۔"

پھر اس سوال پر کہ گورنمنٹ کو کس کس حد تک ہر قسم میں تعلیم کی امداد دینی مناسب ہے؟ اسطرح جواب دیا کہ "اس امر کی نسبت جو میری خاص رائے ہے وہ پبلک فیلنگ کے برخلاف ہے میں نے اس معاملہ کے تمام پہلوؤں پر غور کامل کرنے کے بعد اپنی رائے قائم کی ہے کہ جب تک خود لوگ اپنی تعلیم کا تمام اہتمام اپنے ہاتھ میں نہ لینگے اُسوقت تک مناسب طور پر اُن کی تعلیم کا ہونا ممکن نہیں ہے۔ پس ملک کے لیئے یہ زیادہ تر مفید ہوگا کہ گورنمنٹ تعلیم کا تمام اہتمام لوگوں پر چھوڑدے اور خود اسمیں دست اندازی سے بالکل علیحدہ ہو جائے۔ مگر پبلک کی رائے اس رائے کی موید نہیں ہے۔ اُن کی دلیل یہ ہے کہ ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ گورنمنٹ کا اس تعلیم سے علیحدہ ہونا واجب ہو۔ ایک نہایت لائق ہندوستانی نے جسکا میں دل سے ادب کرتا ہوں مجھسے کہا کہ "یہ خیال

کہ ہمکو آپ اپنی تعلیم کا بندوبست کرنا چاہیئے بالکل ایک غلط خیال ہے، اور لفظ "اپنے آپ" کا کسی قومی معنوں میں ہندوستان کے باشندوں کی نسبت استعمال کرنا بیجا ہے۔ کوئی قوم بڑا کام نہیں کرسکتی جس میں اعلیٰ اور ادنیٰ تمام فرقوں کے لوگ شریک نہ ہوں۔ ہندوستان میں اعلیٰ درجہ کا پولٹیکل اور انتظامی اقتدار گورنمنٹ اور اُس کے یورپین عہدہ داروں کو حاصل ہے اور جو شخص ہندوستان میں تجارت سے سب سے زیادہ فائدہ اُٹھاتے ہیں وہ بھی یوروپین ہیں اور اس وجہ سے وہ فی الحقیقت ہندوستان کی آبادی میں سب سے زیادہ وقعت رکھتے ہیں مگر جب کبھی ان عہدہ داروں سے کسی کالج یا اسکول کے لیئے جو اس ملک میں ہندوستانیوں کے فائدہ کے واسطے قائم کیا جائے زرِ نقد کی امداد کی درخواست کی گئی ہے تو وہ علی العموم اُس سے اس طرح برعلیحدہ رہے ہیں کہ گویا اُن کو اُس سے مطلق کچھ سروکار نہ تھا۔"

اس کے بعد سر سید نے کہا کہ "اس مقام پر میں ایک واقعہ کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو خود میرے ساتھ گذرا ہے یعنی جس زمانہ میں کہ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علیگڈھ میں قائم ہوا تو میں نے ایک نہایت معزز یوروپین افسر سے اُس کی امداد کی درخواست کی اُسنے جواب دیا کہ "ہمپر اسکی مدد کرنا کچھ فرض نہیں ہے، وہ تمہارا بچہ ہے۔ ہمیں اُسکو دھکا دیدینا چاہیئے۔ اگر ہمارا بچہ ہوتا تو ہم البتہ اُسکو والدینی شفقت کے ساتھ چھاتی سے لگا لیتے"۔ پس پبلک اُپنین کے لحاظ سے میں اقرار کرتا ہوں کہ ہمارے واسطے اس بات کا کہنا کچھ آسان نہیں ہے کہ لوگوں کو اپنی تعلیم کا خرچ اپنے آپ برداشت کرنا چاہیئے۔ اگر ہم ہندوستان کی حالتِ موجودہ پر ذرا غور کریں تو اس بات کے کہنے پر مجبور ہونگے کہ اگر لوگ اس قسم کا کوئی ارادہ کرینگے تو اُنھیں ایسی بے انتہا مشکلات میں جنکے سبب سے اُنھیں سراسر ناکامی کے ہونیکا اندیشہ ہے۔"

اسکے بعد اسی سوال کے متعلق اُنھوں نے کہا کہ "اکثر لوگوں میں یہ خیال پھیل گیا ہے کہ گورنمنٹ اس ملک میں ہائی ایجوکیشن موقوف کرنا چاہتی ہے ... پس اگر گورنمنٹ موجودہ کالجوں میں سے کسی کالج کو برخاست کریگی تو گو وہ کیسی ہی واجبی اور معقول دلیل پر کیوں نہو۔ لوگونکو یہی خیال ہوگا کہ اس سے گورنمنٹ کا مقصد ہائی ایجوکیشن کے موقوف کرنیکا ہے۔"

پھر کہا کہ "گو میرے نزدیک مشنری اسکولوں اور کالجوں میں بائیبل پڑھنا کسی طرح مذہب اسلام کے برخلاف نہیں ہے۔ مگر مسلمانوں کی عام فیلنگ بالیقین میری اس رائے کے خلاف ہے۔ اور اگر کسی مشنری اسکول کی موجودگی کے سبب کوئی گورنمنٹ اسکول توڑ دیا جائے گا تو غالباً اسکی وجہ سے لوگوں میں ناراضی پیدا ہوگی پس گورنمنٹ کو اس باب میں کسی کارروائی کے کرنے سے پہلے پبلک فیلنگ کی اصلی حالت دریافت کرنا

مناسب ہے"۔

پھر کہا کہ" جہاں مشنیری کالج اور اسکول ہیں اگر وہاں رعایا کا کوئی فرقہ اُن میں اپنی اولاد کو تعلیم دلوانا پسند نہ کرتا ہو تو لوگوں کو لازم ہے کہ آپ اپنے لیئے علیحدہ اسکول یا کالج قایم کریں۔ اور گورنمنٹ بھی اُسکو بغیر لحاظ اسبات کے کہ وہاں مشنیری اسکول یا کالج پہلے سے قائم ہیں اور اس صورت میں اور مدرسونکی ضرورت نہیں کسیقدر مدد عطا فرمایئے۔ اسکے علاوہ گورنمنٹ اس بات کی بھی خبر گیری کرے کہ حُکام ضلع اس قسم کی لوکل کوششوں میں خلل انداز نہ ہوں۔ اور اپنی حکومت اور رعب و داب کو اُنکے برخلاف عمل میں نہ لاویں۔ جیسا کہ بعض ضلعوں میں ہوا ہے۔"

پھر اس سوال پر کہ گرنٹ ان ایڈ کا قاعدہ جو بالفعل مروج ہے وہ کافی ہے یا نہیں؟ اس طرح جواب دیا کہ" ایک ہائی اسکول کا اسٹاف جب تک کہ اُسمیں ایک یوروپین ہیڈ ماسٹر اور اُسکے ماتحت ماسٹر یونیورسٹی کے گریجوئٹ اور سکنڈ لینگوج یعنی عربی، فارسی اور سنسکرت کے تین لائق ٹیچر نہ ہوں کافی خیال نہیں کیا جا سکتا اور ایسا اسکول بغیر نوسَو روپے ماہوار خرچ کے قائم نہیں ہو سکتا۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ قواعد مروجہ کے موافق اس قسم کے مدرسوں میں کسقدر گرنیٹ اِن ایڈ دیا جاتا ہے۔ اُن قواعد میں یہ شرط ہی کہ لڑکوں کی اوسط حاضری پر جو انگریزی پڑھتے ہوں فی طالب علم ڈیڑھ روپیہ ماہوار سے زیادہ گرینٹ ان ایڈ کا اوسط نہ پہیلے۔ پس ایسے اسکول میں جسکا اوپر ذکر ہوا جب تک کہ اوسط حاضری انگریزی پڑھنےوالونکی کم سے کم تین سو نہو گورنمنٹ سے اسقدر گرینٹ ان ایڈ کے ملنے کی بھی توقع نہیں ہو سکتی جو اُسکے نصف خرچ کے برابر ہو۔ یہ شرط عملاً اُسکے مساوی ہے کہ کبھی کوئی شخص گورنمنٹ سے مناسب گرینٹ کے ملنے کی توقع پر ایک عمدہ ہائی اسکول قائم کرنیکا قصد نہ کرے۔ میرے نزدیک گرینٹ اِن ایڈ طالب علموں کی تعداد کے لحاظ سے نہیں بلکہ جو تعلیم دیجائے اُسکی عمدگی کے لحاظ سے تجویز کرنا چاہیئے۔ محدود لڑکونکو ایک عمدہ تعلیم دینا اس سے بدرجہا بہتر ہے کہ بہت سے لڑکوں کو ناقص تعلیم دیجائے۔"

پھر سوال متعلقہ اسکالرشپ پر اسطرح جواب دیا کہ" میں اسکالرشپوں کے قاعدہ کا طرفدار ہوں اور اس راے کو ہرگز تسلیم نہیں کرتا کہ اسکالرشپ دیکر پڑھانا گویا تعلیم کے لیے رشوت دینا ہے۔ بالتخصیص ہندستان میں اور زیادہ تر مسلمانونکے واسطے اسکالرشپوں کی نہایت ضرورت ہے۔ اسکالرشپوں سے اُن غریب طلبہ کو جو اپنی حالت کی وجہ سے اپنی تعلیم کسی خاص جماعت سے آگے جاری نہیں رکھ سکتے نہایت مدد پہنچتی ہے۔ اگلے زمانہ کے مشہور و معروف شخصوں میں جنہوں نے سائنس کو بڑی ترقی دی ہے۔ یا اپنی عمدہ تصنیفات سے لٹریچر کو رونق دی ہے، مسلمانوں اور نیز اور قوموں میں اکثر وہ لوگ تھے جو غریب اور نہایت مفلس شخص تھے

کی اولاد میں سے تھے۔ اب بھی اس قسم کے لوگوں سے بڑی بڑی امیدیں کیجا سکتی ہیں۔ اگر میری معلومات میں
غلطی نہو تو میں خیال کرتا ہوں کہ اب بھی انگلستان میں اُن غریب آدمیوں کے لیئے جو "سیزر" کہلاتے ہیں
کوئی طریقہ جاری ہے۔ مگر اُنکے زیادہ خوشحال اسکول فیلو اُنکو کسقدر حقیر سمجھتے ہیں۔ محمڈن کالج علیگڈھ میں بھی منیجنگ
کمیٹی نے اس قسم کے سیزر طالب علموں کی امداد کا ایک طریقہ جاری کیا ہے۔ لیکن وہ اُسکو ایسے مخفی طور پر امداد
کرتی ہے کہ اور طالب علموں کو اس قسم کے سیزر کے موجود ہونے کی اطلاع نہیں ہوتی اور وہ اُس حقارت سے
بچ جاتے ہیں جو اور طرح پر کیجاتی ہے۔"

پھر ایک سوال کے جواب میں کہا کہ "گورنمنٹ کی تعلیم اس اثر کے پیدا کرنے سے اسلیئے قاصر رہتی ہے
کہ مضامین تعلیم بے شمار ہیں اور کسی ایک مضمون میں کافی لیاقت نہیں ہوتی۔ اس تعلیم کا نتیجہ یہ ہوا کہ کوئی واقعی
عمدہ مصنف یا خیالات کے ہادی پیدا نہیں ہوئے۔ جنکا نام غالباً باقی رہتا۔ یا جنکا اثر قوم پر پڑتا۔ مورل اور سوشل
ترقی کے لیئے یہ ایک بڑی مصیبت ہے۔ اس ملک کے عام لوگوں کی رائے کثرتِ مضامین تعلیم کے برخلاف ہے۔ اگر
اُسکا مقصد عمیق علم حاصل کرنے کا نہ ہو۔ ہمارے ہاں ایک فارسی مثل مشہور ہے کہ "نیم حکیم خطرۂ جان و نیم ملا خطرۂ ایمان"
اور میں نے سُنا ہے کہ پوپ کا بھی کوئی شعر اسی کے مطابق ہے۔"

پھر اس سوال پر کہ گورنمنٹ مسلمان لڑکیوں کی تعلیم میں کہانتک کوشش کرسکتی ہے؟ اور اس میں کامیابی
کی کیا توقع ہے؟ مفصل جواب سُننے کے بعد کہا کہ "گورنمنٹ عملاً کوئی تدبیر ایسی اختیار نہیں کرسکتی جس سے
اشراف خاندانوں کے مسلمان اپنی بیٹیوں کو تعلیم کے واسطے گورنمنٹ اسکولوں میں بھیجنے پر مائل ہوں۔ اور نہ وہ
کوئی ایسا اسکول قائم کرسکتی ہے جو کہ ان لڑکیوں کے مربیوں کی طمانیت کے لائق ہو۔ میں مسلمانوں پر یہ الزام نہیں
لگا سکتا کہ وہ اپنی لڑکیوں کو ان اسکولوں میں نہیں بھیجتے اور یقیناً کوئی اشراف یوروپین بھی۔ گو وہ کیسا ہی تعلیم نسواں
کا شوقین ہو۔ مسلمانوں پر ایسا الزام نہیں لگا سکتا۔ بشرطیکہ وہ اس ملک کے مدرسوں کی حالت سے واقف ہو
جس حیثیت اور وقعت کے مدارس نسواں ہندوستان میں ہیں اگر ایسے مدرسے انگلستان میں فرض کیے
جائیں تو کیا اشراف خاندانوں کے انگریز اپنی لڑکیوں کو اُن مدرسوں میں تعلیم کے لیئے بھیجنا پسند کرینگے؟ ہرگز نہیں۔
عورتوں کی تعلیم کا معاملہ اُس فلوزفر کے سوال سے نہایت مشابہ ہے جس نے پوچھا تھا کہ پہلے مرغی پیدا ہوئی یا انڈا؟
جن شخصوں کی رائے ہے کہ مردوں کی تعلیم سے پہلے عورتوں کی تعلیم ہونی چاہیئے وہ بڑی غلطی پر ہیں۔ حقیقت
یہ ہے کہ مسلمان عورتوں کی پوری تعلیم اُسوقت تک نہوگی جب تک کہ اُس قوم کے اکثر مرد پورے تعلیم یافتہ نہو جائینگے
اگر ہندوستان کے مسلمانوں کی سوشل حالت پر غور کیا جائے تو اسوقت تک جو حالت مسلمان عورتوں کی ہے
وہ میری رائے میں خانگی خوشی کے واسطے کافی ہے جو کچھ بالفعل گورنمنٹ کو کرنا ہے وہ یہ ہے کہ مسلمان لڑکوں کی تعلیم

و تربیت کے بندوبست کی جانب کافی توجہ کرے۔ جب کہ مسلمانوں کی موجودہ نسل بخوبی تعلیم و تربیت یافتہ ہو جائیگی تو مسلمان عورتوں کی تعلیم پر اُس کا ضرور بالضرور ایک زبردست گو خفیہ اثر پہنچیگا۔ تعلیم یافتہ باپ یا بھائی یا شوہر بالطبع اپنی رشتہ مند عورتوں کی تعلیم کے خواہشمند ہونگے۔ اگر گورنمنٹ مسلمان شریف خاندانوں میں تعلیم نسواں کے جاری کرنے کی کوشش کریگی تو حالتِ موجودہ میں محض ناکامی حاصل ہوگی اور میری رائے ناقص میں اُس سے مضر نتیجے پیدا ہونگے اور روپیہ اور محنت ضائع ہو جائیگی"۔

مسٹر پیرسن نے سوال کیا کہ "آیا ہندوستان کے مزدوری پیشہ لوگ اس بات کا فیصلہ کر سکتے ہیں کہ جو تعلیم سرکاری مدرسوں میں دیجاتی ہے وہ اُنکے بچوں کے لیئے مناسب ہے یا نہیں؟ سرسید نے اسکے جواب میں کہا کہ "اُنکو اس قسم کے سوال پر غور کرنے کی فرصت نہیں"۔

پھر اُنھوں نے یہ سوال کیا کہ "تعلیم کی ترغیب کے لیئے ایجوکیشنل درباروں کی نسبت آپ کی کیا رائے ہے؟ سرسید نے کہا کہ "یہ دربار بجز نمایش کے اور کچھ نہیں"۔

مسٹر وارنر نے سوال کیا کہ "کیا آپ کوئی ایسا یوروپین اسٹیشن ہندوستان میں بتا سکتے ہیں جہاں اہلِ یورپ کسی مشن اسکول یا اور پرائوٹ اسکول کے مصارف کے واسطے جو ہندوستانیوں کے لیئے ہو کنٹری بیوشن یعنی چندہ نہ دیتے ہوں؟ سرسید نے اسکا یہ جواب دیا کہ "یہ سوال پیچیدہ ہے۔ اس سے ضمناً یہ تسلیم کر لینا نکلتا ہے کہ ہندوستان کے ہر ایک یوروپین اسٹیشن میں انگریز ہندوستان کی تعلیم کے لیئے کنٹری بیوشن دیتے ہیں میں اس ضمنی تسلیم کو جو سوال سے نکلتی ہے تسلیم نہیں کرتا باقی سوال دو جُداگانہ امور سے متعلق ہے۔ اول مشنری اسکولوں سے۔ سو اُسکی نسبت میرا یہ جواب ہے کہ میں کسی ایسے یوروپین اسٹیشن سے واقف نہیں ہوں جہاں کوئی مشنیری اسکول کنٹری بیوشن کے ذریعہ سے مقرر ہوا ہو اور انگریز اُسکی مدد نہ کرتے ہوں۔ دوسرے یہ سوال پرائوٹ اسکولوں سے متعلق ہے۔ اس حصۂ سوال کی نسبت میرا یہ جواب ہے کہ میں کسی ایسے اسٹیشن سے واقف نہیں ہوں جہاں کوئی ہندوستانی اسکول قائم ہوا ہو اور اُسکی امداد انگریز بذریعۂ کنٹری بیوشن کرتے ہوں سوا محمدن کالج علیگڈھ کے جس میں فی الحال صرف ایک کنٹری بیوشن یوروپین کیطرف سے مقرر ہے۔ اسکے بعد لارڈ نارتھ بروک۔ لارڈ لٹن اور دیگر جلیل القدر حکام اور ارکان سلطنت کے عطیات کی شکر گزاری کے بعد کہا کہ "مگر اسٹیشن کے یوروپین عہدہ داروں میں سے کسی نے ہمارے کالج کو کوئی ماہواری یا سالانہ کنٹری بیوشن، اور سوا ایک کے کسی نے اُسکو یکمشت چندہ بھی نہیں دیا"۔

مسٹر وارڈ نے سوال کیا کہ "محمدن کالج کے پراسپکٹس میں کیا فی الواقع اس بات پر زور دیا گیا تھا کہ صرف مسلمانوں پر چندہ کا محدود رکھنا مناسب ہے؟ اسکا جواب سرسید نے اسطرح پر دیا کہ "کمیٹی نے تجویز کی تھی کہ

انگریزی قوم سے جو ہمارے حاکم ہیں اس کام میں شریک ہونے کی درخواست کیجائے۔ کیونکہ کمیٹی کے نزدیک ایسے کالج کا قایم کرنا جو انگریزوں کی ہمدردی سے جُدا ہو پولیٹیکل مصلحت کے برخلاف تھا۔ پس اُسنے یہ تجویز کی تھی کہ مسلمان انگریزوں سے بھی امداد کی درخواست کریں "

پھر مسٹر وارڈ نے پوچھا کہ "کیا فی الواقع سائنٹفک سوسائٹی علیگڈہ کے قائم کرنے میں انگریزوں نے روپیہ اور ہمدردی کے لحاظ سے آپ کی بڑی مدد کی تھی؟ اسکا جواب سرسید نے یہ دیا کہ "سوائے مسٹر براملی کے جنہوں نے مجھکو ایکہزار روپیہ دئے تھے اور کسی سے مجھے کچھ مدد نہیں ملی، مگر اُنہوں نے بھی یہ کہا تھا کہ میں نے اس سے پہلے تعلیم کی جانب توجہ نہیں کی تھی "

محمدن سول سروس فنڈ ایسوسی ایشن

۱۸۸۳ء میں سرسید نے "محمدن سول سروس فنڈ ایسوسی ایشن" قائم کی۔ اوّل اُن کو ۱۸۶۸ء میں جبکہ سائنٹفک سوسائٹی کو قائم ہوئے چند سال گذرے تھے یہ خیال ہوا تھا کہ عام ہندوستانیوں کو، خواہ ہندو ہوں خواہ مسلمان۔ تعلیم کی غرض سے یوروپ کے سفر پر آمادہ کرنے کے لیئے ایک ایسوسی ایشن قائم کیجائے اور اُسکے ممبر دو روپیہ ماہوار چندہ دیا کریں جو بطور ایک فنڈ کے یوروپ کے سفر کے لیئے جمع ہوتا رہے۔ مگر اس تدبیر میں کچھہ کامیابی نہیں ہوئی کیونکہ ہندو اُسوقت یوروپ کے سفر کو مذہب اور ذات کے قواعد کے برخلاف جانتے تھے اور مسلمان بھی اسی قسم کے توہمات رکھتے تھے۔ اس کے سوا یوروپ کا سفر اُس زمانہ میں مشکل بھی معلوم ہوتا تھا۔ مگر ۱۸۸۳ء میں یوروپ کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری ہوگیا تھا اور ہندوستانیوں کے لڑکے تعلیم کے لیئے ولایت جانے لگے تھے لیکن خاصکر مسلمانوں کے لیئے حالتِ موجودہ میں سول سروس کا امتحان ولایت جاکر پاس کرنا جیسا کہ سرسید نے علی گڈہ گزٹ مورخہ ۱۱۔ اگست ۱۸۸۳ء میں مفصل بیان کیا ہے ناممکن معلوم ہوتا تھا۔ اُنہوں نے خیال کیا کہ کسی قوم کی جب تک کہ وہ گورنمنٹ میں کچھ حصہ نہ رکھتی ہو۔ عزت نہیں ہوسکتی۔ دولتمند مسلمانوں کا یہ حال ہے کہ اُن کو اپنی اولاد کی تعلیم کا مطلق خیال نہیں اُس وقت سول سروس کے قاعدہ کے موافق ۱۹ برس کی عمر میں ولایت جاکر سول سروس کا امتحان پاس کرنا پڑتا تھا حالانکہ امرا کے لڑکے ۱۹ برس کی عمر تک بچے سمجھے جاتے تھے اور سمجھے جاتے ہیں یہاں تک کہ بقول سرسید کے اُسوقت تک تعویذوں کی ہیکل بھی اُنکے گلے سے نہیں اُترتی۔ ہاں متوسط درجہ کے لوگوں کو بلاشک اولاد کی تعلیم کا خیال تھا اور خیال ہے مگر ولایت کے سفر کا پورا خرچ وہ برداشت نہیں کرسکتے۔ اسی لیئے سرسید نے یہ ایسوسی ایشن خاص مسلمانوں کے لیئے اس غرض سے قایم کی کہ اگر کم سے کم پانسو مسلمان ممبر دو روپیہ ماہوار دینے والے پیدا ہوجائیں تو اس سے ہزار روپیہ سالانہ کی آمدنی ہوجائیگی جو بطور فنڈ کے جمع ہوتی رہیگی تاکہ جن مسلمانوں کے لڑکے ولایت کا تمام خرچ اپنے پاس سے ادا نہیں کرسکتے اُن کی اُن فنڈ سے امداد کیجائے اور مدرسۃ العلوم

میں ایک خاص کلاس قائم کی جسکی تعلیم کا طریقہ ایسا مقرر کیا گیا تھا جس سے اُس کلاس کے طالب علموں کو ولایت پہنچکر سول سروس کے امتحان میں مدد ملے۔

اگرچہ اس کلاس کا نام سول سروس کلاس رکھا گیا تھا مگر درحقیقت اُس کے طالب علموں کو اس مقصد کے لیے تیار کیا جاتا تھا کہ وہ انگلستان پہنچکر مندرجۂ ذیل کورسوں میں سے کوئی کورس اختیار کرلیں (۱) سول سروس کا امتحان مقابلہ (۲) کسی مضمون میں ولایت کی کسی یونیورسٹی کی ڈگری حاصل کرنی (۳) کسی پیشہ میں مثل بیرسٹری، ڈاکٹری یا انجنیری کے ڈپلوما حاصل کرنا۔

پھر اس ایسوسی ایشن کے کام کو زیادہ وسعت دینے کے لیے اُنہوں نے شمالی ہندوستان کے ہر ایک ضلع میں سب کمیٹیاں قایم کرنے کا ارادہ کیا تاکہ ممبروں کی تعداد زیادہ ہو۔ اور سب کمیٹوں کے لیئے قواعد مقرر کرکے شائع کیئے۔ مگر ان تمام کوششوں کا نتیجہ اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوا کہ ایسوسی ایشن میں ۲۹۹ ممبر شامل ہوئے جو کچھ عرصہ تک دو روپیہ ماہوار دیتے رہے اور کچھ لوگوں نے بطور ڈونیشن کے بھی کسیقدر روپیہ دیا آخر سب کے ارادے سست ہوگئے اور جیسا کہ ماہواری یا سالانہ چندوں کا ہمیشہ انجام ہوتا ہے رفتہ رفتہ چندہ دینا بند ہوگیا۔

ایسوسی ایشن مذکور کی آمدنی سے چار ہزار ایک سو روپیہ جمع ہوا تھا جس کو ممبروں کی منظوری سے سرسید نے الہ آباد بینک میں جمع کرا دیا تھا۔ تاکہ جس کام کے لیے وہ جمع کیا گیا تھا جب اُسکا موقع آئے وہاں خرچ کیا جائے اور اُسوقت تک اُسکے منافع سے محمڈن کالج علیگڈھ کے طلبہ کو امداد دیجائے۔

محمڈن ایسوسی ایشن علیگڈھ

اسی ۱۸۸۳ء میں سرسید نے بہ شرکت رئیساں ضلع علیگڈھ محمڈن ایسوسی ایشن قائم کی جس کے مقاصد نہایت عمدہ تھے اور اُسکا چلنا بھی ایسا دشوار نہ تھا جیسا کہ سول سروس فنڈ ایسوسی ایشن کا چلنا اور قائم رہنا دشوار تھا کیونکہ اُسکے مقاصد روسائے ضلع کے مذاق کے موافق تھے مگر چونکہ سرسید مدرسہ کے کاموں کی مصروفیت کی وجہ سے اُسکے پیرو کار نہ تھے اسلیئے وہ چندروز کے بعد بالکل مبہم پڑگئی اور اب اُسکا نام ہی نام باقی رہگیا ہے۔

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس

۱۸۸۶ء میں سرسید نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس قائم کی۔ محمڈن کالج کی حالت جب کسیقدر اطمینان کے قابل ہوگئی تو سرسید کو یہ خیال ہوا کہ اگر بالفرض یہ کالج ہر طرح سے مکمل ہوگیا تو بھی اس سے قومی تعلیم کا مسئلہ حل نہیں ہو سکتا اور ایک کالج چھ کروڑ مسلمانوں کی تعلیم کی کفالت نہیں کرسکتا۔ اسکے سوا مسلمانوں کی قوم جو ہندوستان کے دور دراز حصوں میں پھیلی ہوئی ہے وہ سب اگر … بُرے کی حالت … سے محفوظ رہے … اور کوئی ذریعہ ایسا نہیں کہ مختلف [illegible] مختلف اضلاع کے

لوگ کسی موقع پر آپس میں ایک جگہ جمع ہوں۔ اپنے اپنے خیالات قومی تعلیم اور قومی ترقی کی نسبت ایک دوسرے پر ظاہر کریں، ہر حصۂ ملک کے مسلمانوں کی ترقی یا تنزل کا حال تمام قوم کو معلوم ہو اور مسلمان جو باوجود ایک قوم ہونے کے بمنزلہ مختلف قوموں کے ہو رہے ہیں انمیں قومی یگانگت اور ہمدردی پیدا ہو۔ اسی بنا پر جیسا کہ سرسید نے پہلے اجلاس میں بیان کیا تھا یہ کانفرنس قائم کی گئی اور اُس کا پہلا جلسہ ۲۷ دسمبر ۱۸۸۶ء کو بمقام علیگڈھ محمدن اینگلو اورنٹیل کالج میں منعقد ہوا۔

اس کانفرنس کے مقاصد اولاً حسب تفصیل ذیل قرار دئے گئے تھے (۱) مسلمانوں میں مغربی تعلیم کو اعلیٰ درجہ تک پہنچانے میں کوشش کرنا (۲) مسلمانوں کی تعلیم کے لیئے جو انگریزی مدرسے مسلمانوں کی طرف سے جاری ہوں اُن میں مذہبی تعلیم کے حالات دریافت کرنا اور تا بمقدور عمدگی سے اس تعلیم کے انجام پانے میں کوشش کرنا (۳) علوم مشرقی اور دینیات کی تعلیم جو علماے اسلام جا بجا بطور خود دیتے ہیں اُسکو تقویت دینا اور اُسکو بدستور قائم اور جاری رکھنے کی مناسب تدبیریں عمل میں لانا (۴) جو تعلیم قدیم طرز پر دیسی مکتبوں میں جاری ہے اُسکے حالات کی تفتیش کرنا اور اُن میں جو تنزل ہو گیا ہے اُس کی ترقی اور توسیع کی تدبیریں اختیار کرنا۔ قرآن خوانی اور حفظ قرآن کے لیئے جو مکتب جاری ہیں اور جن کو روز بروز تنزل ہوتا جاتا ہے اُنکے حالات کی تفتیش کرنا اور اُنکے قائم رکھنے اور استحکام دینے کی تدبیریں عمل میں لانا۔

مذکورہ بالا مقاصد کے سرانجام کرنے کے لیئے دو طریقے تجویز کئے گئے تھے۔ ایک یہ کہ ہر سال کسی مناسب موقع پر جہاں کے ممتاز آدمی کانفرنس کے اجلاس کی خواہش کریں اور کانفرنس کا انتظام اپنے ذمہ لیں۔ کانفرنس کا اجلاس ہوا کرے اور اجلاس کی تاریخوں میں کانفرنس کے ممبر جو تجویزیں مسلمانوں کی ترقی تعلیم کے متعلق مناسب سمجھیں وہ اجلاس میں پیش کریں اور بعد غور اور مباحثہ کے اتفاق یا کثرت راے سے اُن کی منظوری یا نامنظوری عمل میں آئے۔ دوسرے جہانتک ممکن ہو ہر شہر و قصبہ میں کانفرنس کے مقاصد کے لیئے کمیٹیاں قائم کیجائیں اور جہاں جہاں اسلامی انجمنیں قائم ہیں اگر وہ منظور کریں تو اُنھیں کو کانفرنس کی کمیٹیاں تصور کیا جائے تاکہ یہ کمیٹیاں اپنے اپنے نواح یا ضلع یا شہر یا قصبہ کی نسبت وقتاً فوقتاً ہر قسم کے مدارس و مکاتب و صنعت و حرفت و تجارت و زراعت وغیرہ کی ترقی و تنزل کے حالات جو مسلمانوں سے علاقہ رکھتے ہیں تحریر کر کے کانفرنس کے جلسوں میں بھیجتے رہیں اور جو تجویزیں کانفرنس کے سالانہ جلسوں میں منظور ہوں اُن میں سے جو تجویز اُنکے علاقہ میں قابل اجرا ہو اُسکے جاری کرنے میں کوشش کریں

۱۸۸۶ء سے ۱۸۹۶ء تک اُسکے سالانہ جلسے برابر مختلف شہروں میں ہوتے رہے مگر سال گذشتہ میں کچھ تو سرکاری روک ٹوک کے سبب جو طاعون کے انسداد کے لیئے ریل کے مسافروں کے ساتھ جا بجا کیجاتی تھی

اور زیادہ تر سرسید کی افسردہ دلی اور انقباض کی وجہ سے۔ جس کی نوبت آخر کو مرض الموت تک پہنچ گئی اُسکا اجلاس موقوف کیا گیا۔ منجملہ گیارہ کے اول کے پانچ اجلاسوں میں پنجاب اور شمال مغربی اضلاع کے مختلف مقامات کی چھوٹی بڑی ۵۳ رپورٹیں اسلامی انجمنوں اور خاص خاص شخصوں نے لکھکر کانفرنس میں بھیجیں یا خود آکر پیش کیں۔ اُسکے بعد ظاہرا پھر کوئی رپورٹ نہیں آئی اور تقریبًا اسی رزولیوشن اتفاق یا کثرت رائے سے پاس ہوئے۔

ہر سال اجلاس کی تمام کارروائی ایک کتاب کی صورت میں چھپکر ممبروں کو تقسیم ہوتی رہی جس میں کیفیت انتظام کانفرنس۔ فہرست ممبران و وزیٹران، تعداد زرچندہ، رپورٹ سکرٹری متضمن حساب جمع وخرچ زرچندہ کیفیت تعمیل و عدم تعمیل تجویزات سالگذشتہ، رزولیوشن جو اجلاس میں پیش ہوکر پاس ہوئے اور اُن کے متعلق ممبروں کی اسپیچیں اور مباحثے۔ رپورٹیں جو مختلف اضلاع سے موصول ہوئیں، لیکچر اور نظمیں جو کانفرنس میں پڑھی گئیں وغیرہ وغیرہ درج ہوتی تھیں۔

اس اجتماع کا نتیجہ براہ راست یہ ہونا چاہیئے تھا کہ جو تجویزیں کانفرنس کے اجلاس میں ہر سال منظور ہوکر شائع ہوئیں اُنکے موافق ہر ضلع کی اسلامی انجمنیں اپنی اپنی بستیوں اور شہروں میں عملدرآمد کرتیں جو تعمیلیں کانفرنس کے سکرٹری سے تعلق رکھتی تھیں اُنکو سکرٹری انجام دیتا اور عام مسلمان جہانتک اُنکے قبضۂ اختیار میں تھا۔ کانفرنس کی تجویزوں کی تائید اور کانفرنس کی صلاح کے موافق اپنی اولاد کی ترقی تعلیم کا انتظام کرتے۔ کیونکہ کانفرنس اسکے سوا اور کچھ اختیار نہیں رکھتی کہ مسلمانوں کو اُنکی واقعی حالت سے اور جو تدبیر اُن کی بھلائی کے لئے مناسب سمجھے اُس سے آگاہ کردے۔

لیکن سوا اسکے کہ سرسید نے جو ابتدا سے اخیر دم تک سکرٹری رہے اپنے فرائض کا پورا پورا حق ادا کیا اور اُنہیں کی توجہ اور کوشش سے کانفرنس کے اجلاس برابر گیارہ برس تک ترقی روزافزوں کے ساتھ ہوتے رہے اُس کی تجویزوں پر بہت ہی کم عمل درآمد ہوا۔ سرسید ہر سال جہاں کانفرنس ہوتی تھی وہاں اجلاس کی تاریخوں سے کئی کئی دن پہلے جو پہنچتے تھے۔ وہاں کی لوکل کمیٹی کو ہر قسم کے انتظام میں مدد دیتے تھے اُنہیں کی صلاح اور مشورہ سے اجلاس کے لیے اکثر ہال تیار ہی اور ممبروں کی آسایش کا بندوبست ہوتا تھا۔ وہ خود کانفرنس کی کارروائی کے قواعد اور پروگرام بناتے تھے ٹکٹ چھپواتے۔ رزولیوشن انتخاب کرتے تھے، سال گذشتہ کا حساب اور تعمیلات کی رپورٹ کانفرنس میں پیش کرنے کے لیئے تیار کرتے تھے کانفرنس کے اجلاس کے بعد تمام کارروائی کو ایک کتاب کی صورت میں مرتب کرتے تھے اُسکو چھپوا کر تمام ممبروں کے پاس بھیجتے تھے۔ مینجنگ کمیٹی جو ہر سال کانفرنس کا مقام تجویز کرنے کے لیے مقرر ہوتی

تھی، اُس سے خط کتابت کرتے تھے سال بھر میں کانفرنس کے متعلق وقتاً فوقتاً اخبار میں آرٹکل چھاپتے تھے اور جب کانفرنس کا اجلاس علی گڈہ میں ہوتا (اور زیادہ تر علیگڈہ ہی میں ہوتا تھا) تو لوکل کمیٹی کے تمام فرائض خود انجام دیتے تھے۔ اُنہوں نے صرف اس غرض سے کہ ہر ایک ضلع کی رپورٹ باقاعدہ مرتب ہو کر آیا کرے۔ دوسرے سال کے اجلاس میں ضلع علی گڈہ کی مفصل رپورٹ بطور نمونہ کے لکھنؤ میں خود لکھکر پیش کی تھی۔ جن رزولیوشنوں کی تعمیل بحیثیت سکرٹری ہونے کے اُنکی ذات سے متعلق ہوتی رہی اُنہوں نے برابر اُسکی تعمیل کی۔ کبھی کسی لوکل گورنمنٹ سے کبھی سررشتہ تعلیم سے اور کبھی یونیورسٹی کے رجسٹرار سے اُنکو خط کتابت کرنی پڑتی تھی اور تمام خط کتابت کا خلاصہ اور اُسکا نتیجہ کانفرنس کے دوسرے اجلاس میں پیش کرنا ہوتا تھا۔ باوجود ان تمام باتوں کے وہ خود بھی اور ممبروں کی طرح اکثر رزولیوشن پیش کرتے اور اُن پر لمبی لمبی اسپیچیں دیتے تھے۔ اس کے سوا اور بھی بہت سے کام کانفرنس کے متعلق اُن کو انجام کرنے پڑتے تھے جیسا کہ کانفرنس کے گذشتہ جلسوں کی رپورٹوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ البتہ جہاں جہاں کانفرنس کے اجلاس ہوئے وہاں کی لوکل کمیٹیوں نے بھی چندہ کی فراہمی اور ممبروں کی مدارات اور اُن کی آسائش و خورونوش کا انتظام نہایت فیاضی اور کوشش و جانفشانی سے کیا مگر جہاں کانفرنس کا جلسہ ختم ہوا پھر سال بھر تک کسی کو اُسکا خیال تک نہیں آتا تھا۔

کانفرنس میں بہت سے رزولیوشن ایسے پاس ہوئے ہیں کہ اگر اُنکے موافق عمل درآمد ہوتا تو قوم کو بہت فائدہ پہنچنے کی اُمید تھی۔ مثلاً قرآن مجید کی تعلیم کو ترقی دینا۔ مسلمانوں کے اوقاف کی طرف گورنمنٹ کو توجہ دلانا۔ تمام شہروں اور قصبوں میں مقاصد کانفرنس کی تائید کے لیئے کمیٹیاں قائم کرنی اور اسلامی انجمنوں سے اُسکی تائید کی خواہش کرنی۔ تمام اسلامی انجمنوں کا اسباب میں کوشش کرنا کہ مسلمان طلبہ کی وظیفوں سے امداد کیجائے، سرکاری مدرسوں میں مسلمانوں کو مذہبی تعلیم کا موقع دینے کی گورنمنٹ سے درخواست کرنی۔ تعلیم نسواں کے لیئے مذہب اسلام اور طریقۂ شرفاے اہل اسلام کے موافق مدرسے جاری کرنے۔ یورپ کے مورخوں نے جو غلط الزام مسلمانوں پر لگائے ہیں اُن کی غلطیاں دور کرنے کے لیئے رسائل لکھے جانے۔ مسلمان بادشاہوں کے قدیم فرامین جمع کر کے اُنکو محفوظ رکھنے کے لیئے چھپوانا، صاف اور سلیس اُردو میں اخلاقی رسالے اور کتابیں لکھی جانی جو لڑکوں کی تعلیم میں آسکیں۔ مسلمانوں کی قدیم اور مستند کتابوں کا جو کہ اب نادر الوجود ہیں۔ پتا لگانا اور تا بمقدور اُن کو بہم پہنچانا۔ اسبات کی تحقیقات کرنی کہ جو علوم مسلمانوں نے یونان وغیرہ ملکوں سے حاصل کئے تھے اُن پر کس قدر اضافہ اُنہوں نے خود کیا ہے وغیرہ وغیرہ۔ مگر افسوس ہے کہ اُن میں سے کسی تجویز پر الا ماشاء اللہ

کوئی معتدبہ توجہ قوم یا قومی انجمنوں کی طرف سے نہیں ہوئی۔

باایںہمہ کانفرنس سے جو نتائج بالذات یا بالعرض پیدا ہوئے وہ بھی امید اور توقع سے زیادہ تھے سب سے بڑا فائدہ جو اس مجلس کے انعقاد سے ہوا وہ یہ تھا کہ ہر سال مسلمانوں کی ایک جماعت کثیر جس کی تعداد بعض اجلاسوں میں ہزار ہزار سے متجاوز ہو گئی نہ کسی سیر اور تماشے کی غرض سے۔ کسی حاکم کے حکم سے اور نہ کسی ذاتی منفعت کے لیئے بلکہ محض اس خیال سے کہ جو مجمع قوم کی بھلائی کے ارادہ سے ہوتا ہے اُس میں شریک ہوں۔ دور دراز سفر کی تکلیف اور آمد و رفت کا خرچ برداشت کر کے کانفرنس کے جلسوں میں شریک ہوتے تھے۔ ایک دوسرے سے ملتے تھے۔ ایک جگہ کھانا کھاتے تھے ایک جگہ رہتے تھے۔ قومی معاملات پر گفتگو کرتے تھے۔ ہنستے تھے۔ بولتے تھے۔ انجانوں میں تعارف پیدا ہوتا تھا۔ دوستوں میں خلوص بڑھتا تھا۔ اور اس طرح ایک مردہ اور پراگندہ قوم کے اجزا میں روز بروز التیام پیدا ہوتا جاتا تھا۔ اسکے سوا جب سے کانفرنس قائم ہوئی مسلمانوں میں علی العموم تعلیم کا خیال زیادہ ہو گیا۔ خصوصاً جس شہر میں کانفرنس کا اجلاس ہوتا تھا وہاں کے باشندوں پر بالخصوص اُسکا اور بھی زیادہ اثر پڑتا تھا۔ اسکے علاوہ صرف کانفرنس کی بدولت گذشتہ برسوں میں غریب مسلمان طلبہ کی امداد بہت زیادہ ہوتی رہی۔ کئی سال تک خود کانفرنس کے چندہ میں سے بعد منہائی اخراجات کے جسقدر روپیہ بچا وہ وظائف میں صرف ہوتا رہا۔ نیز پنجاب کی اکثر اسلامی انجمنوں نے کانفرنس کی صلاح سے بہت سے طالب علموں کی امداد کی۔ کانفرنس ہی کی تحریک یا اقتضا سے بہت سے عمدہ اور نہایت عمدہ رسالے، مضامین، اور لکچر ایسے تیار ہو گئے جن کو اُردو لٹریچر میں ایک معقول اضافہ ہوا ہے جیسے مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم۔ الجزیہ۔ مضمون کتب خانہ اسکندریہ۔ حقوق الذمیین۔ مسلمانوں کی ترقی و تنزل کے اسباب۔ ابوریحان بیرونی کی لائف۔ کتاب کلیلہ و دمنہ کے تاریخی حالات۔ اشاعت اسلام بلا استعانت حسام۔ شمس العلما مولانا نذیر احمد اور نواب محسن الملک اور آنریبل سید محمود کے لکچر اور اسپیچیں وغیرہ وغیرہ۔ ایک اور ضمنی فائدہ کانفرنس سے یہ ہوا کہ پبلک سپیکنگ کی لیاقت میں کانفرنس کے مباحثوں سے بہت ترقی ہو گئی جن لوگوں کی طبیعت میں اُسکی خداداد قابلیت موجود تھی۔ مگر اسکے ظاہر ہونے کا کوئی موقع نہ تھا اُن کو کانفرنس میں گفتگو کرنے کا موقع ملتا تھا اور اُن کا ایک مخفی جوہر ظاہر ہوتا تھا اور چونکہ ممبروں کی تمام اسپیچیں کانفرنس کی روئداد میں ہر سال چھپتی تھیں اس سے اُردو لٹریچر میں ایک اور بکار آمد اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ اسی کانفرنس کی تحریک سے الہ آباد یونیورسٹی نے ”کاکس ہسٹری“ کو جس میں مسلمانوں کی توہین کے مضامین مندرج تھے۔ ہائی اسکولوں کے کورس سے خارج کیا، اور جب کہ یونیورسٹی

میں نہایت زور شور سے اس بات کی تحریک ہوئی کہ فارسی زبان یونیورسٹی کی تعلیم سے خارج کیجائے تو اسی کانفرنس کے ذریعہ سے یونیورسٹی کو مسلمانوں کی ایک باوقعت جماعت کے خیالات سے مطلع ہونے کا موقع ملا اور اُسکو معلوم ہو گیا کہ اگر فارسی زبان یونیورسٹی کے کورس سے خارج کی جائے گی تو اُس سے مسلمانوں کی دلشکنی ہی نہ ہو گی بلکہ ہندوستان کی تہذیب۔ اُسکے علم مجلس اور اُسکی ملکی زبان یعنی اُردو کو سخت صدمہ پہنچیگا۔ نیز کانفرنس ہی تجویز کے موافق نواب وقار الملک کو گورنمنٹ میں اس بات کی تحریک کرنے کی جرات ہوئی کہ سرکاری مدارس میں مسلمانوں کی مذہبی تعلیم کی اجازت دیجائے۔ چنانچہ گورنمنٹ اضلاع شمال مغرب نے بعض شرائط پر اُسکی اجازت دیدی جسکا شکریہ گیارہویں اجلاس میں ادا کیا گیا۔

سب سے عمدہ اور نتیجہ خیز تجویز جو کانفرنس کے اجلاس واقع ۱۸۹۶ء میں بمقام دہلی مسٹر تھیوڈ وربک پرنسپل علیگڈہ کالج نے پیش کی تھی وہ تعلیمی مردم شماری کی تجویز تھی۔ یعنی یہ کہ ہندوستان میں جو مسلمان اپنی اولاد کو انگریزی تعلیم نہیں دلواتے اُن کا اندازہ کیا جائے کہ وہ کسقدر ہیں؟ اور کیوں وہ اپنی اولاد کو تعلیم نہیں دلواتے؟ آیا مذہبی خیالات سے، یا اسوجہ سے کہ تعلیم کے اخراجات کا مقدور نہیں رکھتے یا محض اپنی بے پروائی اور سہل انکاری کے سبب؟ اور جنکی نسبت تیسری وجہ معلوم ہو اُن کو اولاد کی تعلیم پر متوجہ کیا جائے۔ اُنسے اس غرض کے لئے خط کتابت کیجائے اور اُنکے سمجھانے کے لئے لائق آدمی بھیجے جائیں۔ چنانچہ اس تجویز میں مسٹر بک کی توجہ سے بہت کامیابی ہوئی ہے اور اگر اسی طرح کوشش برابر جاری رہے تو اُس سے عمدہ نتیجے پیدا ہونے کی امید ہے۔

اسی طرح اور بھی بہت سے فائدے ہیں جو کانفرنس کے نتائج میں شمار ہو سکتے ہیں مگر ایسے مجمعوں کے مفید یا غیر مفید ہونے کا اندازہ ان باتوں سے نہیں ہوتا بلکہ صرف اس بات سے ہوتا ہے کہ قوم اُسکو برابر ترقی روز افزوں کے ساتھ قایم رکھ سکتی ہے یا نہیں؟ اگر قوم میں اُسکے تھامنے اور ترقی دینے کا حوصلہ پایا جاتا ہے تو اُسکی نسبت نہایت وثوق کے ساتھ پیشین گوئی کیجا سکتی ہے کہ وہ مسلمانوں کی قوم میں جان ڈالنے والی اور اُن کو قومیت کے درجہ تک پہنچانے والی ہو گی لیکن اگر اُسکا مدار کسی خاص شخص کی ذات پر ہو تو اُسکا عدم اور وجود برابر ہے کیونکہ اس قسم کے سالانہ جلسوں کے نتائج اُن ملکوں میں بھی جو صدیوں سے اُنکے عادی چلے آتے ہیں اور اُنسے بیشمار فائدے اُٹھا چکے ہیں۔ مدت دراز کے بعد ظہور میں آتے ہیں۔ پس ہندوستان جیسے ملک میں جہاں محض یورپ کی تقلید سے ایسی مجلسیں انعقاد پاتی ہیں۔ جہاں نہ قومی بندش ہے نہ عملی طاقت اور جہاں قومی مجلسیں پبلک پر کسی قسم کا رعب داب نہیں رکھتیں۔ یہ امید رکھنی فضول ہے کہ کوئی کانفرنس یا کانگریس قوم کو چند سال میں کوئی

معتدبہ فائدہ پہنچا سکے۔ جو لوگ کانفرنس پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اُسنے آجتک کوئی کارنمایاں نہیں کیا وہ گویا اُسکو کمہار کا آوا سمجھتے ہیں جسمیں برتن بہت جلد پک کر تیار ہو جاتے ہیں لیکن درحقیقت وہ کمہار کا آوا نہیں بلکہ چینی کا خمیر ہے جسکے تیار ہونے کا سالہا سال درازتک انتظار کرنا چاہیے۔

اگرچہ ۱۸۹۷ء میں جو سرسید کی افسردہ دلی کے سبب کانفرنس کا اجلاس منعقد نہو سکا اس سے بہت بہت بڑی مایوسی ہو گئی تھی اور لوگوں کو یقین ہو گیا تھا کہ سرسید کے بعد کانفرنس کا قائم رہنا مشکل ہے لیکن سرسید کی وفات کے بعد جو غیر معمولی جوش مسلمانوں میں اُٹھا اُس سے کانفرنس میں پھر جان پڑگئی نواب محسن الملک نے سرسید کی زندگی ہی میں کئی سال سے کانفرنس کی ترقی پر کوشش کرنی شروع کر دی تھی۔ خصوصاً ۱۸۹۶ء میں جیسا کہ گیارہویں اجلاس کی رپورٹ میں مفصل مذکور ہے۔ جو کوشش اور جانفشانی اُنہوں نے کانفرنس کی اصلاح اور ترقی میں کی وہ گذشتہ دس سال میں کبھی کسی سے بن نہیں آئی تھی۔ اور اب بھی جس سرگرمی کے ساتھ کہ وہ محمڈن کالج کی ترقی پر متوجہ ہوئے ہیں۔ اُسیطرح اُنہوں نے کانفرنس کی طرف توجہ کی ہے۔

سول سروس کمیشن کی ممبری

۱۸۸۶ء میں سرسید کو لارڈ ڈفرن نے سول سروس کمیشن کی ممبری کے لیئے انتخاب کیا اس کمیشن میں سرسید کے سوا کوئی ہندوستانی ممبر ایسا نہ تھا جو انگریزی کی اعلیٰ درجہ کی لیاقت نہ رکھتا ہو صرف سرسید ہی ایک ایسے ممبر تھے جو انگریزی میں سوا اسکے کہ اپنا نام لکھ سکتے تھے یا بقدر ضرورت انگریزی سمجھ سکتے تھے۔ اور ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں معمولی بات چیت کر سکتے تھے اور کچھ نہ جانتے تھے باوجود اسکے جیسا کہ سُنا گیا ہے۔ ممبری کمیشن کے فرائض اُنہوں نے نہایت عمدگی سے ادا کئے۔ جس طرح ویسرئیگل کونسل کی ممبری میں اُنہوں نے ہر ایک قانون پر۔ جو اُنکی موجودگی میں پیش ہوا۔ بڑی بڑی لیگل اسپیچیں کیں اور قانونی لیاقت کا بہت بڑا ثبوت دیا اسی طرح سول سروس کمیشن میں تمام سوالات پر جو کمیشن کے زیر بحث تھے نہایت قابلیت کے ساتھ بحث کی۔

افسوس ہے کہ کمیشن مذکور کی رپورٹ میں ممبروں کے مباحثے اور اُنکی اسپیچیں جن سے ہر ایک سوال کے متعلق ہر ایک ممبر کی رائے معلوم ہو۔ بالکل درج نہیں کی گئیں اور اسلئے ہمارے پاس کوئی ذریعہ معلوما کا ایسا نہیں جس سے سرسید کی کارگزاری اور اُن کی رایوں کا۔ جو کمیشن میں اُنہوں نے ظاہر کیں۔ سُراغ لگ سکے۔ صرف ایک خط سرسید کا جو راقم کے خط کے جواب میں اُنہوں نے اسی امر کے متعلق لکھا تھا موجود ہے۔ اُسمیں سے چند سطریں جو اس مقام کے مناسب ہیں نقل کی جاتی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں۔

"سول سروس کمیشن کا حال دریافت کرنے کے لئے جو آپ رپورٹ طلب کرتے ہیں اُس سے آپ کو

کچھ فائدہ نہو گا اُس میں بجز اسکے کہ کثرت رائے فلاں امر کیطرف ہوئی اور کچھ نہیں ہے۔ یہانتک کہ اُن ممبروں کا جن کی رائے مخالف یا موافق تھی۔ نام بھی ظاہر نہیں کیا گیا۔ اگر آپ کو میری نسبت کچھ لکھنا ہے تو اُسکا خلاصہ یہ ہے کہ پبلک سروس کمیشن میں میں اسبات پر ساعی تھا کہ سٹیٹوٹری سول سروس جو جاری ہے اور جس سے ہندوستانیوں کا انتخاب یوروپین کے عہدوں پر ہوتا ہے وہ منسوخ نہو۔ اور جو قواعد اُسکی نسبت گورنمنٹ سے جاری ہوئے ہیں اگر ضرورت ہو تو اُن میں کچھ اصلاح کیجائے۔ کثرت رائے اسکے برخلاف تھی اور وہ یہ چاہتے تھے کہ قانون مذکور منسوخ ہو اور اسکی جگہ دوسرا قانون پارلیمنٹ سے جاری ہو اور اسمیں جدید قواعد مرتب کیے جائیں اسی کثرت رائے کے مطابق یہاں سے رپورٹ گئی۔ مگر ولایت میں یہ تجویز ہوئی کہ سٹیٹوٹری سول سروس کے قانون کو منسوخ کرنا ضرور نہیں اور جدید قانون کے بھی جاری کرنے کی حاجت نہیں۔ مگر ولایت سے اُسی تجویز کے مطابق جو کہ کثرت رائے سے جدید قانون بنانے کے لئے لکھی گئی تھی۔ کچھ قواعد بنکر آئے جنکے بموجب اب عملدرآمد ہے اور جن کو میں پسند نہیں کرتا زیادہ تفصیل اسکی بغیر آپ کی ملاقات کے بیان نہیں ہوسکتی۔

سرسید کا یہ خط ۲۲ نومبر ۱۸۹۵ء کو لکھا ہوا ہے اگرچہ اس خط کے آنے کے بعد کئی دفعہ اُن سے ملنے کا اتفاق ہوا مگر اس خیال سے کہ جب کمیشن مذکور کی ممبری کا حال لکھنے کا وقت آئیگا اُس وقت اُس کی مفصل کیفیت دریافت کیجائے گی۔ اُنسے زیادہ تفصیل نہیں پوچھی گئی۔ کیا خبر تھی کہ جب پوچھنے کا وقت ہوگا اُسوقت وہ دُنیا میں نہ ہونگے۔ لاچار اسی مختصر بیان پر اکتفا کیا گیا۔

انڈین نیشنل کانگرس کی مخالفت

سرسید کی لائف میں کانگرس کی مخالفت کرنا ایک ایسا واقعہ ہے جسکا اثر ہندوستان سے لیکر انگلستان تک ایک نہایت تعجب انگیز صورت میں اور مختلف قوموں پر مختلف طور سے ظاہر ہوا ہے۔ اسلئے ہم اس واقعہ کو کسیقدر تفصیل کے ساتھ بیان کرینگے۔

مئی ۱۸۷۷ء میں بابو سرندرو ناتھ بنرجی نے ہندوستان کے اکثر حصوں کا اس غرض سے دورہ کیا تھا کہ ہندوستان کی تعلیم یافتہ جماعتوں کو اسبات کی طرف متوجہ کیا جائے کہ سول سروس کے امیدواروں کی عمر جو ۲۱ برس سے گھٹا کر ۱۹ برس کی قرار دی گئی ہے۔ اُسکی بابت گورنمنٹ سے درخواست کریں کہ ۲۱ برس کی عمر کا قاعدہ جو امتحان مذکور کے لئے پہلے مقرر تھا وہی اب پھر جاری کیا جائے۔ اور تمام ہندوستانی ملکر ایک فنڈ بنام نیشنل فنڈ جمع کریں تاکہ جب کبھی اُنکو گورنمنٹ ہند یا گورنمنٹ انگلستان میں کوئی درخواست یا شکایت پیش کرنے کی ضرورت ہو اُس فنڈ کی آمدنی میں سے خرچ کیا کریں۔

اس دورہ میں اُنہوں نے ایک مقام علی گڑھ میں بھی کیا تھا اور جو جلسہ اس مقصد کے لئے علی گڑھ میں ہوا تھا اُسمیں سرسید صدر انجمن تھے نیز جو درخواست سول سروس کی عمر بڑھانے کے لئے ولایت بھیجی

کے اُصول سے محض بے خبر۔ اُن میں غالب حصہ اُن لوگوں کا ہے جنکے نزدیک تمام ملک کا متفق ہوکر گورنمنٹ کے انتظام پر نکتہ چینی کرنا اور ایجیٹیشن پھیلانا بعینہ ایسا ہے جیسے سلطنت سے بغاوت اختیار کرنا۔ پس اُن کی اور خاص مسلمانوں کی خیر اسی میں ہے کہ وہ تعلیم یافتہ لوگوں کے ایجیٹیشن سے بالکل علیحدہ رہیں اور ایسی ہدایتوں سے جو ناواقفوں کی گمراہ کرنے والی ہوں اپنے کان بند کرلیں اُن کو یقین تھا کہ سنہ ۵۷ کی بغاوت نے ہندوستانیوں کے اعتبار کو سو برس پیچھے ہٹا دیا ہے وہ کہتے تھے کہ "اگر یہ واقعہ ظہور میں نہ آتا تو آج ہمارے سیکڑوں جوان والنیٹر ہوتے ایجٹ اسلحہ وجود میں نہ آتا اور ہم میں بہت سے لوگ فوج کے کپتان اور کرنیل و جرنیل نظر آتے پس اسباب کا خوف کرنا کچھ بے جا نہ تھا کہ مبادا جو صفائی اور اعتبار ہندوستانیوں نے تیس برس میں از سرِ نو حاصل کیا ہے یا کرتے جاتے ہیں وہ پھر اُسی بے اعتباری کے ساتھ بدل جائے جو تیس برس پہلے گورنمنٹ کو اُن کی طرف سے ہوگئی تھی۔

باوجود ان تمام باتوں کے سرسید نے علی الاعلان کانگرس کی مخالفت ظاہر کرنے میں جلدی نہیں کی۔ وہ ابتدا سے ہندو مسلمانوں میں قومی اتحاد اور سوشل یگانگت پیدا کرنے کے خواہشمند تھے اُنہوں نے ملکی معاملات میں ہندوؤں سے کبھی مغائرت کا خیال نہیں کیا۔ ملازمت کے زمانہ میں اُنکا برتاؤ ہندو مسلمانوں کے ساتھ ہمیشہ یکساں رہا۔ ایام غدر میں بجنور کے ہندو رئیسوں نے خود درخواست کرکے ضلع کا انتظام اُن کے سپرد کرایا۔ سائنٹفک سوسائٹی کے قائم کرنے سے اُنکا اصل مقصد یہ تھا کہ ہندو مسلمانوں اور انگریزوں میں میل جول اور اتحاد کو زیادہ ترقی ہو۔ اگرچہ ۱۸۶۷ء میں جبکہ شمال مغربی اضلاع کی اکثر ہندو سبھاؤں اور انجمنوں نے اُردو زبان اور فارسی حرفوں کے برخلاف نہایت سخت کوشش کی تھی۔ سرسید کی طبیعت ہندوؤں کی طرف سے کھٹک گئی تھی۔ اور اُن کو یہ اُمید نہ رہی تھی کہ ہندو مسلمان مثل ایک قوم کے مل جلکر کوئی کام کرینگے۔ اسکے سوا بنگالی اخباروں کی نکتہ چینیاں اور اعتراضات جو کہ وہ ہمیشہ گورنمنٹ کی اُن جزدی رعایتوں پر کرتے رہتے ہیں جو کبھی کبھی مسلمانوں کے ساتھ اُن کی حالت کے لحاظ سے کی جاتی ہیں۔ اور اُن کی وہ مخالفانہ اور دلشکن تحریریں جو مسلمانوں کے برخلاف اُن میں ہمیشہ چھپتی رہی ہیں۔ اور بھی مایوس کرنے والی تھیں مگر پھر بھی جہانتک ممکن تھا وہ دونوں قوموں میں اتحاد قائم رکھنے کا ہمیشہ خیال رکھتے تھے۔ اُنہوں نے بارہا اپنی پبلک اسپیچوں میں ظاہر کیا ہے کہ ہندو مسلمانوں کی بھلائی اسی میں ہے کہ وہ سب اپنے تئیں ایک قوم سمجھیں اور کوئی کام ایسا نہ کریں جس سے مغائرت پائی جائے یہانتک کہ گائے

کی قربانی کی نسبت جیسا کہ اُنہوں نے ایک آرٹکل میں ظاہر کیا تھا۔ ہمیشہ اُنکی یہ رائے رہی ہے کہ اگر ہم میں اور ہندوؤں میں دوستی قائم رہے تو یہ دوستی ہمارے لیئے گائے کی قربانی سے بہت زیادہ بہتر ہے اور مسلمانوں کا اسپر اصرار کرنا محض جہالت کی بات ہے۔ محمدن کالج علیگڈہ میں اُنہوں نے کوئی قاعدہ ایسا نہیں رکھا جس سے مسلمان طالب علموں کی ہندوؤں پر ترجیح لازم آئے۔ چنانچہ ابتک تقریبًا دوسو ہندو طالب علم اس کالج سے مختلف امتحانوں میں کامیاب ہو چکے ہیں۔

پس اگرچہ وہ کانگرس کے طریق عمل کو ناپسند کرتے تھے مگر اس خیال سے کہ دونوں قوموں میں زیادہ اختلاف نہ پیدا ہو جائے۔ دو برس تک اُنہوں نے کانگریس کے برخلاف کوئی کارروائی نہیں کی بلکہ نہایت صبر و خاموشی کے ساتھ اسبات کے منتظر رہے کہ کانگرس میں کیسی تجویزیں پیش ہوتی ہیں اور کس قسم کے حقوق وہ گورنمنٹ سے طلب کرتے ہیں؟ یہانتک کہ کانگریس کی رپورٹیں شائع ہوئیں اور اُسکے مقاصد اُنکو معلوم ہوئے تو اُنکو پختہ یقین ہو گیا کہ اگر بالفرض کانگرس کی کارروائیوں پر گورنمنٹ کو کچھ اعتراض نہ ہو اور اُسکے مطالبے بھی سراسر ادب اور تہذیب کے ساتھ ہوں تو بھی مسلمانوں کا اور اُن تمام قوموں کا جو تعلیم کے لحاظ سے نہایت پست حالت میں ہیں کانگرس میں شریک ہونا اور اُسکی تائید کرنا کسی طرح مناسب نہیں۔ اُنہوں نے خیال کیا کہ کانگرس کے اصلی اور مقدم مقاصد ایسے ہیں کہ اگر وہ پورے ہو جائیں تو مسلمانوں کی پولٹیکل حالت کو سخت صدمہ پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ مثلًا مقابلہ کا امتحان جو متعہد عہدوں کے لئے ولایت میں ہوتا ہے اُسکا ہندوستان میں ہونا۔ یا تمام غیر متعہد عہدوں کا مقابلہ کے امتحان کے ساتھ مشروط ہونا۔ یا مجلس لیجسلیٹو کونسل میں رعایا کی طرف سے اور رعایا کے انتخاب سے ممبروں کا مقرر ہونا وغیرہ وغیرہ پھر اسی کے ساتھ آن کو معلوم ہوا کہ مدراس میں جو عنقریب کانگریس کا اجلاس ہونے والا ہے اسمیں تعلیم یافتہ نوجوان مسلمان بھی شریک ہونے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس لیئے اُنکو ضروری معلوم ہوا کہ مسلمانوں کو اُن نتائج سے آگاہ کر دیں جو اُن کے نزدیک کانگرس کی شرکت سے مسلمانوں کے حق میں پیدا ہونے والے تھے۔

۲۸ دسمبر ۱۸۸۷ء کو جبکہ محمدن ایجوکیشنل کانفرنس کا دوسرا اجلاس لکھنؤ میں اور کانگرس کا تیسرا اجلاس مدراس میں ہو رہا تھا مسلمانوں کے عام جلسہ میں سرسید نے انڈین نیشنل کانگرس کے خلاف ایک نہایت مفصل اور پرزور لکچر دیا جو اُن کی اسپیچوں کے مجموعہ میں چھپ گیا ہے۔ اور

اسلیئے اُسکے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔ مگر جو بحث کہ اُسمیں کونسل کے الکشن اور امتحان مقابلہ پر کی گئی ہے اُسکا لب لُباب ہم اس مقام پر لکھتے ہیں۔ کونسل کے الکشن کے متعلق اُن کی تقریر کا ماحصل یہ ہے کہ "اگر کونسل کے ممبر انتخاب سے مقرر ہوں تو کسی طرح مسلمانوں کی تعداد ہندوؤں کے برابر نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ ہندوؤں کی تعداد ہندوستان میں بمقابلہ مسلمانوں کے چوگنی ہے۔ پس جو طریقہ انتخاب کا قرار دیا جائیگا اُس سے اگر ایک مسلمان ممبر ہوگا تو چار ہندو ہونگے۔ اور اگر بالفرض محال کوئی ایسا قاعدہ رکھا جائے جسکے رو سے ہندو اور مسلمان دونوں قوموں کے ممبر برابر رہیں تو موجودہ حالت میں ایک مسلمان بھی ایسا نہ نکلیگا جو والسرائے کی کونسل میں بمقابلہ ہندوؤں کے کام کرنے کے قابل ہو" اس موقع پر اُنہوں نے صاف یہ بات کہی کہ "میں نے کونسل میں چار برس کام کیا ہے مگر ہمیشہ یہ سمجھا ہے کہ مجھ سا ذلیل اور نالائق اور مجھ سے بدتر کوئی ممبر نہیں ہوسکتا"۔ اسکے بعد جو تقریر اُنہوں نے کی ہے اُسکا خلاصہ یہ ہے کہ "اگر بالفرض کوئی ایسا مسلمان نکل بھی آئے تو ہرگز یہ امید نہیں کہ وہ اپنے کاروبار چھوڑ کر۔ سفر کی تکلیف گوارا کرکے۔ تمام اخراجات جو ایک ممبر کونسل کے لیئے زیبا ہیں اپنے پاس سے برداشت کرکے یا قوم سے چندہ کرکے کلکتہ اور شملہ میں حاضر رہیگا"۔ مقابلہ کے امتحان کی نسبت اُن کی تمام تقریر کا خلاصہ یہ ہے کہ "اس امتحان کے لیئے ہمارا ملک تیار نہیں ہے۔ انگلستان میں مقابلہ کا امتحان ہر شخص ڈیوک سے لیکر ایک ادنی درزی کے بیٹے تک دلیسکتا ہے۔ چنانچہ جو لوگ ولایت سے مقابلہ کا امتحان دیکر یہاں آتے ہیں اُن میں اعلیٰ سے اعلیٰ اور ادنیٰ سے ادنیٰ خاندان کے لوگ ہوتے ہیں۔ مگر یہ لوگ جو انگلستان سے حاکم مقرر ہوکر آتے ہیں وہ ہماری نظر سے اتنی دور ہیں کہ ہم نہیں جانتے کہ وہ کسی لارڈ کے بیٹے ہیں یا درزی کے۔ اسلیئے یہ امر کہ ہم پر ایک ادنی حکومت کررہا ہے ہماری آنکھ سے چھپا رہتا ہے۔ مگر ہندوستان کا حال اسکے برخلاف ہے۔ ہندوستان کی شریف قومیں اپنے ملک کے ایک ادنی درجہ کے شخص کو جسکی جڑ بُنیاد سے وہ واقف ہیں کبھی اپنی جان اور مال پر حاکم ہونا پسند نہ کرینگی۔ اسکے سوا مقابلہ کا امتحان اُس ملک میں ہوسکتا ہے جہاں اعلیٰ سے لیکر ادنی تک سب ایک قوم کے آدمی ہوں یا مختلف قومیں بسبب تعلیم و تربیت کے مل جُلکر ایک ہوگئی ہوں۔ مگر ہندوستان میں جہاں مختلف قومیں آباد ہیں اور ایک قوم دوسری قوم سے بالکل الگ ہے کسی طرح مقابلہ کا امتحان قرین مصلحت نہیں پھر تعلیم و تربیت کے لحاظ سے ہندوستانیوں کی حالت اسقدر مختلف اور متفاوت ہے کہ بہت سی قومیں جیسے مسلمان، راجپوت، سکھ اور جاٹ وغیرہ موجودہ حالت میں کبھی مقابلہ کے امتحان

سے فائدہ نہیں اُٹھا سکتے - بلکہ ہندوستان کی کوئی قوم بنگالیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی - پس اگر ہندوستان میں تمام متعہد اور غیر متعہد عہدوں کے لئے مقابلہ کا امتحان مقرر کیا جائے تو اُسکا نتیجہ یہ ہوگا کہ کوئی ٹکڑا ملک کا ایسا نہ رہیگا کہ سوائے بنگالیوں کے یا کسیقدر تعلیم یافتہ ہندوؤں کے اور کسی کی صورت حکومت یا عدالت کی کرسی پر دکھائی دے -

سر سید کا یہ لکچر اُردو اور انگریزی میں بذریعہ اخبارات کے بہت جلد ہندوستان میں شائع ہو گیا - اور نیز انگلستان کے اکثر نامور اخباروں نے اُس سے نوٹس لیا اور اسپر عمدہ ریمارکس کئے -

اسکے بعد ۱۶ مارچ ۱۸۸۸ء کو بمقام میرٹھ اُنہوں نے دوسرا لکچر اُسیقدر طولانی جیسا کہ لکھنؤ میں دیا تھا مسلمانوں کے عام جلسہ میں دیا - اس لکچر کا بڑا مقصد اس بات کا ثابت کرنا تھا کہ یہ کہنا کہ مسلمان کانگریس میں شریک ہیں بالکل غلط ہے اور معدودے چند مسلمان جو اُس میں شریک ہوئے ہیں اُنہوں نے غلطی کی ہے اور اُنکے شریک ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ مسلمان من حیث القوم کانگریس میں شریک ہیں - یہ لکچر بھی نہایت پُرزور اور مؤثر تھا - ان دونوں لکچروں میں بڑی بات یہ تھی کہ پُرانے خیالات کے مسلمان جو ہمیشہ سر سید کی ہر ایک تجویز کی مخالفت یا اُس سے نفرت ظاہر کرتے تھے اُنھوں نے بالاتفاق اُن کی رائے کو تسلیم کر لیا - اور باستثنائے معدودے چند تمام تعلیم یافتہ مسلمانوں نے بھی اُسپر پورا پورا عمل کیا - نیز پُرانے خیالات کے اکثر ہندوؤں نے اور تقریباً کل تعلقہ داروں، جاگیرداروں اور رئیسوں نے عام اس سے کہ ہندو ہوں یا مسلمان اُنکی رائے سے اتفاق ظاہر کیا -

پیٹریاٹک ایسوسی ایشن

اسکے بعد اگست ۱۸۸۸ء میں سر سید نے بمقام علیگڈہ پیٹریاٹک ایسوسی ایشن اس غرض سے قائم کی کہ جو قومیں اور جو رئیس اور تعلقہ دار وغیرہ کانگریس میں شریک نہیں ہیں اُن کی رائیں اور خیالات اور خط کتابت بطور پمفلٹ کے وقتاً فوقتاً انگریزی میں چھپوا کر اہل انگلستان اور ممبران پارلیمنٹ کی اطلاع کے لئے ولایت کو بھیجی جائے اور نیز اخبارات کے ذریعہ سے ہندوستان اور انگلستان میں عام طور پر شائع کیجائے -

اس ایسوسی ایشن کے قائم کرنے کا یہ نتیجہ ہوا کہ بنگال، بہار، مدراس، بمبئی، ممالک متوسط اضلاع شمال مغرب، اودھ اور پنجاب کی بیشمار اسلامی انجمنوں میں کانگریس کے برخلاف جلسے کئے گئے - تمام تعلقہ داران اودھ، مہاراجہ بنارس، ریاست حیدرآباد اور دیگر ریاستوں کی طرف سے ایسوسی ایشن کے ساتھ اتفاق کیا گیا - اور جسقدر کارروائیاں کانگریس کے برخلاف تمام ملک میں ہوئیں اُنکی رُودادیں ایسوسی ایشن کے ذریعہ سے وقتاً بعد وقتٍ چھپکر ولایت کو روانہ ہوتی رہیں اور پارلیمنٹ کو اس بات

کا یقین دلایا گیا کہ کانگریس میں ہندوستان کی بہت سی قومیں اور خاصکر مسلمان شریک نہیں ہیں۔

بنگالی اخباروں میں سرسید کی اس کارروائی سے سخت ناراضی ظاہر کی گئی اور اُنکے برخلاف بڑے بڑے تلخ آرٹکل لکھے گئے سب سے بڑا اعتراض اُن پر یہ کیا گیا کہ وہ ابتدا سے ریپرزنٹیٹو اصول کے بڑے طرفدار رہے ہیں اور اُن کی تمام اگلی تحریروں اور اسپیچوں سے پایا جاتا ہے کہ وہ رعایا کی آزادی کے بہت بڑے حامی ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ وہ انڈین نیشنل کانگریس پر جو ہندوستان میں ریپرزنٹیٹو اُصول کے موافق عمل درآمد چاہتی ہے۔ معترض ہیں۔

اسمیں شک نہیں کہ وہ ریپرزنٹیٹو گورنمنٹ کو پسند کرتے تھے اور اس باب میں اُنکی اب بھی وہی راے تھی جو وہ ہمیشہ اپنی تحریروں میں ظاہر کرتے رہتے تھے۔ اُنہوں نے خود لکھنؤ کے لکچر میں اقرار کیا تھا کہ "میں کنسرویٹو نہیں ہوں بلکہ بہت بڑا لبرل ہوں" اُنہوں نے کونسل میں جبکہ لارڈ رپن کے سامنے سلف گورنمنٹ کا قانون پیش تھا۔ اپنی اسپیچ میں صاف کہا کہ "میں اسبات کے خیال کرنے سے خوش ہوں کہ میں اسقدر عرصہ تک زندہ رہا کہ میں نے اُس دن کا آغاز دیکھ لیا جبکہ ہندوستان اپنے حاکموں کے ہاتھ سے سلف ہلپ اور سلف گورنمنٹ کے وہ اُصول سیکھنے کو ہے جنہوں نے انگلستان میں ریپرزنٹیٹو انسٹیٹیوشن پیدا کئے ہیں اور اُسکو دُنیا کی قوموں میں بڑا بنا دیا ہے۔

لیکن اسی اسپیچ میں اُنہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ "انگلستان سے ریپرزنٹیٹو انسٹیٹیوشنوں کا اُصول استعار لینے میں اُن سوشل اور پولٹیکل معاملات کا یاد رکھنا ضروری ہے جنکے لحاظ سے ہندوستان اور انگلستان کے درمیان امتیاز پایا جاتا ہے۔ ہندوستان فی نفسہ ایک براعظم ہے اور اُسمیں مختلف مذاہب کے آدمی کثرت سے رہتے ہیں مذہبی دستورات کی سختی نے ابتک ہمسایوں کو بھی ایک دوسرے سے جُدا رکھا ہے۔ ذات کا قاعدہ بہت شد و مد کے ساتھ جاری ہے ممکن ہے کہ ایک ہی ضلع میں مختلف مذاہب اور مختلف قوموں کے باشندے ہوں، اور ایک گروہ دولتمند اور تجارت پیشہ ہو تو دوسرا گروہ ذی علم اور ذی رعب ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ایک گروہ بلحاظ تعداد کے دوسرے گروہ سے بڑا ہو اور روشن ضمیری کے جس درجہ تک وہ گروہ پہنچ گیا ہو وہ درجہ باقی باشندوں کے درجہ سے بہت اعلیٰ ہو۔ ایک قوم اسبات سے بخوبی واقف ہو کہ لوکل بورڈوں اور ضلع کی کونسلوں میں اُنکی طرف سے ممبروں کا شریک ہونا نہایت ضروری ہے اور دوسری قوم کو اس قسم کے معاملات کی مطلق پروا نہو۔ پس ان صورتوں میں اسبات سے انکار کرنا شاید ہی ممکن ہو کہ ہندوستان میں ریپرزنٹیٹو انسٹیٹیوشنوں کے جاری کرنے سے بڑی مشکلیں اور سوشل اور پولٹیکل خطرات پیدا ہونگے

ایسے ملک میں جیساکہ انگلستان ہے، جہاں قومی امتیاز اب باقی نہیں رہا اور جہاں مذہبی معاملات میں تفرقہ اور اختلافات تحمل کی ترقی کے سبب کم ہوگئے ہیں۔ وہاں ایسے معاملہ میں اس قسم کے مشکلات پیش نہیں آتیں ۔ اور مذہب کے متحد ہونے سے تمام انگریز ایک قوم ہوگئے ہیں اور تعلیم کی ترقی سے خفیف اختلافات جو بیشتر ملک کی بہبودی سے متعلق ہیں بالکل ناچیز ہوگئے ہیں۔ عیسائیوں کو پارلیمنٹ میں اپنے مطالب کی حمایت کرنے کے واسطے یہودیوں کی نسبت ووٹ دینے میں کچھ عذر نہیں ہوتا۔ اور درحقیقت سوشل اور پولیٹکل مقاصد کے واسطے یہ کہا جاسکتا ہے کہ انگلستان کی کل آبادی ایک ہی قوم ہے لیکن ایک ایسے ملک میں جیساکہ ہندوستان ہے جہاں ذات کے اختلافات ابتک موجود ہیں ۔جہاں مختلف قومیں خلط ملط نہیں ہوئیں ۔ جہاں مذہبی اختلافات ابتک زور شور پر ہیں اور جہاں تعلیم نے اپنے جدید معنی کے لحاظ سے باشندوں کے تمام فرقوں میں ایک مساوی مناسبت کے ساتھ ترقی نہیں کی ۔مجھکو یقین کامل ہے کہ لوکل بورڈوں اور ضلع کی کونسلوں میں مختلف مطالب کی حمایت کی غرض سے الکشن کے خالص اور سادہ اُصول کے جاری کرنے سے بہ نسبت محض تمدنی خیالات کے زیادہ تر بڑی بڑی خرابیاں پیدا ہونگی جب تک کہ قوم اور مذہب کے اختلافات اور ذات کا امتیاز ہندوستان کی سوشل اور پولیٹیکل حالت میں ایک جزو اعظم رہیگا اور اُن معاملات میں جو ملک کے انتظام اور بہبودی سے بیشتر متعلق ہیں اُسکے باشندوں پر اثر ڈالے گا، اُسوقت تک الکشن کا خالص قاعدہ طمانیت کے ساتھ جاری نہیں ہوسکتا۔ بڑی قوم چھوٹی قوم کے مطالب پر بالکل غالب آویگی اور جاہل آدمی گورنمنٹ کو اس قسم کی تدابیر کے جاری کرنیکا جوابدہ سمجھینگے جنکے باعث سے قوم اور مذہب کے اختلافات بہ نسبت سابق کے اور بھی سخت ہو جائینگے ۔"

یہ اسپیچ سرسید نے ۱۲ جنوری ۱۸۸۳ء کو یعنی اُس لکچر سے جو کانگریس کے خلاف لکھنؤ میں دیا پانچ برس پہلے لارڈ رپن کے سامنے کی تھی ۔اس سے صاف پایا جاتا ہے کہ وہ جس طرح ہمیشہ ریپرزنٹیٹو گورنمنٹ کو پسند کرتے تھے اُسی طرح وہ ہندوستان کو موجودہ حالت میں اس قابل نہیں سمجھتے تھے کہ اُس میں ریپرزنٹیٹو اُصول کے موافق عمل درآمد کیا جائے ۔ انگلستان میں ہوم رول بل پر جو سب سے بڑا اعتراض مخالف پارٹی کا تھا اور جسنے آخرکار اُسکو پاس نہ ہونے دیا وہ یہی تھا کہ آئرلنڈ میں رومن کیتھولکس کی تعداد بمقابلہ پروٹسٹنٹ فرقہ کے بہت زیادہ ہے ۔پس اگر یہ بل پاس ہوجائے گا تو پروٹسٹنٹوں کو سخت نقصان پہنچیگا جب آئرلینڈ جیسے ملک میں جہاں قومی اور مذہبی اختلافات یقیناً ہندوستان سے بہت کم ہیں۔ ایک فرقہ کی مجاری دوسرے فرقہ کے حق میں اسقدر مضر خیال کیجاتی ہے تو ہندوستان میں جہاں

برخلاف تمام دُنیا کے مذہبی اور قومی تعصبات ترقی تعلیم کے ساتھ روز بروز بڑھتے جاتے ہیں۔ ریپرزنٹیٹوں اصول سے کیا بھلائی کی امید ہوسکتی ہے؟

سرسید پر یہ بھی اعتراض کیا جاتا ہے کہ کانگریس کے قائم ہونے سے پہلے جبکہ بابو سرندرناتھ نبرجی علیگڈھ میں آئے تھے اور اُنہوں نے نیشنل فنڈ جمع کرنے کی تحریک کی تھی اُس وقت سرسید نے کیوں اُن کے ساتھ اتفاق رائے کیا تھا؟ اور کیوں اُس جلسہ میں صدر انجمن بنے تھے جو نیشنل فنڈ جمع کرنے کے لیئے منعقد ہوا تھا؟ اور جب کہ وہ فنڈ اسی لئے جمع کیا جاتا تھا کہ تمام ہندوستان کی طرف سے پارلیمنٹ میں جو درخواستیں بھیجی جائیں۔ یا جو استغاثے پیش کئے جائیں اُنکے اخراجات میں صرف جائے تو پھر نیشنل کانگرس سے جسکے لیئے وہ فنڈ جمع کیا جاتا تھا۔ کس لئے مخالفت کی گئی؟

اسکا جواب بہت صاف ہے۔ جس جلسہ کا ذکر کیا جاتا ہے اُس میں صرف ایک مقصد کی تصریح کی گئی تھی۔ یعنی یہ کہ ایک عرضداشت ولایت میں اس غرض سے بھیجی جائے کہ سول سروس کے امتحان کی عمر بجائے ۱۹ برس کے ۲۱ برس کی قرار دیجاوے۔ اسکے سوا جہانتک کہ ہمکو معلوم ہے اور کسی خاص مقصد کی تصریح نہیں کی گئی۔ چنانچہ اس مقصد کے متعلق جس کے لیئے وہ جلسہ منعقد ہوا تھا۔ سرسید کی رائے میں کبھی فرق نہیں آیا۔ سول سروس کمیشن میں اُنہوں نے برابر اسکی تائید کی اور وہ مقصد اُسیطرح حاصل بھی ہوگیا۔ جسطرح کہ ہندوستانیوں کی خواہش تھی۔ اور اگر وہ تجویزیں جو آخر کار کانگریس پیش ہوئیں اور جنسے مسلمانوں کو نقصان پہنچنے کا یقین کیا جاتا ہے۔ اگر اُس علی گڈہ والے جلسہ میں اُن کی تصریح کیجاتی تو ہرگز قیاس میں نہیں آتا کہ سرسید اُن تجویزوں سے اتفاق کرتے، کیونکہ جو اسپیچ اُنہوں نے پانچ برس پہلے قانون سلف گورنمنٹ پر کونسل میں کی اُس کا سارا نچوڑ اسبات پر ہے کہ ہندوستان کو ایسے حقوق دینے جنسے ہندوستان کی تمام معزز قومیں برابر مستفید ہو سکیں کسی طرح مناسب نہیں۔

اسکے سوا جو طریقہ کانگریس نے گورنمنٹ پر دباؤ ڈالنے کا اختیار کیا سرسید اُس طریقہ کے ہمیشہ مخالف رہے ہیں۔ اُنہوں نے اپنی کتاب "اسباب بغاوت" میں گورنمنٹ پر اعتراض کرنے میں کوئی دقیقہ باقی نہیں چھوڑا تھا۔ مگر اُسکی ایک کاپی بھی اُس طرح جیسے کہ پچاس ہزار رسالے کانگرس نے تمام ملک میں تقسیم کئے۔ ہندوستان میں شائع نہیں کی۔ بلکہ جس قدر

جلدیں چھپوائیں اُن میں سے ایک آدہ جلد گورنمنٹ ہند کے ملاحظہ کے لیئے اور باقی کل جلدیں پارلیمنٹ میں بھیجدیں وہ اس قسم کے ایجٹیشن کو جیسا کہ کانگریس نے ہندوستان میں میں شروع کیا تہا تمام ملک کے حق میں عموماً اور مسلمانوں کے حق میں خصوصاً نہایت مضر سمجھتے تھے۔ وہ ایک چٹھی میں جو بدرالدین طیب جی کے نام اُنھوں نے لکھی تھی ایک موقع پر لکھتے ہیں کہ "امریکہ میں اوّل اسی قسم کا ایجٹیشن شروع ہوا تھا اور آخر کو یہانتک نوبت پہنچی کہ آخری لفظ جو اُن کے مُنہ سے نکلا وہ یہ تہا کہ "ٹو ایگیٹیشن وودٹ ریپرزنٹیشن" پس جن لوگوں میں اس لفظ کے کہنے کی طاقت ہو وہ اس کانگریس کے ایجٹیشن میں شریک ہوں ورنہ ہیجڑوں کی طرح تالیاں بجاتی ہیں" پھر آگے چلکر اسی چٹھی میں لکھتے ہیں کہ "غدر میں کیا ہوا؟ ہندوؤں نے شروع کیا۔ مسلمان دل چلے تھے وہ بیچ میں کود پڑے۔ ہندو تو گنگا نہاکر جیسے تھے ویسے ہی ہوگئے مگر مسلمانوں کے تمام خاندان تباہ و برباد ہوگئے"

اگرچہ کانگریس سے علٰحدہ رہنے میں مسلمانوں نے عموماً سرسید کے کہنے پر عمل کیا اور چند مستثنیٰ اشخاص کے سوا کوئی مسلمان کانگریس میں شریک نہیں ہوا لیکن بہت سے تعلیم یافتہ مسلمان سرسید کی اس پالیسی کو مدت تک نہایت تعجب سے دیکھتے رہے۔ چنانچہ ایک نہایت لائق تعلیم یافتہ مسلمان نے ہم سے کہا کہ "جب گورنمنٹ نے اوّل ہی اول ہندوستان میں انگریزی تعلیم جاری کرنی چاہی تھی اُسوقت ہندوؤں نے اُسکو خوشی سے قبول کرلیا مگر مسلمانوں نے نہایت سختی کے ساتھ اُس سے انکار کیا تھا۔ لیکن آخرکار مسلمان اپنے انکار سے پشیمان ہوئے اور مجبور ہوکر اُنکو انگریزی تعلیم اختیار کرنی پڑی۔ اسیطرح اندیشہ ہے کہ مسلمانوں کو نیشنل کانگریس کی علٰحدگی سے بھی آخر کو پہلے کی طرح پشیمان ہونا نہ پڑے" مگر سال گذشتہ میں جو افسوسناک واقعات پونا میں گذرے اور جو عبرت انگیز نتیجے اُن پر مترتب ہوئے اُنکو دیکھکر غالباً سب کی آنکھیں کھل گئی ہونگی اور معلوم ہوگیا ہوگا کہ سرسید کی رائے اسباب میں کسقدر صائب تھی اور کانگریس سے علٰحدہ رہنا ایک ایسی قوم کے لیئے جیسے کہ مسلمان ہیں کسقدر ضروری تہا۔

اگرچہ بنگالیوں کی طرف سے سرسید پر لے دے ہوئی، اُنکو خوشامدی، زمانہ ساز، ٹائم سرور اور کیا اور کیا کہا گیا، اُن کی پہلی تحریروں کا حال کی تحریروں سے مقابلہ کرکے دکھایا گیا کہ وہ ایک دوسرے سے کسقدر مختلف ہیں مگر سرسید نے جس بات کو اپنے نزدیک قوم کے حق میں بہتر سمجھ لیا تھا۔ اخیر دم تک اُسی پر قایم رہے اور کسی کے کہنے سُننے پر مطلق التفات نہیں کیا۔ یہانتک کہ نکتہ چینوں کے ترکش خالی ہوگئے اور سب کی زبانیں بند ہوگئیں ۔

کیا پوچھتے ہو کیونکر سب نکتہ چیں ہوئے چپ — سب کچھ کہا انھوں نے پر ہم نے دم نہ مارا

اعزاز کمانڈر طبقہ اعلیٰ ستارہ ہند

۱۸۸۸ء میں سرسید کو اعزاز "نائٹ کمانڈر طبقہ اعلیٰ ستارہ ہند" سے ممتاز کیا گیا ۱۴ مئی روز دوشنبہ کو اس تقریب سے علیگڑھ انسٹیٹیوٹ کے بڑے ہال میں ضلع اور شہر علیگڈھ کے رئیس اور سرسید کے مسلمان ہندو اور یوروپین دوست جو باہر سے اس رسم میں شریک ہونے کو آئے تھے اور تمام اسٹیشن کے انگریز جمع ہوئے۔ ہال کی دیواریں علاوہ دیگر معمولی آرائشوں کے مشرقی وضع کی تلواروں اور مغربی وضع کی بندوقوں سے سجائی گئیں۔ مسٹر کریڈک ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس، مولوی محمد کریم مرحوم ڈپٹی کلکٹر اور راجہ جیکشنداس سی، اس، آئی۔ اپنے اپنے تمغے پہنے ہوئے سرسید کو ہال کے اندر لائے۔ تمام حاضرین اُنکے آنے پر کھڑے ہوگئے اور تعظیمی گارد نے جس کو ضلع کی پولیس نے مامور کیا تھا بندوق سے سلامی ادا کی۔ اسکے بعد مسٹر ای۔ ایچ ریڈیچی اسسٹنٹ مجسٹریٹ نے فرمان شاہی حسب ذیل پڑھکر سُنایا۔

اول

وکٹوریا مدظلہ متحد گریٹ برٹن و آئرلینڈ۔ ملکہ حامی دین قیصر ہند فرماں روائے طبقہ اعلیٰ ستارہ ہند بنام مولوی سید احمد خاں بہادر شریک طبقہ اعلیٰ موصوف ممبر کونسل نواب لفٹنٹ گورنر بہادر ممالک مغربی و شمالی بہ سلامتی و مبارک باد آنکہ

ملکہ یہ مدنظر ہوا کہ آپ کو ایک ایسا نشان خسروانہ عطا کیا جائے جس سے وہ قدر و منزلت آپکی نمایاں ہو جو اس سلطنت اور آپ کی ذات اور اُن خدمات کے شایاں ہو جو آپ سے اس سلطنت کے لیے ظاہر ہوئیں، لہذا مناسب و زیبا ہے کہ آپ کو اعزاز "نائٹ کمانڈر طبقہ اعلیٰ ستارہ ہند" سے ممتاز و سربلند کیا جائے۔ اس لیے بذریعہ اس تحریر کے آپ کو اعزاز نائٹ کمانڈر طبقہ اعلیٰ ستارہ ہند عطا ہو کر اختیار دیا جاتا ہے آپ اس اعزاز سے سرفراز و مفتخر ہو کر حقوق جزو کل متعلقہ طبقہ اعلیٰ موصوف سے مستفید ہوں۔

عدالت عالیہ مقام آسبورن بذریعہ مہر طبقہ موصوف
آج یکم جنوری ۱۸۸۸ء عیسوی اور ۵۱ سنہ جلوسی کو جاری ہوا

دستخط
کراس (وزیر ہند)

دوم

(دستخط) وکٹوریا آر آئی

وکٹوریا مدظلہا متحدہ گریٹ برٹن و آئرلینڈ۔ ملکہ حامی دین۔ قیصر ہند فرماں روائے طبقہ اعلیٰ ستارۂ ہند

بنام نامی مولوی سید احمد خاں بہادر شریک طبقۂ اعلیٰ موصوف ممبر کونسل قانونی نواب لفٹنٹ گورنر بہادر

ممالک مغربی و شمالی بہ سلامتی و مبارک باد آنکہ

آپ کو اعزاز طبقۂ اعلیٰ ستارۂ ہند سے ممتاز و نامور کیا گیا ہے از انجا کہ ہم کو حسب اختیارات قوانین طبقہ اعلیٰ موصوف اختیار حاصل ہے کہ آپ کی حاضری ولایت کی بغرض استفادۂ اعزاز طبقۂ اعلیٰ سے معاف کریں لہذا حسب اختیارات خسروانہ طبقۂ موصوف تم کو پورے اختیارات پہننے و استعمال کرنے ستارۂ موصوف کے بجانب چپ بالائے پوشاک بیرونی عطا کرتے ہیں۔ اور نیز نشان خاص و بندش متعلقہ نائٹ کمانڈر موصوف پہنیں اور استعمال کریں۔ اور حسب فحوائے اختیارات مذکور آپ کو اختیار دیا جاتا ہے کہ تمام حقوق جز و کل متعلقہ نائٹ کمانڈر موصوف مع استعمال ایک نشان خاص نائٹ بیچلر سلطنت موصوف سے مستفید و بہرہ یاب ہوں۔ اور یہ اُسی طریقہ اور مراسم سے مقصور ہے جیسا کہ آپ اس نائٹ ہڈ سے ہم سے یا بجائے ہمارے نائب سلطنت اور گورنر جنرل ہند سے جو گرینڈ ماسٹر طبقہ موصوف ہیں اعزاز حاصل کرتے۔

عدالت عالیہ مقام آسبورن بذریعۂ مہر طبقۂ موصوف

آج ۱۱۔ فروری ۱۸۶۶ء عیسوی اور ۱۵ سنہ جلوسی کو جاری ہوا

(دستخط) کراس (وزیر ہند)

اسکے بعد صاحب کلکٹر مسٹر کینڈی اپنی کرسی پر سے اُٹھے۔ سب لوگ اُن کے ساتھ کھڑے ہو گئے اور تعظیمی گارد نے پھر سلامی ادا کی۔ صاحب ممدوح نے حضور ملکۂ معظمہ کوئن وکٹوریا کی طرف سے ستارۂ ہند سر سید کے سینہ پر لگا دیا اور فیتہ مع بیج کے جو اُسکے ساتھ تھی اُن کے گلے میں ڈال دیا، سب لوگ پھر اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے اور صاحب کلکٹر نے اُردو میں ایک لمبی تقریر کی جس میں سر سید کی بہت تعریف کی تھی اور جس کے چند فقرے ہم یہاں نقل کرتے ہیں۔ اُنھوں نے کہا کہ "اہل فرنگ اور اہل ہند نے سید صاحب کی وسیع عقل اور روشن حب الوطنی سے بہت کچھ سیکھا ہے،، اُن میں نوجوانی سے دو وصف

برابر پائے گئے ہیں ایک علم کی محبت دوسرے وطن کی محبت کہ یہ دونو ایک جگہ بہت کم پائی جاتی ہیں، لبرل نے اُن کو کنسرو ٹو خیال کیا کیونکہ اُنھوں نے رسومات مغربی کی بالکل نقل نہیں کی اور کنسرو ٹو کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کس طرح اپنے ملک کے باہر کوئی عمدہ چیز پا سکینگے اُنھوں نے اہل فرنگ اور اہل ہند کے درمیان معقول واقفیت پیدا کرنے کے لیے وہ مدد دی جو بہت کم لوگوں نے دی ہو، سید صاحب وسیع ہمدردی، دانشمندانہ صلاح، تجربہ کاری سرگرمی، مستعدی، مستقل مزاجی اور حب الوطنی کی مثال ہیں اور نیز وہ وہ شخص ہیں جنہوں نے اپنے واسطے کبھی کچھ تلاش نہیں کیا بلکہ ہر چیز اپنے ملک کے واسطے چاہی اور اسلیئے اُنکے ملک کے لوگ اور ملکہ معظمہ اُن کی عزت کرتی ہیں اور ہم لوگ محبت اور تعظیم کی نگاہ سے دیکھتے ہیں،،

اس کے بعد سر سید نے اس مضمون کے معمولی اقرار نامہ پر کہ وہ طبقۂ مذکور کے قوانین کی اطاعت کرینگے دستخط کیے اور جلسہ برخاست ہو گیا اور مسٹر کینڈی نے اسی تقریب میں چند اور مسلمانوں کی اپنے ہاں حاضری پر دعوت دی۔

اس واقعہ کے متعلق سب سے زیادہ دلچسپ بات یہ ہو کہ رؤسائے ضلع علیگڑھ کو جب یہ بات معلوم ہوئی کہ سر سید کو تمغہ مذکور ملنے والا ہو تو اُنھوں نے سر سید کو اور یوروپین افسروں کو اس خوشی میں ایک بہت بڑا ڈنر دینا چاہا اور کچھ لوگ رئیسوں کی طرف سے مع ایک خط کے سر سید کے پاس آئے کہ آپ اس ڈنر میں آنا پسند کریں۔ سر سید نے اُس کے جواب میں بعد شکریہ رؤسائے ضلع کے یہ لکھ بھیجا کہ ''چونکہ قوم کی حالت ابتر ہو اور اُس کو بہم رسانی تعلیم کی بہت حاجت ہو اسلیے میں اپنے فضول اخراجات کا سخت مخالف ہوں۔ پس اس ڈنر اور جلسہ سے آپ مجھے معاف رکھیں،، اور اخبار میں ایک آرٹکل لکھا جس کا ماحصل یہ تھا کہ ''کسی خوشی یا تقریب میں ڈنر دینے محض فضول ہیں۔ سب سے بڑی ضرورت اسوقت مسلمانوں کی تعلیم میں خرچ کرنے کی ہو۔ ہمارے لیے جو ڈنر تجویز ہوا تھا اُسکے لیے بارہ سو روپئے کا تخمینہ ہوا تھا اگر وہ روپیہ تعلیم مسلمانان کے اخراجات میں صرف ہوتا تو کسقدر مفید ہوتا،،

سر سید کے واسطے اس اعزاز کے ملنے کی بہت دن سے تجویز ہو رہی تھی۔ مگر چونکہ اس تمغے کے پانے والوں کی تعداد محدود ہوتی ہو یعنی کبھی ۷ سے زیادہ نہیں ہونے پاتی اس لیے جبتک نائٹ کمانڈر کا عہدہ خالی نہیں ہوتا دوسرے شخص کو تمغہ نہیں مل سکتا۔ چنانچہ لارڈ لٹن نے دربار قیصری کے بعد اس بات پر افسوس ظاہر کیا تھا کہ بسبب خالی نہ ہونے کسی نائٹ کمانڈر کے عہدہ کے اس وقت سر سید کو اعزاز نہ مل سکا۔

ڈگری ادنبرا یونیورسٹی

۱۸۸۹ء میں سرسید کو اڈنبرا یونیورسٹی سے بحیثیت ایک اعلیٰ مصنف اور حامی علوم ہونے کے ایک بڑا علمی امتیاز دیا گیا۔ انگلستان میں دستور ہے کہ جو لوگ علمی حیثیت سے ملک میں امتیاز حاصل کرتے ہیں یا علم کی روشنی پھیلانے میں کوشش کرتے ہیں اُن کو اہل علم کے عام مجمع میں کسی یونیورسٹی کی طرف سے ایک خاص اعزاز دیا جاتا ہے جسکو "ڈگری اوف ڈاکٹر اوف لاز" کہتے ہیں۔ سرسید کی شہرت خطبات احمدیہ اور دیگر تصنیفات و تحریرات کے سبب سے انگلستان میں بحیثیت ایک اعلیٰ درجہ کے مصنف کے ہندوستان سے کچھ کم نہ تھی، اس کے سوا مدرسۃ العلوم کے قائم کرنے اور ہندوستان کے مسلمانوں میں تعلیم کے رواج دینے سے وہ علوم جدیدہ کے بہت بڑے حامی سمجھے جاتے تھے۔ اس لیے بغیر اسکے کہ سرسید کو اطلاع ہو ۱۸۸۹ء ادنبرا کی مشہور یونیورسٹی سے اُن کو ایل، ایل ڈی کی ڈگری ملنی تجویز ہوئی۔

۱۸- اپریل کو شہر اڈنبرا کے سب سے بڑے ہال میں جو سائنڈ ہال کے نام سے مشہور ہے گریجویشن کی رسم ادا کی گئی۔ یہ جلسہ جیسا کہ علیگڑھ گزٹ مطبوعہ ۲۸- مئی ۱۸۸۹ء میں بحوالہ اخبارات و چٹھیات ولایت مفصل مذکور ہے بڑی شان و شوکت کے ساتھ منعقد ہوا تھا تمام گیلریاں اور ہال کا ایک حصہ عام لوگوں سے جو مدعو کیے گئے تھے بھرا ہوا تھا اور دوسرا حصہ یونیورسٹی کے گریجویٹس سے مزین تھا۔ اس جلسے میں دو تہائی لیڈیاں تھیں جن میں لیڈی میور صاحبہ بھی۔ جنہوں نے مدرسۃ العلوم علی گڑھ کی "میور پارک" میں سب سے پہلا پودا اپنے ہاتھ سے لگایا تھا۔ موجود تھیں اور اُن کے معزز شوہر سر ولیم میور بھی۔ جن کو ہندوستان کے لوگ عموماً جانتے ہیں بحیثیت پرنسپل یونیورسٹی لارڈ چینسلر کے ہمراہ۔ جو جلسہ کے پریسیڈنٹ تھے۔ تشریف لائے تھے۔ جس وقت لارڈ چینسلر کے سامنے سرسید کا ذکر کیا گیا اور حاضرین نے اُس پر تحسین و آفرین کا نعرہ بلند کیا تو سر ولیم میور لیڈی صاحبہ خوشی سے باغ باغ ہو گئیں۔ اس موقع پر بارہ آدمیوں کو۔ جن میں سے چھ حاضر اور چھ غیر حاضر تھے۔ یہ ڈگری ملنی تجویز ہوئی تھی پروفیسر کرک پیٹرک نے سرسید کو لارڈ چینسلر کی طرف ڈیوس کرتے وقت کہا کہ "میں سب سے پہلے آپ سے اجازت چاہتا ہوں کہ سرسید احمد خاں بہادر کے۔سی۔ایس۔آئی کو اُن کی غیر حاضری میں ڈاکٹر اوف لاز کی آنریری ڈگری عطا کی جائے" اس کے بعد سرسید کی تاریخ ولادت، خاندان، سلطنت مغلیہ کا قدیم توسل، سرکاری ملازمت، ایام غدر کی خدمات اور بیس انگریزوں کی جان بچانے میں نہایت شریفانہ ہیرو ازم ظاہر کرنا، پولٹکل پنشن اور خطابات کا ملنا، ویسرنگل کونسل کی ممبری، ملکی اور قومی خدمات، آثار الصنادید

اور دیگر تصنیفات خصوصاً خطبات احمدیہ کا لکھنا، سپیکنگ کی اعلیٰ لیاقت، رائل ایشیاٹک سوسائٹی کا فیلو مقرر ہونا، محمدن کالج قائم کرنا اور بڑے بڑے ارکان سلطنت ہند کا اُس میں مدد دینا، یہ سب باتیں بیان کیں اور کہا کہ "سرسید سب سے زیادہ نامور مسلمان بحکٹ حضور ملکہ معظمہ قیصر ہند کے ہیں اور اسلیے خصوصیت کے ساتھ یونیورسٹی کے اس اعزاز کے مستحق ہیں" اس کے بعد تمام حاضرین جلسہ نے تحسین و آفرین کے نعرے بلند کیے اور سرسید کو ال ال ڈی کی ڈگری عطا کی گئی۔ افسوس ہے کہ جو سند اڈنبرا کی یونیورسٹی نے سرسید کو بھیجی تھی وہ اس کتاب کے لکھتے وقت ہم کو دستیاب نہیں ہوئی اس لیے ہم یہاں اُس کے نقل کرنے سے معذور ہیں۔

اگرچہ سرسید اڈنبرا یونیورسٹی کی اس قدر شناسی کے نہایت شکرگزار تھے اور جو اعزاز کہ اُس نے اُن کو دیا تھا اُس پر فخر کرتے تھے لیکن اُنھوں نے ایسی آنزیری ڈگریوں کو ڈگری پانے والوں کی اصلی لیاقت کا معیار کبھی نہیں سمجھا بلکہ وہ یونیورسٹی کی ہر ایک ڈگری کو اُس قوم کے حق میں جس کے ہاتھ میں اُس یونیورسٹی کی باگ نہ ہو ایک بھیک کے ٹکڑے سے زیادہ نہیں جانتے تھے۔ چنانچہ اُنھوں نے ایک ایڈریس کے جواب میں جو اہل پنجاب نے ۱۸۸۴ء میں ان کو بمقام جالندھر دیا صاف کہا تھا کہ "یونیورسٹیوں کی مثال اور ہمارے کالج کے لڑکوں کی مثال آقا اور غلام کیسی ہے ہم یونیورسٹیوں کے تابع ہیں، اُس کے ہاتھ بکے ہوئے ہیں جو ٹکڑا ایسا علم کا وہ دیتی ہے اُسی کو کھا کر پیٹ بھر لیتے ہیں اور اسی پر قناعت کرتے ہیں۔ اے دوستو ہماری پوری پوری تعلیم اُس وقت ہوگی جب کہ ہماری تعلیم ہمارے ہاتھ میں ہوگی، یونیورسٹیوں کی غلامی سے ہم کو آزادی ہوگی، ہم آپ اپنی تعلیم کے مالک ہونگے اور بغیر یونیورسٹیوں کی غلامی کے ہم آپ اپنی قوم میں علوم پھیلائیں گے، فلسفہ ہمارے دائیں ہاتھ میں ہوگا اور نیچرل سائنس بائیں ہاتھ میں اور کلمہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کا تاج سر پر۔ یونیورسٹی کی تعلیم ہم کو صرف مچھر بناتی ہے۔ اے دوستو میں خود بھی اُنہیں میں ہوں کیونکہ مجھکو بھی ایک یونیورسٹی نے ال ال ڈی کی ڈگری دی ہے۔ ہم آدمی جبھی بنیں گے جب ہماری تعلیم ہمارے ہاتھ میں ہوگی"

کالج کا انتظام ابتدا میں صرف ایک کمیٹی سے جو کالج فنڈ کمیٹی کہلاتی تھی متعلق تھا لیکن جوں جوں کالج ترقی کرتا گیا نئی نئی ضرورتیں پیش آتی گئیں۔ چنانچہ ۱۸۸۳ء میں پہلے قواعد کی ترمیم ہو کر نئے بائی لاز بنائے گئے اور کالج فنڈ کمیٹی کے ماتحت چار اور کمیٹیاں مقرر ہوئیں۔

(۱) کمیٹی ڈائرکٹران تعلیم السنہ مختلفہ و علوم دنیویہ (۲) کمیٹی مدبران التعلیم مذہب اہل سنت و جماعت

(۳) کمیٹی ممبران تعلیم مذہب اثنا عشریہ (۴) بینجنگ کمیٹی جس کا کام بورڈنگ ہوس کا انتظام اور بورڈروں کی ہر طرح کی نگرانی تھا۔

اس کے بعد جب کالج کی حالت اور اسکی جائداد بہت ترقی کر گئی اور اُس پر لوگوں کا اعتماد زیادہ ہوگیا۔ یہاں تک کہ لوگ ہزار ہا روپیہ اپنے بچوں کی تعلیم کے لیے پیشگی طور کمیٹی میں امانت رکھوانے لگے تو سرسید کو یہ خیال ہوا کہ اب کالج کا ایک معمولی کمیٹی کے سپرد رہنا مناسب نہیں۔ اس خیال کو پیدا ہوئے تھوڑا ہی عرصہ گذرا تھا کہ اتفاق سے سرسید سخت بیمار ہو گئے۔ جب صحت ہوئی تو انہوں نے اس بات کو بہت ضروری سمجھا کہ اُن کی زندگی میں سرکاری قانون مروجۂ وقت کے موافق کالج اور اُسکی جائداد کے لیے ٹرسٹی (امین) مقرر ہو جائیں، اور ایسے قواعد اور رگیولیشن بنائے جائیں جو تمام ضروری جزئیات کالج پر حاوی ہوں اور جہانتک ممکن ہو ایسا انتظام کیا جائے کہ جن اُصول پر کالج کی بنیاد رکھی گئی ہے اُنہیں اُصول پر وہ ہمیشہ قائم رہے، سرسید کے معزز یوروپین دوستوں نے بھی دور اندیشی کی راہ سے یہی صلاح دی اور گورنمنٹ کی طرف سے بھی یہ ایما پایا گیا کہ جب تک اطمینان کے قابل آئندہ انتظام نہو گا گورنمنٹ اور حیدرآباد کی امداد جاری نہیں رہ سکتی۔

پس سرسید نے ۱۸۸۹ء میں حسب ضابطہ ٹرسٹیوں کے تقرر اور دیگر انتظامات کے لیے ایک کوڈ بنایا اور بل کی صورت میں چھپوا کر اُس کی کاپیاں تمام ممبروں کے پاس رائے کے لیے بھیجیں مولوی سمیع اللہ خاں بہادر سی ام جی نے اُس کی بعض دفعات سے اختلاف کیا جن میں سے ایک وہ دفعہ تھی جس کی رو سے آنریبل سید محمود کو جائنٹ سکرٹری مقرر کیا گیا تھا۔ اور اُن کے ساتھ اُن کے اکثر دوست بھی جن میں زیادہ تر ضلع علی گڑھ اور بلند شہر کے رئیس تھے اس اختلاف میں شریک ہوگئے۔ اگر یہ اختلاف اختلاف رائے کی حد سے متجاوز نہو تا اور ٹرسٹی بل کے پاس ہوجانے پر بالکل رفع ہو جاتا تو ہم اُس کو خدا کی رحمت سمجھتے؛ مگر افسوس ہے کہ وہ آخر کار مخالفت کی صورت میں بدل گیا۔ باوجودیکہ مسودہ ممبران کمیٹی کے بھرے جلسہ میں مجارٹی کی رو سے پاس ہو گیا مگر اُنکی مخالفت رفع نہ ہوئی۔ چنانچہ مولوی سمیع اللہ خاں اور تقریباً اُن کی تمام پارٹی کالج سے بے تعلق ہوگئی۔ اگر فرض کر لیا جائے کہ سرسید کی رائے اس باب میں خطا پر تھی تو بھی جب کہ ٹرسٹی بل قاعدہ کے موافق پاس ہو چکا تھا تمام کالج کے ہوا خواہوں کو اُسے سر پر رکھنا چاہیے تھا، یہی وہ مستحکم بنیاد ہے جس پر تمام شائستہ ملکوں میں قومی جماعتیں اور قومی انسٹیٹیوشن قائم ہیں اور روز

بروقت ترقی کرتے چلے جاتے ہیں۔ جب تک کہ کوئی تجویز کثرت رائے سے پاس نہیں ہوتی اُس سے نہایت زور و شور کے ساتھ اختلاف کیا جاتا ہے اور ایک پارٹی دوسری پارٹی پر غالب آنے کے لیے تمام وسائل جو اُسکی قدرت میں ہوتے ہیں کام میں لاتی ہے مگر جہاں ایک پارٹی کثرت رائے سے غالب آئی فوراً دوسری پارٹی نے اپنے ہتھیار ڈال دیئے اور اختلاف اتفاق کے ساتھ بدل گیا چنانچہ نواب انتصار جنگ مولوی مشتاق حسین نے کہ وہ بھی اس اختلاف میں شریک تھے بل پاس ہوجانے کے بعد اُس کو بسر و چشم قبول اور منظور کرلیا اور کالج کے پہلے سے بھی زیادہ حامی و مددگار بن گئے مگر اور صاحبوں نے قانون ٹرسٹیان کو ہرگز تسلیم نہیں کیا اور کالج سے بالکل قطع تعلق کرلیا۔

اگرچہ سرسید چالیس برس برابر طرح طرح کی مخالفتیں جھیلتے رہے مگر کوئی مخالفت اُن کو ایسی شاق نہیں گذری جیسی کہ مولوی سمیع اللہ خاں اور اُن کی پارٹی کی مخالفت جس سے فی الواقع اُن کا حوصلہ تنگی کرنے لگا اور صبر و تحمل کا دامن اُن کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا۔ اول تو مولوی سمیع اللہ خاں کو وہ اپنا قوت بازو سمجھتے تھے جن سے کالج اور بورڈنگ کے انتظام اور نگرانی میں اُنھیں بے انتہا تقویت پہنچتی تھی اور ایسے عزیز دوست اور مددگار سے ایسی سخت مخالفت کا ظہور میں آنا فی الواقع ناقابل برداشت تھا۔ دوسرے اُن کی مخالفت اُنہیں کی ذات تک محدود نہ تھی بلکہ کالج کے بہت سے معاون اُن کے ساتھ ہوگئے تھے اور اس لیے سرسید کو اندیشہ ہوگیا تھا کہ کہیں کالج کی چلتی گاڑی میں روڑا نہ اٹک جائے چنانچہ اُنہیں دنوں میں جو اُنھوں نے ایک نہایت پرجوش آرٹکل علی گڑھ گزٹ میں شائع کیا تھا اور جس میں فرانسس جلکر ڈوئل لڑنے کا چیلنج دیا گیا تھا اُس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ سرسید کے دل کی اُس وقت کیا حالت تھی۔ اس میں شک نہیں کہ سید احمد خاں بالکل ایک ڈسپاٹک طبیعت کے آدمی تھے۔ اس خصلت کو چاہو اُن کے تمام بڑے بڑے کاموں کی بنیاد سمجھو اور چاہو اُن کے اخلاقی عیوب میں شمار کرو بہرحال یہ خصلت ان میں ضرور تھی۔ گو وہ جزوی اور فروعی باتوں میں اختلاف رائے سے کبھی تنگدل نہ ہوتے تھے مگر جن اُصول پر اُنھوں نے کالج کی بنیاد رکھی تھی اُن سے وہ ہرگز دست بردار ہونا نہیں چاہتے تھے اور جس بات کو اُن میں مخل سمجھتے تھے اُس کو جہاں تک کہ اُن کے امکان میں تھا چلنے نہیں دیتے تھے۔ اُن کا مقصد محمدن کالج قائم کرنے سے صرف یہی نہ تھا کہ مسلمانوں کی اولاد اُس میں تعلیم پائے بلکہ سب سے بڑا اور مقدم مقصد جو ۱۸۵۸ء سے لیکر آخر دم تک اُن کے پیش نظر رہا۔ یہ تھا کہ مسلمانوں اور

اور انگریزوں میں یکجہتی، میل جول اور اتحاد کو ترقی ہو۔ اسی لیے اُنھوں نے یورپین اسٹاف کالج کا جزو غیر منفک قرار دیا تھا اور انگلستان سے چیدہ چیدہ آدمی بلوا کر کالج میں جمع کیے تھے۔ مگر بدقسمتی سے ایسے اسباب جمع ہو گئے تھے کہ یورپین اسٹاف مولوی صاحب ممدوح کی طرف سے کھٹک گیا تھا اور اُن کو یقین ہو گیا تھا کہ اگر سرسید نے اپنی زندگی میں آئندہ کے لیے سکرٹری شپ کا کوئی انتظام نہ کیا تو اُن کے بعد ضرور مولوی سمیع اللہ خاں سکرٹری ہوں گے۔ اُنھوں نے اور نیز بعض اور یورپین افسروں نے سرسید کو صلاح دی کہ سید محمود کو جائنٹ سکرٹری مقرر کر دیں تاکہ یورپین اسٹاف کا جس کو معاہدہ کر کے انگلستان سے بلایا گیا ہے۔ سرسید کے آئندہ جانشین کی طرف سے پورا پورا اطمینان ہو جائے۔ اگرچہ سرسید کو یقین تھا کہ سید محمود کے جائنٹ سکرٹری مقرر کرنے سے لوگوں کے دل میں طرح طرح کی بدگمانیاں پیدا ہوں گی اور ایسی بدگمانیوں سے۔ جیسا کہ اس کتاب کے صفحات میں جابجا مذکور ہے۔ وہ سو سو کوس بھاگتے تھے۔ اس کے سوا سید محمود کی نسبت معتبر ذریعوں سے سنا گیا ہے کہ وہ جائنٹ سکرٹری یا سکرٹری کو پسند نہیں کرتے تھے مگر چونکہ یورپین اسٹاف کو اس بات پر سخت اصرار تھا اور اُن کو کالج کی آئندہ حالت کی نسبت مطمئن کرنا ضرور تھا اس لیے سرسید کو ٹرسٹی بل میں ایک خاص دفعہ سید محمود کے جائنٹ سکرٹری مقرر کرنے کے لیے داخل کرنی اور سید محمود کو بہ جبر اس تجویز پر راضی کرنا پڑا۔

جو لوگ کالج کے خیر خواہ تھے اُن کا فرض تھا کہ اول تو اس تجویز سے اختلاف ہی نہ کرتے، کیونکہ وہ ایک ایسی مصلحت پر مبنی تھی جس کو سرسید نے ہمیشہ نظام کالج میں سب سے زیادہ مقدم سمجھا ہے؛ یہاں تک کہ اگر بالفرض کثرت رائے سرسید کی طرف نہ ہو جاتی تو سرسید قطعاً کالج کو چھوڑ بیٹھتے اور یورپین اسٹاف یقیناً کالج کو خیرباد کہہ کر چلا جاتا اور پھر کوئی یورپین جنٹلمین یہاں آنے کی حامی نہ بھرتا اور اینگلو انڈین افسروں اور حاکموں کو جو ہمدردی کہ اب کالج کے ساتھ ہے وہ ہرگز باقی نہ رہتی۔ اور اگر اُنھوں نے اختلاف ہی کیا تھا تو بل پاس ہو جانے کے بعد لازم تھا کہ اُس کو خوشی سے منظور کر لیتے اور یہ سمجھ لیتے کہ اگر اس تجویز کے نتائج خاطر خواہ نہ نکلے تو ہر وقت اس تجویز کا تدارک اور دفعہ مذکور کی ترمیم ہو سکتی ہے لیکن اگر مخالفت پر باوجود بل پاس ہو جانے کے برابر اصرار کرتے رہے تو کالج کو سخت صدمہ پہنچے گا اور مسلمانوں کی پھوٹ اور نااتفاقی پر سارا زمانہ ہنسے گا۔ یہ کہنا کہ ہم حق پر تھے اور اس لیے ہم کو غلط مجارٹی کا اتباع کرنا ضرور نہ تھا۔ بالکل ایسی بات ہے جیسے دو فریق قرعہ اندازی

پر فیصلہ کا انحصار کریں اور جب قرعہ کسی فریق کے خاطر خواہ نہ نکلے تو یہ عذر کرے کہ اس میں میری حق تلفی ہوتی ہے اس لیے میں اس فیصلہ کو تسلیم نہیں کرتا۔

الغرض بل پاس ہو جانے کے بعد اگرچہ مولوی صاحب اور اُن کی پارٹی کالج سے بالکل بے تعلق ہو گئی تھی مگر مدت تک اُنکے نام ٹرسٹیوں کی جماعت میں بدستور قائم رکھے گئے اور مثل تمام ٹرسٹیوں کے سر سید اُن سے بھی کالج کے معاملات میں برابر مشورہ اور رائے طلب کرتے رہے۔ لیکن چونکہ وہ تمام کارروائی کو۔ جو جدید قواعد کے بموجب کی جاتی تھی۔ غلط سمجھتے تھے اس لیے اُنھوں نے کبھی کچھ جواب نہیں دیا آخر ایک عرصہ کے بعد مجبور ہو کر اُن کا نام ٹرسٹیوں کی جماعت سے خارج کر دیا گیا۔

پھر کچھ دنوں بعد نواب وقار الامرا بہادر مدار المہام ریاست حیدرآباد نے جبکہ وہ کالج کے ملاحظہ کے لیے علیگڑھ میں تشریف لائے ہوئے تھے۔ بہ نظر سرپرستی کالج و خیر خواہی اہل اسلام سر سید اور مولوی صاحب ممدوح کے درمیان صفائی کرادی تھی چنانچہ سر سید نے سالانہ اجلاس ٹرسٹیان میں مولوی اور اُن کی پارٹی کے نام پھر ٹرسٹیوں میں داخل ہونے کی تحریک کی اور تمام حاضرین جلسہ نے بہت خوشی سے اُس کو منظور کیا مگر بعض معقول وجوہات پر جنکی تفصیل طولانی ہے اُنھوں نے ٹرسٹی بننا منظور نہیں کیا اور جو صفائی کہ ہز اکسلنسی نے کرائی تھی اُس پر کوئی عمدہ نتیجہ مترتب نہیں ہوا۔

اگرچہ ہمارا ہرگز جی نہ چاہتا تھا کہ ٹرسٹی بل کے ناگوار واقعہ کا ذکر کر کے ناظرین کو وہ نامبارک زمانہ یاد دلائیں جو قومی کالج اور قومی تعلیم کے حق میں ایک سخت مصیبت کا زمانہ تھا مگر چونکہ سر سید کی بائیوگرفی میں اُن تمام واقعات کا جن سے اُن کے اخلاق پر کوئی روشنی پڑتی ہو۔ استقصا کرنا ضرور ہے اس لیے جو کچھ اس معاملہ کے متعلق ہم کو معلوم تھا یا ہماری سمجھ میں آیا بے کم و کاست بیان کر دیا گیا

ذکر غبن ۱۸۹۵ء

عربی میں یہ مثل مشہور ہے "الھموم بقدر الھمم" یعنی جس قدر ہمتیں عالی ہوتی ہیں اُسی قدر رنج و غم زیادہ ہوتے ہیں۔ سر سید نے کالج کے عشق میں اتنے کام اپنے سر دھر لیے تھے کہ ایک آدمی اُن سے عہدہ برآ ہونا سخت دشوار تھا۔ آخر سنہ ۱۸۹۵ء میں اُن کو کالج کی بدولت ایک ایسا دھچکا لگا جس کا صدمہ اخیر دم تک فراموش نہیں ہوا منجملہ اہلکاران دفتر سکرٹری کے ایک شخص شام بہاری لال جو سنہ ۱۸۸۳ء سے ہیڈ کلرک کے عہدہ پر مامور تھا جو علیگڈھ کے ایک ممتاز کایستھ خاندان کا آدمی تھا۔ اُس کا باپ پنجاب میں تحصیلدار اور اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر رہ چکا تھا۔

اور اب پنشن پاتا تھا اور اُس کا دادا لفٹننٹ پنجاب میں سر منشی تھا۔ سر سید نے اُس کو ایک شریف خاندان کا آدمی سمجھکر اپنے انگریزی دفتر میں ہیڈ کلرک مقرر کر لیا تھا۔ اگرچہ سر سید کو اُس کی تقرری کے برس ڈیڑھ برس بعد جتایا گیا کہ یہ پنجاب میں سرکاری ملازم تھا اور وہاں سرکاری روپیہ غبن کرنے کی علت میں سزا ئے قید پا چکا ہے مگر سر سید نے اس خیال سے کہ اول تو یہاں اُسکی تحویل میں کچھ روپیہ نہیں رہتا جس میں غبن کرنے کا احتمال ہو دوسرے اشراف آدمی ایک دفعہ زک اُٹھا کر پھر ویسی ہی خطا نہیں کرتا۔ اس کو بدستور اُس کے عہدہ پر بحال رکھا۔ سر سید میں ایک خاص خصلت تھی جس کو اگرچہ پُرانی سوسائٹی میں ایک نہایت شریفانہ خصلت خیال کیا جاتا تھا مگر اس زمانہ میں وہ سخت اعتراض کے قابل سمجھی جاتی ہے خاصکر اُس صورت میں جبکہ اُس کا اثر ذاتی معاملات سے گزر کر قومی معاملات تک پہنچ جائے۔ اُن میں ایک خاص قسم کی مروت بدرجۂ غایت تھی وہ کسی کو ملازم رکھ کر عام اس سے کہ اُن کا ذاتی ملازم ہو یا قومی۔ باوجود تمول شکایتوں کے علیحدہ کرنا نہیں چاہتے تھے بلکہ اُس کے باب میں کسی کی شکایت کو صحیح نہیں سمجھتے تھے کسی کی نسبت اُن کو بدگمانی ہوتی تھی۔ وہ اپنے ماتحتوں پر پورا پورا اعتماد کر لیتے تھے۔ اور جو کام اُن کو سپرد کر دیتے تھے اُسکی طرف سے بالکل مطمئن ہو جاتے تھے اگرچہ بغیر اعتبار کے دنیا کا کوئی کام نہیں چل سکتا لیکن اس مشہور قول کے موافق کہ "الحزم سوءالظن" ضرور ہے کہ کبھی کبھی امتحاناً اپنے ماتحتوں کے کام کو جانچ لیا جائے تاکہ اُن کے دل میں ڈر رہے اور وہ ہر ایک بات کا اپنے تئیں جوابدہ سمجھتے ہیں۔ مگر سر سید کے دل میں کبھی اس قسم کے امتحان کا خیال نہ آتا تھا شام بہاری لال جون ۱۸۸۳ء سے جولائی ۱۸۹۵ء تک اُن کے دفتر میں رہا اس عرصہ میں کبھی اُس نے یہ نہیں جانا کہ مجھسے کوئی بازپرس کرنے والا ہے یا نہیں۔

کالج کا بہت سا روپیہ بنک بنگال آگرہ میں بصیغہ امانت جمع رہتا تھا جو وقتاً فوقتاً بحسب ضرورت چکوں کے ذریعہ سے وصول کیا جاتا تھا اور کچھ پرامیسری نوٹ مالیت کالج بطور کنٹنل فنڈ کے بنک کی سپردگی میں تھے جن کا منافع تقریباً دو ہزار سالانہ بنک سے ہر سال وصول ہوتا تھا۔ چک بُک سر سید کے پاس ایک بکس میں بند رہتی تھی اور اُس کی کنجی بھی اُنہیں کے پاس رہتی تھی مگر جب چک جاری کرنے کی ضرورت ہوتی تھی تو شام بہاری لال سر سید سے کنجی لیکر چک نکال لیتا تھا اور اُس کی خانہ پوری کر کے سر سید سے دستخط کرا لیتا تھا اور چک جاری

کر دیتا تھا۔ سرسید چونکہ انگریزی نہیں جانتے تھے اور کلرک پر اعتماد رکھتے تھے بے تامل چیک پر دستخط کر دیتے تھے کئی سال تک تو وہ ٹھیک ٹھیک کام کرتا رہا مگر جب اُس نے دیکھا کہ سکرٹری کو اُس پر پورا اعتماد ہو گیا ہے اُس نے ہاتھ پاؤں نکالنے شروع کیے۔ جب چاہتا تھا سکرٹری سے کنجی لیکر چیک نکال لیتا اور جس قدر روپیہ چاہتا اُس میں درج کر کے کبھی خود سکرٹری سے دستخط کرا لیتا اور کبھی آپ اُن کے جعلی دستخط بنا کر چیک جاری کر دیتا؛ یہاں تک کہ جب زرِ امانت جو بینک میں جمع رہتا تھا ختم ہو گیا تو اُس نے ایک نہایت دلیری کا کام کیا: ۹۴ ہزار کے پرامیسری نوٹ جو بطور کیپٹل فنڈ کے بینک کی سپردگی میں تھے اور کسی کو اُن کے منافع کے سوا اصل فنڈ میں تصرف کرنے کا اختیار نہ تھا ان پر ہاتھ مارنے کا ارادہ کیا۔ اُس نے ٹرسٹیوں کی طرف سے ایک جعلی مختار نامہ بنایا جس میں بینک کو اختیار دیا گیا تھا کہ وقتاً فوقتاً جس قدر روپیہ کی کالج کو ضرورت پرامیسری نوٹوں کی کفالت پر سودی روپیہ دیتا ہے۔ اور سات ٹرسٹیوں کے جعلی دستخط کر کے اُس کو بینک میں بھیجدیا۔ کچھ کم ۲۳ ہزار روپیہ تو وہ زرِ امانت میں سے غبن کر چکا تھا اب نوٹوں کی کفالت پر سودی قرض بینک سے وصول کرنا شروع کیا یہاں تک کہ زرِ امانت کے بیالیس ہزار پانسو ستتر روپیہ اور بینک سے وصول کر کے خورد برد کر گیا۔

سچ یہ ہے کہ ماہ جولائی ۱۸۹۵ء کالج کے حق میں، سرسید کے حق میں۔ اور خود اس ناخداترس کے حق میں جس نے مسلمانوں کا کوڑی کوڑی کان مانگا ہوا ایک لاکھ پانچ ہزار چارسو نو روپیہ شراب خواری اور عیاشی میں برباد کر دیا، سخت منحوس اور نامبارک مہینہ تھا جس کے بعد کالج کی تعمیر بالکل بند اور آگے کو چندہ کی راہ مسدود ہو گئی۔ سرسید کا اس رنج میں گویا کام ہی تمام ہو گیا اور شام بہاری لال فالج میں مبتلا ہوا، اُسی حالت میں پکڑا گیا، دورہ سپرد ہوا اور نہایت تلخی اور رسوائی کے ساتھ حوالات ہی میں کچھ کھا کر مر گیا۔

اگرچہ اُس صدمہ کا اندازہ کرنا نہایت مشکل ہے جو اس غبن فاحش سے سرسید کے دل پر گذرا ہوگا اُنھوں نے بُہتوں بُہتوں تالاب بھرا تھا اور قطرہ قطرہ اُس جمع کر کے قوم کی پیاس بجھانے کا سامان مہیا کیا تھا مگر باوجود اس سخت صدمہ کے وہ نہایت غنیمت سمجھتے تھے کہ اُن کی زندگی میں راز کھل گیا اور شام بہاری لال کی بداعمالی سب پر ظاہر ہو گئی۔ اگر وہ دفعتاً سخت بیمار نہ ہو جاتا تو خدا جانے یہ مادۂ فاسد اندر ہی اندر کس حد تک پہنچ جاتا اور اُس سے آخر کو کیا نتیجے

پیدا ہوتے۔ سرسید نے انہیں دنوں میں جب کہ شام بہاری لال پر کالج کی طرف سے فوجداری میں مقدمات دائر ہو رہے تھے راقم کو ایک خط لکھا تھا اُس میں لکھتے ہیں کہ "اگرچہ ان دنوں میں میری طبیعت نہایت پریشان ہے اور عدالت میں حاضر ہونے اور مقدمات میں حلفی اظہار دینے کی تکلیف نہایت سخت معلوم ہوتی ہے مگر جو تقدیری ہیں اُن سے کچھ چارہ نہیں بعض لوگوں کا خیال ہے کہ شام بہاری لال نے جو تصرف کیا وہ اس خیال سے تھا کہ چونکہ میری عمر زیادہ ہوگئی ہے اور موت کے دن قریب آتے جاتے ہیں ایک دن میں مرجاؤنگا اور جو کچھ اُسنے جعلسازی کی ہے وہ سب تلپٹ ہو جائیگی۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ میری زندگی ہی میں اُسکی جعلسازی اور فریب کھل گیا۔ ورنہ میرے بعد بڑی مشکل پڑتی اور لوگ سمجھتے کہ میں نے ہی روپیہ میں تصرف کیا ہے۔ پس خدا کی مہربانی تھی کہ میرے سامنے ہی یہ راز کھل گیا۔ بعض لوگ اپنی حماقت سے یہ سمجھتے ہیں کہ روپیہ میری تحویل میں اور میرے قبضہ میں تھا، حالانکہ یہ امر بالکل غلط ہے۔ قانون ٹرسٹیان میں حکم ہے کہ روپیہ بینک میں جمع کیا جائے۔ چنانچہ کل روپیہ بینک میں جمع تھا۔ اور بینک کے خزانہ سے بذریعہ جعلی چکوں کے تصرف ہوا۔ اور جعلی چکوں کو روکنا جب تک کہ انکا حال نہ کھلے کسی بشر کے اختیار میں نہیں۔ بہرحال میں تو خدا کی رحمت سمجھتا ہوں کہ میری زندگی میں یہ حال کھل گیا گو کہ مجھکو کیسا ہی رنج اور صدمہ ہو"

الغرض جب شام بہاری لال دفعۃً فالج میں مبتلا ہو گیا اور اُسکی غیبت میں بینک سے چٹھیاں موصول ہوئیں تو اُن کا مضمون سُنکر سرسید کو شبہہ پیدا ہوا۔ اُنھوں نے چک بُک نکلوا کر دیکھی تو معلوم ہوا کہ بہت سے چکوں کے نصف ٹکڑے جو بینک میں بھیجے جاتے ہیں ندارد ہیں اور اُنکے مثنّے جو چک بُک میں لگے رہتے ہیں وہ کورے بغیر لکھے لگے ہوئے ہیں۔ جب روزنامچہ دیکھا تو اُن نمبروں کے کسی چک کی روانگی روزنامچہ میں مندرج نہ پائی گئی اور جو ڈاکٹ کہ چکوں کے ساتھ حسب قاعدہ بینک میں بھیجے گئے تھے اُنکی نقل بھی رجسٹر میں نہ ملی۔ آخر جب سرسید نے بینک سے خط کتابت شروع کی اور وہاں سے تمام کاغذات کی نقلیں منگوائیں تو کلرک کی تمام چوریاں اور جعلسازیاں من وعن ظاہر ہوگئیں۔ اُنھوں نے حسب منشائے قانون ٹرسٹیان فوراً اس واقعہ کی اطلاع گورنمنٹ میں بھیجدی اور دونوں مقدمے شام بہاری لال پر فوجداری میں دائر کیے گئے یہانتک کہ صاحب مجسٹریٹ نے اُس کو سپرد سشن کر دیا۔ لیکن ابھی عدالت سشن میں روبکاری کی نوبت نہ پہنچی تھی کہ وہ حوالات ہی میں غالباً کچھ کھا کر دفعۃً مر گیا۔

سرسید نے جو رپورٹ سالانہ اجلاس ٹرسٹیان منعقدہ یکم جنوری سنہ ۱۸۹۶ء میں پیش کی تھی اُس سے ظاہر ہے کہ اُنھوں نے ایک بات کے سوا اُن تمام فرائض کے ادا کرنے میں جو بحیثیت سکرٹری ہونیکے اُن کی ذات سے علاقہ رکھتے تھے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ بے شک اُنسے یہ بہت بڑی فروگذاشت

ہوئی کہ ایک مدت دراز تک یہ دہاڑی چور چاک بک میں سے نکال نکال کر جعلی چک جاری کرتا رہا اور اُنکے ٹھنے کو بے بغیر لکھے چک بک میں لگے رہے اور کبھی کسی نے چاک بک کو کھول کر نہ دیکھا کہ اُس میں دن ہاڑے کیا لوٹ مچ رہی ہے اور اُس کا سبب سرسید کی وہی نیک دلی اور اُنکا حُسن ظن تھا جسکی وجہ سے کُجُنٹ نفس کی طرف کبھی اُنکا ذہن انتقال نہ کرتا تھا جیسا کہ کہا گیا ہے "إِنَّ الْكَرِيمَ إِذَا خَادَعْتَهُ انْخَدَعَا" یعنی کریم النفس آدمی کو جب دھوکا دوگے وہ دھوکا کھا جائے گا اس ایک الزام کے سوا کسی قسم کی گرفت سرسید پر نہیں کیجا سکتی۔ اُن کا کلرک کی انگریزی تحریروں پر بلا تامل دستخط کردینا کوئی قابل اعتراض بات نہیں ہے۔ تمام دفاتر سرکاری وغیر سرکاری میں اسی طرح ماتحتوں پر اعتماد کیا جاتا ہے کیونکہ اگر اُنپر ایسا اعتماد نہ کیا جائے اور خواہی نخواہی اُنکے کام کو مشتبہ سمجھا جائے تو ہرگز کام نہیں چل سکتا۔ اسکے سوا کلرک مذکور نے تمام جعلی چکوں اور جعلی ڈاکٹوں پر سرسید سے دستخط نہیں کرائے بلکہ زیادہ تر اپنے ہاتھ سے جعلی دستخط بنا کر جاری کیے۔ جو روپیہ نوٹوں کی کفالت پر بطور سودی قرض کے بنک سے وصول کیا گیا اس کا الزام بھی سرسید پر عائد نہیں ہوتا۔ کیونکہ اُن کو ہر طرح سے اطمینان تھا اور اطمینان ہونا چاہیئے تھا کہ پبلک فنڈ کی کفالت پر بنک کسی کو ایک حبہ قرض نہیں دیسکتا۔ اور جعلی مختار نامہ کلرک نے بنک میں بھیجکر اُسکو دھوکا دیا اُسکا کسی کو سان گمان بھی نہ تھا۔ نہ اُسپر سرسید کے اصلی دستخط تھے اور نہ کسی ٹرسٹی کے بلکہ سب کے دستخط اپنے ہاتھ سے بنائے تھے اور مختار نامہ بالا ہی بالا تیار کرکے بنک کو چلتا کردیا تھا۔ مرزا عابد علی بیگ صاحب ٹرسٹی کالج اور سید ولایت حسین صاحب بی اے سکنڈ ماسٹر اسکول ڈپارٹمنٹ نے جو تین مہینے کی لگاتار کوشش اور محنت سے کالج کے حساب کی ابتدا سے اخیر تک جانچ پڑتال کی اور اُسکا مقابلہ بنک کے حسابات سے کیا اُس سے جیسا کہ سرسید کی رپورٹ میں درج ہے۔ صاف پایا جاتا ہے کہ بنک میں پہنچنے سے پہلے کسی طرح کا تغلب دفتر سکرٹری میں نہیں ہوا۔ بلکہ بنک میں پہنچنے کے بعد جعلی چکوں کے ذریعہ سے روپیہ نکلوایا گیا۔ چنانچہ سرسید کی رپورٹ مذکورہ بالا سنکر تمام ٹرسٹیوں نے جو جلسہ میں حاضر تھے اس بات کو تسلیم کیا تھا کہ سرسید نے جو احتیاط کہ ممکن تھی اُس میں کسی طرح کی فروگذاشت نہیں کی اور جس طریقہ سے کہ غبن وقوع میں آیا اُس کا احتمال بہت کم ہوتا ہے اور شام بہاری لال کے ہاتھ میں کسی رقم وصولی کا نہ رہنا اور تمام رقوم مندرجہ روزنامچہ کا بالیقین بنک میں جمع ہوجانا اس بات کے لیے کافی تھا کہ سرسید کو کلرک کی نسبت کسی طرح کی بے اطمینانی نہ ہو۔ اسی بنا پر جلسہ حاضرین نے بالاتفاق ایک ووٹ آف فل کانفڈنس اس مضمون کا پاس کیا کہ سرسید نے حسابات

کالج میں کوئی دقیقہ احتیاط کا فروگذاشت نہیں کیا اور ہیڈ کلرک پر اُس سے زیادہ بھروسا نہیں کیا جیسا کہ انگریزی دفتروں میں عموماً ایسے عہدہ داروں پر کیا جاتا ہے۔

ایک صاحب نے اس ووٹ کے پاس ہونیکا حال سُنکر کہا کہ "ٹرسٹی اگر ایسا ووٹ پاس نکرتے تو اور کیا کرتے؟ وہ خود اس الزام میں جس سے اُنہوں نے سکرٹری کو بَری کرنا چاہا ہے۔ سکرٹری کے شریک غالب تھے" حق یہ ہے کہ ٹرسٹیوں کے پاس اعتراض کا کوئی معقول جواب نہیں ہے اور ہمارے نزدیک مولوی سمیع اللہ خاں نے اپنے خط موسومہ سکرٹری مورخہ ۲۵۔ جنوری ۱۸۹۶ء میں بالکل صحیح لکھا تھا کہ "اگر ٹرسٹی نگرانی کرتے اور سال میں دو سال میں بھی کبھی اپنے فرض کے ادا کرنے کے خیال سے حسابات کو کالج کے جانچتے تو یہ لاکھ روپیہ سے زیادہ کے تغلب کی مصیبت جس میں مسلمانوں کا روپیہ برباد گیا۔ کالج پر کیوں نازل ہوتی" سچی بات یہ ہے کہ گو مسلمان قومی تعلیم میں روپیہ خرچ کرنا سیکھ گئے ہیں مگر روپیہ دینے کے بعد پھر اُسکی خبر لینی بالکل نہیں جانتے اور ٹرسٹیوں میں ایسے لوگ شاذ و نادر ہی نکلیں گے جو اپنے تئیں کالج کے کسی معاملہ کا ذمہ دار سمجھتے ہوں۔ پس جب تک مسلمانوں میں یہ خیال پیدا نہ ہوگا کہ جو روپیہ ہم نے قوم کی تعلیم کے لیے دیا ہے وہ کیونکر خرچ ہوتا ہے اور اُسکے محفوظ رہنے کا کیا انتظام کیا گیا ہے، اور جب تک تمام ٹرسٹی اپنے تئیں کالج کے معاملات کا جوابدہ نہ سمجھینگے اور اپنے فرائض کو جو قانون ٹرسٹیان میں بیان ہوئے ہیں ہمیشہ نصب العین نہ رکھینگے اُس وقت تک کالج کا سرمایہ بدستور خطرہ میں رہیگا۔ ایک سکرٹری کس کس چیز کی خبر رکھیگا اور کہاں کہاں اپنا ذہن دوڑائیگا اور ایک قحط زدہ قوم میں ایسا جامع حیثیات سکرٹری کہاں سے آئیگا جو فکر معاش سے فارغ البال اور خانگی بکھیڑوں سے بالکل آزاد ہو، رات دن کالج کے انتظام میں مصروف رہے اور جب روپیہ کی ضرورت ہو تو در در بھیک مانگتا پھرے، گورنمنٹ اور قوم دونو کا معتمد علیہ ہو، سپیکر ہو، رائٹر ہو، خزانچی ہو اور باوجود ان تمام باتوں کے ایک نہایت کارآزمودہ کلرک بھی ہو جو کلرکوں کی چالاکیوں سے بخوبی آگاہ اور خبردار ہو۔

سرسید کی وفات

اگرچہ غبن کے واقعہ نے سرسید کی خوشدلی کو بہت کچھ مکدر کردیا تھا مگر اس صدمہ سے اُن کی طبیعت ایسی مغلوب نہیں ہوئی تھی کہ اُن کی ہمت اور کوشش میں فتور آجائے وہ تمام قومی خدمات اپنی قدیم عادت کے موافق برابر انجام دیتے تھے اور غبن کے سبب سے جو نقصان کالج کو پہنچا تھا اُسکے تدارک کی فکر سے بھی غافل نہ تھے۔ لیکن افسوس ہے کہ اس خلش سے بھی نجات نہ ہوئی تھی کہ اُن کو ایک ایسی لاعلاج مصیبت پیش آئی جس کا اعادہ کرنا اُس سے زیادہ سخت مصیبت ہے

مختصر یہ ہے کہ سنہ ۱۸۹۷ء کے نصف اخیر میں اُس بیٹے کی علالت اور سوء مزاج نے جسپر نہ صرف باپ کو بلکہ تمام قوم کو فخر تھا سرسید کو آوے کی طرح بٹھا دیا۔ گو بظاہر وہ اس مصیبت کو اخیر دم تک نہایت صبر اور خاموشی کے ساتھ اور ایسے تحمل کے ساتھ جس کی نظیر ملنی مشکل ہے برابر جھیلتے رہے مگر یہ صدمہ اندر ہی اندر کام تمام کرتا جاتا تھا۔ جو تلخ اور ناگوار حالت اس زمانہ میں ان پر گذری اس کا کسی قدر اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ مرض الموت میں ایک بڑے ڈاکٹر نے اُنکے ملاحظہ کے بعد لوگوں سے کہا کہ اگر یہ صدمہ اُن کو نہ پہنچتا تو اُنکے قوٰے ایسے عمدہ تھے کہ پندرہ بیس برس تک اور زندہ رہ سکتے تھے۔ باوجود ایسی تلخ حالت کے کبھی کسی نے اس کوہ وقار شخص کی زبان سے کوئی شکایت یا افسوس کا کلمہ نہ سنا ہوگا۔ مرنے سے دو ڈیڑھ مہینے پہلے اُن کو چپ لگ گئی تھی بولتے بہت کم تھے اور ہاں یا نہیں کے سوا بات کا بہت کم جواب دیتے تھے۔ اُن کے یار غار محسن الملک اور سید زین العابدین خاں گھنٹوں اُنکے پاس خاموش بیٹھے رہتے تھے صحبت کا لطف بالکل جاتا رہا تھا۔ ایک دن سید زین العابدین خاں نے پوچھا کہ آپ ہر وقت خاموش کیوں رہتے ہیں؟ سرسید نے کہا کہ "اب وہ وقت قریب ہے کہ ہمیشہ چپ رہنا ہوگا۔ اسلیے خاموش رہنے کی عادت ڈالتا ہوں"

باایں ہمہ قومی خدمات کی دُھن اور خاصکر کالج کی بہبودی کا خیال کبھی اُن کے دل سے فراموش نہ ہوتا تھا۔ اُسی حالت میں اُنہوں نے متعدد آرٹیکل تعلیم پر لکھے۔ اُنہیں دنوں میں اُردو زبان اور فارسی خط کے خلاف جب تیسری بار جھگڑا اُٹھا تو اُنہوں نے اس معاملہ کی نسبت پھر اپنی قدیم رائے مرنے سے آٹھ دن پہلے ظاہر کی اور گورنمنٹ کو اُسکی طرف توجہ دلائی اور جو کمیٹی الہ آباد میں اُردو زبان اور فارسی خط کی حمایت کے لیے قائم کی گئی تھی اُس سے خط کتابت کی اور باوجود ہر طرح کی معذوری کے تا بمقدور اُس کی تائید کرنے کا وعدہ کیا۔ اُنہیں دنوں میں ایک عیسائی نے رسالہ امہات المومنین اسلام کے برخلاف شائع کیا تھا جس میں آنحضرت صلعم کی کثرت ازواج اور آپ کے اخلاق پر نہایت دریدہ دہنی سے اعتراض لکھے تھے۔ سرسید نے اول بطور تمہید کے ایک بڑا آرٹیکل اُصول تنقید روایات پر اسی رسالہ کو دیکھکر لکھا اسکے بعد اُس رسالہ کا جواب لکھنا شروع کیا۔ یہ جواب[1] ابھی ختم نہ ہونے پایا تھا کہ ۲۴ مارچ سنہ ۱۸۹۸ء کو احتباس بول کا عارضہ لاحق ہوا۔ صاحب سول سرجن علیگڑھ بڑی توجہ سے علاج کرنے لگے اور میرٹھ کے مشہور مڈیکل افسر ڈاکٹر مور یارٹی کو بھی مشورہ کے لیے

[1] یہ جواب جسقدر لکھا گیا تھا کالج میگزین میں چھپ گیا ہے ۱۲

بلایا گیا مگر چونکہ وقت موعود آ پہنچا تھا کوئی تدبیر کارگر نہوئی۔ ۲۶- کی شام کو علامات ردیہ ظاہر ہونے لگیں۔ ۲۷- مارچ کی صبح سے نہایت سخت درد سر لاحق ہوا جو اس بات کی علامت تھی کہ یورک ایسڈ دوران خون میں شامل ہوکر جلد جلد دماغ پر اپنا اثر کر رہا ہے۔ اُسی دن شام کو شدید لرزہ کے ساتھ تپ چڑہی اور تھوڑی سی دیر میں ہذیان کی صورت پیدا ہو گئی۔ اُنکی عادت تھی کہ ہمیشہ بیماری کی شدت میں "حَسْبِیَ اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْل" بار بار پڑھا کرتے تھے۔ اس دفعہ بھی ہذیان کی حالت طاری ہونے سے پہلے قرآن کی یہ دو آئتیں برابر اُن کی زبان پر جاری ہیں "(۱) حَسْبِیَ اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْل نِعْمَ الْمَوْلٰی وَنِعْمَ النَّصِیْر (۲) اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا"۔ مگر تپ کی شدت اور ہذیان کی حالت میں کوئی بات جو سمجھ میں آئے اُنکی زبان سے نہیں نکلی۔ گویا کہ تپ کے چڑھتے ہی تھوڑی دیر بعد احتضار شروع ہو گیا تھا تین گھنٹے سخت کرب و بے چینی رہی اور رات کے دس بجے حاجی اسمٰعیل خاں کی کوٹھی میں۔ جہاں مرنے سے دس بارہ روز پہلے حالت صحت میں وہ سید محمود کی کوٹھی سے اُٹھ گئے تھے۔ وفات پائی دوسرے دن ساڑھے پانچ بجے دن کے جنازہ اُٹھایا گیا۔ مدرسۃ العلوم کا کل اسٹاف اور تمام طالب علم، اسٹیشن کے یوروپین اور ہندوستانی افسر اور اہلکار، علیگڑھ کے رئیس اور ہر درجہ کے مسلمان ہندو اور عیسائی اس کثرت سے جنازہ کے ساتھ تھے کہ غالباً علیگڑھ میں کبھی اس نوعیت کا ازدحام کسی نے نہ دیکھا ہوگا۔ جو راج مزدور بڑھئی اور سنگتراش پچیس چھبیس برس سے کالج میں کام کرتے تھے۔ وہ اُن کی عورتیں اور بچے جو دیہات سے یہ خبر سنکر آئے تھے جنازہ کی گذرگاہ کے ایک جانب کھڑے ہوئے نہایت حسرت بھری نگاہ سے اپنے مربی کے جنازہ کو تاک رہے تھے اور اکثر طالب علم زار و قطار روتے جاتے تھے۔ الغرض ۶ بجے کے بعد کرکٹ فیلڈ میں جنازہ کی نماز ہوئی نماز کے بعد جب جنازہ فیلڈ سے بورڈنگ ہوس کے احاطہ میں داخل تو گارڈ آف آنر جو گورنمنٹ کی طرف سے مامور ہوا تھا۔ پریزنٹ آف آرمس کی سلامی اُتاری اور قبیل مغرب مسجد مدرسۃ العلوم کے شمالی پہلو پر جو تھوڑی سی جگہ مسجد کی حد سے خارج اُسکے احاطہ کے اندر بیکار پڑی تھی وہاں اُس قوم کی امیدگاہ اور پشت پناہ کو دفن کیا گیا۔

قوم را سرمایۂ مجد و علا از دست رفت ٭ بعد ازاں کایں گنج را در خاکداں انداختند
تا قیامت گوئی از تاراج ما فارغ شدند ٭ کایں مصیبت بر سر اسلامیاں انداختند

اگرچہ سرسید کی وفات کی بیشمار تاریخیں لکھی گئیں و عربی مادے عجیب غریب نکلے ہیں ایک "غُفِرَلَہٗ" اور دوسری قرآن مجید کی یہ آیت "اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ وَمُطَھِّرُکَ"[۱]

اس شخص کے مرنے پر جس غیر معمولی طریقے سے نہ صرف مسلمانوں نے بلکہ غیر قوموں نے بھی اور نہ صرف ہندوستان میں بلکہ غیر ملکوں میں بھی رنج و افسوس کا اظہار کیا گیا ہے اسکی مثال ملنی دشوار ہے تعزیت کے کچھ کم دو سو تار جنمیں سے کسیقدر بذریعۂ کالج میگزین کے شائع کیے گئے تھے اطراف ہندوستان سے اُنکے بیٹے کے نام پہنچے اور تمام ہندوستان میں شاید ہی کوئی اسلامی انجمن یا سوسائٹی ایسی رہ گئی ہوگی جس میں سرسید کی وفات پر ماتمی جلسہ اور رنج و ملال کا اظہار نہ کیا گیا ہو۔ حضور ویسرائے اور نواب لفٹنٹ گورنر کے علاوہ اکثر یوروپین افسروں اور حاکموں نے بذریعۂ تار یا تحریر یا تقریر کے اس بزرگ کی موت پر رنج ظاہر کیا۔ نواب لفٹنٹ گورنر صاحب نے کلکٹر علیگڑھ کو بذریعہ تار کے اطلاع دی کہ ہز آنر کی طرف سے جنازہ کی مشایعت اور دفن میں شریک ہوں۔ ملک میں کوئی انگریزی یا دیسی اخبار ایسا نہ ہوگا جس میں بار بار اس عالمگیر حادثہ پر آرٹکل یا نوٹ نہ لکھے گئے ہوں لندن کے بڑے بڑے نامور اخباروں میں (جیسے ٹائمز اوف لندن، پال مال گزٹ، ایوننگ سٹینڈرڈ، ایکو میل، ڈیلی میل، لائڈز، ایوننگ نیوز وغیرہ) اس واقعہ کو ہندوستان کے مسلمانوں کی ایک نہایت اعلی درجہ کی پولٹکل طاقت کے زوال سے تعبیر کیا گیا اور انگلو انڈین اور مسلمان دونوں کے لیے ایک عام مصیبت بیان کیا گیا۔

انگلستان میں جو ایک مسلمانوں کی سوسائٹی موسوم بہ "مسلم پیٹریاٹک لیگ" ہے اُس میں بھی سرسید کی وفات پر ایک ماتمی جلسہ کیا گیا جس میں مولوی رفیع الدین احمد نے ایک ریزولیوشن اس مضمون کا پیش کیا تھا کہ سرسید کی خدمات کا شکریہ اور اُن کی وفات پر رنج و افسوس اور اُن کے وارثوں کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا جائے۔ ٹائمز اوف لندن نے بھی اس جلسہ کا ذکر کیا تھا اور سرسید کی وفات پر ایک لمبا آرٹکل چھاپا تھا جس میں لکھا تھا کہ "وہ (یعنی سرسید) اپنے ہم مذہبوں کی حمایت میں اُن کو حملوں سے بچانے کے لیے ہمیشہ تیار رہتے تھے اور خود ہمارے کالموں نے اور بعض بڑے بڑے میگزینوں نے اُنکی اُس علمی اور منطقی لیاقت کی شہادت دی ہے جو اُنہوں نے اپنی قوم کی حمایت میں ظاہر کی"۔ اسکے بعد اُسمیں لکھا تھا کہ "کسی شخص نے ہندوستان کے مسلمانوں کے بیدار کرنے اور اُن کو اپنے تنزل اور خاصکر تعلیم کے ضروری معاملہ کا خیال دلوانے میں اُن کے کام کا دسواں حصہ بھی نہیں کیا۔ فی الحقیقت جب اس معاملہ میں اُنکی عمر بھر کی لگاتار کوششوں اور تعجب انگیز کامیابیوں کو دیکھا جاتا ہے تو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ انکو ہندوستان

---

[۱] اس آیت میں عیسیٰ علیہ السلام کی طرف خطاب ہے جسمیں خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے عیسیٰ میں تجھکو موت دینے والا ہوں اور اپنی طرف اُٹھانے والا ہوں اور تجھکو کافروں کے اتہام سے پاک کرنیوالا ہوں ۱۲

کے مسلمانوں میں تعلیم کا پیغمبر کہا جاوے - علیگڑہ کی سوسائٹی، اُسکا مطبع، اُسکا اخبار اور محمڈن کالج - جو کیمبرج اور اکسفورڈ کے کالجوں کے نمونہ پر مسلمانوں کی شریف قوموں کے لیے بنایا گیا ہے - یہ سب اُسکی ہمت، عقل اور فراخ حوصلگی کی شاندار یادگاریں ہیں"

پال مال گزٹ مورخہ ۲۹- مارچ میں سرسید کی نسبت لکھا تھا کہ "سرکار انگریزی اور باشندگان ہند کے تعلقات کی کہانی میں کوئی باب ایسا نہیں ہے جس پر ہم دل سے اپنے تئیں اسقدر مبارکباد دیسکیں جسقدر سرسید احمد خاں کی زندگی پر - وہ ابتدائے عمر سے آخر دم تک انگریزی راج کا پکا دوست رہا اور جو خدمتیں اُسنے کیں اُنکی قدر و قیمت کا اندازہ کرنا مشکل ہوگا"

انگلستان کے اخباروں کے حوالے سے یورپ کے اکثر اخباروں میں اور نیز ممالک اسلامیہ کے بعض عربی اخباروں میں بھی اس حادثہ پر افسوس کیا گیا تھا چنانچہ المؤیّد میں انہیں کے حوالے سے لکھا تھا کہ "مسلمانوں میں سید مرحوم ایک بہت بڑے زبردست پولٹیشن تھے اسلیے مرحوم کی وفات اسلامی دنیا میں ایک عالمگیر مصیبت خیال کی گئی ہے - خدا اُنکی مغفرت کرے اور مسلمانوں کو اُنکا نعم البدل عنایت کرے"

پایونیر مورخہ ۲۹- مارچ ۹۸ء میں اس واقعہ کی خبر پہنچتے ہی یہ لکھا گیا تھا کہ "سرسید احمد خاں جو ایک دوراندیش مدبر ہونیکی وجہ سے تعلیم کا نہایت سرگرم حامی تھا - اُسکے انتقال کے ساتھ اُس نہایت مفید بارآور اور نہایت زبردست پولٹکل طاقت کا خاتمہ ہوگیا ہے جسنے موجودہ صدی کے اخیر ربع میں ہندوستان کی اسلامی دنیا کو متحرک کر دیا تھا"

ٹائمز آف انڈیا مورخہ ۲۹ مارچ ۹۸ء میں جو ایک لمبا آرٹکل کسی اینگلو انڈین کا لکھا ہوا اس واقعہ کے متعلق چھپا تھا اُس میں سرسید کی نسبت لکھا تھا کہ "اُسکا یہ خیال تھا کہ اسلام کو دوبارہ اُس درجہ پر پہنچا دیا جائے جو بارہویں صدی عیسوی میں علم و حکمت کا مربی ہونے کی حیثیت سے اُسکو حاصل تھا"

جو اسپیچیں انگریزوں اور ہندوستانیوں نے اطراف ہندوستان کے ماتمی جلسوں میں سرسید کی وفات پر کی ہیں وہ گنتی اور شمار سے خارج ہیں یہاں ہم صرف دو معزز اور لائق انگریزوں کی تقریر کا خلاصہ لکھتے ہیں جن کو مدت دراز تک علیگڑھ میں رہنے اور سرسید سے ملنے جلنے اور اُنکے حالات پر غور کرنے کا اتفاق رہا۔

مسٹر بوررڈ کلکٹر و مجسٹریٹ میرٹھ نے جو تقریر میرٹھ کے ماتمی جلسہ واقع ماہ اپریل ۱۸۹۸ء میں کی اُسمیں اُنھوں نے کہا "آج اس جلسے میں ہم پر ایک غم کی گھٹا چھائی ہوئی ہے - سرسید احمد کے انتقال سے نہ صرف ملک کا ایک بڑا رکن سلطنت اور قوم کا بڑا خیر اندیش کھو دیا ہے بلکہ حاضرین جلسہ میں سے اکثر کا ایک ذاتی دوست ہاتھ سے جاتا رہا ہے اگر میں نے اُسکی زندگی کے مطالعہ میں غلطی نہیں کی تو میں کہہ سکتا ہوں کہ جہاں اُسمیں اور بڑے بڑے اوصاف موجود تھے اُن میں دو بہت ہی اعلیٰ درجہ کے تھے: اول اُسکی اعلیٰ درجہ کی حُب الوطنی اور دوسری اعلیٰ درجہ کی دلیری۔ اُسنے گویا ابتدائے عمر ہی میں معلوم کر لیا تھا کہ ہندوستان کے مسلمان مایوسانہ جہالت میں ڈوبتے جاتے ہیں اور اُن کو روشنضمیر بنانے کی سخت ضرورت ہے، بڑی بڑی قومی ضرورتیں رفع کرنے کے لیے ہمیشہ بڑے آدمی

درکار ہوتے ہیں اور یہ ہندوستان کے مسلمانوں کی خوش قسمتی تھی کہ ایسا بڑا شخص اُنکی ضرورت رفع کرنیکو اُٹھا۔ سرسید احمد نے مجبوری کے ساتھ اپنے تئیں تقدیر کے حوالہ نہیں کیا اور نہ اُسنے گورنمنٹ سے مدد چاہی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ جو کام اُس کو درپیش ہے اگر اُسکو پورا کرنا ہے تو قوم ہی اُسکو پورا کریگی اور اسلیئے اُسنے زندگی کے ایک ایسے زمانہ میں جبکہ ہم میں سے اکثر ہاتھ پاؤں ہلانے سے جی چُراتے ہیں اور باقی عمر کو اپنی ذاتی آسائشوں اور ذاتی افزائشوں کے لیے مخصوص کر دیتے ہیں۔ اپنا وقت، اپنی طاقت، اپنا روپیہ، اور سچ پوچھو تو اپنا سب کچھ ہمجنسوں کی بھلائی کے لیے وقف کر دیا۔ ہم میں سے جو یہاں موجود ہیں کوئی شخص اُن مشکلات کا جن کا اُس کو مقابلہ کرنا پڑا اور اُس عزم و حزم کا جو اُن مشکلات کے مغلوب کرنے کے لیے مطلوب تھا تصور اور اندازہ نہیں کر سکتا۔ لیکن باوجود تمام مشکلات اور تمام نا امیدیوں کے وہ اپنے منصوبہ پر کامل وثوق رکھتا تھا اور آخر اُسکو اپنی کوششوں کا ثمرہ مل گیا"

اس کے بعد مسٹر بورڈ نے کالج کی ابتدا اور اُسکی ترقیات کا ذکر کرنے کے بعد کہا کہ "لندن کے سینٹ پال کیتھیڈرل[۵۱] میں سر کرسٹوفر رن کی لاش مدفون ہے اور اُسکی قبر پر لیٹن میں یہ مشہور کتبہ کندہ کیا ہوا ہے کہ "اگر تم اُسکی یادگار تلاش کرنی چاہتے ہو تو اپنے چاروں طرف دیکھو" جن لوگوں نے یہ کتبہ یہاں کندہ کرایا تھا اُنھوں نے خیال کیا اور صحیح خیال کیا کہ اُس بڑے نقاش کی سب سے عمدہ یادگار یہی نامی گرجا ہے جو اُسکے مجوزہ نقشہ پر بنایا گیا ہے۔ اسی طرح جب تم سے لوگ سرسید کی یادگار پوچھیں تو تم بھی اُس عالیشان کالج کو بتا سکتے ہو جسکی اُس نے بنیاد ڈالی ہے اور کہہ سکتے ہو کہ اپنے چاروں طرف دیکھو۔ لیکن اگر تم اور تمہاری آیندہ نسلیں اپنے بڑے لیڈر کی زندگی کے سبقوں کو خوب ذہن نشین کرینگی تو اُس سے بھی زیادہ عالیشان یادگار اُسکے لیے قائم کرینگی۔ تم نہ صرف بے جان پتھر اینٹ اور مسالے کو بلکہ ایک بڑے قومی کالج کی زندہ اور زندگی بخش طاقت کو اور اُسکے تعلیم یافتہ گروہ کی بے سقم تربیت، حب الوطنی، خود اعتباری اور سب سے بڑھکر اُن کی اعلیٰ درجہ کی اخلاقی حالت کو پیش کر سکو گے۔

صاحبو! ایک ایسے وقت میں جیسا کہ یہ وقت ہے میں جو ایک مختلف نسل کا ممبر اور مختلف مذہب پر یقین رکھنے والا ہوں آپ سے ایک درخواست کر سکتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ تم تمام اختلافات اور حسد اور عداوت کو جنے تمہیں متفرق کر رکھا ہے اپنے مرحوم لیڈر کی قبر میں دفن کرنے پر راضی ہو جاؤ۔ خفیف خفیف باتوں یا مذہبی خیالات میں تم سرسید کے ساتھ یا باہم کیسا ہی اختلاف رکھو مگر تم سب کو اُس عالیشان جانفشانی کی۔ جو اُسنے اسلام کی حمایت میں ظاہر کی اور اُن اعلیٰ نتائج کی جو اس جانفشانی کی وجہ سے اُسنے حاصل کیے۔ قدر کرنی چاہیے۔ اگر تم صرف اُسکے کام ہی کو جاری رکھوگے تو یقیناً تم کو کامیابی حاصل ہوگی کیونکہ میں تم کو یاد دلاتا ہوں کہ دنیا میں اتفاق اور صرف اتفاق ہی کا نام طاقت ہے"

مسٹر آرنلڈ نے جو انجمن اسلامیہ لاہور کے ماتمی جلسہ واقع ۲۹۔ مارچ سنہ مذکور میں سرسید کی

---

[۵۱] یہ لندن میں ایک نہایت شاندار اور مشہور گرجا ہے جو عمارت اور نقشہ کی خوبی میں ضرب المثل ہے۔ ۱۲

وفات پر تقریر کی اُس کا ترجمہ ہم اول سے آخر تک نقل کرتے ہیں اُنہوں نے کہا کہ "میں امید کرتا ہوں کہ اس موقع پر مجھکو اس لحاظ سے کہ دس برس تک اُس بزرگ اور شریف آدمی کی خدمت میں مجھے رہنا نصیب ہوا ہے جسکی موت پر ہم اس وقت رنج و الم ظاہر کرتے ہیں۔ چند الفاظ کہنے کی اجازت دیجائیگی۔

مجھکو دس برس تک اس عجیب و غریب اور بالاترین شخص سے تقرب اور دوستی کی عزت حاصل رہی ہے، نہیں نہیں بلکہ فرزند کے شفقت بھرے لفظ سے اُنہوں نے مجھکو مخاطب کیا ہے۔ اس دس برس میں سوائے زمانہ تعطیل کے مجھکو روزانہ سرسید سے ملنے جلنے کا اتفاق رہا۔ اُن کا مکان میرے گھر سے چند قدم کے فاصلہ پر تھا جس کا دروازہ ہر وقت میرے لیے کھلا رہتا تھا۔ جس قدر سرسید سے کوئی شخص زیادہ واقف ہوتا تھا اُسی قدر اُنکی بزرگی اور عظمت کا زیادہ معترف ہوتا تھا کیونکہ حقیقی عظمت کا اگر کوئی انسان مستحق ہو سکتا ہے تو یقیناً سید احمد خاں اُسکے مستحق تھے۔ تاریخ سے معلوم ہوگا کہ دنیا میں بڑے آدمی اکثر گزرے ہیں لیکن اُن میں بہت کم ایسے نکلیں گے جنمیں حیرت انگیز اوصاف اور لیاقتیں مجتمع ہوں۔ وہ ایک ہی وقت میں اسلام کا محقق، علم کا حامی، قوم کا سوشل ریفارمر، پولیٹشن، مصنف اور مضمون نگار تھا۔ اُس کا اثر اُس موجے والے عالم کا سا نہ تھا جو گوشۂ تنہائی میں بیٹھا اپنی تحریروں سے لوگوں کے دل الگ سے لیکر وہ دنیا کے سامنے لوگوں میں لوگوں کا رہبر بنکر اسلیے آیا کہ جس بات کو سچ اور صحیح سمجھے اگر اُس کی دنیا مخالف ہو تو ساری دنیا سے لڑنے کے لیے ہر وقت تیار اور آمادہ رہے۔ ہندوستان میں ہم کو ایسی شخص کی مثال جیسا کہ وہ تھا کہاں ملسکتی ہے کہ نہ جاہ و مرتبہ تھا اور نہ دولت تھی باوجود اسکے ہندوستان میں مسلمانوں کی قوم کا سردار بنکر ظاہر ہوا۔ یہ وہ رتبہ ہے جو اس سے پہلے کسی شخص کو بغیر تلوار کے زور کے حاصل نہیں ہوا۔ سرسید نے اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کہ اہلی غفلت، جہالت اور ذلت سے جس میں وہ مبتلا تھے اپنے تئیں نکالیں اور دیکھو اُسکی پکار پر ایک نئی نسل اُٹھ کھڑی ہوئی۔ لوگوں نے سرسید کو جھوٹا سمجھا، اُن کی باتوں کو بدنیتی پر محمول کیا اور چاروں طرف سے اُن پر طعن و تشنیع کی بوچھار ہوئی مگر اُس نے تمام مخالفتوں کو سامنے سے ہٹایا اور رستے کے تمام خس و خاشاک کو صاف کرتا ہوا اُس منزل کی طرف سیدھا ہو لیا جس پر پہنچنا مقصود تھا۔ جو مقصود وہ باندھتا تھا اُنکی طرف سے اول گورنمنٹ کو اطمینان دلانا ہوتا تھا جو ابتدا میں اس اندیشہ سے کہ وہ کہیں سلطنت کے استحکام اور ملک کے امن میں خلل انداز نہوں مطمئن نہ تھی۔ اور پھر اپنے ہم مذہبوں کے تعصبات اور اوہام سے مقابلہ کرنا پڑتا تھا جو سرسید سے اسلیے بدگمان تھے کہ اُسنے مذہبی مسائل میں ایک نیا اسکول قائم کیا تھا جسکی وجہ سے وہ اُسکو ملحد و بے دین کے نام سے پکارتے تھے۔ یہ ایک ایسی بات ہے جسمیں ہم نہایت مضبوط شہادت سرسید کی طبیعت کی اُس مقناطیسی قوت پر پاتے ہیں جس سے وہ لوگوں کے دلوں کو تسخیر کرتی تھی۔ وہ ایک ایسی قوم میں جسکی قومیت کی بنیاد صرف مذہب پر قائم ہو اور ایسی حالت میں جبکہ وہ نیچری اور کافر سمجھا جاتا ہو اپنی قوم کا مسلم سردار مانا گیا۔ تاریخ اسلام میں بہت سی مثالیں ایسی تحریکوں کی پائی جاتی ہیں جن کو مذہبی پیشواؤں نے شروع کرکے تکمیل تک پہنچایا اور ہزاروں پیرو اُن لوگوں میں سے

جو مذہبی خیالات میں اشتراک رکھتے تھے پیدا کر دے۔ لیکن کوئی تحریک (جیسا کہ میں یقین کرتا ہوں) اسلام کی تاریخ میں ایسی ملیگی جس میں ایک مسلمان شخص ایسے مسلمانوں کا سردار تسلیم ہوا ہو جو اُسکے مذہبی خیالات سے ہمدردی نہ رکھتے ہوں"

"جب سر آکلنڈ کالون ہندوستان سے جانے لگے تو علیگڑھ میں آئے اور اپنے دوست سید احمد خاں کے ذکر میں جن کو اُنہوں نے گویا جمعین کے لفظ سے یاد کیا تھا غدر کے اُس ہولناک زمانہ کا ذکر کیا جبکہ لوگوں کے دل عداوتوں سے بھرے ہوئے اور انتقام کے خیالات دلوں میں موجزن تھے۔ اُنہوں نے کہا کہ "اُس وقت کیا ہندوستانیوں میں اور کیا انگریزوں میں سرسید پہلے شخص تھے جنہوں نے اس سوال کی طرف توجہ کی کہ اس خرابی کا کیونکر علاج ہو اور حاکم و محکوم میں کسی طرح آشتی پیدا ہو"

سرسید نے غدر ۱۸۵۷ء کے بعد سب سے پہلے انگریزوں اور ہندوستانیوں میں دوستی پیدا کرنیکی کوشش کی اور اُس وقت سے مرتے دم تک وہ اسی بات میں کوشش کرتے رہے کہ قلم سے زبان سے اور نصیحت و تنبیہ سے حاکم و محکوم کے زخموں پر مرہم لگائیں اور اُن میں ایک مضبوط اتفاق پیدا کر دیں"

"آپ کو معلوم ہے کہ برٹش گورنمنٹ کی طرف سے اور اپنی قوم کی طرف سے سرسید کی قدر و منزلت ہوئی لیکن یہ عزت اور خطاب ہمیشہ بے طلب آئے۔ دنیا کے سگ طینت لوگ اس بات پر جسقدر اُن کا جی چاہے بھونکیں لیکن میں جو برسوں سے سرسید کو جانتا ہوں اس بات کو سچ سمجھتا ہوں میں آجتک کبھی کسی ایسے شخص سے نہیں ملا ہوں جس نے سرسید سے زیادہ شریف زندگانی بسر کی ہو، جو جاہ طلبی میں اُن سے زیادہ بے غرض ہو اور جو اُن سے زیادہ سچ کا حامی اور دوسروں کی خدمت پر اپنے تئیں وقف کرنیوالا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں آج ہم اُسکی موت پر روتے ہیں اب اُس جیسا کوئی کہاں ملے گا"

"ایک اور بات رہ گئی ہے جس کو میں اسوقت کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اگر آپکے یہ آنسو جھوٹے نہیں ہیں اور آپ جو سرسید کے ہم مذہب اور خیرخواہ ہیں اگر آپ کا یہ غم و الم سچا ہے تو کیا آپ کو رونے کے علاوہ کوئی اور کام باقی نہیں ہے؟ سمجھ لیجئے کہ یہ شخص جسکو آپ رو رہے ہیں یہ اسقدر مفلس تھا کہ نہ اُسکے پاس رہنے کو گھر تھا نہ مرنے کو؛ لیکن پھر بھی اُسنے ایک دولت آپکے لیے چھوڑی ہے وہ آپ ہی کے لیے یہ کام چھوڑ گیا ہے کہ تعصب اور جہالت کے مقابلہ میں شریفانہ لڑائی جاری رکھو اور آپ ہی کے سپرد یہ کام کر گیا ہے کہ اپنی افتادہ قوم کو اُٹھاؤ اور موجودہ ذاتی زندگی جو کچھ ہے اُسنے اپنی قوم کی مصالحت کراؤ۔ اس شخص نے آپکے لیے ایک ایسی مثال چھوڑی ہے کہ اگر آپنے اُسکی پیروی کی تو وہ آپکے اور آپ کی اولاد کے قبضہ میں سب سے بڑی دولت ہوگی"

جسقدر مرثیے اُردو، فارسی اور انگریزی میں اس حادثہ پر لکھے گئے ہیں ظاہرا واقعہ کربلا کے بعد کسی شخص کی موت پر نہ لکھے گئے ہونگے۔ کہتے ہیں کہ جعفر بن یحییٰ برمکی اور معن بن زائدہ شیبانی کے مرنے پر بھی شعرائے عرب نے بیشمار مرثیے لکھے تھے۔ اگر فرض کر لیا جائے کہ وہ تعداد میں سرسید کے مرثیوں سے کچھ کم نہ تھے تو بھی وہ مرثیے ان مرثیوں سے کچھ مناسبت نہیں رکھتے۔ اُنمیں شعرا اپنے ذاتی فائدوں اور شخصی نعمتوں کو روتے تھے جو اُنکی ذات کو جعفر اور معن کے بذل و عطا سے ہمیشہ پہنچتی تھیں اور ان میں اُس نقصان عظیم پر افسوس کیا گیا ہے جو قوم کے تمام افراد کو ایک شخص کے مرنے سے پہنچا ہے۔ وہ اُن شخصوں کی شان میں لکھے گئے تھے جو لوگوں کی جیبیں

درہم و دینار سے بھرتے تھے اور یہ اُس شخص کے لیے لکھے گئے ہیں جو لوگوں کی جیبیں خالی کرتا پھرتا تھا۔ اُنکا موضوع ایک خاندان یا ایک قبیلہ کی تباہی پر افسوس کرنا تھا اور ان کا موضوع تمام قوم کی مصیبت پر رنج و افسوس کرنا ہے۔ عرب کے ایک شاعر اشجع بن عمر سلمی نے جو اشعار اپنے باپ کے مرثیہ میں بطور مبالغہ کے لکھے تھے سچ یہ ہے کہ سرسید سے بہتر اُنکے مضمون کا کوئی مصداق نہیں ہو سکتا۔ وہ کہتا ہے

"مَضَی ابنُ سعیدٍ حینَ لم یَبقَ مَشرِقٌ وَلا مَغرِبٌ اِلّا لَہٗ فیہِ مَادِحٗ
وَمَا کُنتُ اَدرِی مَا فَوَاضِلُ کَفِّہٖ عَلَی النَّاسِ حَتّٰی غَیَّبَتہُ الصَّفَائِحُ"
کَاَن لَمْ یَمُتْ حَیٌّ سِوَاہُ وَلَمْ تَقُمْ عَلٰی اَحَدٍ اِلّا عَلَیْہِ النَّوائِحُ"

ترجمہ۔ ابن سعید گذر گیا جب کہ مشرق اور مغرب میں کوئی جگہ ایسی نہ رہی جہاں اُسکا کوئی نہ کوئی مداح نہو۔ جبتک وہ قبر میں نہیں گاڑا گیا میں نہیں جانتا تھا کہ لوگوں پر اُسکے کسقدر احسانات ہیں۔ گویا اُسکے سوا دنیا میں کوئی زندہ آدمی مرا ہی اور نہ کسی پر نوحہ کیا گیا ہے۔

منجملہ اُن بیشمار مرثیوں اور نوحوں کے جو اس حادثۂ عظیم پر لکھے گئے ہیں چند اشعار ایک یورو پین فاضل لیڈی نے بھی انگریزی زبان میں ترتیب دیے ہیں چونکہ لٹریری دنیا میں شاید پہلی ہی مثال ہے کہ ہندوستان کے ایک مسلمان کی موت پر انگلستان کی ایک شریف لیڈی ایک نظم بطور مرثیہ کے اپنی زبان میں لکھے اسلیے ہم اُس لطیف سونٹ (مرثیہ) کا ترجمہ اس مقام پر لکھتے ہیں۔

"ایک تناور درخت جہاں کھڑا تھا وہیں گر پڑا۔ اُسکی سایہ دار شاخیں۔ جو چاروں طرف دور تک جھومتی تھیں صحت بخش شبنم اُنسے ٹپکتی تھی، اور اُنھوں نے کثرت سے بیج بکھیرے تھے۔ اُنکے سایہ میں بنجر زمین اصلاح پا گئی۔ بیج پھوٹ نکلے؛ شگفتہ و شاداب پھول کھلنے لگے اور خوبصورت نونہالوں نے جو طاقت اور حسن سے آراستہ تھے اس ویران ریگستان کو گلزار بنا دیا۔ روؤ! اب اس شاہانہ درخت کے لیے کہ اجل نے اُسکو گرا دیا ہے۔ غم کرو مگر امید کے ساتھ، کیونکہ اسکی ہری بھری کھیتیاں جو اُسکی سالہا سال کی محنت کا ثمرہ ہیں اُسکی قبر کے گرد لہلہا رہی ہیں۔ جن نونہالوں کو اُسنے اپنی چھاؤں میں پرورش کیا تھا وہ پھول رہے ہیں اور پھبک رہے ہیں۔ یہ نونہال بھی اُسی کی مانند زندہ رہیں گے تاکہ کسی ویرانہ کو گلزار بنا جائیں"

سرسید کی وفات پر لوگوں نے صرف زبانی مدح و ثنا اور مرثیہ خوانی و نوحہ خوانی ہی پر بس نہیں کی بلکہ عملی طور پر اس بات کا کافی ثبوت دیا ہے کہ یہ شخص اپنی راست بازی و خلوص سے ایک عالم کے دل میں اپنی عظمت کا نقش بٹھا گیا ہے اور اپنی محبت کا بیج بو گیا ہے اور قومی ہمدردی کی چینٹک ایک ایسی مردہ دل قوم کو لگا گیا ہے جو سردمہری میں ضرب المثل اور نااتفاقی میں شہرۂ آفاق تھی۔ سرسید کے مرتے ہی کچھ لوگ اُنکی ایک عظیم الشان یادگار یعنی محمدن یونیورسٹی قائم کرنے کے لیے کھڑے ہو گئے جن کا اپیل مسلمانوں نے اور خاصکر پنجاب کے زندہ دل مسلمانوں نے

بڑی توجہ اور نہایت ذوق و شوق سے سنا اور اُسکی تائید پر فوراً کمربستہ ہوگئے۔ اہل پنجاب نے سخت تقاضوں سے اُن کو لاہور میں بلایا اور اثنائے راہ میں جابجا اُسی گرمجوشی کے ساتھ جیسی کہ سرسید کے استقبال میں ظاہر کیجاتی تھی۔ اُنکی آؤ بھگت اور مدارات کی گئی۔ یونیورسٹی کے لیے مالیر کوٹلہ اور لاہور میں بڑی اُمنگ اور چاؤ سے لوگوں نے چندہ دیا اور صرف صوبۂ پنجاب سے دو لاکھ روپیہ جمع کرنیکا وعدہ کیا گیا۔ لاہور کے جلسوں میں سرسید کی تصویریں جنکی آنہ دو آنہ سے زیادہ قیمت نہ تھی پانچ پانچ روپیہ کو لوگوں نے خریدیں۔ بعض جوانمرد تاجروں نے اپنے منافع کا ایک معتدبہ حصہ سرسید کی یادگار کے لیے مخصوص کردیا۔ اکثر تھوڑی تھوڑی تنخواہ کے ملازموں نے اپنی اپنی ایک ایک پوری تنخواہ چندہ میں دیدی کالجوں اور اسکولوں کے طلبہ نے بڑے شوق سے چندہ جمع کیا۔ طالبعلموں کی ایک جماعت نے خاص اسی کام کے لیے دکان لگائی تاکہ جو کچھ اس سے فائدہ ہو اس فنڈ میں جمع کیا جائے۔ پنجاب کے سوا اور اطراف میں بھی اُسکی تحریک شروع ہوگئی ہی یہانتک کہ انگلستان میں جو مسلمان طلبہ کی ایک مختصر جماعت نے انجمن اسلامیہ قائم کر رکھی ہی اُس میں بھی گرمجوشی سے چندہ کی تحریک ہوئی اور پہلے ہی جلسہ میں حاضرین نے بیس پونڈ دینے کا وعدہ کیا اور آیندہ چندہ کے لیے کوشش کرنیکا ارادہ ظاہر کیا۔ اضلاع شمال مغرب کے بعض مقامات میں بھی معقول چندہ کیا گیا ہی اور دکن میں بھی اُسکے لیے تحریک ہورہی ہی۔ چندہ کی تعداد صرف تین مہینے میں پچاس ہزار تک پہنچ گئی ہی جسکی ہرگز توقع نہ تھی۔ نواب محسن الملک جنہوں نے درحقیقت سرسید کا جوا اپنے کندھے پر رکھا ہی اُن کو مسلمان اُسی نگاہ سے دیکھتے ہیں جس نگاہ سے کہ سرسید کو دیکھتے تھے اور ہر شخص کی نظر میں اُن کی وقعت ویسی ہی ہی جیسی اُنکے اُس بڑے پیشرو کی تھی۔

یہ تمام علامتیں اس بات کی ہیں کہ مسلمان قومی خدمات کی قدر کرنے لگے ہیں اور قومی ہمدردی کی آگ جو سرسید کے سینہ میں مشتعل تھی اُسکو وہ اپنے ساتھ قبر میں نہیں لے گئے بلکہ اُسکی آنچ دور دور پہنچ گئی ہی اور اُس ایک چراغ سے بہت سے چراغ روشن ہوگئے ہیں۔ اکثر لوگ اُن انگریزوں کی ہمدردی پر تعجب کرتے ہیں جو سرسید کی یادگار کے چندہ میں بہت خوشی سے شریک ہوئے ہیں خصوصاً لارڈ سٹینلی کا انگلستان سے دو سو پونڈ بھیجنا اور مسٹر آرنلڈ کی تحریک سے لاہور میں اسی مقصد کے لیے ایک یوروپین کمیٹی کا قائم ہونا۔ بڑے بڑے افسروں کا اُس میں شریک ہونا اور معقول رقمیں چندہ میں دینا بڑے استعجاب کی نگاہ سے دیکھا گیا ہی مگر ہم کو اس سے کچھ بھی تعجب نہیں ہوا؛ ان لوگوں کا خمیر اس سرزمین کی خاک سے ہی جہاں بنی نوع کی بھلائی کے کاموں میں لوگ اُڑ کر شریک ہوتے ہیں، انسانی ہمدردی اُن کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہی، وہ اپنے قومی رفارمروں کی کوشش سے اعلیٰ مدارج ترقی پر پہنچے ہیں اور اسلیے ہر قوم کے رفارمر اور ہر ملک کے ہیرو کی دل سے عزت کرتے ہیں اور اُسکی یادگار قائم کرنے کو منجملہ فرائض انسانی کے سمجھتے ہیں؛ پس اُن لوگوں کا ہماری بھلائی کے کاموں میں شریک ہونا کچھ بھی تعجب کی بات نہیں ہی۔ ہاں اگر تعجب ہی تو ہم کو اپنی مردہ دل قوم کی حالت پر ہی جو اب سے تیس برس پہلے

ہمدردی، قومیت اور فارمیشن کے مفہوم تک سے واقف نہ تھے، جنھوں نے سلف کے ادھورے کاموں کو پورا کرنے کا کبھی سبق نہیں پڑھا تھا، جو اپنی ذاتی اغراض کے سوا کسی رفاہ عام کے کام میں روپیہ خرچ کرنا مطلق نہ جانتے تھے اور بغیر حکام کے رُعب و داب کے ایک پیسہ ہاتھ سے نہ چھوڑتے تھے، ایسی قوم میں اپنے ہیرو کی یادگار قائم کرنیکا جوش، یا اُسکے منصوبے پورے کرنیکا خیال، یا ایک قومی درسگاہ کو یونیورسٹی بنانیکا ارادہ کہاں سے پیدا ہوگیا؟ بیشک یہ بیج سرسید کے بابرکت ہاتھ کا بویا ہوا ہی جسکو اُنکی مساعی جمیلہ کا سب سے اعلیٰ اور افضل نتیجہ سمجھنا چاہیے کیونکہ اگر اُنکی کوششیں اُنہیں کی ذات پر ختم ہو جاتیں اور قوم میں یہ ولولہ پیدا نہ ہوتا تو اُنکی تمام عمر کی جانفشانی اور محنت گویا بالکل رائیگاں جاتی، اور اُس گھنگھور گھٹا کی طرح جو ایک ناقابل زراعت زمین میں خوب زور شور سے برس کر کھل جائے درحقیقت سرسید کی کوئی پائدار اور زندہ نشانی دنیا میں باقی نہ رہتی مگر خدا کا شکر ہی کہ اُس نے قوم میں اپنی زندہ یادگار چھوڑی ہی اور قوم کے بہت سے افراد میں وہ اپنا درد مرض متعدی کی طرح پھیلا گیا ہی۔

فتیً عِیشَ فی مَعرُوفِہٖ بَعدَ مَوتِہٖ کَمَا کَانَ بَعدَ السَّیلِ مَجرَاہُ مَرتَعاً

یعنی وہ ایک جوانمرد تھا جو خود مرگیا مگر اُس کا فیض زندہ ہی جیسے رَو کی گذرگاہ۔ جب رَو کا پانی نکل جاتا ہی۔ تو مویشی کے لیے ایک سرسبز چراگاہ بن جاتی ہی۔

مصر کے ایک تعلیم یافتہ مسلمان نے اپنے سفر یورپ کا حال عربی زبان میں لکھا ہی۔ وہ اہل یورپ کی ملکی اور قومی ہمدردی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہی کہ "اسی خصلت نے ان قوموں کو تمام دنیا کی قوموں سے بالاتر اور برتر کر دیا ہی یہ لوگ وطن اور قوم کی خدمت کرنیوالوں کی صرف اُن خدمات کو دیکھتے ہیں جو اُنھوں نے عام بھلائی کے لیے کی ہیں اور اُن کے عیبوں پر مطلق نظر نہیں کرتے"، اسکے بعد اُسنے اٹلی، فرانس، انگلینڈ اور روس کے چند وطن دوستوں کے نام لیے ہیں اور انکے بڑے بڑے اخلاقی عیوب جو تاریخ میں مذکور ہیں بیان کیے ہیں اسکے بعد وہ لکھتا ہی کہ "اُنکے ہموطن اُن عیبوں پر بالکل نظر نہیں کرتے بلکہ اُنکے احسانات کو جو اُنھوں نے قوم پر کیے ہیں یاد کر کے اُنکے نام پر سر جھکاتے ہیں، اُنکے سٹیچو جو ملک میں قائم کیے گئے ہیں اُنکی زیارت کے لیے اطراف و جوانب سے آتے ہیں اور اُنکی تعظیم کے لیے سروں سے ٹوپیاں اور تاج اُتار لیتے ہیں"

اگرچہ ہماری قوم میں ابھی تک یہ شریف خصلت کمیاب ہی لیکن سرسید کی وفات کے بعد جو غیر معمولی جوش ہمدردی لوگوں نے ظاہر کیا ہی اور جس گرمجوشی کے ساتھ سرسید کی یادگار قائم کرنے کا ولولہ قوم میں اُٹھا ہے اور جس توجہ اور خوشی سے اُسکے محرکوں کا اپیل سنا گیا ہی اُس سے معلوم ہوتا ہی کہ یہ خصلت قوم میں رفتہ رفتہ ترقی کرتی جاتی ہی لوگ اپنی قومی ضرورتوں سے واقف ہوتے جاتے ہیں اور جو اُن ضرورتوں کے رفع کرنے پر کمر باندھتے ہیں اُنکی عظمت دلوں میں بیٹھتی جاتی ہی۔ یہی قوموں کی زندہ دلی کی علامت ہی اور یہی وہ صفت ہے کہ جس قوم میں وہ معدوم ہو جاتی ہی وہ قوم جیتے جی مرجاتی ہی ؎

"مجھے یہ ڈر ہے دلِ زندہ تو نہ مرجائے　　　　کہ زندگانی عبارت ہی تیرے جینے سے"

مذکورۂ بالا تحریر کے بعد معلوم ہوا کہ ۲۳ - جولائی ۱۸۹۸ء کو نواب لفٹننٹ گورنر بہادر اضلاع شمال مغرب محض سرسید میموریل فنڈ کمیٹی کی تائید کے لیے علیگڑھ میں تشریف لائے اور ایک عام جلسہ میں جسمیں علیگڑھ اور اُسکے گرد و نواح کے رئیس شریک تھے۔ کمیٹی کے ایڈریس کا جواب دیتے وقت حضور لارڈ ایلگن ویسرائے کشورِ ہند کی چھٹی - جو اس موقع پر اُنکے نام موصول ہوئی تھی - حاضرین کو پڑھکر سُنائی جس میں حضور ممدوح نے محمدن اینگلو اورینٹل کالج پر نہایت مربیانہ توجہ، اور کمیٹی کی اُن کوششوں پر - جو وہ کالج کی ترقی میں کر رہی ہے - کمال خوشنودی ظاہر فرمائی تھی اور مسلمانوں کو اور نیز غیر قوموں کو جو تعلیم سے دلچسپی رکھتے ہیں اس تحریک کی اعانت پر توجہ دلائی تھی اور لکھا تھا کہ "میں ہمیشہ اپنے تئیں اس وجہ سے خوش نصیب سمجھونگا کہ سال گزشتہ میں مجکو علیگڑھ جانیکا موقع مل گیا اور سرسید سے ملاقات کرنے اور اور اُس دارالعلوم کے دیکھنے کا جو سرسید کو نہایت عزیز تھا - ایسی حالت میں کہ اُن کی ذات کا حوصلہ بخش سایۂ سر پر چھایا ہوا تھا - امتیاز حاصل ہوا" اسکے بعد لکھا تھا کہ "اُن کی یادگاری میری اس خواہش کو قوی کرتی ہے کہ میں بھی اپنے تئیں اُس کالج کے دوستوں کے زمرہ میں شامل کروں، اور اس لیے میں چاہتا ہوں کہ جو فنڈ اب جمع ہو رہا ہے اُس میں دو ہزار کا چندہ شامل کرکے اپنی ہمدردی کا عملی اظہار کروں - امید ہے کہ آپ ازراہ مہربانی میری اس خواہش سے کمیٹی کو مطلع کر دینگے"

اسکے بعد ہز آنر کی موجودگی میں حاضرین کے سامنے چندہ کی فہرست پیش کی گئی اور اُسی جلسہ میں تقریباً پچیس ہزار کا چندہ - جسمیں حضور ویسرائے اور نواب لفٹننٹ گورنر کا چندہ بھی شامل ہے - لکھا گیا۔

کسی بزرگ کا قول ہے کہ "اچھے دوست کی مثال ایسی ہے جیسے ایک گنجان میوہ دار درخت کہ جب تک سرسبز ہے اُسکے سایہ میں راحت ملتی ہے اور اُسکے پھل سے لذت حاصل ہوتی ہے اور جب خشک ہو گیا تو اپنی لکڑی سے طرح طرح کے فائدے پہنچاتا ہے" یہی مثال ہمارے ہیرو سرسید کی تھی - وہ بھی مسلمانوں کا ایسا ہی دوست تھا کہ جب تک زندہ رہا اپنے ہاتھ پاؤں زبان قلم جان اور مال سے اُنکی مدد کرتا رہا اور جب مرگیا تو اپنی محبت اور اپنے کام کی عظمت کا نقش لوگوں کے دلوں میں یادگار چھوڑ گیا تاکہ اُنکی بھلائی کا کام جو اُس نے ادھورا چھوڑا ہے اُس کو سب مل کر پورا کریں حق یہ ہے کہ ایسے ہی لوگوں کی شان میں کہا گیا ہے۔

جَمَالُ ذِی الْاَرْضِ کَانُوْا فِی الْحَیٰوۃِ وَھُمْ　　　　بَعْدَ الْمَمَاتِ جَمَالُ الْکُتُبِ وَالسِّیَرٖ

حصّہ اوّل ختم ہوا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً و مصلیاً

دوسرا حصّہ

سرسید کی لائف، اُن کی تصنیفات اور اُن کے کاموں پر ریویو

سرسید کی ترقی کے اسباب

ہمارے ملک میں ترقی کا لفظ زیادہ تر عہدہ یا منصب کی ترقی پر اطلاق کیا جاتا ہے مگر اس موقع پر نہ ایسی ترقی سے ہماری غرض متعلق ہے اور نہ ہمارے نزدیک سرسید نے عہدہ یا منصب کے لحاظ سے ترقی کا کوئی ایسا درجہ حاصل کیا تھا جو اُنکی اعلیٰ لیاقتوں کے مقابلہ میں کچھ وزن رکھتا ہو۔ میرے ایک دوست سے ایک لائق انگلش مین نے سرسید کا ذکر کرتے وقت کہا کہ اگر یہ شخص یورپ میں پیدا ہوتا تو کسی بڑی امپائر میں وزیر اعظم کے درجہ تک پہنچتا۔ کرنل گریہم نے سرسید کی لائف میں اُن کو باعتبار پولٹکل لیاقت کے سر سالار جنگ اول سے دوسرے درجہ پر رکھا ہے۔ مگر اخبار پراؤایر مطبوعہ ۱۲ فروری ۱۸۸۶ء میں اس پر یہ ریمارک کیا گیا تھا کہ "سید احمد خاں کو سر سالار جنگ سے دوسرے درجہ پر رکھنے میں ایک ممتاز ہندوستانی جنٹلمین کی قدر و قابلیت کا غلط اندازہ کیا گیا ہے۔ جسکی تمام زندگی شمالی ہندوستان کے واسطے برکت و رحمت رہی ہے"

بہرحال یہاں سرسید کی جس ترقی کے اسباب بیان کرنے مقصود ہیں وہ عہدہ اور منصب کی ترقی نہیں بلکہ وہ ترقی ہے جو بعض اوقات کسی شخص کو نہ عہدہ اور منصب کے لحاظ سے اور نہ مال و

دولت کے اعتبار سے بلکہ اعلیٰ اور اشرف خصائل انسانی کے لحاظ سے نہ صرف اپنے خاندان میں بلکہ تمام قوم اور ملک میں ممتاز کر دیتی ہے۔

سرسید کی زندگی کے واقعات جو پہلے حصہ میں بیان ہو چکے ہیں اگر اُن کو محض سرسری طور پر دیکھا جائے تو بھی اُن سے اس قدر ضرور ثابت ہوگا کہ ایک مسلمان جو قومی تنزل کے زمانہ میں پیدا ہوا جس نے ایک مردہ دار الخلافہ کی پژمردہ سوسائٹی میں ہوش سنبھالا اور ہندوستان کی کمزور آب و ہوا میں نشو و نما پائی۔ اُس نے اپنی عمر کا بہت بڑا حصہ نہایت جانکاہ محنت، دلی شوق اور بے نظیر استقلال کے ساتھ گورنمنٹ کی خیراندیشی، ملک کی خیر خواہی، قوم کی خدمت اور مذہب کی حمایت میں بسر کر دی۔ پس اس مقام پر ضرور یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کس چیز نے یہ غیر معمولی تحریک اُس کے دل میں پیدا کی؟ اور کیونکر وہ اس قدر طول طویل زمانہ تک ایسے استقلال کے ساتھ اپنے ارادوں پر قائم رہا؟ اگرچہ اس سوال کے جواب میں صرف یہ کلام معجز نظام پیش کرنا کافی ہے کہ "کلٌّ مُیَسَّرٌ لِمَا خُلِقَ لَهٗ" (یعنی ہر شخص کو اُس کام میں جس کے لیے وہ پیدا کیا گیا ہے آسانی دی گئی ہے)، لیکن چونکہ سرسید کی بائیوگرفی کو ہم آیندہ نسلوں کے لئے ایک مثال قابل تقلید سمجھتے ہیں اس لئے اُن کی ترقی کے اسباب کی تفتیش کرنا غالباً فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔

سرسید کی لائف میں، جیسا کہ اُن کے ابتدائی حالات پر نظر کرنے سے ظاہر ہوتا ہے بہت سی ایسی خصوصیتیں پائی جاتی ہیں جن پر ان کی ترقیات کی بنیاد قائم کی جا سکتی ہے قطع نظر ان جسمانی اور اخلاقی قابلیتوں کے جن کے بخشنے میں قدرت نے بہت بڑی فیاضی کی تھی اور جن کے بغیر کوئی شخص بڑا آدمی نہیں ہو سکتا۔ اتفاقات حسنہ نے بھی اُن کے ساتھ کچھ کم مساعدت نہیں کی۔ وہ ایک ایسے خاندان میں پیدا ہوئے جس میں قدیم خاندان کی نیکیاں اور نئے خاندان کی اولوالعزمی اور ہمت مجتمع تھی۔ اُن کی ددھیال سلطنت کے ایک قدیم متوسل گھرانے کی یادگار تھی اور ان کی ننھیال ایک ایسے خاندان سے علاقہ رکھتی تھی جس نے اپنی ذاتی لیاقت حسن تدبیر اور علم و فضل سے اپنے اقران و امثال میں امتیاز حاصل کیا تھا اور اپنے تئیں زمانہ کے سانچے میں ڈھالا تھا۔ وہ خوش قسمتی سے بچپن میں زیادہ تر اپنی ننھیال ہی میں رہے اور وہیں تعلیم و تربیت پائی۔ اُنھوں نے اپنے نانا کا عہد اپنی آنکھ سے دیکھا اور اپنے لائق ماموؤں کی صحبت برتی۔ اُن کی ماں ایک نیک نہاد، سنجیدہ اور دانشمند بی بی تھیں جن کی تعلیم و تادیب سرسید جیسے جوہر قابل کے لئے

اکسیر کا حکم رکھتی تھی۔ انھوں نے حُسن اتفاق سے ایسی حالت میں نشو و نما پائی کہ نہ اُن کی حد سے زیادہ روک ٹوک ہوئی اور اُن کو بالکل مطلق العنان چھوڑا گیا۔ وہ پڑھتے لکھتے بھی تھے اور ہر قسم کے کھیل بھی کھیلتے تھے مگر اپنے رشتہ داروں کے سوا غیر جنس کے لڑکوں سے کبھی نہ ملنے پاتے تھے۔ نہ ان پر تعلیم کا ایسا بوجھ ڈالا گیا تھا کہ قوائے جسمانی مضمحل ہو جائیں اور نہ اُن کی ڈور ایسی ڈھیلی چھوڑی گئی تھی کہ جدھر مونہ اٹھا گیا چل نکلے اُن کے والد ایک آزاد منش اور تعلقات دنیوی سے الگ تھلگ رہنے والے آدمی تھے۔ گھر کے انتظام اور اولاد کی پرورش اور تربیت کا مدار زیادہ تر بلکہ بالکل سرسید کی والدہ پر تھا جو باوجود طنطنہ اور رعب وداب کے نہایت متحمل اور بردبار تھیں پس وہ بے جا تشدد اور سختی۔ جو اولاد کی تعلیم و تربیت کے زمانہ میں اکثر والدین سے ظہور میں آتی ہے۔ اور جس سے رفتہ رفتہ اولاد کے دل میں خود اپنی حقارت اور ذلت بیٹھ جاتی ہے۔ سرسید پر کبھی نہیں گذری۔

جوانی کے آغاز میں سرسید کو بچپن کی نسبت کسی قدر زیادہ آزادی حاصل ہوئی وہ اکثر رنگین جلسوں میں شریک ہونے لگے اور شہر کے نوجوان امیرزادوں سے ملنے جلنے لگے سوسائٹی کا پرچھاواں اُن پر بھی پڑا اور پڑنا چاہیئے تھا۔ مگر ہونہار نوجوانوں کی لغزشیں بھی اُن کی اصلاح کا باعث ہوتی ہیں۔ وہ ایک ٹھوکر کھا کر ایسے چوکنا ہو جاتے ہیں کہ پھر کبھی عمر بھر ٹھوکر نہیں کھاتے۔ بھائی کی عبرت انگیز موت سے دل پر ایسی افسردگی چھائی کہ ہمیشہ کے لئے لہو و لعب سے دست بردار ہونا پڑا۔ مگر چونکہ طبیعت میں آتشگیر مادہ بھرا ہوا تھا وہ آخرکار مشتعل ہوئے بغیر نہ رہا۔ وہی سودا جو عنفوان شباب میں ہوا و ہوس کی شکل میں ظاہر ہوا تھا بیس برس بعد حُبِ قومی کے لباس میں جلوہ گر ہوا اور میر کا یہ شعر سرسید کے حال پر منطبق ہو گیا ؎

دل عشق کا ہمیشہ حریف نبرد تھا — اب جس جگہ کہ داغ ہے یاں آگے درد تھا

جس حد تک سرسید کی تعلیم ہوئی اُس کو بھی اُن کی ترقی کا ممد سمجھا جاتا ہے۔ انھوں نے جیسا کہ پہلے حصّہ میں بیان ہو چکا ہے قدیم یا جدید کسی طریقہ میں پوری تعلیم نہیں پائی۔ اگر وہ پرانے طریقہ کی تعلیم پوری کر لیتے اور علوم قدیمہ کا رنگ ان پر چڑھ جاتا پھر ممکن نہ تھا کہ کسی دوسرے رنگ کے قبول کرنے کی قابلیت اُن میں باقی رہتی۔ وہ تقلید کی بندشوں میں

جکڑبند ہو جاتے اور تعصب کے توبرتو پردے اُن کی آنکھوں پر پڑ جاتے۔ نئے طریقہ کی تعلیم بھی اُن نتائج تک پہنچانے والی نہ تھی جو سرسید سے ظہور میں آئے۔ یوروپ کی اعلیٰ درجہ کی سویلزیشن اور حیرت انگیز ترقیات جو ایک ہندوستانی طالب علم کے دل پر تعلیم کے ساتھ ساتھ نقش ہوتی جاتی ہیں۔ وہ آخر کار اُس کو اپنے ملک کی ترقی سے مایوس کر دیتی ہیں؛ یہاں تک کہ وہ اُن کوششوں کو جو ہندوستانیوں کی ترقی اور اصلاح کے لئے کی جاتی ہیں محض بےسود اور لاحاصل جاننے لگتا ہے۔ پس کہا جا سکتا ہے کہ سرسید کا پرانی تعلیم میں ادھورا رہنا اور نئی تعلیم سے آشنا نہ ہونا منجملہ اُن اتفاقاتِ حسنہ کے تھا جنھوں نے قوم کی اصلاح کے عظیم الشان کام پر ہاتھ ڈالنے سے اُن کو جھجکنے نہیں دیا۔

اگرچہ یہ تمام باتیں جو اوپر بیان کی گئیں بلاشبہ ایسی ہیں جن کو سرسید کی ترقی میں بہت کچھ دخل معلوم ہوتا ہے۔ مگر اُن میں سے ایک بات بھی ایسی نہیں جس کو اُن کی ترقی کے اصلی اسباب میں شمار کیا جائے؛ کیونکہ یہی باتیں اکثر اوقات ترقی کی سدِ راہ دیکھی گئی ہیں۔ اس کے سوا ایک ایسے ملک میں جیسا کہ ہندوستان ہے اور خاص کر ہماری مردہ قوم میں جس قسم کے حیرت انگیز اور عظیم الشان کام سرسید سے ظہور میں آئے ہیں اور جیسی جلیل القدر خدمتوں میں انھوں نے اپنی زندگی کا ایک معتدبہ حصہ نہایت استقلال کے ساتھ بسر کیا ہے اُن کو محض اتفاقیہ امور کی طرف منسوب نہیں کیا جا سکتا۔

بعض اوقات خیال کیا جاتا ہے کہ سرسید کا اپنی بی بی کے انتقال کے بعد دوسری شادی نہ کرنا اور چالیس برس تجرد اور بےتعلقی کی حالت میں رہنا ہی اُن کے تمام بڑے بڑے کاموں کی بنیاد تھی؛ اگر وہ دوسرا نکاح کر لیتے تو ہرگز اُن کو ان کاموں کے سرانجام کرنے کا موقع نہ ملتا۔ مگر اس تقدیر پر یہ سوال باقی رہتا ہے کہ وہ کیا چیز تھی جس نے ایک چالیس بیالیس برس کے توانا تندرست ذی استطاعت اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مسلمان شخص کو نکاح ثانی سے باز رکھا اور تجرد کی ناگوار اور تلخ زندگی پر قانع کر دیا؟

البتہ ایک اور بات لحاظ کے قابل ہے جو سرسید کی لائف پر غور کرتے وقت لوگوں کے ذہن میں ضرور پیدا ہوتی ہوگی۔ یعنی یہ کہ جب سے انگریزی تعلیم ہندوستان میں پھیلی ہے اور یوروپ کے اُن نامور لوگوں کے حالات سے جنھوں نے ملک اور قوم پر اپنی جانیں قربان کی ہیں ہندوستان کے لوگ واقف ہوئے ہیں اُس وقت سے ہندوستان میں بھی

کم و بیش قومیت اور قومی ہمدردی کا خیال لوگوں کے دل میں پیدا ہوتا جاتا ہے۔ پس یہ بات بالکل قرین قیاس ہے کہ سرسید نے بھی جو کچھ ملک یا قوم یا مذہب کی خدمت میں کیا وہ انہیں یورپ کے رفارمروں اور وطن دوستوں کے حالات سن کر ان کی ریس سے کیا ہو۔ اگرچہ یہ خیال ایک خاص حد تک صحیح معلوم ہوتا ہے مگر اسی کے ساتھ اس بات پر بھی غور کرنا ضرور ہے کہ جس وقت سرسید کو ملک اور قوم کی خدمت یا مذہب کی حمایت کا خیال پیدا ہوا اُس وقت تک انگریزی تعلیم ہندوستان میں نہایت محدود تھی اور مسلمانوں میں بالکل نہ تھی دوسرے یہ بات صرف اسی قدر مانی جاسکتی ہے کہ یوروپ کی تاریخ سے سرسید کے دل میں بھی حبِ وطن اور قومیت کا خیال ایسا ہی پیدا ہوگیا ہو جیسا کہ ہندوستانی تعلیم یافتہ نوجوانوں کے دل میں ایک دودھ کا سا اُبال پیدا ہوجاتا ہے مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ خیال ایسا پک جائے کہ ایک ہندوستان کا مسلمان قوم کی دُھن میں اپنے تئیں فنا کردے۔ جس طرح حالت موجودہ میں یہ ممکن نہیں کہ یوروپ کے موجدوں اور مخترعوں کے حالات سُن سُن کر ہندوستان میں بھی ویسے ہی موجد اور مخترع پیدا ہونے لگیں اسی طرح یہ بھی امکان سے خارج ہے کہ یوروپ کے رفارمروں اور وطن دوستوں کے حالات کتابوں میں پڑھ کر یا زبانی سن کر ہندوستان میں بھی ویسی ہی ملک کے جان نثار اور قوم کے مصلح پیدا ہوجائیں۔

اصل یہ ہے کہ ایشائی طرزِ حکومت جو ایک طاقت کو اعتدال سے زیادہ بڑھانے والی اور اس کے سوا تمام طاقتوں کو مضمحل کرنے والی ہے اور جو ہندوستان میں بھی تمام ایشائی ملکوں کی طرح آفرینش سے ایک عنوان پر چلی آتی تھی اُس نے ایشیا کی کسی قوم بلکہ کسی متنفس میں قومیت کی روح باقی نہیں چھوڑی۔ ایک بڑے حکیم کا قول ہے کہ شخصی حکومت میں صرف ایک شخص (یعنی بادشاہ) ملک کا خیر خواہ ہوسکتا ہے اور بس۔ جان سٹوارٹ مل لکھتے ہیں کہ "اگر رعیت کو ایسا بنا دو کہ وہ ملک کے لئے کچھ نہ کرسکے تو اُس کو ملک کی کچھ پروا نہ رہیگی"۔
اگرچہ ہندوستان میں سو برس سے طرزِ حکومت بدل گئی ہے جس کا مقتضا یہ ہونا چاہئے کہ لوگوں میں ملک اور قوم کی بھلائی کا خیال اور جوش پیدا ہو، مگر جو سکون اور انجماد ہندوستان کی قوموں میں صدہا پشت سے متوارث چلا آتا ہے اور جو اُن کے آب و گل میں خمیر ہوگیا ہے اُس کو برٹش طرزِ حکومت جیسی کہ وہ ہندوستان میں ہے ایک صدی میں زائل نہیں کرسکتی یہی وجہ ہے کہ یوروپ کی نظریں سُن سُن کر جو اکثر ہندوستانیوں کے دل میں بعض اوقات

ملک اور قوم کی بھلائی کا جوش دفعتاً اٹھتا ہے کچھ زیادہ دن نہیں گذرتے کہ وہ آوے کی طرح بیٹھ جاتا ہے۔

البتہ مذہب ایک ایسی چیز ہے جو ہر ملک میں اور خاص کر ایشیائی ملکوں میں مذہبی آدمیوں کو نہایت استقلال کے ساتھ تمام عمر اپنے ارادوں پر ثابت قدم رہ سکتا ہے۔ یہ مذہب ہی میں طاقت ہے کہ انسان نہایت ہی سخت ریاضتوں میں اپنی زندگی بسر کر دیتا ہے، تمام لذات کو اپنے اوپر حرام کر دیتا ہے، آگ میں تپتا ہے، برف میں گلتا ہے، گھر بار لٹا دیتا ہے اور ہر نا قابل برداشت تکلیف اٹھاتا ہے۔ مگر بھی کیسا ہی سچا اور خدا کا بھیجا ہوا ہو طرز حکومت کا تابع ہوتا ہے اس میں جتنی باتیں طرز حکومت کے مقتضا کے موافق ہوتی ہیں وہ رواج پاتی ہیں اور باقی حصہ نا قابل عمل سمجھ کر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ مثلاً خود مختار سلطنت جس میں کوئی بات شخصیت سے خالی نہیں ہوتی۔ اس میں مذہب بھی ذاتی اور شخصی بھلائیوں کے سوا اور کچھ نہیں سکھاتا۔ وہ صرف ایسی نیکیاں سکھاتا ہے جن نفع یا تو نیکی کرنیوالے کی ذات پر ختم ہو جاتا ہے یا صرف خاص خاص شخصوں کو پہنچتا ہے۔ وہ کبھی ایسی نیکیوں کی ترغیب نہیں دیتا جن سے بلا واسطہ تمام ملک یا تمام بنی نوع کو فائدہ پہنچے۔ مذہب کی یہ حالت ایسی پائدار اور مستحکم ہو جاتی ہے کہ خود مختار سلطنت کا دورہ ختم ہو جانے کے بعد بھی صدیوں تک وہ اسی حالت پر قائم رہتا ہے۔ پچھلے جس شاہراہ پر اگلوں کو چلتا دیکھتے ہیں آپ بھی آنکھیں بند کر کے اسی شاہراہ پر ہو لیتے ہیں۔ دائیں بائیں آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتے۔ مگر بعض اوقات زمانہ کی ضرورتیں خود مذہبی فرقہ میں کوئی ایسا شخص پیدا کر دیتی ہیں جس کو مذہب کی چھان بین کرنا پڑتی ہے اور مذہب کا وہ متروک حصہ جو موجودہ زمانہ کے موافق ہوتا ہے اس پر عمل کرنا اور اس کو رواج دینا پڑتا ہے۔ زمانہ کی ضرورتیں اس کی آنکھیں کھولتی ہیں اور بانی مذہب کی محبت اور عقیدت اس کو مذہب کی حقیقت کھولنے پر مجبور کرتی ہے، اور خود مذہب اس میں استقلال پیدا کرتا ہے۔ جس کی بدولت وہ قوم کی شاہراہ کے خلاف اپنی کٹھن منزل طے کرتا ہے۔ یہیں سے اس چیز کا سراغ چلتا ہے جس نے سرسید سے تمام ملکی اور قومی خدمتیں سرانجام کرائی ہیں۔ ہمارے نزدیک جہاں تک کہ ان کی لائف شہادت دیتی ہے اور جس قدر کہ ان کے حالات۔ افعال۔ اور اقوال سے ظاہر ہوتا ہے ان کی تمام ترقیات کا منبع۔ ان کے کل مقاصد عالیہ کا محرک

اور اُن کی ہر منزل کا رہبر مذہب کے سوا اور کوئی چیز قرار نہیں پا سکتی۔

اسلام کی حقیقت کا یقین اور بانی اسلام کی محبت اور عقیدت گویا سرسید کی گھٹی میں پڑی تھی۔ اور دار الخلافۃ کا اخیر دَور تھا اور مسلمانوں کی آخرت کی امیدوں کے سوا جن کا اسلام وعدہ کرتا تھا کوئی امید دنیا میں باقی نہ رہی تھی اس لئے وہ مذہب کو زیادہ مضبوط پکڑتے جاتے تھے۔ خصوصاً شریف اور ممتاز خاندانوں میں مذہبی فرائض کی پابندی اور مذہبی باتوں کا چرچا بہت زیادہ تھا۔ شاہ غلام علی صاحب کی خانقاہ۔ جو اُس زمانہ میں دیندار مسلمانوں کا ملجا و ماویٰ تھی۔ اُسکے ساتھ سرسید کو ایک خاص تعلق تھا۔ اُن کے والدین خانقاہ کے مشائخ سے کمال ارادت و عقیدت رکھتے تھے؛ اور اس لئے سرسید بچپن ہی سے اپنے والد کے ساتھ خانقاہ میں جانے لگے تھے اور ایک مدت دراز تک اُنھوں نے وہاں کا رنگ صحبت اپنی آنکھ سے دیکھا تھا۔ اُن کی والدہ کے سوا اُن کے تمام ننھیال والے جہاں اُنھوں نے نشو و نما پائی شاہ عبدالعزیز صاحب کے خاندان کے معتقد تھے۔ پس سرسید نے آنکھ کھول کر اپنے سارے گھر میں مذہب ہی کا دور دورہ دیکھا تھا، گویا مذہب ہی کی آغوش میں اُنھوں نے پرورش پائی تھی اور مذہب کی گود میں ہوش سنبھالا تھا۔ علوم جدیدہ جس عمر میں مذہب سے دل اُچاٹ کر سکتے ہیں۔ اس عمر میں سرسید پر اُن کی پرچھائیں تک نہیں پڑی تھی بلکہ زیادہ تر اُن کی لَے اُس وقت کھلنی شروع ہوئی جب مذہب کی جڑ پتال تک پہنچ چکی تھی۔ اور جب کہ سائنس کو بجائے اس کے کہ مذہب کے ساتھ جنگ کرے اُس سے صلح کرنی ضرور تھی۔

چونکہ سرسید کا تمام خاندان دو ایسے خانوادوں سے عقیدت رکھتا تھا جو نہ صرف دلی بلکہ تمام ہندوستان کے مسلمانوں میں جامع شریعت و طریقت سمجھے جاتے تھے اسلئے اُنکا گھر بہت سی ایسی جاہلانہ رسموں اور بیہودہ اوہام اور لغو عقائد سے پاک تھا جن میں اکثر جاہل مسلمانوں کے خاندان گرفتار ہوتے ہیں۔ چنانچہ سرسید کہتے تھے کہ "اس زمانہ میں بھی جب کہ میرے مذہبی خیالات محققانہ اصول پر مبنی ہیں۔ میں اپنی والدہ کے عقائد میں ایک آدھ بات کے سوا کوئی عقیدہ اپنے اصول کے خلاف نہیں پاتا"۔ یہی عقائد ابتدا سے سرسید کے دل میں ڈالے گئے تھے اور اسلام کی یہی صورت اُنھوں نے آنکھ کھول کر دیکھی تھی۔ گویا ہوش سنبھالتے ہی اُنھوں نے اپنا قدم تحقیق کی پہلی سیڑھی پر پایا تھا۔ پھر مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کی تصنیفات نے اُن کے خیالات کی اور زیادہ اصلاح کی اور اُن کو کسی قدر تقلید کی بندشوں

سے آزاد کیا۔ مگر جب تک قدیم سوسائٹی کا رنگ اُن پر غالب رہا مذہبی خیالات میں کوئی بڑا انقلاب واقع نہیں ہوا؛ وہ انھیں سنت و بدعت و تقلید و عدم تقلید کے جھگڑوں میں اُلجھے رہے۔ اور اسلام کے اشرف و اعلیٰ مقاصد کو صرف اُنھیں شخصی کاموں میں منحصر جانتے رہے جن کا نفع یا تو خود کام کرنے والے کی ذات کو اور یا خاص خاص شخصوں کو پہنچتا ہے۔ مگر آخرکار زمانہ کی ضرورتوں نے ان کی آنکھیں کھولیں اور خود اس یقین نے جو اسلام کی حقیت کی نسبت اُن کی گھٹی میں پڑا تھا۔ اُن کو اسلام کی حقیقت اور اُس کے اصلی مقاصد تک پہنچا دیا۔ جو باتیں دین حق کی پاکیزگی اور تقدس کے خلاف معلوم ہوئیں اُن کو چھوڑا اور جو اس کے مطابق پائیں اُن کو پکڑا اور زید و عمرو کی مخالفت کا خوف یکقلم دل سے اُٹھا دیا ہرایک معاملہ میں خود مذہب کو نہ کہ زید و عمرو کو اپنا رہبر بنایا۔ جو سوال پیش آیا اُس کو بلا واسطہ مذہب ہی سے پوچھا اور جو کچھ وہاں سے جواب ملا اُس کو سر پر رکھا۔ لوگ انگریزی نوکری پر اعتراض کرتے تھے مگر مذہب نے اجازت دی اس لئے انگریزی نوکری بے تامل اختیار کرلی۔ مذہب ہی سے یہ سوال کیا کہ غیر قوم اور غیر مذہب گورنمنٹ کی نوکری محض دفع الوقتی و ایام گذاری کے طور پر کرنی چاہیے؟ یا نہ دل سے اُس کے فرائض ادا کرنے چاہئیں۔ مذہب نے جواب دیا کہ نوکری کا پورا معاوضہ لینا اور اُسکے فرائض دل سے ادا نہ کرنا خدا اور رسول کی مرضی کے خلاف ہے۔ اس لئے نوکری کے فرائض نہایت ایمانداری اور سچائی کے ساتھ سرانجام کئے۔ مذہب ہی سے پوچھا کہ غیر قوم کی حکومت میں رعیت کو اُس کی خیرخواہ اور وفادار رعایا بن کر رہنا ضرور ہے یا نہیں۔ مذہب نے جواب دیا کہ کوئی گناہ اس سے بڑھ کر نہیں کہ جس گورنمنٹ کے سایہ حمایت میں رعیت کو ہر طرح کا امن اور آزادی حاصل ہو اُس کی رعیت اپنی گورنمنٹ کی وفادار اور خیرخواہ نہ ہو؛ لہٰذا اپنی تمام زندگی گورنمنٹ کی وفاداری اور خیرخواہی میں صرف کر دی۔ مذہب ہی سے یہ پوچھا کہ غیر مذہب قوموں کے ساتھ صدق دل سے دوستی، میل جول اور کھانا پینا دین حق کی پاکیزگی اور تقدس کے موافق ہے یا نہیں۔ مذہب نے جواب دیا کہ موافق ہی نہیں بلکہ نہایت ضرور ہے؛ کیونکہ اسلام نفاق سے بدتر اور ذلیل تر کسی خصلت کو نہیں بتاتا اس لئے ہمیشہ انگریزوں اور تمام غیر مذہب قوموں کے ساتھ اُسی صداقت اور خلوص کے ساتھ میل جول رکھا جیسا کہ مسلمانوں کے ساتھ رکھنا چاہیے۔

واقعہ ۱۸۵۷ء نے جب ہندوستان کے مسلمانوں کو نہایت سخت صدمہ پہنچایا اور اُن کے پنپنے کی بالکل امید نہ رہی اس سے سرسید کے دل پر ایسی افسردگی اور مایوسی چھائی کہ اُن کا ارادہ ہندوستان کے تعلقات قطع کرکے کسی دوسرے ملک میں جاکر رہنے کا ہوگیا۔ اُس وقت بھی اُنھوں نے مذہب ہی سے یہ سوال کیا کہ قوم کی آگ میں کودنا بہتر ہے یا اپنی جان بچاکر اور کسی گوشہ میں بیٹھ کر خدا کی یاد کرنی بہتر ہے؟ مذہب نے جواب دیا کہ اسلام کا اصل اصول بلکہ خود اسلام محض قوم کی خیر خواہی اور ہمدردی ہے اور بس۔ مذہب نے اُن کو بتایا کہ بانیٔ اسلام جس کی اطاعت اور اتباع تمام امت پر فرض ہے اور جس کی نسبت قرآن ناطق ہے کہ "لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ" اُس نے دنیا میں آکر کیا کیا؟ اپنی تمام عمر ملک اور قوم کی خیر خواہی میں بسر کی، وہ گمراہ تھے ان کو ہدایت کی، وہ وحشی تھے اُن کو انسان بنایا، وہ ایک دوسرے کے دشمن تھے اُن میں اخوت اور دوستی کی بنیاد ڈالی۔ وہ آپس کی خانہ جنگیوں میں پھنسے ہوئے تھے اُن میں ملک گیری اور کشورکشائی کا مادہ پیدا کیا، اُن کا دین اور دنیا دونوں درست کئے، اُنکی خیرخواہی اور اصلاح میں سخت شدائد اور تکلیفیں اپنے نفس پر برداشت کیں، ملک کی محبت کو جزوِ ایمان قرار دیا اور کہا کہ "حُبُّ الْوَطَنِ مِنَ الْاِيْمَانِ" قوم کی محبت پر تمام امت کو مجبور کیا اور فرمایا "حُبُّ الْعَرَبِ مِنَ الْاِيْمَانِ" قوم کی سرداری کو قوم کی خدمت میں منحصر ٹھیرایا اور کہا کہ "سَيِّدُ الْقَوْمِ خَادِمُهُمْ" اخیر دم تک امت یعنی قوم ہی کا خیال رکھا اور اُمَّتِي اُمَّتِي کہتا دنیا سے رخصت ہوا۔

سرسید نے مذہب کی یہ ہدایت سن کر تمام ارادے فسخ کئے اور اس اصول کو مضبوط پکڑ لیا۔ اُنھوں نے دنیوی تعلقات کو جن کے بغیر قوم کی خیرخواہی اور قوم کو نفع پہنچانا غیر ممکن تھا قطع تعلق سے ہزار درجہ بہتر سمجھا اور اپنی تمام زندگی اور طاقت اور استطاعت اور اپنے تمام قوے کو نفس واپسیں تک قومی خدمت اور قومی خیرخواہی کے لئے وقف کردیا۔ اُنھوں نے مذہب ہی سے یہ پوچھا کہ قوم کی اصلی اور حقیقی خیرخواہی کس چیز میں ہے؟ مذہب نے جواب دیا کہ مسلمانوں کے اعزاز سے اسلام کو معزز کرنا اور دنیا کے ذریعہ سے دین کو تقویت دینی۔ مذہب ہی نے اُن کے دل میں ڈالا کہ مسلمان دنیوی عزت میں حد سے زیادہ گرے ہوئے ہیں اور گرتے چلے جاتے ہیں اور مسلمانوں کی ذلت بعینہٖ اسلام کی ذلت ہے اگر چند روز اُن کا یہی حال رہا تو ہندوستان میں اُن کا عدم اور وجود برابر ہوجائیگا

اور اسلام اس ملک سے رخصت ہو جائیگا۔ اس لئے انھوں نے قوم کو اول دنیا ہی کیطرف متوجہ کیا اور جو ذریعے اُنکی دنیوی ترقیات کے تھے اُن کیلئے مہیا کئے۔ سب سے زیادہ اُن کی ترقی کا مدار انگریزی تعلیم پر سمجھا اس لئے گو ایک زمانہ نے انگریزی تعلیم کی مخالفت اور مزاحمت کی۔ مگر اُنھوں نے اس کو قوم میں جاری کرکے چھوڑا۔ مذہبی اوہام اور غلط خیالات جو دنیوی ترقی کے مانع تھے اپنی پُرزور تحریروں سے اُن کی غلطی ثابت کی، سوشیل اور اخلاقی خوبیاں جو قوم میں شائع تھیں جن پر غیر قومیں ہنستی تھیں اور جو دنیوی عزت اور وقار کی منافی تھیں اُن کی اصلاح میں جہاں تک ممکن تھا کوشش کی، قوم کی طرف سے جو گورنمنٹ کو پولٹکل بدگمانیاں تھیں اُن کو رفع کیا، گورنمنٹ کی طرف سے جو قوم کے دل میں مغائرت، یا دہشت یا جھجک تھی اُس کو دور کیا، انگریز جو اسلام کو ایک نہایت مہیب اور خوفناک مذہب خیال کرتے تھے اور اس لئے مسلمانوں کی طرف سے مطمئن نہ تھے۔ اُن کو اسلام کی اصلی صورت دکھائی اور ثابت کیا کہ اگر دنیا میں کوئی مذہب عیسائیوں کا دوست، عیسائی مذہب کا حامی، بائیبل کی تصدیق کرنے والا اور اس کے اصول سے مطابقت رکھنے والا ہے تو وہ صرف اسلام ہے اور بس، ہندو مسلمانوں میں جہاں تک کہ ممکن تھا اتحاد و اتفاق پیدا کرنے میں کوشش کی۔ کیونکہ دونوں قوموں کی عزت اسی بات پر موقوف تھی اور موقوف ہے کہ آپس میں مل جل کر رہیں، جتنے مدرسے اور انسٹی ٹیوشن قائم کئے اُن میں دونوں قوموں کو شریک کیا اور اُن سے دونوں کے فوائد ملحوظ رکھے، ہمیشہ اپنی پبلک اسپیچوں میں دونوں قوموں کو اسی بات کی نصیحت کی کہ ہندوستان کی عزت اتفاق میں ہے، مسلمانوں کے مختلف فرقے جن میں مذہبی نزاع اور جھگڑوں نے پھوٹ ڈال رکھی ہے اور اس لئے وہ روز بروز ضعیف اور حقیر ہوتے جاتے ہیں۔ جہاں تک ممکن تھا ان میں اتفاق والتیام کی بنیاد ڈالی۔ مدرسۃ العلوم میں ہر مسلمان فرقہ کی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا اور ہر فرقہ کے طالبعلموں کو ایک مسجد میں نماز پڑھنے کی ہدایت کی، اپنے سنی دوستوں کو شیعوں کے خلاف کتابیں لکھنے سے روکا اور خود جو ابتدائے عمر میں اس قسم کی چھیڑ چھاڑ کی تھی اس سے ہمیشہ کیلئے اجتناب کیا، باوجودیکہ ان کو اپنا مقصد پورا کرنے کے لئے مذہب کے متعلق صدہا باتیں جمہور کے خلاف لکھنی پڑیں مگر بغیر سخت ضرورت کے کبھی کوئی نئی بات زبان سے نہیں نکالی کبھی جمہور اہل اسلام کے مقابل کوئی جدید فرقہ کھڑا کرنا اور آپ اُس کا سرگروہ بننا نہیں چاہا

کبھی مخالفین کے اعتراضات کا جواب پلٹ کر نہیں دیا۔ یہ سب کچھ اس لئے کیا کہ قوم میں اختلاف اور نزاع بڑھنے نہ پائے اور سیل کا بیل نہ بن جائے۔

جس وقت سرسید نے مسلمانوں میں انگریزی تعلیم جاری کرنے کا ارادہ کیا اُسوقت مذہب ہی نے اُن کو اس یقین پر قائم رکھا کہ جو صدمہ یوروپ میں عیسائی مذہب کو تعلیم سے پہنچا ہے وہ اسلام کو ہرگز نہیں پہنچ سکتا۔ اور جب کہ انگریزی تعلیم اُن میں جاری ہوگئی اور اُس کو روز بروز ترقی ہونے لگی اُس وقت بھی مذہب ہی نے اُن کو یہ سوجھایا کہ جب تک سائنس اور اصول اسلام میں تطبیق نہ کی جاوے تب تک اُن کورے اور سادہ لوح طالب علموں کی طرف سے اطمینان نہیں ہوسکتا جو مذہبی تعلیم سے بے بہرہ ہوتے ہیں اور اس لئے ان کے دل میں مذہب کی طرف سے سوءِ ظن پیدا ہوجانا بالکل قرین قیاس ہے۔ مذہب ہی نے اُن کو ڈرایا کہ اگر تعلیم سے اسلام کو کچھ صدمہ پہنچا تو اُس کا مظلمہ خاص کر اُس شخص پر ہوگا جس نے قوم میں تعلیم جاری کی۔ چنانچہ اس عظیم الشان کام کو بھی انھوں نے اپنے ذمہ لیا اور اپنی سمجھ اور علم اور عقل کے موافق قرآن کی تفسیر لکھنی شروع کی۔

یہاں تک جو کچھ ہم نے لکھا یہ محض بے سروپا قیاسات نہیں ہیں بلکہ خود سرسید نے اپنی تحریروں میں جا بجا اس مضمون کی طرف اشارہ کیا ہے خصوصاً وہ آرٹکل جو تہذیب الاخلاق مورخہ یکم ربیع الاول ۱۲۹۶ھ ہجری میں "ایک نادان خداپرست اور دانا دنیا دار" کے عنوان سے لکھا ہے اُس سے ہمارے مذکورہ بالا بیانات کی بخوبی تائید ہوتی ہے۔ اُس کے علاوہ ہم ہمیشہ اپنی آنکھ سے دیکھتے تھے کہ سرسید قومی خدمات اُسی سرگرمی اور ذوق و شوق کے ساتھ انجام دیتے تھے جیسے ایک مرتاض اور نفس کش زاہد عبادت الٰہی بجا لاتا ہے۔ نہ بیماری اور ضعیفی اُن کے ذوق و شوق کو کم کرتی تھی اور نہ گرمی یا سردی کی شدت یا اور کسی ہرج مرج سے اُن کی ہمت قاصر ہوتی تھی۔ چالیس برس برابر اُنھوں نے مخالفتیں جھیلیں اُن کے کفر کے بے شمار فتوے لکھے گئے، اُن کو دہری ملحد کافر اور دجال سب کچھ کہا گیا، اُن کو بارہا قتل کی دھمکیاں دی گئیں، صدہا گمنام خطوں میں مغلظ گالیاں لکھ کر بھیجی گئیں، اخباروں اور رسالوں میں جہاں تک ہوسکا اُن کی توہین کی گئی، مگر وہ اپنی دھن میں اُسی طرح لگے رہے اور اپنا کام اُسی ذوق و شوق کے ساتھ کئے گئے، بلکہ جس قدر مخالفت بڑھتی گئی اُسی قدر اُن کا جوش اور سرگرمی زیادہ

ہوئی تھی لوگ اُن کو بُرا کہہ کر اور گالیاں دے کر اس قدر خوش ہوتے ہوں گے جس قدر کہ وہ بُرا سُن کر اور گالیاں کھا کر خوش ہوتے رہے۔ اُن کی بہن کی انتقال کی خبر اُن کو اُس وقت پہنچی جب کہ وہ قومی کانفرنس کی کارروائی میں مصروف تھے۔ جب تک جلسہ اپنے معمولی وقت پر برخاست نہ ہوا وہ بہن کی تجہیز و تکفین میں شریک نہ ہوئے۔ جوان بیٹے کی موت سے اُن کو سخت صدمہ پہنچا، پندرہ بیس روز تک قلب کی حرکت سُست رہی اور یہ صدمہ آخر تک فراموش نہ ہوا۔ بایں ہمہ وہ اپنی قومی خدمات میں برابر مصروف رہے اور ایک رات اور ایک دن سے زیادہ جو کہ دلّی کی آمد و رفت میں صرف ہوا انھوں نے باوجود ایسے سخت صدمہ کے کوئی قومی کام ملتوی نہیں کیا اور ایسے مواقع کو تا بمقدور کبھی پاس نہیں آنے دیا جن سے بیٹے کا داغ تازہ ہو اور قومی جذبات میں ہرج واقع ہو۔ دلّی میں انھیں خیالات سے وہ جنازہ کے ساتھ نہ گئے اور دفن کرنے میں شریک نہیں ہوئے۔ لوگوں کو سخت تعجب ہوا اور بعضوں نے بڑے بڑے اعتراض کئے اور حق یہ ہے کہ اُن کے اعتراض بالکل بجا تھے کیونکہ "من جھل شیئاً عاداہ"

الغرض یہ سب باتیں شہادت دیتی ہیں کہ اُن کے تمام کاموں کی محرک کوئی ایسی روحانی اُمنگ تھی جس پر دنیا کے معمولی خلجان غالب نہیں آسکتے تھے اور جس قدر جسمانی اُمنگیں کم ہوتی جاتی تھیں وہ اُمنگ بڑھتی جاتی تھی۔

اس بحث کو جو ہم نے اس قدر طول دیا ہے اس سے شاید لوگوں کو یہ خیال ہو کہ ہم سرسید کے مخالفوں کو اُن کے مسلمان یا پابند مذہب ہونے کا یقین دلانا چاہتے ہیں مگر فی الواقع ہمارا یہ مقصد نہیں ہے کیونکہ جس مذہب کو سرسید مذہب سمجھتے تھے اور جس اسلام کو وہ اسلام جانتے تھے مخالفوں کے نزدیک نہ وہ مذہب مذہب تھا اور نہ وہ اسلام اسلام۔ بلکہ ہمارا مقصد اس طولانی بحث سے صرف اس بات کا ظاہر کرنا ہے کہ ایشیائی ممالک میں جہاں وطنیت اور قومیت کا خیال بالکل نہیں ہے جو شخص مذہب کا پابند نہ ہو وہ ہرگز ملک یا قوم کی بھلائی کا کوئی بڑا کام نہیں کر سکتا۔ پس ہماری قوم کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو جو قومی ہمدردی کا دم بھرتے ہیں۔ یاد رکھنا چاہئے کہ جب تک وہ اسلام پر ثابت قدم نہ ہوں گے ممکن نہیں کہ قوم کی بھلائی کا کوئی بڑا کام کر سکیں۔ یوروپ و امریکا میں اب تک جس قدر ترقیات اور اصلاحات ظہور میں آئی ہیں اُن کے بانی مبانی تقریباً

تمام وہی لوگ نکلیں گے جو مذہب کے سخت پابند تھے؛ لوتھر، کالون، بیکن، ملٹن، نیوٹن، کلیس، بنجمن فرنیکلن، جارج سٹیفن، واشنگٹن، ہمپڈن، سٹنی وغیرہ وغیرہ سب مذہب کے نہایت پابند تھے۔

اب ہم سرسید کی سرکاری، ملکی، قومی اور مذہبی خدمات کا ذکر جو پہلے حصہ میں بالاجمال کیا گیا ہے کسی قدر تفصیل کے ساتھ کرتے ہیں۔

سرکاری خدمات

سب سے پہلے ہم سرسید کی سرکاری خدمات پر۔ جو اُن کی تمام ترقیات کی پہلی سیڑھی اور اُن کے تمام کارناموں کا ایک زبردست آلہ رہی ہیں۔ نظر ڈالتے ہیں، اور اپنی قوم کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو۔ جو گورنمنٹ سروس کے ذریعہ سے اعزاز حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ نصیحت کرتے ہیں کہ اُن کو سرسید کی راستبازی، دیانت، وفاداری اور شریفانہ غلامانہ اطاعت سے۔ جس پر وہ ملازمت کے زمانہ میں اور اُس کے بعد ہمیشہ کاربند رہے۔ سبق لینا چاہیئے؛ کیونکہ حسن خدمت کی کوئی مثال اور کوئی نمونہ اُن کو اس سے بہتر دستیاب نہیں ہو سکتا۔

سرکاری ملازمت کا آغاز

جس زمانہ میں سرسید نے انگریزی نوکری اختیار کی اُس وقت مسلمانوں کو انگریزوں کے اخلاق، عادات، طرز معاشرت اور انگلش گورنمنٹ کی طرز حکومت سے بہت ہی کم واقفیت تھی، اور دلی اور اُس کے نواح کے مسلمان عموماً انگریزی نوکری اور انگریزی تعلیم سے متنفر تھے۔ خصوصاً جو خاندان قلعۂ دہلی سے کچھ تعلق رکھتے تھے اُنکو انگریزی نوکری کا کبھی خواب بھی نظر نہ آتا ہوگا۔ چنانچہ سرسید نے جب سرکاری ملازمت کی خواہش ظاہر کی تو اُن کے تمام عزیز اور رشتہ دار اس ارادہ سے مانع آئے مگر چونکہ اُن کے نانا دبیر الدولہ نے بعض سرکاری خدمات انجام دی تھیں اور اُن کے خالو خلیل اللہ خاں اُس وقت ایک ممتاز انگریزی خدمت پر مامور تھے اس لئے انھوں نے قلعہ دہلی کے تبرک پر قناعت نہ کی بلکہ انگریزی نوکری اختیار کر لی۔

سلیقۂ کار

سرسید نے ابتدائے ملازمت ہی میں یہ نکتہ بخوبی ذہن نشین کر لیا تھا کہ کسی کام کے ملنے سے پہلے اُس کام کی لیاقت اور اُس کے فرائض کی اطلاع حاصل کرنی ضروری

چنانچہ ۱۸۴۳ء میں جب مسٹر رابرٹ ہملٹن نے اُن کو عدالت سشن کا سررشتہ دار[۱۵] مقرر کرنا چاہا تو اُنھوں نے اُس کے قبول کرنے سے انکار کیا اور صاف کہہ دیا کہ جس کام کی میں اپنے میں لیاقت نہیں پاتا اُس کو کیونکر قبول اور اُس کے فرائض ادا کر سکتا ہوں؟ جب وہ آگرہ کی کمشنری میں نائب منشی کے عہدہ پر مقرر ہو گئے تو انھوں نے بہت جلد قوانین مال سے واقفیت حاصل کر لی اور ترتیب دفتر کا ایک دستور العمل بنایا جس کے مطابق تمام دفتر کمشنری آگرہ کا مرتب کیا گیا۔ پھر عدالت منصفی کے متعلق قوانین کا ایک خلاصہ تیار کیا جسکو صاحب کمشنر آگرہ نے گورنمنٹ میں پیش کر کے اُن کیلئے عہدہ منصفی کی سفارش کی۔

اس کے بعد انھوں نے اپنے تمام زمانہ ملازمت میں اس قاعدہ کو ہمیشہ نصب العین رکھا کہ جو کام سرکار کی طرف سے ان کو تفویض ہوا اس کے متعلق کافی واقفیت بہم پہنچائی اور اُسکے فرائض بڑے بڑے تجربہ کار آدمیوں کی طرح سرانجام کئے۔ یہاں تک کہ سروس کا زمانہ ختم ہونیکے بعد بھی جتنے کام گورنمنٹ نے اُن سے لینے چاہے اُن کو کمال جانفشانی اور محنت سے اور نہایت بصیرت اور اطلاع کے ساتھ انجام دیا۔ لیجس لیٹو کونسل کی ممبری اُنھوں نے ایسی لیاقت کے ساتھ کی کہ اُن سے پہلے کسی ہندوستانی ممبر نے نہیں کی تھی۔ اُن سے پہلے ظاہرا کسی نیٹو ممبر نے کوئی مسودہ قانون پیش نہیں کیا تھا۔ اُنھوں نے تین مفید قانون بنائے جن میں سے صرف دو پیش ہوئے اور دونوں پاس ہو گئے۔ کونسل کے اکثر مباحثوں میں باوجود انگریزی نہ جاننے کے نہایت سنجیدہ اور لیگل اسپیچیں کیں اور محض اپنی اعلیٰ لیاقت کے سبب دو ویسرائوں کے عہد میں دو بار منتخب ہوئے اسی طرح ایجوکیشنل کمیشن میں جیسی مبسوط اور مفصل شہادت اُنھوں نے دی اور جو روشنی تعلیمی معاملات پر اُن کی شہادت نے ڈالی اُس سے زیادہ کسی کی شہادت میں نہیں سنی گئی۔ غرض کہ اُنھوں نے سرکاری کام کو کبھی بیگاریوں

---

[۱۵] چونکہ سررشتہ داری عدالت سشن کے قبول کرنے سے سرسید نے اس خوف سے انکار کیا تھا کہ مبادا اُسکے فرائض اُن سے ادا نہ ہو سکیں اس لئے مسٹر رابرٹ ہملٹن نے جو سفارش کی چٹھی مسٹر لنڈزی کے نام لکھکر سرسید کو آگرہ بھیجا تھا اُس میں اُن کو عالی خاندان اور ہوشیار ہونیکے علاوہ ڈرپوک بھی لکھا تھا۔ اس چٹھی کو کرنل گریہم سرسید کی لائف میں نقل کر کے لکھتے ہیں کہ سرسید میں اب کوئی علامت ڈرپوک ہونے کی نہیں ہے اس کے بعد وہ عارف جنگ کے معنی ماسٹر آف وار لکھکر کہتے ہیں کہ غدر کے موقع پر سید احمد نے اس خطاب کا کافی ثبوت دیا ہے ۱۲

کی طرح نہیں کیا بلکہ ہر ایک خدمت کے فرائض نہایت تندہی اور جانفشانی سے ادا کئے۔ اسی سبب سے اُن کے افسر ہمیشہ اُن کے مداح اور شکرگزار رہے۔

بےغرضی

جہاں تک ہم کو معلوم ہے انھوں نے کبھی اپنی ترقی یا کسی خدمت کے صلہ کی صراحتہً یا کنایۃً اپنے افسروں سے درخواست نہیں کی، بلکہ ہمیشہ اپنی کارگزاری اور حُسن خدمت سے اُن کے دل میں جگہ کی اور خود اپنے کاموں کو اپنا سفارشی بنایا ۱۸۸۸ء میں جب کہ سرسید کو بمقام علی گڑھ کے سی ایس آئی کا خطاب دیا گیا اُس وقت صاحب کلکٹر علی گڑھ مسٹر کینیڈی نے سرسید کی نسبت کہا تھا کہ "یہ وہ شخص ہے جس نے اپنے واسطے کبھی کچھ نہیں چاہا بلکہ ہر چیز اپنے ملک کے واسطے چاہی" پروفیسر آرنلڈ ایم اے جو دس برس علی گڑھ کالج میں سرسید کے پاس رہے انھوں نے بھی سرسید کے ماتمی جلسہ میں کہا تھا کہ "گورنمنٹ کی طرف سے جو اعزاز یا خطاب اُن کو ملا وہ ہمیشہ بے طلب ملا اور میں آج تک کسی ایسے شخص سے نہیں ملا جو اُن سے زیادہ شریفانہ زندگی بسر کرنے والا اور اُن سے زیادہ بےلاگ اور بےغرض ہو"

دیانتداری

دیانت داری کی صفت اُن کی تمام پبلک سروس میں ایسی نمایاں رہی ہے جیسے آفتاب میں روشنی۔ صہیب رومی کی نسبت آنحضرتؐ نے فرمایا ہے کہ "نِعْمَ الْعَبْدُ صُهَيْبٌ لَوْلَمْ يَخَفِ اللّٰهَ لَمْ يَعْصِهٖ" (یعنی صہیب ایسا نیک بندہ ہے کہ اگر وہ خدا سے نہ ڈرتا تو بھی اُس کی نافرمانی نہ کرتا) یہی حال سرسید کے تدّین کا تھا۔ وہ نہ کسی حاکم کے خوف سے اور نہ شرعی امتناع کی وجہ سے بلکہ محض اپنی طبیعت کے اقتضا سے کوئی کام دیانت داری کے خلاف نہیں کر سکتے تھے۔ غدر سے پہلے اُن کا تدّین بہت خوفناک صورت میں ظاہر ہوتا تھا۔ اہل مقدمہ کو یہ جرأت تو نہ ہوتی تھی کہ اُن کے سامنے کچھ نذرانہ پیش کریں، یا ایسا پیغام بھیجیں، البتہ کبھی کبھی ناواقف لوگ دوران مقدمہ میں اُن کے مکان پر صرف ملنے کے بہانے یا کوئی سوغات لے کر چلے جاتے تھے۔ سوغات کا قبول کرنا تو درکنار۔ ہم نے سنا ہے کہ وہ سوغات لانے والے سے اس قدر بدگمان ہو جاتے تھے کہ اُس کا اثر مقدمہ کے فیصلہ تک پہنچتا تھا۔ آخر اہل مقدمہ نے اثنائے تحقیقات میں اُن سے ملنا چھوڑ دیا تھا جھوٹے مقدمے بنانے والے اور جھوٹی گواہیاں دینے والے اُن کے نام سے کانپتے تھے۔ نہ اُن سے اپنوں کو رعایت کی توقع تھی اور

نہ غیروں کو۔ صاحب جج بنارس نے سالانہ رپورٹ میں ان کی نسبت لکھا تھا کہ "شہر اور ضلع بنارس کو سید احمد خاں ایک ایسا شخص ملا ہے جس پر وہ نہایت اعتماد رکھتے ہیں اور جس کو فریب یا دھوکا نہیں دے سکتے۔"

غدر سے پہلے جو اکثر یوروپین افسروں نے سرسید کی نسبت اپنی چٹھیات میں رائے ظاہر کی ہے اُس میں زیادہ تر اُن کے علو خاندان لیاقت اور دیانت داری کا ذکر کیا ہے کیونکہ اس میں سے زیادہ وہ ہندوستانیوں کے کیرکٹر سے اُسی وقت بخوبی واقف ہو سکتے ہیں جب کوئی امتحان کا موقع پیش آئے۔ یہاں ہم صرف ٹامس مٹکاف صاحب رزیڈنٹ وکمشنر دہلی کی چٹھی مورخہ ۱۴ جولائی ۱۸۵۳ء کا ترجمہ نقل کرتے ہیں وہ لکھتے ہیں کہ "سید احمد خاں معزز خاندان کے ممبر ہیں اور نواب دبیرالدولہ خواجہ فرید خاں مرحوم کے۔ جو شاہنشاہ اکبر شاہ مرحوم کے وزیر اعظم تھے نواسے ہیں۔ اور میں اپنے ذاتی تجربہ سے اس بات کی شہادت دیتا ہوں کہ ایمانداری اور لیاقت میں بہت اعلیٰ درجہ کا کیرکٹر رکھتے ہیں۔"

اس باب میں سرسید کی احتیاط کا یہ حال تھا کہ اُن کی سروس ختم ہونے پر باوجودیکہ گورنمنٹ بہت خوشی سے ان کو کام کرنے کی مہلت دینی چاہتی تھی مگر اُنھوں نے زیادہ مہلت لینی مناسب نہ سمجھی کیونکہ مدرسۃ العلوم قائم ہو چکا تھا جس کے لئے چندہ جمع کرنے کی ازبس ضرورت تھی اور وہ عام طور پر چندہ وصول کرنا ملازمت کی حالت میں خلاف احتیاط سمجھتے تھے۔ چنانچہ جب تک اُنھوں نے پنشن نہیں لی بنارس میں اپنے دوستوں کے سوا کسی سے چندہ طلب نہیں کیا۔

آزادی

اگرچہ سرسید نے اُس دربار کے سایہ میں پرورش پائی تھی جو ایک قدیم ڈسپاٹک گورنمنٹ کی یادگار تھا۔ جہاں آزادی کے پر جلتے تھے اور خوشامد کا بازار گرم تھا۔ نیز اُس وقت شمالی ہندوستان میں انگریزی عملداری کا ابتدائی زمانہ تھا اور اس لئے برٹش گورنمنٹ میں بھی اُس وقت تک ایشیائی طرز حکومت کی تمام خاصیتیں موجود تھیں؛ اہلکار خوشامد کو اہلکاری کا زیور سمجھتے تھے اور اس وجہ سے یوروپین حکام اور افسر ہندوستان میں آکر خوشامد پسند بن جاتے تھے۔ باوجود اس کے سرسید کا برتاؤ اپنے افسروں کے ساتھ ابتدا سے اخیر تک نہایت آزادانہ رہا۔ وہ اپنے افسروں کا ادب اور تعظیم اور کار سرکار میں اُنکی اطاعت جیسی کہ چاہئے ہمیشہ کرتے تھے مگر اُن کا بیجا دباؤ کبھی نہیں مانا اور بے موقع

کبھی ہاں میں ہاں نہیں ملائی۔ غدر سے بہت پہلے۔ جب کہ دلی میں جان پاٹن گبنس سشن جج اور سرسید منصف تھے۔ قسمت دلی کے دو جاگیردار بھائیوں میں جن میں سے ایک سرسید کا گہرا دوست تھا۔ جاگیر کی بابت سخت نزاع تھا اور اُن کا جھگڑا گورنمنٹ میں پیش تھا۔ دوسرے بھائی نے صاحب جج سے شکایت کی کہ میرے بھائی کو سید احمد خاں بہکاتا اور ہر قسم کی مدد دیتا ہے۔ اس کو آپ سمجھا دیں کہ جب تک ہمارا جھگڑا عدالت سے طے نہ ہو جائے وہ میرے بھائی سے ملنا چھوڑ دے۔ جان پاٹن گبنس کے طنطنے اور رعب و داب کی تمام قسمت میں دھاک تھی اور اُن کے کسی ماتحت کی یہ مجال نہ تھی کہ اُن کا کہنا نہ مانے۔ انھوں نے ایک روز سرسید کو بلا کر سمجھایا کہ جب تک یہ نزاع رفع نہ ہو تم اپنے دوست سے ملنا چھوڑ دو۔ سرسید نے صاف کہہ دیا کہ میں بیشک آپ کا ماتحت ہوں سرکاری معاملات میں جو کچھ آپ ہدایت کریں گے بسر و چشم تعمیل کروں گا مگر میرے ذاتی تعلقات میں آپ کو دخل دینا نہیں چاہیے اگر آپ کہیں کہ تم چند روز کو اپنی ماں یا بہن سے ملنا چھوڑ دو تو میں کیونکر آپ کے حکم کی تعمیل کر سکتا ہوں، اگرچہ انگریزوں میں ہندوستان کی آب و ہوا تحکم اور خوشامد پسندی پیدا کر دیتی ہے۔ مگر چونکہ آزادی اُن کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہوتی ہے وہ ایسے آزاد شخصوں کی آخر کار قدر کرنے لگتے ہیں اور برخلاف عام اشخاص کے اُن کے ساتھ خاص طور کا برتاؤ برتتے ہیں۔ جب صاحب جج نے یہ معقول عذر سنا پھر کبھی اُن پر ایسا بے جا دباؤ نہیں ڈالا

۱۸۵۵ء میں جب کہ وہ پہلی بار مسٹر کرک کی جگہ صدر امین مقرر ہو کر رہتک گئے ہیں اُس وقت تک رہتک میں عجب کھل بلی پڑی ہوئی تھی۔ مسٹر گتری قائم مقام مجسٹریٹ نے بیشمار مقدمے بد اعمالی اور رشوت ستانی کے مسٹر کرک پر دائر کر رکھے تھے، مخبری کا بازار گرم تھا، جو لوگ گتری صاحب کے ہاں کرک کے برخلاف مخبری کرتے تھے ان سے سب لوگ دبتے تھے۔ خان بہادر غلام نبی خاں مرحوم جو اُس وقت وہاں نائب سررشتہ دار کلکٹری تھے اُن کا بیان ہے کہ " سید صاحب نے وہاں جا کر کوئی کام صاحب مجسٹریٹ کی مرضی کے بالکل خلاف کئے اور کبھی اُن کا دباؤ نہیں مانا۔ ایک شخص بابر خاں نامی قصبہ رہتک کا نمبردار (جس کو راقم بھی جانتا ہے) گتری صاحب کا بڑا مقرب تھا جس نے کرک کے برخلاف اُن کو بہت مدد دی تھی۔ اُس نے کسی دیوانی کے مقدمہ میں سید صاحب کے اجلاس میں جھوٹی گواہی دی۔ انھوں نے فوراً اُس کو

ماخوذ کیا۔ ہرچند گتری صاحب نے اُس کی رہائی کے لئے سفارش کی مگر سید صاحب نے سفارش نہیں مانی اور اُس کو دورہ سپرد کر دیا جہاں سے اُس کو تین برس کی قید کا حکم ہوا۔"

پھر میونسپل کمیٹی کے ایک مقدمہ میں گتری صاحب ایک ٹھیکہ دار کی جائداد بعلت مطالبہ کمیٹی نیلام کرنی چاہتے تھے۔ اور تمام ممبران کمیٹی سوائے سید صاحب کے اُن سے متفق الرائے تھے۔ سر سید نے اس وقت کے بائلاز کے مطابق یہ رائے دی کہ کمیٹی بدون حاصل کرنے ڈگری دیوانی کے اپنے اختیار سے ٹھیکہ دار کی جائداد کے نیلام کرنے کی مجاز نہیں ہے۔ جب سب نے اس رائے سے اختلاف کیا تو اُنھوں نے اپنی رائے مدلل تحریر کر کے کمیٹی میں بھیج دی۔ آخر گتری صاحب کو بصد اکراہ اُنھیں کی رائے کے موافق عمل کرنا پڑا۔"

منشی صاحب ہی کا یہ بھی بیان ہے کہ "جب سے گتری صاحب نے مسٹر کرک کو زک دی تھی صدر امینی کی کچھ وقعت لوگوں کی نظر میں نہیں رہی تھی۔ خصوصاً ملازمان کچہری ضلع اُس کو لاشئ محض سمجھنے لگے تھے۔ اتفاق یہ کہ ایک شخص جس کا باپ صاحب ضلع کے محکمہ میں سررشتہ دار تھا صدر امینی میں بزمرۂ محرران نوکر تھا۔ اس گھمنڈ پر کہ میرا باپ صاحب مجسٹریٹ کی ناک کا بال ہے اپنا کام نہایت بے پروائی سے کرتا تھا۔ سر سید نے اُس کو بعلت غفلت و بے پروائی کے معطل کر دیا۔ ہرچند ضلع والوں نے سفارش کے لئے بہت کچھ ہاتھ پاؤں مارے مگر اُنھوں نے کچھ التفات نہ کیا۔ یہاں تک کہ وہ دیوانی کی تعطیل میں دلّی چلے گئے، مگر تعطیل سے واپس آکر کسی کے کہنے سے نہیں بلکہ اُس کے باپ کے بڑھاپے کا خیال کر کے اُس کو پھر بحال کر دیا۔"

یہ واقعات اُس زمانہ کے ہیں جبکہ سر سید یورپین حکام کی نظر میں ایک ہندوستانی عہدہ دار سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے تھے؛ اور جو وقعت اور اعتبار اُن کو ایامِ غدر کی خدمات کے بعد انگلش حکام اور خود انگلش گورنمنٹ میں حاصل ہوا اُس کا عشرِ عشیر بھی اُس وقت حاصل نہ تھا۔ مگر اُس حالت میں بھی اُنھوں نے اپنی آن کو کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا؛ اور اپنے فرائضِ منصبی نہایت آزادی اور دلیری سے ادا کرتے رہے۔ منشی غلام نبی خاں مرحوم کہتے تھے کہ "دومنی صاحب۔ جو مسٹر کرک کے مقدمات کی تحقیقات کے لئے اڈیشنل کمشنر ہو کر رہتک گئے تھے جب سر سید ان سے ملے تو وہ اُن کی ملاقات سے نہایت خوش ہوئے؛ اور اُن کی غیبت میں لوگوں سے کہا کہ ہم نے ہندوستانی افسروں میں ایسا صاف اور آزاد طبیعت کوئی افسر نہیں دیکھا۔ اسی وجہ سے سر سید کا منی صاحب سے اس قدر ربط بڑھ گیا تھا کہ آثار الصنادید کا

انگریزی ترجمہ - جو مسٹر رابرٹسن جنٹ مجسٹریٹ دہلی نے ناتمام چھوڑ دیا تھا - اس کے پورا کرنے کا وعدہ انھوں نے سرسید سے کیا - چنانچہ جب صاحب موصوف مراد آباد میں جج ہو کر گئے تو بہت سا ترجمہ انھوں نے کرایا۔"

تھیوڈور ماریسن اس آرٹیکل میں - جو انھوں نے سرسید کی وفات کے بعد اُن کے پولٹکل ورکس پر لکھا تھا - ٹرکی اور مسلمانوں کے تعلقات کی نسبت لکھتے ہیں کہ "اس مضمون پر سرسید نے کوئی مذبذب اور مشتبہ آواز نہیں نکالی - اُنھوں نے بھی اور مسلمانوں کی طرح سلطان ٹرکی کے ساتھ ہمدردی ظاہر کی اور اُس کے تنزل پر افسوس کیا + + + + وہ کہا کرتا تھا کہ عصائے سلطنت مسلمانوں کے ہاتھ سے نکلا جاتا ہے اور اُس کو یہ خوف تھا کہ مبادا مسلمان بھی پولٹکل بے وقعتی کی اس حالت تک پہنچ جائیں جو یورپ میں یہودیوں کی حالت ہے - اسی لئے ٹرکی کے ہر ایک صدمہ پر وہ ایسے ہی سچے دل سے رنج و الم کرتا تھا جیسا کہ ہر مسلمان کرتا ہے - لیکن اس ہمدردی کی بدولت جو اس کو اپنے معزز ہم مذہبوں کے ساتھ تھی - وہ قیصر ہند کی وفاداری اور احسان مندی سے یکدم منحرف نہیں ہو سکا۔"

بے تعصبی اور انصاف

اس کے سوا سرسید نے اپنی تمام اپنی ملازمت کا زمانہ جس بے تعصبی اور کشادہ دلی سے بسر کیا وہ فی الحقیقت ہمارے ملک میں ایک ایسی مثال ہے جو نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے - انھوں نے عدالت کی کرسی پر بیٹھ کر ہر قوم اور ہر مذہب کے آدمی کو ہمیشہ ایک نگاہ سے دیکھا، اور کبھی ایک جج ہونے کی حیثیت سے اپنی قوم اور اپنے مذہب کے آدمی کو دوسری قوم اور دوسرے مذہب کے آدمی پر ترجیح نہیں دی - بلکہ ایسی ترجیح دینے کو ایک نہایت کمینہ خصلت اور ننگ انسانیت تصور کیا - اُن کی بے تعصبی کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ غدر کے موقع پر - جیسا کہ پہلے حصہ میں مفصل بیان ہو چکا ہے - باوجودیکہ ضلع بجنور کے ہندو مسلمانوں میں کمال عداوت تھی - وہاں کے تمام ہندو تعلقہ داروں نے خود سرکار سے کمال خوشی اور آرزو کے ساتھ یہ درخواست کی کہ جب تک ضلع میں امن نہ ہو سید احمد خاں اور ڈپٹی رحمت خاں کو ضلع سپرد کیا جائے، اور انھیں کو ضلع کا حاکم بنایا جائے - تاریخ سرکشی بجنور میں سرسید نے جہاں ہندو چودھریوں کا حال لکھا ہے اُس سے اُن کی غایت درجہ کی بے تعصبی ظاہر ہوتی ہے - باوجودیکہ ہندو چودھریوں اور اُن کے ساتھیوں کی طرف سے مسلمانوں پر سخت ظلم اور زیادتیاں ہوئی تھیں - اس پر بھی - چونکہ وہ فی الواقع بغاوت سے

الزام سے پاک تھے اس لئے ان کو اس الزام سے بالکل بری کیا ہے۔ اور واقعات کے بیان کرنے میں مذہبی یا قومی تعصبات کو۔ جو اُس وقت تمام ملک میں وبا کی طرح پھیلے ہوئے تھے۔ مطلق کام نہیں فرمایا۔

جب سرسید ملازمت سے کنارہ کش ہو کر بنارس سے روانہ ہونے کو تھے تو وہاں کے ہندو اور مسلمان رؤسا نے بشمول یورپین حکام کے اُن کو ایک وداعی ایڈریس دیا تھا جسمیں ان کی سرکاری، ملکی، اور قومی خدمات کے علاوہ خاص کر اُن کے بے لاگ انصاف اور بے تعصبانہ فیصلوں کی نہایت تعریف تھی۔ سرسید نے اُس کے جواب میں کہا کہ "اگر میں نے قانون کی تعمیل انصاف کے ساتھ بلا لحاظ کسی کے رتبہ اور قوم اور رنگ یا مذہب کے کی تو اُسکے لحاظ سے میں کسی شکریہ کا مستحق نہیں ہوں۔ مجھکو تمام عمر اس بات کی فکر رہی ہے کہ جو بڑا فرض مجھکو تفویض ہوا ہے اُس کو ایمانداری کے ساتھ انجام دوں۔ میں اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کو ہمیشہ خوب سمجھتا رہا ہوں؛ اور دنیا کی دولت اور عزت پر سچ بات کو اور خدا تعالیٰ کی خوشنودی کو انسان کی قدر دانی اور تعریف پر ہمیشہ ترجیح دیتا رہا ہوں۔ میں نے ہمیشہ اپنے تئیں خدا تعالیٰ کا جواب دہ سمجھا ہے؛ نہ کہ انسان کا۔ گو میں نے اپنی رائے میں غلطی کی ہو۔ مگر ہمیشہ اپنے ایمان کی ہدایت پر عمل کیا ہے۔ باوجود اس کے مجھ کو اس بات کے دیکھنے سے کچھ کم خوشی حاصل نہیں ہوئی کہ جو کوششیں میں نے سب لوگوں کے حق میں انصاف کرنے میں کی تھیں ان کی قدر شناسی میرے ہم وطنوں نے کی ہے"۔

انھیں دنوں میں جب کہ سرسید بنارس سے رخصت ہونے والے تھے شہر کے ہندو اور مسلمان شرفا نے اُن کی یادگار قائم کرنے کے لئے ایک کمیٹی منعقد کی تھی جسکے پریسیڈنٹ راجہ شمبھو نراین سنگھ بہادر تھے۔ اس کمیٹی میں راجہ صاحب موصوف نے سرسید کی یادگار کے طور پر بنارس کالج میں طبیعیات کی تحصیل کے لئے ایک اسکالرشپ ہمیشہ کے واسطے "سید احمد خاں اسکالرشپ" کے نام سے مقرر کی تھی جو اب تک برابر جاری ہے۔

انتظام قحط ضلع مرادآباد کا مفصل حال ہم پہلے حصہ میں لکھ چکے ہیں اسی کے ضمن میں وہ واقعہ جو راجہ جے کشن داس صاحب نے مجھ سے خود بیان کیا تھا اور جس سے اُن کو سرسید کی بے تعصبی کا یقین ہوا تھا ملاحظہ کے قابل ہے کہ رسالہ "لائل محمڈنز آف انڈیا" کو دیکھکر انھوں نے سرسید کو ایک سخت متعصب مسلمان خیال کیا تھا مگر مرادآباد کے محتاج خانہ

میں ہر مذہب اور ہر ملت کے ادنیٰ ادنیٰ کنگلوں کی خدمت گزاری میں اُن کو دیوانہ وار سرگرم دیکھکر وہ حیران اور ان کی بےتعصبی کے دل سے قائل ہو گئے۔

وفاداری

غدر کے زمانہ میں جس خلوص اور سچائی کے ساتھ گورنمنٹ کی وفاداری خیر خواہی اور یورپین مردوں عورتوں اور بچوں کی جان کی حفاظت اُن سے بن آئی اس کو ہم مفصل پہلے حصّہ میں لکھ چکے ہیں یہاں صرف سر جان اسٹریچی کے چند الفاظ نقل کئے جاتے ہیں جو انھوں نے ۱۸۸۰ء میں ہندوستان سے رخصت ہوتے وقت محمدن کالج کمیٹی کے ایڈریس کے جواب میں سر سید کی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے کہے تھے انھوں نے کہا کہ "کسی شخص نے اُس سے زیادہ شریفانہ طور پر دلیری اور وفاداری کا ثبوت برٹش گورنمنٹ کے ساتھ نہیں دیا جیسا کہ ۱۸۵۷ء میں انھوں نے (یعنی سید احمد خاں نے) دیا میں کوئی لفظ بھی ایسا استعمال نہیں کر سکتا جس سے اُن کی جان نثاری کا کافی طور پر اظہار ہو سکے" اسی اسپیچ میں انھوں نے یہ بھی کہا کہ "شمالی مغربی اضلاع میں اُن سے زیادہ کوئی روشنضمیر جج نہیں ہوا" اور مسٹر شکسپیر نے اپنی رپورٹ میں اقرار کیا تھا "اگر صدر امین (یعنی سید احمد خاں) بیچ میں واسطہ نہ ہوتا تو ہماری جانیں نواب محمود خاں کی شکار ہو جاتیں" اسی رپورٹ میں انھوں نے سر سید کی دانشمندی بے مثل ایمانداری اور سرگرمی پر شہادت دی تھی۔

ججوں

بنارس کی سول جسٹس اینڈ منسٹریشن رپورٹ ۱۸۶۷ء میں صاحب جج بنارس نے اُن کی نسبت لکھا تھا کہ "شہر اور ضلع بنارس کو سید احمد خاں ایک ایسا شخص ملا ہے جس پر وہ نہایت اعتماد رکھتے ہیں اور جس کو فریب یا دھوکا نہیں دے سکتے۔ وہ اپنے فرائض کے ادا کرنے میں نہایت باقاعدہ اور اُن کی طرف متوجہ رہنے والا ہے اور اُس کے فیصلے نہایت احتیاط اور غور سے کئے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ مقدمہ کے ہر ایک پہلو اور ہر ایک جانب پر اس طرح غور کرتا ہے کہ عدالت اپیل کے فیصلہ کے واسطے کچھ باقی نہیں رہتا۔ اُن کے اس بہت بڑے تجربہ سے۔ جو ہر قسم کے جوڈیشل امور میں اُن کو حاصل ہے۔ میں نے خود بہت فائدہ اُٹھایا ہے"

ہائی کورٹ کے ججوں نے سر سید کی درخواست پنشن گورنمنٹ میں بھیجتے وقت حسب ذیل رپورٹ کی تھی "سید احمد خاں کے اوصاف اور قابلیت بحیثیت ایک پبلک سرونٹ کے ہر آنریبل بخوبی روشن ہیں۔ گو یہ عدالت بوجہ بالا دست عدالت ہونے کے جس کے سید احمد خاں تحت رہے ہیں۔ اُن کی ذہانت، محنت، قابلیت اور ہوشیاری کی بلند اور بےنشہرت کو۔ جو انھوں نے

اپنے طول طویل زمانۂ ملازمت میں تمام جماعتوں کے درمیان حاصل کی ہے بطور شہادت کے درج کر دینا چاہتی ہے" اور نیز اس نقصان پر افسوس کرنا چاہتی ہے جو پبلک سروس کو۔ جو انھوں نے اس قدر عزت اور شرافت کے ساتھ انجام دی ہے۔ ان کی کنارہ کشی سے پہنچے گا"

نواب لفٹننٹ گورنر کی طرف سے جو اس رپورٹ کا جواب موصول ہوا وہ یہ ہے "سید احمد خاں کا استعفا منظور کرنے میں ہز آنر لفٹننٹ گورنر نے مجھ کو ہدایت کی ہے کہ انکی جانب سے میں اُن کی ہائی ایمینین سید احمد خاں کی اس قابلیت اور ہوشیاری کی نسبت ظاہر کروں جو پبلک سروس میں اُن کے امتیاز کا باعث رہی ہے، اور نیز اُن کی اس روشن، مہذب اور بے غرضانہ محنت کی نسبت بھی جو انھوں نے اپنی پرائوٹ لائف میں اپنے ہموطنوں کے فائدہ کے واسطے کی ہے"

اس موقع پر ہائی کورٹ نے چاہا تھا کہ سرسید کی خدمات کی نسبت ایک خاص شکریہ گورنمنٹ گزٹ میں مشتہر کرایا جائے۔ مگر چونکہ یہ ایک غیر معمولی طریقہ تھا اس لئے عمل میں نہیں آنے پایا لیکن پایونیر نے غالباً رجسٹرار ہائی کورٹ کے اشارہ سے اس شکریہ کے الفاظ چھاپ کر مشتہر کر دئے تھے۔

کتاب "پلر راوت دی انڈین امپائر" جس میں سرسید کو ارکان سلطنت ہندوستان میں سے ایک رکن شمار کیا گیا ہے۔ اُن کی ممبری کونسل کے زمانہ کی طرف اشارہ کرکے یہ لکھا ہے کہ "اُن طریقوں میں سے جو لارڈ لٹن نے ہندوستانیوں کو عزت اور ذمہ داری کے مناصب پر ترقی دینے کے لئے اختیار کئے تھے کوئی طریقہ از روئے استحقاق کے اس قدر ہر دل عزیز نہیں ہوا جیسا کہ شائستہ مسلمانوں کے اس واجب التعظیم لیڈر (یعنی سید احمد خاں) کا لیجس لیٹو کونسل میں مقرر کرنا ہوا ہے اس اعزاز کو ہندوؤں اور مسلمانوں نے مساوی طور پر سید احمد خاں کی دیانت داری، بے غرضانہ اور شریفانہ برتاؤ اور اُن کی قابلیتوں کا صلہ تسلیم کیا ہے۔

مسٹر ایچ جی کین ممبر پارلمنٹ نے اخبار "ہوم ورڈ میل" میں سرسید کی نسبت اپنی یہ رائے ظاہر کی تھی کہ "سید احمد خاں۔ جس سے میں نے ۱۸۷۸ء میں جب کہ وہ لیجس لیٹو کونسل کا ممبر تھا واقفیت حاصل کی تھی۔ ٹھیک اُس قسم کا شخص ہے جس کو ہندوستان کا ایک انگلش منتظم اپنے ساتھ رکھنے کے خاص کر مشکل اور خطرہ کے وقت میں خواہش کرے گا۔ وہ ایک خاندانی تعلیم یافتہ، لائق، وفادار اور پوری اُرجنیل اور مستقل طبیعت کا آدمی ہے۔ وہ تاج برطانیہ کا ایک خیر خواہ اور دوست سبجکٹ

ہے، مگر باایںہمہ وہ انگریزی گورنمنٹ کے نقصوں سے بھی بخوبی واقف ہے"

مسٹر تھیوڈور بیک نے جو ۲۹ مارچ ۱۸۹۸ء کو سرسید کی وفات پر اسپیچ دی تھی۔ اُس میں انھوں نے یہ بھی کہا تھا کہ "دس برس کا عرصہ ہوا کہ سر اکلنڈ کالون نے۔ جبکہ وہ لفٹنٹ گورنر تھے مجھ سے یہ کہا تھا کہ "کسی زندہ شخص نے۔ عام اس سے کہ وہ انگریز ہو یا ہندوستانی برٹش گورنمنٹ کے استحکام سلطنت ہندوستان کے بارہ میں اسقدر کوشش نہیں کی ہے جسقدر کہ سرسید نے کی ہے"

رسالہ اسباب بغاوت ہند کا انگریزی ترجمہ

رسالہ اسباب بغاوت۔ جس کا لکھنا ایک حیثیت سے ملک اور قوم کی بے نظیر خدمت اور دوسری حیثیت سے تاج برطانیہ کی حقیقی خیرخواہی کا کام تھا۔ سرسید کی اُن جلیل القدر خدمات میں سے ہے جن سے وہ ارکان سلطنت میں شمار کئے جانیکے مستحق ہوئے ہیں وہ اپنے ایک خط میں جو ولایت سے مولوی سید مہدی علیخاں کو بھیجا ہے لکھتے ہیں کہ "میں انڈیا آفس میں صاحب سکرٹری وزیر ہند کے پاس گیا تھا۔ انھوں نے مجھکو کونسل کے کاغذات میں میری کتاب اسباب بغاوت مع تمام و کمال انگریزی ترجمہ کے دکھلائی۔ اسے دیکھ کر بہ نہایت دل خوش ہوا۔ جو کچھ رائیں اُسکی بدولت قرار پائیں اُن کا بیان بے فائدہ ہے۔ اہل ہند ناقدردان دوست کش اور اپنے خیرخواہ کے دشمن ہیں۔ مگر میں خوش ہوں کہ میرے ہموطنوں کی بھلائی ہوئی"

اسی حال کو انھوں نے زبانی مجھ سے اس طرح بیان کیا کہ "ولایت میں۔ سر جان کے۔ فارن سکرٹری وزیر ہند سے پرائیویٹ ملاقات ہوئی تو اُن کی میز پر ایک دفتر کاغذات کا موجود تھا۔ انھوں نے ہنسکر کہا کہ "تم جانتے ہو کہ یہ کیا چیز ہے؟ یہ تمہارا رسالہ اسباب بغاوت اصل اور اس کا انگریزی ترجمہ ہے اور اُس کے ساتھ وہ تمام مباحثات ہیں جو اُس پر پارلیمنٹ میں ہوئے مگر چونکہ وہ تمام مباحثے کانفیڈنشل تھے اس لئے وہ نہ چھپے اور نہ اُن کا ولایت کے کسی اخبار میں تذکرہ ہوا"

سر کالون کا اعتراف

اسی کتاب کی نسبت ۱۸۸۸ء میں سر اکلینڈ کالون لفٹنٹ گورنر نے ٹرسٹیان محمدن کالج کی ایڈریس کے جواب میں یہ الفاظ کہے تھے کہ "جو واقعات سب سے پہلے مجھ کو۔ اُس وقت پیش آئے جب کہ میں اول مرتبہ ہندوستان میں آیا تھا۔ منجملہ اُن کے ایک بات یہ تھی کہ میرے دوست سر سید احمد خاں نے ایک ایسے معاملہ میں مجھ سے اعانت کی خواہش کی جو اُسوقت انھوں نے شروع کیا تھا اور جس کی طرف ان کی دلی توجہ مائل تھی۔ انھوں نے مجھ سے یہ فرمائش کی تھی کہ میں انکو ہندوستانی زبان سے انگریزی زبان میں اُس رسالہ کا ترجمہ کرنے میں مدد دوں جو انھوں نے اُن افسوس ناک واقعات کے اسباب کی نسبت تحریر کیا تھا جو ۱۸۵۷ء میں ظہور میں آئے۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ آپ

میں سے اکثر صاحبوں نے اُس رسالہ کو دیکھا ہوگا۔ انھوں نے مجھ سے اس امداد کی درخواست کرکے مجھ پر ایک ایسا احسان کیا جو ہندوستان میں میرے دورِ ملازمت کے خاتمہ تک قائم رہے گا کیونکہ انھوں نے اس رسالہ میں خاص کر بعض ایسے خیالات پر زور دیا تھا جن کی پوری قوت کو میں اُسکے بعد اپنے تجربہ کی رو سے بخوبی سمجھ سکا ہوں۔ سرسید احمد نے اُس میں اشارہ کیا تھا کہ جو بات انگریزوں اور ہندوستانیوں دونوں کے لئے ضروری ہے وہ یہ ہے کہ ایک دوسرے کے خیالات اور حالات کو بخوبی سمجھیں۔ انھوں نے اس بات پر اصرار کیا تھا کہ زیادہ تر اُن واقعات کی بنیاد۔ جن پر وہ بحث کر رہے تھے۔ بجائے ناراضی کے غلط فہمی تھی۔ پس اگر انگریز اور ہندوستانی ایک دوسرے کے خیالات کے سمجھنے میں ثابت قدمی کے ساتھ کوشش کریں گے تو اُن کے باہمی تعلقات بہت زیادہ مربوط و مستحکم ہو جائیں گے'' اس کے بعد انھوں نے کہا کہ ''وہ انھیں خیالات سے ہمارے ہندوستان کے انتظامی مسائل حل ہونگے اور انھیں خیالات کی دوسری صورت علی گڑھ کالج ہے''۔

مسٹر ماریسن کی رائے

مسٹر تھیوڈور ماریسن نے جو سرسید کی وفات کے بعد اُن پولٹکل ورکس پر ایک آرٹکل لکھا تھا اُس میں وہ اسی رسالہ اسباب بغاوت کی نسبت لکھتے ہیں کہ ''وہ انگریزوں میں بہت سے اس بات کے بڑے خواہشمند تھے کہ فتح کے بعد (ہندوستانیوں سے) دل کھول کر انتقام لیں اور اُنکے غصہ کی آگ مسلمانوں کے برخلاف خاص کر بھڑکی ہوئی تھی جنکی نسبت بہت سے لوگوں کا یہ خیال تھا کہ وہ غدر کے محرک ہوئے ہیں + + + اس وحشیانہ حالت میں جبکہ شدید تر خیالات کے پھیلنے کا احتمال تھا ایک ایسی حق بات کا۔ جو عام پسند نہ تھی۔ مونہ سے نکالنا کوئی آسان بات نہ تھی + + + ۱۸۵۸ء میں یہ دلیری کے الفاظ تھے' باوجود اس کے سرسید کے دلائل کے عام منشے کی سچائی اُسی وقت سے تسلیم کرلی گئی ہے اور جو لوگ سرسید کے اُس برتاؤ پر۔ جو اُس نے نیشنل کانگرس کے ساتھ کیا الزام لگاتے ہیں ان کے لئے اس بات پر غور کرنا مفید ہوگا کہ اُس نے اتنی مدت پہلے جتنی کہ ۱۸۵۸ء سے اب تک گذری ہے گورنمنٹ پر زور ڈالا تھا کہ لیجس لیٹو کونسل میں دیسیوں کے داخل کرنے کی نہایت ضرورت ہے''۔

ہوم نیوز کی رائے

انگلستان کے مشہور اخبار ہوم نیوز نے اس کتاب کی نسبت لکھا ہے کہ ''سید احمد خاں نے جو غدر کے اسباب تحریر کئے تھے اُن میں سے بعضے نہایت قیمتی اور عملدرآمد کے قابل تجویزیں پیش کی تھیں جو حکام ہندوستان نے کسی اور ذریعہ سے حاصل نہیں کیں۔ اُس نے نہایت دلیری کے ساتھ اپنی رائے اس مضمون پر ظاہر کی۔ یہ بات محتاج بیان نہیں ہے کہ حکمراں گروہ میں اُس کی رائے نے نہایت اثر پیدا کیا وہ اُن اسباب کے بیان کرنے سے خائف نہیں ہوا جن کی طرف غدر کو بخوبی منسوب کیا

جاسکتا ہے"۔ اور جن کی صحت تجربہ سے پورے طور پر ثابت ہو چکی ہے"۔

برمنگھم ڈیلی گزٹ نے سرسید کی اسی کتاب کا کسی قدر خلاصہ لکھکر یہ تحریر کیا تھا کہ "ان شکایتوں کو اس طرح رفع کیا گیا ہے کہ ہندوستان کی حکومت ایسٹ انڈیا کمپنی سے لیکر تاج برطانیہ سے متعلق کی گئی۔ اور ہندوستانی اور یوروپین جو ملازم سرکار نہ تھے وہ ویسرائے اور پریزیڈنسیوں کی لیجس لیٹو کونسلوں میں شریک کئے گئے"۔

اخبار سینٹ جیمس گزٹ نے اسی کتاب پر یہ ریمارک کیا تھا کہ "سید احمد خاں کی مستحکم وفاداری جو اس یقین پر مبنی ہے کہ انگریزی حکومت اُس کے ملک کے واسطے سراسر مفید ہے۔ وہ اُسکے اُن خیالات اور رایوں کو نہایت سنگین کر دیتی ہے جو اُس نے بڑے جوش اور فصاحت کے ساتھ کتاب اسباب بغاوت میں بیان کئے ہیں۔ یہ کتاب انگریزوں کے واسطے اب تک نہایت دلچسپ اور فائدہ مند ہے۔ خود سید احمد خاں دو دفعہ وائسرائے کی کونسل میں لارڈ لٹن اور لارڈ ڈفرن کے عہد میں ممبر رہا ہے۔ اور اُس کی وہ خواہش جو ہندوستانیوں کے کونسل میں شریک ہونے کی تھی پوری ہو لی ہے۔ لیکن ابھی اُس کی اُس شکایت میں زور ہے کہ حاکم اور محکوم دونوں طرفداری اور غلط فہمی ہونے کے سبب ہنوز ایک دوسرے سے جدا ہیں۔ اور یہ اکثر صورتوں میں عدم ہمدردی یا بالاتر قوم کی طرف سے عمدہ اخلاق ظاہر نہ ہونے کے سبب ہوتا ہے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ ایک خیالی شکایت ہے لیکن اگر ہم یہ خیال کریں کہ ہم عملی لوگ ہیں۔ اس لئے ہم کو خیالی شکایتوں پر توجہ نہ کرنی چاہئے تو بیشک ہم اُس غلطی میں گر جائیں گے جس کی سید احمد خاں شکایت کرتا ہے۔ ہمارے نزدیک سید احمد خاں کی شکایتوں کا اثر بہت جلد اور بہت وسعت کے ساتھ پھیلا ہے۔ بہ نسبت اُن شکایتوں کے جو لال موہن گھوس اور اُس کے اسکول کے نوجوان آدمی نہایت فصاحت کے ساتھ کرتے ہیں"۔

کرنل گریہم۔ جنھوں نے سرسید کی لائف لکھی ہے۔ وہ اس کتاب کی نسبت لکھتے ہیں کہ "وہ اگرچہ ہم میں سے بعضے لوگ سید احمد کی اسباب بغاوت سے متفق نہ ہوں۔ مگر یہ رسالہ جس کو ہمارے خیر خواہ اور وفادار مسلمان شرفا میں سب سے لائق ترین شخص نے لکھا ہے۔ فی نفسہ بدرجہ غایت

[1] اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ رسالہ اسباب بغاوت کے دیکھنے کے بعد یہ تبدیلی عمل میں آئی ہے کیونکہ ملکہ معظمہ کا اشتہار جسمیں اس تبدیلی کا اعلان کیا گیا تھا سرسید کی کتاب چھپنے سے پہلے شائع ہو چکا تھا پس اس سے یہ مراد ہے کہ جس بات کی آرزو سرسید نے اس کتاب میں ظاہر کی تھی وہ اُنکی کتاب کے پیش ہونیسے پہلے ہی پوری کردیگئی ۱۲

مفید ہے۔ کہ اس سے ہندوستانی طرز خیالات کے اندازہ کرنے کا موقع ملتا ہے۔"

رسالہ اسباب بغاوت کے بعض نتائج

اگرچہ کرنل موصوف کے بیان کے موافق ممکن ہے کہ کچھ انگریز ایسے ہوں جو اس رسالہ کے مضامین بالکل نہ تسلیم کرتے ہوں یا اس کے بعض مضامین سے اختلاف رکھتے ہوں لیکن اس میں شک نہیں کہ گورنمنٹ نے۔ جیسا کہ مذکورہ بالا انگریزی اخباروں میں تصریح کی گئی ہے۔ سرسید کی بہت سی تجویزوں کے موافق عمل درآمد اور اکثر شکایتوں کا تدارک کیا۔ مثلاً سب سے بڑی چیز جس کو سرسید نے کتاب مذکور میں بغاوت کا اصلی سبب قرار دیا تھا۔ وہ ہندوستانیوں کا قانونی کونسل میں شریک نہ ہونا تھا۔ جس کے سبب سے گورنمنٹ کے خیالات رعایا پر اور رعایا کے خیالات گورنمنٹ پر ظاہر نہ ہونے پاتے تھے۔ گورنمنٹ نے فوراً اس شکایت کا تدارک کیا۔ یعنی سنہ ۱۸۵۹ء میں یہ رسالہ گورنمنٹ میں پیش ہوا اور سنہ ۱۸۶۱ء میں ہندوستانی رئیس لیجس لیٹو کونسل کی ممبری پر نامزد کئے گئے۔ چنانچہ جنوری سنہ ۱۸۶۲ء کے اجلاس کونسل میں ہم پہلی ہی بار مہاراجہ نرندر سنگھ رئیس پٹیالہ، راجہ دیونراین سنگھ رئیس بنارس، اور راجہ ڈنکر راؤ دیوان ریاست گوالیار کو شریک پاتے ہیں۔ اگرچہ اس وقت ہندوستانیوں کا کونسل میں شریک ہونا محض برائے نام تھا۔ مگر سرسید نے درحقیقت یہ بیج بویا تھا اس پودے کا جواب کسی قدر بارآور ہونے لگا ہے اور اُن کا یہ احسان تمام ملک پر ہمیشہ رہے گا۔ یا مثلاً کتاب مذکور میں یہ بھی شکایت کی گئی تھی کہ ہندوستانیوں کو بڑے بڑے ذمہ داری کے عہدوں پر مقرر نہیں کیا جاتا۔ اس شکایت کا دفعیہ بھی گورنمنٹ نے بہت جلد کیا۔ کتاب مذکور کے پیش ہونے سے ایک برس بعد یعنی سنہ ۱۸۶۲ء میں پہلی ہی بار پنڈت شمبھو ناتھ ہائی کورٹ کلکتہ کے جج مقرر ہوئے اور اس کے بعد رفتہ رفتہ اکثر اعلیٰ عہدے جو پہلے کبھی ہندوستانیوں کو نصیب نہیں ہوئے تھے ملنے لگے۔

بعد وفات پال مال گزٹ کی رائے

لندن کے نامور اخبار پال مال گزٹ میں سرسید کی وفات پر اُن کی پولٹکل خدمات کی نسبت یہ ریمارک کیا تھا کہ "سرکار انگریزی اور باشندگان ہند کے تعلقات کی کہانی میں کوئی باب ایسا نہیں ہے جس پر ہم دل سے اپنے تئیں اس قدر مبارکباد دے سکیں جس قدر کہ سرسید احمد خاں کی لائف پر۔ وہ ابتدا سے آخر دم تک سرکار انگریزی کے راج کا پکا دوست رہا اور جو خدمتیں اس نے کیں اُن کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنا مشکل ہوگا۔"

یہاں تک ہم نے سرسید کی سرکاری خدمات، اور جو وقعت اور اعتبار انھوں نے اُن

خدمات کی بدولت ایک ایسی قوم کی حکومت میں حاصل کیا جس کی نظر میں ہندوستانیوں کا جینا شاید محال سے کچھ ہی کم ہو گا اُس کو بطور مشتے نمونہ از خروارے۔ بیان کر دیا ہے۔ اب ہم اُن کی ملکی اور قومی خدمات پر نظر ڈالتے ہیں۔ جن کی نظیر کم سے کم ہندوستان کی تاریخ میں مشکل سے دستیاب ہو گی۔

ملکی و قومی خدمات

اگرچہ پہلے حصہ میں سرسید کے ہر قسم کے واقعات زندگی کے ضمن میں اُن کی ملکی قومی خدمات کا ذکر اپنی اپنی جگہ تفصیل کے ساتھ ہو چکا ہے۔ مگر ہم کو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر اُن کو ایک سلسلہ میں نہایت اختصار کے ساتھ منتظم کر کے ناظرین کو خاص طور پر اُن کی طرف متوجہ کیا جائے۔ اور اُن کے متعلق جو امور پہلے حصہ میں بیان نہیں ہو سکے یا جو نتائج اُن خدمات پر مترتب ہوئے۔ اُن کو بھی اس سلسلہ میں شامل کر دیا جائے۔

مگر یاد رکھنا چاہیئے کہ ہم اس کتاب میں ایک ایسے شخص کی خدمات کا ذکر کر رہے ہیں جس کے اختیار میں اپنی طاقت کے موافق کوشش و تدبیر کرنے کے سوا کچھ نہ تھا۔ نہ اُس کے ہاتھ میں سلطنت اور حکومت کی باگ تھی کہ اپنے ملک اور قوم کے واسطے جو چاہے سو کر گزرے اور نہ ملک اور قوم کے دل اُس کے قبضہ میں تھے کہ جو نیک صلاح اُن کو بتائے اُس سے کسی کو اختلاف یا انکار نہ ہو۔ پس ہم کو سرسید کی لائف میں۔ بہ نسبت اس کے کہ اُس کی کوششوں سے ملک اور قوم کو کیا کیا فائدے پہنچے۔ زیادہ تر یہ لکھنا چاہیئے کہ اُس نے اُن کے فائدے کے واسطے کیا کیا کوششیں کیں۔ اسی لئے ہم نے سرسید کی کامیاب اور بار آور کوششوں کے ساتھ اُن کاموں کا بھی ذکر کیا ہے جن سے کوئی معتد بہ نتیجہ پیدا نہیں ہوا یا جو بسبب نامساعدت وقت کے ادھورے رہ گئے۔ تاکہ لوگوں کو اچھی طرح معلوم ہو جائے کہ اس شخص کی ساری عمر کس دھن اور کس اُدھیڑ بن میں گذری ہے۔

ہمدردی

ہمدردی کا اصل مادہ ظاہرا انسان اور تمام حیوانات میں یکساں پیدا کیا گیا ہے فرق صرف اس قدر ہے کہ دیگر حیوانات کی ہمدردی۔ اُس حد سے جو اُن کی فطرت میں رکھی گئی ہے کبھی آگے نہیں بڑھ سکتی۔ برخلاف انسان کے کہ کبھی اُس کی ہمدردی ایک چھوٹے سے حلقہ میں محدود رہتی ہے اور کبھی بیرونی اسباب سے وہ نہایت وسیع ہو جاتی ہے۔ لیکن ہمیشہ اسکا تعلق

اول گھر کی چار دیواری سے شروع ہوتا ہے، پھر جس قدر انسان میں بیرونی اسباب سے متاثر ہونے کی قابلیت زیادہ ہوتی ہے۔ اُسی قدر وہ تعلق بڑھتا جاتا ہے۔ سرسید کے واقعات زندگی سے بہ آسانی یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اُن میں ہمدردی کا مادہ اور بیرونی اسباب سے منفعل ہونے کی قابلیت معمولی آدمیوں سے بمراتب بڑھ کر پیدا کی گئی تھی محبت جو کہ ہمدردی کی ماں ہے اُن کی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ محبت کی پہلی سیڑھی خاندان کی محبت ہے۔ سو اس کی شہادتیں اس کتاب میں جا بجا ملیں گی خاندان کے بعد وطن کی محبت ہے۔ سو دلی کے ساتھ جو دل بستگی اُن کو تھی اور جو آخر کو حسرت کے ساتھ بدل گئی تھی۔ اُس کا ثبوت بھی اس کتاب میں متعدد مقامات پر ملے گا اسی وطن کی محبت کا اقتضا تھا جس نے اُن کو اُس اُجڑے دیار کے پُرانے کھنڈروں اور قدیم یادگاروں کی تحقیقات میں بے انتہا مشقتیں اٹھانے پر مجبور کیا اور آئین اکبری کی تصحیح میں جس سے دلی کے افضل ترین بادشاہ کی ایک دھندلی تصویر کا اُجالنا مقصود تھا، اُن سے فوق العادت محنت کرائی۔ لیکن یہ سب کام ایسے تھے کہ اگر سرسید کی کوششیں انھیں کاموں پر ختم ہو جائیں تو شاید اُن کو ایک محب وطن کی خدمات کا درجہ نہ دیا جاتا؛ مگر جب اُن کی آیندہ مسلسل خدمات پر جن کا سلسلہ اُن کے اخیر دم تک برابر جاری رہا۔ نظر کی جاتی ہے تو لا محالہ اقرار کرنا پڑتا ہے کہ اُن کے یہ معمولی کام اُسی طلائی زنجیر کی ابتدائی کڑیاں تھیں جو زمانہ مستقبل میں اُن کی ملکی اور قومی خدمات سے ترتیب پانے والی تھی۔

غدر سے پہلے پہلے حصہ میں جو سرسید کے ہر قسم کے کام تاریخ وار بیان کئے گئے ہیں اُن پر غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس شخص میں جس درجہ کی عملی قوت پیدا کی گئی تھی وہ ان کاموں پر بس کرنے والی نہ تھی جو وہ ابتدائے حال میں وقتاً فوقتاً سرانجام کرتے رہے۔ باوجودیکہ عدالت کا کام۔ جو ان کو سپرد تھا اور جس کو وہ کمال تندہی سے انجام دیتے تھے۔ فی نفسہ ایک تھکا دینے والا کام تھا با ایں ہمہ وہ بعینہ ایک مستسقی کی طرح۔ جس کی پیاس چلّو دو چلّو پانی سے نہیں بجھتی اور وہ کنویں یا دریا کی طرف دوڑتا ہے۔ ہمیشہ کسی بڑے کام کی تلاش میں رہتے تھے۔ غدر سے پہلے۔ جیسا کہ پہلے حصہ میں بیان ہو چکا ہے۔ انھوں نے مختلف قسم کے بہت سے کام سرانجام کئے مگر اُن کی پیاس کسی طرح نہ بجھی آخر وہ وقت آپہنچا جب کہ اُن کی طبیعت کے اصلی جوہر ظاہر ہونے والے تھے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ نے

غدر کا اثر سرسید پر

جیسا کہ سرسید کے کسی دوست کا قول ہے۔ اُن کے دل پر وہ کام کیا جو لوتھر کے دل پر بجلی کے گرنے نے کیا تھا۔ جس طرح سورج کی گرمی سے پانی کا ایک خاص حصہ اپنے حیز طبعی سے بلند ہو جاتا ہے اسی طرح غدر کی آنچ نے سرسید کو اپنے طبقہ کی سطح سے بالاتر کر دیا۔ دلی۔ مراد آباد اور بجنور کے مسلمان خاندانوں کی تباہی اور بربادی دیکھکر جس جوش کے ساتھ ہمدردی کی لہر اُن کے دل میں اُٹھی وہ فی الواقع حیرت انگیز تھی۔ اُس وقت اُن کا حال بعینہٖ اُس شخص کا سا تھا جس کے گھر میں آگ لگ کر گھر کا ایک حصہ جل گیا ہو اور باقی حصوں کے بچانے کے لئے دیوانہ وار اِدھر اُدھر ہاتھ پاؤں مارتا پھرتا ہو۔ انھوں نے خیال کیا کہ جو مسلمان غدر کی روندن میں آ چکے اور جو خاندان بگڑ چکے اُن کو مدد پہنچانی تو اب امکان سے خارج ہے۔ مگر جو باقی ہیں اور جو ہندوستان کی آبادی کا ایک چوتھائی حصہ ہیں اُنکو کس طرح غدر کے آیندہ خوفناک نتیجوں سے بچایا جائے؟ گورنمنٹ تمام ہندوستان کے مسلمانوں سے بدگمان ہو گئی ہے، مسلمان گورنمنٹ کے شدید انتقام اور سخت سزاؤں سے جو غدر کے بعد ظہور میں آئیں۔ اُس کی مہربانی اور شفقت سے بالکل مایوس ہو گئے ہیں۔ جن غلط فہمیوں کے ہندوستانی شکار ہوئے ہیں اُن کی سوتیں بدستور جاری ہیں۔ جس جہالت اور تعصب نے یہاں تک نوبت پہنچائی وہ اسی طرح ہندوستانیوں اور خاص کر مسلمانوں کے سر پر سوار ہے۔ حکمراں قوم مسلمانوں کو دشمنی کی نگاہ سے دیکھتی ہے، انگریزی اخباروں میں برابر مسلمانوں کے برخلاف آرٹکل لکھے جاتے ہیں جن سے انگریزوں کا دل روز بروز مسلمانوں سے زیادہ پھٹتا جاتا ہے، کچہریاں اور دفتر مسلمانوں سے خالی ہوتے جاتے ہیں، فوج میں اُن کی بھرتی موقوف ہو گئی ہے، وہ درباروں میں کم بلائے جاتے ہیں، غرض کہ تمام آثار اس بات پر گواہی دیتے ہیں کہ اب مسلمانوں کا ہندوستان میں عزت اور اعتبار کے ساتھ رہنا غیر ممکن ہے۔

ان تمام باتوں پر نظر کر کے اول اول تو سرسید کا جی چھوٹ گیا تھا یہاں تک کہ اُنھوں نے ہندوستان سے کسی دوسرے اسلامی ملک میں جا کر بود و باش کرنے کا پختہ ارادہ کر لیا تھا مگر آخر کار اُن کو وہ ارادہ فسخ کرنا اور قوم کی آگ میں کودنا پڑا۔ اُس وقت جو کیفیت اُن کے دل پر طاری تھی اُس کا کسی قدر اندازہ اُس اُردو مناجات کے پردرد الفاظ سے ہو سکتا ہے جو ملکہ معظمہ کا اشتہار معافی شائع ہونے کے وقت اُنھوں نے بعد ادائے دوگانہ

شکرالہی کے پندرہ ہزار مسلمانوں کے مجمع میں بمقام مرادآباد پڑھی تھی اور جو اُن کے لکچروں اور اسپیچوں کے مجموعہ میں چھپ کر شائع ہو چکی ہے۔

مدرسہ مرادآباد

الغرض اس مہم کے سر کرنے کے لئے جب کبھی جو تدبیر اُن کے خیال میں گذری اُس کو اُنھوں نے کئے بغیر نہیں چھوڑا معلوم ہوتا ہے کہ اسی زمانہ میں اُن کو یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ جب تک ہندوستان میں مغربی طریقۂ تعلیم عام نہ ہو گا اُس وقت تک رعایا اور گورنمنٹ میں جو منافرت چلی آتی ہے وہ رفع نہ ہو گی۔ چنانچہ مرادآباد میں آتے ہی اُنھوں نے

گورنمنٹ کو انگریزی تعلیم کی رائے

اول ایک اسکول جس کو تعلیم کے میدان میں اُن کا پہلا قدم سمجھنا چاہیئے قائم کیا۔ پھر اُنھیں دنوں میں جیسا کہ پہلے حصہ میں بیان ہو چکا ہے ایک رائے جس میں ورنیکلر اسکولوں پر سخت اعتراض کئے تھے اور گورنمنٹ کو نہایت شد و مد کے ساتھ مشورہ دیا تھا کہ اگر وہ ہندوستان کے ساتھ فی الواقع بھلائی کرنی چاہتی ہے تو اُن کو انگریزی زبان میں تعلیم دے اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں چھاپ کر شائع کی۔ پھر رسالہ اسباب بغاوت کے ذریعہ

رسالہ اسباب بغاوت ہند

سے گورنمنٹ ہند اور پارلیمنٹ کو اُن تمام شکایتوں سے جو از راہ غلط فہمی یا واجبی طور پر گورنمنٹ کی طرف سے ہندوستانیوں کے دلوں میں متمکن تھیں اور ان کے ظاہر ہونے کی کوئی سبیل نہ تھی۔ نہایت دلیری اور صفائی کے ساتھ ظاہر کیا۔

اسی ہمدردی کے جوش میں جو اُس وقت اُن کے دل میں موجزن تھا اُنھوں نے صاحب کلکٹر

---

[1] اسی رسالہ میں جہاں اُنھوں نے ہندوستانیوں کے کونسل میں شریک نہ ہونے کی شکایت کی ہے وہاں اس اعتراض کا جواب۔ کہ ہندوستانی جو جاہل اور بے تربیت تھے کونسل میں کیونکر شریک کئے جا سکتے تھے اس طرح دیا ہے کہ کونسل میں رعایا کے شریک کرنے کا طریقہ ہم نے علیحدہ بیان کیا ہے اس کو ملاحظہ کرنا چاہئے۔ پھر جو خط کہ سرسید نے ولایت سے سید مہدی علی خاں کو لکھے ہیں اُن سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ ولایت ہی میں طریقۂ انتظام سلطنت ہندوستان پر ایک مبسوط کتاب لکھنی چاہتے تھے۔ مگر جب راقم نے بذریعہ تحریر کے اُن سے اس کتاب کا حال دریافت کیا تو اُنھوں نے ایک لمبی تحریر بھیجی تھی جس کا ماحصل یہ تھا کہ اس کتاب کے لکھتے وقت یہ ارادہ تھا کہ انڈیا کونسل کے ممبروں سے بھی ہر ایک پوائنٹ پر اس باب میں گفتگو کی جائے مگر کونسل مذکور کے تمام ممبر انگریزی میں گفتگو کرتے تھے اور میں اردو میں۔ نہ وہ میری بات سمجھتے تھے اور نہ میں اُنکی۔ اس لئے کافی معلومات ملنے کا کوئی سامان میسر نہ آیا۔ ہر ایک ممبر سے گفتگو کرنے کیلئے کرایہ کی گاڑی پر جانا پڑتا تھا اور جب تک گفتگو ہو گاڑی کو باہر کھڑا رکھنا پڑتا تھا اور ان اخراجات کا تحمل ناممکن تھا اسی لئے جو چند یادداشتیں اور مسودے لکھے تھے وہ سب معدوم کر دئے گئے

مراد آباد سے خود درخواست کر کے قحط کا انتظام اپنے ذمہ لیا اور جہاں تک اُن کی دسترس تھی ہندو مسلمانوں کے یتیم بچوں کو مشنریوں کے چنگل سے بچانے میں کوشش کی پھر اسی زمانہ میں جب کہ مسلمانوں کے برخلاف انگریزی اخباروں میں زیادہ بوچھار ہونے لگی تو انھوں نے ایک سہ ماہی رسالہ موسوم بہ لائل محمڈنز آف انڈیا اردو اور انگریزی میں۔ جیسا کہ پہلے حصہ میں بیان ہو چکا ہے۔ نکالنا شروع کیا۔ اسی زمانہ میں جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے انگریزوں کی بدگمانی رفع کرنے کو انھوں نے ایک رسالہ نصاریٰ کے لفظ کی تحقیق پر لکھ کر اردو اور انگریزی میں شائع کیا۔

مراد آباد ہی میں سرسید کو یہ خیال ہوا کہ جو غلط فہمیاں عیسائی ملکوں میں اسلام اور بانیٔ اسلام کی نسبت ابتدائے شیوع اسلام سے آج تک چلی آتی ہیں اور جو تیرہ سو برس تک پکتے پکتے تمام دنیا کے عیسائیوں کی طرح انگریزوں کے نزدیک بھی مثل علوم متعارفہ کے مسلم الثبوت ٹھیر گئی ہیں جب تک وہ رفع نہ ہوں گی۔ اُس وقت تک مسلمان ہمیشہ انگریزوں کی نظروں میں کھٹکتے رہیں گے اور جو تدبیر مسلمانوں کی صفائی کے لئے کی جائے گی وہ اُس دوا کی طرح جو بغیر ازالہ سبب کے کسی مرض کے علاج میں استعمال کی جائے بے سود ثابت ہوگی۔ اگرچہ یہ بہت بڑا کام تھا جس کا بوجھ سید احمد خاں جیسی حیثیت کے آدمی سے اُٹھنا ناممکن معلوم ہوتا تھا لیکن وہ جو مشہور ہے کہ ہمت کا حامی خدا ہوتا ہے جونہیں سرسید کو یہ خیال پیدا ہوا معاً سرکار سے ان کی مدتوں کی چڑھی ہوئی تنخواہ جو غدر کے زمانہ میں بند رہی تھی اور لٹے ہوئے اسباب کا معاوضہ اُن کو مل گیا۔ انھوں نے فوراً اس عظیم الشان کام کی بنیاد مراد آباد ہی میں ڈال دی اور بائیبل کی تفسیر لکھنی اور ساتھ کے ساتھ چھپوانی شروع کر دی جس بنیاد پر اور جس غرض سے سرسید نے اس کتاب کے لکھنے کا ارادہ کیا تھا اور جو اثر اس کے شائع ہونے سے عیسائیوں کے دل پر ہوا اُس کا ذکر ہم پہلے حصہ میں کر چکے ہیں اُس سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ کام خاص کر ہندوستان کے مسلمانوں کے حق میں کس قدر مفید اور نتیجہ خیز تھا۔ لیکن کچھ تو اس لئے کہ مسلمانوں میں اُسکی کچھ قدر نہ ہوئی اور زیادہ تر اس وجہ سے کہ سرسید کی توجہ اُس سے مفید تر اور اعلیٰ تر کاموں کی طرف منعطف ہوگئی اُس تفسیر کی صرف دو جلدیں چھپ کر رہ گئیں۔

غازی پور پہنچکر انھوں نے دوسری طرح سے ہندوستانیوں اور انگریزوں میں میل جول

بڑھانے اور اُس منافرت کے دور کرنے کی۔ جو ۱۸۵۷ء کی بغاوت نے حاکم و محکوم میں پیدا کر دی تھی۔ بنیاد ڈالی۔ اس سے ہماری مراد سائنٹفک سوسائٹی کا قائم کرنا ہے۔ جو اس غرض سے قائم کی گئی تھی کہ لٹریری اور علمی کتابیں انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کرا کر مغربی لٹریچر اور مغربی علوم کا مذاق اہل وطن میں پیدا کیا جائے، علمی مضامین پر سوسائٹی میں لکچر دیئے جائیں، رعایا کے خیالات گورنمنٹ پر اور گورنمنٹ کے اصول حکمرانی رعایا پر ایک ایسے اخبار کے ذریعہ سے ظاہر کئے جائیں جو اُردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں شائع ہوا کرے، ہندو مسلمان اور انگریز تینوں قوموں کے ممبر اُس میں شامل کئے جائیں اور اس طرح قومی مغایرت اور مذہبی تعصبات اور جو جھجک ہندوستانیوں کے دلوں میں انگریزوں کی طرف سے ہے اُس کو آہستہ آہستہ کم کیا جائے۔

سوسائٹی کے نتائج

قطع نظر اُن عام مقاصد کے جن کے لئے یہ سوسائٹی قائم ہوئی تھی اُس سے اور بہت سے ضمنی فائدے نہ صرف شمالی ہندوستان بلکہ ملک کے اکثر حصوں کو پہنچے ہیں، شمالی ہندوستان میں جہاں تک ہم کو معلوم ہے کوئی قومی انسٹیٹیوشن یا قومی مجلس جو ذکر کے قابل ہو اس سوسائٹی سے پہلے قائم نہیں ہوئی تھی۔ پھر ۳۵ برس کے عرصہ میں جس قدر سوسائٹیاں۔ انجمنیں و سبھائیں تمام ملک میں پھیلیں وہ سب اُس کے بعد اور اُسی کی ریس سے قائم ہوئیں اور اسی سوسائٹی کے اخبار نے تمام دیسی اخباروں کا رنگ بالکل بدل دیا، اُن میں بجائے اس کے کہ کچھ سچی اور اکثر بے سروپا بعید از قیاس خبریں درج ہوتی تھیں۔ پولٹکل سوشیل اور علمی و اخلاقی مضامین بھی خبروں کے ساتھ چھپنے لگے اور بجائے اس کے۔ کہ وہ محض دیسیوں کے دل بہلانے کے اوزار تھے۔ اُن کو یہ دن نصیب ہوا کہ گورنمنٹ اُن کی آواز پر کان لگانے لگی۔

اخباروں کی اصلاح

اُردو لٹریچر کی ترقی

پھر اسی سوسائٹی کی درخواست پر جو کہ اُس نے ایڈریس مورخہ ۹ مئی ۱۸۶۶ء میں بحضور سر ولیم میور لفٹننٹ گورنر بمقام علی گڑھ پیش کی تھی ہز آنر نے وعدہ کیا کہ جو کتابیں دیسی زبان میں تصنیف و تالیف یا ترجمہ کی جائیں گی ان میں گورنمنٹ ضرور امداد دیگی۔ چنانچہ ۲۶۔ اگست ۱۸۶۶ء کو یعنی ایڈریس کے پیش ہونے سے ساڑھے تین مہینے بعد گورنمنٹ شمال و مغرب نے وہ انعامی اشتہار جاری کیا جس کا ہندوستان پر ہمیشہ احسان رہے گا اور جس نے تیس برس کے عرصہ میں ملک کو اس سرے سے اُس سرے تک دیسی زبانوں کی تصنیفات سے مالا مال کر دیا۔ اگرچہ انعام سے کچھ زیادہ آدمی مستفید نہیں ہوئے اور اشتہار کی میعاد چند سال بعد گذر گئی لیکن

اس اشتہار کا اثر اُس تمام گروہ پر - جو دیسی زبانوں میں تصنیف و تالیف کی کم و بیش لیاقت رکھتا تھا مگر اُس لیاقت کو کام میں لانا نہیں جانتا تھا - برقی قوت کی طرح دوڑ گیا - انھوں نے اپنی تصنیفات سے ملک کو بھی فائدہ پہنچایا اور وہ ان کے حق تصنیف سے خود بھی فائدہ اٹھانا سیکھ گئے - خصوصاً اردو لٹریچر صرف اسی تحریک کی بدولت جو کہ اشتہار مذکور نے ملک میں عموماً پیدا کر دی تھی تھوڑے عرصہ میں توقع سے بہت زیادہ ترقی کر گیا -

اسی ایڈریس میں جو کہ سر ولیم میور کے حضور میں پیش کیا گیا تھا یہ بھی ظاہر کیا گیا تھا کہ منجملہ اُن کتابوں کے - جو اردو زبان میں سوسائٹی تیار کر رہی ہے - دو کتابیں سید احمد خاں آنریری سکرٹری تیار کرینگے ایک اردو لٹریچر کی تاریخ یا فہرست جسمیں تمام کتابوں کا جو ابتدا سے آج تک چھپی ہیں - نام اُسکے مصنف کا حال - تصنیف کا زمانہ ، طرز بیان اور مختلف مقامات سے اُسکی عبارت کے چند نمونے اور بعض مضامین کا خلاصہ ہوگا - دوسری اردو ڈکشنری - مگر معلوم ہوتا ہے کہ پہلی کتاب کی شروع کرنے کی نوبت نہیں پہنچی - لیکن اردو ڈکشنری جو سرسید نے لکھنی شروع کی تھی اُس کا نمونہ سوسائٹی کے اخبار میں چھپا اور اُس پر بعض یورپین فاضلوں کے عمدہ ریمارکس موجود ہیں - اگرچہ سرسید نے ان دونوں کاموں میں سے کوئی کام پورا نہیں کیا لیکن اس سے اتنی بات ضرور معلوم ہوتی ہے کہ ملک اور قوم کی تمام مقدم ضرورتیں - جن میں سے بعضی ابتک بھی لوگوں کو محسوس نہیں ہوئیں - اس شخص نے اب سے تیس بلکہ چالیس برس پہلے بخوبی محسوس کر لی تھیں - یہاں تک کہ جب کوئی اُن ضرورتوں کا پورا کرنے والا نظر نہ آتا تھا تو باوجود یک سرو ہزار سودا ہونے کے خود ہی اُس کام کے سرانجام کرنے کو کھڑا ہو جاتا تھا -

سرسید کی انتہائی کوشش

مگر درحقیقت یہ سب سوسائٹی کے ضمنی نتائج تھے اور جس بڑے مقصد کے لئے وہ قائم کی گئی تھی اُس کا گھر ابھی بہت دور تھا اور محض سوسائٹی اُس درد کی دوا نہیں ہو سکتی تھی باانیہمہ سرسید نے سوسائٹی کے ترقی دینے میں کوئی دقیقہ کوشش و تدبیر کا فروگذاشت نہیں کیا یہاں تک کہ سالانہ چندہ اور قیمت اخبار کی تعداد دس ہزار آٹھ سو پچاس روپیہ سالانہ تک پہنچ گئی ، ضلع کے رئیسوں کو اُس کی امداد پر آمادہ کیا ، گورنمنٹ کو اُسکی طرف توجہ دلائی ، خود اپنی بساط سے بڑھ کر اُس کو مالی مدد پہنچائی - اُس کی عالیشان عمارت اپنے اہتمام اور نگرانی میں

ہوائی؛ اسکی مستقل آمدنی کے لئے عمدہ عمدہ تدبیریں کیں، لائق لائق آدمی ترجمہ کے کام کے لئے مقرر کئے، قریب چالیس کے چھوٹی بڑی علمی اور تاریخی کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرائیں' غازی پور علی گڈھ بنارس جہاں کہیں رہے سوسائٹی کے اخبار کو اپنے عمدہ مضامین سے برابر مدد پہنچاتے رہے یہاں تک کہ ہندوستان چھوڑنے کے بعد بھی سوسائٹی کی دھن برابر لگی رہی۔ چنانچہ ولایت جاتے ہوئے جو خط کہ انھوں نے مولوی سید مہدی علیخاں کو عدن سے بھیجا تھا اس میں لکھتے ہیں کہ "مجھکو علاوہ مفارقت احباب کے یہ رنج بڑا ہے کہ میرے پیچھے لوگ عقل کے دشمن سائنٹفک سوسائٹی کی بڑی مخالفت کریں گے اور کوئی درجہ سعی کوشش کا واسطے شکست کر دینے سوسائٹی کے باقی نہ رکھیں گے پس میں چاہتا ہوں کہ آپ سوسائٹی کی طرف زیادہ متوجہ ہوں اور اسکے سنبھالنے اور ممبروں کے بڑھانے میں زیادہ کوشش فرمائیں"

غازی پور کا مدرسہ

سوسائٹی قائم کرنے کے بعد جب تک کہ سرسید اپنی منزل مقصود تک نہیں پہنچے جو کام ملک اور قوم کی بھلائی کا اُن کو معلوم ہوا اُسی ذوق و شوق اور سرگرمی کے ساتھ جو اُنکی جبلت میں داخل تھا اُس کو سرانجام کیا۔ ۱۸۶۴ء میں انھوں نے غازی پور میں محض قومی چندہ سے بڑی دھوم دھام کے ساتھ ایک مدرسہ قائم کیا جس کی اُٹھان مدرستہ العلوم کی ابتداء سے کچھ ہی کم سمجھنی چاہیئے اور جو اب تک وکٹوریا اسکول کے نام سے غازی پور میں جاری ہے پھر ۱۸۶۶ء میں اُنھوں نے علی گڈھ آکر برٹش انڈین ایسوسی ایشن۔ جس نے اب

برٹش انڈین ایسوسی ایشن

نیشنل کانگریس کی صورت میں جون لیا ہے قائم کی جسکا مقصد یہ تھا کہ ہندوستانی اپنے حقوق کی خواہش اور اپنے دردِ دل اور اپنی شکایتوں کے اظہار کے لئے براہ راست پارلیمنٹ اور گورنمنٹ ہند سے تعلق پیدا کریں اگرچہ جس مقصد کیلئے یہ ایسوسیشن قائم ہوئی تھی۔ وہ اس سبب سے کہ ملک میں اُسکے چلانیکی قابلیت نہ تھی اور سرسید۔ جو اُس کے بانی مبانی تھے۔ وہ یک انار و صد بیمار کے مصداق تھے۔ حاصل نہ ہوا' مگر اس کے ذریعہ سے اکثر مفید تحریکیں کی گئیں اور اُن میں سے اکثر میں کامیابی ہوئی، جیسے مسافران ریل کی تکالیف کی شکایت، کتابوں کے محصول میں تخفیف کی درخواست ورنیکلر یونیورسٹی قائم کرنے کی سلسلہ جنبانی وغیرہ۔ پھر ۱۸۶۶ء میں بمقام بنارس اُن کو یہ خیال ہوا کہ ہومیوپیتھک سے زیادہ کوئی طریقہ علاج کا ملک کے لئے مفید نہیں ہے۔ چنانچہ انھوں نے۔ جہاں تک ان کی قدرت میں تھا اُس کی حمایت اور ترویج و اشاعت میں کوشش کی؛ پھر ۱۸۶۶ء میں سرسید ہی کی سلسلہ جنبانی سے تمام اضلاع شمال مغرب

میں تعلیمی کمیٹیاں مقرر کی گئیں جن میں ہر ضلع کے زمینداروں کو تعلیم کے انتظام نگرانی اور اخراجات پر بحث اور گفتگو کرنے کا اختیار دیا گیا۔ پھر بنارس ہی میں اُنھوں نے اردو زبان اور فارسی خط کی حمایت میں۔ جو بظاہر خاص مسلمانوں کی طرف داری کا تھا مگر درحقیقت تمام شمالی ہندوستان کی بھلائی کا کام تھا، بے انتہا کوشش کی۔ اس کے سوا بنارس ہی میں اُنھوں نے احکام طعام اہل کتاب پر ایک رسالہ اس غرض سے لکھا کہ مسلمان جنکا مذہب انگریزوں کے ساتھ کھانا کھانے سے مانع نہیں ہے، بلکہ محض رسم و رواج کی قید نے انکو آجتک انگریزوں سے دور دور رکھا ہے۔ اُنکی یہ جھجک اور رکاوٹ جاتی رہے۔ اُن کو حکمراں قوم کے ساتھ زیادہ میل جول کا موقع ملے، ہر ایک قوم دوسری قوم کے اصلی خیالات سے بلا واسطہ اطلاع حاصل کرے اور بدگمانی اور خوف صفا اور اطمینان کے ساتھ بدلجائے۔ اگرچہ اُس وقت اس رسالہ پر بہت سے دے ہوئی اور سرسید کو اُس کے لکھنے پر جیسی کہ امید تھی سب کچھ کہا گیا۔ مگر آخر کار اُس کا یہ نتیجہ ہوا کہ مسلمانوں کے ایک جم غفیر نے جن کی انگریزوں تک رسائی اور اُن کے ساتھ ربط ضبط تھا یہ آن بالکل توڑ ڈالی۔

اس رسالہ کے علاوہ سرسید نے اور طرح طرح سے انگریزوں اور مسلمانوں میں موانست پیدا کرنے کی کوشش کی۔ مسلمانوں کی جھجک نکالنے کے لئے اُنھوں نے اولاً خود انگریزوں کے ساتھ معاشرت اور مواکلت اختیار کرکے قوم کے واسطے ایک مثال قائم کی اور رفتہ رفتہ اپنے دوستوں کی سوسائٹی میں اس طریقہ کو وسعت دے کر اُس کا اثر دور دور تک پھیلا دیا۔ تہذیب الاخلاق اور انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں اُنھوں نے بہت سے آرٹیکل اسی مضمون پر لکھے۔ انگریزوں کو اُنھوں نے سب سے پہلے نہایت شد و مد کے ساتھ رسالہ اسباب بغاوت میں متنبہ کیا تھا کہ اُن کو ہندوستانیوں کے ساتھ دوستی اور صداقت کا برتاؤ رکھنا ضرور ہے۔ اس کے بعد ہمیشہ اپنی تحریروں اور پبلک اسپیچوں میں اس بات کی تمنا ظاہر کرتے رہے کہ ہمارے اور انگریزوں کے سوشیل تعلقات برادرانہ اور دوستانہ ہونے چاہئیں نہ حاکم محکومانہ۔ اس موقع پر ہم سرسید کی ایک مختصر اسپیچ جو اُنھوں نے علی گڈھ میں ایک ڈنر پر مسٹر بلنٹ ممبر پارلیمنٹ کا جام صحت پروپوز کرتے وقت ۱۸۸۴ء میں کی تھی اور جس میں یہی تمنا خاص مسلمانوں کی طرف سے ایک لطیف پیرایہ میں ظاہر کی گئی تھی۔ بجنسہ نقل کرتے ہیں۔ سرسید نے کہا کہ "ہم کو نہایت خوشی ہے کہ

مسٹر بلنٹ نے ہمارے ملک کو دیکھا۔ ہماری قوم کے مختلف گروہوں سے ملے۔ ہم کو امید ہے کہ انھوں نے ہر جگہ ہماری قوم کو تاج برطانیہ کا لائل اور کوئن وکٹوریا امپرس اوف انڈیا کا دلی خیر خواہ پایا ہوگا۔ اگر ہماری کسی آرزو سے وہ واقف ہوئے ہوں گے تو وہ صرف انگریزوں کی طرف سے سمپتھی کی خواہش ہوگی۔ جس کی نسبت بلاشبہ میں کہوں گا کہ ہماری وہ خواہش پورے طور پر پوری نہیں ہوئی۔"

"مسلمانوں کی یہ خواہش۔ کہ مسلمانوں میں اور انگلش نیشن میں سمپتھی قائم ہو۔ کوئی عجیب بات نہیں ہے۔ کبھی کوئی ایسا زمانہ نہیں گذرا کہ ہم مسلمانوں میں اور انگلش نیشن میں کوئی معرکہ ایسا گذرا ہو کہ ہم میں اور ان میں کوئی بنائے مخاصمت قائم ہوئی ہو۔ ان کو ہم سے بدلا لینے کی رغبت ہو، اور ہم کو ان کے عروج اقبال سے رشک و حسد ہو۔ کہاں وہ سیڈ کے زمانہ میں۔ جو ایک زمانہ ہر قسم کی عداوتوں کے برانگیختہ ہونے کا تھا۔ انگلش کو بہت ہی کم ان معرکوں سے تعلق تھا۔"

"یہ بات سچ ہے کہ ہم نے ہندوستان میں کئی صدیوں تک شاہنشاہی کی، یہ بھی سچ ہے کہ ہم اپنے باپ دادا کی شان و شوکت کو بھول نہیں سکتے۔ لیکن اگر یہ خیال کسی شخص کے دل میں ہو کہ ہم مسلمانوں کو انگلش نیشن کے ساتھ اس وجہ سے کہ انھوں نے ہماری جگہ ہندوستان کی حکومت حاصل کی۔ کچھ حسد و رشک ہے تو وہ خیال محض بے بنیاد ہوگا۔ وہ زمانہ جس میں انگریزی حکومت ہندوستان میں قائم ہوئی۔ ایسا زمانہ تھا کہ بیچاری انڈیا بیوہ ہو چکی تھی۔ اسکو ایک شوہر کی ضرورت تھی اس نے خود انگلش نیشن کو اپنا شوہر بنانا پسند کیا تھا تاکہ گاسپل کے عہد نامہ کے مطابق وہ دونوں مل کر ایک تن ہوں۔ مگر اس وقت اس پر کچھ کہنا ضرور نہیں ہے کہ انگلش نیشن نے اس پاک وعدہ کو کہاں تک پورا کیا۔"

"ہندوستان میں ہم نے اپنے ملک کی بھلائی کے واسطے انگلش حکومت قائم کی۔ ہندوستان میں انگلش حکومت قائم ہونے میں اور وہ مثل قینچی کے دو پھلوں کے شریک تھے کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ان دونوں میں کس نے زیادہ کام کیا ہے۔ پس ہم مسلمانوں کی نسبت ایسا خیال کرنا کہ ہم انگلش حکومت کو ایک ناگواری سے دیکھتے ہیں محض ایک غلط خیال ہوگا۔"

انگلش نیشن ہمارے مفتوحہ ملک میں آئی، مگر مثل ایک دوست کے نہ بطور ایک دشمن کے ہماری خواہش ہے کہ ہندوستان میں انگلش حکومت صرف ایک زمانہ دراز تک ہی نہیں بلکہ اٹرنل ہونی چاہیے۔ ہماری یہ خواہش انگلش قوم کے لئے نہیں ہے بلکہ اپنے ملک کے لئے ہے

ہماری یہ آرزو انگریزوں کی بھلائی یا اُن کی خوشامد کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اپنے ملک کی بھلائی وبہتری کے لئے ہے۔ پس کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم میں اور ان میں سمپیتھی نہ ہو۔ سمپیتھی سے میری مراد پولٹیکل سمپیتھی نہیں ہے۔ پولٹیکل سمپیتھی تانبے کے برتن پر چاندی کے ملمع سے زیادہ کچھ وقعت نہیں رکھتی۔ اس کا اثر دونوں (فریق) کے دلوں میں کچھ نہیں ہوتا۔ ایک فریق جانتا ہے کہ وہ تانبے کا برتن ہے دوسرا فریق سمجھتا ہے کہ وہ جھوٹے ملمع کی قلعی ہے۔ سمپیتھی سے میری مراد برادرانہ ودوستانہ سمپیتھی ہے۔

سرسید کہتے تھے کہ "یہ اسپیچ جب اخبار میں سر الفرڈ لائل لفٹننٹ گورنر کی نظر سے گذری اور اُس کے بعد میں اُن سے ملا تو انھوں نے فرمایا کہ تم نے یہ عجیب طرح کی اسپیچ دی تھی، میں نے کہا شاید عجیب ہو مگر غلط نہیں تھی"۔ غالباً ہز آنر کو اسپیچ مذکور کے اس فقرہ پر تعجب ہوا ہوگا کہ "انگلش حکومت کے قائم ہونے میں ہم اور وہ مثل [illegible] کے دو پلڑوں کے شریک تھے"۔ شاید عام لوگ سرسید کی اس تلمیح سے آگاہ نہ ہوں، اس لئے اس کا جو مطلب ہم سمجھے ہیں اُس کو مختصر طور پر بیان کرتے ہیں۔ غالباً سرسید نے اس فقرہ میں ہندوستان کے اُن تاریخی واقعات کی طرف اشارہ کیا ہے جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ممالک ہندوستان کی ابتدائی انگریزی فتوحات اور سرکار کمپنی کے رعب وداب اور اُس کی پالیسی کو مسلمان امیروں اور حکمرانوں کی تائید اور آشتی سے بہت مدد ملی ہے، جیسے پلاسی کی لڑائی میں میر جعفر کا بمقابلہ سراج الدولہ کے لارڈ کلائیو کا ساتھ دینا، شاہ عالم کا مرہٹوں کے مقابلہ کے وقت اپنے تئیں لارڈ لیک کی حفاظت میں سپرد کر دینا، اور نظام حیدرآباد کا لارڈ ولزلی کی صلاح ماننا اور تمام فرانسیسیوں کی فوج کو اپنی قلمرو سے یکقلم موقوف کرنا وغیرہ وغیرہ۔

نمائش آگرہ کے دربار میں یورپین افسروں سے جھگڑا

ایک اور موقع پر اسی سودا کے جوش میں کہ ہندوستانیوں کے ساتھ انگریزوں کا برتاؤ اچھا نہیں ہے، سرسید ایک ایسی جرأت کر بیٹھے جس کی بدولت آخر کار اُن کو گورنمنٹ سے معافی مانگنی پڑی۔ فروری ۱۸۶۷ء میں جب کہ ڈرمنڈ صاحب اضلاع شمال مغرب میں لفٹننٹ گورنر تھے۔ آگرہ میں ایک بہت بڑی نمائش ہوئی تھی اور سرسید بھی منتظم کمیٹی کے ایک ممبر تھے۔ اس کمیٹی میں ان کے سوا اور بھی چند معزز ہندوستانی انگریزوں کے ساتھ شامل تھے اور تمام ممبروں کو یکساں اختیارات دئے گئے تھے۔ کسی طرح کا تفاوت انگریزوں اور ہندوستانی ممبروں میں نہ تھا۔ نمائش کی اخیر تاریخ دربار کے لئے

مقرر تھی اور دربار کا انتظام مسٹر پالک کلکٹر ضلع آگرہ کے سپرد تھا۔ صاحب موصوف نے نمائش گاہ کے قریب ایک میدان میں درباریوں کے لئے کرسیاں اس طرح بچھوائیں کہ جو مقام کسی قدر بلند تھا کرسیوں کی ایک لین تو اس مقام پر لگائی اور اس پر ایک شامیانہ بھی جس سے دھوپ کی روک ہو کھچوا دیا۔ اور دوسری لین اس کے متوازی۔ مگر اس سے ذرا نیچی جگہ پر لگوائی جس پر شامیانہ وغیرہ کچھ نہ تھا۔ سرسید نے اکثر ہندوستانی درباریوں کو اس بات کا یقین دلایا تھا کہ اس موقع پر گورنمنٹ کو یہ منظور ہے کہ انگریزوں اور ہندوستانیوں میں کچھ تمیز نہ رکھی جائے اور سب کے ساتھ یکساں برتاؤ کیا جائے۔ درباریوں میں سے ایک معزز ہندوستانی شاید دربار سے ایک دن پہلے چلتے پھرتے دربار کے میدان کی طرف جا نکلے اور اتفاق سے اوپر کی لین میں ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ ایک بابو نے آکر ان کو وہاں سے اٹھا دیا اور کہا کہ آپ کے واسطے نیچے کی لین لگائی گئی ہے وہ وہاں سے سیدھے سرسید کے پاس آئے اور حال بیان کیا اور یہ کہا کہ آپ کا خیال انگریزوں اور ہندوستانیوں کی مساوات کے باب میں صحیح نہ تھا۔ سرسید کو نہایت تعجب اور اس کے ساتھ سخت ندامت ہوئی کہ جو کچھ لوگوں کو یقین دلایا گیا تھا وہ غلط ہو گیا۔ یہ اسی وقت دربار کے میدان میں پہنچے اور قصداً اوپر کی لین میں ایک کرسی پر جا بیٹھے۔ بابو نے آکر ان کو بھی ٹوکا یہ وہاں سے اٹھ کھڑے ہوئے اور مسٹر جیمس سمن سکرٹری گورنمنٹ سے جو وہیں دربار کے ٹکٹ بانٹ رہے تھے سارا حال بیان کیا۔ انھوں نے بھی اس امر کو ناپسند کیا اور سرسید سے کہا کہ آپ اس کا ذکر مسٹر پالک سے کریں اتنے ہی میں مسٹر تھارن ھل صدر بورڈ کے حاکم اعلیٰ وہیں چلے آئے۔ جب ان کو یہ قصہ معلوم ہوا تو وہ سرسید پر نہایت افروختہ ہوئے اور کہا کہ تم لوگوں نے غدر میں کونسی برائی تھی جو ہمارے ساتھ نہیں کی؟ اب تم یہ چاہتے ہو کہ ہمارے اور ہماری عورتوں کے ساتھ پہلو بہ پہلو دربار میں بیٹھو۔ سرسید نے کہا اسی سبب سے تو یہ ساری خرابیاں پیدا ہوئیں کہ آپ لوگ ہندوستانیوں کو ذلیل سمجھتے رہے۔ اگر ان کو اس طرح ذلیل نہ سمجھا جاتا تو کیوں یہاں تک نوبت پہنچتی۔ تھارن ھل صاحب اور زیادہ برہم ہوئے۔ آخر مسٹر جیمس سمن نے سرسید کو سمجھایا کہ اس گفتگو سے کچھ فائدہ نہیں۔ سرسید وہاں سے اپنے ڈیرے میں چلے آئے اور دربار میں شریک نہیں ہوئے۔ لیکن یہ خبر نواب لفٹنٹ گورنر کو پہنچی تو انھوں

نے بھی دربار کی ترتیب اور انتظام کو ناپسند کیا اور یہ حکم دیا کہ اس وقت زیادہ تبدیلی تو نہیں ہو سکتی لیکن ہر ضلع اور قسمت کے حکام کو چاہئے کہ اپنے اپنے ضلع اور قسمت کے ہندوستانی رئیسوں اور افسروں کے ساتھ نیچے کی بین میں بیٹھیں۔ دربار کے بعد جو یوروپین افسر سرسید سے ملتا تھا اس واقعہ کو پوچھتا تھا اور جب وہ بیان کرتے تھے تو بگڑتا تھا۔ لاچار انھوں نے وہاں زیادہ ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا اور رات کو وہاں سے سوار ہو کر علی گڈھ چلے آئے۔ مگر چند روز بعد لوکل گورنمنٹ کے سکرٹری کی چٹھی سرسید کے نام پہنچی جس میں اُن سے اس بات کا جواب طلب کیا گیا تھا کہ تم دربار میں کیوں نہیں شریک ہوئے؟ اور بلا اجازت کس لئے علی گڑھ چلے گئے؟ سرسید نے آگرہ سے بلا اجازت چلے آنے کا سبب لکھ بھیجا اور دربار میں شریک نہ ہونے کی معافی چاہی۔ اس کے بعد پھر وہاں سے کچھ بازپرس نہیں ہوئی۔ مگر اس نمائش سے پہلے جو لارڈ لارنس مرحوم وائسرائے و گورنر جنرل نے آگرہ میں دربار کیا تھا وہاں سرسید کو ایک طلائی تمغہ دئے جانے کا حکم دیا تھا اور وہ تمغہ اب تیار ہوا تھا چونکہ سرسید نمائش کے دربار میں شریک نہیں ہوئے تھے اس لئے نواب لفٹنٹ گورنر نے وہ تمغہ صاحب کمشنر قسمت میرٹھ کو دیدیا تاکہ وہ میرٹھ جاتے ہوئے علی گڑھ میں سرسید کو اپنے ہاتھ سے تمغا پہنانے جائیں صاحب کمشنر جب علی گڑھ کے ریلوے اسٹیشن پر پہنچے تو سرسید حسب الحکم وہاں موجود تھے اُن کو ایک طرف لے جاکر بسبب اُس رنجش کے جو تھارن ہل صاحب سے انھوں نے سخت گفتگو کی تھی یہ کہا کہ اگرچہ میں اپنے ہاتھ سے تم کو تمغا پہنانا پسند نہیں کرتا لیکن گورنمنٹ کے حکم سے مجبور ہوں۔ یہ کہکر سرسید کو تمغا پہنانا چاہا۔ سرسید نے یہ کہکر کہ میں بھی گورنمنٹ کے حکم سے مجبور ہوں اُن کے آگے سر جھکا دیا اور تمغا پہنکر چلے آئے ہم نے معتبر ذریعے سے سنا ہے کہ انھیں دنوں میں گورنمنٹ کا ارادہ سب ججوں کی تنخواہ میں معقول اضافہ کرنے کا تھا مگر سرسید کی اس کارروائی سے وہ اضافہ مدت تک ظہور میں نہیں آیا اور سرسید کے ساتھ اور لوگ بھی جو اُن کے ہم عہدہ تھے۔ اُس سے محروم رہے۔ نواب محسن الملک کا بیان ہے کہ اس واقعہ کے بہت دن بعد مسٹر پالک سے جب کہ وہ کمشنر تھے ایک دن سرسید کا ذکر آیا انھوں نے نہایت چیں بہ جبیں ہو کر کہا کہ وہ بڑا مفسد اور باغی ہے اور آگرہ کی نمائش گاہ کا وہ تمام قصہ بیان کیا۔ میں نے یہ حال سید صاحب کو لکھ بھیجا

انھوں نے مسٹر پالک کو ایک مفصل چِٹھی لکھکر بھیجی جس میں اصل منشا اپنی اُس جسارت کا بیان کیا تھا۔ اس چِٹھی کے آنے کے بعد پھر مسٹر پالک اُن کی طرف سے بالکل صاف ہوگئے تھے۔

الغرض سرسید کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ ہندوستانیوں کے ساتھ کوئی برتاؤ انگریزوں کی طرف سے ایسا نہ ہو جو ہندوستانیوں کی ذلت کا باعث ہو۔ خصوصاً مسلمانوں کی جانب سے انگریزوں کی بدگمانی رفع کرنے میں انھوں نے کوئی دقیقہ کوشش و تدبیر کا فروگذاشت نہیں کیا۔ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کی سالانہ جلدوں میں شاید ہی کوئی جلد ایسی نکلے جس میں ان کے متعدد آرٹیکل اس مضمون پر لکھے ہوئے موجود نہوں۔ خصوصاً ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب کا ریویو۔ جو انھوں نے ۱۸۷۱ء میں بمقام بنارس لکھا تھا اور جس کا مفصل ذکر پہلے حصہ میں ہو چکا ہے۔ سرسید کی ان جلیل القدر خدمتوں سے سے جن کے شکر سے ہندوستان کے تمام مسلمان عموماً اور وہابی مسلمان خصوصاً کبھی عہدہ برآ نہیں ہوسکتے چونکہ اس ریویو میں سرسید نے اپنے وہابی ہونے کا اقرار کیا تھا۔ اس لئے انگریزوں کی بدگمانی وہابیوں کی نسبت بالکل جاتی رہی تھی۔ منشی غلام نبی خاں مرحوم کا بیان ہے کہ "غالباً ۱۸۷۱ء میں جب مسٹر گریفن ڈپٹی کمشنر لاہور نے منشی قادر بخش خاں تحصیلدار چونیاں کو ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس کی رپورٹ پر بجرم وہابیت زیر مواخذہ کرکے صاحب فنانشل کمشنر کے پاس بھیجا اور کرنل ڈیوس کو۔ جو اُس وقت کمشنر تھے۔ یہ معلوم ہوا کہ قادر بخش خاں کا وہی مذہب ہے جو سید احمد خاں کا ہے تو انھوں نے فنانشل کمشنر سے سفارش کرکے ان کی تبدیلی قصور میں کرا دی۔ اس کے بعد جب ان کی تبدیلی قصور سے ہونے لگی تو مسٹر ابراہن اسسٹنٹ کمشنر قصور نے ان کو جو سرٹیفکٹ بغرض صفائی کے دیا تھا اُس میں بڑا ثبوت اُن کی صفائی کا یہ لکھا تھا کہ یہ شخص وہی مذہب رکھتا جو سید احمد خاں صدر الصدور اضلاع شمال و مغرب کا مذہب ہے اور اس لئے اس کی نسبت بدخواہی سرکار کا اشتباہ محض لغو ہے"

[حاشیہ: سرسید کا اپنے وہابی ہونے کا اقرار]

ولایت کا سفر جو سرسید نے ۱۸۶۹ء میں کیا اگرچہ بظاہر اس غرض سے معلوم ہوتا ہے کہ بیٹے کو تعلیم کے لئے انگلستان لے جاکر اُس کے آرام و آسائش و تعلیم و تربیت کا انتظام اپنی آنکھوں کے سامنے کریں۔ اور اُس کی طرف سے ہر طرح کا اطمینان حاصل کرکے واپس چلے آئیں۔ مگر جن شغلوں اور جن منصوبوں میں انھوں نے سترہ مہینے لندن میں بسر کئے

[حاشیہ: سفر ولایت کی اصلی غرض]

اُن سے صاف پایا جاتا ہے کہ بیٹے کی تعلیم کا صرف ایک بہانہ تھا ورنہ اصل منشا اس سفر دور دراز کا قوم کی خیر خواہی اور اسلام کی حمایت کے جوش کے سوا کچھ نہ تھا اُس وقت اسلام اور مسلمانوں کی لگن میں سرسید کا حال بعینہ اس شعر کا مصداق تھا؎

ترکتُ للناس دنیاھم و دینھم شغلاً بحبک یا دینی و دنیائی

مذہب اسلام کی خدمت جو کچھ کہ وہاں اُن سے بن آئی اُس کا ذکر ہم اگلے عنوان میں کرینگے یہاں صرف یہ دکھانا منظور ہے کہ اس سفر کے آغاز سے لیکر انجام تک برابر اُن کو مسلمانوں کی لو کس قدر لگی رہی ہے۔

(ان کا سفرنامہ اور قومی ہمدردی) اُن کے سفرنامہ سے جس کا نمونہ پہلے حصہ میں دکھایا جا چکا ہے اور اُن کے آرٹیکلوں سے جو وقتاً فوقتاً وہ سوسائٹی کے اخبار میں چھپنے کے لیے ولایت سے ہندوستان میں بھیجتے رہے۔ ہر شخص بآسانی سمجھ سکتا ہے کہ ہندوستان سے جاتے وقت جو حالت کہ وہ مسلمانوں کی دیکھ گئے تھے اُس سے اُنکے دل پر عجب بے چینی اور قلق کا عالم تھا،

(پرائیوٹ خطوط اور قومی ہمدردی) خصوصاً اُن کے دل کی کیفیت اور تلملائی اُن پرائیوٹ خطوں کے دیکھنے سے بالکل آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے جو اُنھوں نے اپنے ہمدرد اور دلی دوست سید مہدی علی خاں کو ولایت سے بھیجے ہیں اور جو اس کتاب کے لکھتے وقت مخدومی مولوی سید زین العابدین خاں نے راقم کو عنایت کیے ہیں صاف پایا جاتا ہے کہ ایک شخص قوم کے سوز مین انگاروں پر لوٹ رہا ہے۔ کبھی یورپ کی ترقی کے مقابلہ میں مسلمانوں کی پستی و تنزل کا اندازہ کرکے نہایت مایوسی کے الفاظ لکھتا ہے، کبھی کسی انگریزی اخبار میں کوئی مضمون مسلمانوں کے برخلاف دیکھ کر پیچ و تاب کھاتا ہے۔ کہیں یہ صلاح دیتا ہے کہ ہندوستان میں کوئی انجمن مسلمانوں کی طرز معاشرت کی اصلاح کے لیے جلد قائم کرنی چاہیے۔ کبھی اسی غرض سے کوئی قومی اخبار یا میگزین ہندوستان میں جاری کرنے کا ارادہ ظاہر کرتا ہے، کبھی انگریزی میں ایسی کتابیں لکھوانے پر کمر باندھتا ہے جن میں یورپ کے مورخوں کے اُن بیجا اعتراضات کا جواب دیا جائے۔ جو اُنھوں نے مسلمان بادشاہوں یا خلیفوں پر وارد کیے ہیں اور جنکا اثر ہندوستان کے مسلمانوں کی پولٹکل حالت پر بہت بُرا پڑتا ہے۔ اور اس کام کے لیے ہندوستان سے چندہ

۱؎ شاعر اپنے محبوب کی طرف خطاب کرکے کہتا ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ لوگوں کو اُن کی دُنیا اور اُنکا دین مبارک ہو۔ میرا تو دین بھی تو ہی ہے اور دُنیا بھی تو ہی ہے ۱۲

طلب کرتا ہے کبھی ایسی کتابیں لکھوانے کا ارادہ کرتا ہے جنسے مسلمانوں کو اپنی گذشتہ عظمت کا خیال پیدا ہو اور اُن کو سلف کی ترقی اور اپنے تنزل کا اندازہ کرنے سے غیرت آئے، کبھی کسی ہندوستان کے مسلمان کے اعزاز کی خبر سُنکر نہایت خوشی ظاہر کرتا ہے۔ اور کبھی کسی ایسے قانون کے نافذ ہونے پر جس سے ہندوستانیوں کے حقوق کو صدمہ پہنچنے کا اندیشہ ہو افسوس کرتا ہے۔ یہاں ہم چند فقرے مذکورہ بالا خطوں میں سے ناظرین کی اطلاع کے لیے بطور نمونہ کے نقل کرتے ہیں۔

ایک خط میں اُس عربی مدرسہ کا۔ جو دلی میں منشی امو جان مرحوم کے مکان میں قایم کیا گیا تھا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں "جانِ من و جانِ من! ایسے ایسے مدرسوں سے کچھ فائدہ نہیں ہے۔ افسوس ہے کہ مسلمان ہندوستان کے ڈوبے جاتے ہیں اور کوئی اُن کا نکالنے والا نہیں ملتے افسوس! امرت تھوکتے ہیں اور زہر نگلتے ہیں۔ ہائے افسوس ہاتھ پکڑنے والے کا ہاتھ جھٹک دیتے ہیں اور مگر کے مونہہ میں ہاتھ دیتے ہیں۔ اے بھائی مہدی کچھ فکر کرو اور یقین جان لو کہ مسلمانوں کے ہونٹوں تک پانی آگیا ہے۔ اب ڈوبنے میں بہت ہی کم فاصلہ باقی ہے۔ اگر تم یہاں آتے تو دیکھتے کہ تربیت کس طرح ہوتی ہے؟ اور تعلیمِ اولاد کا کیا قاعدہ ہے؟ اور علم کیونکر آتا ہے؟ اور کس طرح پر کوئی قوم عزت حاصل کرتی ہے۔ انشاء اللہ تعالےٰ میں یہاں سے واپس آن کر سب کچھ کہونگا اور کرونگا، مگر مجھ کا فرمردود، گردن مروڑی ہوئی مرغی کھانے والے، کفر کی کتابیں چھاپنے والے کی کون سنے گا"

ایک اور خط میں اس طرح لکھتے ہیں "جس کتاب[1] کے چھاپہ ہونے کا اشتہار میں نے بھیجا تھا وہ تمام ہوگئی ہفتہ یا دو ہفتہ کے بعد اُس کے نسخے آپ کے پاس بھیجونگا، آپ دیکھیں گے کہ مصنف نے کیا انصاف اور کیسا سچ اختیار کیا ہے، گو بعض خیالات اُس کے ہمارے خیالات کے مطابق نہوں۔ وہ مسلمان نہیں ہے انگریز ہے۔ جب آپ اُس کی کتاب دیکھیں گے تو جانیں گے کہ وہ انگریز ہزار درجہ مسلمانوں سے بہتر ہے"

---

[1] یہ اُس کتاب کا ذکر ہے جو جان ڈیون پورٹ نے اسلام کی حمایت میں لکھی تھی اور جس کو لندن میں کوئی پبلشر نہیں چھاپتا تھا مگر سرسید نے وہاں پہنچکر اور اپنے روپیہ سے اُس کو چھپوا کر ہندوستان میں بھیجا اور یہاں دو شخصوں نے اُس کے الگ الگ ترجمے کیے۔ اگرچہ ڈیون پورٹ کی انگلستان میں کچھ وقعت نہ تھی اور اُس کی کتاب میں اور مصنفوں کے اقوال نقل کرنیکے سوا اور کچھ نہ تھا مگر چونکہ سرسید نے اس سے پہلے کسی یوروپین مصنف کی ایسی تحریر جسمیں اسلام کی اسقدر حمایت کی گئی ہو نہیں دیکھی تھی اس لیے اُن کو اسکے شایع کرنیکا خیال ہوا ۱۲

"اب ایک اور بات ضروری ہے جو لکھتا ہوں۔ انگریزوں نے مسلمان بادشاہوں اور مسلمان حکومتوں کی تاریخیں نہایت ناانصافی اور تعصب سے لکھی ہیں اور کوئی برائی نہیں ہے جو مسلمانوں کی بابت منسوب نہ کی ہو۔ ہماری قوم کے جوان لڑکے انگریزی میں انھیں تاریخوں کو پڑھتے اور دیکھتے ہیں جس سے بڑا نقص پیدا ہوتا ہے اور جو بات کہ ازراہ ناانصافی اور تعصب کے مسلمانوں کی بابت لکھی گئی ہے اس کو وہ سچ اور واقعی سمجھتے ہیں۔ اس لیے اس قسم کی انگریزی کتابوں کا پیدا ہونا جن میں مسلمانوں کا حال نہایت سچائی اور انصاف سے لکھا گیا ہو نہایت مفید بلکہ نہایت ضروری ہے"

"دو بڑے واقعے دنیا میں ہوئے ہیں جن سے مسلمانوں کو نہایت بڑا تعلق ہے، ایک واقعہ فتح اندلس کا ہے جس میں سات سو برس تک مسلمانوں کی عیسائیوں پر حکومت رہی۔ اور جو انصاف اور تعلیم و تربیت مسلمانوں نے اس قوم کی کی نہایت ہی عجیب اور قابل فخر ہے۔ دوسرا واقعہ کروسیڈ کا ہے یعنی آٹھ لڑائیاں جو مسلمانوں اور عیسائی قوموں سے بیت المقدس پر ہوئیں۔ میں نے اُن عالم صاحب (یعنی جان ڈیون پورٹ) سے کہا ہے کہ ان دونوں واقعوں کی دو مختصر تاریخیں وہ لکھ دیں اور اُن کی رائے میں جو سچ اور انصاف ہو اور جس کا قصور اُن کی منصفانہ رائے میں ہو سب لکھیں۔ اور چونکہ وہ نہایت منصف اور بہت بڑا عالم ہے اور جرمن لیٹن فرنچ گریک زبان جانتا ہے اور سب مصنفوں کی کتابیں پڑھکر رائے قایم کرتا ہے صرف انگریزی کتابوں پر اُس کو بھروسا نہیں ہے اس لیے امید ہے کہ جیسی بلا تعصب اُس نے یہ کتاب (یعنی اپالوجی) لکھی ہے ویسی ہی وہ بھی لکھیگا۔ ان دونوں کتابوں کے چھپنے اور تیار ہونے میں آٹھ سو روپیہ تخمیناً صرف ہوگا، فی کتاب چار سو روپیہ۔ بس میں چاہتا ہوں کہ آپ وہاں کے احباب سے آٹھ سو روپیہ چندہ کرکے میرے پاس بھیجدیں چندہ کرنے میں شہرت نہیں چاہیے، صرف احباب مخلصین سے چندہ ہو۔ مثلاً آپ میر ظہور حسین زین العابدین مرزا رحمت اللہ، اور اور احباب سے ملاقات کریں۔ اور زبانی بات چیت کریں اور جو جس کی توفیق ہو اُس سے ایکر جمع کریں"

مولوی سید مہدی علی خاں کے لیے ہندوستان میں صاحب کمشنر نے خلعت کے لیے گورنمنٹ میں رپورٹ کی ہے اس کی مبارکباد کے بعد سرسید اُن کو لکھتے ہیں "بھائی مہدی تم پایونیر اخبار الہ آباد کے ایک آرٹکل کا ترجمہ سُنو وہ لکھتا ہے کہ "آج کل ہندوستان میں خاندان مسلمانوں کے روز بروز گھٹتے جاتے ہیں۔ چنانچہ صرف بنگالہ میں تمام سلطنت کے ملازمین میں چند

مسلمان ہیں، وہ بھی ضعیف ہیں، جلد پنشن لیں گے، اور اُن کی جگہ یقینی کوئی مسلمان نہیں ہونے کا۔ اور آئندہ بجز چپراسی اور دفتری کے کوئی مسلمان معزز عہدہ پر نہیں ہوگا" دیکھو میں جو کہتا تھا اور جس کا غم کرتا تھا اب سب لوگ وہی کہتے ہیں۔ یہ آرٹکل بہت بڑا ہے کہیں سے دستیاب ہو تو منگا کر بالکل سنو۔ بہرحال جو عزت تم کو خدا دے وہ تمام قوم کی عزت ہے۔ اور مجھکو دوہری خوشی ہے ایک قومی دوسری خاص محبت و محبوبیت کی۔ اللہ تعالےٰ ہمیشہ باقبال رکھے"۔

مولوی امداد العلی جو سرسید کے سخت مخالف تھے اُن کو ہندوستان میں سٹار آف انڈیا کا خطاب ملنا تجویز ہوا ہے یہ خبر سُنکر سرسید مولوی مہدی علی خاں کو لکھتے ہیں" بلا تصنع میں آپ سے عرض کرتا ہوں کہ مولوی امداد العلی صاحب کی نسبت سٹار آف انڈیا تجویز ہونے سے بے انتہا خوشی ہوئی۔ عین آرزو مسلمانوں کی ترقی اور عزت کی ہے۔ چشم ما روشن دل ما شاد۔ اُنکو یہ فرمانا کہ سید احمد نے انگریزوں کا جھوٹا کھا کر سٹار آف انڈیا لیا اور اُنہوں نے مونچھوں پر تاؤ دیکر (نہیں نہیں بھول گیا اُنکے مونچھیں[1] نہیں ہیں) ڈاڑھی پر ہاتھ پھیر کر میرے سر اور آنکھوں پر خدا کرے ایک اُن کو اور ہزار اور مسلمانوں کو یہ دن نصیب ہو"

اول کئی خطوں میں مولوی مہدی علی خاں کو اس بات کی تاکید کی ہے کہ میرے واپس آنے سے پہلے ایک ایسوسیئشن مسلمانوں کی طرز معاشرت کی اصلاح کے لیے قایم کرو اور ایک اخبار اِسی مقصد کے لیے ایسوسیئشن کی طرف سے ایسا اور ایسا نکالو، اور سپیچیں کرو اور میٹنگیں کرو پھر جب اس سے بھی کچھ کامیابی ہوتی نہیں دیکھی تو ممانعت کر دی۔ بعد ممانعت کے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ "اگر بالتخصیص مسلمانوں کی تربیت کے لیے جداگانہ مدرسہ مقرر ہو جائے تو ایک رحمت ہمارے لیے ہے۔ کوئی رات نہیں جاتی کہ اپنے مدرسہ کے تقرر کی باتیں اور تجویزیں بیان نہیں ہوتیں مگر بغیر دس لاکھ روپیہ نقد کے ممکن نہیں ہے" اسی طرح سرسید کے تمام خطوں میں جو ولایت سے اُنہوں نے سید مہدی علی خاں کو لکھے ہیں۔ اسلام اور مسلمانوں کا دکھڑا رونے کے سوا کوئی مضمون نظر نہیں آتا۔

محمڈن کالج کی تجویز

الغرض سرسید کے تمام منصوبے۔ جو وہ ابتدا سے مسلمانوں کی بھلائی کے لیے برابر باندھتے رہتے تھے۔ اس رلے پر آکر ختم ہو گئے کہ ہندوستان میں علیگڑھ قوم کی تعلیم کے لیے ایک محمڈن کالج یا محمڈن یونیورسٹی قایم کی جائے۔ انہوں نے دیکھا کہ مسلمانوں کی

---

[1] مولوی امداد العلی اتباع سنت کے خیال سے مونچھیں نہیں رکھتے تھے یہ اس کی طرف اشارہ ہے ۱۲

سوشیل اور پولٹکل حالت درست کرنے کے لیے ایسوسیئشن قایم کرنی یا کاغذ کی ناؤ سے اس دریا کو طے کرنا کسی طرح ممکن نہیں۔ بلکہ جب تک انہیں انگریزی تعلیم نہ پھیلائی جائیگی۔ اُن کی بھلائی کی تمام تدبیریں ایسی ہی فضول اور بیکار ثابت ہونگی جیسے کسی کھیت میں تخم ریزی سے پہلے آب پاشی کرنا۔ اُنھوں نے پختہ ارادہ کر لیا کہ اپنی تمام زندگی اس کام پر وقف کر دیجیے۔ چنانچہ اس مقصد کے متعلق تمام ابتدائی مدارج جو ولایت میں طے ہونے ممکن تھے۔ اُنھوں نے وہیں طے کر لیے۔

ایک پمفلٹ جس میں ہندوستان کے موجودہ نظام تعلیم پر اعتراض اور بجائے اُس کے جو طریقہ تعلیم اُن کے نزدیک ہندوستان کی حالت کے مناسب تھا اُسکو بیان کیا تھا۔ لندن میں شائع کیا، تاکہ جنکی رائے اُس کے خلاف ہو وہ اخباروں کے ذریعہ سے ظاہر کریں۔

نیز کیمبرج یونیورسٹی کو خود جا کر نہایت توجہ سے دیکھا اور اُس کے تمام جزئی و کلی حالات پر غور کی۔ پھر مسلمانوں اور نیز گورنمنٹ کی اطلاع کے لیے اردو انگریزی میں اشتہار چھپوا کر سید مہدی علی خاں کے پاس اشاعت کی غرض سے ہندستان میں بھیجے اور ہندوستان میں نہایت با قاعدہ اور دانشمندانہ طریقہ سے اُس منصوبہ کے پورا کرنے پر کمر باندھی جو اُن کی سالہا سال کی غور و فکر کا آخری نتیجہ تھا۔

انجمن خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان

ادھر تو انجمن خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان قایم کی جس کی کوششوں سے آخر کار مدرستہ العلوم قایم ہو گیا۔ اور اُدھر قوم کو جگانے اور تعلیم کی طرف مائل کرنے کے لیے پرچہ تہذیب الاخلاق نکالا۔ سر سید کے ان دونوں کاموں کا مفصل حال ہم پہلے حصہ میں لکھ چکے ہیں۔

تہذیب الاخلاق کا اثر

یہاں ہم کو صرف یہ دکھانا ہے کہ تہذیب الاخلاق نے مسلمانوں پر کیا اثر کیا اور مدرستہ العلوم سے اُن کو اب تک کیا فائدہ پہنچا اور آیندہ کن فائدوں کے پہنچنے کی توقع ہے۔

تہذیب الاخلاق کے نکلنے کا سبب

ہندوستان میں دیسی اخباروں اور میگزینوں کی حالت کچھ تو اس وجہ سے کہ اُن میں کوئی ایسا کرشمہ نہیں ہوتا جو پبلک میں کچھ جنبش پیدا کرے۔ اور زیادہ تر ہندوستانیوں کی مردہ دلی کے سبب جیسی کہ ابتک رہی ہے وہ سب پر ظاہر ہے یوروپ میں یہی اخبار اور میگزین قوموں کے دلوں کے مالک ہیں اور اُن کے جذبات اور خیالات پر حکومت کرتے ہیں مگر ہمارے ملک میں۔ سوا اس کے کہ لوگ اُن کو دل کا بہلاوا جانتے ہیں۔ وہ کسی مرض کی دوا نہیں

سمجھے جاتے۔ ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ تہذیب الاخلاق سے۔ جو ایک سب سے زیادہ افسردہ اور دل مردہ قوم کے بیدار کرنے کے لیے نکالا گیا تھا۔ کیا امید ہو سکتی تھی؟ باوجود اس کے جو نتیجے اس سے پیدا ہوئے وہ نہایت تعجب انگیز ہیں۔

بات یہ ہے کہ جس وقت یہ پرچہ جاری ہوا اُس وقت مسلمانوں پر بسبب اُس انقلاب کے جس نے غدر کے بعد اُن کی حالت دگرگون کر دی تھی۔ دو مختلف حالتیں طاری تھیں ایک [illegible] تعصبات اور مذہبی جوش و خروش۔ جو ادبار اور تنزل کے زمانہ کے ہتھیار ہیں [illegible] تھے۔ اور تہذیب الاخلاق کا جزو اعظم وہ مضامین تھے جن کو مذہبی تعصبات کے ساتھ [illegible] نسبت تھی جو آگ کو بارود کے ساتھ ہوتی ہے۔ پس جیسی کہ امید تھی تہذیب الاخلاق نے [illegible] کے گروہ میں تلاطم پیدا کر دیا اور مذہبی مناظرہ کے ہتھیار جو مدت دراز سے کام میں نہ آنے کے سبب زنگ خوردہ پڑے تھے اُن کو کام میں لانے کا موقع ملا۔

دوسری طرف مسلمانوں کا ایک بہت بڑا گروہ ایسا بھی تھا جن کی افسردہ اور مایوس طبیعتیں اپنے روز افزوں تنزل کے سبب ڈوبتی ہوئی ناؤ کی طرح کوئی ایسا سہارا ڈھونڈھ رہی تھیں جس سے اُن کی ڈھارس بندھے اور کوئی امید کی صورت نظر آئے۔ تہذیب الاخلاق نے اس گروہ کے دل پر فی الواقع وہ کام کیا جو ٹھنڈا پانی پیاسے پر کرتا ہے۔ اس گروہ نے جبکہ وہ اپنے تئیں ناچیز اور ایک نہایت کس مپرس حالت میں سمجھ رہا تھا اور دنیوی ترقیات کے دروازے اپنے چاروں طرف مسدود پاتا تھا۔ دیکھا کہ ایک ناصح شفیق کمال دلسوزی سے اُن کو نیند سے جگاتا ہے، اُنکی غفلت پر ملامت کرتا ہے، اُن کے اسلاف کے کارنامے سُنا کر اُن کو غیرت دلاتا ہے اور اُن کو ترقی کرنے کا گُر بتاتا ہے۔ یہ گروہ اُس کی آواز پر اس طرح دوڑا جیسے کسی بن سری فوج کا کوئی سردھرا پیدا ہو جائے اور وہ اُس کے اشارہ پر اِدھر اُدھر سے سمٹ کر اُس کے گرد جمع ہو جائے غرض کہ موافق اور مخالف دونوں فریق ہمہ تن اُس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ دوسرا اس لیے کہ اُسکی آواز غور سے سنیں اور پہلا اسلیے کہ اُس کی آواز کسی کو سننے نہ دیں، تعجب یہ ہے کہ جس قدر اُسکی موافقت سے قوم کو فائدہ پہنچا اُسی کے قریب قریب اُس کی مخالفت نے لوگوں کو فائدہ پہنچایا۔

جوں جوں تہذیب الاخلاق مدرسۃ العلوم کی طرف لوگوں کو بُلاتا تھا اور جس قدر وہ انگریزی تعلیم کی ضرورتیں اُنکے ذہن نشین کرتا تھا اسی قدر مدارس اسلامیہ قایم کرنے کا جوش مسلمانوں میں بڑھتا جاتا تھا۔ چنانچہ اسی کی تحریک سے بے شمار اسلامی مدرسے ہندوستان میں

قایم ہو گئے اور برابر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ تہذیب الاخلاق کو جاری ہوئے شاید تین برس گذرے تھے کہ مولوی سخاوت علی صاحب نے انبہٹہ میں اسلامی مدرسہ قایم کیا۔ مدرسہ قایم کرنے کے بعد اُنہوں نے۔ جیسا کہ تہذیب الاخلاق نمبر ا جلد ۴ میں منقول ہے ایک موقع پر کہا کہ "اگرچہ پہلے بھی ہم کو اپنی قوم کی بھلائی کی فکر تھی مگر کوئی تقاضا کرنے والا اور بار بار جگانے والا نہ تھا۔ اب تہذیب الاخلاق نے یہاں تک چوکنا اور آگاہ کیا جس کے سبب اس قصبہ میں بھی ایک مدرسہ قائم ہو گیا۔ خدا اس پرچۂ تہذیب الاخلاق کو ہمارے لیے ہمیشہ مبارک رکھے" اُنہوں نے یہ بھی کہا کہ "ہمارے مدرسہ انبہٹہ اور ہمارے ضلع کے کل مدارس دیوبند، سہارنپور اور گنگوہ کو بڑی تسلی ہے کہ یہ سب مدرسے اس مدرسۃ العلوم مسلمانان سے جس کے قایم کرنے کی کوشش ہو رہی ہے مستفیض ہونگے، گویا علی گڑھ ہمارے مدرسوں کے طلبا کا قصر امید ہے اگر درحقیقت ہم اپنی ترقی کرینگے تو وہ تمرہ ہمارے ہی لیے ہے۔ پس کس قدر ہم کو اُس کے بانیوں کا شکر گذار ہونا چاہیے۔

اس قول کے نقل کرنیکے بعد سرسید تہذیب الاخلاق میں لکھتے ہیں کہ "سب سے اخیر مدرسہ جو ہماری تحریروں کے اثر سے قایم ہوا وہ مدرسہ ایمانیہ لکھنؤ ہے۔ جس میں بشمول دیگر علوم معینہ کے مذہب شیعۂ اثنا عشریہ کی بھی تعلیم ہوتی ہے اور اس سے خیال ہوتا ہے کہ ہماری کوششوں نے شیعہ اور سنی دونوں کے دل کو جگا دیا ہے" سرسید نے جس مضمون میں یہ حال لکھا ہے وہ ۱۸۷۶ء کا لکھا ہوا ہے جس کو اب چوبیس برس کا عرصہ گذر چکا ہے۔ اس عرصہ میں اور بے شمار مدارس اسلامیہ زیادہ تر اسی خیال سے قایم ہوئے ہیں کہ انگریزی تعلیم جسکی بنیاد مسلمانوں میں تہذیب الاخلاق نے ڈالی ہے اُس کے اثر سے مسلمانوں کو بچایا جائے۔ یہ خیال فی نفسہ صحیح ہو یا غلط مگر اس میں شک نہیں کہ تہذیب الاخلاق ہی نے مسلمانوں میں یہ جوش پیدا کیا ہے اور اس طرح سرسید کی پیخ پکار نے اپنے مخالفوں میں بھی وہ اسپرٹ پیدا کر دی ہے۔ جس پر قومی ترقی کا دارومدار ہے۔

اگرچہ تمام مدارس اسلامیہ جو ہندوستان میں ابتک قایم ہوئے ہیں اُن میں آج تک کوئی تبدیلی زمانہ کے مقتضا کے موافق ظہور میں نہیں آئی اور وہ قدیم ڈگر ابتک نہیں چھوڑی گئی جو اس زمانہ کے ہرگز مناسب نہیں ہے۔ لیکن چند سال سے ایسے آثار نظر آتے ہیں کہ زمانہ جو سب سے بڑا ریفارمر ہے اُنکی اصلاح کیے بغیر نہ رہے گا۔ چنانچہ ندوۃ العلما۔ جس کا پانچواں اجلاس گذشتہ سال لکھنؤ میں ہو چکا ہے۔ اس غرض سے قائم ہوئی ہے کہ مسلمانوں کے قدیم سلسلۂ درس کی زمانہ حال

کی ضروریات کے موافق اصلاح کرے۔ اور اگر ذرا غور کرکے دیکھا جائے تو خود ندوۃ العلما کا وجود اسی نتیجہ کی ایک شان ہے جسکے لیے تہذیب الاخلاق جاری کیا گیا تھا۔ وہی کانپور۔ جو تہذیب الاخلاق اور سرسید کی مخالفت کا سب سے بڑا مرکز تھا اور جہاں سے تہذیب الاخلاق کے برخلاف نور الانوار، نور الآفاق، اور امداد الآفاق اور کیا اور کیا مدت دراز تک شایع ہوتے رہے۔ وہیں سے علما کی یہ جماعت اس غرض سے اُٹھی ہے کہ مسلمانوں کی قدیم طرز تعلیم زمانۂ حال کی طرز تعلیم کے سانچے میں ڈھالی جائے اور اسی لیے اکثر علما اُس سے بدگمان ہو گئے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ مجلس سید احمد خاں کے اشارہ سے قایم ہوئی ہے ہم ایسا تو نہیں سمجھتے لیکن اتنا تو ضرور کہتے ہیں کہ "ھذا ایضاً من برکات البرامکۃ" بے شک مسلمانوں کی اصلاح کا خیال اُن کے دل میں سید کی چیخ پکار نے پیدا کیا ہے اور اگر وہ اپنے ارادوں پر ثابت قدم رہے اور لومۃ لائم سے خوف زدہ نہ ہوئے تو رفتہ رفتہ ضرور وہ اپنے موجودہ خیالات سے آگے بڑھیں گے اور جن باتوں کی درحقیقت قوم کو ضرورت ہے اُن کی طرف متوجہ ہونگے۔

علما پر تہذیب الاخلاق کا اثر

نواب محسن الملک نے ایجوکیشنل کانفرنس کے ایک اجلاس میں گفتگو کرتے وقت ندوۃ العلما کی روداد میں سے اُس کے بعض ممبروں کی تقریر کا خلاصہ نقل کیا تھا جو تہذیب الاخلاق جدید کی پہلی جلد میں چھپ گیا ہے اُس کے دیکھنے سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ جو کچھ سرسید نے تہذیب الاخلاق کی ابتدائی جلدوں میں علوم جدیدہ کی ضرورت کے متعلق لکھا تھا، یا قرآن کی بعض آیتوں کی تفسیر علوم جدیدہ کے مطابق کی تھی اور جس پر اُنکی تکفیر کیجاتی تھی۔ ہمارے علما کی رایوں پر اُس نے کسقدر اثر کیا ہے اور اُن کے خیالات کو کہاں سے کہاں تک پہنچا دیا ہے اب وہ تسلیم کرتے ہیں کہ ہمارا قدیم علم کلام جو اُس زمانہ کے فلسفہ کے مقابلہ کے لیے مدون ہوا تھا اس زمانہ میں اُس کا مدارس اسلامیہ میں پڑھانا بے فائدہ ہے، اب فلسفہ زمانہ حال کے مقابلہ کی ضرورت ہے اور اس لیے انگریزی زبان کا سیکھنا اور علوم جدیدہ سے واقف ہونا ضرور ہے پہلے جو ہمارے علما علوم جدیدہ کے پڑھنے سے اس لیے منع کرتے تھے کہ اُن سے اصول اسلام میں شبہات پیدا ہونگے اور الحاد اور دہریت پھیلے گی اب برخلاف اُس کے وہ بھی کہنے لگے ہیں جو بیس برس سے برابر سرسید کہتے چلے آتے تھے۔ چنانچہ ایک عالم نے ندوۃ العلما میں یہ کہا کہ "مذہب اسلام ایسا کچے کا گھر نہیں جس پر نئے فلسفہ کا ریلا کچھ اثر کرے اور نہ کبھی پچھلی صدیوں میں کچھ اثر کیا ہے۔ فلسفہ بدلتا رہا ہے اور بدلتا رہیگا پر آسمانی مذہب کبھی نہ بدلیگا۔ اسلام کا کوئی دنیاوی فلسفہ نہیں نہ کوئی ہیأت و ریاضی ہے وہ

تو صرف انسان کی اخلاقی و روحانی تعلیم کرنے والا ہے "، پھر کہا کہ "اسلام نے تاریخ کا بھی بطرز مورخانہ ذمہ نہیں لیا ہے بلکہ انہیں واقعات کا ذکر کیا ہے جو انسان کے لیے عبرت و تبصرت پیدا کریں۔ اگر بطلیموس کی ہیأت ثابت ہو جائے تو کیا، اور فیثاغورس کی قائم ہو جائے تو کیا، جزو لا یتجزیٰ باطل ہوا تو کیا، اور ثابت ہوا تو کیا، خلا کا بطلان ہوا تو کیا اور اثبات ہوا تو کیا، ہمارے بزرگوں نے یونانی فلسفہ کے جھگڑے کئے لیے ایسے ایسے مسائل علم کلام میں داخل کیے تھے جن کو آج کل محض جودت طبع کے لیے ہم لوگ پڑھتے ہیں، نہ وہ ہمارا مذہب تھا نہ کتاب و سنت اور مشکوٰۃ نبوت کا فرمودہ تھا۔ سب کچھ بگڑ جائے تو ہماری بلا سے"

اگر تہذیب الاخلاق لوگوں کی مخالفت کے خوف سے صلح کل کا طریقہ اختیار کرتا اور جو رکاوٹیں مسلمانوں کی ترقی کی سدراہ تھیں اُنکے دور کرنے پر علی الاعلان کمر نہ باندھتا تو ظاہر ہے کہ اُس کی مخالفت بالکل نہوتی اور اس لیے جو عمدہ نتیجے اسکی مخالفت سے پیدا ہوئے وہ ظہور میں نہ آتے، نیز جس قدر اُس کی مخالفت کم ہوتی اُسی قدر اُس کے مددگاروں کا جوش کم ہوتا اور اس لیے وہ مخالف اور موافق دونوں کے حق میں کوئی معتدبہ نتیجہ پیدا نہ کرسکتا، یہی سبب تھا کہ جوں جوں اُس کی مخالفت زیادہ ہوتی گئی اُسی قدر لوگ اُس کی طرف زیادہ متوجہ ہوتے گئے اور اُسی قدر اُسکا منتر زیادہ کارگر ہوتا گیا۔

مسلمانوں کو اسلاف کے حالات سے واقف کرنا

اس نے جب کہ مسلمان اپنے اسلاف کے حال سے بے خبر تھے۔ نہایت موثر طریقوں کے ساتھ اُن کو اُنکے بزرگوں کی علمی اور عقلی فتوحات سے آگاہ کیا تاکہ اُن میں وہ حمیت پیدا ہو جو اولاد کے دل میں اپنے آبا و اجداد کی بڑائی سننے سے پیدا ہونی چاہیے اور وہ اپنے موجودہ تنزل کا مقابلہ زمانہ سلف کی ترقیات کے ساتھ کر کے خود ترقی کی طرف مائل ہوں۔ اگرچہ تہذیب الاخلاق کو اس مقصد میں پوری کامیابی ہوئی کہ اُس نے مسلمانوں میں فخر و مباہات کا جوش توقع سے زیادہ پیدا کر دیا لیکن اُن نیچرل موانع کے سبب۔ جو گری ہوئی قوموں کو مدت تک اُٹھنے نہیں دیتے۔ ابھی تک اُنہیں وہ حرکت پیدا نہیں ہوئی جو سلف کے کارنامے سُنکر غیور قوم میں خود بخود پیدا ہو جاتی ہے اور اُن کو پستی و تنزل کے ننگ و عار سے نکلنے پر آمادہ کر دیتی ہے۔ تاہم جسقدر بیس بائیس برس کے عرصہ میں کم و بیش ترقی کا خیال ہندوستان کے مسلمانوں میں پیدا ہوا ہے اُسکو اسی تہذیب الاخلاق کا نتیجہ سمجھنا چاہیے ورنہ مسلمانوں نے زمانہ کی مخالفت پر جس شد و مد کے ساتھ کمر باندھی تھی وہ اُس وقت تک کہ زمانہ اُنکو پیس نہ ڈالے۔ ہرگز کھلنے والی نہ تھی۔ تہذیب الاخلاق جس کوٹھے پر چڑھنے کی تاکید کرتا تھا صرف اُس کے بتانے ہی پر اکتفا نہیں کرتا تھا بلکہ اُس کا زینہ بھی اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ وہ ایک ہاتھ سے لوگوں کو ترقی کی طرف بُلاتا تھا۔

اور دوسرے ہاتھ سے مدرسۃ العلوم کی تصویر اُن کے سامنے پیش کرتا تھا۔ اسی لیے اُسکی کوششیں بالکل اکارت نہیں گئیں۔

تہذیب الاخلاق ہی نے لوگوں میں یہ خیال پیدا کیا یورپ کے مصنفوں نے جو غلطیاں اسلام کی حقیقت ظاہر کرنے یا اسلام کی تاریخ لکھنے میں کی ہیں اُن غلطیوں کو رفع کیا جائے اور اُنکا منشا ظاہر کیا جائے۔ اگرچہ سر سید اپنی متعدد تصنیفات میں جیسا کہ اس کتاب میں جا بجا ظاہر کیا گیا ہے۔ اس موضوع پر بہت کچھ لکھ چکے تھے اور آیندہ مصنفوں کے لیے یہ رستہ صاف کر چکے تھے۔ مگر اُنکی اکثر تحریرات عام طور پر شایع نہیں ہوئی تھیں۔ تہذیب الاخلاق ہی کی تحریک سے لایق لایق مسلمان اس کام پر کھڑے ہوئے بہت سے مضامین تہذیب الاخلاق میں اسی موضوع پر لکھے گئے اور اُن کے سوا عمدہ عمدہ متعدد کتابیں انگریزی اور اُردو میں علیحدہ شایع کی گییں۔ اس تحریک کا سب سے عمدہ نتیجہ مسلمانوں کے حق میں یہ ہوا کہ بہت سے تعلیم یافتہ مسلمان۔ جنسے ہم خود واقف ہیں یا جن کا حال معتبر ذریعوں سے معلوم ہوا ہے۔ اُن اعتراضوں کو دیکھکر جو انگریزی کتابوں میں اسلام اور مسلمانوں پر وارد کیے گئے ہیں اسلام سے برگشتہ ہو چلے تھے، کوئی عیسائی ہونے کا ارادہ رکھتا تھا، اور کوئی سرے سے مذہب ہی کو لغو سمجھنے لگا تھا، مگر تہذیب الاخلاق کے مضامین دیکھکر جو شبہات اسلام کی طرف سے اُن کے ذہن میں خطور کرتے تھے وہ یکقلم زائل ہو گئے اور اُنکے دل کا وسوسہ بالکل جاتا رہا اب وہ اسلام پر پختہ یقین رکھتے ہیں اور اپنے اُن پراگندہ خیالات سے نادم ہیں۔

تہذیب الاخلاق نے تعصبات کو بہت کم کر دیا، تقلید کی بندشیں ڈھیلی کر دیں، توکل قناعت اور تقدیر کے جو غلط معنی لوگ سمجھے ہوئے تھے اور جس غلطی نے اُن کو نکما اور کاہل اور جمادات کی طرح بے حس و حرکت کر دیا تھا اُس سے اُن کو مطلع کیا اور صرف مطلع ہی نہیں کیا بلکہ لاکھوں کے خیالات بدل دیے اور تدبیر و کوشش کی طرف اُنکا رخ پھیر دیا۔ اسی پرچہ نے اُن کو اپنے دست و بازو پر بھروسا کرنا اور گورنمنٹ کا سہارا چھوڑنا سکھایا۔

اور سلف ہلپ کا اصول جسکے بغیر کوئی قوم ترقی نہیں کر سکتی اُنکے ذہن نشین کیا جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ جو لوگ قومی کاموں میں ایک پیسہ صرف کرنا نہیں جانتے تھے وہ سیکڑوں اور ہزاروں صرف کرنے لگے۔ کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ قومی کاموں میں چندہ دینا کم سے کم ہندوستان کے

مسلمانوں کو صرف تہذیب الاخلاق سے یا دوسرے لفظوں میں سید احمد خاں کی تحریروں اور
اسپیچوں نے سکھایا ہے اور اس بات کا انکار نہیں ہو سکتا کہ مسلمان جو روپیہ دو روپیہ مہینے سے
زیادہ اولاد کی تعلیم میں خرچ کرنا نہیں جانتے تھے وہ اسی شخص کی چیخ پکار سے اب پچاس پچاس ساٹھ
ساٹھ روپیہ مہینا بیدریغ اپنے بچوں کی تعلیم میں خرچ کرتے ہیں اور ولایت کی تعلیم کے لیے ایک ایک
لڑکے پر بیس بیس تیس تیس ہزار صرف کر دیتے ہیں۔ سرسید کے مخالف جو ہمیشہ مستثنیٰ نتیجوں کو اعتراض
کا ذریعہ گردانتے ہیں؟ اس مقام پر ضرور مسلمان لڑکوں کی وہ مثالیں پیش کریں گے جنکو ولایت جانے
سے بجائے فائدہ کے نقصان پہنچا ہے مگر ایسے مستثنیات سے تو خدا کے کام بھی خالی نہیں پائے جاتے

یاراں کہ در لطافتِ طبعش خلاف نیست — در باغ لالہ روید و در شورہ بوم خس

ہم کو اس باب میں اُن شاذ و نادر مثالوں پر نظر کرنی نہ چاہیے بلکہ یہ دیکھنا چاہیے کہ سرسید
نے مسلمانوں کے خیالات میں کس قدر تبدیلی پیدا کر دی ہے کہ جو روپیہ وہ پہلے اولاد کی بیاہ
شادیوں کی بیہودہ رسموں میں خرچ کرنے کے عادی تھے یا جس روپیہ سے جاہل اور نالائق اولاد کے
لیے جائداد خرید کر اُن کی عیاشی اور بدچلنی یا کاہلی اور سستی کا سامان مہیا کر جاتے تھے اب وہ روپیہ
اُن کی لیاقت اور اصلی عزت اور اقتدار بڑھانے میں صرف کرنا سیکھ گئے ہیں۔

قومیت کا خیال

تہذیب الاخلاق ہی نے اگر ذرا غور سے دیکھا جائے تو مسلمانوں کو مدت دراز کے
بعد قومیت کے معنی یاد دلائے ہیں۔ قومیت جو درحقیقت ایک لفظ اسلامی اُخوت کا
مرادف ہے اُس کے مفہوم سے ہندوستان کے مسلمانوں کو بالکل ذہول ہو گیا تھا،
اُن میں بھی مثل ہندوؤں کے ذاتوں کی تفریق پیدا ہو گئی تھی اور ایک ذات کو دوسری ذات کے
ساتھ قومی حیثیت سے کچھ تعلق نہ سمجھا جاتا تھا پٹھانوں کو یہ استحقاق نہ تھا کہ وہ مغلوں کی فتوحات
پر فخر کر سکیں اور سادات اس بات کا حق نہیں رکھتے تھے کہ بنی امیہ یا بنی عباس کے کارناموں پر
نازاں ہوں۔ اس کے سوا مذہبی فرقوں کے اختلاف نے اُن میں ایک دوسری طرح کا تفرقہ
ڈال دیا تھا جس کے سبب سے وہ رابطہ جو تمام اہل قبلہ میں بسبب اتحاد اسلامی کے متحقق ہونا چاہیے
باقی نہ رہا تھا۔ تہذیب الاخلاق نے اِن دونوں تفرقوں کے دور کرنے کی بنیاد ڈالی اور ہندوستان
کے لاکھوں مسلمانوں میں کم سے کم یہ خیال ضرور پیدا کر دیا کہ ذاتوں کے تفرقہ یا مذہبی طریقوں
کے اختلاف سے قومی اتحاد میں کچھ فرق نہیں آتا اور ہمارے نزدیک یہ کہنا کچھ غلط نہیں ہے کہ قوم
و قومیت و قومی ہمدردی اور قومی عزت کے الفاظ جن وسیع معنوں میں کہ اب ہندوستان میں عام طور

گریجویٹ ۲۲ انڈر گریجویٹ ۶۲ ایل ایل بی وکالت ہائیکورٹ وکالت ضلع ۱۹۲ سیکڑوں انٹرنس اور متعدد ہندو گریجوٹ اسی کالج کے ہیں سٹری یا مڈلین میں ولایت جاکر کامیاب ہو چکے ہیں پس یہ کہنا کچھ بناوٹ میں داخل نہیں ہے کہ محمڈن کالج نہ صرف مسلمانوں کی بلکہ تمام ہندوستان کی بھلائی کے لیے قایم کیا گیا ہے اور اُس سے غیر قوموں کو بھی برابر فائدہ پہنچتا رہا ہے لیکن اسمیں شک نہیں کہ سرسید کا بڑا مقصد اس کالج کے قایم کرنے سے بھی تھا کہ کسی طرح مسلمانوں کی عالت درست ہو اور وہ انگریزی تعلیم کی طرف متوجہ ہوں۔



مگر یہ کوئی آسان کام نہ تھا۔ قطع نظر اُن سخت مخالفتوں کے جو مدرسۃ العلوم قایم کرتے وقت پیش آئیں اور جنکا حال ہم آیندہ عنوان میں لکھیں گے۔ مسلمان پہلے ہی انگریزی تعلیم سے متنفر تھے ابتدا سے ہندو اور مسلمانوں کے خیالات میں جو تفاوت انگریزی تعلیم کے متعلق تھا اُس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ ۱۸۲۳ء میں جبکہ گورنمنٹ نے کلکتہ میں ہندوؤں کے لیے ایک سنسکرت کالج قایم کیا تو ہندوؤں نے ایک عرضداشت اس مضمون کی گذرانی کہ ہم کو اس بات کی ضرورت نہیں ہے کہ گورنمنٹ ہمارے لیے سنسکرت کی تعلیم کا سامان مہیا کرے بلکہ اُس کو چاہیے کہ جہانتک ممکن ہو انگریزی تعلیم کی اشاعت میں کوشش کرے۔ برخلاف اس کے ۱۸۳۵ء میں جبکہ واقعۂ مذکور کو گیارہ برس گذر چکے تھے اور ہندوؤں کا شوق دوبالا ہو گیا تھا، کلکتہ کے مسلمانوں نے جس وقت یہ سنا کہ گورنمنٹ تمام ہندوستان میں انگریزی تعلیم پھیلانا چاہتی ہے تو انہوں نے ایک عرضی تیار کی جسپر آٹھ ہزار مسلمان رئیسوں اور عالموں کے دستخط تھے اور جسکا ماحصل یہ تھا کہ گورنمنٹ کا انگریزی تعلیم پر اسقدر توجہ کرنا صاف دلالت کرتا ہے کہ اُس کا ارادہ ہندوستانیوں کو عیسائی بنانے کا ہے۔

قطع نظر مذہبی خیالات کے مسلمان زیادہ تر اسوجہ سے بھی انگریزی تعلیم کے مخالف تھے کہ ابتدائے اشاعت اسلام سے وہ جس ملک میں گئے اور جہاں جاکر رہے مستثنیٰ صورتوں کے سوا کبھی اُنکو غیر ملک اور غیر قوم کی زبان سیکھنے کی طرف توجہ نہیں ہوئی وہ جہاں جاتے تھے اپنی زبان اور اپنا علم ادب اپنے ساتھ لیجاتے تھے۔ جس طرح اسپین میں جاکر انہوں نے اسپینش زبان یا ایران میں ژند زبان نہیں سیکھی اسی طرح ہندوستان میں آکر اس ملک کی زبانوں کے سیکھنے کی طرف توجہ نہیں کی اور اسلیے غیر زبانوں کے سیکھنے کی فی الواقع اُن میں قابلیت نہ رہی تھی۔ برخلاف اِس کے ہندوؤں نے مسلمانوں کے عہد میں غیر زبان سیکھنے کا ملکہ اپنے میں بخوبی پیدا کر لیا تھا۔ جو قومیں

ملازمت پیشہ تھیں وہ اپنی اولاد کو کم سے کم فارسی زبان سکھانا نہایت ضروری جانتی تھیں اور اکثر شوقین لوگ فارسی کی تکمیل کے لیے عربی بھی سیکھتے تھے۔

بس مسلمانوں کو جس قدر کہ مذہبی خیالات انگریزی تعلیم سے مانع تھے اُس سے زیادہ اُن کی طبعی نامناسبت جو تیرہ سو برس سے اُن میں متوارث چلی آتی تھی ایک اجنبی زبان کے سیکھنے کی اُن کو اجازت نہ دیتی تھی۔ علاوہ بریں انگریزی زبان کے سوا اور بھی سبجکٹ ایسے تھے جن سے ہندوستان کے مسلمانوں کو کچھ مناسبت نہ رہی تھی۔ جغرافیہ جس میں اُن کے اسلاف نے اگلے زمانہ میں بے انتہا ترقی کی تھی اب وہ اُس کو محض لغو جاننے لگے تھے۔ تاریخ کا حال بھی اسی کے قریب قریب تھا۔ ریاضی سے فی الواقع مسلمانوں کو کچھ لگاؤ باقی نہ رہا تھا۔ مسلمانوں کے ذہن میں عموماً یہ بات نشیں تھی اور اب تک ہے کہ انگریزی زبان میں منطق اور حکمت و فلسفہ بالکل نہیں ہے اور دنیا میں عربی کے سوا کوئی علمی زبان نہیں ہے۔

اس کے سوا اور بہت سے موانع تھے جنکی تفصیل کی یہاں گنجایش نہیں۔

اس سے بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے کہ جس وقت سر سید نے محمدن کالج قایم کرنے کا ارادہ کیا اُس وقت مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کی کیا حالت ہو گی؟ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ۱۸۵۸ء یعنی اُس وقت سے جبکہ کلکتہ مدارس اور بمبئی یونیورسٹیاں قایم ہوئیں۔ ۱۸۷۵ء یعنی اُس وقت تک کہ علیگڈھ میں ابتدائی اسکول کھولا گیا۔ تمام ہندوستان میں مسلمان گریجوٹس کی تعداد صرف بیس تک پہنچی تھی جنمیں ۱۷ بی اے اور ۳ ایم اے تھے حالانکہ اُسوقت تک ہندو گریجوٹس کی تعداد ۸۴۶ تک پہنچ گئی تھی جنمیں ۷۱۵ بی اے اور ۱۳۱ ایم اے تھے۔ نیز جو نفرت یا نامناسبت اور اجنبیت مسلمانوں کو انگریزی تعلیم سے چلی آتی تھی اُس سے اس بات کا اندازہ بھی اچھی طرح ہوسکتا ہے کہ اگر بالفرض اُنکو تعلیم کا خیال پیدا بھی ہو جاتا تو بھی اُنمیں انگریزی تعلیم کیساتھ دلبستگی اور مناسبت پیدا کرنے کیلیے کس قدر عرصہ درکار تھا؟ اور وہ کتنی مدت میں اس قابل ہو سکتے تھے کہ اپنی ہموطن قوموں کے ساتھ جو چالیس برس پہلے سے انگریزی تعلیم پر دلدادہ اور اُس کے حاصل کرنے میں سرگرم تھیں تعلیمی دوڑ میں شریک ہوں۔

ان تمام باتوں پر نظر کرنے کے بعد جو نتایج نہایت قلیل عرصہ میں علی گڑھ محمدن کالج سے ظہور میں آئے اُنکو نہایت غنیمت سمجھنا چاہیے۔ علیگڑھ محمدن اسکول ۱۸۷۵ء میں اور محمدن کالج ۱۸۷۸ء میں کھولا گیا تھا اور کالج کے نتایج ۱۸۸۰ء سے نکلنے

شروع ہوئے اُسوقت سے ۱۸۹۵ء تک کہ جسکو ۱۹ برس سے زیادہ مدت نہیں گذری۔ اُسنے صرف اپنے مسلمان طلبہ میں سے ۱۴۲ گریجوٹ اور ۱۷۴ انڈر گریجوٹ پیدا کیے ہیں۔

جو طالب علم کہ محمدن کالج کی لا کلاس میں لکچر سنتے ہیں وہ ۱۸۹۰ء سے قانونی امتحانوں میں شریک ہونے لگے ہیں اُس وقت سے ابتک صرف مسلمانوں میں سے ۱۴ ال ال بی کے امتحان میں اور ۵ وکالت کے امتحان میں کامیاب ہوچکے ہیں

اور اگر اُس سخت گیری پر۔ جو آٹھ سات برس سے قانونی امتحانوں میں ہونے لگی ہے۔ نظر کی جائے تو اس قلیل عرصہ میں مذکورہ بالا نتایج خاصکر مسلمانوں کے حق میں بہت غنیمت ہیں۔

محمدن کالج کا اثر تمام ہندوستان میں

مگر محمدن کالج کے فوائد کو صرف اُن نتایج ہی میں منحصر نہ سمجھنا چاہیے جو خاصکر اُسکے طالب علموں نے یونیورسٹی کے مذکورۂ بالا امتحانوں میں حاصل کیے ہیں بلکہ اُس کا اثر ہندوستان کے تمام حصوں اور تمام صوبوں تک پہنچا ہے اور اس کا کسی قدر اندازہ اس بات سے ہوسکتا ہے کہ لفٹنٹ گورنر بنگال نے ۱۸۹۶ء کے آغاز میں ایک موقع پر مسلمانان بنگالہ کی تعلیم کے متعلق یہ کہا تھا کہ "۱۸۸۰ء میں جبکہ میں نے بنگال کو چھوڑا تھا تو صوبۂ مذکور کے تمام مدرسوں اور کالجوں میں ایک لاکھ بچاسی ہزار مسلمان طالب علم تھے اور اپنے واپس آنے پر مجھکو معلوم ہوا ہے کہ اس تعداد کی نوبت قریب چار لاکھ نوے ہزار کے پہنچ گئی ہے" چونکہ ۱۸۸۰ء ہی سے زیادہ تر محمدن کالج کا چرچا ہندوستان میں ہوا ہے۔ اور صوبہ بنگال میں ظاہرا کوئی زبردست تحریک مسلمانوں کی تعلیم کے لیے نہیں ہوئی اس لیے سوا اس کے کہ تہذیب الاخلاق کی اشاعت اور محمدن کالج کی شہرت سے یہ نتیجہ پیدا ہوا ہے اور کوئی بات خیال میں نہیں آتی۔

اِسکے سوا محمدن کالج کے قایم ہونے سے پہلے ہندوستان میں قومی کالجوں کا گویا بالکل وجود نہ تھا مگر اس کے قایم ہوتے ہی اُنکا شمار بڑھنا شروع ہوا چنانچہ آج ہندوستان میں کالجوں کی تعداد ڈیڑھ سو تک پہنچ گئی ہے جن میں سے چند کے سوا سب پرائیویٹ کالج ہیں۔

ولایت کی تعلیم کا خیال شمالی ہندوستان میں سید احمد خان سے پیدا ہوا

ولایت کی تعلیم کا خیال شمالی ہندوستان کے ہندو مسلمانوں میں درحقیقت اُسوقت سے پیدا ہوا ہے جبکہ سرسید اپنے بیٹوں کو ساتھ لیکر انگلستان گئے ہیں۔ اُس سے پہلے ہندوستان سے کوئی مسلمان اور شمالی ہند سے کوئی ہندو یا مسلمان ولایت میں تعلیم کے لیے نہیں گیا تھا اگرچہ سرسید کو اس سفر کی جرأت زیادہ تر اُس اسکالرشپ کے سہارے سے ہوئی تھی جو سید محمود کی تعلیم کے لیے گورنمنٹ نے عنایت کیا تھا۔ لیکن چونکہ وہ خود بھی مع اپنے بڑے بیٹے کے ۱۷ مہینے ولایت میں ٹھیرے تھے اور سید محمود

کی تعلیم ختم ہونے تک ایک خدمتگار برابر پانچ برس اُنکے ساتھ رہا تھا اور بعض ایسے اخراجات بھی جو اُور دونکو اُٹھانے نہیں پڑتے تھے سرسید کو برداشت کرنے پڑے تھے اس لیے علاوہ دس ہزار روپیہ کے جو گورنمنٹ سے ملا کیا تھا پچاس ہزار روپیہ اُنکو اپنی جائداد اور کتابیں بیچکر اور رخصت کے زمانہ کی تنخواہ کٹوا کر گویا اپنے پاس سے خرچ کرنا پڑا۔ اگرچہ سرسید کو اس سے بہت بڑی زیرباری ہوئی مگر ہندوستان کے لیے آیندہ ولایت جانے کی راہ کھل گئی۔ سرسید نے اسی پر اکتفا نہیں کیا کہ بیٹے کو ولایت میں تعلیم دلا کر ملک کے لیے ایک مثال قایم کردی بلکہ جیسا پہلے حصہ میں مذکور ہوچکا ہے۔ اُنہوں نے متعدد تدبیریں ہندوستانیوں کے اور خاصکر مسلمانوں کے ولایت بھیجنے کے لیے کیں جنکا نتیجہ آج ہر شخص اپنی آنکھ سے دیکھتا ہے۔ کلکتہ بمبئی اور مدراس کے علاوہ شمالی ہندوستان میں کوئی سال ایسا نہیں جاتا جسمیں کچھ ہندو یا مسلمان طالبعلم تعلیم کے لیے ولایت نہ جاتے ہوں۔ ایک معتدبہ تعداد ولایت کے تعلیم یافتہ بیرسٹروں اور سول سرونٹس وغیرہ کی جن کا پہلے بنگالیوں اور پارسیوں کے سوا کسی قوم میں وجود نہ تھا۔ اکثر قوموں میں پیدا ہوگئی ہے جو روز بروز بڑہتی جاتی ہے اور جیسا کہ نواب محسن الملک نے اپنے لاہور کے لکچر میں بیان کیا ہے اس وقت صرف محمڈن کالج کے ۱۲ طالب علم بیرسٹرایٹ لاہیں اور ۴ ولایت میں ڈاکٹری کی تعلیم پاتے ہیں۔

اس حالت کا مقابلہ جب شمالی ہندوستان کی اُس حالت سے کیا جاتا ہے۔ جبکہ سرسید نے پہلی ہی بار ولایت جانیکا ارادہ کیا تھا اور جب کہ ہمارے ملک کے ہندو اور مسلمان دونوں مذہبی خیالات کے سبب یوروپ جانے کو عیسائی ہوجانے سے کم نہیں سمجھتے تھے اور غیر ملکوں کے سفر کے بالکل عادی نہ تھے۔ تو دونوں حالتوں میں زمین وآسمان کا فرق معلوم ہوتا ہے اور اس میں شک کرنے کی ظاہرا کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ جس طرح مسلمانوں میں ولایت کی تعلیم کا خیال صرف سرسید کی تحریک سے پیدا ہوا ہے اسی طرح شمالی ہندوستان کے ہندوؤں میں یہ خیال اس شخص کی بدولت پھیلا ہے،

باوجودیکہ ہندو ۱۸۴۲ء سے انگریزی تعلیم میں مصروف تھے مگر وہ ایسے چپ چاپ یہ رستہ طے کررہے تھے جیسے تنا خور آدمی ایک کونے میں بیٹھکر اپنا پیٹ بھر لیتا ہے اور پڑوسیوں کو خبر نہیں ہونے دیتا، یہاں تک کہ پچاس برس گذر گئے اور مسلمانوں میں کسی قسم کی جنبش پیدا نہیں ہوئی مگر سرسید کی چیخ پکار صرف مسلمانوں ہی کو جگانے والی نہ تھی بلکہ اُسنے شمالی ہندوستان کے دونوں صوبوں میں اس سرے سے اُس سرے تک تعلیم کا غل ڈالدیا۔ اگرچہ ہندوستان کی تعلیم پر ہندو پہلے ہی سے متوجہ تھے۔ اور سرسید کی تحریک نے سوا اس کے کہ اُن کی ترقی کی رفتار

کسی قدر تیز کر دی کوئی بڑا نمایاں اثر اُس پر نہیں کیا۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ ولایت کی تعلیم کا خیال اُن میں صرف مسلمانوں کی ریس اور سرسید کے شور و غل سے پیدا ہوا۔ مذہبی رُکاوٹیں ہمارے ملک کے ہندوؤں میں اور ہندوؤں سے بہت زیادہ تھیں، چنانچہ بعض شریف ہندو اسی جرم میں کہ اُنہوں نے ولایت جا کر تعلیم پائی برادری سے خارج کر دیے گئے۔ لیکن چونکہ تعلیم نے اُن کو ذکی الحس کر دیا تھا اور زمانہ کا ساتھ نہ دینے کے مضر نتائج سے وہ خوب واقف تھے اس لیے انھوں نے وہ تمام قیدیں جو ترقی کی مانع تھیں توڑ ڈالیں اور مسلمانوں کو ولایت کی تعلیم میں بھی اپنے سے آگے نہیں بڑھنے دیا۔

سرکاری ملازمت اور ہندوستانی ریاستیں

سرکاری یا غیر سرکاری ملازمت میں جس قدر ترقی مسلمانوں نے محمدن کالج کی تعلیم کے ذریعہ سے بواسطہ یا بلا واسطہ کی ہے اُس کا اندازہ اس طرح پر کرنا صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ اس کالج کے قائم ہونے سے پہلے مسلمان ملازموں کی تعداد کیا تھی اور اُس کے قائم ہونے کے بعد کہاں تک پہنچ گئی؟ یا یہ کہ ہندوستان کی دیگر قوموں کے ساتھ صیغۂ ملازمت میں اُن کو پہلے کیا نسبت تھی اور اب کیا ہے؟ بلکہ ہمارے نزدیک اُسکا اندازہ اس طرح ہونا چاہیے کہ اگر محمدن کالج قائم نہ ہوتا اور سرسید کی تحریک سے تمام ہندوستان کے مسلمانوں کو تعلیم کا خیال پیدا نہ ہو جاتا تو آج کے مسلمان سرکاری محکموں یا ہندوستانی ریاستوں میں ملازم پائے جاتے؟

سرکاری ملازمت کی جو شرطیں گذشتہ بیس سال میں وقتاً فوقتاً قرار پاتی رہی ہیں اور اُنھیں کے قریب قریب ہندوستانی ریاستوں میں بھی قیدیں لگتی چلی جاتی ہیں اُن پر لحاظ کرنے سے اس بات میں کچھ شبہ باقی نہیں رہتا کہ اگر اب تک مسلمان اُسی خواب غفلت میں رہتے اور انگریزی تعلیم سے جس قدر حصہ کہ اُنہوں نے اس عرصہ میں لیا ہے وہ حصہ نہ لیتے تو آج سرکاری دفتر اور محکمے اُن سے گویا بالکل خالی پاتے اور ہندوستانی ریاستوں میں بھی وہ شاید خال خال ہی نظر آتے۔

ذمہ داری کے عہدے۔ جو پہلے ہندوستانیوں کو ادنیٰ درجہ کی تعلیم یا سعی سفارش وغیرہ کے ذریعہ سے مل جاتے تھے۔ اب سوا اس کے کہ گورنمنٹ اپنے خاص اختیارات سے کسی مستثنیٰ آدمی کو دیدے گریجوٹس کے سوا کسی کو نہیں مل سکتے کومپٹیشن کے قاعدہ نے ایجوکیٹیڈ کلاس کے سوا ہر درجہ کے آدمیوں کو عمدہ خدمات سے گویا بالکل محروم کر دیا ہے۔ اور جس قدر ملازمت کے

امیدواروں کی تعداد بڑھتی جاتی ہے اُسی قدر ملازمت کی شرطیں روز بروز زیادہ سخت ہوتی جاتی ہیں سیکڑوں مڈل پاس اور انٹرینس پاس آٹھ آٹھ دس دس روپیہ ماہوار کی نوکری ڈھونڈتے پھرتے ہیں اور مشکل سے فیصدی دس کامیاب ہوتے ہیں۔

۱۸۷۸ء میں جبکہ محمڈن کالج کی عمر دو تین برس سے زیادہ کی نہ تھی۔ سرسید نے جو متعدد مضامین پنجاب یونیورسٹی اور مشرقی تعلیم کے خلاف لکھے تھے اُن میں ایک جگہ لکھتے ہیں "جب صدر عدالت دیوانی ہائیکورٹ نہیں ہوئی تھی مشرقی علوم اور مشرقی زبان کے نہایت ذی علم ولایق شخص وکالت کرتے تھے اور ایسے کامیاب تھے کہ زمانہ اُن پر رشک کرتا تھا دفعتہً ۱۸۶۶ء میں صدر عدالت دیوانی ہائی کورٹ ہوگئی اور یوروپین زبان نے اپنا رواج کیا۔ وہ بار آور درخت علوم مشرقی اور مشرقی زبان کے جنکی پھننگ آسمان تک پہنچی تھی اس طرح کملاکر زمین پر گر پڑے جیسے کوئی نیا نازک پودا پالے کے صدمہ سے جھلس جائے۔ اب ہائی کورٹ میں جاکر علماے علوم مشرقی کا حال دیکھو کہ اُن پر مکھیاں بھنکتی ہیں۔ نہ وہ اپنی ذات کا کچھ فائدہ کرسکتے ہیں، نہ ملک کا، نہ قوم کا، تمام عہدوں میں سے مشرقی علوم و مشرقی زبان خارج ہوگئی ہے دیوانی عہدوں میں جن کی بنیاد وکالت کے امتحان پر قایم ہوتی ہے مشرقی علوم و مشرقی زبان کی قدر دپرسش نہیں رہی ہے۔ ہم نے سنا ہے کہ ہائی کورٹ کی وکالت کے امیدواروں کی فہرست میں ایک بھی مسلمان نہیں۔ یہ بھی سنا ہے کہ ایک لایق تحصیلدار عالم علوم مشرقی کو امیدواران ڈپٹی کلکٹری کی فہرست میں اس لیے جگہ نہیں مل سکی کہ وہ انگریزی نہیں جانتا تھا"

سرسید کا یہ مضمون ۱۸۷۸ء کا لکھا ہوا ہے جس کو سترہ برس کا زمانہ گذر چکا ہے اور جس کے بعد سرکاری عہدوں کی شرطیں آج تک برابر سخت ہوتی چلی آئی ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس عرصہ میں جو تھوڑی بہت ترقی مسلمانوں نے انگریزی تعلیم میں کی ہے اگر اسکا اب تک کچھ ظہور نہوتا تو سرکاری معزز عہدوں پر شاذ ونادر ہی کسی مسلمان کی صورت نظر آتی اور پایونیر نے جو ۱۸۷۱ء میں صوبہ بنگال کی نسبت لکھا تھا کہ "تمام بنگالہ میں چند مسلمان عہدہ دار ہیں جو جلد پنشن لین گے اور اُن کی جگہ یقینی کوئی مسلمان نہیں ہونے کا اور آیندہ بجز چپراسی اور دفتری کے کوئی مسلمان معزز عہدہ پر نہیں دکھائی دیگا" بعینہ وہی حال صوبۂ پنجاب اور اضلاع شمال مغرب واودھ کا ہو جاتا کہ سرکاری عہدوں پر کسی مسلمان کی شکل دکھائی نہ دیتی۔ پس یہ سمجھ لینا چاہیے کہ کم سے کم شمالی ہندوستان میں جس قدر تعلیم یافتہ نوجوان مسلمان سرکاری عہدوں پر نظر آتے ہیں۔ عام اس سے کہ وہ محمڈن کالج کے تعلیم یافتہ ہوں یا کسی اور کالج کے

یہ سب اُسی شور و غل کا نتیجہ ہے جو سر سید نے ولایت سے آکر محمڈن کالج قایم کرنے اور مسلمانوں کو اُس کی طرف متوجہ کرنے کی غرض سے تمام ملک میں ڈالدیا۔

خصوصیاتِ محمڈن کالج

علی گڈھ محمڈن کالج کے جو نتایج اوپر بیان کیے گئے اگرچہ ان کو مسلمانوں کی اُس پست حالت کے لحاظ سے جو بیس بائیس برس پہلے تھی اور جو روز بروز زیادہ پست ہوتی جاتی تھی بہت غنیمت سمجھنا چاہیے لیکن ان نتایج سے محمڈن کالج کی کوئی ایسی خصوصیت ظاہر نہیں ہوتی جس کی روسے اُس کو ہندوستان کے اور کالجوں پر ترجیح دیجا سکے یا اُس کو مسلمانوں کے حق میں زیادہ مفید سمجھا جائے۔ سوا اِس کے کہ اس کالج میں ہندوستان کے اور کالجوں کی نسبت مسلمان طلبہ کی تعداد کسی قدر زیادہ پائی جاتی ہے کوئی تفاوت تعلیم اور نتایج تعلیم کے لحاظ سے محسوس نہیں ہوتا۔ نہ یہاں کے طالب علموں نے آجتک فضیلت اور علمی لیاقت میں اور کالجوں کے طلبہ پر کوئی صریح فوقیت دکھائی ہے اور نہ یہ ثابت کیا ہے کہ یونیورسٹی کے نتایج امتحان میں اس کالج کے تعلیم یافتہ بہ نسبت دیگر کالجوں کے زیادہ کامیاب ہوتے ہیں پس تا وقتیکہ کوئی وجہ امتیاز کی نہ بتائی جائے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے لیے اِس سے بہتر اور اِس سے بہتر اور اس سے مفید تر کوئی انسٹیٹیوشن نہیں ہے۔

بات یہ ہے کہ نفس تعلیم کے لحاظ سے ہمارے ملک کے کالجوں کو جب کہ اُن کی باگ ہندوستان کی موجودہ یونیورسٹیوں کے ہاتھ میں ہے ایک دوسرے پر ترجیح دینی ناممکن ہے ایک سانچے سے ایک ہی سے پرزے ڈھلکر نکلتے ہیں اور جس قسم کا بیج بویا جاتا ہے ویسی ہی جنس پیدا ہوتی ہے ؎

درپس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند　　آنچہ اُستادِ ازل گفت ہماں میگویم

بارہا خود مدبران سلطنت نے ایجوکیشنل درباروں میں کہا ہے کہ سرکاری کالج اور یونیورسٹیاں کامل تعلیم دینے سے قاصر ہیں۔ پس جو تعلیم کا اصلی مقصد ہونا چاہیے اُسکو سردست ہندوستان کے کسی کالج میں ڈھونڈھنا لاحاصل ہے ہاں اگر ہندوستانیوں میں اتنی ہمت اور اُس کے ساتھ قدرت بھی ہو کہ وہ بھی یورپ کے کالجوں اور یونیورسٹیوں کی طرح اپنے پرائویٹ کالجوں میں فیلو سسٹم جاری کریں یا اپنی یونیورسٹی الگ قایم کریں تو ممکن ہے کہ اس ملک میں بھی ویسے ہی محقق اور موجد و مخترع پیدا ہونے لگیں جیسے انگلستان فرانس اور جرمنی میں پیدا ہوتے ہیں مگر یہ سب ناشدنی باتیں ہیں جنکو ہندوستان کی آب و ہوا راس آتی معلوم نہیں ہوتی۔

لیکن اگر تعلیمی نتائج سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو محمڈن کالج میں ضرور ایسی خصوصیتیں موجود ہیں جن لحاظ سے اُس کو ہندوستان کے دیگر کالجوں کی نسبت زیادہ مفید کہا جا سکتا ہے اور جن سے ہماری مراد سامان تربیت ہے جس کو بانی کالج نے ہمیشہ تعلیم سے زیادہ اہم اور ضروری سمجھا ہے اور جس کے بغیر فی الواقع تعلیم کا عدم اور وجود برابر ہے یہی وہ چیز ہے جس کا ہماری درسگاہوں میں کبھی خیال نہیں کیا گیا اور اسی لیے ہم لوگ تربیت کے مفہوم سے جیسی کہ چاہیے واقفیت نہیں رکھتے۔ اگرچہ کالج کے بانیوں نے تربیت کے متعلق بہت کچھ تحریروں اور تقریروں میں بیان کیا ہے باوجود اس کے اکثر لوگ تربیت کے مفہوم سے ابتک ناواقف ہیں اور اسی واسطے محمڈن کالج کے کھیلوں پر اور طالب علموں کے لباس وغیرہ پر اعتراض کرتے ہیں۔ اسی خیال سے ہم چاہتے ہیں کہ اس مطلب کو زیادہ وضاحت سے بیان کریں۔ کیونکہ سرسید کی لائف میں اس سے زیادہ کوئی مہتم بالشان واقعہ نہیں ہے کہ اُنھوں نے مسلمانوں کی درسگاہ میں تربیت کی بنیاد ڈالی ہے۔

ہمارے ہاں تربیت اولاد کا آلہ زیادہ تر تعلیم و تلقین نصیحت و پند زجر و توبیخ، یا زد و کوب کو سمجھا جاتا ہے۔ مگر یہ تمام وسائل جب تک کہ لڑکے ایک معتدبہ زمانہ تک عمدہ سوسائٹی میں نہ رہیں اکثر صورتوں میں محض فضول اور بیکار ثابت ہوئے ہیں۔ مذکورۂ بالا وسائل سے اول تو اکثر صورتوں میں مضر نتائج پیدا ہوتے ہیں اور اگر کوئی عمدہ اثر دلوں پر ہوتا بھی ہے تو وہ نقش بر آب کی طرح جلد زائل ہو جاتا ہے۔ لیکن سوسائٹی کے اثر سے عمدہ اخلاق رفتہ رفتہ طبیعت ثانی بنجاتے ہیں اسی سوسائٹی کے اثر سے اہل یوروپ کے اخلاق اصولاً ایک سانچے میں ڈھلے ہوئے معلوم ہوتے ہیں اور اسی سوسائٹی کے میسر ہونے سے ہم لوگوں کے اخلاق و عادات میں باہم زمین و آسمان کا فرق معلوم ہوتا ہے۔

ہمارے لڑکے جب کسی درسگاہ میں آتے ہیں تو بجائے اسکے کہ اُن کو کچھ سکھایا اور یاد کرایا جائے زیادہ تر اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ جو کچھ وہ اپنے گھروں سے سیکھکر آئے ہیں اُس کو بالکل اُن کے دلوں سے بھلا دیا جائے۔ قطع نظر اُن عام خرابیوں کے جو ہندوستان کے اخلاق اور معاشرت میں عموماً پائی جاتی ہیں۔ ہم خاصکر اُن چند خصلتوں کا ذکر کرتے ہیں جو بالخصوص مسلمانوں کے ساتھ منسوب کی جاتی ہیں، جیسے مذہبی تعصبات، باہمی نزاع، رشک و حسد، غیبت بدگمانی، کاہلی، تن آسانی، تضیع اوقات، ادائے فرائض میں سستی کرنا، غصہ، بے اعتدالی

نافرمانی وغیرہ وغیرہ اور کچھ شک نہیں کہ انہیں سے اکثر خصلتیں مسلمانوں میں بہ نسبت دیگر اقوام کے زیادہ دیکھی جاتی ہیں، یہی باتیں جب چھوٹے بڑوں میں دیکھتے ہیں تو اُن کی طبیعتوں میں آہستہ آہستہ سرایت کرتی جاتی ہیں اور آخر کار اُن کی طبیعت ثانی بنجاتی ہیں۔

انہیں خرابیوں کے تدارک کے لیے محمدن کالج میں بورڈنگ سسٹم قایم کیا گیا ہے۔ مگر پہلے اس سے کہ ہم اس سسٹم کے فوائد اور یہ کہ اُس کو طلبہ کی تربیت میں کیا دخل ہے بیان کریں۔ یہ سمجھ لینا چاہیے کہ جس طرح تعلیم کے نتیجے اعداد کے ذریعہ سے دکھائے جا سکتے ہیں اس طرح تربیت کے نتائج نہیں دکھائے جا سکتے۔ نیز تعلیم کا اثر دفعتہً اور نمایاں ہوتا ہے اور تربیت کا اثر نامعلوم اور بتدریج ہوتا ہے جس طرح دھوپ اور ہوا اور پانی کی تاثیر سے پودے جو آہستہ آہستہ نشو و نما پاتے ہیں اُن کا نمو کرنا مالی کے سوا ہر شخص کو فوراً محسوس نہیں ہوتا اسی طرح تربیت کے نتائج بدیہی طور پر ایک مدت کے بعد ظاہر ہوتے ہیں۔ چونکہ کالج اور بورڈنگ ہوس کو قائم ہوئے کچھ بہت عرصہ نہیں گذرا اس لیے یہاں ہم کو زیادہ تر یہ دکھانا مقصود ہے کہ محمدن کالج میں مسلمان طلبہ کی تربیت کا کیا سامان مہیا کیا گیا ہے؟ وہ کہاں تک اُنکی حالت کے مناسب ہے؟ اور اُس سے آیندہ کن نتائج کی توقع ہو سکتی ہے؟ نہ یہ کہ اس طریقۂ تربیت سے ابتک کیا نتیجے مترتب ہو چکے ہیں؟

یکجائی رہن

سب سے زیادہ ضرورت مسلمانوں کی موجودہ اور آیندہ نسلوں میں اتفاق و یکجہتی و قومی ہمدردی پیدا کرنے کی ہے جس کے نہونے سے تمام قوم روز بروز مضمحل اور تباہ و برباد ہوتی جاتی ہے یہ امید رکھنی۔ کہ وعظ و نصیحت سے، یا اخباروں اور رسالوں میں اتفاق کے فوائد پر بڑے بڑے آرٹکل لکھنے سے، یا اس مضمون پر زوردار اور موثر نظمیں شائع کرنے سے مسلمانوں میں اتفاق پیدا ہو جائے گا۔ ایسی ہی بات ہے جیسے حُب کے عمل سے دشمنوں میں دوستی پیدا کرنی۔ اُن میں اتفاق پیدا ہونے کی صرف یہی ایک صورت ہے کہ اُن کی نسلیں اتفاق کے سایہ میں نشو و نما پائیں اور ایک مدت تک ایسی سوسائٹی میں زندگی بسر کریں جہاں مختلف خاندانوں، مختلف صوبوں اور مختلف مذہبوں کے لڑکے ایک ہال میں کھانا کھائیں۔ ایک مسجد میں نماز پڑھیں، ایک فیلڈ میں مردانہ کھیل کھیلیں ایک میدان میں گھوڑے دوڑائیں، ایک کلب میں ڈبیٹ کریں، ایک کالج میں پڑھیں اور ایک احاطہ میں دن رات سگے بھائیوں کی طرح شیر و شکر ہو کر رہیں اور اس طرح اتفاق کی حلاوت ماں کے دودھ کی طرح اُنکی رگ و پے میں سرایت کر جائے۔

ریاضتِ جسمانی

ریاضتِ جسمانی - جس کا سامان محمدن کالج میں ہندوستان کے تمام کالجوں سے زیادہ مہیا کیا گیا ہے اور جس میں یہاں کے طالب علموں نے تمام ملک میں بڑی شہرت حاصل کی ہے اکثر لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ اس سے طالب علموں کی طبیعت تعلیم سے اُچاٹ ہوجاتی ہے اور کالج میں رہنے سے جو اصل مقصود ہے وہ حاصل نہیں ہوتا۔ مگر جس قوم کی تقلید سے ہم اپنی اولاد کو انگریزی تعلیم دلواتے ہیں اُن کے ہاں ریاضت جسمانی تعلیم کا جزو غیر منفک سمجھی جاتی ہے۔ لیکن صرف اونکی تقلید ہی سے ریاضت جسمانی کو محمدن کالج میں ضروری نہیں ٹھیرایا گیا بلکہ اس لیے اُس کا زیادہ اہتمام کیا گیا ہے کہ جو طالب علم یہاں سے نکلیں وہ قوم میں مستعدی اور جفاکشی کی مثال ہوں اور سستی اور کاہلی جو مسلمانوں کی ایک قومی خصلت سمجھی جانے لگی ہے بجاے اس کے وہ اُن میں چستی و چالاکی کی بنیاد ڈالیں۔ وہ برخلاف اُن کتاب کے کیڑوں کے جو اپنے تمام قواے دماغی کتاب کی نذر کر دیتے ہیں اور زندہ دلی و شگفتگی اور تمام اُمنگیں اور چاؤ بلکہ بعض صورتوں میں اپنی زندگی تک تعلیم پر قربان کر دیتے ہیں جب کالج کو چھوڑیں تو لکھنے پڑھنے کے سوا وہ دنیا کے تمام کاموں کے لایق ثابت ہوں۔

وہ ہندوستان کے عام خیالات کے برخلاف - جہاں ایک شخص کا سپاہی اور عالم ہونا گویا اجتماع ضدین سمجھا جاتا ہے تعلیم یافتہ بھی ہوں اور سپاہی بھی۔ وہ اُن فرسودہ دماغوں کی طرح - جن میں کثرت مطالعہ سے تحمل اور برداشت کی طاقت نہیں رہتی - چڑچڑے، نازک مزاج اور بد دماغ نہ بنجائیں - اگر اُن کو یورپین افسروں کی ماتحتی میں رہنے کا اتفاق ہو تو محنت اور جفاکشی کے موقعوں پر اُن کا ساتھ دینے سے عاجز اور اُن کی نظر میں ذلیل نہوں۔ وہ ملکی اور فوجی دونوں قسم کی خدمات کے لیے انتخاب ہو سکیں - اگر اُن کو نوکری میسر نہ آئے تو اپنے دست و بازو پر بھروسا کر کے ہر کام پر ہاتھ ڈالنے کی جرات کر سکیں - اُن میں ایسی مستعدی پیدا ہو جائے کہ بیکاری اور آرام طلبی - جو مسلمانوں کی قومی خصلت بن گئی ہے اور جس کے سبب سے عرب میں "ہندی بطال"[1] ایک مثال ہوگئی ہے اُن کو وبال معلوم ہونے لگے۔ وہ غیر ملکوں کے سفر سے نہ ہچکچائیں - وہ سختیوں کے جھیلنے کے عادی ہوجائیں - انھیں اغراض کے لیے محمدن کالج میں ریاضت جسمانی پر زیادہ زور دیا گیا ہے اور حق یہ ہے کہ محض تعلیم سے کوئی قوم ترقی نہیں کر سکتی جب تک کہ اُس میں دلیری اور مستعدی کا عنصر پیدا نہو - لارڈ ڈفرن اپنے عہد حکومت میں جب محمدن کالج کے ملاحظہ کو آئے اور

---

[1] عربی میں بطال نکمے اور بیکار آدمی کو کہتے ہیں۔

توکس قدر باقاعدگی اور اطاعت اُن کی طبیعت میں پیدا ہوجائے گی؟ اور کس قدر وہ دنیا میں ہر جگہ ہر دل عزیز ہوکر رہنا سیکھ جائیں گے۔

ایسی اطاعت جو قواعد و اصول پر مبنی ہو اُس کی عادت اولاد کو ابتدائے عمر میں ڈلوانی ایسی ہی ضروری ہے جیسے ایلی بچھیڑے کو سدھا کر اور پاؤں پر صاف کرکے سواری کے قابل بنانا۔ جس طرح اُوکھے اور سرکش گھوڑے کا کوئی خریدار نہیں ہوتا اسی طرح نافرمان آدمی کہیں عزیز نہیں سمجھا جاتا۔ اکثر انگریز افسروں نے لوگوں سے یہ شکایت کی ہے کہ مسلمان ایسے فرمانبردار نہیں ہوتے جیسے ہندو، اور اسی لئے یوروپین افسر اُنکی نسبت ہندوؤں کو زیادہ پسند کرتے ہیں اگر فی الواقع یہ شکایت صحیح ہے تو مسلمانوں کی اولاد جن کا مدارِ معاش اب تک صرف نوکری پر رہا ہو اُن کو سب سے زیادہ اطاعت اور فرمانبرداری سکھانے کی ضرورت ہے۔ یہ سمجھنا کہ آزادی اور اطاعت میں منافات ہے محض ایک غلط خیال ہے انگریزوں کی قوم دنیا میں سب سے زیادہ آزاد خیال اور آزاد طبع سمجھی جاتی ہے، حالانکہ اُن سے بڑھکر کوئی اپنے افسر کا حکم ماننے والا اور قانون پر چلنے والا اور قواعد کی پابندی کرنے والا نہیں ہوتا۔ پس محمدن کالج کے بورڈنگ ہوس میں رہنے سے مسلمانوں کی اولاد ایک ایسی خصلت سیکھتی ہے جس پر اُن کی تمام آیندہ کامیابیاں منحصر ہیں۔

قومی لباس کا خیال

اس کے سوا مسلمانوں میں قومیت کا خیال پیدا کرنے کے لئے ایک اور چیز کی ضرورت ہے جسکو آج تک ہندوستان کے عام مسلمانوں نے قابل التفات نہیں سمجھا، حالانکہ وہ ایک نہایت مہتم بالشان مسئلہ ہے لباس جسکی نسبت ہمارے بزرگوں کا یہ قول تھا کہ الناس باللباس اور جس سے ایک قوم کی دوسری قوم سے تمیز کیجاتی ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں نے اُنہیں کوئی امتیاز باقی نہیں رکھا۔ انگرکھا، پاجامہ، ٹوپی، عمامہ، پگڑی یا جوتہ غرضکہ کوئی چیز مسلمانوں کے لباس میں ایسی نہیں ہے جس پر قومی خصوصیت کا اطلاق ہوسکے۔ ہندو مسلمانوں میں پہلے صرف اُلٹے اور سیدھے پردہ کی تمیز تھی مگر جب سے اچکن کا رواج ہوا ہے یہ تمیز بھی باقی نہیں رہی۔ قطع نظر اور ملکوں کے۔ جہاں ہر قوم ایک خاص لباس رکھتی ہے۔ خود ہندوستان میں اکثر معزز قومیں ہیں جو صرف اپنی قوم کے لباس سے پہچانی جاتی ہیں، جیسے پارسی، مرہٹے، بنگالی، راجپوت وغیرہ مگر مسلمانوں کے لباس میں کوئی قومی خصوصیت نہیں پائی جاتی۔ لباس کا متحد ہونا قومی یگانگت کے بڑھانے اور مغایرت کے دور کرنے میں ویسا ہی دخل رکھتا ہے جیسا زبان، نسل اور مذہب کا متحد ہونا۔ اس کے سوا جس قوم کے لباس میں کوئی قومی خصوصیت نہیں ہوتی اُن کی مجلسیں

اُنکے میلے اور اُنکی جماعتیں دوسری قوموں کی نظر میں ایک گوہار سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں۔

اسی سبب سے سرسید کو ہمیشہ یہ خیال رہا ہے کہ ہندوستان کے مسلمان بھی اور قوموں کی طرح اپنے لباس میں کوئی خصوصیت اور مابہ الامتیاز پیدا کریں، اور چونکہ بقول اُن کے آج ہندوستان میں کوئی مسلمان اتھارٹی ایسی موجود نہیں ہے جو ایک نیشنل لباس اختراع کرے اور اُسکے رواج دینے پر زور دے۔ اس لئے انھوں نے مسلمانوں کی ایک معزز ترین قوم یعنی ترکوں کا لباس اول خود اختیار کرکے قوم میں ایک مثال قائم کی اور پھر محمدن کالج کے بورڈروں کے لئے اس قاعدہ کے موافق جیسے قسطنطنیہ کی درسگاہوں میں عملدرآمد ہے یونی فارم کا قاعدہ جاری کرنیکا ارادہ کیا۔ مگر بعض موانع کے سبب وہ قاعدہ جاری نہیں ہوسکا۔ لیکن محمدن کالج کے طالب علم جو بورڈنگ ہوس میں آکر رہتے ہیں بغیر کسی جبر کے اپنے ہمچشموں کو دیکھکر خود بخود ٹرکش لباس اختیار کرلیتے ہیں جو علاوہ خوش قطع اور خوشنما ہونیکے ہر موسم اور ہر حالت کے مناسب اور قواعد حفظ صحت کے بھی موافق ہے۔ اور جب وہ کالج چھوڑکر وہی لباس اپنے وطن میں جاکر پہنتے ہیں تو اکثر قوم کے نوجوان اُنکی دیکھا دیکھی وہی لباس اختیار کرلیتے ہیں اور اسی طرح محمدن کالج ہندوستان کے مسلمانوں میں آہستہ آہستہ ایک قومی لباس کو رواج دے رہا ہے۔

اگرچہ بعض سنگدل انگریز جو ہندوستانیوں کو پست اور ذلیل حالت میں دیکھنا پسند کرتے ہیں وہ اس لباس سے ناراض ہوتے ہیں لیکن چونکہ گورنمنٹ نے ہم کو ہر قسم کا لباس پہننے کی آزادی دی ہے اور انگریزوں میں بھی زیادہ تر وہی فیاض اور آزاد طبع لوگ ہیں جنکے ایسے متعصبانہ خیالات نہیں ہیں اسلئے محمدن کالج کے طالب علم نہایت آزادی سے ٹرکش لباس پہنتے ہیں اور کسی کی بیجا ناخوشی یا ناگواری کا خیال نہیں کرتے۔

کالج یونین کلب

نیز بورڈروں نے کالج کے احاطہ میں متعدد سوسائٹیاں قائم کر رکھی ہیں۔ از انجملہ ایک کالج یونین کلب اور دوسری اسکول یونین کلب ہے۔ کالج اور اسکول کے طلبہ ہفتہ میں ایک روز مختلف مضامین پر اپنے اپنے صدر انجمن کے روبرو انگریزی یا اردو میں معارضانہ بحث کرتے ہیں مگر کوئی بات واہیات مناظرہ اور تہذیب کے خلاف زبان پر نہیں لاسکتے۔ جو لڑکے ڈبیٹ یا اسپیکنگ میں عمدہ لیاقت ظاہر کرتے ہیں اُن کو انعام دئے جاتے ہیں۔ اس سے علاوہ اسپیکنگ اور استدلال کا ملکہ پیدا ہونے کے بڑا فائدہ یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں جو مجادلہ کا ناپسندیدہ طریقہ عموماً جاری ہے اُس کی اصلاح کی اُن میں بنیاد پڑتی ہے اور طالبعلم

مختلف سوالات پر بحث کرنے کے لئے مختلف کتابیں دیکھنے اور ہر ایک سوال پر رائے قائم کرنے کا موقع ملتا ہے۔

طالب علموں ہی نے ایک دوکان ڈیوٹی شاپ کے نام سے بورڈنگ ہوس میں کھول رکھی ہے جو مختلف طریقوں سے روپیہ جمع کرکے کالج اور طلبہ کی مدد کرتی ہے اس سے اُنکے دلمیں کالج کے ساتھ ہمدردی اور اُس کی امداد کے لئے عملی کام کرنیکی خود بخود ترغیب ہوتی ہے۔

ایک اور سوسائٹی براورہڈ کے نام سے قائم کی گئی ہے جسمیں اُن تمام طالب علموں نے جو تعلیم ختم کرنے کے بعد کہیں نوکر ہو گئے ہیں اپنی آمدنی میں سے فیصدی ایک روپیہ ماہوار چندہ محض کالج کی امداد کے لئے دینے کا وعدہ کیا ہے۔

اِسکے سوا دو اور سوسائٹیاں ہیں ایک انجمن اخوان الصفا جس میں اُس کے ممبر آزادی کے ساتھ مختلف عنوانوں پر مضامین لکھ کر پیش کرتے ہیں۔ دوسری لجنتہ الادب جو عربی زبان میں تقریر یا تحریر کی مشق کرنے کے لئے قائم کی گئی ہے۔

ایک اور سوسائٹی حال ہی میں سائنس پر لکچر دینے اور اس کے تجربے دکھانے کے لئے طالب علموں نے قائم کی ہے جس کا مقصد ہندوستانیوں میں علمی مذاق پیدا کرنا ہے۔ یہ سوسائٹی گو ابھی ابتدائی حالت میں ہے مگر چونکہ وہ زمانہ کے مقتضا کے موافق ہے اسلئے اُسکے ترقی کرنے کی بہت کچھ امید کیجاتی ہے۔

ان سب سوسائٹیوں کے علاوہ ریاضت جسمانی کے لئے کرکٹ اور فٹ بال اور جمناسٹک کلب اور گھوڑے کی سواری کے لئے رائڈنگ اسکول ہے۔ اگرچہ رائڈنگ اسکول نے مسلمانوں کی کم ہمتی یا بے مقدوری کے سبب ابھی تک کچھ زیادہ ترقی نہیں کی مگر جو کلب یا ریاضت جسمانی کے لئے قائم ہیں انہیں توقع سے بہت زیادہ ترقی ہوئی ہے جسکی وجہ سے کالج ٹیم نے تمام ہندوستان کی یوروپین اور ہندوستانی ٹیموں میں۔ جیسا کہ کالج کی سالانہ رپورٹوں سے ظاہر ہے۔ توقع سے بہت زیادہ شہرت حاصل کی ہے۔

مذہبی تعلیم و تربیت بھی اس کالج کی خصوصیات میں سے ہے۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ یہ شاخ جیسی کہ ایک محمدن کالج میں ہونی چاہئے ابھی تک اُس درجہ پر نہیں پہنچی لیکن اس کا الزام سرسید یا کالج کے اور منتظموں پر عائد نہیں ہوتا۔ اول تو دو مذہبی کمیٹیاں جو شیعہ اور سنی دونوں کی مذہبی تعلیم کی نگرانی اور انتظام کے لئے جدا جدا مقرر رہتیں اور جن سے سرسید

نے لوگوں کی بدگمانی کے خیال سے خود علیحدگی اختیار کی تھی اُنھوں نے کبھی اس طرف توجہ نہیں کی[1] دوسرے دنیوی تعلیم کے کورس جو یونیورسٹی وقتاً فوقتاً مقرر کرتی ہے وہ اس قدر مشکل اور طویل الذیل ہوتے ہیں کہ اُن کے پورا کرنے میں طلبہ کو دوسری طرف متوجہ ہونے کا بہت ہی کم موقع ملتا ہے، یہاں تک کہ اگر اُن پر مذہبی تعلیم کا زیادہ بوجھ ڈالا جائے تو دو حال سے خالی نہیں، یا تو وہ کالج چھوڑ دیں گے یا یونیورسٹی کے امتحانوں میں کامیاب نہ ہوسکیں گے۔ بااینہمہ جس قدر مسلمانوں کی مذہبی تعلیم و تربیت کا اہتمام اس کالج میں کیا جاتا ہے اور جس کی تفصیل اس کی سالانہ رپورٹوں میں ہمیشہ چھپتی ہے۔ ہندوستان کے کسی کالج میں اس کا وجود نہیں ہے۔

یہ سچ ہے کہ انگلستان کے جن کالجوں کی تقلید سے اس کالج میں تربیت کا مذکورۂ بالا سامان مہیا کیا گیا ہے اُن کے مقابلہ میں اس کالج کو مشکل سے ایک خاکا یا ایک ادھورا نمونہ اُن کالجوں کا کہا جاسکتا ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ انگلستان کے مذکورہ بالا کتنی کتنی مدت میں موجودہ حالت تک پہنچے ہیں تو جس حد تک علی گڈھ محمدن کالج بیس بائیس برس کے عرصہ میں پہنچ گیا ہے اس سے کچھ کم تعجب نہیں ہوتا۔ انگلستان کے بڑے بڑے نامور کالج اور یونیورسٹیاں جو آج تمام یورپ میں مشہور و معروف ہیں کئی کئی سو برس تک نہایت گمنامی اور پستی کی حالت میں رہی ہیں اور جس قدر بتدریج قوم میں تعلیم بڑھتی گئی اُسی طرح آہستہ آہستہ اُن کی حالت ترقی کرتی گئی۔ پس ہم کو اس کالج کی موجودہ حالت پر نظر کرنی نہیں چاہئے بلکہ یہ دیکھنا چاہئے کہ جن اصول پر وہ قائم کیا گیا اگر انھیں اصول کے موافق وہ ترقی کرتا چلا گیا تو پچاس ساٹھ ہی برس میں وہ کس درجہ پر پہنچ جائیگا۔

بے شک کالج کے اندرونی انتظامات میں بہت سی باتیں قابل اعتراض موجود ہیں جنکو سرسید کی خودرائی اور ضد اور ہٹ کا نتیجہ کہا جاتا اور کچھ شبہ نہیں کہ لوگوں کا یہ کہنا بالکل غلط نہ تھا لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی ضرور ہے کہ صدیوں کے کام مہینوں اور دنوں میں پورے نہیں ہوسکتے اور ایک شخص کی طاقت سے باہر ہے کہ وہ اپنی زندگی میں ایک قومی انسٹی ٹیوشن کو اس حد تک

[1] مگر ۱۹۰۵ء میں برخلاف سنین ماضیہ کے نواب محسن الملک اور مولوی حبیب الرحمان خاں کی توجہ سے کمیٹی اہل سنت میں مذہبی تعلیم کے ترقی دینے کا زیادہ خیال پیدا ہوا ہے اور اس غرض سے اُس کے جلسے جلد جلد منعقد ہونے لگے ہیں ۱۲

پہنچا جائے جس کے بعد کسی اصلاح یا ترقی کی ضرورت باقی نہ رہے۔ اور ایک لفارمر جس نے اگلے وقتوں کے بہت سے خیالات اور بہت سی رایوں کی اصلاح کی ہو اُس کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ ساتھ کے ساتھ اپنے خیالات اور اپنی رایوں کی بھی اصلاح کرتا جائے۔

یورپین اسٹاف

ایک اور خصوصیت اس کالج کی یوروپین اسٹاف ہے جس کو بانی کالج نے متعدد وجوہ سے نہایت اہم اور ضروری سمجھا ہے۔ اُنکی رائے تھی کہ اول تو ہندوستانی تعلیم یافتہ علمی لیاقت اور طرز تعلیم کے لحاظ سے بھی یوروپین پروفیسروں کی برابری نہیں کرسکتے اور اگر بالفرض ایسے لایق ہندوستانی پروفیسر میسّر بھی آجائیں تو اُن کا اثر طلبہ کی تربیت پر جو اس کالج کا اصلی مقصود ہے ویسا ہرگز نہیں پڑسکتا جیسا انگریز پروفیسروں کا پڑسکتا ہے۔ ڈیوٹی کا خیال، وقت کی قدر، قواعد حفظ صحت کی پابندی، سلف ہلپ، مستعدی اور ریاضت جسمانی کی عادت، یہ تمام خصلتیں اور نیز میں بھی انگلش قوم کی خصوصیات میں شمار ہوتی ہیں۔ خصوصاً انگلستان کی مشہور یونیورسٹیوں کے گریجوٹ شریفانہ اخلاق کے لحاظ سے تمام قوم میں ممتاز گنے جاتے ہیں۔ اسکے سوا کالج کا نظم و نسق اور افسرانہ رعب داب جیسا کہ ایک انگریز معلم کالج یا اسکول میں قائم رکھ سکتا ہے ہندوستانی معلموں سے اُسکی ہرگز توقع نہیں کی جاسکتی۔ اسی لئے کالج کے قواعد میں یہ اصول قرار دیا گیا ہے کہ کم سے کم ایک پرنسپل اور دو پروفیسر کالج میں اور ایک ہیڈ ماسٹر اسکول میں ہمیشہ یوروپین ہونا چاہئے اور جہاں تک کالج کی آمدنی میں گنجائش ہو اس تعداد میں اور اضافہ کیا جائے اور جب کسی یوروپین پروفیسر کی ضرورت ہو تو انگلستان کی کسی مشہور یونیورسٹی کا گریجوٹ جس کی علمی اور اخلاقی فضیلت پر اُس کے اُستادوں نے شہادت دی ہو ایک ہزار روپیہ سفر خرچ دیکر بلایا جائے چنانچہ اب تک چار چار پانچ پانچ یوروپین افسر کالج اور اسکول میں برابر مقرر رہے ہیں اور اگر کالج فنڈ میں گنجائش ہو تو ممکن ہے کہ عند الضرورۃ اُنکی تعداد اس سے زیادہ بڑھجائے۔

اگرچہ بظاہر جو بیش قرار تنخواہیں یوروپین عہدہ داروں کو دیجاتی ہیں وہ کالج کی مالی حیثیت سے بہت زیادہ معلوم ہوتی ہیں لیکن حق یہ ہے کہ یوروپین اسٹاف نے عام طور پر اُس ضرورت کو بخوبی ثابت کردیا ہے جس کی بنا پر سرسید نے اُن کو کالج کا جزو اعظم قرار دیا ہے۔ وہ وجوہ قومی، مذہبی اور ملکی مغایرت کے محمدن کالج کو گویا اپنا قومی انسٹی ٹیوشن سمجھتے ہیں، وہ اپنے طلبہ کے ساتھ مشفقانہ اور برادرانہ برتاؤ رکھتے ہیں، ان کے کھیلوں میں، اُن کی دعوتوں اور پارٹیوں میں، ان کی مجلسوں میں، اور اُن کے مباحثوں میں خود بھی شریک

ہوتے ہیں اور اسٹیشن کے یوروپین افسروں اور ان کی لیڈیوں کو شریک کرتے ہیں، اور اس طرح ان کا حوصلہ بڑھاتے ہیں۔ وہ اس لئے کہ گورنمنٹ اور انگریزوں کی نظر میں اُن کا اعتبار زیادہ ہو۔ اُن کو گورنمنٹ کا ادب اور انگریزوں کی محبت سکھاتے ہیں خود ان کا برتاؤ جو ہندوستانی طالب علموں کے ساتھ ہے انگلش نیشن کی محبت اور وقعت اُنکے دل میں پیدا کرتا ہے۔ وہ طرح طرح سے اُن کو غیرت دلاتے ہیں اور اُن کی غفلت کے نتائج سے اُن کو خبردار کرتے ہیں وہ اپنی عمدہ خصلتوں، شائستہ عادتوں، فرائض کی پابندی، صفائی، ضبط اوقات اور دیگر خوبیوں سے طالب علموں کے کیرکٹر پر نہایت قوی اور پائدار اثر پیدا کر رہے ہیں جو کسی اور طریقے سے پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ غریب طالب علموں کی طرح طرح سے امداد اور تقویت کرتے ہیں، بیماروں کی خبر لیتے ہیں، کالج کے چندوں میں شریک ہوتے ہیں۔ اس کی ترقی کی تدبیریں سوچتے ہیں، اس کی محبت طالب علموں کے دل میں پیدا کرتے ہیں اور اُس میں وہ تمام انتظامات اور تربیت کے طریقے جو انگلستان کے کالجوں میں جاری ہیں آہستہ آہستہ جاری کرتے جاتے ہیں۔ وہ باوجود مذہبی اختلاف کے مسلمان لڑکوں کی مذہبی تعلیم و تربیت کا خیال خود مسلمانوں سے زیادہ رکھتے ہیں۔ مسجد کی غیر حاضری پر اُن کو سزائیں دیتے ہیں، مذہبی تعلیم اور قرآن خوانی کی ان کو تاکید کرتے ہیں، مولود کی مجلسوں اور اُن کے دیگر مذہبی اجتماعوں میں شریک ہوتے ہیں۔

ایک بڑا بدیہی ثبوت اس بات کا کہ وہ محمڈن کالج میں کس وقعت اور محبت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ یہ ہے۔ کہ مسٹر آرنلڈ پروفیسر آف فلازفی جو کالج کی بدقسمتی سے یہاں کا تعلق ترک کرکے لاہور کالج میں چلے گئے ہیں۔ اُن کی روانگی کے زمانہ میں ہر شخص کو جو کالج سے تعلق رکھتا تھا اس قدر افسوس ہوا تھا کہ بیان نہیں ہو سکتا۔ خصوصاً کالج کلاسوں کے طالب علم جو اُن کا

لیکچر سنتے تھے اُن کو مسٹر آرنلڈ کی اور مسٹر آرنلڈ کو اُنکی جدائی کا جس قدر رنج اور قلق ہوا تھا اُسکی مثال ملنی مشکل ہے اُن سے پہلے جب مسٹر داس پروفیسر اور مسٹر ہورسٹ ہیڈ ماسٹر نے کالج سے قطع تعلق کیا تھا اُس وقت بھی تمام کالج کو اسی کے قریب قریب رنج ہوا تھا جیسا کہ اس سال مسٹر آرنلڈ کے جانے سے ہوا اور اسی طرح مسٹر ڈنٹن مرحوم ہیڈ ماسٹر کے قبل از وقت مرجانے پر کالج کے تمام متعلقین نے مثل اپنے عزیزوں کے رنج و ماتم کیا ہے۔ اگرچہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کالج کو ہمیشہ ایسے ہی دلسوز اور مسلمانوں کے ہمدرد پروفیسر ملتے رہیں گے جن کا ذکر اوپر ہوا یا جیسے کہ اب کالج میں موجود ہیں لیکن بہر حال یورپین اسٹاف کا اس کالج میں ہونا خاص کر مسلمانوں کی حالت کے لحاظ سے نہایت ضروری ہے۔

غدر ۱۸۵۷ء سے۔ بلکہ اُس وقت سے جبکہ ہندوستان کی سلطنت مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل کر انگلش قوم کے ہاتھ میں گئی۔ ہندوستان کے مسلمانوں کا حال بعینہٖ ایک نوجوان بیوہ کا سا رہا ہے۔ کہ کیسی ہی عفیفہ اور پاک دامن ہو مگر بدگمانیوں سے کسی طرح نہیں بچ سکتی۔ پس ہندوستان کے مسلمانوں کو جس طرح اپنے مذہب کی رو سے اس بات کی ضرورت ہے کہ سچے دل سے انگلش گورنمنٹ کے وفادار رہیں اسی طرح ملکی مصلحت سے یہ بھی ضروری ہے کہ حکمراں قوم کو کبھی اپنی طرف سے بدگمان ہونے کا موقع نہ دیں۔ آج کل انگریزی تعلیم سے انگریزوں میں تقریباً ویسی ہی بدگمانی پائی جاتی ہے جیسی کسی زمانہ میں جہالت اور تعصب سے پائی جاتی تھی۔ پس ایک ایسا انسٹی ٹیوشن جہاں چار چار سو مسلمان طالب علم ایک وقت میں انگریزی تعلیم پاتے ہوں اور کئی کئی برس تک دن رات وہیں زندگی بسر کرتے ہوں جب تک کہ اُس میں متعدد یورپین افسر اُن کے نگراں اور اُن کے خیالات کی اصلاح کرنیوالے موجود نہ ہوں ہرگز حکمراں قوم کے اطمینان کے لایق نہیں ہو سکتا۔

انھیں خیالات سے سرسید نے کم سے کم چار یورپین افسروں کا ہمیشہ کالج اور اسکول

میں رہنا کالج کے قواعد میں داخل کر دیا ہے اور اس تدبیر سے کالج کو بہت فائدہ پہنچا ہے اور اس سے بہت زیادہ فائدے پہنچنے کی آئندہ توقع ہے۔ زیادہ تر اسی خصوصیت کی وجہ سے گورنمنٹ پندرہ ہزار چھ سو روپیہ سالانہ کی امداد اس کالج میں دیتی ہے اور اسی سبب سے تمام اینگلو انڈین افسر اور حکام عموماً اس کی نسبت عمدہ خیال رکھتے ہیں۔ دور دور سے نواب لوگ سردار زادوں اور رئیس زادوں کو تعلیم کے لئے یہاں بھیجتے ہیں۔ ہر صوبہ میں یہاں کے طالبعلموں کو خوشی سے نوکریاں دیتے ہیں بعض اوقات پرنسپل سے خود درخواست کرکے یہاں کے طلبہ کو نوکری کے لئے بلاتے ہیں، بڑے بڑے جلیل القدر انگریز کالج کو آکر دیکھتے ہیں۔ پانچ ویسرائے اور چھ سات لفٹنٹ گورنر اب تک یہاں آچکے ہیں۔ لارڈ ناتھ بروک نے دس ہزار روپیہ اسکالرشپوں کے لئے اس کالج کو عنایت کیا ہے اور ان کے سوا کئی ویسراؤں اور لفٹنٹ گورنروں نے اس میں چندے یا تمغے دیئے ہیں خصوصاً سرسید کی وفات کے بعد جو خاص توجہ اور مربیانہ سرپرستی حضور لارڈ ایلگن اور آنریبل مسٹر لاٹوش اور سر انٹونی مکڈانل نے کالج کی نسبت ظاہر فرمائی اس کی شکرگزاری سے ہندوستان کے تمام مسلمان عموماً اور منتظمان کالج خصوصاً کسی طرح سبکدوش نہیں ہوسکتے۔ اور کچھ شک نہیں کہ یہ تمام امتیازات زیادہ تر یوروپین اسٹاف اور خاص کر مسٹر تھیوڈور بک پرنسپل کالج کی بدولت اس انسٹی ٹیوشن کو حاصل ہوئے۔ انھیں وجوہات سے سرسید کالج کی باگ کسی ایسے شخص کے ہاتھ میں جانی نہیں چاہتے تھے جس سے یوروپین اسٹاف کے ساتھ ویسا ہی برتاؤ رکھنے کی جیسا کہ وہ خود ان کے ساتھ رکھتے تھے توقع نہ ہو۔

مدبران سلطنت کی رائیں (؟)

جو رائیں اور خیالات محمڈن کالج یا اس کے طلبہ اور اس کے بانی کی نسبت مدبران سلطنت نے وقتاً فوقتاً اپنی تحریروں یا تقریروں میں ظاہر کئے ہیں ان میں سے بعض کے کچھ کچھ فقرے انتخاب کرکے ہم اس مقام پر نقل کرتے ہیں۔

۱۸۸۰ء میں سر جان اسٹریچی نے اس ایڈریس کے جواب میں جو ہندوستان کے

جاتے وقت اُن کو کالج میں دیا گیا تھا کہا کہ " سب سے بڑا اور اخیر کام جس میں اُنھوں نے (یعنی سید احمد خاں نے) اپنی زندگی اور اپنے تمام وسائل کو صرف کیا ہے یعنی اپنے ہم وطنوں کی تعلیم اور اُن کی حالت کو ترقی دینے اور مسلمانوں اور انگریزوں کے درمیان زیادہ تر اتحاد اور ہمدردی پیدا کرنے کا وہ کام ہے جس کے بعض نتیجوں کو ہم مشاہدہ کر رہے ہیں۔ مجھکو کچھ شبہ نہیں کہ یہ نتیجے زمانہ آئندہ میں اور بھی زیادہ عجیب وغریب ہو سکتے۔ لیکن اب بھی میں اس کالج کی ترقی کو شمالی ہندوستان کی پچھلی تواریخ کے نہایت عظیم اور دلچسپ واقعات میں سے تصور کرتا ہوں "

پھر صاحب ممدوح نے اپنی کتاب " انڈیا " میں اوّل ایجوکیشن کمیشن کی رپورٹ کا یہ فقرہ جو محمڈن کالج کے متعلق ہے نقل کیا ہے کہ " بعض اعتبارات سے یہ کالج ہندوستان میں سب انسٹیٹیوشنوں سے اعلیٰ درجہ کا انسٹیٹیوشن ہے جو تعلیمی اور ملکی دونوں حیثیتوں سے بڑی عظمت اور وقعت کا وعدہ کرتا ہے انگریزی حکومت کے آغاز سے کہ اب تک مسلمانوں کی ذاتی کوشش کا یہ پہلا اظہار ہے۔ علی گڑھ کی جماعت نے ایک مثال پیدا کی ہے جس کی اگر اچھی طرح سے پیروی کی جاوے تو قومی تعلیم کا مسئلہ حل کر دیگی۔ اُن لوگوں کی جنھوں نے ایسی دلسوزی سے محنت کی ہے اور اُس مدد کی جو سرکار کو تعلیم اور ترقی کے کام میں ملا ہے یہاں تک قدر و منزلت کی جائے نامناسب نہ ہوگی " اس کے بعد وہ اپنی کتاب " انڈیا " میں اہل انگلستان سے محمڈن کالج کی سفارش کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ " اُنھیں (یعنی اہل انگلستان کو) اپنی مدد سید احمد خاں کے کالج کے واسطے بھیجنی چاہیئے۔ اُن کو اس سے زیادہ طمانیت بخش موقع نیکی کرنے کا نہیں ملے گا "

ڈاکٹر ہنٹر نے ۱۸۸۲ء میں جب کہ وہ ایجوکیشن کمیشن کے پریسیڈنٹ تھے اضلاع شمال مغرب کے دورہ کے وقت صرف محمڈن کالج کی عظمت وشان کے لحاظ سے کمیشن کا پہلا اجلاس علی گڑھ میں کیا اور اپنی اخیر اسپیچ جو ایجوکیشن کے باب میں تھی وہ کالج کے بڑے ہال میں آکر کی اور کالج کی نسبت کہا " صاحبو! یہ کالج جس میں ہم جمع ہوئے ہیں چونکہ یہ ایک نہایت عظیم اور شریف کوشش کا نتیجہ ہے جو ہندوستان میں مسلمانوں کے لئے کی گئی ہے۔ اس لئے کمیشن کا پہلا اجلاس جو اضلاع شمال مغرب میں ہونا چاہیئے تھا۔ علی گڑھ میں تجویز ہوا ہے ہم اُمید کرتے ہیں کہ ہماری موجودگی اور اس مقام پر آنا اُس سلف ہلپ کی عظیم الشان مثال کی خوبی کا ایک ثبوت خیال کیا جاوے گا۔ اگر ایسی ہی چند مثالیں سلف ہلپ کی اور ہوں تو ہندوستان میں ایجوکیشن کمیشن کی ضرورت نہ رہیگی " پھر کہا کہ " یہ ایک نہایت شریف کام ہے جو کسی فانی انسان کے ہاتھوں سے دنیا کے پردہ پر ہوا ہو اور یہ میرے پاس

موجود ہے وہ بہادر اور فیاض دل شخص جس نے بیس برس کی پُر صبر و پُر استقلال کوششوں سے اس کام کو انجام دیا ہے۔" پھر کہا کہ "پہلے دس برسوں میں میرے دوست سید کو اکثر مایوسیوں کا مونھ دیکھنا پڑا اور اُس کے اختیار کئے ہوئے کام میں بہت کم ترقی ہوئی۔ اُس کو اپنے بعض خیالات چھوڑ کر نئی تجویزیں اختیار کرنی پڑیں اور لوگوں کی مخالفت اور ناراضی اور اپنے پُرانے دوستوں کی سرد مہری اور جاہل دشمنوں کی پُر ضرر شورش نہایت تحمل سے برداشت کرنی پڑی مگر اُس نے ایک لمحہ کے واسطے ہمت نہ ہاری۔ رفتہ رفتہ مگر مضبوطی سے اُس کے مقصد نے ترقی پائی۔ لوگوں نے اُس پر اعتماد کیا کیونکہ وہ اپنے کام پر اعتماد رکھتا تھا۔"

سر الفریڈ لائل

سر الفریڈ لائل نے اس کالج کی نسبت کہا کہ "اس نظیر کے قائم کرنے سے کالج کے بانیوں نے گورنمنٹ اور رعایا اور علی العموم ہندوستان کی تعلیم کے حق میں ایک عمدہ خدمت کی ہے، کیونکہ وہ ہم کو ایک ایسے مسئلہ کے حل کرنے میں مدد دے رہے ہیں جو اب تک شاید ہی دنیا کے کسی حصے میں خاطر خواہ طور پر حل ہوا ہو۔"

سر اکلینڈ کالون

سر اکلینڈ کالون نے محمدن کالج کے طالب علموں کی نسبت کہا کہ "جو شخص ان نوجوان آدمیوں سے واقف ہے جو اس کالج سے پاس ہو کر نکلے ہیں وہ غالباً اس امر میں مجھ سے اتفاق کرینگے کہ وہ اپنی تعلیم و تربیت کی علامتیں ایسی ہی صاف صاف ظاہر کرتے ہیں جیسی کہ انگلستان میں ہمارے پبلک اسکولوں اور ہماری یونیورسٹی کے گریجوٹ ظاہر کرتے ہیں۔ علی گڑھ کالج کا طالب علم فیاضانہ خیالات اور ترقی یافتہ تعلیم و تربیت اور آزادانہ خصلت رکھنے والا شخص خیال کیا جاتا ہے، سب سے بڑھکر وہ ہندوستانیوں کے اُس فرقہ کا ایک نمونہ ہو گیا ہے جو انگریزوں کی خواہش کی بخوبی داد دینے کے واسطے کوشش کرتا ہے اور اُس کے ساتھ یہ بھی چاہتا ہے کہ ہم بھی اُن کی خواہشوں کی اسی طرح داد دیں۔"

مسٹر کین ممبر پارلیمنٹ

مسٹر کین جو پارلیمنٹ کے ایک نامور اور بنی نوع کے خیر خواہ ممبر ہیں اور جو پچھلے برسوں میں شراب اور مسکرات کے استعمال کے خلاف ہندوستان میں لکچر دینے اور اصلی حالات تحقیق کرنے کے لئے آئے تھے۔ اُنھوں نے سفر ہندوستان کے متعلق ایک کتاب موسوم بہ "پکچرسک انڈیا" لکھی ہے جس کے ایک باب میں علی گڑھ کالج کی نسبت نہایت عمدہ اور مفصل خیالات ظاہر کئے ہیں۔ اُن میں سے ہم چند فقروں کا خلاصہ اس مقام پر نقل کرتے ہیں وہ لکھتے ہیں کہ "محمدن اینگلو اورینٹل کالج دوسرے کالجوں سے اس بات میں امتیاز رکھتا ہے کہ وہ ایک خالص تعلیمی جوش کی نسبت زیادہ تر ایک پولٹیکل جوش پھیلانے والا ہے۔ اسی فیلنگ کا یعنی اس بات کا کہ قومی بہبودی اسی اصول پر منحصر ہے جس کا وہ پابند ہے یہ نتیجہ ہے کہ اُس کی بڑی امداد کی گئی ہے۔ نہ صرف مسلمانوں کا ترقی یافتہ گروہ - بلکہ گورنمنٹ انگریزی

بھی نہایت توجہ اور شوق سے اُس کی جانب نظر رکھتی ہے۔" دوسری جگہ وہ لکھتے ہیں کہ "گورنمنٹ کالجوں سے یہ کالج دو خاص باتوں میں مختلف ہے۔ اوّل تو اُس میں مسلمان طالب علموں کی مذہبی تعلیم کا بند و بست کیا گیا ہے دن میں پانچ مرتبہ اذان کی آواز سن کر طالب علم اس وسیع احاطہ کی تمام اطراف سے اپنے آبا و اجداد کے عقیدہ کے موافق عبادت کرنے کے لئے مسجد میں جمع ہو جاتے ہیں۔ نماز کے علاوہ قرآن اور دینیات اور اخلاق کی کتابوں کا پڑھنا کالج کے سلسلہ خواندگی کا ایک حصہ ہے۔ اس سے اُمید کی جاتی ہے کہ جو طالب علم اس کالج سے نکلیں گے وہ قدیم خیالات پر نئے علوم کا پیوند لگاوینگے اور اس کے ذریعہ سے پُرانے خیالات کے لوگوں کو اس بات پر آمادہ کرینگے کہ وہ زمانہ کے ساتھ ساتھ چلیں اور جو طریقہ قوم کو اس کی ذلیل حالت سے نجات دینے کا موجود ہے اُس کو اختیار کریں۔ دوسرا اصول جس میں یہ کالج سرکاری مدارس سے ممتاز ہے۔ یہ ہے کہ اُس میں بخلاف سرکاری مدارس کے صرف عقلی تعلیم ہی پر توجہ نہیں کی جاتی۔ بلکہ وہ انگلستان کی یونیورسٹیوں کے نمونہ پر قائم کیا گیا ہے۔ سب طالب علم ایک احاطہ میں رہتے ہیں، ایک جگہ کھانا کھاتے ہیں اور ایک صحت بخش کالج لائف سے حظ اُٹھاتے ہیں۔ کسی ملک میں ایک ایسے انسٹیٹیوشن کا پایا مشکل ہے جو اس کالج کی بہ نسبت زیادہ تر زبردست جوش باہمی اتحاد کا پیدا کرتا ہو۔ قوم کی اُمیدیں اس انسٹیٹیوشن کی کامیابی کے ساتھ وابستہ ہیں اور یہ ایک بڑی کوشش ہے جو ترقی اور اصلاح کے باب میں ایک ایسی قوم نے کی ہے جس میں تقدیر پر بھروسا کرنے کے عقیدے نے تمام ہمتیں اور ارادے پست کر دیئے ہیں۔" پھر کرکٹ کلب کے متعلق لکھتے ہیں کہ "کالج کی ایک ٹیم تمام ایرانڈیا میں ہندوستانی ٹیموں سے گوئے سبقت لے جاتی ہے۔ اور اسٹیشن کی نہایت عمدہ الیونوں کا مقابلہ کرتی ہے۔" پھر یونین کلب وغیرہ کی نسبت لکھتے ہیں کہ "ڈبیٹنگ سوسائٹی جو کیمبرج یونین کلب کے نمونہ پر قائم کی گئی ہے لڑکوں کو جلسہ عام میں گفتگو کرنے اور انگریزی طریقہ پر کاروبار انجام دینے کا سبق دیتی ہے۔ کالج کی دعوتوں اور جلسوں، مذہبی تہواروں، شاعرانہ صحبتوں، کرکٹ، فٹ بال اور اور جسمانی ورزشوں کے باعث نوجوان مسلمانوں کو اپنی زندگی مختلف طریقوں میں دل بہلانے کے لئے مدد ملتی ہے اور اُن کی مختلف لیاقتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ معلموں اور طالب علموں میں کسی قسم کا تفرقہ جو قومی اختلاف سے پیدا ہوتا ہے مطلق نہیں ہے۔ علی گڑھ میں انگریزوں اور ہندوستانیوں کے درمیان جو صفائی قلب اور دلی میل جول دیکھا جاتا ہے ویسا شاذ و نادر ہی ہندوستان میں کہیں اور دیکھا جاتا ہے۔ اسٹیشن کے انگریز جنٹلمین اور لیڈیاں کالج کے طالب علموں کی پنج پر دعوت کرتے ہیں اور کالج کے ہال میں اُن کے ساتھ دعوتوں میں شریک ہوتے ہیں۔ اس طرح پر محبت کی فیلنگ کی ایک ایسی بنیاد قائم کی گئی ہے کہ اگر اس کو ترقی ہو جائے تو وہ ہندوستان کے باشندوں اور انگریزی حکومت دونوں کے حق میں بے شمار فائدوں کا باعث ہوگی۔ ایسے موقعوں پر معزز بزرگ سید نے اکثر اوقات پر جوش سرگرمی کے

ساتھ اپنی یہ دلی آرزو ظاہر کی ہو انگریز اور مسلمان سچے دوست ہو جائیں اور ایک دوسرے کے اتفاق سے کام کیا کریں اور انھیں موقعوں پر اُس نے کالج کے اُس نشان کی طرف اشارہ کیا ہو جس میں ہلال پر ایک صلیب لگی ہوئی ہو۔"

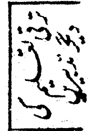
سر انٹونی مکڈانل

سر انٹونی مکڈانل نے جو ۱۸۹۶ء میں ٹرسٹیان کالج کی اڈریس کا جواب دیا تھا اس میں اُنھوں نے کالج کا ذکر کرتے وقت فرمایا "چنانچہ ہندوستان میں ہمارے عہد کی مصالحت آمیز فتوحات میں اس کالج کا قائم ہونا یقیناً ایک فتح ہو جس سے سب کے دلوں کو خوشی حاصل ہوتی ہو اور کسی کے دل کو تکلیف یا رنج نہیں پہنچتا۔ یہ ایک ایسی فتح ہو جس کی رونق مرور زمانہ کی وجہ سے کم نہیں ہوسکتی۔" پھر فرمایا کہ "میں اس انسٹیٹیوشن کو نہایت عزت کے لائق سمجھتا ہوں، جس طرح پر کہ میں کسی شخص کو پسند کرتا ہوں اسی طرح پر میں اُس انسٹیٹیوشن کو پسند کرتا ہوں جو آپ اپنے اوپر بھروسہ رکھتا ہو اور فخریہ طور پر آزاد ہو اور اسی کے ساتھ گورنمنٹ کی فیاضانہ مہربانی کی واجبی طور پر قدر کرتا ہو۔" پھر اسپیچ کے خاتمہ پر یہ الفاظ کہے "اس بات کی اُمید کرنا کچھ مبالغہ نہیں ہو کہ یہ کالج ترقی پاکر آئندہ مسلمانوں کی بڑی درس گاہ ہو جائیگا اور یہ مقام مشرق کا قرطبہ ہو جائیگا۔"

لارڈ ایلگن نے نومبر ۱۸۹۷ء میں جب کہ سرحد پر سرکاری فوج آفریدیوں سے لڑ رہی تھی اور ہندوستان کے مسلمانوں کی نسبت اینگلو انڈین اخبارات حکمران گروہ میں بدگمانی پھیلا رہے تھے محمدن کالج میں آنے کی خود خواہش ظاہر کی اور جو اڈریس ٹرسٹیان کالج کی طرف سے اُن کی خدمت میں پیش کیا گیا اُس کے جواب میں اُنھوں نے اُس وقت جب کہ کالج کے تمام طالب علم اُن کے سامنے حاضر تھے یہ فرمایا کہ "صاحبو! کوئی وقت ایسا نہیں ہو جب کہ اس قسم کا ایک مجمع میری طبیعت کو اس قدر خوش معلوم ہوسکے جیسا کہ یہ معلوم ہوتا ہو۔ پچھلے چند مہینوں میں اور اس وقت گورنمنٹ ہند بالکل اپنی خواہش کے برخلاف اُن قوموں کے ساتھ۔ جو تمھارے ہم مذہب ہیں۔ علانیہ لڑنے پر مجبور ہوئی ہو اور ایسے شخصوں کی کچھ کمی نہیں ہو جنھوں نے یہ بیان کیا ہو کہ ہندوستان میں انگریزی حکومت اور اُس کی مسلمان رعایا کے درمیان مخالفت روز بروز روبہ ترقی ہے۔ × × × صاحبو! ان قابل افسوس ہنگاموں کیا ہم نے پھر اُس بات کو دیکھا ہو جو ہم اکثر اوقات سابق میں دیکھ چکے ہیں، یعنی حضور ملکۂ معظمہ کی نسبت مسلمان رعایا کی خیر خواہی اور بہادری کو، اور میں اس جگہ پر ایک زیادہ تر پُرامن موقع پر اس بات کو تسلیم کرنے اور معلوم ہونے سے خوش ہوں کہ اس کالج کے اندر پُرامن صورتوں میں خیر خواہی اور وفاداری کا وہی جوش ترقی پر ہی جیسا کہ میدان جنگ میں ظاہر کیا گیا ہو۔"

یہ اور اسی قسم کے اور بہت سے عمدہ خیالات مدبرانِ سلطنت انگلشیہ اس کالج کی موجودہ حالت دیکھ کر وقتاً فوقتاً ظاہر کرتے رہے ہیں اور کچھ شبہ نہیں کہ ایک تعلیمی انسٹیٹیوشن کی عمدگی پر ان لوگوں کی شہادت سے بہتر کسی کی شہادت نہیں ہو سکتی۔

یہ ہی سید احمد خاں کی زندگی کا وہ کارنامہ جس کی اگرچہ مسلمانوں نے عام طور پر اب تک کچھ قدر نہیں کی لیکن یورپ کے نامور اخبار "ٹائمز اوف لندن" نے گزشتہ اپریل میں اسی کارنامہ پر سر سید کی نسبت لکھا تھا کہ "اس شخص کو ہندوستان کے مسلمانوں کے حق میں تعلیم کا پروفٹ کہا جائے تو بجا ہے" اگرچہ اس عظیم الشان کام کی ابتدائی مشکلات اس مرحوم کی جاں فشانی اور استقلال سے تقریباً بالکل حل ہو گئی ہیں، مذہبی مخالفتوں اور بدگمانیوں کا طوفان فرو ہو گیا ہے، کالج کی سالانہ آمدنی اور خرچ کی نوبت پون لاکھ کے قریب پہنچ گئی ہے، عمارتیں جس اعلیٰ اور وسیع پیمانے پر بنانی منظور تھیں گو ابھی اُن کی تکمیل نہیں ہوئی مگر قوم کی تھوڑی سی توجہ سے پوری ہو سکتی ہیں۔ یورپین اور نیٹو اسٹاف توقع سے زیادہ عمدہ اور قابلِ اطمینان بہم پہنچ گیا ہے، یونیورسٹی کے نتائج امتحان کالج اور اسکول کی وقعت اور اعتبار لوگوں کی نظر میں روز بروز زیادہ کرتے جاتے ہیں، بورڈنگ ہوس ایک بے نظیر نمونہ پر جیسا کہ کبھی ہندوستان میں نہیں دیکھا گیا تھا طلبہ کی تربیت کے لئے قائم ہو گیا ہے۔ مذہبی تعلیم و تربیت کا سامان بھی جہاں تک کہ منتظمان کالج کی قدرت میں تھا مہیا کیا گیا ہے اور سب سے بڑھکر یہ کہ گورنمنٹ نے اُس کی طرف خاص توجہ مبذول فرمائی ہے، مگر درحقیقت اُس کا تھامنا، اُس کی اصلاح کرنا اور اُس کو ترقی دینا قوم کا اور صرف قوم ہی کا کام ہے۔ اگرچہ سر سید کی زندگی میں تو لوگ قوم کی طرف سے بالکل مایوس تھے اور سمجھتے تھے کہ اُن کی آنکھیں بند ہوتے ہی کالج کی حالت دگرگوں ہو جائیگی۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ سر سید کے بعد مسلمانوں نے بالکل خلاف توقع اور خلاف اُمید کالج کی طرف وہ توجہ ظاہر کی ہے کہ بقول ایک ظریف کے اگر سر سید کو یہ خبر ہوتی کہ میرے بعد لوگ ایسی سرگرمی ظاہر کرینگے تو وہ بن آئی مرجاتے۔



سر سید نے ترقی تعلیم کی غرض سے صرف محمدن کالج قائم کرنے اور اُس میں تعلیم و تربیت کا سامان مہیا کرنے ہی پر قناعت نہیں کی بلکہ یونیورسٹی کے طریقۂ تعلیم کی اصلاح اور ہائی ایجوکیشن کی ضرورت پر وہ اخیر دم تک اپنی تحریروں اور اسپیچوں میں برابر زور دیتے رہے، ہندوستان کی یونیورسٹیوں کے نظامِ تعلیم کو وہ ہمیشہ ہندوستانیوں کے حق میں غیر مفید خیال کرتے تھے اور جب سے ملک میں یہ خیال پھیل گیا تھا کہ گورنمنٹ ہائی ایجوکیشن

موقوف کرنا چاہتی ہی اُن کو سخت اندیشہ ہوگیا تھا کہ مسلمانوں کے لئے جو مر مر کر تعلیم کے وسائل مہیا کئے گئے ہیں کہیں یہ تمام کوششیں برباد نہ ہوجائیں اور سر منڈاتے ہی اولے نہ پڑ جائیں۔ اس لئے وہ ہمیشہ یونیورسٹیوں کے نظام پر نکتہ چینی کرتے تھے اور جب کبھی اُن کو گورنمنٹ کے تیور ہائی ایجوکیشن کے برخلاف معلوم ہوئے اُنہوں نے فوراً اُس کی حمایت پر قلم اُٹھایا اور نہایت دلیری اور بے باکی سے اس پالسی کی تغلیط کی ۱۸۸۲ء میں اُنہوں نے ایجوکیشن کمیشن میں شہادت دیتے وقت یونیورسٹی کے قواعد پر خوب دل کھول کر اعتراض کئے اس کے سوا ہمیشہ بذریعہ تحریر اور تقریر کے یونیورسٹی کے نقص اور ستم ظاہر کرتے رہے۔

ہائی ایجوکیشن

ہائی ایجوکیشن کے متعلق اُنہوں نے کمیشن کو آگاہ کیا کہ لوگوں میں عموماً یہ خیال پھیل گیا ہی کہ گورنمنٹ ہائی ایجوکیشن بند کرنا چاہتی ہے۔ پس اگر گورنمنٹ کوئی کالج توڑے گی خواہ اُس کے توڑنے کی کیسی ہی معقول وجوہات ہوں۔ لوگ یہی سمجھیں گے کہ سرکار ہم کو اعلیٰ درجہ کی تعلیم سے محروم رکھنا چاہتی ہے۔

پنجاب یونیورسٹی کی مخالفت

اس سے پہلے ۱۸۸۱ء میں جس شد و مد کے ساتھ اُنہوں نے اسی بنا پر پنجاب یونیورسٹی کی مخالفت کی تھی وہ اکثر لوگوں کو یاد ہوگی۔ اس مخالفت کی بنیاد یہ تھی کہ اول لارڈ لٹن نے پنجاب کے بعض مقامات میں جو اسپیچیں کیں اُن سے مشرقی علوم کی ترغیب و تحریص کی بو آتی تھی اس کے بعد جو ایڈریس اہل پنجاب نے لارڈ رپن کی حضور میں گزرانے اور جو جواب حضور ممدوح نے اُن پر دیئے اُن سے یہ احتمال قوی ہوگیا کہ اگر پنجاب یونیورسٹی کالج کو یونیورسٹی کے اختیارات مل گئے تو پنجاب میں ہائی ایجوکیشن کا نام و نشان باقی نہ رہیگا چنانچہ ہزاکسلنسی کے جواب میں یہ الفاظ موجود تھے کہ ”ترقی و اشاعت زبانہائے مشرقی و علوم مشرقی نہایت کار احسن ہی + + + اور جہاں تک میری محدود واقفیت معاملات ہندوستان میں ہی میں اُن خیالات سے اتفاق رکھتا ہوں جو میرے نزدیک آپ لوگ رکھتے ہیں کہ اس ملک میں صرف زبانہائے دیسی کے توسل سے علوم و فنون کی ترقی و اشاعت بہترین سہولت سے ہوسکتی ہے“ اور جس ایڈریس کے جواب میں ہزاکسلنسی نے یہ ارشاد فرمایا تھا اُس میں صاف لکھا تھا کہ ”ساڑھے تین لاکھ روپیہ جو سرمایۂ یونیورسٹی کالج ہی والیان ریاست ہا و دیگر روسائے پنجاب نے دراصل زبانہائے دیسی کی تکمیل سے تعلیم کو رواج دینے کی غرض سے عطا کیا تھا سنسنٹ کو اس بارہ میں کچھ بھی شک نہیں کہ علم کو زبانہائے دیسی کے توسل سے ترقی دینا تعلیم کی ضروریات کو ملک کے حسب حال بنانے کا بہترین طریقہ ہی اور سنسنٹ اور گورنمنٹ ہند کا بھی

یہی مقصد ہی"۔

جب یہ ایڈریس اور اُس کا جواب شائع ہوا اور سرسید کی نظر سے گزرا تو اُن کی آنکھوں میں اندھیرا آگیا اور جیسا کہ اُن کی طرز تحریر سے پایا جاتا ہی عنانِ صبر اُن کے ہاتھ سے جاتی رہی۔ اُنہوں نے حد سے زیادہ جوش و خروش کے ساتھ پے درپے تین آرٹکل پنجاب یونیورسٹی کے خلاف لکھکر شائع کئے جن کا تمام پنجاب میں غل پڑگیا۔ تعلیم یافتہ گروہ نے جن میں زیادہ تر ہندو اور گریجوئیٹ شامل تھے تینوں آرٹکلوں کو ایک جگہ جمع کرکے چھپوادیا اور تمام پنجاب میں اُن کو عام طور پر شائع کردیا جس سے پنجاب یونیورسٹی کے اکثر حامیوں کی رائیں بدل گئیں اور ڈاکٹر لائٹنر جو مشرقی علوم اور دیسی زبانوں کے نہایت سرگرم حامی تھے اور پنجاب یونیورسٹی کو گویا ورنیکلر یا اورینٹل یونیورسٹی بنانا چاہتے تھے اُنہوں نے سرسید کے آرٹکلوں کا انگریزی اور اُردو دونوں زبانوں میں جواب لکھکر مشتہر کیا مگر اس عربی مثل کے موافق کہ قد سبق السیف العذل[1] ۔ سرسید کی تحریریں اپنا کام کرچکی تھیں، اور اس لئے اب اُن کا جواب لکھنا اور اُن کی تردید چھاپنی بے سود تھی۔ اگرچہ یہ تینوں آرٹکل بہت لمبے ہیں اور یہاں اُن کے نقل کرنے کی گنجائش نہیں ہی لیکن چونکہ یہ بھی سرسید کی ملکی خدمات میں سے ایک خدمت ہی اور اُس کی وقعت کا اندازہ بغیر اس کے نہیں ہوسکتا کہ اُن تحریروں میں سے کچھ فقرے بطور نمونہ کے ناظرین کو دکھائے جائیں اس لئے ہم تینوں آرٹکلوں میں سے بعض بعض مقامات اس موقع پر نقل کرتے ہیں۔

پہلے آرٹکل کو جس کا عنوان "مشرقی علوم و فنون" ہی وہ اس طرح شروع

"ہم کو نہایت ہوشیاری سے دیکھنا چاہیے کہ جو کچھ کیا جاتا ہی درلھا جاتا ہی ۔ کہ ہمارے اور ہمارے ملک کی بہبودی اور ترقی کے لئے ہی ایسا نہو کہ صرف دھوکا ہو۔ ہم کو اس وقت پچھلے زمانہ کے قصے اور کہانیوں کو یاد دلانا اور کہنا ۔ کہ ایشیا میں، ایشیائی سلطنت کے زمانہ میں علوم و فنون کیا تھے اور اُن کے وقت میں اُن کو کیسی ترقی اور کیسی سرسبزی تھی۔ محض بے فائدہ ہی ۔ ہم کو اپنے زمانہ کے حالات پر جو گورنمنٹ انگلشیہ کی حکومت کا زمانہ ہی غور کرنا اور اُس کو ہندوستان ہی کی حدود میں محدود رکھنا ہمارے لئے زیادہ مفید اور زیادہ تر بکار آمد ہی"

---

[1] یعنی تلوار چل چکی اب ملامت بے فائدہ ہی ۱۲

اس کے بعد انھوں نے وہ مختلف طریقے جو ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستانیوں کی تعلیم کے متعلق ابتدائے عملداری سے اختیار کرتی رہی (یعنی اول ہندوستانیوں کی تعلیم کے فرض سے غافل رہنا، پھر اُن میں علوم مشرقی کے رواج دینے میں کوشش کرنا اور آخرکار لارڈ مکالے کے اصرار سے اہل یورپ کے علم و حکمت کی تعلیم دینا) بیان کئے ہیں پھر انھوں نے دینیات کو مستثنیٰ کرنے کے بعد مشرقی علوم و مشرقی لٹریچر کی جس کو پنجاب یونیورسٹی از سرنو زندہ کرنا چاہتی تھی۔ خوب قلعی کھولی ہے۔ اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ "ہم صاف صاف کہنا چاہتے ہیں کہ ہم کو مشرقی علوم کی ترقی کے پھندے میں پھنسانا ہندوستانیوں کے ساتھ نیکی کرنا نہیں ہے بلکہ دھوکے میں ڈالنا ہے۔ ہم لارڈ مکالے کو دعا دیتے ہیں کہ خدا اس کو بہشت نصیب کرے کہ اس نے دھوکے کی ٹٹی کو اٹھا دیا تھا، کیا وہ ٹٹی ہماری آنکھوں کے سامنے پھر لگائی جاتی ہے؟ ایڈریس کے ساتھ (جو رپن کو دیا گیا تھا) بڑے بڑے ہندوستانی سرداروں کا ہونا اور بہت بڑی فیاضی سے بڑے بڑے چندوں کا دیدینا مثل اسی فیاضی کے ہے جو ہمیشہ وہ اصلی مقصد سے ناواقف رہ کر دیگر اسباب سے کیا کرتے ہیں۔ اُن کی شان و شوکت ایسے امر کی۔ جو فی الحقیقۃ کچھ وقعت نہیں رکھتا۔ وقعت نہیں بڑھا سکتی چند ناعاقبت اندیش ہندوستانی شاید ان باتوں سے خوش ہوتے ہونگے اور گورنمنٹ کا احسان مانتے ہونگے۔ مگر دوراندیش آدمی ان باتوں سے نہایت رنجیدہ ہوتے ہیں اور نہایت افسوس و مایوسی سے گورنمنٹ کی اور اُن یورپین اعلیٰ درجے کے حکام کی کارروائی کو۔ جو اس میں شریک ہیں دیکھتے ہیں۔

"ہم نہایت سچائی سے اور گورنمنٹ کی دلی خیرخواہی سے بتانا چاہتے ہیں کہ سمجھدار اور دُوراندیش ہندوستانی ان تمام کارروائیوں سے گورنمنٹ کی نسبت کیا خیال رکھتے ہیں؟ نہایت بدخیال اُن کے دل میں پیدا ہوتا ہے چند سال گزرے (یعنی یونیورسٹیاں قائم ہونے سے پہلے جب کہ مشرقی علوم کی تعلیم پر زور دیا جاتا تھا) کہ اُن کو یقین کامل تھا کہ گورنمنٹ کو درحقیقت ہم کو واقعی تعلیم دینا منظور نہیں ہے اور وہ ہم کو اسی قدر تعلیم دینا چاہتی ہے جس قدر کی اُس کو ضرورت ہے۔ وہ ہم کو ایسا مرکب بنانا چاہتی ہے کہ اسباب لاد کر ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچا دے۔ اس کو انتظام ملک اور انتظام دفتر کے لئے چند ایسی پتلیاں درکار ہیں جو انگریزی لکھ سکتی ہوں مگر سمجھ نہ سکتی ہوں، جیسے کہ منیچسٹر میں سوت کاتنے کے لئے پتلیوں کی ضرورت ہے۔ جو کچھ کہ وہ (یعنی گورنمنٹ) ہندوستان میں تعلیم کی نسبت کرتی تھی کوئی اُس کا شکرگزار نہ تھا اس لئے کہ اُس کو خودغرضی پر محمول کیا جاتا تھا نہ رعایا پروری پر۔"

"کچھ بہت عرصہ نہیں گزرا (یعنی جب کہ ہندوستان میں کلکتہ بمبئی اور مدراس یونیورسٹیاں قائم ہوگئیں) کہ ہندوستانیوں میں سے یہ بدخیال دور ہوا تھا اور ہندوستانی یہ یقین کرتے تھے کہ گورنمنٹ نے اپنی پالسی بدل دی ہے اور درحقیقت اس کو اعلیٰ درجہ کی تعلیم دینا اور ہندوستانیوں کو انھیں کے فائدہ کے لئے تعلیم دینا مقصود ہے۔ مگر ہندوستانی خوب سمجھتے ہیں کہ تھوڑے دنوں سے بعض مدبران سلطنت کی پالسی پھر بدلی ہے اور ہندوستانیوں کو اب اعلیٰ درجہ کی حقیقی تعلیم دینا وہ مناسب نہیں سمجھتی۔ ان کو (یعنی ہندوستانیوں کو) اب تک یقین نہیں ہے کہ یہ پالسی درحقیقت مستحکم ہوگئی ہے اور اس پر عمل کرنا فی الواقع قرار پا چکا ہے۔ مگر ایسے واقعات جو پیش آتے جاتے ہیں جیسے کہ حضور عالی لارڈ لٹن کے وقت میں انڈین سول سروس[1] کے قواعد قرار پائے، اور جیسے کہ جناب ممدوح نے بعض اسپیچوں میں علوم مشرقی کی ترقی کی ترغیب دی، یا جیسے کہ یہ حال میں واقعہ پنجاب یونیورسٹی کالج کو کامل یونیورسٹی بنانے کی درخواست کے وقت پیش آیا دور اندیش ہندوستانیوں کو نہایت تردد میں ڈالتا ہے اور وہ خوف زدہ ہو کر خیال کرتے ہیں کہ شاید وہ پالسی مستحکم ہوگئی ہے اور وہی دھوکے کی ٹٹی پھر ہماری آنکھوں کے سامنے کھڑی کی جاتی ہے جس کو ہمارے محسن مرحوم لارڈ مکالے نے اپنی نہایت سچی تحریروں اور زبردست ہاتھوں سے اٹھایا تھا۔ ہم نے کوئی مجلس لائق ہندوستانیوں کی ایسی نہیں پائی جس میں ان خیالات کی روز بروز ترقی نہ ہوتی ہو ہمارا دلی مقصد ہے کہ ہم اصلی حال ان ہندوستانیوں کی فیلنگ کا جن کی فیلنگ درحقیقت قدر و غور کے لائق ہے گورنمنٹ سے مخفی نہ رکھیں اور اس میں کوشش کریں کہ گورنمنٹ ایسی جماعت کی باتوں سے جن کے ظاہری بدن زر و جواہر سے جگمگاتے ہیں اور جن کے تمام کام درحقیقت دیگر اسباب پر مبنی ہیں نہ واقعی واقعات پر دھوکے میں نہ آوے۔"

دوسرے آرٹیکل میں جس کا عنوان "ورنیکلر یعنی ہماری زبان" ہے انھوں نے اول ان مشکلات کو بیان کیا ہے جو مغربی علوم کو دیسی زبانوں میں ترجمہ کرکے شائع کرنے میں پیش آتی ہیں اور ایسٹ انڈیا کمپنی کا کلکتہ میں ایک سوسائٹی کتابوں کا ترجمہ کرنے کے لئے قائم کرنا پھر دہلی کالج میں بہت سی کتابوں کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ ہونا، اور پھر اسی

---

[1] چونکہ انڈین سول سروس کے قواعد میں امیدواروں کے لئے کسی یونیورسٹی کی ڈگری کی شرط نہیں تھی اس لئے یہ خیال پیدا ہوا کہ گورنمنٹ ہائی ایجوکیشن کو موقوف کرنا چاہتی ہے ۱۲

مقصد کے لئے سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ کا قائم ہونا اور تینوں جگہ ناکامی کے سوا کوئی نتیجہ حاصل نہونا نہایت عمدگی سے ظاہر کیا ہے۔ اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ "جب غیر قوم یعنی مسلمانوں نے ہندوستان کو فتح کیا تو یہاں کے باشندوں میں سے وہی لوگ بر سر عزت اور حکومت میں شریک ہوئے جنہوں نے اُن کے علوم، اُن کی زبان، ان کے سے خیالات، اُن کا سا تمدن، اُن کا سا لب و لہجہ اور اُن کی سی روش اختیار کی۔ ہندوستان میں اس خیال کا پیدا کرنا۔ کہ ہم مشرقی علوم دیسی زبان، اور دیسی علوم کو ترقی دے کر عزت و دولت وحشمت و حکومت حاصل کرینگے بعینہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی امریکا کے اصل باشندوں کو خیال دلا وے کہ تم اپنی دیسی زبان اور دیسی علوم میں ترقی کر کے اپنی حکمران قوم میں عزت و دولت وحشمت و حکومت حاصل کرو گے"

"قومی ترقی اور حکومت دونوں ماں جائی بہنیں ہیں، پس جب کسی قوم میں حکومت نہ رہے تو اُس کی ترقی صرف اس بات پر منحصر ہے کہ وہ اپنی فتحمند قوم کے علوم و زبان حاصل کرنے سے اپنے فتحمندوں کے ساتھ ملکی حکومت میں حصہ لے، علوم کی اُن شاخوں میں اعلیٰ درجہ کی لیاقت حاصل کرے جن میں اُن فتحمندوں نے کاملیت حاصل کی ہے، سوشیل عادات اور علمی و عملی و ملکی خیالات اُس قسم کے پیدا کرے جو فاتح و مفتوح میں کسی درجہ تک مناسبت پیدا کریں۔ جب تک فاتح و مفتوح میں اس قسم کی مناسبت پیدا نہ ہو اُس وقت تک باہمی دوستی کا برتاؤ محالات سے ہے۔ اسی مناسبت کے نہونے سے آج تک ہندوستان میں فاتح و مفتوح کے باہم دوستانہ برتاؤ نہیں ہیں۔ خوشامد کی باتیں جو کوئی چاہے سو کہے اور پولیٹکل طریقہ میں جو کچھ بیان کرنا ہو کیا جائے مگر ہندوستانیوں کا حال اپنی فتحمند قوم کے ساتھ غلامی کی حالت سے کچھ زیادہ نہیں ہے ہم اس کا الزام اپنی فتحمند قوم کے سر نہیں دھرتے بلکہ خود اپنی قوم کے ذمہ ڈالتے ہیں کہ اُس نے خود اپنے تئیں اس لائق نہیں بنایا کہ ہماری فتحمند قوم ہم سے دوستانہ برتاؤ کر سکے۔ پھر علوم مشرقی کی ترقی اور چھوٹی موٹی ترجمہ کی ہوئی کتابیں ہم کو کیا نتیجہ دینگی؟ اور ہم کو کون سی عزت و دولت وحشمت و حکومت بخشیں گی؟ یونیورسٹی کالج لاہور نے اب تک ہم کو کس نتیجہ پر پہنچایا ہے جو آئندہ پوری یونیورسٹی ہو کر اور مردہ علوم مشرقی کو زندہ کر کے اور ہماری پرانی شائستگی کو پھر پیدا کر کے ہم کو پہنچا وے گا۔ کچھ شبہ نہیں کہ یونیورسٹی کالج اب بھی ہماری ترقیوں کا سد راہ رہا ہے اور جب وہ یونیورسٹی ہو جائے گا اور ضرور ہو جائیگا تو ملک کے لئے، قوم کے لئے، ملکی اور قومی ترقی کے لئے آفت عظیم ہوگا۔ ہم پر احسان رکھ کر ہم کو دھوکے میں ڈالا جاتا ہے کہ ہم تمہارے مشرقی علوم و تمہاری مشرقی زبان کو ترقی دیتے ہیں، مگر ہم پوچھتے ہیں کہ کیوں اور کس مطلب سے؟ اس کا جواب کسی پیرایہ میں اور کیسے ہی میٹھے لفظوں میں دیا جائے اُس کا نتیجہ یہی

ہے کہ غلامی کی حالت میں رکھنے کے لئے ''۔

'' گورنمنٹ نے ہمارے لئے سول سروس میں داخل ہونے کا رستہ۔ گو اُس میں کیسی ہی مشکلات پڑ گئی ہوں۔ ابھی تک کھلا رکھا ہے۔ بیرسٹری کی سند، ڈاکٹری کا ڈپلوما اور انجنیری کا سرٹیفکیٹ حاصل کرنے کے لئے کوئی امر ہم کو مزاحم نہیں ہے، ہندوستان میں انڈین سول سروس کے عہدے کو جس میں ہماری بدبختی سے ابھی تک چنداں قابلیت کی ضرورت نہیں سمجھی گئی ہے۔ جانے دو، مگر ہائی کورٹ کی ججی حاصل کرنے سے ہماری اُمیدیں ابھی منقطع نہیں ہوئی ہیں، ہندوستانیوں کا کونسل قانونی میں داخل ہونا ابھی تک بند نہیں ہوا ہے، ہم کو سمجھنا چاہیئے کہ ان حقوق کے واجبی طور سے حاصل کرنے کے لئے ہم کو کیا کرنا ہے؟ کیا مشرقی مردہ علوم کو زندہ کرنے والی یونیورسٹی؟ کیا ہماری پرانی شائستگی کو پھر ہمارے لئے مہیا کرنے والی تجویز؟ معمولی عہدے بھی جیسے وکالت و منصفی و سب ججی ہے۔ بغیر انگریزی زبان کی کافی لیاقت کے ہم کو میسر نہیں آسکتے، پھر کیا مردہ علوم مشرقی کے زندہ ہونے اور ہماری مشرقی زبانوں کی ترقی سے ہم کو کچھ نتیجہ مل سکتا ہے؟ یونیورسٹی کالج لاہور۔ جو پوری یونیورسٹی ہونے والا ہے۔ بجز اس کے۔ کہ ہم کو سیدھی راہ چلنے سے روکے ہم کو ہماری حقوق سے محروم رکھے اور ہم کو اس لائق نہ ہونے دے کہ ہم اپنے حقوق کا دعویٰ کر سکیں۔ ہمارے حق میں اور کیا کر سکتا ہے؟

'' ہم کو ایسا لائق ہونا چاہیئے کہ ہم دور دراز اور مختلف ملکوں کے سفر کرنے کے قابل ہوں، ہم بساطی کی سی دوکانداری سے نکلیں، ہم اپنی اور اپنے ملک کی تجارت کو ترقی دیں، ہماری تجارت کی محمدن اینڈ ہندو کمپنی کے نام سے کوٹھیاں لندن میں، اڈنبرا میں، ڈبلن میں، بروزلز میں، سینٹ پٹرسبرگ میں، برلن میں، وائنا میں، قسطنطنیہ میں، پیکن میں، واشنگٹن میں اور اور دنیا کے تمام حصوں میں قائم ہوں اور ہم بحری و بری سفر اسی طرح خوشی سے کریں جیسے کہ اور قومیں کرتی ہیں جس سے ہم کو عزت، دولت، حشمت اور حکومت میں شرکت حاصل ہو۔ پھر کیا ہمارے مردہ مشرقی علوم کا زندہ ہونا اور مشرقی زبانوں کا ترقی دینا اور ہماری پرانی شائستگی کو پھر قائم کرنا ہم کو اس قابل بنا دیگا؟ ہرگز نہیں۔ پس ہم کو علوم مشرقی کے زندہ کرنے اور مشرقی زبانوں کے ترقی دینے کے جال میں پھنسانا صاف ایسی تدبیریں کرنا ہے کہ جہاں تک ہو سکے ہم کو ہماری ترقیات حاصل کرنے سے روکا جائے۔ جو لوگ دوراندیش ہیں وہ کبھی ایسی پالیسی کو پسند نہ کرینگے اور اُس میں ہندوستان کی فلاح نہ تصور کرینگے، اپنے حق میں، ہندوستان کے حق میں، اور گورنمنٹ کے حق میں شدید مضر سمجھیں گے ''۔

اس کے بعد اُن اسباب کی طرف جن سے یہ خیال پیدا ہوا ہی کہ گورنمنٹ ہائی ایجوکیشن موقوف کرنا چاہتی ہے۔ اشارہ کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ "ہم تسلیم کرتے ہیں کہ یونیورسٹی کی تعلیم نے بعض تعلیم یافتہ لوگوں کو زیادہ دلیر کردیا ہی اور اُنھوں نے نہایت سخت اور بعض اوقات نہایت بے جا اور ناواجب اور نامنصفانہ نکتہ چینی گورنمنٹ پر کی ہی، مگر ہم دل سے یقین رکھتے ہیں اور گورنمنٹ کو بھی یقین دلانا چاہتے ہیں کہ وہی تعلیم یافتہ نکتہ چیں جس قدر گورنمنٹ انگریزی کے قدر داں ہیں شاید کوئی دوسرا نہوگا۔ پس نکتہ چینی کے اندیشہ سے ہماری تعلیم کو برباد کرنا ہمارے حق میں کچھ انصاف نہیں ہے۔ ہم کو بالغ العلوم اور مالک العلوم کے خطاب دینا اور پھر نابالغ کے درجہ پر رکھنا ہم کبھی پسند نہیں کرسکتے"

"ہمارے لئے سیدھا رستہ کھلا ہوا ہے کہ جہاں تک ہم سے ہوسکے یورپین لٹریچر اور یورپین سائنس میں اعلیٰ درجہ کی ترقی کریں، جہاں تک ہم کو یونیورسٹی کے سچے خطاب حاصل ہوسکتے ہیں حاصل کریں، جب اُس سے بھی زیادہ ہم میں ہمت ہو آکسفورڈ و کیمبرج کی یونیورسٹیوں میں تعلیم کو جائیں اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ کی ڈگریاں حاصل کرنے میں کوشش کریں، اپنے تئیں مہذب و تعلیم یافتہ جنٹلمین اُس کے اصلی و حقیقی معنوں میں بنائیں اور جو فیض تعلیم و تربیت و تہذیب ہم نے اُن مہذب ملکوں میں حاصل کیا ہو اُس کو اپنے ہم وطنوں اور ہم قوموں میں پھیلاویں۔ بے شک ہم کو ایسا کرنے میں بہت مشکلات ہیں، اِدھر ہم کو اپنی قوم کی جہالت و تعصب سے مقابلہ کرنا ہی اور اُدھر اپنی فتحمند قوم کے اُن تنگ دل لوگوں کی مزاحمت کا برداشت کرنا ہے جو ہمارے سوشیل اور پولٹیکل حالت کی ترقی اپنی طبعی تنگدلی کے برخلاف سمجھتے ہیں، ہماری انگلش لائف، انگلش تمدن، جنٹلمین کیسے اخلاق یہاں تک کہ ہمارے تغیر لباس سے بھی وہ ایسے ناراض ہوتے ہیں اور چشم خشم آلود سے ہم کو دیکھتے ہیں جیسے کوئی نہایت نیک دل بہت بڑے مجرم کو دیکھتا ہو۔ مگر ہم کو اپنی اور اپنی قوم کی بھلائی پر نظر رکھنی چاہئیے اور جو تکالیف اور مشکلات ہم کو پیش آئیں نہایت تحمل اور پختہ مزاجی سے برداشت کرنی چاہئیں۔ مگر ہم اس بات کو مخفی رکھنا نہیں چاہتے کہ گریٹ رفارمر (یعنی زمانہ) ان باتوں کو ضرور ہونے دیگا اور کوئی مزاحمت اور کوئی ناخوشی و خفگی اُس کو روک نہیں سکیگی۔ لیکن بے شک یہ تنگدلی کے خیالات ناراضی کو ترقی دینے والے اور فاتح و مفتوح میں ہمدردی و محبت کو توڑنے والے ہیں"

یہ دو آرٹیکل جن سے مفہوم ہوتا تھا کہ سرسید نے خاص کر پنجاب یونیورسٹی پر حملہ کیا ہی جب پنجاب یونیورسٹی کے حامیوں کو شاق گزرے اور اُن کے برخلاف پنجاب سے بعض مضامین شائع

ہوئے تو سرسید نے ایک تیسرا آرٹکل جس کا عنوان "ہماری زبان اور ہماری اعلیٰ درجہ کی تعلیم" تھا اور لکھا جس سے صرف یہ جتانا مقصود تھا کہ درحقیقت ہمارا روئے سخن پنجاب یونیورسٹی کی طرف نہیں بلکہ گورنمنٹ کی پالسی کی طرف تھا جس سے خوف تھا کہ رفتہ رفتہ تمام ہندوستان کی یونیورسٹیاں یہی اصول نہ اختیار کرلیں۔ اس آرٹکل کو انھوں نے اس طرح شروع کیا ہے "ہمارے دو آرٹکلوں نے ہمارے پنجاب کے دوستوں کو گھبرا دیا ہے بلکہ کسی قدر رنجیدہ کردیا ہے وہ سمجھتے ہیں کہ ان آرٹکلوں سے ہم کو بالتخصیص یونیورسٹی پر حملہ کرنا مقصود ہے اور اپنے حسن ظن سے اس کی بنیاد حسد پر قائم کی ہے۔ ہم کو افسوس ہے اگر یہ کینہ خصلت ہم میں ہے۔ پنجاب یونیورسٹی کالج جس کے اصول سے بلاشبہ ہم مختلف الرائے ہیں۔ اگر وہ یونیورسٹی ہو جائے تو ملک کو اور ایسے وسیع ملک کو جس میں تین اور یونیورسٹیاں موجود ہوں کوئی معتدبہ نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ اگر وہ صحیح اصول پر قائم ہوتی ہے اور اس سے ملک کو برخلاف ہماری رائے کے فائدہ پہنچنے والا ہے تو چشم ما روشن ہماری عین خوشی ہے کہ ملک کو فائدہ پہنچے اور ہماری رائے غلط ثابت ہو۔ اور اگر وہ فی الحقیقت ملک کو فائدہ پہنچانے والی نہیں ہے تو اس کو ہونے دو، اس سے مخالفت کرنے کی کچھ ضرورت نہیں ہے، خود اس میں ناکامی کا بیج ہے اور وہ آپ ہی ناکام ہو جائیگی۔"

اس کے بعد وہ مشرقی علوم اور مشرقی لٹریچر کی تعلیم کے نتائج کی طرف اشارہ کرکے لکھتے ہیں کہ "بنارس کالج نے سنسکرت زبان کی ترقی پر بہت توجہ کی مگر وہ ایک کو بھی سنسکرت میں ان پنڈتوں کے برابر نہیں بنا سکا جو دھوتی باندھے کمری پہنے منکا اور شیوالہ گھاٹ کی سیڑھیوں پر بیٹھکر اپنی مقدس زبان سنسکرت کو تحصیل کرتے ہیں۔ مگر ان کی تحصیل سے ملک کو بجز اس کے کہ بنارس میں دس پانچ منگتا پنڈت اور زیادہ ہو گئے کیا نتیجہ حاصل ہوا؟ یونیورسٹی کالج لاہور نے بلخ و بدخشاں[1] کے طالب علموں کو جو کچھ تعلیم دی ہو دی ہو ہم کو اس کا حال معلوم نہیں۔ مگر آج تک (ہندوستان میں) اس نے ایک کو بھی عربی یا فارسی میں ان لوگوں کے برابر نہیں بنایا جنہوں نے مسجد کے چبوتروں اور خانقاہ کے تنگ و تاریک حجروں میں بیٹھکر اور درود و فاتحہ کی روٹی پر گزران کرکر عربی و فارسی کو تحصیل کیا اور اعلیٰ درجہ کا تبحر ان میں پیدا کیا۔ مگر اس کا نتیجہ بجز [illegible] کے کہ مردود

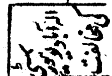
---

[1] جو آرٹکل سرسید کے خلاف لاہور سے نکلے تھے ان میں لکھا تھا کہ پنجاب یونیورسٹی کالج میں بلخ و بدخشاں کے طالب علم تعلیم پاتے ہیں ۱۲

کی روٹیاں کھانے والے اور زیادہ ہو گئے ملک کو کیا فائدہ پہنچا؟ اگر پنجاب یونیورسٹی قائم ہو جائے اور ہم کو علوم مشرقی میں ویسی ہی تعلیم دے (گو ویسی بھی ممکن نہیں) تو بجز اس کے کہ چند بھکاری اور چند فاتحہ کی روٹی کھانے والے ملک میں زیادہ ہو جائیں اور کیا نتیجہ حاصل ہو سکتا ہے؟ ہم کو صاف صاف بتاؤ کہ لاہور یونیورسٹی کالج نے جن لوگوں کو .. .. پروفشنسی اور ہائی پروفشنسی کے خطاب مرحمت فرمائے ہیں وہ کس مرض کی دوا ہیں اور ان سے ملک کو، قوم کو، اس کی دولت کو، اس کی حکومت کو، اس کی تجارت کو، اس کے اخلاق کو، اس کی روشنضمیری کو اور اس کی وسعت خیالات کو کیا فائدہ پہنچا یا آئندہ پہنچ سکتا ہے؟ ہاں اگر یہ کہا جائے کہ اس تعلیم سے مقصد ہی یہ ہے کہ ایسے نہ ہونے پائیں تو سب کچھ تسلیم کیا جا سکتا ہے۔"

اس کے بعد سر سید نے اس اعتراض کا کہ سائنٹفک سوسائٹی جو انہوں نے علی گڑھ میں قائم کی تھی وہ بھی تو اسی اصول پر مبنی تھی کہ مغربی علوم ترجموں کے ذریعے سے ملک میں شائع کئے جائیں۔ جواب دیا ہے اور جو آسمان و زمین کا فرق سوسائٹی کے قیام کے وقت میں اور موجودہ زمانہ میں ہو گیا تھا اس کو دکھایا ہے اور لکھا ہے کہ "اس زمانہ کے مناسب حال بلاشبہہ ایک شخص کو۔ جو سچے دل سے اپنی قوم اور ملک کی ترقی کا خواہاں ہو۔ اس خیال کا پیدا ہونا کہ ہم دیسی زبان کے ذریعہ سے اپنے ملک و قوم کو ترقی دیں نہایت سچا اور واجب خیال ہو سکتا تھا، مگر رفتہ رفتہ تمام حجاب رفع ہوتے گئے اور خود زمانہ نے بتا دیا کہ کدھر جاتے ہو اور ٹھیک راستہ کدھر ہے۔"

پھر آرٹیکل کو اس طرح ختم کیا ہے کہ "ہم کہہ چکے ہیں کہ پنجاب یونیورسٹی کسی اصول پر قائم ہو صحیح پر یا غلط پر۔ ہم کو کچھ زیادہ نقصان نہیں پہنچا سکتی اور اس لئے ہم ضرورت نہیں سمجھتے کہ پنجاب یونیورسٹی پر کوئی حملہ کریں۔ ہاں بلاشبہہ ہم کو اس وقت خوف پیدا ہوتا ہے جب کہ ہم ایسے لوگوں کو جن کے ہاتھ میں خدا نے ہمارے ملک کی بھلائی برائی نفع نقصان سپرد کیا ہے۔ مردہ مشرقی علوم۔ مشرقی زبانوں کے زندہ کرنے پر مائل پاتے ہیں تو ضرور سمجھتے ہیں بلکہ بلحاظ حب قومی اپنا فرض جانتے ہیں کہ اس امر کو بیان کریں کہ مردہ علوم مشرقی اور مشرقی زبانوں کے زندہ کرنے کی فکر میں پڑنا ہمارے لئے، ملک کے لئے بلکہ گورنمنٹ کے لئے کچھ بھلائی نہیں ہے۔ اپنی قوم کو سمجھاتے ہیں کہ ان کا مقصد مغربی علوم و مغربی زبان کو اعلیٰ درجہ تک حاصل کرنا ہونا چاہئے اور گورنمنٹ سے التجا کرتے ہیں کہ ہندوستان میں یورپ کے علوم اور یورپ کی حکمت کو ترقی دینا اس کا مقصد ہو۔"


پھر ۱۸۸۶ء میں جب کہ الہ آباد یونیورسٹی اسی اصول پر جس پر پنجاب یونیورسٹی

کے قائم ہونے کا گمان تھا قائم ہونے لگی اور سر سید کو معلوم ہوا کہ سر ولیم میور لفٹنٹ گورنر سابق جو مشرقی علوم کے بڑے قدرداں تھے اُن کی پرانی تجویز کے موافق یہ یونیورسٹی بھی اسی غرض سے قائم ہونے والی ہے کہ مشرقی علوم اور مشرقی زبانوں کو ترقی دے تو انہوں نے الٰہ آباد یونیورسٹی کی بھی اُسی شدومد کے ساتھ مخالفت کی جیسے کہ پنجاب یونیورسٹی کی مخالفت کی تھی۔ چنانچہ اُن کے ایک آرٹیکل کے چند جملے بطور نمونہ کے یہاں لکھے جاتے ہیں۔ اُنہوں نے کہا۔

"افسوس ہے کہ لوگوں میں یہ خیال پختہ ہوتا جاتا ہے اور دن بدن اُس کو وسعت ہوتی جاتی ہے کہ الٰہ آباد یونیورسٹی ایک نقل پنجاب یونیورسٹی کی ہوگی۔ شاید اُس کی صورت میں کچھ تبدیلی ہو مگر اُس کی پالسی وہی ہوگی جو پنجاب یونیورسٹی کی تھی۔ پس علوم مشرقی کی ترقی کا دھوکہ دے کر انگلش ہائی ایجوکیشن کو گھٹانا اور جس طرح ایک تیلی اپنے کولھو کے بیل کی آنکھیں بند کرکے دن رات ایک ہی سرکل میں کولھو کے گرد پھراتے جاتا ہے۔ اسی طرح ہندوستانی رعایا کی آنکھیں بند کرکے دن رات ایک ہی چکر میں ڈالے رکھنا بے شک ایک مہذب گورنمنٹ کا کام ہے ... ہم اپنا الیقین ظاہر کرتے ہیں کہ الٰہ آباد یونیورسٹی پنجاب یونیورسٹی کی بہن نہیں ہونے کی، وہ انگلش ہائی ایجوکیشن کے لئے بمنزلہ ایک مادر مہربان کے ہوگی۔ لیکن اگر فرض کرلیا جائے کہ یہ ہمارا خیال غلط ہے تو یہ سوال پیش آتا ہے کہ ہم کو کیا کرنا چاہیئے؟ ہماری رائے میں اس کا جواب صاف ہے؟ استقلال، استقلال، استقلال۔ ہمت، ہمت، ہمت، کوشش، کوشش، کوشش، ہم کو گورنمنٹ کی پالسی کی کچھ پروا نہیں کرنی چاہیئے اور خود اپنے لئے انگلش ہائی ایجوکیشن کے حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے اور اگر ہم میں سیلف ریسپکٹ کا کچھ اثر باقی ہے تو گورنمنٹ کو دکھا دینا چاہیئے کہ بلاشبہ گورنمنٹ کو لوگوں کی جانوں پر اختیار ہے مگر لوگوں کی رایوں پر نہیں۔"

اگرچہ بالیقین یہ نہیں کہا جاسکتا کہ سرسید کی تحریروں کا کیا اثر ہوا اور آیا فی الواقع پنجاب یونیورسٹی اور الٰہ آباد یونیورسٹی کا مقصد مشرقی علوم کی آڑ میں انگلش ہائی ایجوکیشنل کو گھٹانا تھا یا نہیں مگر اس میں شک نہیں کہ جو خیالات دونو یونیورسٹیوں کی نسبت شمالی ہندوستان کے تعلیم یافتہ گروہ میں پھیل گئے تھے۔ اور جہاں تک کہ معلوم ہوا ہے وہ خیالات محض بے بنیاد نہ تھے۔ اب تک علانیہ طور پر اُنکا کچھ ظہور نہیں ہوا۔ بظاہر دونو یونیورسٹیوں میں کوئی ایسا قاعدہ نہیں پایا جاتا جو ہائی ایجوکیشن کا سد راہ ہو۔ بیشک پنجاب یونیورسٹی جس طرح بی اے اور ام اے کی ڈگریاں دیتی ہے اسی طرح اورینٹل کالج کے طلبہ کو بی او ال اور ام او ال یا بالغ العلوم اور مالک العلوم وغیرہ کی بھی ڈگریاں دیتی ہے مگر جیسا کہ سرسید نے کہا تھا کہ وہ اُس میں ناکامی کا بیج ہے

اس لئے وہ آپ ہی آپ ناکام ہو جائیگی" اورینٹل کالج روز بروز تنزل کرتا جاتا ہے اور کچھ عجب نہیں کہ ایک عرصہ کے بعد وہ فضول سمجھکر توڑ دیا جائے ۔

سرسید نے جو مذکورہ بالا آرٹیکلوں میں مشرقی علوم (یعنی قدیم منطق فلسفہ طبعیات اور ہیئت وغیرہ جن کی درس و تدریس مسلمانوں میں قدیم سے جاری ہے) اور مشرقی زبانوں کو ترقی دینے یا دیسی زبانوں میں مغربی علوم کے شائع کرنے پر اس قدر لے دے کی ہے اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ وہ اس کے بالکل مخالف تھے مشرقی زبانوں کی نسبت انھوں نے خود اپنے پہلے آرٹکل میں لکھا ہے کہ "بلاشبہ ہم اس بات کو پنجاب یونیورسٹی کالج - قدیم مشرقی زبانوں کو ترقی دے - پسند کرتے ہیں کیونکہ قدیم لینگوج ماڈرن لینگوج کی ریورہیں" اسی طرح انھوں نے مغربی علوم کے دیسی زبانوں میں ترجمہ ہونے کی نسبت دوسرے آرٹکل میں لکھا ہے کہ "ہم تسلیم کرتے ہیں کہ عام تعلیم کے لئے ہماری زبان نہایت عمدہ وسیلہ ہے جو تحصیل دیہاتی مکتبوں میں محدود رہنی چاہیئے" اس کے سوا انھوں ایجوکیشنل کانفرنس کے دوسرے اجلاس میں خود اس مضمون کا رزولیوشن پیش کیا تھا کہ "علوم عربی جو ہماری قومی نشانی ہیں اور علوم مذہبی جو ہماری روحانی تربیت کا ذریعہ ہیں بدستور قایم رہیں اور مسلمانوں کے اوقاف کا روپیہ اُن کی ترویج اور ترقی میں صرف کیا جائے" پس انھوں نے جو علی العموم اور مشرقی علوم اور مشرقی لٹریچر اور دیسی بانوں کے ترجموں کی مخالفت کی ہے اُس سے اُن کا صرف یہ مطلب ہے کہ ہندوستان کے کالجوں میں اعلیٰ درجہ کی تعلیم محض انگلش لینگوج کے ذریعہ سے ہونی چاہیئے نہ یہ کہ کالجوں میں انگلش لینگوج بطور سیکنڈ لینگوج کے برائے نام رہ جائے اور اصل مقصود مشرقی علوم اور مشرقی زبانوں کی ترقی اور مغربی علوم کو بذریعہ دیسی زبانوں کے تعلیم دینا قرار دیا جائے ۔

ٹکنکل ایجوکیشن کی مخالفت

مذکورہ بالا آرٹیکلوں کے سوا اُن کی بے شمار تحریریں اسی موضوع پر علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ کی جلدوں میں موجود ہیں جن میں شاید سب سے اخیر وہ آرٹکل ہے جو علی گڑھ گزٹ مورخہ ۱۰ فروری ۱۸۹۸ء میں اُن کے مرنے سے سوا مہینے پہلے شائع ہوا تھا اور جس کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان کی موجودہ حالت کے لحاظ سے سردست ٹکنکل ایجوکیشن کی چنداں ضرورت نہیں ہے بلکہ سب سے مقدم اعلیٰ درجہ کی دماغی تعلیم کی ضرورت ہے - جواب تک بالکل یا پوری طور پر پوری نہیں ہوئی - چند برسوں سے جو اکثر اعلیٰ حکام اپنی اسپیچوں میں ٹکنکل ایجوکیشن کی ضرورت بیان کرتے تھے اس سے بھی سرسید کو یہی اندیشہ ہو گیا تھا کہ گورنمنٹ کا منشا ہائی ایجوکیشن یا لٹریری تعلیم کے موقوف کرنے کا ہے اور اسی لئے جب کوئی ایسی اسپیچ اُن کی نظر سے گزرتی تھی وہ ضرور اس کے برخلاف کچھ نہ کچھ لکھتے تھے

اور اِسی بنا پر اُنھوں نے کانفرنس کے پانچویں اجلاس میں ایک رزولیوشن ٹکنکل ایجوکیشن کے خلاف پیش کیا تھا اور رزولیوشن کی تائید میں ایک طول طویل اسپیچ کی تھی جو کانفرنس کی روئداد میں مندرج ہی اور جس کا ماحصل یہ تھا کہ اگر ٹکنکل تعلیم کالجوں اور اسکولوں میں محض اوپشنل طور پر جاری کی جائے اور ہماری اعلیٰ درجہ کی لٹریری تعلیم کو اُس سے کچھ صدمہ نہ پہنچے تو ہم کو اُس میں کچھ عذر نہیں ہوسکتا لیکن اگر موجودہ طریقہ تعلیم میں کوئی ایسی تبدیلی کیجائے جو ہماری اعلیٰ درجہ کی لٹریری تعلیم میں مخل ہو تو ہم کو علانیہ بات ظاہر کردینی چاہیے کہ ہم ایسی تبدیلی سے سخت ناراض ہیں۔ سرسید کو یہ خیال اس سبب سے پیدا ہوا تھا کہ الہ آباد یونیورسٹی میں بغرض ترقی ٹکنکل ایجوکیشن یا بہ خیال ٹکیس تجاویز گورنمنٹ متعدد دفعہ ایسے امور پیش ہوئے تھے جو سرسید کے نزدیک علانیہ لٹریری تعلیم کو روکتے والے تھے اور اُنھیں دنوں میں گورنمنٹ شمال مغرب نے ایک رزولیوشن بغرض ترقی ٹکنکل ایجوکیشن مشتہر کیا تھا اور ایک کمیٹی اس بات کے دریافت کرنے کو منعقد کی تھی کہ ٹکنکل تعلیم کو کن طریقوں سے ملک کے حق میں مفید بنایا جائے سرسید نے اس خوف سے کہ کہیں یہ سب تمہیدیں ہائی ایجوکیشن کے موقوف کرنے کی نہوں یہ رزولیوشن کانفرنس کے جلسہ عام میں جس میں ایک ہزار لایق ہندوستانی موجود تھے اس غرض سے پیش کیا تھا کہ اس باب میں ہندوستانیوں کی عام رائے معلوم ہونے کے بعد یونیورسٹی کو اُس سے آگاہ کیا جائے چنانچہ یہ رزولیوشن جس کی تائید مولوی حشمت اللہ ایم اے اور مسٹر تھیوڈور بک نے بڑے زور شور کے ساتھ کی تھی تمام مجمع کے اتفاق سے پاس ہوا اور الہ آباد یونیورسٹی اور گورنمنٹ شمال مغرب کو اس تمام کارروائی کی اطلاع دی گئی۔

سرسید نے مسلمانوں کی ترقی کے لئے اُنھیں تدبیروں اور کوششوں پر بس نہیں کی جو اُن کی زندگی کے ساتھ ختم ہونے والی تھیں بلکہ وہ قوم کی تعلیمی مشکلات کی حل کرنے والی ایک ایسی انجمن چھوڑ گئے ہیں کہ اگر مسلمانوں نے اُس کو قایم رکھا تو وہ تمام معاملات میں جو قومی تعلیم سے علاقہ رکھنے میں سرسید کا نعم البدل ثابت ہوگی۔

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا قایم کرنا

اُنھوں نے ۱۸۸۶ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس قایم کی جس کا ذکر پہلے حصہ میں تفصیل کے ساتھ ہوچکا ہی۔ اُنھوں نے اس قومی انجمن کو اپنی زندگی میں برابر گیارہ برس تک جاری رکھا اور اس عرصہ میں وہ تمام مرحلے جو ابتداءً ایسے کاموں میں پیش آتے ہیں نہایت خوبی کے ساتھ طے کردیئے اور آیندہ نسلوں کے لئے رستہ بالکل صاف کردیا کہ کس طرح اُس کو چلائیں اور کیوں کر اُس سے فائدہ اُٹھائیں۔ جو کام قوم کے کرنے کے تھے ایک جم غفیر کے صلاح و مشورہ سے قوم کو اُن کے کرنے کی صلاح دی اور جو باتیں گورنمنٹ پر ظاہر کرنے کی تھیں اُن کو بطور ایک جماعت کی رائے کے

کے باوقعت صورت میں گورنمنٹ کے کان میں ڈالا اور اپنی بے نظیر لیاقت اور حسن تدبیر سے ایک ایسی مجلس کو جس میں تعلیم و تعلم کی رُوکھی پھیکی باتوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ چند سال کے عرصہ میں ایسا دلچسپ بنا دیا کہ پان پانسو اور ہزار ہزار کوس سے ہندوستان کے مسلمان جو ایسی صحبتوں سے کوسوں دُور بھاگتے تھے خرچ کثیر برداشت کرکے ایسے چاؤ اور اُمنگ کے ساتھ جیسے کہ لوگ پھول والوں کی سیر یا شالامار کے میلے میں دُور دُور سے آتے ہیں۔ اس علمی مجمع میں آ آکر شریک ہونے لگے۔

سول سروس کلاس اور سول سروس فنڈ ایسوسی ایشن

ایک اور تدبیر ترقی تعلیم کی۔ جو قوم کی معمولی بے پروائی سے براہِ راست پوری نہ ہوسکی سول سروس کلاس اور سول سروس فنڈ ایسوسی ایشن کا قایم کرنا تھا۔ جن کو سرسید نے اس غرض سے قایم کیا تھا کہ جو مسلمان اپنی اولاد کو ولایت کی تعلیم کے لئے تیار کرنا چاہیں اُن کو محمدن کالج میں ایک خاص طریقہ پر ابتدائی تعلیم دیجائے اور بعد امتحان کے جو لڑکے ولایت میں جانے کے قابل سمجھے جائیں اُن کو چندہ کے ذریعہ سے مدد دیجائے۔ یہ تجویز بھی اگر چل جاتی تو مسلمانوں کی ترقی تعلیم کے حق میں نہایت مفید تھی۔ یہاں تک کہ ایجوکیٹڈ کلاس کے ہندو بھی اس ایسوسی ایشن میں شریک ہونے کی دل سے آرزو کرتے تھے۔ چنانچہ ۱۸۸۴ء میں جب کہ سرسید نے پنجاب کا دوسرا سفر کیا تو لاہور کے مقام میں برہمو سماج اور آریہ سماج کے تقریباً پچاس معزز ممبروں نے اور نیز انڈین ایسوسی ایشن لاہور نے سرسید سے یہ تمنا ظاہر کی تھی کہ "اس ایسوسی ایشن میں اگر ممکن ہو تو ہندوؤں کو بھی شامل کیا جائے وہ بہت خوشی سے اس میں چندہ دینے کو تیار ہیں" اگرچہ اور طریقوں سے ہندو و مسلمانوں کے لئے ولایت کی تعلیم کی راہ کھل گئی مگر اس تدبیر میں کچھ کامیابی نہیں ہوئی اور آخر کار وہ کلاس اور وہ ایسوسی ایشن دونوں توڑ دی گئیں۔

کونسل کی ممبری

کونسل کی ممبری کے زمانہ میں جو ملک کی خدمت سرسید نے کی اُس کو نہ صرف مسلمانوں نے بلکہ تمام تعلیم یافتہ ہندوؤں نے برابر تسلیم کیا ہے۔ چنانچہ جو ایڈریس انڈین ایسوسی ایشن لاہور نے ۱۸۸۴ء میں اُن کو دیا تھا اُس میں صاف لکھا تھا کہ "ہندوستان کی قانونی کونسل میں جو آپ نے نہایت منفعت بخش کارروائی کی اُس کی نسبت یہاں (یعنی ایڈریس میں) صرف سرسری طور پر ذکر کیا جاسکتا ہے اور آپ جو اُس زمانہ میں جب کہ آپ مجلس مذکور (یعنی کونسل) میں کام کرتے تھے بے طرفدارانہ طور پر تمام فرقوں کی بہبودی کی فکر رکھتے تھے اور قومی خیالات کو دلیری اور راستبازی کے ساتھ ظاہر کرتے تھے اور بڑی سرگرمی کے ساتھ قومی مطالب کا خیال رکھتے تھے اُس کے لحاظ سے آپ ہماری طرف سے اور ہمارے ہموطنوں کی طرف سے دلی احسان مندی کے مستحق ہیں۔" اسی طرح برہمو سماج اور آریہ سماج کے

ایک معزز ڈپوٹیشن نے۔ جیسا کہ سفرنامۂ پنجاب میں مذکور ہے سرسید کی ممبری کونسل کی نسبت یہ الفاظ کہے تھے کہ "ہم ممبران آریا سماج اور برہمو سماج لاہور تمام ہندوؤں کی طرف سے + + + آپ کی اُن کوششوں کا شکریہ ادا کرتے ہیں جو آپ نے قانونی کونسل میں اور نیز مختلف اوقات میں ہندوستان کے لئے کی ہیں + + + ہندو راجہ مہاراجہ (غالباً یہ اشارہ راجہ شیو پرشاد کی طرف ہے) جن سے بہت کچھ اُمید کیجاتی تھی ملک کے لئے خیرخواہ نہ ثابت ہوئے + + + لیکن آپ نے حب الوطنی کو ہاتھ سے نہ دیا اور البرٹ بل اور دیگر مفید ملک تجویزوں کی کونسل میں استقلال کے ساتھ حمایت کی۔"

جو کام خاص کر مسلمان معزز خاندانوں کی بھلائی کا سرسید نے ممبری کونسل کے زمانہ میں کرنا چاہا تھا اُس کا مفصل ذکر پہلے حصہ میں ہو چکا ہے یعنی قانون وقف خاندانی کا مسودہ جو بڑی محنت اور جانفشانی اور اعلیٰ درجہ کی قانونی لیاقت سے تیار کیا تھا اور جو بعض قانونی موانعات کے سبب کونسل میں پیش نہ ہو سکا وہ کم سے کم اس بات کو ہمیشہ یاد دلائے گا کہ قوم کی بھلائی کی کوئی تدبیر جو خیال میں آسکتی تھی۔ عام اس سے کہ ممکن الوقوع ہو یا نہو۔ اس شخص نے اُس کا تعاقب کئے بغیر نہیں چھوڑا۔

نیشنل کانگرس میں شریک ہونے سے ۱۸۸۷ء میں سرسید نے مسلمانوں کو باز رکھا اگرچہ افسوس اور نہایت افسوس ہے کہ اُن کی اس کارروائی سے تعلیم یافتہ ہندوؤں میں عموماً ایک قسم کی ناراضی مسلمانوں سے پیدا ہو گئی۔ مگر درحقیقت سرسید نے مسلمانوں پر بہت بڑا احسان کیا کہ ایک خاردار جھاڑی میں۔ جو شاید اوروں کے لئے درخت باردار ہو۔ اُن کا دامن اُلجھنے نہیں دیا۔ سرسید کی اس کارروائی کو اوّل اوّل تعلیم یافتہ لوگ نہایت تعجب سے دیکھتے تھے۔ مگر پچھلے دنوں میں پونا کے افسوسناک واقعات نے اُمید ہے کہ اُن کا تعجب رفع کر دیا ہوگا۔ مسلمان جو تعلیم میں نسبتاً مرہٹوں سے کچھ مناسبت نہیں رکھتے اگر کانگرس والوں کے خیالات عام طور پر اُن میں پھیل جاتے تو کچھ شک نہیں کہ وہ اپنی جہالت اور ناعاقبت اندیشی سے بہ نسبت پونا کے برہمنوں کے بہت زیادہ اپنے تئیں گورنمنٹ کی بدگمانی کا نشانہ بنا لیتے اور جب اُن پر کوئی ایسا بُرا وقت آکر پڑتا جیسا پچھلے دنوں میں پونا کے برہمنوں پر پڑا تو جو ہمدردی اہلِ پونا کے ساتھ ملک نے ظاہر کی اور جس قدر اُن کی طرف سے ڈفنس میں پیروی کی گئی اُس کا سوّاں حصہ بھی بدنصیب مسلمانوں کے ہاتھ نہ مسلمانوں کی طرف سے اور نہ غیر قوموں کی طرف سے ظہور میں آنے کی اُمید تھی۔ اگر اس میں کسی کو شک ہو تو وہ مولوی ہدایت رسول کی مثال پر غور کرے جو کانگرس کے بعض جلسوں میں شریک ہو کر بنگالیوں سے آزادی کا سبق

پڑھ کر آئے تھے۔ اگر عام مسلمانوں میں جو تعلیم سے عموماً بے بہرہ ہیں اور جن میں مشکل سے پچاس ہزار میں ایک تعلیم یافتہ نکلے گا۔ کانگریشین گروہ کے خیالات پھیل جاتے تو اُن سے اکثر ایسی ہی سخیف اور نالایق حرکتیں سرزد ہوتیں جیسی ہدایت رسول سے لکھنؤ کے ایک عام مجمع میں سرزد ہوئیں، اور جب وہ عدالت میں ماخوذ ہوتے تو اپنے تئیں ویسا ہی بے یار و مددگار پاتے جیسا ہوا ہوگی ہدایت رسول کا حال ہوا کہ اُس کو ضمانت تک نہ ملی آئی اور جو سزا عدالت ماتحت نے اُس کے لئے تجویز کی اُس کو بے چون و چرا قضائے مبرم کی طرح بھگتنا پڑا۔

پس اگرچہ مسلمانوں کی علیحدگی سے ہندوؤں میں ناراضی پھیل جانے کا نہایت افسوس ہے لیکن کانگرس کی شرکت میں جو مضر نتائج مسلمانوں کے حق میں پیدا ہونے والے تھے وہ اُن کے لئے اس سے بہت زیادہ افسوسناک ہوتے۔ اسی لئے مسلمانوں کو سرسید کا دل سے شکرگزار ہونا چاہئے کہ اس شخص کی چیخ پکار نے وہ ایک ایسے ایجیٹیشن میں۔ جو دیوانوں کے لئے ھُو کی آواز اور ہشیاروں کے لئے خالی بادل کی گرج تھی۔ شریک ہونے سے باز رہی۔

اصل بات یہ ہے کہ جب ہم کانگرس کے بلند ارادوں پر نظر کرتے ہیں اور پھر اپنے گریبان میں مونہ ڈال کر دیکھتے ہیں تو اُن کو لامحالہ یہ کہنا پڑتا ہے کہ "حلوا خوردن را روئے باید"۔ ہماری قوم میں عموماً پھوٹ پڑی ہوئی ہے، مذہبی تعصبات مادۂ اکالہ کی طرح قوم کو فنا کر رہے ہیں ہر فرقہ دوسرے فرقہ کی جان کا مال کا عزت و آبرو کا خواہاں ہے۔ پولیس ہمارے مذہبی جھگڑوں کی تحقیقات کرتے کرتے اور حاکم سزائیں دیتے دیتے تھک گئے مگر ہم لڑنے جھگڑنے کے لئے اُسی طرح تازہ دم ہیں، تمام قوم ہزاروں بیہودہ رسموں کی پابندی میں گرفتار ہے، اسراف اور فضول خرچی ہماری قومی خصلت بن گئی ہے، صدہا خاندان اپنی فضولیوں کے سبب بگڑ گئے اور بگڑتے چلے جاتے ہیں، کروڑہا روپیہ کی جائداد قرضہ کی ڈگریوں اور عدالت کے جھگڑوں میں غیر قوموں کے پاس منتقل ہوتی چلی جاتی ہے، تعلیم کے لحاظ سے اگر بنظر انصاف دیکھا جائے تو ابھی ہم نے الف بے تے شروع کی ہے، عورتوں کی تعلیم۔ جو قومی ترقی کی جڑ ہے۔ اُس کے لحاظ سے ہم اب تک بالکل صفر ہیں، تجارت میں گویا ہمارا کچھ حصّہ ہی نہیں، دولت کو ہمارے ساتھ وہ نسبت ہے جو پانی کو چھلنی کے ساتھ ہے، لاکھوں مسلمان شہر شہر اور گاؤں گاؤں بھیک مانگتے پھرتے ہیں مگر ہم اس کا کچھ تدارک نہیں کرتے، ہزاروں اشراف خاندانوں کے لاوارث اور مفلس بچے آوارہ اور مطلق العنان پھرتے ہیں مگر ہم سے اُن کی پرورش اور تعلیم کا کچھ انتظام

نہیں ہوسکتا، ہماری حالت پر فی الواقع یہ مثل صادق آتی ہے کہ "اونٹ رے اونٹ تیری کون سی کل سیدھی"۔ جب کہ ہماری قوم کا یہ حال ہے تو کس برتے پر ہم نیشنل کانگرس میں شریک ہوسکتے ہیں اور کیا مُنہ لے کر ہم گورنمنٹ سے اُن حقوق کا مطالبہ کرسکتے ہیں جن کے ہم مستحق نہیں ہوئے۔ ہم کو پہلے اس سے۔ کہ گورنمنٹ سے کچھ مانگیں۔ مانگنے کا استحقاق پیدا کرنا چاہیئے اور پہلے اس سے کہ گورنمنٹ سے اُن اصلاحوں کے خواستگار رہوں۔ جو اُس کے اختیار میں ہیں۔ ہم کو وہ اصلاحیں کرنی چاہئیں جو خود ہمارے اختیار میں ہیں۔ ہم کو اپنی معاشرت مذہب اخلاق اور تعلیم و تربیت کے متعلق ہزاروں کام کرنے ہیں جن کے بغیر ہماری دنیا اور دین دونوں خراب ہیں پھر ہم سلطنت سے کس بات کی توقع رکھتے ہیں۔ ہم کو اپنے نبی کا یہ ارشاد یاد رکھنا چاہیئے کہ "اعمالکم عمالکم" (یعنی جیسی تمہاری حالت ہوگی ویسی ہی تم پر حکومت کی جائیگی) اسی لئے سرسید نے اپنی لکھنو والی اسپیچ کے آخر میں مسلمانوں کو یہ نصیحت کی تھی کہ "گورنمنٹ سے حقوق طلب کرنے کا بھی ایک طریقہ ہے کہ اپنے تئیں اُن حقوق کا مستحق بناؤ" اور کہا تھا کہ "جو چیز تم کو اعلیٰ درجہ پر پہنچانے والی ہے وہ صرف ہائی ایجوکیشن ہے۔ جب تک ہماری قوم میں ایسے لوگ پیدا نہوں گے ہم ذلیل رہیں گے"، اَور دوں سے پست رہیں گے اور اُس عزت کو نہ پہنچیں گے جس پر پہنچنے کو ہمارا دل چاہتا ہے۔ یہ دلسوزی کی چند نصیحتیں ہیں جو میں نے تم کو کیں ہیں مجھے اس کی کچھ پروا نہیں ہی کہ کوئی مجھے دیوانہ کہے یا اور کچھ، میرا فرض تھا کہ میرے نزدیک جو باتیں قوم کی بھلائی کی ہیں وہ اُن سے کہدوں اور اپنا فرض ادا کروں اور خدا کے سامنے۔ جو قادر مطلق اور رحیم اور گناہوں کا بخشنے والا ہی۔ اپنے ہاتھوں کو دھو دوں۔

یہ ہی سلسلہ سرسید کی سرکاری، ملکی اور قومی خدمات کا جن میں بعض ایسی جلیل القدر ہیں کہ جس قوم میں ایک مثال بھی ایسی خدمات کی پائی جائے وہ قوم کم سے کم دنیا کی نظر میں حقیر نہیں سمجھی جاتی جیسا کہ کہا گیا ہی ؎

مُتیٰ تَخلُو تَمِیمٌ مِن کَرِیمٍ ‌ ‌ ‌ وَمُسلِمَۃُ ابنُ عَمرٍ وَمِن تَمِیمٍ

(یعنی جب کہ مسلمۃ بن عمرو (یعنی امیر ممدوح) بنی تمیم میں سے ہی تو یہ کیوں کر کہا جا سکتا ہی کہ بنی تمیم جوانمردوں سے خالی ہیں)

مذہبی خدمات

اس عنوان میں ہم سرسید کی وہ کوششیں اور خدمات دکھانی چاہتے ہیں جو دین اسلام کی

حمایت میں زمانۂ حال کی ضرورتوں کے موافق وہ اخیر دم تک انجام دیتے رہے۔ اگرچہ ابھی تک اُن کی مذہبی خدمات کی کچھ قدر نہیں ہوئی۔ کیوں کہ ایک محدود جماعت کے سوا اکثر مسلمان اُن کی مذہبی تصنیفات کو مُخرّب اسلام جانتے ہیں اور اکثر تکفیر یا تضلیل کے خوف سے محض مصلحتاً مخالفین کی ہاں میں ہاں ملا دیتے ہیں یا سکوت اختیار کرتے ہیں، لیکن چوں کہ مخالفت کا سبب محض تعصب یا پاس دینداری ہی نہیں بلکہ اُس کے ساتھ ناواقفیت اور زمانہ کی ضرورتوں سے بے خبر ہونا بھی شامل ہے اس لئے اُمید ہے کہ جس قدر لوگ زمانہ کی ضرورتوں سے واقف ہوتے جائیں گے اُسی قدر سرسید کی مذہبی خدمات کی قدر مسلمانوں میں روز بروز بڑھتی جائے گی۔

سرسید نے جو کچھ مذہب کے متعلق ابتدا سے اخیر تک لکھا ہے منجملہ اُس کے وہ کتابیں اور رسالے جو غدر کے زمانہ سے پہلے لکھے گئے اور جن کا ذکر پہلے حصّہ میں اپنے اپنے موقع پر آچکا ہے وہ اس مقام پر ہماری بحث سے خارج ہیں، کیوں کہ اُن میں ہم کوئی چیز ایسی نہیں پاتے جس کی لحاظ سے اُن کو قدیم طرز کی تصنیفات میں کوئی ممتاز درجہ دیا جائے یا جو اسلام کی حمایت کے لئے اس زمانہ میں درکار ہے۔ پس جو کچھ ہم کو اس بات میں دکھانا ہے وہ صرف اُن کی وہ مذہبی خدمات ہیں جو غدر کے بعد اُنھوں نے انجام دیں۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ جو کچھ اُنھوں نے غدر کے بعد مذہب کے متعلق لکھا وہ خطا اور غلطی سے بالکل پاک ہے۔ اور ایک فانی مخلوق کا کام ایسا ہو بھی نہیں سکتا لیکن ہم یہ ضرور کہتے ہیں اور کہیں گے کہ جس شخص کو کافر، ملحد، نیچری اور بد مذہب کہا جاتا تھا جو اسلام کی خدمت اُس سے بن آئی وہ نہ اُن مستفتیوں سے ہو سکی جنھوں نے مکہ میں جاکر اُس کے کفر کے فتوے لکھوائے اور نہ اُن مفتیو سے جنھوں نے مسجد الحرام میں بیٹھکر اُس کے کفر کے فتووں پر مہریں کیں۔

اسلام کی زمانۂ حال میں حالت

ہندوستان میں اسلام تین خطروں سے گھرا ہوا تھا۔ ایک طرف مشنری اُس کی گھات میں لگے ہوئے تھے۔ اگرچہ قحط کے دَوروں میں اُن کو دُبلا پتلا شکار پیٹ بھرا ملجاتا تھا مگر وہ اس پر قانع نہ تھے اور ہمیشہ صید فربہ کی تلاش میں رہتے تھے۔

پہلا خطرہ

ہندوستان میں سب سے زیادہ ان کا دانت مسلمانوں پر تھا اور اس لئے اُن کی منادیوں میں، اُن کے اخباروں میں اور اُن کے رسالوں میں زیادہ تر بوچھار اسلام پر ہوتی تھی۔ اسلام کی تعلیم کی طرح طرح سے بُرائیاں ظاہر کرتے تھے۔ بانی اسلام کے اخلاق و عادات پر انواع و اقسام کی نکتہ چینیاں کرتے تھے چنانچہ بہت سے مسلمان کچھ ناواقفیت اور بے علمی کے سبب اور اکثر افلاس کے

سبب اُن دام میں آ گئے۔ اس خطرہ سے بلا شبہ بعض علمائے اسلام (شکر اللہ مساعیهم) جیسے مولانا رحمت اللہ مرحوم اور مولوی آلِ حسن اور ڈاکٹر وزیر خاں وغیرہ متنبہ ہوئے انھوں نے متعدد کتابیں عیسائیوں کے مقابلہ میں لکھیں اور اُن سے بالمشافہہ مناظرے کیے جس سے یقیناً مسلمانوں کو بہت فائدہ ہوا لیکن اس کا اثر مسلمانوں ہی تک محدود رہا عیسائیوں کی غلط فہمیاں جو اسلام کی نسبت قدیم سے چلی آتی تھیں وہ بدستور قایم رہیں۔

دوسرا خطرہ

دوسرا خطرہ جو پہلے سے زیادہ خوفناک تھا وہ مسلمانوں کی پولیٹکل حالت سے علاقہ رکھتا تھا۔ اوّل تو مسلمان اس نظر سے کہ ہندوستان کی سلطنت انگلش قوم نے مسلمانوں سے لی تھی، ہمیشہ حکمران قوم کی نگاہ میں کھٹکتے تھے دوسرے بسبب اُن غلط فہمیوں کے جو یوروپ کی تمام عیسائی قوموں میں اسلام کی نسبت پھیلی ہوئی تھیں۔ انگریز مسلمانوں کے مذہب کو بغاوت و فساد کا سرچشمہ اور امن و عافیت کا دشمن خیال کرتے تھے۔

تیسرا خطرہ

تیسرا خطرہ خاص کر مذہب اسلام کو انگریزی تعلیم کی طرف سے تھا جو روز بروز ہندوستان میں پھیلتی جاتی تھی اور جس سے ہندوستانیوں کو کسی طرح مفر نہ تھا۔ اگرچہ غدر سے پہلے مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کی کچھ اشاعت نہیں ہوئی تھی۔ لیکن غدر کے بعد اس کے بغیر مسلمانوں کا اُبھرنا محال ہو گیا تھا یہاں تک کہ سرسید کو خود اُن میں تعلیم پھیلانی پڑی۔ حالاں کہ انگریزی تعلیم کے نتائج اسلام کے حق میں مشنریوں کی پریچنگ سے بہت زیادہ اندیشہ ناک تھے۔

سرسید نے تینوں خطروں کا مقابلہ کیا

پچھلے دونوں خطروں کا سرسید کے سوا ہندوستان کے کسی عالم کو احساس نہیں ہوا۔ مولویوں سے اس کے سوا کہ چند روز دریا کی رَو یعنی انگریزی تعلیم کو روکنے کے لئے ہاتھ پاؤں مار کر رہ گئے اور کچھ نہ ہو سکا۔ سید احمد خاں پہلا شخص ہے جس نے ان تینوں خطروں کا جہاں تک کہ اُس کی قدرت میں تھا مقابلہ کیا اور توقع سے زیادہ اُس میں کامیابی حاصل کی۔ اُس نے تمام اعتراضوں کے جواب جن کے ذریعہ سے مشنری مسلمانوں کو دام میں لا سکتے تھے خود عیسائی عالموں کے اقوال کی سند پر لکھے اس نے اُن تمام غلطیوں کو رفع کیا جو اسلام کی نسبت عیسائی قوموں میں پھیلی ہوئی تھیں۔ اُس نے بدلائل قاطعہ ثابت کر دیا کہ دنیا میں کوئی مذہب اسلام سے زیادہ عیسائی مذہب اور عیسائی قوم کا دوست نہیں ہو سکتا اور اُسی نے جب دیکھا کہ انگریزی تعلیم سے کسی طرح مسلمانوں کو مفر نہیں تو اپنی عمر کا ایک تہائی حصہ اسلام کو انگریزی تعلیم کے مضر نتائج سے بچانے میں صرف کیا۔

تبیین الکلام

اُنہوں نے ان مقاصد کی طرف پہلے ہی بار اُس وقت توجہ کی تھی جبکہ مراد آباد میں تبیین الکلام یعنی توریت وانجیل کی تفسیر لکھنے کی بنیاد ڈالی اس کتاب کا مفصل ذکر پہلے حصہ میں ہو چکا ہے یہاں اُس کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے

پھر جب سر ولیم میور کی کتاب لائف آف محمد چار جلدوں میں چھپکر ہندوستان میں پہنچی جسکی نسبت عیسائیوں میں مشہور تھا کہ اُس نے اسلام کے استیصال میں تسمہ لگا نہیں رکھا۔ اُس وقت جو حال سرسید کی بے چینی اور جوش وخروش کا تھا وہ ہم نے اپنی آنکھ سے دیکھا ہے۔ غالباً ۱۸۶۷ء یا ۱۸۶۸ء میں سائنٹفک سوسائٹی کا سالانہ جلسہ تھا اور دلی سے منشی امو جان مرحوم اور جہانگیر آباد سے نواب مصطفیٰ خاں مرحوم۔ کہ یہ بھی اُس وقت تک سوسائٹی کے ممبر تھے۔ علی گڑھ گئے تھے۔ نواب صاحب کے ہمراہ میں بھی گیا تھا گو اُس وقت تک میری سرسید سے جان پہچان نہ تھی مگر چونکہ ہم اُنہیں کی کوٹھی میں ٹھیرے تھے اُن کے خیالات معلوم کرنیکا اکثر موقع ملتا تھا۔ وہ جب کبھی اَور کاموں سے فارغ ہوکر بیٹھتے تھے اکثر سر ولیم کی کتاب کا ذکر کرتے تھے اور نہایت افسوس کے ساتھ کہتے تھے کہ اسلام پر یہ حملے ہو رہے ہیں اور مسلمانوں کو مطلق خبر نہیں۔ اُسی وقت ہم نے یہ بھی دیکھا کہ سرسید جاہلیت کے اشعار۔ جن سے اُس زمانہ کی بیہودہ اور نفرت آنگیز رسمیں ظاہر ہوتی ہیں۔ اور جو خطبات احمدیہ میں بجنسہٖ نقل کئے گئے ہیں۔ ایک مولوی سے انتخاب کرا رہے تھے جس سے معلوم ہوتا تھا کہ اُنکا پختہ ارادہ سر ولیم کی کتاب کا جواب لکھنے کا ہے۔

مگر معلوم ہوتا ہے کہ آخر کار جب اُنہوں نے دیکھا کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں ہندوستان کے تمام اسلامی کتب خانے برباد ہو گئے ہیں اور جن کتابوں کی اس مضمون کے لیے ضرورت ہے وہ یہاں دستیاب نہیں ہو سکتیں تو اُن کو ولایت جانے کا خیال ہوا۔ چنانچہ ایک ہی دو برس بعد جب سید محمود کا ولایت جانا قرار پایا تو وہ بھی اُن کے ساتھ روانہ ہو گئے۔

سرسید کے بعض خطوں سے جو اُنہوں نے ولایت سے سید مہدی علی خاں کے نام بھیجے ہیں پایا جاتا ہے کہ ہندوستان سے چلتے وقت جب اُنہوں نے یہ ارادہ اپنے احباب پر ظاہر کیا تو اُن کے بعض دوست جو سرکاری عہدہ دار اور سر ولیم میور کی گورنمنٹ کے ماتحت تھے اُن کو سر ولیم کی کتاب کا جواب لکھنے سے مانع آئے تھے مگر سرسید نے اُنکا کہنا نہیں مانا۔ اور ولایت پہنچتے ہی اس کی فکر میں مصروف ہو گئے۔

خطبات احمدیہ کی تالیف

انہوں نے انڈیا آفس کے کتب خانہ سے کتابیں بہم پہنچائیں۔ برٹش میوزیم کی لائبریری سے بہت سی اطلاعیں حاصل کیں۔ سیر کی عربی کتابیں جو مصر و فرانس اور جرمنی میں چھپی تھیں وہاں سے منگوائیں اور چند لیٹن اور انگریزی کی پرانی کتابیں جو نایاب تھیں بہت گراں قیمت پر لندن کے بازار سے خریدیں اور شب و روز کی لگاتار محنت سے بارہ اسّے یعنی خطبے یا مضمون لکھکر ایک لایق انگریز سے انگریزی میں ترجمہ کرائے اور لندن ہی میں خطبات احمدیہ کے نام سے اُس کو چھاپ کر شتہر کیا۔

چند خطوط جو ولایت سے مولوی مہدی علی خاں کو لکھے

اس کتاب کے لکھتے وقت جس قدر جوش سرسید کے دل میں تھا اور جو مالی مشکلات اُن کو اس کے شایع کرنے میں پیش آئیں اور جو سخت محنت اُس کے لکھنے میں اُنکو کرنی پڑی اُس کا کسی قدر اندازہ اُن کے خطوں سے ہوتا ہے جو اُنہوں نے ولایت سے مولوی سید مہدی علیخاں کے نام بھیجے ہیں۔ وہ ایک خط میں لکھتے ہیں" ان دنوں ذرا قدرے دل کو شورش ہے۔ ولیم میور صاحب کی کتاب کو میں دیکھ رہا ہوں۔ اُس نے دل کو جلا دیا اور اُسکی نا انصافیاں اور تعصبات دیکھکر دل کباب ہوگیا۔ اور مصمم ارادہ کیا کہ آنحضرت صلعم کی سیر میں جیساکہ پہلے سے ارادہ تھا کتاب لکھدی جائے اگر تمام روپیہ خرچ ہو جائے اور میں فقیر بھیک مانگنے کے لایق ہو جاؤں تو بلا سے۔ میں نے فرانس اور جرمن سے اور مصر سے کتب سیر منگانی شروع کر دی ہیں، چٹھیات روانہ ہوگئیں۔ سیرت ہشامی مطبوعہ اور چند کتابیں لیٹن کی خریدلیں، ایک آدمی مقرر کرلیا جو لیٹن کا ترجمہ کرکر مضمون تبلاسکے"

ایک خط میں لکھتے ہیں" مواعظ احمدیہ (یعنی خطبات احمدیہ) لکھنے میں شب و روز مصروف ہوں۔ اسکے سوا اور کچھ خیال نہیں۔ جانا آنا ملنا جلنا سب بند ہے۔ آپ اس خط کے پہنچنے پر میر ظہور حسین کے پاس جائیے اور دونوں صاحب کسی مہاجن سے میرے لیے ہزار روپیہ قرض لیجیے، سود اور روپیہ میں ادا کردونگا + + + ہزار روپیہ بھیجنے کے لیے دلی لکھاہے اور رکھدیا ہے کہ کتابیں اور میرا اسباب یہانتک کہ میرے ظروف مسی تک فروخت کرکے ہزار روپیہ بھیجدو + + + کیا کہیے اس کتاب کے پیچھے خواب و خور حرام ہوگیا خدا مدد کرے"

ایک اور خط میں لکھتے ہیں" میں روز و شب تحریر کتاب سیر مصطفوی (یعنی خطبات احمدیہ) میں مصروف ہوں۔ سب کام چھوڑ دیا ہے۔ لکھتے لکھتے کمر درد کرنے لگتی ہے + + + اور کسی شخص کے مددگار نہونے سے یہ کام اور بھی سخت ہوگیا ہے۔ اِدھر جب حساب دیکھتا ہوں تو جان نکل جاتی ہے کہ الٰہی لکھنا اور چھپوانا شروع کر دیا روپیہ کہاں سے آئیگا مسلمان البتہ آستینیں چڑھاکر اس بات پر تو لڑنے کو

تیار ہو جاوینگے کہ انگریزوں کے ساتھ کھانا کیوں کھایا؟ مگر جب کہو کہ مذہب کی تائید میں کچھ روپیہ خرچ کرو تو جان بچائیں گے"

ایک اور خط میں لکھتے ہیں" میں اپنا حال آپ کو کیا لکھوں، سکتہ سا ہو گیا ہے - دن رات کی تکلیف سے - جو میرا دل ہی خوب جانتا ہے - جلد اول خطبات احمدیہ کی تمام ہو گئی ہے اور اس مہینے میں چھاپہ بھی تمام ہو جائے گا - اب جو اندازہ اُس کی ایک جلد کے چھاپے کی لاگت کا کیا گیا تو ڈھائی ہزار روپیہ سے زیادہ کا معلوم ہوتا ہے - ہوش جاتے رہے ہیں اور جان میں جان نہیں - میر تراب علی نے نہایت مدد کی ہے، تین سو روپیہ اس کے چندہ کی بابت بھیجے ہیں - میر ظہور حسین صاحب نے ڈیڑھ سو روپیہ بھیجا ہے مرزا رحمت اللہ بیگ صاحب نے اپنا چندہ سو روپیہ کا بھیجدیا + + + آپ زین العابدین سے روپیہ منگوا کر بھیجوا دیجیے - اپنا ذاتی چندہ سو روپیہ کا بھی بھیجدیجیے -

جب ہندوستان سے سرسید کے دوستوں نے کچھ اور چندہ بھیجا ہے تو اُن کو بے انتہا تقویت ہوئی چنانچہ اُس کی رسید کے خط میں وہ لکھتے ہیں کہ" اگر آپ لوگ کچھ مدد نہ کرتے تو زہر کھا کر مرجانے کے سوا کچھ چارہ نہ تھا"

مگر بعض خطوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جو تخمینہ کتاب کے چھاپہ کا پہلے کیا گیا تھا اُس سے بہت زیادہ صرف ہو گیا تھا، یعنی قریب چار ہزار کے خرچ ہوا - جس میں سے کچھ کم سولہ سو روپیہ سرسید کے دوستوں نے ہندوستان سے چندہ کر کے بھیجا اور باقی روپیہ اُنہوں نے قرض لیکر ادا کیا - اُن کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ ولایت سے مراجعت کرتے وقت اُن کے پاس زادِ راہ کے لیے کچھ نہ رہا تھا اور نہایت پریشان تھے وہ ایک خط میں لکھتے ہیں کہ" اب جب تک اور روپیہ قرض نہ لیا جائے مراجعت متعسر ہے - یہ ترددات ایسے جانکاہ ہیں کہ بیان نہیں ہو سکتا - کتابیں مطبوعہ صندوقوں میں بند ہو رہی ہیں واسطے روانگی ہندوستان کے - اُن کے محصول وغیرہ میں بھی دو سو روپیہ سے کم خرچ نہیں ہونے کے - زیادہ حال ترددات کا لکھنا ناحق آپ کو تردد میں ڈالنا ہے"

شاید اسی اخیر خط کے جواب میں مولوی سید مہدی علی خاں نے اپنی ساری تنخواہ بھیجنے اور کچھ قرض لینے کا ارادہ ظاہر کیا تھا جس کے جواب میں سرسید نے اُنکو لکھا کہ" کتاب کے اخراجات کا صدمہ اور نیز اسی صدمہ میں صدمۂ غم انتقال ہمشیرۂ حامد و محمود کا لاحق ہونا جیسا کچھ مصیبت کا وقت مجھ پر گذرا واقعۂ کربلا سے کم نہ تھا؂ ع این ہمہ اندر عاشقی بالائے دگر - آپ نے جو الفاظ اپنی محبت اور الفت سے لکھے ہیں اُن کا بہت بہت شکر کرتا ہوں اور بے تکلف لکھتا ہوں کہ اب کچھ حاجت نہیں ہے

تین ہزار روپیہ قرض لیا گیا سب بیباق ہوگیا۔ اب آپ نہ کچھ قرض لیجیے نہ اپنی تنخواہ بھیجیے" مگر غالباً معلوم ہوا کہ سید مہدی علی خاں اس خط کے پہنچنے سے پہلے اپنی تنخواہ کا روپیہ روانہ کر چکے تھے۔

معلوم ہوتا ہے کہ سرسید اس کتاب کے لکھنے کو مذہبی فرائض میں سب سے زیادہ اہم اور ضروری خیال کرتے تھے اور جب کہ وہ حسب دلخواہ تیار ہوگئی تو اُن کو بے انتہا خوشی اور فخر اس کے لکھنے پر ہوا تھا۔ وہ سید مہدی علی خاں کو ایک کتاب میں لکھتے ہیں "اگر میری یہ کتاب تیار ہوگئی تو میں لندن میں آنا دس حج کے برابر سمجھونگا، خدا قبول کرے" ایک اور خط میں لکھتے ہیں "میری کتاب خطبات احمدیہ ایک مسلمان عالم متبحر نے کہ جو قسطنطنیہ سے یہاں آیا ہے۔ جو الفاظ اُس نے کہے اور مجھے لکھے اور جس طرح میرے ہاتھ چومے اُس کی لذت میں ہی جانتا ہوں" ایک اور خط میں لکھتے ہیں "آنحضرت صلعم کی بارہ برس کی عمر تک حال لکھ چکا اور سر ولیم میور صاحب اور اور مصنفوں نے یہانتک کے حال پر جو کچھ لکھا ہے سب کے ایک ایک حرف کا جواب لکھا ہے۔ نہایت محققانہ جواب ہیں اور یہ شرط ہے کہ کسی شخص کے آگے ڈالدو وہ کیسا ہی بے دین کیوں نہو اگر وہ کہے کہ ہاں نہایت سچ اور انصاف کا جواب ہے تو تو میرا نام ورنہ میرا نام نہیں"

خیر یہ خیالات تو سرسید کے اپنی کتاب کی نسبت ایسے ہی ہیں جیسے ہر مصنف کے خیالات اپنی تصنیف کی نسبت ہوتے ہیں، اس سے سوا اس کے کہ وہ اسلام کی حمایت کرنے سے بے انتہا خوش تھے اور کوئی بات ثابت نہیں ہوتی۔ سرسید سے پہلے بے شمار عالموں نے بمقابلہ عیسائیوں کے اسلام کی حمایت میں کتابیں لکھی ہیں، غدر سے پہلے خود ہندوستان کے علمائے اسلام نے (جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا) بڑی بڑی مبسوط کتابیں نہایت کوشش سے اِسی مضمون پر تحریر کی ہیں۔

خطبات احمدیہ کی ترجیح علمائے اسلام کی کتابوں پر [illegible]

پس تا وقتیکہ خطبات احمدیہ میں کوئی وجہ ترجیح کی نہ پائی جائے اسکو اگلے علما کی کتابوں پر فوقیت نہیں دیجاسکتی۔ مگر ہمارے نزدیک فی الواقع ایسی وجوہات موجود ہیں جنکی روسے کہا جاسکتا ہے کہ سرسید سے پہلے کسی مسلمان سے اسلام کی ایسی خدمت بن نہیں آئی"

وجہ ترجیح اول

اولاً۔ جہاں تک ہمکو معلوم ہوا ہے سرسید سے پہلے دنیا کے کسی مسلمان نے یوروپ کا سفر محض اس غرض سے اختیار نہیں کیا کہ وہاں جا کر اسلام کی حمایت کے لیے بڑے بڑے کتب خانوں سے میٹریل جمع کرے، وہیں بیٹھکر عیسائیوں کی تردید

اور اسلام کی تائید میں کتاب لکھے، یوروپ ہی کی کسی زبان میں - جو تمام بر اعظم میں عموماً بولی اور سمجھی جاتی ہو - اُس کا ترجمہ کرائے اور وہیں اُس کو چھپوا کر شائع کرے اور اس طرح اسلام کی خوبیاں اُن قوموں کے کان تک پہنچائے جنھوں نے تیرہ سو برس سے کبھی اسلام کی نسبت بُرائی کے سوا کوئی بات نہ سُنی ہو -

ریورنڈ ہوپر - جو اب سے تقریباً ۲۵ برس پہلے لاہور ڈیوٹی کالج میں پرنسپل تھے اور جن سے میں خود بارہا ملا ہوں اُنھوں نے میرے ایک دہلوی دوست سے - جو اُن کو اُردو پڑھاتے تھے کہا کہ "مسلمانوں سے نہایت تعجب ہے کہ وہ سید احمد خاں کو کافر ملحد اور بد مذہب سمجھتے ہیں : ہمارے نزدیک جو کام سید احمد خاں نے اسلام کی حمایت کا کیا ہے وہ آج تک کسی مسلمان سے بن نہیں آیا - جب کہ مسلمان اسلام کے سوا سب مذہبوں کو باطل یا غلط سمجھتے ہیں اور اسلام کا ماننا تمام بنی آدم پر فرض جانتے ہیں تو اُن کا فرض تھا کہ جن کو وہ گمراہ سمجھتے تھے اُن پر اسلام کی حقیقت اور اُس کی خوبی ظاہر کرتے، اُن کے ملکوں میں جا کر اُنہیں کی زبان میں وعظ کہتے یا اُنہیں کی زبان میں اسلام کی حمایت پر کتابیں لکھتے میں نہیں جانتا کہ تیرہ سو برس میں سید احمد خاں سے پہلے کسی ایک مسلمان نے بھی ایسا کام کیا ہو"

مسٹر آرنلڈ - جنھوں نے ابھی پریچنگ آف اسلام لکھی ہے اُس کے لکھتے وقت مسلمانوں کے لٹریچر سے بے مثل واقفیت حاصل کی ہے - ایک نہایت سچے اور نہایت پختہ عیسائی ہیں اُن کا بیان ہے کہ "ایسی مثالیں تو پائی جاتی ہیں کہ کسی مسلمان نے بمقابلہ عیسائیوں کے اپنی زبان میں اپنی ہی ملک میں بیٹھکر اسلام کی حمایت پر کوئی کتاب لکھی اور اُس کا ترجمہ کسی یوروپ کی زبان میں ہو گیا - لیکن مجھے کوئی ایسی مثال معلوم نہیں کہ کسی مسلمان نے یوروپ میں جا کر یوروپ ہی کی کسی زبان میں اس مضمون پر کتاب لکھ کر شائع کی ہو"

سر سید کہتے تھے کہ ۱۸۷۰ء میں جبکہ خطبات احمدیہ چھپکر لندن میں شائع ہوئی تو اُس پر لندن کے ایک اخبار میں کسی انگریز نے لکھا تھا کہ عیسائیوں کو ہوشیار ہو جانا چاہیے کہ ہندوستان کے ایک مسلمان نے اُنھیں کے ملک میں بیٹھکر ایک کتاب لکھی ہے جس میں اُس نے دکھایا ہے کہ اسلام اُن تمام داغوں اور دھبوں سے پاک ہے جو عیسائی اُس کے خوشنما چہرے پر لگاتے ہیں ::

دوسری خصوصیت دوسری خصوصیت اس کتاب کی یہ ہے کہ سر سید نے اس کتاب میں مناظرہ کے اُس مخاصمانہ طریقہ کی جگہ - جو مسلمانوں میں عموماً دائر و سایر ہے اور جس سے فریق مخالف کے دل میں بجائے رغبت کے نفرت اور بجائے آشتی کے ضد پیدا ہوتی ہے - ایک ایسا دوستانہ

اور بے تعصبانہ طریقہ اختیار کیا ہے جو کسی کو ناگوار نہیں معلوم ہوتا اور مسلمانوں کے لیے ایک ایسی مثال قایم کی ہے جس کی نہایت ضرورت تھی۔

کرنل گریہیم سرسید کی لائف میں خطبات احمدیہ کی نسبت لکھتے ہیں کہ "اس کتاب سے ظاہر ہوتا ہے مصنف کا غیر معمولی تعمقِ نظر، غیر مذہبوں سے بے تعصبی اور اصلی عیسائیت کے سچے اصول کا ادب"

پھر اپنی قوم کے مذہبی لوگوں کو اس طرح آگاہ کرتے ہیں کہ "جو لوگ مذہبی باتوں سے دلچسپی رکھتے ہیں اُنکو چاہیے کہ اس کتاب کو غور سے پڑہیں۔ دین محمدی فی زماننا انگریزوں کے نزدیک بالکل ایک غیر معقول اور سخت متہم دین ہے اور وہ اُس کو ایک روحانی آفت خیال کرتے ہیں جیسے کہ ہمارے بزرگ اس صدی کے شروع میں بونا پارٹ کو ایک جسمانی آفت خیال کرتے تھے۔ وہ (یعنی اسلام) عموماً ایک تلوار کا مذہب خیال کیا جاتا ہے اور ہر ایک چیز تعصب مغایرت اور تنگدلی کی اُنہیں خیال کی جاتی ہے۔ لیکن ہمارے ناظرین کتاب جو اس غلطی میں مبتلا ہیں۔ جب سید احمد خاں کی اس کتاب کو غور سے پڑہیں گے تو میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ بالکل دوسرے خیالات لیکر اُٹھیں گے۔ ہمارے مصنف (یعنی سید احمد خاں) نے اپنے دلی دوست سر ولیم میور کی کتاب "لائف آف محمد" کی تحریروں کی مخالفت کی ہے اور خوب چٹکیاں لی ہیں۔ اور میں خیال کرتا ہوں کہ بے تعصب اور نکتہ سنج ناظرین کتاب بہت سی باتوں میں سر ولیم میور کے خلاف فیصلہ دینے میں اتفاق کرینگے" اس سے ہر شخص بخوبی اندازہ کرسکتا ہے کہ خطبات احمدیہ نے انگریزوں کے دل پر کیا اثر کیا اور جو کتابیں مذہبی مناظرہ کے متعلق۔ برخلاف قدیم طریقہ کے شائستگی اور بے تعصبی کے ساتھ لکھی جاتی ہیں وہ کسقدر مفید اور کس قدر فریق ثانی کو انصاف پر مائل کرنے والی ہوتی ہیں۔

تیسری خصوصیت

تیسری خصوصیت اس کتاب میں یہ ہے کہ سر ولیم میور نے وہ قدیم فرسودہ و بوسیدہ طریقہ جسکے بموجب مشنیری اسلام پر نکتہ چینی کرتے تھے اور جسمیں اُنکو کبھی مقابلہ اہل اسلام کے کامیابی نہیں ہوئی ترک کر دیا تھا اور اُسکی جگہ اپنی کتاب لائف اوف محمد میں نکتہ چینی کا ایک ایسا طریقہ اختیار کیا تھا جو خاصکر تعلیم یافتہ لوگوں پر۔ خواہ وہ مسلمان ہوں خواہ ہندو اور خواہ عیسائی بہت زیادہ اثر کرنے والا تھا۔ مثلاً قدیم مشنیری مسلمانوں کی کتب سیر و احادیث پر یہ اعتراض کرتے تھے کہ وہ مثل انجیلوں کے الہام سے نہیں لکھی گئیں اور اس لیے جن روایتوں سے آنحضرت کے معجزات اور پیشین گوئیاں ثابت کی جاتی ہیں وہ اعتبار کے لایق نہیں ہیں۔ مگر سر ولیم میور نے اُنکے برخلاف تمام روایتوں کو۔ جو مسلمانوں کی حدیثوں تفسیروں اور سیر کی کتابوں میں مندرج ہیں صحیح تسلیم کرکے آنحضرت کی تعلیم اور اخلاق وغیرہ پر نکتہ چینی کی تھی۔ یا مثلاً پادری فانڈر وغیرہ

اسلام کے برخلاف عقلی دلیلیں پیش کرتے تھے اور اُس کی تعلیم کو انبیا کی روحانی تعلیم کے منافی بیان کرتے تھے، مگر سر ولیم میور نے بجائے عقلی دلیلوں کے تاریخی شہادتیں پیش کی تھیں اور بجائے اس کے کہ اسلام کی تعلیم کو روحانیت کے برخلاف ثابت کریں اُس کو زمانہ حال کی شائستگی اور تمدن و حسن معاشرت کے برخلاف ظاہر کیا تھا، مسلمانوں کی موجودہ پستی اور تنزل کو اسلام کی تعلیم کا نتیجہ قرار دیا تھا اور مسلمان بادشاہوں کی ہوا پرستی و سفاکی و خونریزی کا جوابدہ اسلام کو ٹھیرایا تھا۔ یہ باتیں گو فی نفسہ صحیح ہوں یا غلط مگر تعلیم یافتہ جماعتوں کے دل پر جادو کا کام کرنیوالی تھیں۔ سرسید نے اِن تمام مغالطوں کو نہایت معقول اور دلنشیں دلائل سے رفع کیا ہے، اُنھوں نے دو طویل خطبوں میں صرف مسلمانوں کی مذہبی کتابوں کا اور اُن روایتوں کا جو اُن کتابوں میں درج ہیں مفصل حال بیان کیا ہے جو اُن لوگوں کے لیے جو سچائی اور انصاف سے اسلام کے متعلق کچھ لکھنا چاہیں ہمیشہ کے واسطے ایک مشعل رہنما ہے۔ اِن خطبوں میں روایات کی تنقید کے جو اصول و قواعد محدثین نے مقرر کئے ہیں اور جو معیار اُنھوں نے معتبر اور غیر معتبر روایتوں کا قرار دیا ہے اُن کی تشریح ایسے بسط کے ساتھ کی گئی ہے کہ اُس پر غور کرنے کے بعد اُن روایات کی کچھ وقعت باقی نہیں رہتی جن کی رو سے سر ولیم میور نے اسلام کی تعلیم اور بانی اسلام کے اخلاق پر نکتہ چینی کی ہے۔ اُنھوں نے نہایت صفائی اور وضاحت سے بیان کیا ہے کہ اسلام میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو زمانہ حال کی شائستگی یا دنیوی ترقیات کی مانع ہو اور مسلمانوں کے اعمال اور کردار جن کے ثمرے وہ آج بھگت رہے ہیں اُن کے جوابدہ خود مسلمان ہیں نہ اسلام اور جو مباحث تاریخی یا جغرافی تحقیقات پر مبنی تھے اُن کا فیصلہ ایسی عمدگی سے کیا ہے کہ کسی منصف مزاج آدمی کو۔ اگرچہ وہ اسلام کا کیسا ہی مخالف ہو۔ اُس کے تسلیم کرنے سے چارہ نہیں۔

مگر سب سے بڑی خصوصیت خطبات احمدیہ کی جو اُس کو اگلے علما کی کتابوں سے ممتاز ٹھیراتی ہے وہ یہ ہے کہ اُس میں برخلاف دیگر علمائے اسلام کے الزامی جوابوں سے بہت ہی کم تعرض کیا گیا ہے، بلکہ ہر ایک اعتراض کا محققانہ جواب جو عیسائی اور لامذہب دونوں کو برابر دیا جا سکے لکھا گیا ہے۔ الزامی جوابوں سے سوا اس کے کہ صرف مسلمانوں کی تسلی ہو جائے یا بعض صورتوں میں عیسائی بھی ساکت ہو جائیں اُن لوگوں کی زبان بند نہیں ہو سکتی جو اسلام اور عیسائیت دونوں مذہبوں سے الگ ہیں یا مطلقاً قید مذہب سے آزاد ہیں۔ یہاں بطور مثال کے مختصر طور پر ہم خطبات کا ایک مقام اس غرض سے نقل کرتے ہیں تاکہ ناظرین کو معلوم ہو جائے کہ عیسائیوں

کے مقابلہ میں سرسید کا طریق استدلال کیا ہے اور جنہوں نے اُن سے پہلے اس مضمون پر کتابیں لکھی ہیں اُن کا طریق استدلال کیا تھا؟ مگر باوجود اس کے کہ سرسید نے اس مضمون کو پہلے کی نسبت بہت بلند کر دیا ہے۔ ہم مولانا رحمت اللہ اور مولوی آل حسن کے سرسید سے کچھ کم مداح اور شکر گزار نہیں ہیں جنہوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کو مشنریوں کے حملوں سے بچایا اور اُن سے مناظرہ کرنے کی سب سے پہلے بنیاد ڈالی اور جنکی کتابیں دیکھکر پچھلوں کو یہ خیال پیدا ہوا۔

عیسائیوں کا جو طعن آنحضرت صلعم پر بابت کثرت ازواج کے اور اسلام پر بابت جواز تعدد ازواج اور اجازت طلاق کے ہے اس کی تردید میں ہمارے علما نے بالکل الزامی جواب سے کام لیا ہے اور بلاشبہ اگر عیسائی اپنے مذہب کے اصلی اصول کے پابند ہوں تو یہ جواب اُنکی سکوت کے لیے کافی ووافی ہیں مثلاً ازالة الاوہام میں توریت کے حوالوں سے نہایت تصریح کے ساتھ حضرت ابراہیم کے تین نکاح، حضرت یعقوب کے چار نکاح، حضرت موسیٰ کے دو نکاح، حضرت داؤد کی نو سے زیادہ بیویاں جن میں سے بعض منکوحہ اور بعض غیر منکوحہ تھیں۔ اور حضرت سلیمان کی ایک ہزار بیویاں اور بعض اور بعض اور انبیا کی کثرت ازواج کو ثابت کیا گیا ہے۔ اسی طرح طلاق کی طعن پر توریت سے جس کے احکام کو عیسائی منسوخ نہیں مانتے۔ ثابت کیا ہے کہ حضرت موسیٰ نے جواز طلاق کا حکم دیا ہے کتاب استفسار میں بھی اول اسی قسم کے الزامی جواب دیئے اور آخر میں جواب تحقیقی یہ لکھا ہے کہ کوئی دلیل عقلی یا نقلی توریت و انجیل سے بھی اس بات پر قایم نہیں ہے کہ جو بہت سی بیویاں کرے وہ نبی نہیں ہو سکتا یا خدا تعالے کسی نبی کو بہت سی بیویاں کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ اور طلاق کی نسبت یہ لکھا ہے کہ اگرچہ انجیل میں طلاق کو منع کیا گیا ہے مگر توریت میں اجازت دیگئی ہے اور عیسائیوں کا دعویٰ ہے کہ توریت اور انجیل آپس میں متحد ہیں ناسخ و منسوخ نہیں۔

اگرچہ یہ جوابات جو ہمارے علما نے دیئے ہیں مسلمانوں کی تسلی کے لیے اور اگر عیسائی اپنے مذہبی اصول کے پابند ہوں تو اُنکے ساکت کرنے کے لیے کافی ہیں مگر عیسائی۔ باوجودیکہ توریت کو الہامی کتاب اور قیامت تک غیر منسوخ جانتے ہیں۔ نہ توریت کے کسی حکم کو مانتے ہیں اور نہ توریت کے حوالوں پر کان دھرتے ہیں۔ نیز عیسائی انبیا کو مثل اہل اسلام کے معصوم نہیں سمجھتے یہانتک کہ اُن میں سے بعض کی طرف بدترین گناہوں کو منسوب کرتے ہیں پس تاوقتیکہ عیسائیوں کو تحقیقی جواب نہ دیا جائے اُنکی زبان بند نہیں کیجا سکتی اس کے سوا الزامی جوابات اُن لوگوں کے لیے جو

توریت و انجیل کو نہیں مانتے کافی نہیں ہیں جب تک اس زمانہ کی مُسلّمات کے موافق اُنکا جواب نہ دیا جائے۔

مسئلۂ تعدّد ازدواج اور جواز طلاق کی بحث خطبات احمدیہ میں بھی آگئی ہے۔ اسمیں سرسید نے سر ولیم میور کا اعتراض نقل کیا ہے جسکا ماحصل یہ ہے کہ تعداد ازدواج اور طلاق کا حکم عام اخلاق کی بیخکنی کرتا ہے، عام زندگی کو آلودہ اور ناپاک کرتا ہے اور حسنِ معاشرت کو درہم و برہم کر دیتا ہے،

اِس کے جواب میں سرسید نے اول تعداد ازدواج پر لمبی بحث کی ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ "اس معاملہ پر تین حیثیتوں سے بحث ہو سکتی ہے۔ اول قانونِ قدرت کے لحاظ سے، سو ہم قدرت کی بےخطا نشانیوں سے پاتے ہیں کہ جن ذی روحوں کی نسبت اُن کے خالق کا یہ منشا تھا کہ اُن کے صرف ایک ہی مادہ ہو۔ اُن کی نسل ہمیشہ جوڑا جوڑا پیدا ہوتی ہے جن میں سے ایک مادہ اور ایک نر ہوتا ہے، برخلاف اِسکے جن ذی روحوں کی متعدد مادائیں ہونی مقصود تھیں اُن کے ایک سے زیادہ بچے پیدا ہوتے ہیں اور نر و مادہ کی تعداد متناسب نہیں ہوتی۔ اس قانون کے بموجب جیسا کہ ظاہر ہے انسان دوسری قسم میں داخل ہے مگر چونکہ رتبہ میں بوجہ اُس بیش بہا قوت کے جو دُرکِ کلیات و جزئیات ہے وہ تمام مخلوقات سے اشرف ہے۔ اسلیے اُسکا فرض ہے کہ جو قوتیں اور حقوق مثل اَوَر ذی روحوں کے قدرت نے اُس کو عطا کیے ہیں اُن کو احتیاط سے اور موقع بموقع بلحاظ امورات طبعی اور حسنِ معاشرت اور انتظام خانہ داری یا نظم ملکی و قوانین حفظان صحت اور ممالک مختلفہ کی آب و ہوا کے کام میں لائے - ورنہ اُس میں اور دیگر حیوانات میں جو اُس کے آس پاس پھرتے ہیں کچھ فرق نہیں ہے اور ایک بکرے یا مرغے سے زیادہ کچھ رتبہ نہیں رکھتا۔ پس جس طرح کثرت ازدواج اکثر حالتوں میں قابل نفرت ہے ویسے ہی ایک سے زیادہ ہونے کا قطعی التزام خلافِ فطرت ہے۔

اِسکے بعد سرسید نے معاشرت کے لحاظ سے اِسی مسئلہ پر بحث کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ "انسان مدنی الطبع پیدا ہوا ہے - اسی بات کو توریت میں اس طرح بیان کیا ہے کہ "جب خدا تعالیٰ کو یہ خیال آیا کہ انسان کو اکیلا ہونا اُسکے حق میں اچھا نہیں ہے تو اُس نے اُس کے واسطے ایک ساتھی پیدا کیا" اور وہ عورت ہے جو اسواسطے پیدا کی گئی ہے کہ انسان کی زندگی کے فکر و تردد اور رنج و راحت میں شریک ہو، اپنی مجالست سے اُس کی خوشی کو بڑھا دے، اپنی محبت بھری ہمدردی سے اُس کی تکلیف کو کم کرے اور سب سے اخیر غرض جس کےلیے وہ پیدا کی گئی ہے یہ ہے کہ مرد کے ساتھ شریک ہو کر قدرت کے اس بڑے حکم کی تعمیل میں کہ "بڑھو اور پھیلو اور زمین کو آباد کرو" مدد دے - مگر جب کبھی یہ مددگار کسی سبب سے اپنے اِن قدرتی

فرایض کے ادا کرنے میں قاصر ہو تو اُس دانشمند حکیم خالق زن و مرد نے اس نقصان کے رفع کرنے کی بالیقین کوئی تدبیر رکھی ہوگی اور وہ بجز اس کے اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ یا ایسی حالتوں میں ایک سے زیادہ مگر کسی خاص حد تک ایک ہی وقت میں جورو اں رکھنے کی اجازت ہوا ور یا پہلی زوجہ کو طلاق دینے کے بعد دوسری جورو کرے۔ پچھلا حق عورت کو بھی حاصل ہونا چاہیے تھا، چنانچہ مذہب اسلام کی رو سے اُس کو حاصل ہے۔ سیاست مُدن کے لحاظ سے صرف اتنا فرق ہے کہ مرد جب چاہے یہ علاج کرسکتا ہے لیکن عورت کو اول قاضی کی اجازت حاصل کرنی چاہیے۔

"اگر اس تدارک کی انسان کو اجازت نہ ہوتی تو اس کے سبب سے حسنِ معاشرت میں بڑا خلل واقع ہوتا اور انسان کو بدترین گناہوں کی طرف مائل ہونا پڑتا۔ اگرچہ تعلیم و تربیت سے اِس ضرورت کا کم ہونا ممکن ہے لیکن مٹنا محالات سے ہے۔ پس جہاں اسکی ضرورت ہے وہاں اُس کے عمل میں نہ لانے سے وہی تمام نقصان پیدا ہوتے ہیں جو حسنِ معاشرت کے لیے سمِ قاتل ہیں"

اِس کے بعد اُنھوں نے مانٹگیو کی رائے اور سر ڈبلیو ا وسلی کی رائے تعدد ازواج کی میں نقل کی ہے۔ پھر آگے چلکر اُن بے شمار اخلاقی خرابیوں کا ذکر کیا ہے جو آنحضرت سے پہلے عرب اور اُسکے گرد و نواح کے ملکوں میں ازواج کے متعلق واقع تھیں۔

اس کے بعد اُنھوں نے مذہب کی حیثیت سے اس مسئلہ پر بحث کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ "جس خوبی سے اسلام نے تعدد ازدواج کو روکا ہے اس طرح نہ یہودیوں کے مذہب نے اُس کی بندش کی ہے اور نہ عیسائی مذہب نے یہودیوں کے ہاں بکثرت اور بلا تعین حد ازدواج موجود ہے۔ عیسائی مذہب نے بھی تعدد ازدواج کی کہیں ممانعت نہیں کی، چنانچہ مسٹر ہگنز لکھتے ہیں کہ "میں نہیں جانتا متعدد بیویوں کی اجازت کی نسبت اسلام پر ایسا سخت طعن کیوں کیا جاتا ہے؟ حضرت سلیمان اور حضرت داؤد کی نظیر پر۔ جو خدا کی دلی مرضی کے مطابق چلتے تھے اور جن کو خدا نے خاص اپنی شریعت کے احکام کی تعمیل کے لیے بنایا تھا۔ یہ امر ہرگز اعتراض کے لایق نہیں ہے، خصوصاً اس وجہ سے کہ عیسیٰ مسیح نے بھی اُن میں انجیلوں میں سے۔ جن کو اُن کے معتقدوں نے اُنکے احکام قلمبند کرنے کے واسطے تحریر کیا تھا۔ کسی انجیل میں اسکی ممانعت نہیں کی" جان ڈیون پورٹ نے بھی اپنی کتاب میں بائبل کی بہت سی آیتوں کے حوالے سے لکھا ہے کہ "ان آیتوں سے پایا جاتا ہے کہ تعدد ازدواج صرف پسندیدہ ہی نہیں ہے بلکہ خاص خدا نے اس میں برکت دی ہے"

اس کے بعد سر سید نے نہایت مشہور و معروف عیسائی عالم جان ملٹن۔ جو تعدد ازدواج

کا ایک مشہور حامی ہے اور جس نے اس امر کی تائید میں بائبل میں سے بہت آیتیں نقل کی ہیں اُس کی تقریر نقل کی ہے جس میں تعدد ازدواج کے جواز پر ایک لطیف اور دقیق استدلال کیا گیا ہے۔

اِس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ "یہ حال تو تعدد ازدواج کی نسبت مذہب موسوی اور عیسوی میں تھا"

اب ہم کہتے ہیں کہ اسلام نے تمام مذہبوں سے بڑھکر تعدد ازدواج کو نہایت خوبی سے روکا ہے اور صرف ایک ہی بیوی کرنے کو پسند کیا ہے اور تعدد کو صرف ایک نہایت محدود خاص حالت میں جائز رکھا ہے ہمکو کچھ شبہہ نہیں کہ سچا مسئلہ سچے مذہب کا جو اُس کی مرضی کے موافق ہو جسنے مرد و عورت کو جوڑا پیدا کیا۔ ضرور ایسا ہوگا جو قانونِ قدرت کے تو برخلاف نہو اور معاشرت میں کوئی نقصان نہ پیدا کرے۔ اور وہ یہی ہوسکتا ہے کہ عموماً کثرتِ ازدواج کی ممانعت اور صورت ہائے خاص اور حالتِ مستثنیٰ میں اجازت ہو۔ اور یہی مسئلہ ٹھیٹ اسلام کا ہے۔ قرآن مجید نے اس نازک معاملہ اور دقیق اور پُر پیچ مطلب کو نہایت فصیح و بلیغ دو لفظوں میں بیان کر دیا ہے جہاں فرمایا ہے "فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً" (یعنی اگر تمکو خوف ہو کہ متعدد جوروؤں میں عدل نکرسکوگے تو صرف ایک ہی جورو رکھنی چاہیے) اس کے بعد اُن کی تقریر کا ماحصل یہ ہے کہ "اس آیت کے اگر وہی ظاہری معنی لیے جائیں جیسے کہ اکثر فقہا اور علما نے لیے ہیں تو بھی یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ شارع نے تعدد ازدواج کو گویا بالکل روک دیا ہے، کیونکہ جو سچا دیندار ہوگا وہ بغیر اشد ضرورت کے کبھی تعدد ازدواج کی جو ایسی سخت شرط کے ساتھ مشروط کیا گیا ہے جرأت نہیں کریگا۔ لیکن اگر اس آیت کے الفاظ کو بہ تعمق نظر دیکھا جاے تو معلوم ہوگا کہ تعداد کو شاذ و نادر صورتوں کے سوا قطعاً ناجائز ٹھیرا دیا گیا ہے۔ کیونکہ یہ نہیں کہا گیا کہ إِنْ لَمْ تَعْدِلُوا بلکہ یہ فرمایا گیا ہے کہ إِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا پس اگر یہ ممکن بھی ہو کہ مرد متعدد عورتوں میں عدل کرسکے تو بھی عدل نہو سکنے کا اندیشہ کبھی زائل نہیں ہوسکتا" اس کے بعد اُنھوں نے دوسری آیت سے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ عدل کرنا مرد کی طاقت سے باہر ہے اور اسلیے مستثنیٰ صورتوں کے سوا اُس کو متعدد جوروئیں کرنے کی کسی حالت میں اجازت نہیں دیگئی اور وہ آیت یہ ہے۔ "وَلَنْ تَسْتَطِيعُوا أَنْ تَعْدِلُوا بَيْنَ النِّسَاءِ" (یعنی تم ہرگز طاقت نہیں رکھتے کہ عورتوں میں عدل کرسکو) اس کے بعد وہ خاص خاص صورتوں کو جن میں تعدد ازدواج کی اجازت دی گئی ہے بیان کرکے لکھتے ہیں۔

"ہاں بلاشبہہ اس اجازت سے اوباش اور شہوت پرست آدمیوں کو حشی زندگی کا منشا۔ ٹٹی کی اوجھل شکار کھیلنا ہے ایک حیلہ ہاتھ آگیا ہے۔ مگر اُس عمدہ اور مفید قاعدہ کا بیجا عملدرآمد کرنے

سے وہ لوگ اس خدا کے سامنے جوابدہ ہونگے جو انسانوں کے دلوں کا محرم راز ہے اور وہ یقیناً اُن کو اس قسم کی سزا دیگا جو ان کے گناہ کے لحاظ سے واجب ہوگی،،

اس کے بعد سرسید نے طلاق کے مسئلہ پر بحث کی ہے۔ وہ اول حسنِ معاشرت کی نظر سے اُس پر نظر ڈالتے ہیں اور اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ سب سے بڑا دشمن حسنِ معاشرت و تمدن کا طلاق ہے جس سے نکاح کی وقعت گھٹ جاتی ہے اور مرد کی محبت کا عورت کے ساتھ اور عورت کی وفاداری کا مرد کے ساتھ اعتبار نہیں رہتا۔ اس کے بعد لکھتے ہیں" لیکن اس بات سے بھی انکار نہیں ہوسکتا کہ اگر کسی سبب سے ایسی خرابیاں مرد و عورت میں پیدا ہو جائیں جو کسی طرح اصلاح کے قابل نہوں تو اُنکا بھی کچھ علاج ہونا چاہیے اور وہ علاج طلاق ہے، کیونکہ اس سے مرد و عورت کو آزادی ہو جاتی ہے جن کے مزاج کے اختلاف سے دونوں کی زندگی تلخ ہوگئی تھی۔ بایںہمہ اگرچہ طلاق ایک شخص واحد کے حق میں مفید ہو لیکن بلحاظ اُن بداخلاقیوں کے۔ جو اکثر اوقات نہایت آشکارا طور پر وقوع میں آتی ہیں۔ اور نیز اُس مضرت بخش اثر کی وجہ سے جو طرفین کی اولاد پر اپنے والدین سے جدا ہونے سے ہوتا ہے تمدن کے حق میں کچھ کم مضرت پہنچانے والا نہیں ہے۔ پس جبکہ طلاق کے ساتھ ایسی خرابیاں لگی ہوئی ہیں تو اس کو بطور ایک علاج کے سمجھ کر اُسی حالت میں اُس کی جانب رجوع کرنا جائز ہوسکتا ہے جبکہ اُس پر عمل کرنے سے ایسی مصیبتیں۔ جو طلاق کی مصیبتوں سے بھی زیادہ ناقابلِ برداشت ہوں، اور ایسے ترددات و تفکرات میں ڈالنے والی ہوں۔ جو طلاق کے رنجوں سے بھی زیادہ رنج دینے والے، اور روز افزوں رنجشیں پیدا کرنے والے اور باہمی معاشرت کے بدلے دن رات کی لعن وطعن و جھگڑتی بیزار میں رکھنے والے ہوں دور ہوسکتے ہوں۔ اگر ایسی حالت میں طلاق کو جائز رکھا جائے۔ جیسا کہ اسلام نے اسی حالت میں جائز رکھا ہے تو وہ کسی طرح حسنِ معاشرت کے مخالف نہیں ہے بلکہ اسکی اصلاح کرنے والی اور ترقی دینے والی ہے۔

اسکے بعد مسئلہ طلاق پر اسلام اور مذہب موسوی و عیسوی کے بموجب گفتگو کی ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ" یہودیوں کے ہاں طلاق دینا بغیر کسی قید و شرط و حالت کے مرد کے اختیار میں تھا، جب وہ چاہتا تھا طلاق نامہ لکھ کر جورو کو دیدیتا تھا اور اس پر کوئی گناہ عائد ہوتا تھا۔ حضرتِ عیسیٰ نے اس حکم کو منسوخ کیا اور جیسا کہ اس زمانہ کے عیسائی سمجھتے ہیں۔ سوائے زنا کے اور کسی حالت میں طلاق کو جائز نہیں رکھا۔ لیکن اگر فی الواقع عیسائیوں کے خیال کے موافق طلاق کی امتناع سے حضرت عیسیٰ کا یہی مطلب تھا تو یہ ایک ایسا سخت حکم تھا جسکی برداشت انسان کی طاقت سے باہر تھی۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ کے معتقدوں نے اُن سے کہا کہ اگر جورو سے مرد کا یہ طور ہے تو جورو کرنا خوب نہیں۔ اگر یہ حکم ایسی طرح مانا جائے جیسا کہ آج کل عیسائی مانتے

ہیں تو حسنِ معاشرت کے لیے نہایت ہی مضر ہے، اور جو رنج وہ امور زن وشوہر میں واقع ہو جاتے ہیں جن سے تمام اغراض تزوج برباد ہو جاتے ہیں اُس کا کچھ بھی علاج نہیں ہے اور زن و مرد دونوں کے لیے اَور بہت سی خرابیوں اور خوفناک حالتوں میں پڑنے کا اندیشہ ہے،،

اس کے بعد سرسید نے یوروپ کے مشہور و نامور عیسائی عالم جان ملٹن کی بہت لمبی تقریر اور محققانہ رائے جو وہ اس مسئلہ کے متعلق رکھتے ہیں نقل کی ہے اور بائبل کی جن آیتوں سے اُنہوں نے جوازِ طلاق پر استدلال کیا ہے وہ سب آیتیں نقل کی ہیں۔

اِس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ "اب دیکھنا چاہیے کہ اسلام نے نسبت طلاق کے کیا کیا؟ اُس نے طلاق کو بطور ایک مرض لاعلاج کے جائز و مباح بتایا ہے۔ مگر زن وشوہر کا معاملہ ایک ایسا نازک اور ایک عجیب قسم کے ارتباط و اختلاط کا معاملہ ہے کہ جو اُس میں بیماری پیدا ہو سوائے انھیں دونوں کے اور کوئی تیسرا شخص اس بات کی تشخیص نہیں کر سکتا کہ آیا وہ اُس حد تک پہنچ گئی ہے جس کا علاج بجز طلاق کے اور کچھ نہیں۔ اس لیے بانیِ اسلام نے اس مرض کی تشخیص نہ کسی جج یعنی قاضی کی رائے پر منحصر کی ہے نہ کسی مفتی کے فتویٰ پر بلکہ صرف شوہر کی رائے اور اخلاق پر جس کی تسلی اور موانست کے لیے ابتدا میں عورت بطور انیس دلنواز اور مونسِ غمگسار کے پیدا ہوئی تھی"۔

"اب اس بات کی بندش کہ وہ علاج بے محل اور بے موقع نہ استعمال کیا جائے صرف مرد کے اخلاق اور دلی نیکی اور روحانی تربیت پر منحصر تھی جو نہایت اعلیٰ درجہ پر خاص اِسی معاملہ میں مذہبِ اسلام نے اپنے سچے مریدوں اور ٹھیٹ مسلمانوں کو کی ہے"

"بانیِ اسلام نے اسلام کے سچے پیرودں کو بتایا کہ "ماخلق اللہ شیئا علی وجہ الارض البغض الیہ من الطلاق" (یعنی کوئی چیز خدا تعالیٰ نے زمین کے پردہ پر ایسی پیدا نہیں کی جو خدا کے نزدیک طلاق سے زیادہ مبغوض ہو)"

"پھر ایک دفعہ یوں فرمایا کہ "ابغض الحلال الی اللہ الطلاق" (یعنی خدا کے نزدیک مباح چیزوں میں سب سے زیادہ مبغوض اور مکروہ چیز طلاق ہے)"

اس کے بعد لکھتے ہیں "کہ یہ ہدایت تو مردوں کی نسبت تھی اور عورتوں کو جو طلاق لینا چاہتی ہیں یہ فرمایا" ایما امرأۃ سألت زوجہا طلاقا فی غیر ما بأس فحرام علیہا رائحۃ الجنۃ" (یعنی جو عورت اپنے خاوند سے بغیر سختی کی حالت کے طلاق چاہے اُس پر جنت کی بو تک حرام ہے)"

پھر لکھتے ہیں کہ "پیغمبر خدا صلعم طلاق دینے والے سے ایسے ناراض ہوتے تھے جس سے بعض لوگ

کو یہ خیال ہو گیا کہ جو شخص اپنی جورو کو دفعتہً قطعی طلاق دیدے وہ قتل ہونے کے لایق ہے۔ چنانچہ نسائی نے روایت کی ہے کہ ایک شخص نے اپنی جورو کو دفعتہً تین طلاقیں دیدیں۔ یہ سُنکر آنحضرت صلعم غصہ میں بھرے ہوئے کھڑے ہو گئے اور فرمایا کہ کیا اس نے خدا کے حکم کو کھیل بنایا ہے؟ اور وہ بھی ایسی حالت میں کہ میں تم میں موجود ہوں یہ سُنکر ایک شخص کھڑا ہوا اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ میں اُسکو قتل نہ کر ڈالوں؟ یعنی وہ شخص آنحضرت کی شدت غضب سے یہ سمجھا کہ اس شخص نے قتل کئے جانے کے لایق کام کیا ہے"

اِس کے بعد اُن کی تقریر کا ماحصل یہ ہے کہ "بانی اسلام نے طلاق کے روکنے میں انہیں تہدیدوں اور ہدایتوں پر بس نہیں کی بلکہ نکاح اور ملاپ قایم رکھنے کے لیے یہ تدبیر رکھی ہے کہ جب تک تین دفعہ طلاق نہ دیجائے زن و شوہر میں پوری تفریق نہو اور دفعتہً تین طلاقیں دینے کی ممانعت فرمائی اور حکم دیا کہ سوچ سوچ اور سمجھ سمجھکر مناسب مناسب فاصلہ سے طلاق دیجائے کہ ہر ایک میں تقریباً پچیس روز کا فاصلہ ہوتا ہے، تاکہ پہلی طلاق کے بعد اگر آپس میں صلح ہو جائے تو بدستور زن و شوہر میں اور دوسری طلاق کے بعد بھی بشرط مصالحت کے اسی طرح ملاپ ہو جائے لیکن اگر تیسری طلاق بھی واقع ہو جائے تو سمجھا جائے کہ یہ بیل منڈھے چڑھنے والی نہیں ہے اور پھر دائمی تفریق ہو جاے۔

علاوہ اِن ہدایتوں کے عورتوں کے ساتھ محبت رکھنے اور اون کے ساتھ مہربانی اور خاطرداری سے پیش آنے اور اُن کی سختی اور بدمزاجی کو تحمل کے ساتھ برداشت کرنی کی نہایت تاکید سے ہدایت فرمائی ہے اور یہ سب باتیں اسی مکروہ چیز یعنی طلاق کے روکنے کو ہیں۔

اس سے بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ اسلام صرف اِسی حالت میں طلاق کی اجازت دیتا ہے جبکہ وہ زن و شوہر کے حق میں ایک بیش بہا نعمت ثابت ہو اور اُس کے ذریعہ سے حالت زوجیت کی تمام تلخیاں رفع ہو جائیں یا کم ہو جائیں اور بغیر اِس کے حالتِ معاشرت روز بروز خراب ہوتی جائے۔ اس صورت میں ظاہر ہے کہ طلاق بجاے اِس کے کہ حسنِ معاشرت کے حق میں مضر ہو وہ زن و شوہر دونوں کے حق میں ایک برکت اور حسنِ معاشرت کی ترقی کا کامل ذریعہ ہو گی۔ ہاں میں اس بات کو قبول کرونگا کہ مسلمانوں نے اس عمدہ حکم کو نہایت قابلِ نفرت طریقہ پر استعمال کیا ہے، پس اُن کے افعال کی نفریں اُنھیں پر ہونی چاہیے نہ مذہبِ اسلام پر۔ ہم کو اُمید ہے کہ تمام منصف مزاج لوگ جب اسلام کے اس مسئلہ پر غور کرینگے تو قبول کرینگے کہ جو عمدہ طریقہ اس باب میں اسلام نے اختیار کیا ہے وہ عقل، انصاف اور معاشرت کی نظر سے ایسا عمدہ ہے کہ اُس سے بہتر ہو ہی نہیں سکتا اور صاف صاف یقین دلاتا ہے کہ یہ مسئلہ

اُسی اُستاد کا بتایا ہوا ہے جس نے انسان کو پیدا کر کے اُس کے لیے اُس کا جوڑا پیدا کیا تاکہ اُسکی تسلی اور دل کی خوشی کا باعث ہو۔"

خطبات احمدیہ کا خلاصہ — مذکورہ بالامثال کے بعد ہم خطبات احمدیہ کی نہایت مختصر کیفیت جس سے مصنف کی محنت اور جانفشانی کا۔ جو اس کتاب کے لکھنے میں اُس نے کی ہے۔ کسی قدر اندازہ ہو سکے اور ناظرین کے ذہن میں کتاب کی حقیقت کا ایک دُھندلا سے خیال پیدا ہو جائے بیان کرتے ہیں۔

پہلا خطبہ — پہلے خطبہ میں۔ جو سب سے بڑا اور بجائے خود ایک کتاب ہے۔ عرب کا نہایت مفصل تاریخی جغرافیہ مسلمانوں کے اُن بعض مسلّمات کے ثابت کرنے کے لیے جنکا سر ولیم میور نے اپنی کتاب میں انکار کیا ہے۔ بطور بنیاد مباحثِ آیندہ کے بیان کیا گیا ہے تاکہ آیندہ خطبات میں اس بات کا فیصلہ آسانی سے ہو سکے کہ مثلاً جبل فاران جسکا نام توریت کی ایک آیت میں آیا ہے اور جس سے مسلمان آنحضرتؐ کی نبوت کی بشارت نکالتے ہیں۔ آیا وہ بقول اہل اسلام جبال عرب میں سے ہے یا بقول سر ولیم میور کے جبال شام میں؟ یا یہ کہ فی الواقع حضرت اسمٰعیل اور ان کے بیٹے عرب کے مختلف حصوں میں۔ جیسا کہ مسلمان کہتے ہیں۔ آباد ہوئے یا بقول سر ولیم کے آباد نہیں ہوئے؟ یا یہ کہ آنحضرت کا اسمٰعیل کی اولاد میں ہونا ثابت ہے یا بقول سر ولیم کے ثابت نہیں ہے؟ اس خطبہ میں سرسید نے توریت کے حوالوں اور عیسائی محققوں کی شہادتوں سے اپنے ہر ایک دعویٰ پر سر ولیم میور اور دیگر عیسائی مصنفوں کے برخلاف استدلال کیا ہے۔

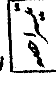
دوسرا خطبہ — دوسرے خطبہ میں عرب جاہلیت کی رسوم و عادات اور خیالات و عقائد اچھے یا بُرے جہانتک کہ شعرائے جاہلیت کے اشعار اور دیگر معتبر ذریعوں سے معلوم ہوئے۔ بیان کئے ہیں اور جس قدر باتیں اشعار سے استنباط کی ہیں اُن کے ساتھ وہ اشعار یا مصرعے بھی نقل کر دیئے ہیں جن سے اِن باتوں کا سراغ لگایا گیا ہے۔ یہ خطبہ اس غرض سے لکھا گیا ہے تاکہ لوگوں کو اس بات کے اندازہ کرنے کا موقع ملے کہ اسلام سے پہلے عرب کی کیا حالت تھی اور اسلام کے بعد اُن کے اخلاق اور عادات اور عقائد و خیالات کس درجہ تک تبدیل ہو گئے۔

تیسرا خطبہ — تیسرے خطبہ میں اُن ادیان مختلفہ کا جو اسلام سے پہلے عرب میں شائع تھے اور اس بات کا بیان ہے کہ اسلام ان تمام ادیانؐ میں کونسے دین سے زیادہ مشابہت رکھتا ہے۔

چوتھا خطبہ — چوتھے خطبہ میں اس بات کا نہایت شافی ثبوت دیا ہے کہ اسلام انسان کے حق میں رحمت ہے اور اس سے موسوی اور عیسوی مذہب کو نہایت فائدے پہنچے ہیں۔


اُنھوں نے اس مضمون کو چار حصوں پر منقسم کیا ہے جن میں سے پہلے حصہ میں وہ فائدے بیان کئے ہیں جو اسلام سے عموماً انسان کی معاشرت کو پہنچے ہیں اور اُسکے ثبوت میں اُن مشہور اور نامور عیسائی مصنفوں کے اقوال نقل کئے ہیں جنھوں نے اسلام کے حق میں مذہب اسلام کے مفید ہونے کی نسبت شہادتیں دی ہیں جیسے سر ولیم میور- ایڈورڈ گبن، جان ڈیون پورٹ، ٹامس کارلائل وغیرہ وغیرہ -


دوسرے حصہ میں اُن عیسائی مصنفوں کی رائے کی تردید کی ہے جنھوں نے اسلام کو نوع انسان کی معاشرت کے حق میں مضر بتایا ہے اور اُس میں بھی یوروپ کے بہت سے نامور اور محقق مصنفوں کی شہادتوں سے استدلال اور اسلام کا مقابلہ حسن معاشرت کے لحاظ سے عیسائی مذہب کے ساتھ کیا ہے -


تیسرے حصہ میں اُن فائدوں کا بیان ہے جو یہودی اور عیسائی دونوں مذہبوں کو بالاشتراک اسلام کی بدولت حاصل ہوئے ہیں- یہ دونوں حصے خطبہ مذکور کے چونکہ بہت طولانی ہیں اور خلاصہ میں اُس کی خوبی باقی نہیں رہ سکتی اسلیے اُن کو اصل کتاب میں دیکھنا چاہیے- مگر تیسرے حصہ کا صرف ایک فقرہ بطور نمونہ کے یہاں لکھا جاتا ہے -

وہ لکھتے ہیں کہ "اسلام سے پہلے یہودی اور عیسائی اکثر پیغمبروں اور پاک شخصوں سے نہایت بداخلاقی کے افعال قبیحہ منسوب کرتے تھے - اگرچہ ہمارے نزدیک اُن تحریروں کو الہام ربانی سے کچھ تعلق نہ تھا مگر تمام یہودی اور عیسائی اُن تمام تحریروں کو الہام ربانی اور اُن نبیوں اور مقدس لوگوں کو اُن افعال قبیحہ[1] کا مرتکب یقین کرتے تھے - اسلام نے اُن معصوم نبیوں اور خدا پرست شخصوں اور پاک خصلت بزرگوں کو اُن تہمتوں سے بچایا اور جو اتہام یہودیوں اور عیسائیوں نے اُن پر لگائے تھے اُن کو فتحمندی سے دفع کیا اور ان بزرگوں کے معصوم اور بے گناہ ہونے کا دنیا کے بہت بڑے حصہ پر یقین کرا دیا- مسلمان عالموں نے اسلام کے اس مسئلہ پر یقین دلانے سے- کہ انبیا و پیغمبر سب پاک و معصوم ہیں- توریت کو بڑے غور سے پڑھا اور عیسائیوں اور یہودیوں کی تمام غلطیوں کو ظاہر کر دیا اور جن وجوہ سے وہ غلطی میں پڑے تھے اُن کو بخوبی دریافت کیا- پس اگر اسلام نہ ہوتا تو ان پیغمبروں اور نبیوں اور خدا کے پاک بندوں یعنی حضرت ابراہیم، حضرت لوط، اُنکی بیٹیوں، حضرت اسحٰق

---

[1] یہ عہد عتیق کے اُن درسوں کی طرف اشارہ ہے جن میں حضرت لوط و حضرت داؤد وغیرہا کی طرف زنا اور دیگر افعال قبیحہ کی نسبت کی گئی ہے-

یہودا، حضرت یعقوب کی بیویوں اور بیٹیوں، ہارون، داؤد، اور سلیمان کی دنیا میں ایسی ہی مٹی خراب ہوتی جیسی ایک بدکار آدمی کی خراب ہوتی ہے - وہ تمام دنیا کی نظروں میں ایسے ہی حقیر ہوتے جیسے کہ ایسے جرموں کے مجرم حقیر ہوتے ہیں جنکو دایم الحبس کرکے کالے پانی بھیجتے ہیں یا اُن کے گناہوں کی سزا کے لیے اُن کو سولی پر لٹکاتے ہیں - صرف یہ اسلام ہی کا احسان ہے جس نے اِن تمام بزرگوں کی بزرگی دنیا میں اُس حد تک پہنچا دی جیکے وہ مستحق تھے -

پھر اسی خطبہ کے چوتھے حصہ میں اُن فائدوں کو بیان کیا ہے جو اسلام کی بدولت خاص عیسائی مذہب کو پہنچے ہیں وہ لکھتے ہیں کہ "دنیا میں مذہب اسلام سے زیادہ کوئی مذہب عیسائی مذہب کا دوست نہیں ہے اور اسلام نے کسی مذہب کو اس قدر فائدے نہیں پہنچائے جس قدر کہ عیسائی مذہب کو پہنچائے ہیں عیسائی مذہب کی بنیاد اُس نیک اور حلیم شخص (یعنی حضرت یحیٰی پیغمبر) سے ہے جو خدا کا رستہ درست کرنے آیا تھا اور پھر بالکل دارومدار اُس عجیب شخص پر ہے جس کو اُنہوں نے اتنا بزرگ اور مقدس سمجھا کہ خدا یا خدا کا بیٹا مانا (یعنی حضرت عیسیٰ پر) مذہب اسلام ہی کا یہ احسان عیسائی مذہب پر ہے کہ وہ نہایت مستقل ارادہ اور نڈر دل اور نہایت اُستوار ثابت قدمی سے عیسائی مذہب کا طرفدار رہا - اور یہودیوں سے مقابلہ کیا اور علانیہ اور دلیرانہ اس بات کا اعلان کیا کہ جان دی باپٹسٹ (یعنی حضرت یحیٰی) بلاشبہ سچے پیغمبر اور حضرت عیسیٰ بے شک عبداللہ اور کلمۃ اللہ اور روح اللہ تھے پس کون سا مذہب اس بات کا دعویٰ کرسکتا ہے کہ وہ عیسائی مذہب کی حمایت میں اسلام سے زیادہ تر مفید ہے اور اُس نے عیسائی مذہب کی حمایت میں اسلام سے زیادہ کوشش کی ہے"

"جو سب سے بڑی خرابی حواریوں کے بعد عیسائی مذہب میں پیدا ہوگئی ہے وہ تثلیث فی التوحید اور توحید فی التثلیث کا مسئلہ تھا اور یہ مسئلہ اُس لازوال سچ کے بھی متناقض تھا اور اُن خاص نصیحتوں کے بھی برخلاف تھا جو حضرت عیسیٰ نے فرمائی تھیں اور حواریوں نے انجیل میں لکھی تھیں - یہ امر اسلام کی لازوال عظمت کا باعث ہے کہ اُسی نے خدائے ذوالجلال پرستش کو پھر جاری کیا اور اُس خاص مذہب کو پھر سرسبز کیا جسکی خاص تلقین حضرت عیسیٰ نے کی تھی - اسلام ہمیشہ اُس زمانہ کے عیسائیوں کو اُن کی غلطیوں سے متنبہ کرتا رہتا ہے - اسلام نے عیسائیوں سے اُسی سچے مذہب کے قبول کرنے کی استدعا کی جس کا وعظ حضرت مسیح نے کیا تھا - جیسا کہ قرآن میں آیا ہے کہ قُلْ یَا اَھْلَ الْکِتَابِ تَعَالَوْا اِلٰی کَلِمَۃٍ سَوَاءٍ بَیْنَنَا

بیننا ... [illegible]

بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَ لَا نُشْرِکَ بِهٖ شَیْئًا" بہت سے عیسائیوں کی آنکھیں اسلام کی روشنی سے کھل گئیں اور اُس ذلیل حالت سے وہ خبردار ہوئے جس میں مبتلا تھے اور اُنہوں نے پھر اُسی رتبہ کے حاصل کرنے کی کوشش کی جو پہلے اُن کو حاصل تھا یعنی اُنہوں نے صرف قرآن کی ہدایت سے تثلیث کے عقیدے کو غلط سمجھا اور خدا کو وحدہٗ لاشریک لہٗ اور عیسیٰ مسیح کو خدا کا مقدس بندہ مانا جو عین مسئلہ مذہب اسلام کا ہے چنانچہ وہ فرقہ اب موجود ہے اور نہایت معزز لقب یونیٹیرین (یعنی موحّدین) سے معزز ہے۔"

"اگر یہ عقیدہ تھوڑی دیر کے لیے دنیا سے اُٹھا لیا جاوے تو مسٹر گبن کی یہ راے عیسائیوں کے حال پر بالکل مطابق ہو جائیگی کہ "اگر سینٹ[1] پیٹر یا سینٹ پال پوپ کے محل میں آجائیں تو غالباً وہ اُس دیوتا کا نام دریافت کریں گے جس کی پرستش ایسے پُر اسرار رسومات کے ساتھ اُس عظیم الشان عبادت گاہ میں کیجاتی ہے۔ اکسفورڈ یا جنیوا میں جا کر اُن کو چنداں حیرت نہو گی مگر گرجا میں جا کر سوال وجواب کا پڑھنا اور جو کچھ صادق[2] القول مفسروں نے اُن کی تحریرات اور اُن کے مالک کے کلمات کی تفسیر کی ہے اس پر غور کرنا پڑے گا۔"
یعنی عیسیٰ مسیح ۱۲

اس کے بعد سر سید لکھتے ہیں کہ "جو فائدے اسلام نے عیسائی مذہب کو پہنچائے اُن میں سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اُس نے عیسائیوں کو پوپ کے بے انتہا اختیارات ناجائز سے نجات دی اور عیسائیوں میں ایک زندگی کی روح پھونکدی۔ تمام عیسائی پوپ کو حضرت عیسیٰ کا پورا با اختیار نائب سمجھتے تھے اور اُس کو معصوم جانتے تھے جیسے کہ اب بھی بہت سے فرقے عیسائیوں کے سمجھتے ہیں۔ اُنکا یقین تھا اور بہتوں کا اب بھی یقین ہے کہ دوزخ اور اعراف اور بہشت کے دروازوں کے کھولنے کا بالکل اختیار ہے۔ پوپ گنہگاروں کے بخشدینے کا دعویٰ رکھتا ہے۔ پوپ کو پورا اختیار تھا کہ جس ناجائز چیز کو چاہے جائز کر دے درحقیقت پوپ بلحاظ اُن اختیارات کے جو اُس کو حاصل تھی اور جن کو وہ کام میں لاتا تھا کسی طرح حضرت عیسیٰ سے کم نہ تھا بلکہ دو چار قدم آگے بڑھا ہوا تھا۔ قرآن ہی نے عیسائیوں کو اس خرابی سے مطلع کیا اور جو خرابیاں اُس سے پیدا ہوتی ہیں اُن کو بتلایا اور جابجا عیسائیوں کو اس غلامانہ اطاعت پر ملامت کی اور اُن کو سمجھایا کہ اس رسوائی اور بے عقلی کی اطاعت کو چھوڑیں اور خود آپ اپنے بیچ کی جستجو کریں چنانچہ قرآن مجید میں فرمایا "قُلْ یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ

---

[1] سینٹ پیٹر یعنی پطرس حواری اور سینٹ پال یعنی پولوس مقدس ۱۲

[2] صادق القول کا لفظ مسٹر گبن نے بطور طنز کے لکھا ہے جس سے مراد تحریف کرنیوالے مفسر ہیں ۱۲

بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ" اور پھر دوسری جگہ فرمایا "اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ"

"جب یہ آیت نازل ہوئی تو عدیؓ بن حاتم جو اُسوقت عیسائی تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور اُن کے گلے میں سونے کی صلیب پڑی ہوئی تھی۔ آنحضرت نے فرمایا کہ لے عدی اس بت کو اپنے گلے سے نکال پھینک چنانچہ نکال ڈالی۔ جب وہ پاس آئے تو آنحضرت قرآن کی یہ آیت پڑھتے تھے اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ" جب آپ پڑھ چکے تو عدی نے عرض کیا کہ ہم تو اُن کی پرستش نہیں کرتے آپنے فرمایا کہ کیا یہ نہیں ہے کہ وہ حرام کر دیتے ہیں اُس چیز کو جسے خدا نے حلال کیا پھر تم بھی اُس کو حرام سمجھتے ہو اور حلال ٹھیراتے ہیں وہ اُس چیز کو جسے خدا نے حرام کر دیا سو تم بھی اُس کو حلال سمجھنے لگتے ہو؟ عدی نے کہا ہاں یہ تو ہے۔ آنحضرت نے فرمایا بس یہی اُنکا پوجنا ہے۔

"ایک مدت تک عیسائی اسلام کو عداوت سے دیکھا کئے اور اسکے ہر ایک مسئلہ سے بے سمجھی سے نفرت کرتے رہے مگر بعض نیک دل عیسائیوں نے کچھ تھوڑی بہت غور سے اُسے دیکھا اور کالون اور لوتھر مقدس کے دل پر اُس کا کچھ کچھ اثر ہوا جب کہ اُن دونوں نے قرآن مجید کی اس قسم کی آیتوں کو پڑھا جن میں پوپ کو اور پادریوں کو خدا کے سوا دوسرا خدا یا جھوٹے خدا ماننے کی مذمت تھی تو وہ سمجھے اور اس سچے مسئلہ نے اُنکے دل پر اثر کیا۔ اور جیسی کہ قرآن نے ہدایت کی تھی وہ سمجھے کہ ہر شخص فی الواقع آپ اپنا پوپ اور پادری ہے وہ چلا اُٹھے کہ پالیا پالیا اور اسی وقت پوپ کی غلامی سے آزاد ہوئے اور علانیہ اور ذلیل حالت سے جس میں وہ خود اور اُنکے تمام ہم مذہب مبتلا تھے نکل آئے اور صاف صاف اُس کے خلاف وعظ کرنے کو کھڑے ہو گئے جسکی بدولت ہم کروروں عیسائیوں کو پروٹسٹنٹ مذہب میں دیکھتے ہیں۔ اگر اسلام عیسائی مذہب کو یہ نعمت نہ بخشتا تو آج تمام دنیا کے عیسائی ایسے ہی بت پرست ہوتے جیسے کہ اب تک رومن کیتھلک فرقہ کے لوگ بت پرست ہیں اور حضرت مسیح کی مجسم مورت صلیب پر لٹکی ہوئی کے آگے سجدہ کرتے ہیں بس عیسائی مذہب پر یہ کتنا بڑا احسان اسلام کا ہے۔"

"چونکہ درحقیقت لوتھر مقدس نے مذہب اسلام سے یہ ہدایت پائی تھی اسلیے اُس کے مخالف علانیہ اُس پر یہ الزام لگاتے تھے کہ وہ دل سے مسلمان تھا۔ کوارٹرلی ریویو نمبر ۲۵ میں لکھا ہے کہ جینی براڈ نے پوپ کی طرف سے جرمنی کے رفارمروں اور خصوصًا لوتھر کے ذمہ یہ الزام لگایا تھا کہ

وہ عیسائیوں میں مذہب اسلام کو جاری کرنے اور تمام پادریوں کو اس مذہب میں لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مراکسی کی یہ رائے ہے کہ اسلام میں اور لوتھر کے عقیدہ میں کچھ بہت فرق نہیں ہے چنانچہ دونوں کا میلان جو بت پرستی کے برخلاف ہے اُس پر غور کرو۔ بارٹینین الفانسس اور والڈس کہتے ہیں کہ تیرہ نشانیاں اس بات کے ثابت کرنے کو موجود ہیں کہ اسلام میں اور لوتھر کے مذہب میں ایک رتی بھر کا بھی تفاوت نہیں ہے۔ محمد (صلعم) نے انھیں باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے جو یہ مرتد (یعنی پیروان لوتھر) کرتے ہیں۔

تاہم لوتھر نے اپنی کوشش کو نہیں چھوڑا اور آخر کار اُس عظیم الشان اصلاح کرنے پر کامیاب ہوا جو عموماً مذہب پروٹسٹنٹ یا رفارمیشن کے نام سے مشہور ہے، اور طبیعت انسانی کو تمام غلامیوں کی بدترین غلامی سے جو ایک مرشدانہ غلامی تھی آزاد کر دیا۔ ہم کو یقین ہے کہ اگر لوتھر مقدس اور زندہ رہتے تو ضرور وہ مسئلہ تثلیث کے مخالف ہوتے اور اسلام کی ہدایت سے خدا کی وحدانیت کے مسئلہ کو بھی۔ جو درحقیقت حضرت عیسیٰ نے بھی یہی مسئلہ تلقین کیا تھا۔ لوگوں میں پھیلاتے اور آخر اُس نبی آخر الزماں پر یقین کرتے جس نے ایسی ایسی بڑی غلطیوں سے عیسائی مذہب کو بچایا تھا۔ پس مذہب عیسوی کو ہمیشہ اسلام کا احسانمند رہنا چاہیئے"

پانچواں خطبہ

پانچویں خطبہ میں نہایت تفصیل کے ساتھ مسلمانوں کی مذہبی کتابوں یعنی کتب حدیث کتب سیر تفاسیر اور کتب فقہ کی تصنیف کا منشا اور غرض اور ڈھنگ بیان کیا ہے تاکہ غیر مذہب کے محقق اور نکتہ چین جو اسلام کی نسبت آیندہ زمانہ میں کچھ لکھنا چاہیں اُن کو مسلمانوں کی مذہبی کتابوں کی طرز تصنیف سے آگاہی اور بصیرت حاصل ہو اور وہ اُن مصنفوں کی طرح جو اسلام کی مذہبی کتابوں سے ناواقفیت کے سبب غلطی میں پڑے ہیں گمراہ نہوں اور اُنکی رہبری کے لیے ایک سیدھا رستہ بن جاوے۔

چھٹا خطبہ

چھٹا خطبہ مذہب اسلام کی روایت پر لکھا گیا ہے یہ خطبہ کسی قدر طولانی ہے اس لیے صرف اُس کی سرخیاں لکھنے پر اکتفا کیا جاتا ہے اسمیں اول روایت کی اصلیت اور یہ کہ اُسکے رواج کی ابتدا کیونکر ہوئی اور نیز یہ کہ دین اسلام صرف اُنہیں صحیح روایتوں میں منحصر ہے جو تبلیغ رسالت سے علاقہ رکھتی ہیں نہ دیگر دنیوی امور سے بیان کیا ہے۔ پھر جھوٹی روایت کرنے کا امتناع اور اُسکی سزا جو اسلام میں مقرر ہے، درجات احادیث بلحاظ ثقہ ہونے رُواۃ کے، راویوں کا درجہ اعتبار بلحاظ تفقہ کے، یہودیوں سے روایت کرنے کی اجازت جو آنحضرت نے صحابہ کو دی،

اختلاف روایات کے اسباب، احادیث موضوعہ کا بیان، یہ تمام باتیں مفصل بیان کی ہیں۔ اس کے بعد سر ولیم میور نے جن روایات سے استدلال کر کے اسلام اور بانی اسلام پر اعتراضات وارد کیے ہیں ان اعتراضوں کا نہایت شافی جواب الزامی اور تحقیقی دونوں طرح سے دیا ہے۔

یہ دونوں خطبے یعنی پانچواں اور چھٹا نہایت ضروری اور مفید اطلاعوں پر مشتمل ہیں جو اسلام کی مذہبی کتابوں اور روایتوں پر ایسی روشنی ڈالتے ہیں جسکے اجالے میں کوئی غیر مذہب مصنف بشرطیکہ اس نے آنکھیں نہ بند کر لی ہوں ٹھوکر نہیں کھا سکتا۔

قرآن مجید

ساتویں خطبہ میں اول قرآن مجید، اس کا نزول، اس کی سورتوں اور آیتوں کی ترتیب، اس کی مختلف قراءتیں، آیات ناسخ و منسوخ کی بحث، اس کے جمع ہونے کا زمانہ، اسکی نقلوں کی اشاعت، اور اسکا کامل اور الہامی ہونا بیان ہوا ہے اور اسکے بعد سر ولیم میور اور دیگر عیسائی مصنفوں کی غلطیاں جو انہوں نے قرآن مجید کے متعلق کی ہیں بیان کی ہیں۔

ان غلطیوں کا اصل منشا وہ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ "مسلمان بادشاہوں یا عالموں کو تو خدا نے توفیق نہیں دی کہ قرآن مجید کو خود دوسری زبانوں میں ترجمہ کراتے اور مختلف ملکوں میں شائع کرتے یوروپ کی زبانوں میں بے شک اس کے ترجمے ہوئے مگر وہ سب غیر مذہب کے لوگوں یعنی عیسائیوں نے کیے۔ ابتدا میں جس طرح پر بذریعہ ان ترجموں کے قرآن مجید کا رواج یوروپ میں ہوا اس کا بیان گاڈفری ہگنز نے عمدہ طرح پر ان الفاظ میں کیا ہے کہ "اگر عبرانی توریت کا ترجمہ اس طرح پر شایع ہوتا کہ ہر لفظ قابل تبدیل (یعنی محتمل المعنیین) مہین اور شایستہ معنی سے ذلیل اور غیر مہذب معنی میں بدل دیا جاتا اور ہر آیت جس کا مضمون کسی جوڑ توڑ اور ناقابل برداشت غلط ترجموں اور غلط تاویلوں کے ساتھ مصنف پر معیوب معنی پہنچانے کا ذریعہ بنایا جاتا۔ ایک بے قدر اور خراب شرح اسکے ساتھ لگی ہوتی، تو اس ذریعہ کا کسی قدر تصور بندھ سکتا جسکی وساطت سے یوروپ میں قرآن کی اشاعت ہوئی"

اس کے بعد سر سید نے سر ولیم میور اور دیگر عیسائی مصنفوں کی غلطیوں کی تشریح کی ہے اور جو اعتراض انہوں نے غلط فہمی سے قرآن پر وارد کیے ہیں ہر ایک کا جواب دیا ہے۔

آٹھواں خطبہ خانۂ کعبہ کے حالات اور اسکی تاریخی اور جغرافی تحقیقات پر مشتمل ہے۔ یہ خطبہ اس غرض سے لکھا گیا ہے کہ سر ولیم میور نے اپنی کتاب لائف آف محمدؐ میں اس بات کا دعویٰ کیا ہے کہ یقطان جسکا ذکر توریت میں جابجا آیا ہے۔ اہل عرب کا اس کی اولاد میں ہونا۔ حضرت اسمٰعیل کا مکہ کے قریب آباد ہونا، خانۂ کعبہ کی تعمیر اور اسکی تمام مراسم کا ابراہیم و اسمٰعیل سے تعلق ہونا یہ

سب بناوٹ اور افسانہ ہے اور ہر قسم کی تاریخی سچائی اور مورخانہ احتمالات وقیاسات سے نہایت بعید ہے۔ اس دعوی سے سر ولیم کا یہ مطلب تھا کہ اُنھوں نے جو آگے چل کر اپنی کتاب میں آنحضرت کے نبی اسمٰعیل ہونے سے انکار کیا ہے اور آپ کے نسب نامہ پر شبہات وارد کیے ہیں اُن کے لیے ایک وجہ ہاتھ آئے۔

سرسید نے اس خطبہ میں نہ صرف مسلمانوں کی تاریخوں سے بلکہ زیادہ تر یوروپ کے عیسائی محققوں اور جغرافیہ دانوں کی تحقیقات سے حضرت اسمٰعیل اور اُنکی اولاد کا حجاز یا عرب میں آباد ہونا ثابت کیا ہے اور اسکے بعد توریت کی نہایت صریح شہادتوں سے اس امر کا ثبوت دیا ہے کہ حجرِ اسود اور قربانی کی رسم اور کعبہ کا بیت اللہ نام ہونے کو خاص حضرت ابراہیم اور اُنکی اولاد سے تعلق ہے۔ اُنھوں نے توریت کے بہت سے حوالوں سے ثابت کیا ہے کہ حضرت ابراہیم اور اُنکی اولاد یعنی حضرت اسحاق، حضرت یعقوب اور حضرت موسیٰ سب کا یہی طریقہ تھا کہ خدا کی عبادت کے لیے ایک بن گھڑا پتھر مثل حجرِ اسود کے کھڑا کر کے مذبح بناتے تھے اور اُس کو بیت ایل یعنی بیت اللہ کہتے تھے۔ اور تمام مراسم جو موسم حج میں خانۂ کعبہ اور اُس کے قرب وجوار میں مسلمان ادا کرتے ہیں ان سب کا تعلق حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل کے ساتھ ایسے طور پر ثابت کیا ہے جس سے فی الواقع سر ولیم میور کے شبہات ہر منصف مزاج آدمی کی نظر میں نہایت بے وقعت ہو جاتے ہیں۔

یہ خطبہ بہت لمبا ہے۔ اسکی اصل خوبی بغیر اسکے کہ اُسکو اول سے آخر تک اصل کتاب میں دیکھا جائے معلوم نہیں ہو سکتی۔ اس میں سر ولیم میور کے شبہات کی تردید کرنے کے بعد خانۂ کعبہ اور مکۂ معظمہ کی تمام تاریخ محققانہ طور سے مفصل بیان کی گئی ہے۔

نواں خطبہ

نواں خطبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نسب کی تحقیقات پر ہے۔ اس خطبہ کے لکھنے کا منشا یہ تھا کہ سر ولیم میور نے اپنی کتاب میں آنحضرت صلعم کے نبی اسمٰعیل ہونے سے انکار کیا ہے چنانچہ وہ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ "غالباً یہ کوشش کہ وہ (یعنی آنحضرت) اسمٰعیل کی نسل سے ثابت کئے جائیں اُنکی حین حیات میں پیدا ہو گئی تھی اور اس طرح پر محمد (صلعم) کے ابراہیمی نسب نامہ کے ابتدائی سلسلے گھڑے گئے تھے اور اسمٰعیل اور بنی اسرائیل کے بے شمار قصے نصف یہودی اور نصف عربی سانچے میں ڈھالے گئے تھے"۔ سر ولیم میور کو نسب پر نکتہ چینی کرنے کی جرأت غالباً اس سبب سے ہوئی کہ آنحضرت کا نسب سیر کی کتابوں میں صرف عدنان تک مسلسل بیان ہوا ہے جس میں کسی کو اختلاف نہیں ہے مگر عدنان کے بعد حضرت اسمٰعیل تک جتنی پشتیں اہل سیر نے لکھی ہیں اُن میں اختلافات واقع ہوئے ہیں۔

اسی بنا پر اس خطبہ کے اول میں سرسید نے ایک نہایت عمدہ تمہید لکھی ہے جسکا ماحصل یہ ہے کہ "زمانہ جاہلیت میں عرب کے لوگ کوئی فن نہیں جانتے تھے مگر دو باتیں اُنہیں بے مثل تھیں ایک شاعری، دوسرے علم الانساب۔ چونکہ اُنکے ہاں کتابت کا رواج نہ تھا اور صرف حافظہ پر مدار تھا اسلیے وہ اپنے اپنے قبیلہ کی تمام پشتیں اور اسی طرح دوسرے ہمسایہ قبیلوں کی تمام پشتیں تا بقدر امکان زبر یاد رکھتے تھے اور اپنے نسب پر فخر کرتے تھے اور اپنے حریفوں کے نسب میں عیب نکالتے تھے مگر چونکہ بغیر کتابت کے کسی قبیلہ کی تمام پشتوں کو بہ ترتیب یاد رکھنا غیر ممکن تھا اس لیے بڑے بڑے جلیل القدر اور مشہور اشخاص کے نام تو ضرور یاد رہتے تھے۔ باقی کے نام کچھ یاد رہتے تھے کچھ بھول جاتے تھے۔ مشاہیر کے نام یاد رہنے کا ایک یہ بھی سبب تھا کہ اُن کے نام اور اُنکے کارنامے اشعار میں بیان ہوتے تھے اور بڑے بڑے معرکوں میں وہ اشعار پڑھے جاتے تھے۔ ان وجوہات سے ہر شخص اپنے تئیں اور اپنے ہمسایہ اور مخالف کو بخوبی جانتا تھا کہ وہ کس قبیلہ اور کس نسل سے ہے اور کسی کی یہ مجال نہ تھی کہ اپنی قوم اور نسل کو بدل سکے اور جھوٹ موٹ اپنے کو کسی دوسری نسل کا بتا سکے۔ اگرچہ کسی کو کسی قبیلہ کی نسلیں بترتیب یاد نہوں مگر ہر ایک قبیلہ میں جو نامور اور قابل فخر اشخاص ہوتے تھے وہ سب کو یاد رہتے تھے۔ اسی لیے جب اسلام کے زمانہ میں کتابت اور تصنیف و تالیف کا رواج ہوا اور ایک مدت کے بعد مورخین نے کسی کا پورا نسب نامہ سلسلہ وار لکھنا چاہا تو اُنکو ایسی دقتیں پیش آئیں جنکا حل کرنا بہت مشکل تھا کیونکہ نسب ناموں کے بہ ترتیب یاد نہونے کے علاوہ دوسری مشکل یہ تھی کہ ایک ہی نام کے کئی کئی شخص نسب ناموں میں ہوتے تھے اور پھر ایک ہی شخص کے کئی کئی نام ہوتے تھے۔ شام و عرب میں یہ بھی دستور تھا کہ نسب نامہ کے اشخاص میں جو شخص مشہور و معروف ہوتا باپ کی جگہ اُس کا نام لے دیتے تھے، جیسا کہ انجیل متی میں حضرت عیسیٰ کی نسبت لکھا ہے کہ "نسب نامۂ عیسیٰ مسیح بن داؤد ابن ابراہیم"
حالانکہ مسیح سے داؤد تک اور داؤد سے ابراہیم تک بہت سی پشتیں درمیان تھیں مگر چونکہ داؤد اور ابراہیم نہایت مشہور اشخاص تھے اسلیے مسیح کو داؤد کا اور داؤد کو ابراہیم کا بیٹا بتا دیا"

عرب کے لوگوں کی یہ بھی عادت تھی کہ اپنا کرسی نامہ بیان کرتے وقت جب آبا و اجداد کے نام اُن کی یاد کے موافق ختم ہو جاتے تو اخیر یاد رہے ہوئے شخص کو اُس شخص کا بیٹا کہدیتے تھے جس سے وہ نسل چلی ہے اِن اسباب سے مورخوں کو اُن کے نسب نامے سلسلہ وار لکھنے میں سخت مشکلات پیش آئیں"

"آنحضرتؐ کا نسب نامہ سلسلہ وار لکھنے والوں کو بھی یہی مشکلیں پیش آئیں۔ آپکو اپنا کرسی نامہ بیان کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی کیونکہ تمام عرب کے لوگ یقیناً آپ کو قبیلۂ قریش سے اور قریش کو معد بن

عدنان کی اولاد میں اور عدنان کو قیدار ابن اسمٰعیل ابن ابراہیم کی اولاد میں جانتے تھے اور اسی قدر انکا جاننا آپ کے بنی اسمٰعیل ہونے کے لیے کافی تھا، گو کہ درمیان میں کتنی ہی پشتیں گذری ہوں۔ اسی لیے کوئی صحیح روایت آپ کے نسب نامہ کے متعلق موجود نہیں ہے سوا اس کے کہ آپ نے فرمایا "ابراہیم خلیل اللہ میرے باپ اور میرے ولی ہیں"۔

"پس جب لوگوں نے آنحضرت کا نسب نامہ بترتیب لکھنا چاہا تو انہیں اختلاف ہونا ایک ضروری امر تھا۔ آنحضرت سے لیکر معد ابن عدنان تک کسی مورخ کا اختلاف نہیں ہے، جو کچھ اختلاف ہے وہ معد بن عدنان سے اسمٰعیل تک کی پشتوں میں ہے صرف پانچ شخص ہیں جن کے لکھے ہوئے نسب ناموں میں معد ابن عدنان سے لیکر ابراہیم تک پشتوں کا بیان ہوا ہے"۔

اسکے بعد سرسید نے تین نسب ناموں کو غلط بتایا ہے، کیونکہ انمیں قطع نظر اختلافات کے بڑی خرابی یہ ہے کہ جو زمانہ عدنان اور ابراہیم کے درمیان گذرا ہے وہ گویا دس یا گیارہ پشتوں سے (یعنی فیصدی تین پشتوں کے مسلمہ قاعدہ کے موافق پورا نہیں ہوتا۔ اب دو نسب نامے باقی رہ گئے ایک برخیا کاتب الوحی ارمیا نبی کا، دوسرا الجرا کا۔ ارمیا نبی۔ جیسا کہ بائیبل سے ثابت ہے خود معد ابن عدنان کے زمانہ میں تھے اور بخت نصر کے ہنگامہ میں انہوں نے معد کو بچایا تھا اور اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ یہ قوی قرینہ اس بات کا ہے کہ ان کو معد کا نسب نامہ اسمٰعیل ابن ابراہیم تک لکھنے کی ضرورت پڑی ہوگی اور اس نسب نامہ کو مسعودی اور واقدی دونوں نے اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے مگر اس نسب نامہ سے بھی اگر اس میں آنحضرت سے عدنان تک جتنی پشتیں ہیں انکو شامل کر لیا جائے تو وہ زمانہ جو آنحضرت سے ابراہیم تک ہے پورا نہیں ہوتا۔

جو شجرہ الجرا نے لکھا ہے وہ بھی ابتک ایک جدا نسب نامہ سمجھا جاتا تھا مگر سرسید نے نہایت عمدگی سے ثابت کیا ہے کہ وہ جدا نسب نامہ نہیں ہے بلکہ برخیا کے نسب نامہ کا تتمہ ہے کیونکہ اس کو تتمہ فرض کرنے کی صورت میں آنحضرت سے اسمٰعیل تک ستر پشتیں ہوتی ہیں جو فیصدی تین پشت کے مسلمہ قاعدہ کے موافق اس زمانہ پر بالکل منطبق ہو جاتی ہیں جو اسمٰعیل کی ولایت اور آنحضرت کی ولادت کے درمیان گذرا ہے یعنی دو ہزار چار سو چہتر برس کا زمانہ۔

سر ولیم میور لطو رطعن کے لکھتے ہیں کہ "آنحضرت کا نسب نامہ عدنان تک خاص عرب کی ملکی روایتوں سے لیا گیا ہے اور عدنان سے آگے یہودیوں سے" اس پر سرسید لکھتے ہیں کہ بلاشبہ

اہل عرب بنی اسرائیل سے نہایت قرابت قریبہ رکھتے تھے۔ وہ اسمٰعیل کی اولاد تھے اور بنی اسرائیل اسحٰق کی۔ وہ اَن پڑھ جاہل تھے اور یہ لکھے پڑھے قابل۔ پس یہ ایک قدرتی بات تھی کہ جس بات سے وہ ناواقف ہوں اپنے اسرائیلی بھائیوں سے اُس کو دریافت کریں یا جس بات کی تفصیل آنحضرت نے نہیں فرمائی اُس کا مفصل حال اپنے اسرائیلی بھائیوں سے پوچھیں خصوصاً اس وجہ سے کہ آنحضرت نے بنی اسرائیل سے روایت کرنے کی اجازت دی تھی۔"

"پس جب کہ مسلمانوں کو اپنے پیغمبر کے نسب نامہ لکھنے کا خیال ہوا جس کا کبھی مذکور آنحضرت کی زندگی میں نہیں ہوا تو بلاشبہ انھوں نے اپنے بنی اسرائیلی بھائیوں سے جو لکھے پڑھے تھے اور تاریخ نویسی اور نسب ناموں کی تحریر کا اُن کے ہاں رواج تھا۔ مدد لی۔"

اس کے بعد سرسید کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ "نہایت تعجب ہے کہ عیسائیوں نے کیوں اس امر کے ثابت کرنے میں بے فائدہ سعی کی ہے کہ یہودیوں اور مسلمانوں کے مذہب میں ایک تعلق ہے اور پچھلا پہلے پر مبنی ہے اور از راہ طعن ہماری نسبت کہتے ہیں کہ ہم نے فلاں فلاں باتیں یہودیوں سے لی ہیں۔ گویا وہ سمجھتے ہیں کہ اسلام یہودیوں کے ہاں سے چُرایا ہوا مذہب ہے اور جیسے کہ عیسائی مذہب یہود کا بالکل محتاج ہے اسی طرح اسلام بھی مذہب یہود کا محتاج ہے۔ ہم نہایت خوشی سے اس بات کو تسلیم کرتے ہیں اور جو مشابہت ان دو نورانی الہامی مذہبوں میں پائی جاتی ہے اُس سے انکار کرنے کے بدلے ہم اُس کو نہایت فخر سمجھتے ہیں۔ صرف ہم مسلمان ہی ہیں جو ہر ایک سچے اور خدا کے بھیجے ہوئے نبی کے سچے پیرو ہیں ہم ہی یقین کرتے ہیں کہ آدم و نوح اور ابراہیم و یعقوب و اسحاق و اسمٰعیل و موسیٰ و عیسیٰ اور محمد صلوات اللہ علیہم اجمعین سب کا ایک ہی دین تھا جیسا کہ ہمارے پیغمبر کو خدا نے فرمایا کہ "قل یا اھل الکتٰب تعالوا الی کلمۃٍ سواءٍ بیننا و بینکم ان لا نعبد الا اللہ۔" ہم مسلمانوں کا فخر یہی ہے کہ ہم یہودیوں سے زیادہ موسیٰ کلیم اللہ کے اور عیسائیوں سے زیادہ عیسیٰ روح اللہ کے پیرو ہیں جنھوں نے یحییٰ و عیسیٰ اور محمد رسول اللہ کے مبعوث ہونے کی خبر دی تھی اور اُن کی پیروی کی ہدایت کی تھی۔ مگر یہودیوں نے اُن تینوں کو اور عیسائیوں نے اس پچھلے کو جس پر ایمان کا خاتمہ تھا نہ مانا اور اُن کی سچی پیروی ہم مسلمانوں ہی نے کی۔"

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ "آنحضرت کے نسب نامہ کی نسبت کیا بیہودہ گفتگو عیسائیوں نے کی ہے۔ خدا کے اس وعدہ کا پورا ہونا۔ جو اُس نے بنی اسرائیل سے موسیٰ کی زبانی کیا تھا کہ "میں تمہارے بھائیوں یعنی بنی اسمٰعیل میں سے موسیٰ کی مانند ایک نبی پیدا کروں گا۔" کچھ اس بات پر

منحصر نہ تھا کہ بنی اسمٰعیل کی نسلیں محمدؐ سے لے کر اسمٰعیل تک ہم کو ترتیب وار اور پوری پوری یاد ہوں اور نہ اس بات پر منحصر تھا کہ وہ کرسی نامہ ہم عرب کی ملکی روایتوں سے یاد کریں یا یہود کی روایتوں اور برخیا کی تحریروں سے لیں، وہ اسمٰعیل کی اولاد میں سے ایک کے لئے ہوتا تھا سو محمدؐ رسول اللہ کی نسبت پورا ہوا۔ تمام عرب اور یہود اور عرب کی قرب وجوار کی تمام قومیں اور تمام اگلے اور پچھلے مؤرخ خواہ عرب کے رہنے والے ہوں یا کسی اور ملک کے اور مسلمان ہوں یا کسی اور مذہب کے اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کرتے بلکہ بالکل تسلیم کرتے ہیں کہ محمدؐ رسول اللہ بنی ہاشم قریش۔ اسمٰعیل ابن ابراہیم کی اولاد میں ہیں۔ محمدؐ رسول اللہ نے قریش کو پکار کر مخاطب کیا کہ ابیکم ابراہیم جس کو سب نے تسلیم کیا اور کون ایسا شخص ہے کہ جس میں اس قدر جرأت ہو کہ وہ سچ بات کو تسلیم نہ کرے۔"

اس کے بعد ابوالفدا مسلمان مؤرخ اور مسٹر گبن اور ریورنڈ فاسٹر عیسائی مؤرخوں کی شہادتیں نقل کی ہیں جن میں سے گبن کا قول یہ ہے کہ "محمدؐ (صلعم) کو حقیر اور مبتذل نسل سے کہنا عیسائیوں کا ایک احمقانہ افترا ہے، ایسا افترا کرنے سے بجائے اس کے کہ اس سے مخالف کی خوبیوں کو گھٹائیں اُن کو اور زیادہ بڑھاتے ہیں اسمٰعیل سے اُن کی نسل کا ہونا ایک قومی تسلیم کی ہوئی بات اور ملکی روایت سے ثابت شدہ امر ہے۔ بالفرض اگر کرسی نامہ کی پہلی نسلیں بخوبی معلوم نہوں اور ابہام میں ہوں تو اور بہت پشتیں ایسی ہیں جو صاف صاف شریف ونجیب ہیں، وہ قریش اور بنی ہاشم ہیں جو اہل عرب میں نہایت نامی اور مکہ کے فرمانروا اور کعبہ کے موروثی محافظ تھے۔" یہی رائے مسلمان مؤرخ یعنی ابوالفدا کی ہے اور یہی گواہی ریورنڈ مسٹر فاسٹر نے دی ہے۔

اس کے بعد سرسید لکھتے ہیں کہ "اب ہم اس خطبہ کے خاتمہ میں اپنے پیغمبر کا نسب نامہ جس طرح پر کہ ہم نے تحقیق کیا مندرج کرتے ہیں اور جو کہ مجھکو بھی اس بات کا فخر حاصل ہے کہ میں بھی اُسی آفتاب عالمتاب کے ذرّوں میں سے ہوں اس لئے اپنے نسب کو بھی اس کے ساتھ شامل کر دیتا ہوں تاکہ جو روحانی ارتباط مجھکو اس سردار دوجہان سے ہے اور جو خون کا اتحاد مجھ میں اور اُس سرورِ عالم میں ہے اور جس کے سبب لحمک لحمی ودمک دمی ہمارا موروثی خطاب ہے اس ظاہری ارتباط سے معزز ہو جائے۔"

"گرچہ خُردیم نسبتے ست بزرگ
ذرۂ آفتاب تابانیم"

دسواں خطبہ | دسواں خطبہ اُن بشارتوں کے بیان میں ہے جو توریت اور انجیل میں آنحضرت صلعم کے

نبی ہونے کی بابت مذکور ہیں اس خطبہ میں اوّل سر سیّد نے قرآن مجید کی وہ آیتیں نقل کی ہیں جن میں اس بات کا بیان ہے کہ توریت و انجیل میں آپ کی نبوت کی خبریں دی گئیں ہیں۔ اس کے بعد اُنھوں نے وہ وجوہات بیان کی ہیں جن کے سبب سے اکثر قدیم مسلمان عالموں نے انبیاء سابقین کی کتابوں کا پورا پورا اعتبار نہیں کیا اور اس لیے اُنھوں نے توریت و انجیل میں اُن بشارتوں کی زیادہ تفتیش نہیں کی اور تحریف کا عذر پیش کر کے اُن بشارتوں کے نشان دینے سے جن کی قرآن میں جا بجا خبر دی گئی تھی دست بردار ہو گئے۔ پھر اُن محققین کا ذکر کیا ہے جنھوں نے نہایت کوشش اور استقلال سے اُن کی اور توریت و انجیل میں بہت سے ایسے مقامات دریافت کیے جہاں آنحضرت کے نبی ہونے کی بشارتیں موجود تھیں۔ مگر چوں کہ ان کی نشان دی ہوئیں بشارتیں جو ہماری مذہبی کتابوں اور تفسیروں اور سیر و تواریخ میں مذکور ہیں اُن کی بابت کچھ پتہ نہیں دیا گیا کہ وہ بائیبل کی کون سی کتاب اور کون سے باب اور کون سے درسوں میں بیان ہوئے ہیں اور نہ یہ بتایا گیا ہے کہ قلمی قدیم نسخے جن میں کثرت سے اختلاف عبارت تھا اور جن کے جدا جدا نام تھے اُن میں سے کون سے نسخے میں وہ بشارتیں پائی گئیں اور نہ یہ جتایا گیا کہ بائیبل کی بہت سی کتابیں جو اب مفقود ہیں یا جن کو عیسائی اب نامعتبر سمجھتے ہیں وہ بشارتیں اُن میں سے لی گئی ہیں یا موجودہ مسلمہ کتابوں میں سے۔ اس لئے سر سید نے صرف چند بشارتیں[1] جو آنحضرت کے حق میں نہایت صراحت کے ساتھ صادق آتی ہیں اور جو موجودہ مسلمہ مجموعہ عہد عتیق و عہد جدید میں موجود ہیں جس کو تمام یہودی اور عیسائی مانتے ہیں اس خطبہ میں بیان کی ہیں۔

اس کے بعد اُنھوں نے وہ طریقہ جس طریقہ سے کہ بائیبل میں پیشین گوئیاں آنے والے پیغمبر کی نسبت بیان ہوئی ہیں بتایا ہے اور لکھا ہے کہ اُن کا بیان بالکل ایسا ہی ہے جیسے پہیلی یا مُعمّے کا بیان ہوتا ہے۔ جب تک اُن کی تشریح نہ کی جائے اور اُن کا حل نہ بتایا جائے اُن کا مطلب ہر ایک کی سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ اس لئے پہلے اس سے کہ آنحضرت کی بشارتیں بیان کریں اُنھوں نے اوّل بطور مثال کے عہد عتیق کی وہ بشارتیں لکھی ہیں جن کو حواریوں نے حضرت عیسیٰ کے حق میں بتایا ہے تاکہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ بائیبل میں پیشین گوئی کس طریقہ سے بیان

---

[1] ان میں سے اکثر بشارتیں سر سید سے پہلے ہمارے زمانہ کے بعض علمانے مسلمہ مجموعہ بائیبل سے بحوالۂ باب اور درس کی نقل کی ہیں مگر جس عمدگی کے ساتھ خطبات میں اُن کا بیان ہوا ہے ویسا کسی نے بیان نہیں کیا۔

کی جاتی ہی اور نیز حضرت عیسیٰ اور آنحضرت صلعم کی بشارتوں کے مقابلہ کرنے سے ظاہر ہو جائے کہ کون سی بشارتیں زیادہ روشن اور صاف ہیں اور کونسی مبہم اور دُھندلی۔

اس کے بعد اُنھوں نے چھ بشارتیں عہدعتیق سے اور تین بشارتیں عہدجدید سے آنحضرت صلعم کی نسبت بیان کی ہیں۔ ازانجملہ عہدعتیق کی تین بشارتیں جن میں سے ایک توریت کتاب استثنا باب (۱۸) میں اور دوسری کتاب استثنا باب (۳۳) و کتاب حبقوق نبی باب (۳) میں اور تیسری کتاب تسبیحات سلیمان باب (۵) میں مندرج ہے۔ اور انجیل یوحنا باب (۱۴) میں سے ایک بشارت یہ چار بشارتیں نہایت معرکۃ الآرا ہیں جن کی یہودیوں اور عیسائیوں کو عجیب عجیب تاویلیں کرنی پڑی ہیں اور عیسائیوں نے اُن کے ترجموں میں عجیب عجیب کارستانیاں کی ہیں۔ سرسید نے ان چاروں بشارتوں کی جیسے کہ چاہیئے اُس سے بھی کچھ بڑھکر تحقیقات کی بڑے بڑے عیسائی محققوں کے اقوال اور بائبل کے حوالوں سے اپنے استدلالات کو تقویت دی ہی اور اپنے بیان کو فی الواقع اُس حد تک پہنچا دیا ہی کہ کسی عیسائی کو باوجود ماننے عیسیٰ مسیح کی پیشین گوئیوں کے آنحضرت کی پیشین گوئیوں سے انکار کرنے کا محل باقی نہیں رہا۔

گیارھواں خطبہ گیارھویں خطبہ میں معراج اور شق صدر کی حقیقت محققانہ طور سے بیان کی ہی اور اس باب میں جس قدر مختلف اور متناقض روایتیں حدیث کی کتابوں میں آئی ہیں اُن کا اختلاف اور تناقض دکھایا ہے اور اس لئے جس قدر کہ قرآن مجید میں معراج کی نسبت بیان ہوا ہی صرف اُسی پر معراج کے واقعہ کا انحصار رکھا ہی اور معراج کو رویا پر محمول کیا ہی جس کا ایک جزو شق صدر بھی تھا اور عیسائیوں کی طعن کا جواب الزامی اور تحقیقی دونوں طرح کا دیا ہی۔

مگر یہ دونوں بحثیں یعنی معراج اور شق صدر کی سرسید نے خطبات لکھنے کے بہت بعد اپنی تفسیر میں بہت زیادہ شرح وبسط کے ساتھ بیان کی ہیں جیسی کہ ان سے پہلے شاید کسی نے نہیں بیان کیں اس لئے اُن دونوں بحثوں کو تفسیر میں دیکھنا چاہیئے۔

بارھواں خطبہ بارھویں خطبہ میں آنحضرت صلعم کی ولادت سے بارہ برس کی عمر تک کا حال جس قدر کہ معتبر اور صحیح روایتوں سے ثابت ہوتا ہی بیان کیا ہی اور جو بے شمار رطب ویابس روایتیں اہل سیر نے اپنی کتابوں میں بھر دی ہیں اور جن کی رُو سے سر ولیم میور نے اپنی کتاب میں جابجا تعرض کی ہیں اُن کی تضعیف کی ہی اور اکثر جگہ برتقدیر اُن کی صحت کے نہایت لطیف جواب سر ولیم میور کی تحریرات کے دیئے ہیں۔ مثلاً سر ولیم میور نے جو بارہ برس تک کے بعض واقعات تعریضاً

بیان کئے ہیں۔ جیسے چھوٹی چھوٹی لڑکیوں کے ساتھ آنحضرت کا کھیل کود میں مصروف رہنا، اپنے مکان کی چھت پر بیٹھے ہوئے پرندوں کو اُڑا دینا، اپنی رضاعی بہن کی پیٹھ میں کاٹ کھانا، مدینہ سے حدیبیہ کو جاتے وقت اپنی ماں کی قبر پہ رونا۔ اس پر سرسید لکھتے ہیں کہ "اگرچہ ان باتوں کی کوئی معتبر سند نہیں ہے لیکن اگر یہ سب باتیں تسلیم بھی کرلی جائیں تو یہ ایسی باتیں ہیں جو ایام طفولیت میں انسانی فطرت کے موافق ہمیشہ ہوا کرتی ہیں۔ آنحضرت صلعم نہ خدا تھے اور نہ خدا کے بیٹے انھوں نے آپ کو صرف یہ کہا تھا کہ "اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحٰى اِلَيَّ" پس ایسی باتیں اگر ہوئیں بھی تو انسانی فطرت سے زیادہ اور کچھ نہیں ہو سکتیں"

یا مثلاً سر ولیم میور بارہ برس کی عمر میں آنحضرت کے سفر شام کا حال ابوطالب کے ہمراہ بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ "زمانہ سابق کے منہدم اور اُجڑے ہوئے مقاموں نے جن کو خیالی قصوں اور عجیب وغریب بیانوں اور تعجب انگیز روایتوں نے اور بھی پر اثر کر دیا تھا اور گرجاؤں کی صلیبوں اور مورتوں اور دینی علامتوں سے آراستہ ہونے اور گھنٹوں کے بجنے کی قوی رسموں نے محمد (صلعم) کے خوض کنندہ دل و دماغ پر ایک گہرا نقش اور پائیدار اثر کر دیا تھا"

سرسید اوّل تو سفر شام میں چچا کے ساتھ آنحضرت کے جانے کی روایت کو صحیح تسلیم نہیں کرتے اور اس کے بعد بر تقدیر تسلیم لکھتے ہیں کہ "ہم نہایت ادب سے سر ولیم میور سے پوچھتے ہیں کہ کیا ایک مصروع شخص (جیسا کہ سر ولیم میور نے آنحضرت کی نسبت لکھا ہے) کا دل و دماغ ایسا اثر قبول کر سکتا ہے؟ اور کیا ایک مصروع شخص خوض کنندہ دل و دماغ رکھتا ہے؟ اگرچہ یہ بیان سر ولیم میور کا نہایت دلچسپ ہے مگر افسوس ہے کہ ہم اس بیان سے اتفاق نہیں کر سکتے؛ کیونکہ اسی لڑکے نے جس کا دماغ صلیبوں اور مورتوں اور علامات دین عیسوی سے اس قدر اثر پذیر ہوا تھا بعد کو انھیں چیزوں سے مخالفت اختیار کی، صلیب کو توڑا، مورتوں کو پھوڑا، اُن کی پرستش سے منع کیا اور بتایا کہ خدا کا کوئی بیٹا نہیں، تثلیث کے عقیدہ کو جھٹلایا، خدا کو وحدہٗ لا شریک بتلایا اور اسی کی عبادت کا وعظ کیا اور تمام دُنیا میں اسی کو رواج دیا"

"لیکن اس بات کو تسلیم کرکے کہ درحقیقت مذکورۂ بالا چیزوں نے اس لڑکے کے دل پر اثر کیا تھا ایک اور خیال خود بخود دل میں آتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ ایسا لڑکا۔ جس کے ابتدائی چار برس ایک صحرا میں کٹے تھے اور پھر آٹھ برس تک مُشرک اور بُت پرست لوگوں میں گھر رہا۔ صرف بارہ برس کی عمر میں ایک ایسا دل رکھتا تھا کہ ہر چیز سے۔ جو اُس کی نظر سے گزرتی تھی، پُرانی منہدم عمارتوں کے آثار سے گرجاؤں کا

صلیبوں، مورتوں اور علامات دین عیسوی کے دیکھنے سے۔ ایک گہرا اثر قبول کرنے کے قابل تھا اور اس قدر عقل و فہم و ذکا سے آراستہ تھا کہ اِن چیزوں سے اُن کے برخلاف ایسے کامل نتائج اور معبود غیر ظاہر اور بقائے رُوح انسانی کے بارہ میں ایسے ایسے عالی خیالات مستنبط کر سکا وہ بلاشبہ مادر زاد پیغمبر برحق تھا جس کی فطرت خود اس کی مُعلّم تھی اور وہ وہی تھا جس کی نسبت خود حضرت عیسٰی نے یہ کہکر بشارت دی ہے کہ "سچ تو یہ ہے کہ میرا چلا جانا تمہارے لئے ضرور ہے کیوں کہ اگر میں نجاؤں تو فارقلیط یعنی احمدؐ مجتبیٰ تمہارے پاس نہیں آوے گا اور اگر میں چلا جاؤں تو اُس کو تمہارے پاس بھیجدوں گا۔"

اس خطبہ میں بمقابلہ سر ولیم میور کی تعریضات کے اور بہت سے لطیف مباحث ہیں جن کو خطبات احمدیہ میں دیکھنا چاہیئے۔

یہ جو کچھ ہم نے خطبات احمدیہ میں سے ناظرین کے سامنے پیش کیا ہی اس کو ایک بہت بڑے حوض یا تالات میں سے چلّو دو چلّو پانی سمجھنا چاہیئے۔ اس کتاب کی خوبی اور جو کچھ کہ اس میں لکھا گیا ہی اُس کی حقیقت جب تک کہ اصل کتاب کو نہ دیکھا جائے ہرگز معلوم نہیں ہوسکتی خصوصاً اُردو خطبات جو سر سید نے ولایت سے آکر بہت مدت کے بعد لکھی ہے اور جس میں بہ نسبت انگریزی ترجمہ کے ہر ایک بات زیادہ وسعت کے ساتھ لکھی ہے اُس سے مصنّف کی محنت۔ لیاقت اور اسلام کی محبت کا اچھی طرح اندازہ ہوتا ہے۔ مگر افسوس ہی کہ یہ کتاب زیادہ تر مالی مشکلات کے سبب سر سید کے ارادہ کے موافق پوری نہ ہوسکی۔ اُن کا ارادہ سر ولیم میور کی چاروں جلدوں کا جواب لکھنے کا تھا جس میں سے صرف ایک جلد لکھنے پائے تھے کہ ولایت میں ٹھہرنا ناممکن ہوگیا اور ہندوستان میں پہنچکر کچھ تو اس وجہ سے کہ یہاں آکر وہ کالج کی فکر میں مصروف ہوگئے اور زیادہ تر اس سبب سے کہ جو کتابیں لندن میں بآسانی میسر آسکتی تھیں اُن کا ہندوستان میں کہیں وجود نہ تھا۔ وہ ارادہ پورا نہو سکا۔ مگر جو مباحث سر ولیم میور کی کتاب میں زیادہ اہم تھے اُن میں سے چند کے سوا سب کا تفصیلی یا اجمالی جواب اسی ایک جلد میں آگیا ہی کیوں کہ جس اصول پر سر ولیم میور نے اپنے تمام اعتراضات کی بنیاد قایم کی ہی خطبات احمدیہ میں اُس کی جڑ کاٹ دی گئی ہی اور نہایت واضح طور پر جتایا گیا کہ اسلام پر مخالفین کا کوئی اعتراض اس وقت تک وارد نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ قرآن یا اُن حدیثوں کی سند پر۔ جو اصول علم حدیث کے موافق واجب التسلیم قرار پائیں۔ مبنی نہو۔ اور اس قاعدہ سے وہ اعتراضات یکقلم ساقط ہوجاتے ہیں جو عام تاریخ و سیر کی کتابوں یا اجتہاد فقہا یا اقوال عُلما

و آرائے مفسرین کی رُو سے مذہب اسلام پر ایراد کئے جاتے ہیں۔

جس وقت سرسید نے خطبات احمدیہ لکھی ہی اُس وقت تک مذہبی تحقیقات کے متعلق اُن میں وہ آزادی پیدا نہیں ہوئی تھی جیسی تفسیر القرآن میں دیکھی جاتی ہی اور اس لئے خطبات احمدیہ میں کوئی بات ایسی نہیں پائی جاتی جس کو اسلام کے اصول متعارفہ کے خلاف سمجھا جائے۔ البتہ دو ایک جگہ کسی قدر انھوں نے جمہور کے خلاف لکھا ہی جیسا کہ علمائے محققین نے صدہا مسائل میں جمہور سے اختلاف کیا ہے۔ مثلاً معراج کے مضمون کو، جیسا کہ بعض صحابہ کا مذہب ہی۔ رویا پر محمول کیا ہی۔ اور شق صدر اور بُراق کی سواری کو اسی رویا میں داخل کیا ہے یا اور ایک آدھ بات اسی قبیل کی جمہور کے خلاف بیان کی ہی۔ لیکن اس سے اصول اسلام کی مخالفت لازم نہیں آتی۔ تعجب ہی کہ سر ولیم میور نے جیسا کہ سرسید کی زبانی سنا گیا ہی۔ جس وقت خطبات احمدیہ کو پہلی مرتبہ دیکھا تو یہ کہا کہ "ہیں نے سید احمد کے اسلام پر اعتراض نہیں کئے بلکہ اُس اسلام پر اعتراض کئے ہیں جس کو تمام دنیا کے مسلمان مانتے چلے آئے ہیں" یہ بعینہٖ ایسی ہی بات ہی کہ ایک تیرانداز کسی گروہ کو نہتا سمجھکر اُس پر تیر برسانے شروع کرے اور جب اُدھر سے بھی خلاف توقع تیر آنے لگیں تو یہ کہے کہ میرا مقابلہ نہتوں سے ہی تیراندازوں سے نہیں ہی۔ سر ولیم میور نے جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہی ایک نئے طریقہ سے نکتہ چینی کی تھی اور چوں کہ مسلمانوں نے اس قسم کے اعتراض پہلے عیسائیوں سے بہت کم سنے تھے۔ اس لئے سر ولیم میور کو یقین تھا کہ کوئی مسلمان میرے اعتراضوں کا جواب نہیں دے سکے گا مگر جب اُنھوں نے دیکھا کہ جس قسم کے آلات اُنھوں نے اسلام کے برخلاف استعمال کئے تھے اُسی قسم کے آلات اسلام کی حمایت میں ایسے طور پر استعمال کئے گئے ہیں جس کی اُن کو بالکل توقع نہ تھی تو مذکورہ بالا الفاظ اُن کی زبان سے نکلے جن کے یہ معنی ہیں کہ میں نے تو اسلام کو نہتا سمجھکر اس پر حملہ کیا تھا۔

انگلستان کے اخبار "انکوائرر" مورخہ ۱۱ رمئی ۱۸۷۲ء میں۔ جب کہ سرسید کو ولایت سے ہندوستان میں آئے ہوئے دو برس گزر چکے تھے۔ کسی آزاد خیال انگریز نے خطبات احمدیہ پر ایک ایک مفصل ریویو چھپوایا تھا۔ اُس کے چند دلچسپ فقرے ہم اس مقام پر نقل کرتے ہیں۔

وہ لکھتا ہی کہ "ہمیں اس کتاب کے مضامین کو خوشی سے لینا چاہیئے کیوں کہ وہ مسلمانوں کی طرف سے کم از کم پہلے پھل ہیں اُس مبادلۂ خیالات اور فیلنگز کے جو مشرق اور مغرب میں اُن مختلف مذاہب کے ماننے والوں میں جو باوجود اختلاف کے ایک نوع کا اتحاد بھی رکھتے ہیں، ہوتا چلا ہی گو ہم پہلے ہی سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ خیالات کا مبادلہ زمانہ آیندہ میں کہاں تک جاری رہیگا یا اس سے کیا کیا نتیجے پیدا ہوں گے۔ لیکن بہرحال ہم سید احمد کو، جو اپنے

ملک میں فاہ عام کے سرگرم کارگزار اور اپنے مذہب کی اُڑکر حمایت کرنے والے ہیں۔ وہ کلام کرتے ہیں کہ انھوں نے اپنی مذہبی تحریریں ہمارے سامنے پیش کی ہیں۔ مسلمانوں کو بلاشبہ اس بات کا حق ہے کہ انجیل کی تفسیر[1] کے متعلق جو کچھ وہ کہیں اُس کی سماعت کیجائے۔ بخصوصاً اس وجہ سے کہ شاید وہ روایات کے نئے ذریعے ہم پر ظاہر کریں۔ سامنےک مذہب کا فرض ہے کہ وہ کسی شہادت کے سننے سے جو اُس کو مل سکے انکار نہ کرے۔ مگر مصنف کو اس سے زیادہ ہم سے توقع رکھنی نہیں چاہیئے کہ ہم اُس کے خیالات سے ایک حد تک اتفاق کریں گے۔"

اس سے آگے چل کر وہ لکھتا ہے کہ "محمدؐ (صلعم) جیسے شخص کے کیرکٹر معلوم کرنے کے لئے ایک ایسی سائیکولوجی کا دشوار اور دقیق مسئلہ حل کرنا پڑتا ہے جو تاریخ کے ذریعہ سے منکشف ہوئی ہے۔ میور، اور اسپرنگر نے زمانۂ حال کی نکتہ چینی کا طریقہ۔ جس کو دیندار عیسائی (اپنے مذہب کی نسبت) ناپسند کرتے ہیں اسلام کی اصل اور اُس کی ترقی کے حالات دریافت کرنے میں برتا ہے، اور بارتھلمی سینٹ ہلیر نے ہمارے سامنے ایک مفصل تاریخی تصور پیش کی ہے۔ عام طور پر یہ ظاہر کرسکتے ہیں کہ ہم نے محمدؐ (صلعم) کی تعریف اور عزت دل میں رکھنی سیکھ لی ہے، لیکن ہم میں ایسے کم ہیں جو کبھی قرآن کو پڑھتے ہوں۔ یہاں تک کہ سیل نے جو ابتدائی بحث اس کتاب (یعنی قرآن) کی نسبت کی ہے اُس کو بھی نہیں پڑھتے، اور اُن سے بھی کم وہ لوگ ہیں جو اسلام کو کیا بلحاظ ملکی اور کیا بلحاظ مذہبی قوت کے ایک ایسی زندہ طاقت سمجھتے ہوئے ہیں جو اپنی موجودہ یا کسی تبدیل شدہ حالت میں آنے والی صدیوں میں حکمران طاقتوں میں سے ایک طاقت شمار ہوگی۔"

سرسید نے جس خطبہ میں آنحضرت (صلعم) کی نسبت بائبل کی پیشین گوئیاں بیان کیں ہیں اُس کے متعلق فاران اور فارقلیط کی پیشین گوئی کا ذکر کرکے لکھتا ہے کہ "سید احمد بار بار اس بات پر اطمینان ظاہر کرتے ہیں کہ اُن کے دلائل اسی درجہ کے ہیں جیسے کہ عیسائی عموماً استعمال کرتے ہیں + + + + اگر وہ ہم کو اپنے دلائل کا یقین دلانا چاہتے ہیں تو ان کو چاہیئے کہ عیسائیوں کی طرح صرف عمدہ ہی نہیں بلکہ عمدہ[2] ترین دلیلیں ہمارے سامنے پیش کریں۔ انھوں نے اپنے دو دشمنوں کو ایک کر دیا ہے۔ وہ خیال کرتے ہیں کہ عیسائی مذہب ہی اُن پر حملہ کر رہا ہے حالاں کہ اُس کے ساتھ ہی آج کل کی نکتہ چینی کا طریقہ اُن کے مذہب کے ساتھ بھی ویسا ہی برتاؤ کر رہا ہے جیسا کہ وہ اور مذہبوں کے ساتھ جن میں کرید کرنی اُسکو منظور ہوتی ہے کرتا ہے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ

---

[1] یہ اشارہ ہے خطبات احمدیہ کے اُن بیانات کی طرف جہاں سرسید نے کہیں عیسائی مفسرین کی سند سے اور کہیں اور دلائل سے انجیل کے معنی جمہور عیسائیوں کے برخلاف بیان کئے ہیں ۱۲

[2] چوں کہ ریویو نگار ایک آزاد خیال آدمی ہے اس لئے وہ جس طرح عیسائیوں کی پیشین گوئیوں کو تسلیم نہیں کرتا اسی طرح مسلمانوں کی پیشین گوئیوں کو نہیں مانتا اور اثبات نبوت کے لئے ایسی دلیلوں کو کافی نہیں سمجھتا ۱۲

سید احمد، میور اور اسپرنگر جیسے لوگوں کے مقابلہ میں اپنی جگہ پر قایم رہنا بخوبی جانتے ہیں۔"

اس کے بعد چوتھے خطبہ کے اُس مدلل بیان پر جو سرسید نے تعدادِ ازواج کی بحث میں لکھا ہے لکھتا ہی کہ "فی الواقع یہ مضمون مصنف کو بہت عزت دیتا ہی کہ وہ یہ بات ثابت کرنے کے لئے کہ پولیگمی (یعنی تعدادِ ازواج) مضر نہیں ہے۔ اپنے اونٹ کو سوئی کے ناکے سے نکال لے گیا ہی؛ گو اُس نے اس کی جرأت نہیں کی کہ اُس کو حقیقی فوائد میں سے شمار کرتا۔ بہرحال ایسے مضمون پر اگر ہم کو سید احمد سے اتفاق بھی ہو تو ہم اُس کو ظاہر نہ کریں گے کیوں کہ ہم کو اس موقع پر ایک خوشگوار سکوت[1] ہی کو ترجیح دینی چاہیئے۔" پھر اسی خطبہ کے متعلق اُس بیان پر جس میں سرسید نے ثابت کیا ہی کہ اسلام عیسائیوں کے لئے رحمت تھا لکھتا ہی کہ "ہم دیکھتے ہیں کہ ہیات اور طب یہ دونوں علم اور پروٹسٹنٹ اور یونانی بیٹرن یہ دونوں مذہب اُن فوائد میں سے ہیں جو اسلام نے کرسچینٹی (یعنی عیسائی مذہب) کو عطا کئے ہیں۔ ہم اُمید کرتے ہیں کہ عیسائی قومیں کافی طور پر شکر گزار ہونگی ان فوائد سے ہر ایک فائدہ کے لئے اور سب فائدوں کے لئے۔ لیکن سچ یہ ہی کہ یہ فوائد مشکل سے کافی بیان ہیں اُس زبردست تحریک کا جو یورپ میں اندلس کے مسلمانوں سے پیدا ہوئی اور جو فنِ تعمیر، شاعری، معاشرت اور آداب سب پر حاوی ہے۔"

اس کے بعد نویں خطبہ کے متعلق جس میں آنحضرت صلعم کا نسب بیان کیا گیا ہے اوّل سرسید کا یہ قول نقل کرتا ہی کہ "عدنان تک۔ جو کہ پیغمبرِ خدا صلعم کے نسب نامہ میں اکتالیسواں ہے۔ مطلقاً عربی روایات سے لیا گیا ہی اور عدنان سے اوپر یہود کی تاریخ سے لیا گیا ہی۔ ہم کو بہت تعجب ہوتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے عیسائی مصنفوں نے اپنا وقت ضائع کیا اور بے فائدہ دماغ صرف کیا اس بے فائدہ تلاش میں کہ اسلام اور یہودی مذہب میں تعلق ہی حالاں کہ کسی مسلمان نے اس سے انکار کرنے کا خیال تک نہیں کیا عیسائیوں کو جب یہ معلوم ہوا تو اُنھوں نے طنز کے ساتھ ہم کو الزام لگایا کہ تم نے یہ چیز یہودیوں سے لی اور وہ چیز اُن کے ہاں سے چرائی۔ گویا اسلام کوئی بنیاد نہیں رکھتا جس پر وہ قایم ہو بلکہ بالکل عیسوی اور یہودی دین پر منحصر ہے۔ ہم مسلمانوں کو دونوں الہامی مذہبوں سے انکار کرنا تو کیا ہم تو اپنی سب سے بڑی عزت سمجھتے ہیں کہ "ہم سچے اور ایماندار پیرو ہیں ہر ایک سچے اور خدا کے بھیجے ہوئے پیغمبر کے"

اس پر ریویو نگار لکھتا ہی کہ "اخیر کے جملہ کو ہم نے ممتاز حرفوں میں لکھا ہی کیوں کہ وہ توجہ کے قابل ہی اور اس قابل ہی کہ یاد رکھا جائے۔ ہم کو یقین ہی کہ اس جملہ کے الفاظ ایسے ہیں جو کم سے کم اسلام کی اصولی

---

[1] اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سوسائٹی کے خوف سے اپنا عندیہ ظاہر کرنا نہیں چاہتا ورنہ سرسید کے استدلال کو وہ دل میں مان گیا ہی ۱۲

تعلیم پر مبنی ہیں اور اس میں تو شک ہی نہیں کہ مصنف کے نزدیک مسلم ہیں۔ یہ الفاظ ہم کو ایک شریف قول معلوم ہوتے ہیں اور ایسے ہیں جو بالکل تسلیم کیے جانے کے قابل ہیں۔ ان پر فی الحقیقت کیتھولسٹی[۱] کے سچے اصول کی مہر ہے۔ فی الواقع اگر کوئی جامع اصول مختلف مذہبوں میں مصالحت پیدا کر سکتا ہے تو وہ صرف یہی اصول ہوگا۔ شاید ہم سید احمد کو بغیر ناراض کیے یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ کلی یا عربی کیتھولک ہے بہر حال اُنھوں نے لٹریچر کا مرد میدان ہونے کا حق بخوبی ثابت کر دیا ہے + + + اور اُن کے مضامین کو وہ لوگ توجہ سے پڑھیں گے جن کو اس سبجکٹ میں دلچسپی حاصل ہو چکی ہے اور جو اس میں زیادہ معلومات حاصل کرنے کی تلاش میں ہیں۔"

جان ڈیون پورٹ کی کتاب کا چھپوانا

لندن ہی میں سرسید نے جان ڈیون پورٹ کی کتاب "اپالوجی فور محمد اینڈ قرآن" کو جو اُنھوں نے عیسائیوں کے برخلاف اسلام کی حمایت میں لکھی تھی خود اپنے روپیہ سے چھپوایا۔ سرسید کے خطوں سے جو سید مہدی علی خاں کے نام ہیں معلوم ہوتا ہے کہ لندن کا کوئی پبلشر اس کتاب کے چھاپنے کی ہامی نہیں بھرتا تھا اور خود مصنف کو اس قدر استطاعت نہ تھی کہ اپنے روپیہ سے اُس کو چھپوا کر شائع کر دیتے۔ سرسید نے وہاں پہنچکر جب اس کتاب کے مضامین سُنے تو اُنھوں نے فوراً اپنے پاس سے روپیہ کی تدبیر کر کے وہ کتاب جھٹ پٹ چھپوا دی اور اُس کی کئی سو جلدیں ہندوستان بھجوا دیں۔ یہاں اُس کا ایک اُردو ترجمہ مولوی عنایت الرحمٰن خاں صاحب دہلوی نے اور دوسرا مولوی ابوالحسن نے کیا اور دونوں ترجمے چھپکر شائع ہو گئے۔

گاڈفری ہیگنز کی کتاب کا ترجمہ کرانا

انگلستان کے ایک اور ذی وقعت مصنف گاڈفری ہیگنز کی کتاب جو کسی زمانہ میں مصنف مذکور نے اسلام کی تائید میں لکھی تھی اور اب نایاب ہو گئی تھی ایک جرمن کتاب فروش کی مشہور دوکان سے جہاں ہر زبان کی پُرانی اور نایاب کتابیں بکتی ہیں۔ سرسید نے دس گنی قیمت پر لندن میں خریدی اصل مطلب اس کے خریدنے سے یہ تھا کہ خطبات احمدیہ کی تصنیف میں اُس سے مدد لیجائے مگر اُنھوں نے ہندوستان میں آکر اُن لوگوں کے لیے[۲] جن کو مشنریوں سے مذہبی گفتگو کرنے کا اتفاق ہوتا ہے۔ پانسو روپیہ خرچ کر کے اُس کا اُردو ترجمہ بھی جو حمایت الاسلام کے نام سے مشہور ہے شائع کرا دیا۔

رسالہ ابطال غلامی

ابطال غلامی کا مضمون اگرچہ بقدر ضرورت خطبات احمدیہ میں لکھا جا چکا تھا مگر

۱؎ کیتھولسٹی ایک لفظ مشترک بہت سے معنوں میں آتا ہے جن میں سے ایک معنی مذہبی فراخ حوصلگی یا بے تعصبی اور ناطرفداری کے ہیں ۲؎ یہ ترجمہ مشہور عالم مولوی محمد احسن مرحوم پروفیسر بریلی کالج نے کیا تھا۔ ۱۲

ولایت سے آنے کے بعد سرسید نے اس مضمون پر ایک مستقل رسالہ لکھکر اوّل تہذیب الاخلاق کے متعدد پرچوں میں شائع کیا اور پھر اُس کو علیحدہ کتاب کی شکل میں چھپوایا۔ ہمارے علما۔ جنھوں نے اُن اعتراضوں اور طعنوں سے کان بند کر لئے ہیں جو یورپ کی قومی اسلام اور اہلِ اسلام پر کرتی ہیں اُن کو تو آج تک یہ بھی احساس نہیں کہ بردہ فروشی کا دستور جو عرب اور افریقہ میں جاری ہے اُس میں کیا بُرائی ہے اور وہ اصول اسلام کے موافق صحیح ہے یا نہیں؟ اُن کے نزدیک حمیتِ اسلامی اسی کا نام ہے کہ جو شخص اسلام پر اعتراض کرے اگر قدرت ہو تو اُس کا مُنہ بند کر دیں ورنہ اپنے کانوں میں اُنگلیاں دے لیں۔ مگر جو لوگ اس قسم کے مطاعن کتابوں اور اخباروں میں دن رات دیکھتے اور پڑھتے ہیں اور جن کو معلوم ہے کہ یہ مطاعن مسلمانوں کی نئی پود پر جو دنیا کے حالات سے روز بروز زیادہ باخبر ہوتی جاتی ہے۔ کیا اثر کرتے ہیں۔ وہ خوب سمجھتے ہیں کہ اگر معترضین کی غلط فہمیوں کو اس وقت رفع نہ کیا جائے تو ہماری نسلیں۔ جو ہمارے بعد اسلام کی وارث ہونے والی ہیں۔ وہ اسلام کو کس نگاہ سے دیکھیں گی اور تمام عیسائی قوموں میں اور خاص کر انگریزوں کی قوم میں۔ جو ہندوستان کے مسلمانوں پر حکمراں ہیں مذہبِ اسلام کس نظر سے دیکھا جائیگا۔

انھیں مطاعن میں سے ایک طعن جواز استرقاق یعنی لونڈی غلام بنانے کا ہے جو عیسائی قومیں مذہبِ اسلام پر اس لئے کرتی ہیں کہ نصف صدی سے مسلمانوں کے سوا اور کسی قوم میں یہ دستور باقی نہیں رہا۔ اگرچہ اٹھارھویں صدی تک جو غلاموں کی حالتِ زار یورپ اور امریکہ میں تھی اُس بے رحمی اور سنگدلی کی سنین اسلام میں کہیں نظر نہیں پائی جاتی چنانچہ فرانس کے مشہور محقق ڈاکٹر لی بان نے۔ جیسا کہ احمد شفیق بک نے اپنے رسالہ میں نقل کیا ہے اپنی کتاب تمدنِ عرب میں اُن بیرحمیوں کا بیان کرنے کے بعد۔ جو عیسائی قومیں غلاموں پر کرتی تھیں صاف اقرار کیا ہے کہ "حق بات یہ ہے کہ مسلمانوں کی غلامی بالکل اُس غلامی کے برعکس ہے جو عیسائیوں میں جاری تھی۔ لیکن اسی بیرحمی کا آخر کار یہ نتیجہ ہوا کہ نیکدل لوگوں کو غلاموں کی حالت پر رحم آیا اور وہ اُن کی حمایت کے لئے کھڑے ہو گئے یہاں تک کہ غلامی کا نام و نشان تک یورپ اور امریکا سے مٹا دیا گیا"

پس اس سے زیادہ اور کیا افسوس کی بات ہو سکتی ہے کہ جو قومیں غلاموں پر ایسی بیرحم تھیں اور جن کے مذہب میں کوئی خاص رعایت غلاموں کے ساتھ نہیں کی گئی وہ تو تمام دُنیا میں غلامی اور بردہ فروشی کا انسداد کرتی پھرتی ہیں اور مسلمان جن کے مذہب نے تمام دنیا کے

مذاہب سے بڑھکر غلاموں کی حمایت کی اور اگر سچ پوچھیے تو غلامی کو بالکل معدوم کر دیا وہی تمام دنیا میں بردہ فروشی کے ناجائز وناشایستہ رواج میں سب سے زیادہ بدنام ہیں اور انھیں کے مذہب پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ نوع انسان کا دشمن اور ظلم و بیرحمی کا سرچشمہ ہے۔

سرسید اپنے ایک آرٹیکل میں۔ جو رسالۂ ابطال غلامی کے علاوہ اُنھوں نے اسی مضمون پر لکھا ہے لکھتے ہیں کہ "ولیم ہور ورسل صاحب جو نہایت نامی گرامی ہیں۔ اپنے روزنامچہ میں اسمٰعیل پاشا خدیو مصر کی بڑی تعریف کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ "اُس نے اس نیکی کے حاصل کرنے اور رسم بد کے موقوف کرنے میں بڑی کوشش کی ہے اور کسی قدر کامیاب بھی ہوا ہے"۔

اس کے بعد سرسید کہتے ہیں کہ "اگرچہ مسٹر رسل کی کتاب پڑھکر ہمارا دل خوش ہوا مگر جس لفظ نے ہمارے دل کو رنجیدہ کیا اُس کا بیان کرنا بھی ضرور ہے اور وہ یہ ہے کہ جہاں اُنھوں نے اسمٰعیل پاشا کے اس نیک کام کی تعریف کی ہے وہاں یہ بھی لکھا ہے کہ اُس نے برخلاف اپنے مذہب و ایمان کے یہ نیک کام کیا ہے اس تحریر پر ہم کچھ مسٹر رسل سے ناراض نہیں ہوئے اُنھوں نے ٹھیک لکھا ہے مگر اُن کا فر مسلمانوں سے ناراض ہوئے جنھوں نے اپنے افعال ناشایستہ کو ایسے طور پر رواج دیا ہے جس کے سبب غیر قومیں اُن افعال کو مذہبی اور ایمانی افعال سمجھتی ہیں اور مذہب اسلام کو حقارت سے دیکھتی ہیں اور سمجھتی ہیں کہ تہذیب اور شایستگی اور انسانیت مذہب اسلام کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتی"۔

اگرچہ مسلمان سلطنتوں میں سلطان عبدالمجید خاں اور اسمٰعیل پاشا خدیو مصر کے وقت سے بردہ فروشی کا انسداد محض بطور مصلحت ملکی کے ہونے لگا مگر ۱۸۸۸ء تک وہاں بھی کسی مسلمان عالم کو یہ خیال نہیں آیا کہ عیسائی۔ جو بردہ فروشی کے نالایق طریقہ کو دین اسلام کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ اس غلط فہمی کو رفع کیا جائے۔ حالاں کہ ٹرکی۔ مصر اور افریقہ کے دیگر ممالک اسلامیہ کے علما کا سب سے مقدم فرض تھا کہ وہ اسلام پر سے اس الزام کو رفع کرتے کیوں کہ دنیا میں کوئی مرکز بردہ فروشی کا اب وسط افریقہ کے سوا باقی نہیں رہا تھا جہاں ایک مدت سے سلاطین یوروپ انسداد بردہ فروشی کی تدبیروں میں معروف ہیں اور عیسائی مشنری تمام یوروپ اور افریقہ میں منادی کرتے پھرتے ہیں کہ مظلوم حبشیوں کو اسلام کے پنجۂ ظلم سے نکالو۔

بارے ۱۸۸۸ء میں یعنی سرسید کی تصنیف سے اُنیس برس بعد۔ مصر کے ایک روشن ضمیر فاضل احمد شفیق بک کو جس نے فرانس میں تعلیم پائی ہے۔ یہ خیال اُس وقت پیدا ہوا جب کہ کارڈنل لاویجری پیرس کے ایک چرچ میں نہایت جوش و خروش کے ساتھ بردہ فروشی

کے مظالم پہ لکچر دے رہا تھا اور اُس کا الزام صرف مسلمانوں ہی کے اعمال و افعال پر نہیں بلکہ مذہبِ اسلام پر لگاتا تھا کہ وہ علانیہ اس رسم بد کی تعلیم دیتا ہے۔ اس کے بعد احمد شفیق بک نے دیکھا کہ وہ لکچر یوروپ میں عام طور پر شائع ہو گیا اس لئے انھوں نے ایک رسالہ فرانسیسی زبان میں لکھا جس کا ترجمہ احمد ذکی آفندی نے عربی میں کیا ہے۔

اس رسالہ کی جس قدر شہرت اور وقعت یورپ کی عیسائی قوموں میں اور مصر و ٹرکی کے مسلمانوں میں ہوئی ہے اُس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ مضمون جس کو اب سے اُنتیس برس پہلے سرسید لکھ چکے تھے اور جس کا صلہ ان کو یہ ملا تھا کہ بجائے عیسائیوں کے خود مسلمانوں نے اُس کے رد لکھے۔ کس قدر ضروری تھا۔ مصر کے اسلامی اخبار المؤید مؤرخہ ۲ ستمبر ۱۸۹۱ء میں اس کی نسبت لکھا گیا تھا کہ "اسلام کی حمایت میں اس سے عمدہ اور افضل کوئی تصنیف نہیں ہوئی، چنانچہ کبرا و فضلائے اہلِ اسلام نے۔ جو ایسے کاموں سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ احمد ذکی آفندی سے نہایت التجا کے ساتھ اس کا ترجمہ فرانسیسی زبان سے عربی میں کرایا۔" اس کے سوا فرانس کے مشہور عالم موسیو میسمبر نے اس رسالہ کو دیکھکر مصنف کو لکھا کہ "تم نے اپنے حریف (یعنی کارڈنل لا فیجری) کو لاجواب کر دیا۔ اور بیشک حق تمہاری جانب ہے۔" اسی طرح فرانس کے آٹھ بڑے بڑے مشاہیر نے رسالہ مذکور کی نہایت تعریف اور اس کے لکھنے پر مبارک باد لکھی خصوصاً موسیو بوکارا انسپکٹر کمپنی نہر سویس نے لکھا کہ "میں نہایت قدر کرتا ہوں تمہارے اس کام کی جو تم نے اپنے مذہب ملک کی حمایت کے لئے کیا ہے اور کیا اچھا ہو اگر فرانس کا ہر فرد اسی طرح اپنے مذہب اور اپنے ملک کی حمایت کے لئے کھڑا ہو۔" رستم پاشا سفیر سلطانی جو اُس وقت لندن میں تھے اُنھوں نے رسالہ مذکور کی رسید میں نہایت شکریہ کے بعد مصنف کو لکھا کہ "اس رسالہ سے نہایت عمدہ نتائج پیدا ہوں گے اور میں ان نسخوں کو نہایت خوشی سے انگریزوں میں اور اُن اخباروں میں جو انگریزوں کی نظر سے گزرتے ہیں تقسیم کروں گا۔" احمد ذکی آفندی مترجم رسالہ مذکور لکھتے ہیں کہ "بہت دن گزرنے نہ پائے تھے کہ یہ مضمون تمام یوروپ میں مشہور ہو گیا، یوروپ کے بڑے بڑے اخباروں میں اُس پر عمدہ عمدہ ریویو لکھے گئے۔ اور بعض اخباروں میں یہ رسالہ بجنسہٖ اوّل سے آخر تک چھاپ دیا گیا۔"

الغرض اسلام کی اس ضروری اور مہتم بالشان خدمت کی نسبت غالباً تمام اسلامی دنیا میں سب سے پہلے سید احمد خاں کو اس بات کا خیال پیدا ہوا کہ غلامی کے باب میں جو فضیلت اور فوقیت مذہبِ اسلام کو تمام دنیا کے مذاہب پر ہے اور جو نیکی اور سلوک و احسان اُس نے لونڈی

غلاموں کے ساتھ کیا ہی اُس کو صاف صاف دنیا پر روشن کریں۔ اُنھوں نے اوّل ۱۸۷۰ء میں جہاں سر ولیم میور کے اور مطاعن واعتراضات کے جواب خطبات احمدیہ میں دیئے ہیں انھیں کے ذیل میں غلامی پر بھی بہت شافی بحث[1] کی ہی۔ جس کے بعد عیسائیوں کے مقابلہ میں کچھ اور لکھنے کی ضرورت باقی نہ تھی مگر چوں کہ اس میں ایک دعویٰ فقہائے اسلام کے خلاف تھا اور جب تک اصول شرع کے موافق اُس پر استدلال نہ کیا جائے وہ مسلمانوں کے سامنے پیش کرنے کے قابل نہ تھا اس لئے اُنھوں نے ۱۸۷۲ء میں ایک مستقل اور مبسوط رسالہ اسلام کی غلامی پر لکھکر تہذیب الاخلاق میں چھپوایا۔ اس رسالہ میں اوّل بطور تمہید کے دلائل عقلیہ غلامی کی بُرائی پر نہایت عمدگی اور صفائی سے بیان کئے ہیں اور پھر لکھا ہی کہ اگر غلامی خدا کی مرضی کے موافق ہو تو اُس کے یہ معنی ہوں گے کہ خدا بندوں کو اپنا شریک گردانا پسند کرتا ہی کیوں کہ حدیث میں آیا ہی کہ کُلُّکُمْ عَبِیْدُ اللّٰہِ وَکُلُّ نِسَائِکُمْ اِمَاءُ اللّٰہِ[2]۔ اور یہ جو کہا جاتا ہی کہ۔ اگر غلام اچھی طرح رحم اور محبت کے ساتھ رکھے جائیں تو کوئی بُرائی نہیں۔ اس کی تردید کی ہی اور کہا ہی کہ غلامی فی نفسہٖ ایک قدرتی گناہ ہے اور ان کو بدسلوکی سے رکھنا دوسرا گناہ ہی اور کوئی چیز قدرتی گناہ سے زیادہ خوفناک نہیں ہی۔

اس کے بعد لکھا ہی کہ "یہودی مذہب نے غلامی کے قانون کو جائز سمجھا اور عیسیٰ مسیح نے اس کی نسبت کچھ نہیں کہا مگر رسول اللہ صلعم نے جو کچھ اُس کی نسبت کہا اُس کو کسی نے نہیں سمجھا"۔ پھر جس جس طریقہ سے زمانۂ جاہلیت میں غلام بنائے جاتے تھے اُس کی تفصیل لکھی ہے اور دکھایا ہے کہ غلامی کی رسم جو اس وقت عرب میں تمام دنیا کی قوموں کی طرح جاری تھی اُس کا دفعتاً موقوف کر دینا صرف مصالح ملکی کے برخلاف ہی نہ تھا۔ بلکہ ایسا کرنا انواع واقسام کے گناہوں کا مورث ہوتا۔ چنانچہ اب بارہ سو برس بعد بھی یورپ کے بڑے بڑے مدبّر جنھوں نے غلامی کے معدوم کرنے میں بڑی انتہا کوششیں کیں وہ بھی اس سے زیادہ کچھ نہ کرسکے کہ آیندہ کی غلامی کو بند کیا اور موجودہ غلاموں کے رفتہ رفتہ آزاد ہو جانے کی تدبیریں کیں مگر اُن کی تدبیروں میں اور بانی اسلام کی تدبیروں میں تہ

---

[1] چوں کہ سرسیّد نے غلامی پر کوئی علٰحدہ مضمون لکھکر انگریزی میں شائع نہیں کیا تھا بلکہ خطبات کے ضمن میں اس کا ذکر کیا تھا اور خطبات کی بہت کم جلدیں انگریزی میں شائع ہوئی تھیں اس لئے اس کی شہرت یورپ میں نہیں ہوئی جیسی احمد شفیق بک کے رسالہ کی ہوئی ۱۲

[2] یعنی تم سب خدا کے غلام ہو اور تمہاری سب عورتیں خدا کی لونڈیاں ہیں ۱۲

فرق تھا کہ اُن کی تدبیریں زیادہ تر مادی چیزوں سے اور بانی اسلام کی تدبیریں زیادہ تر روحانی چیزوں سے علاقہ رکھتی تھیں۔ پس اسلام نے جس طرح شراب خواری کو بتدریج موقوف کیا تھا اسی طرح غلامی کے رفتہ رفتہ مسدود کرنے کی بنیاد ڈالی۔ اوّل طرح طرح سے غلاموں کے آزاد کرنے کی مسلمانوں کو ترغیب دی یہاں تک کہ بردہ آزاد کرنے کو تمام دنیا کی نیکیوں سے افضل بتایا یا بعض گناہوں کے کفارہ میں بردہ آزاد کرنے کا حکم دیا، اور بتایا کہ جو غلام اپنی قیمت اپنی کمائی سے ادا کرنی چاہیں ان سے یہ اقرارنامہ لے کر چھوڑ دو، جن سے اُن کے مالک اس طرح آزاد کرنے کا وعدہ کریں اُن کی خیرات یا چندہ سے مدد کرو، بیت المال ہی سے مکاتب غلاموں کی آزادی کے لئے روپیہ دینا تجویز کیا۔ بعض صورتیں ایسی بتائیں کہ لونڈی غلام بغیر آزاد کرنے مالک کے خودبخود آزاد ہو جائیں اسی طرح اور طرح طرح کی سبیلیں اُن کے آزاد کرنے کی نکالیں۔ ملک کو اُن کے ساتھ رعایتیں کرنے کی نہایت تاکید کی کہ اُن سے زیادہ خدمت نہ لیں، اُنھیں لونڈی غلام کہکر نہ پکاریں۔ اُن کو مثل اپنے کھانا اور کپڑا دیں، اُن کو ان کے رشتہ داروں سے جدا نہ کریں وغیرہ وغیرہ۔

یہاں تک سرسید کا بیان جمہور علمائے اسلام کے مطابق ہے۔ مگر اس کے بعد اُنھوں نے دو دعوے نہایت شدّومد کے ساتھ کئے ہیں جن میں بظاہر وہ متفرد معلوم ہوتے ہیں۔ پہلا دعویٰ ان کا یہ ہے کہ لڑائی کے قیدیوں کو لونڈی غلام بنانے کا کوئی حکم قرآن مجید کی کسی آیت میں یا کسی حدیث صحیح میں نہیں ہے۔ اس کے بعد جن آیتوں یا حدیثوں سے علما نے استرقاق کا حکم استنباط کیا ہے اُن کو نقل کر کے ثابت کیا ہے کہ ان سے استرقاق کا حکم مستنبط نہیں ہوتا اور جو الفاظ قرآن مجید یا احادیث صحیحہ میں ایسے آئے ہیں جن سے آنحضرت صلعم کے زمانہ میں لونڈی غلاموں کا ہونا معلوم ہوتا ہے جیسے ما ملکت ایمانکم فك رقبة، عبد، امه فتیات، وغیرہ اُن کی نسبت وہ یہ کہتے ہیں کہ بیشک جب تک آیہ منّاً و فداءً[1] نازل نہیں ہوئی اُس وقت تک عرب کی قدیم رسم کے مطابق مختلف طریقوں سے (جن کی تفصیل اُنھوں نے لکھی ہے) بنا بر لونڈی غلام بنائے جاتے تھے؛ اور نیز بعد اُترنے آیۂ مذکورہ کے گو آیندہ کے لئے استرقاق کی ممانعت ہو گئی مگر جن کے پاس لونڈی غلام پہلے سے موجود تھے اُن کو آزاد کرنے پر مجبور نہیں کیا گیا کیوں کہ آیہ مذکورہ میں صرف آیندہ کے لئے یہ حکم تھا کہ لڑائی کے قیدیوں کو

---

[1] یعنی سورۂ محمد کی یہ آیت "فاذا لقیتم الذین کفروا فضرب الرقاب حتی اذا اثخنتموهم فشدوا الوثاق فاما منا بعد واما فداء" ۱۲

۲۶ پارہ سورۂ محمد

یا احسان رکھکر چھوڑ دو یا فدیہ لے کر۔ پس قرآن و حدیث کے جن الفاظ سے رقیت کا وجود رسول صلعم کے زمانہ میں معلوم ہوتا ہے وہ اُنھیں لونڈی غلاموں سے متعلق ہیں جو آیہ مذکور کے نازل ہونے سے پہلے مسلمانوں کے پاس موجود تھے۔

دوسرا دعویٰ اُن کا یہ ہی کہ سورۂ محمدؐ کی اُس آیت سے۔ جس میں یہ حکم ہے کہ آیندہ لڑائی کے قیدیوں کو یا احسان رکھکر چھوڑ دیا کرو۔ یا فدیہ لے کر۔ اسلام نے رسم استرقاق کو جو مثل اور قوموں کے عرب میں بھی قدیم زمانہ سے چلی آتی تھی ہمیشہ کے لئے موقوف کر دیا۔ وہ کہتے ہیں کہ زمانۂ جاہلیت میں لڑائی کے قیدیوں کو قتل کرنا، لونڈی غلام بنانا، فدیہ لے کر یا احساناً چھوڑ دینا، یہ چاروں باتیں رائج تھیں اور اسلام میں بھی جب تک کوئی حکم قیدیوں کی نسبت نہیں آیا۔ ایسا ہی ہوتا رہا لیکن جب سے آیۂ منّ و فداء نازل ہوئی۔ پھر آنحضرت نے کسی غزوہ میں قیدیوں کو لونڈی غلام نہیں بنایا، یعنی جاہلیت میں جو اسیران جنگ کے ساتھ چار طرح کے برتاؤ کئے جاتے تھے۔ اُن میں سے قتل و استرقاق کو بالکل موقوف کر دیا اور صرف منّ و فدا میں اختیار دیدیا کہ چاہو بغیر کسی معاوضہ کے محض احساناً چھوڑ دو اور چاہو کچھ فدیہ لے کر چھوڑ دو۔

اس دوسرے دعویٰ کے متعلق اُنھوں نے بہت سی موافق اور مخالف روایتیں کتب احادیث سے نقل کر کے اس بات کے ثابت کرنے میں کوشش کی ہے کہ یہ منّ و فدا کے نازل ہونے کے بعد رسول خدا صلعم کے عہد میں پھر کسی کو لونڈی غلام نہیں بنایا گیا۔ اور بعد آنحضرت کے صحابہ و تابعین و تبع تابعین کے زمانہ میں جو کچھ ہوا اس کی نسبت ان کے بیان کا ماحصل یہ ہے کہ جب قرآن مجید یا کسی حدیث صحیح سے غلام بنانے کا کوئی صاف حکم نہیں نکلتا اور آیۂ منّ و فدا سے صاف پایا جاتا ہی کہ جاہلیت کی رسم کے موافق جو ابتدائے اسلام میں لونڈی غلام بنائے جاتے تھے اُس کی صاف ممانعت ہو گئی اور اُس کے بعد آنحضرت نے کسی قیدی کو لونڈی غلام نہیں بنایا اب ہم کو کچھ ضرورت اس بات کے دریافت کرنے کی نہیں ہے کہ آنحضرت کے بعد صحابہ یا تابعین وغیرہم نے اس باب میں کیا کیا؟

اس بیان کی تائید اُنھوں نے اس طرح سے کی ہی کہ شراب کی حرمت نازل ہونے کے بعد کوئی نہیں سمجھا تھا کہ شراب حرام ہو گئی یہاں تک کہ تین دفعہ اُس کی حرمت نازل ہوئی پھر باوجودیکہ بیع امہات اولاد کا ممنوع ہونا آنحضرت کے زمانہ میں تسلیم کیا جاتا ہی تاہم حضرت عمرؓ کے عہد خلافت تک بیع ہوتی رہی۔ اِس کے سوا متعہ کی حرمت سے عمر فاروق کی خلافت تک صحابہ ناواقف

رہے۔ پس اسی طرح ممکن ہے کہ آنحضرت کے زمانہ میں آیۂ منّ و فدا سے جو اصل مقصود تھا
اُس کو بھی صحابہ نہ سمجھے ہوں خصوصاً اس وجہ سے کہ پہلے بھی قیدیوں کو احساناً یا فدیہ لیکر چھوڑنے
کا دستور برابر جاری تھا۔ پس اس آیت کے اُترنے کے بعد جو تمام قیدی کسی نہ کسی طرح
چھوڑ دیئے گئے اور قتل یا استرقاق واقع نہیں ہوا اس کو سب نے ایک اتفاقی بات سمجھا
ہو اور بعد آنحضرت کے خلافت راشدہ میں اس مسئلہ پر بحث کا موقع اس لئے نہ ملا ہو کہ پہلی
خلافت مرتدین کے مطیع کرنے میں ختم ہوگئی دوسری اور تیسری خلافت میں دارالخلافہ سے
دور دور کے فاصلہ پر لڑائیاں ہوئیں اور چوتھی خلافت کا آپس کے جھگڑوں میں خاتمہ ہوگیا
اور اسلئے چاروں خلافتوں میں اس مسئلہ کے تصفیہ کرنے کی مہلت نہیں ملی۔

اگرچہ یہ امید نہیں ہے کہ علمائے اسلام اور خاص ہندوستان کے علما موجودہ حالت میں
ایک ایسی رائے کے ساتھ اتفاق کریں گے جو اسلام کی غلامی کے متعلق انھوں نے برخلاف
جمہور فقہا و علمائے اسلام کے قائم کی ہے چنانچہ ایک مبسوط رسالہ جواز استرقاق پر سرسید کے
برخلاف انہیں دنوں میں جبکہ پہلی ہی بار ابطال غلامی کا رسالہ تہذیب الاخلاق میں شائع ہوا تھا۔ لکھا جا
چکا ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ جس طرح سرسید کی رائے فقہا اور مفسرین اور تعامل اہل اسلام کے
برخلاف ہے اسی طرح تعامل اہل اسلام اور فقہا و مفسرین کے اقوال ظاہر قرآن کے برخلاف معلوم
ہوتے ہیں۔ بیشک نہ قرآن میں کوئی ایسی نص صریح موجود ہے جس میں لونڈی غلام بنانے کا
حکم دیا گیا ہو اور نہ آیۂ منّ و فدا کے حصر کی کوئی ایسی معقول تاویل ہوسکتی ہے جس سے یہ ثابت
ہو کہ لڑائی کے قیدیوں کے ساتھ سوائے منّ و فدا کے تیسرا سلوک کیا جاسکتا ہے اور نہ ان لوگوں
کے پاس جو نسخ کے قائل ہوئے ہیں کوئی ایسی صاف اور صریح نص قرآنی موجود ہے جس کو
آیہ مذکور کا ناسخ قرار دیا جائے اور اس بات کا تو انکار ہی نہیں ہوسکتا کہ آیۂ مذکور نے اس سلوک
کو جو اسیران جنگ کے ساتھ کرنا چاہئے صرف دو باتوں میں منحصر کر دیا ہے " یا احسان رکھکر
چھوڑنا " یا کچھ چھڑائی لیکر چھوڑنا۔ ورنہ آیہ مذکور کے منسوخ ماننے کی کچھ ضرورت نہ تھی
اس تقدیر پر۔ اگر ہمارا قیاس غلط نہ ہو۔ مسئلہ متنازع فیہ کی صورت بعینہ ایسی ہوگئی
ہے جیسے عبد اللہ ابن عباس سے مسح رجلین اور غسل رجلین کے باب میں منقول ہے
کہ " لَآ اَجِدُ فِیْ کِتَابِ اللّٰہِ اِلَّا الْمَسْحَ وَلٰکِنَّھُمْ اَبَوْا اِلَّا الْغَسْلَ " (یعنی میں قرآن میں
تو مسح کے سوا کچھ نہیں پاتا لیکن صحابہ نے صرف غسل ہی کو اختیار کیا ہے)

اگرچہ عام طور پر تعامل اہل اسلام اور فقہا و مفسرین کے اقوال سرسید کی رائے کے خلاف معلوم ہوتے ہیں مگر بعض تاریخی شہادتیں ایسی ملی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی امیہ کے زمانہ میں آیہ من و فدا سے اس بات پر استدلال کیا گیا ہے کہ اسیران جنگ کے ساتھ من و فدا کے سوا اور کوئی سلوک نہیں کیا جا سکتا۔ یعنی ایک دفعہ۔ جیسا کہ کتاب عقد الفرید میں مذکور ہے۔ حجاج کے روبرو کچھ اسیر لائے گئے۔ حجاج نے اُن کے قتل کئے جانے کا حکم دیدیا۔ ایک قیدی نے جبکہ اُس کو قتل کرنے لگے۔ حجاج کو یہ دعا دی اور کہا کہ خدا تعالیٰ تو اپنی کتاب میں یہ کہتا ہے کہ "فاذا لقیتم الذین کفروا فضرب الرقاب حتی اذا اثخنتموھم فشدوا الوثاق فاما منا بعد واما فداء اور تمہارا شاعر اپنی قوم کے مکارم اخلاق اس طرح بیان کرتا ہے۔

"وما نقتل الاسریٰ ولکن نفکھم اذا اثقل الاعناق حمل القلائد"

(یعنی ہم قیدیوں کو قتل نہیں کرتے بلکہ اُن کو جب کہ ان کی گردنیں طوقوں کے بوجھ میں دبی جاتی ہیں چھوڑ دیتے ہیں)

یہ سُنکر حجاج نے (گویا مقتول قیدیوں کی طرف مخاطب ہو کر) کہا "تمہارا بُرا ہو کیا تم نہ کہہ سکتے تھے جو بات اس منافق نے مجھکو جتائی" اور یہ کہکر باقی قیدیوں کو چھوڑ دیا۔

حجاج ہی کا ایک اور قصہ امام ابو یوسف کی کتاب الخراج میں درج ہے۔ یعنی حجاج کے سامنے ایک اسیر لایا گیا۔ حجاج نے عبد اللہ ابن عمر سے۔ جو اس وقت وہاں موجود تھے کہا کہ اُٹھو اور اُسکو قتل کر ڈالو۔ ابن عمر نے فرمایا "ہم کو یہ حکم نہیں ہے" خدا تعالیٰ فرماتا ہے" حتی اذا اثخنتموھم فشدوا الوثاق فاما منا بعد واما فداءً"

اگرچہ احمد شفیق بک نے آیہ من و فدا پر زیادہ زور نہیں دیا مگر نتیجہ کے لحاظ سے اُنکے اور سرسید کے استدلال میں چنداں فرق نہیں معلوم ہوتا۔ احمد شفیق کی تمام تقریر کا ماحصل یہ ہے کہ چونکہ عرب پشت ہا پشت سے لونڈی غلام بنانے کے عادی تھے اور یہ عادت اُنکی طبیعت ثانی ہو گئی تھی اور اسلام کا سب سے بڑا اور مہتم بالشان مقصد توحید کا پھیلانا اور شرک و جہالت کا استیصال کرنا تھا اس لئے غلامی کا دفعیہ موقوف کر دینا ضرور اسلام کے اعلیٰ اور اشرف مقاصد میں خلل انداز ہوتا۔ لیکن جو نصیحتیں بانی اسلام نے غلاموں کے حق میں مسلمانوں کو فرمائیں اور جو بے شمار حقوق اُن کو عنایت کئے اور جسطرح اُن میں اور اُنکے مالکوں میں ہر طرح سے مساوات کا درجہ قائم کیا اُس سے صاف ظاہر ہے کہ اسلام نے غلامی کی سوتیں بالکل بند کر دیں۔ اِسکے

سو اسلام صرف اُن غیر مسلمین کے استرقاق کی اجازت دیتا ہے جو شرعی جہاد میں اسیر ہوں اور اس پر بھی اُن کو ہمیشہ کے لئے مملوک رہنے پر مجبور نہیں کرتا بلکہ جس طرح بادشاہ اسلام ان کو احساناً چھوڑ سکتا ہے اسی طرح وہ خود فدیہ دیکر چھوٹ سکتے ہیں۔ پس جو حبشی وسط افریقہ سے ناجایز طور پر پکڑے جاتے ہیں وہ عام اس سے مسلم ہوں یا غیر مسلم اصول اسلام کے موافق لونڈی غلام نہیں ٹھہر سکتے۔

اس بیان میں اور سرسید کے بیان میں۔ جیسا کہ ظاہر ہے۔ اس سے زیادہ کچھ فرق نہیں معلوم ہوتا کہ سرسید کے نزدیک جس طرح چوری سے پکڑے ہوئے یا چھینے ہوئے حبشی لونڈی غلام نہیں بن سکتے۔ اسی طرح اسیران جنگ بھی لونڈی غلام نہیں بنائے جاسکتے بلکہ اُن کے قید ہونے کے بعد مسلمانوں کو اس کے سوا کچھ چارہ نہیں کہ ان کو احساناً چھوڑ دیں یا فدیہ لیکر چھوڑ دیں اور احمد شفیق بک کے نزدیک وہ قید ہونے کے بعد لونڈی غلام تو بنجاتے ہیں مگر اس کے بعد اگر مسلمان اُن کو احساناً نہ چھوڑیں تو وہ فدیہ دیکر چھوٹ سکتے ہیں۔ اس تقدیر پر ظاہرا ثمرہ اختلاف صرف یہ نکلے گا کہ احمد شفیق بک کے نزدیک اگر مسلمان اُن کو احساناً نہ چھوڑیں تو جب تک وہ فدیہ ادا نہ کریں گے بدستور لونڈی غلام رہیں گے اور سرسید کے نزدیک اگر وہ فدیہ ادا نہ کرسکیں تو مسلمانوں کو چار ناچار انہیں احساناً چھوڑنا پڑے گا۔ کیونکہ ان کے نزدیک درحقیقت رقیت طاری نہیں ہوئی۔

بہر حال سب سے پہلے سرسید نے اور اُن کے بعد مصر کے اس روشنضمیر فاضل نے بخوبی ثابت کر دیا ہے کہ جو سلوک اور احسان لونڈی غلاموں پر اسلام نے کیا ہے وہ کسی مذہب سے بن نہیں آیا اور گو نصف صدی سے بلحاظ حسن معاشرت کے عیسائیوں نے اور خاص کر انگلش قوم نے اس باب میں تمام دنیا کی قوموں پر فضیلت حاصل کی ہے مگر مذہب کی رو سے وہ غلاموں کے حق میں اس سے زیادہ کوئی شہادت پیش نہیں کرسکے کہ انجیل تمام بنی آدم کو ایک دوسرے کا بھائی ٹھیراتی ہے اور سب کو ایک دوسرے سے محبت کرنے کی تاکید کرتی ہی تمام عہد جدید میں کوئی صریح نص غلامی کے برخلاف نہیں پائی جاتی۔ بلکہ سینٹ پال کے تمام خطوں میں۔ جو دین عیسوی کی اشاعت کی غرض سے اطراف وجوانب میں بھیجے گئے کوئی حکم غلامو کی نسبت اس کے سوا نہیں پایا جاتا کہ وہ اپنے آقاؤں کے آگے سر جھکائیں، اُنکی اطاعت کریں اُن سے ڈریں، اُنکی ایسی فرمانبرداری کریں جیسی عیسیٰ مسیح کی کرتے ہیں، اُن کو ہر تعظیم و تکریم کے

لائق سمجھیں اور اگر اُن کے آقا عیسائی ہوں تو اُن کی خدمت گزاری میں اور بھی زیادہ مبالغہ کریں برخلاف اس کے بانیٔ اسلام نے کہیں غلاموں کو اپنے مالکوں کی اطاعت یا تعظیم و تکریم کا حکم نہیں دیا بلکہ جہاں نصیحت کی ہے وہاں مالکوں کو غلاموں کے ساتھ مہربانی اور شفقت اور ہر ایک بات میں اپنے برابر سمجھنے کی کی ہدایت کی ہے اور طرح طرح سے اُنکے آزاد کرنیکی ترغیبیں دی ہیں اور مالک و مملوک میں ایک محض اعتباری فرق کے سوا کوئی فرق نہیں رکھا اور اگر قرآن کے موافق دیکھا جائے تو غلامی کو ہمیشہ کیلئے موقوف کر دیا ہے۔

تفسیر القرآن سرسید نے قرآن مجید کی تفسیر جن اصول پر اور جس ضرورت اور غرض سے لکھی ہے اُس کا مختصر ذکر پہلے حصہ میں آچکا ہے، یہاں ہم اُس کی وہ خصوصیتیں بیان کرنی چاہتے ہیں جو اُس میں اور دیگر تفاسیر میں ما بہ الامتیاز ہیں اور جن سے سرسید کی نیت کا اور اُس ضرورت کا جس نے اس تفسیر کے لکھنے پر اُن کو مجبور کیا۔ کسی قدر اندازہ ہو سکتا ہے۔

ہمارے قدیم مفسروں نے بلاشبہ اُن تمام ضرورتوں کو۔ جو اُن کے زمانہ میں وقتاً فوقتاً پیش آتی گئیں۔ بخوبی پورا کیا۔ اور اپنی آسمانی کتاب کی خدمت کا حق بحسب ضرورت ادا کرتے رہے۔ سب سے پہلے اُن کو۔ اس بنا پر کہ تفسیر بالرائے کی نسبت حدیث میں وعید وارد ہوئی تھی اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ جس قدر اخبار و آثار تفسیر القرآن کے متعلق کتب احادیث میں روایت کئے گئے ہیں ان سب کو تفسیروں میں اپنے اپنے موقع پر بیان کیا جائے، تاکہ کوئی ضروری بات جو قرآن کی تفسیر کے متعلق رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے وہ امت تک پہونچنے سے رہ نہ جائے۔ مگر افسوس ہے کہ قدما کی اس کوشش سے جو محض نیک نیتی سے کی گئی تھی بے شمار روایتیں تفاسیر قدیمہ میں ایسی درج ہو گئیں جن کے لحاظ سے علمائے محققین کو یہ کہنا پڑا کہ "کتب التفسیر مشحونۃ بالاحادیث الموضوعۃ" اور اس سے بھی زیادہ افسوس یہ ہے کہ پچھلوں نے قدما کی تفسیروں میں جو رطب و یابس روایتیں پائیں بغیر اس کے کہ اصول علم حدیث کے مطابق اُن کی تنقید کریں اُن تمام رطب و یابس روایتوں سے اپنی تفسیروں کو بھر دیا اور مخالفوں کے لئے اعتراض کا دروازہ کھول دیا۔

پھر جب اسلام دور دراز ملکوں میں اور غیر قوموں میں۔ جن کی مادری زبان عربی نہ تھی اور جو قرآن کی فصاحت و بلاغت کا مثل اہل زبان کے اندازہ نہیں کر سکتے تھے۔ پھیلنے لگا تو اس بات کی ضرورت معلوم ہوئی کہ قرآن کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک جملہ پر بموجب

قواعد صرف و نحو و معانی و بیان کے بحث کی جائے اور وجوہ اعجاز قرآن نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کی جائیں۔ اس ضرورت کو بھی ہمارے علما نے اس زمانہ کی حالت کے موافق نہایت خوبی اور لیاقت کے ساتھ پورا کیا۔

جب یونانی فلسفہ اور منطق اہل اسلام میں شائع ہوئی اور مسلمانوں میں نئے نئے فرقے پیدا ہونے لگے اور ہر فرقہ ایک آیت قرآنی کی تفسیر اپنے اپنے عقائد اور اصول کے موافق منطق اور فلسفہ کی رو سے کرنے لگا تو علمائے متکلمین نے اسلام کی حمایت اس بات میں منحصر سمجھی کہ تفسیر قرآن میں فلسفہ اور حکمت کو دخل دیا جائے اور تفسیروں میں مذہب حق کی تائید دلائل عقلیہ سے کی جائے۔ بعض مفسروں نے اپنی تفسیروں کی بنیاد جزئیات فقہیہ کے استنباط اور اختلافی مسائل میں اپنے اپنے مذہب کی نصرت اور حمایت پر رکھی۔ غرض کہ جو ضرورت ہمارے قدیم مفسروں کو پیش آئی اس کو باحسن وجوہ پورا کیا گیا۔ لیکن جو ضرورتیں اس وقت نہ صرف ہندوستان کے بلکہ تمام دنیا کے مسلمانوں کو۔ ان کے مذہب کے متعلق درپیش ہیں ویسی ضرورتیں اگلے زمانہ میں کبھی پیش نہیں آئیں اور اس لئے ہمارے علما کو تفسیروں میں ان کے پورا کرنے کا کبھی خیال نہیں آیا۔

اس بات کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ موجودہ صدی میں کرہ زمین کا کوئی پہلو اور کوئی گوشہ ایسا باقی نہیں رہا جہاں عیسائی قوموں کی حکومت یا اُن کا رعب داب قائم نہ ہو اور اگر دنیا عالم اسباب ہے تو ضرور اُن کا رعب داب روز بروز بڑھتا جائیگا۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ جہاں کسی عیسائی قوم کا رعب و داب قائم ہوا اور فوراً ان کا مشن اور انکی تجارت سایہ کی طرح اُس کے ساتھ ساتھ وہاں پہنچی۔ اگرچہ اکثر عیسائی حکومتوں میں عموماً اور انگریزی حکومت میں خصوصاً جس قدر رعایا کو مذہبی آزادی حاصل ہے شاید دنیا کی کسی حکومت میں کبھی اس سے زیادہ آزادی حاصل نہیں ہوئی ہوگی لیکن رعیت کو کیسی ہی مذہبی آزادی دی جائے سلطنت کی مقناطیسی کشش اپنا کرشمہ دکھائے بغیر نہیں رہتی۔ حکمراں قوم کی رسوم و عادات و اوضاع و اطوار و اخلاق یہاں تک کہ اُن کے دینی مذہب کی طرف محکوم قوم کا دل خود بخود کھچا جاتا ہے۔ اور جب کہ سلطنت کے ساتھ دعوت دین بھی شامل ہو اور کروڑوں روپیہ حکمراں قوم کے مذہب کی اشاعت میں صرف کیا جاتا ہو اور سلطنت بھی ایک ایسی قوم کی ہو جو عقل و دانش اور شائستگی و تمدن میں دنیا بھر کی قوموں میں ممتاز ہو

اور طرح طرح کی ترغیبیں تبدیل مذہب کی موجود ہوں تو دیکھنا چاہیے کہ وہ کشش کس حد تک پہنچ جائے گی۔ اگرچہ ہندوستان میں ابھی تک مشنریوں کا منتر مسلمانوں پر ویسا کارگر نہیں ہوا جیسا کہ اور قوموں پر ہوا ہے لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ مسلمان ہمیشہ اسی طرح مشن کی زد سے بچے رہیں گے، مسلمانوں کے پولٹکل زوال کو ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں گذرا اور اس لئے اسلام کی حقیت کا سکہ ابھی اُن کے دل پر بیٹھا ہوا ہے، آبا و اجداد کی مذہبی عظمت ان کو فراموش نہیں ہوئی، آزادی نے ابھی اُن کو بالکل مطلق العنان نہیں کیا، قومی سوسائٹی کا دباؤ بھی اُن کی طبیعتوں پر کم و بیش باقی ہے، تبدیل مذہب سے جو ذلت قوم اور خاندان کی نظر میں ہوتی ہے ابھی تک وہ اُس کو گوارا نہیں کر سکتے، لیکن جس قدر زمانہ گذرتا جائے گا اُسی قدر یہ رکاوٹیں کم ہوتی جائیں گی اور نہایت اندیشہ ہے کہ مبادا آخر کار مسلمان بھی اپنے اسلاف کے مذہب سے ویسے ہی بے تعلق ہو جائیں جیسے ہندوستان کی اور قومیں۔ جو ہزار برس سے غیر قوموں کی محکوم چلی آتی ہیں اور مذہب کو بزرگوں کی ریت اور رسم سے زیادہ کوئی چیز نہیں سمجھتیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ آہستہ آہستہ اور مذہبوں کی طرح اسلام کی سرحد میں بھی مشن اپنا قدم بڑھاتا جاتا ہے۔ انھیں دنوں میں پنجاب کے ایک دیسی مشنری کی تحریر ہماری نظر سے گذری جس میں لکھا ہے کہ چالیس برس کے عرصہ میں صرف امرتسر کے گرجا میں ۱۵۲ مسلمانوں نے بپتسما پایا ہے اور دہلی کے صرف باپٹسٹ مشن میں ۴۰ مسلمانوں نے اصطباغ لیا ہے۔

ظاہر ہے کہ اہل اسلام کو ایسی حالت بارہ سو برس تک کبھی پیش نہیں آئی، وہ جہاں گئے اور جہاں جا کر رہے اسلام کا رعب و داب اُن کے ساتھ ساتھ رہا۔ وہ اس عرصہ میں کبھی کسی غیر قوم کے جو اپنے دین کی اشاعت میں مثل عیسائیوں کے سرگرم ہو محکوم ہو کر نہیں رہے، اور اس لئے ہمارے قدیم علما کو وہ ضرورتیں جو آج کل اسلام کے خیر اندیشوں کو نظر آتی ہیں کبھی محسوس نہیں ہوئیں۔

دوسری ضرورت۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ اسلام کو سائنس کے حملہ سے بچانے کی ہے علوم جدیدہ کا رواج جیسا عیسائی ملکوں میں ہے ویسا ہی تمام دنیا میں روز افزوں ترقی کرتا جاتا ہے اور جو صدمہ کہ اُس نے یورپ میں عیسائی مذہب کو پہنچایا ہے وہی صدمہ دنیا کے تمام مذاہب کو اُس سے پہنچتا معلوم ہوتا ہے۔ شام و مصر و ٹرکی میں علوم جدیدہ کی

اشاعت کو غالباً پچاس برس سے زیادہ عرصہ نہیں گذرا ؛ اس قلیل عرصہ میں اُس سے جو نتائج ممالک مذکورہ میں باوجود اسلامی سلطنت ہونے کے پیدا ہوئے ہیں اُن کو طرابلس کے ایک مشہور عالم شیخ حسین آفندی نے اپنی کتاب حمیدیہ[1] میں ایک موقع پر اس طرح ظاہر کیا ہے کہ "جو مسلمان نوجوان مدارس میں علوم جدید اور خاص کر فن طبیعیات کی تعلیم پاتے ہیں وہ اسلام کی قید سے ایسے نکل جاتے ہیں کہ اُن کو اُس سے کچھ لگاؤ باقی نہیں رہتا۔ اس بات کے معتقد نہیں رہتے کہ کوئی عالم کا پیدا کرنے والا موجود ہے بلکہ تمام کائنات اور آثار موجودات کو مادہ اور اُس کے اجزا کی حرکت اور قوانین طبیعی کی طرف منسوب کرتے ہیں اور جب کہ اُن کا حال الوہیت کے اعتقاد میں - جو اصل اصول اسلام ہے ایسا ہو تو پھر کونسا اعتقاد دین اسلام کی نسبت اُن میں باقی رہ سکتا ہے"!

اس کے بعد مصنف ممدوح اپنے ہموطن مسلمانوں کو اُس آفت اور بلائے عظیم سے آگاہ کرتا ہے جو اُن کی اولاد میں پھیلتی جاتی ہے - اور اُن کو ہوشیار کرتا ہے کہ پہلے اس سے کہ یہ مصیبت لا علاج ہو جائے اُس کا تدارک کریں -

ظاہر ہے کہ علوم جدیدہ کی تعلیم جبکہ ممالک اسلامیہ میں یہ نتائج پیدا کر رہی ہے تو ہندوستان میں اسلام کیونکر اُس کی طرف سے مطمئن رہ سکتا ہے - یہ بھی ممکن نہیں کہ مسلمان اُن نتائج سے بچنے کے لئے اپنی اولاد کی تعلیم سے دست بردار ہو جائیں وہ پہلے ہی اپنی اُس غفلت اور فروگذاشت پر کف افسوس مل رہے ہیں جو زمانہ گذشتہ میں انگریزی تعلیم کی نسبت اُن سے ظہور میں آئی اور وہ کیونکر اُس تعلیم سے دست بردار ہو سکتے ہیں جس سے ٹرکی اور شام اور مصر کے مسلمانوں کو بھی کسی طرح مفر نہیں - اس کے سوا مسلمانوں کا اولاد کو صرف اس اندیشہ سے مغربی تعلیم نہ دلوانا - کہ وہ دین اسلام سے بد اعتقاد نہ ہو جائیں - گویا اس بات کو تسلیم کر لینا ہے کہ اسلام فلسفہ جدیدہ کے مقابلہ کی تاب نہیں لا سکتا اور اسلام کا اعتقاد سائنس کے یقین کے آگے نہیں ٹھیر سکتا۔

جو ضرورتیں ہم نے اوپر بیان کیں بیشک اُن راسخ الاعتقاد مسلمانوں کو محسوس نہیں ہو سکتیں جن کے دل ہر قسم کے وساوس و شبہات سے بالکل پاک ہیں۔ جو بقائے دین اسلام

[1] یہ کتاب ۱۳۰۵ھ میں اُن شکوک و شبہات کے دفع کرنے کی غرض سے جو علوم جدیدہ کی تعلیم سے مسلمان نوجوانوں کے دل میں اصول اسلام کی نسبت پیدا ہوتے ہیں ملک شام میں لکھی گئی ہے۔ جس کا نام مصنف نے سلطان عبدالحمید خاں بالقابہ کی کے نام نامی پر حمیدیہ رکھا ہے ۱۲

کے معنی اس کے سوا کچھ نہیں سمجھتے کہ صرف اُن کے خاندان کا محدود حلقہ الحاد یا ارتداد کے صدمہ سے محفوظ رہے گو کہ ساری دنیا ملحد و بد مذہب ہو جائے۔ لیکن جو لوگ تعلیم یافتہ نوجوانوں کے خیالات سے واقف ہیں اور ہر مسلمان کے تبدیل مذہب سے اُن کو وہی صدمہ پہنچتا ہے جو اپنے کسی عزیز یا دوست کے ارتداد سے پہنچنا چاہئے اُن کو یہ ضرور تیں روز روشن کی طرح نظر آ رہی ہیں اور اُن کو وہ زمانہ قریب معلوم ہوتا ہے کہ کسی مذہب کا اعتقاد جب تک کہ اس کو زمانہ حال کے شکوک و شبہات سے منزہ اور مبرا ثابت نہ کیا جائے گا۔ محض آباد اجداد کی تقلید سے قائم نہ رہے گا۔

۱۸۸۸ء میں ایک مرزا صاحب نے سرسید پر یہ اعتراض لکھ کر شائع کیا تھا کہ "سید صاحب دنیوی ترقی کی کوشش میں مذہبی بحث کو کیوں دخل دیتے ہیں" اس پر لاہور گورنمنٹ کالج کے ایک مسلمان طالب علم نے کچھ لکھ کر علی گڑھ گزٹ میں چھپوایا تھا جس میں لکھا تھا کہ "سرکاری مدارس میں کوئی تعلیم یافتہ ایسا نہ ہوگا۔ خواہ ہندو خواہ مسلمان۔ جس کا اعتقاد اپنے مسائل مذہبی پر ویسے ہی استحکام سے ہو جیسا کہ پیشتر تعلیم سے تھا۔ ممکن ہی نہیں کہ انگریزی پڑھ کر مشرقی قصوں اور کہانیوں اور دیوؤں اور پریوں کی داستانوں کو جھوٹا نہ سمجھے اور جن کتابوں میں ان کا ذکر ہو اور پھر اُن کے الہامی ہونے کا دعویٰ کیا گیا ہو اُن کو لغو اور بیہودہ نہ جانے۔ آج کل کے طالب علموں کے اگر دل چیر کر دیکھے جائیں تو معلوم ہو کہ اُن کے مذہبی مسائل اُن کے دل میں کیسے کھٹکتے ہیں اور کوئی ملا مولوی اُن کی تشفی نہیں کر سکتا۔ بعض جو بہت آزاد طبع ہوتے ہیں اور اپنے کانشنس کو دبا نہیں سکتے اور بغیر کافی دلیل کے اس کو زبردستی جھٹلا نہیں سکتے وہ عیسائی یا لامذہب ہو جاتے ہیں + + + شکر ہے کہ سید صاحب نے اصلاح مذہبی سے اس آفت کو روکا + + + اسی اصلاح نے پادریوں کی امید کو توڑا۔ اگر سرسید صاحب یہ اصلاح نہ کرتے تو نہ معلوم مدرسۃ العلوم ہی کے کتنے مسلمان طالب علم اصطباغ پا چکے ہوتے + + + ہماری رائے میں سید صاحب کے تمام کارہائے نمایاں میں جو نہایت قدر و منزلت کے لائق بات ہے اور آیندہ کی ترقی کی جڑ ہے وہ یہی حصہ ہے جس کو مرزا صاحب قابل تنفر قرار دیتے ہیں کاش اگر مرزا صاحب چندے کالجوں میں رہے ہوتے تو وہ سرسید کے اسی کام کو جس کو وہ اب قابل نفرین قرار دیتے ہیں۔ نہایت عمدہ بلکہ تمام کارہائے نمایاں کی جان قرار دیتے اور جو تحریریں اب باعث دل شکنی اور موجب ضلالت و گمراہی خیال کی گئی ہیں۔ ہم مرزا صاحب کے گلے میں بطور حرز جان کے لٹکتی دیکھتے!!

یہ اگرچہ ایک نوجوان طالب علم کی شہادت ہے۔ جس کی شاید لوگوں کی نظر میں کچھ زیادہ وقعت نہ ہو۔ مگر اس قول کے موافق کہ "اھل البیت ادریٰ بما فی البیت" انگریزی خوان طلبا کے نزدیک اس نوجوان طالب علم کی شہادت بڑے بڑے مشائخ کبار کی شہادت سے زیادہ اعتبار کے لائق ہے اور اس کا ثبوت بارہا ہم نے خود اپنی آنکھ سے دیکھا ہے۔

ایک دفعہ ہمارے سامنے یہ واقعہ گذرا کہ عید الفطر سے پہلے ایک عالم نے وعظ میں یہ روایت بیان کی کہ "عید کے روز روئے زمین پر ہر شہر میں خدا تعالیٰ علی الصباح اپنے فرشتوں کو بھیجتا ہے اور وہ زمین پر اُتر کر ہر ایک بستی کے گلی کوچوں میں منادی کرتے ہیں۔ جس کو تمام مخلوقات سوائے جن و انسان کے سنتی ہے۔ اور بلند آواز سے کہتے ہیں کہ اے امت محمدیہ اُس خدا کی طرف چلو جو بڑا بخشش والا اور بڑے بڑے گناہ معاف کرنے والا ہے"۔ اُس وقت اتفاق سے کچھ انگریزی تعلیم یافتہ نوجوان مسلمان بھی موجود تھے، جب وعظ ہو چکا تو مسجد سے باہر نکل کر اُن میں سے اکثر طلبا اس روایت پر ہنستے تھے اور ایک دوسرے سے کہتے تھے کہ عجب تماشا ہے جن کو عیدگاہ میں بھیجنا منظور ہے وہ تو سُن نہیں سکتے اور تمام نباتات وجمادات وحیوانات سنتے ہیں۔ پھر اگر ہم لوگ عیدگاہ میں نہ جائیں تو ہمارا کیا قصور ہے۔

اسی طرح کے صدہا واقعات ہر روز دیکھنے اور سننے میں آتے ہیں اور زیادہ تر یہ خرابیاں ہمارے واعظوں کی سادہ لوحی اور ناعاقبت اندیشی سے پیدا ہوئی ہیں جو اس قسم کی ضعیف وموضوع روایتیں بیان کرکے لوگوں کو دین پر ہنسواتے ہیں اور بجائے اسکے کہ ہر گروہ کے ساتھ اُس کی عقل اور سمجھ کے موافق گفتگو کرنی چاہیئے۔ سب کو اُسی قدیم دستور کے موافق ایک لاٹھی ہانکتے چلے جاتے ہیں۔

سرسید نے انھیں خرابیوں کے تدارک کے لئے قرآن مجید کی تفسیر لکھنی شروع کی تھی جس کی پہلی جلد ۱۲۹۷ھ ہجری میں چھپ کر شائع ہوئی اور اس کے بعد وقتاً فوقتاً اُس کی جلدیں شائع ہوتی رہیں۔ مگر افسوس ہے کہ وہ نصف قرآن شریف سے کچھ ہی زیادہ کی تفسیر لکھنے پائے تھے کہ پیغام اجل آپہنچا اور چھ جلدیں چھپی ہوئی آخر سورۂ بنی اسرائیل تک اور ایک جلد بن چھپی سورۂ انبیا تک اور چند چھوٹے چھوٹے رسالے۔ مثل تفسیر السموات ابطال غلامی، ازالۃ الغین عن قصۃ ذی القرنین، ترقیم فی قصۃ اصحاب الکھف والرقیم وغیرہ وغیرہ کے جن کو تفسیر کے اجزا سمجھنا چاہیئے۔ سرسید سے یادگار رہ گئے۔

سرسید نے اس تفسیر میں اُن مضامین سے بہت ہی کم تعرض کیا ہے۔ جن کو قدیم مفسرین نہایت بسط اور تفصیل کے ساتھ اپنی اپنی تفسیروں میں بیان کر چکے تھے یا جن کے بیان کرنے کی اس زمانہ میں کچھ ضرورت نہ تھی۔ بلکہ انھوں نے زیادہ تر انھیں باتوں کے بیان کرنے پر اکتفا کیا ہے جن کو وہ اس زمانہ میں اسلام کی حمایت کے لئے نہایت ضروری سمجھتے تھے اور جن سے اگلی تفسیریں بالکل خالی نظر آتی تھیں۔

تنقیح مثلاً ہمارے قدیم مفسروں نے اخبار ماضیہ کی تنقیح پر۔ جو کہ قرآن مجید میں اجمالاً یا تفصیلاً بیان ہوئے ہیں۔ بہت ہی کم توجہ کی تھی۔ اس کا سبب خواہ یہ سمجھو کہ اُن کو ایسی ضرورت پیش نہیں آئی اور خواہ یہ قرار دو کہ اُس زمانہ میں اطلاع کے ذریعے محدود تھے۔ دونوں صورتوں میں یہ فروگذاشت بلاشبہ تفسیر قرآن میں ایک بہت بڑی کمی کا باعث تھی اگرچہ قرآن مجید میں اُمم سابقہ کے قصے ایسی تفصیل کے ساتھ۔ جیسی کہ بائبل میں درج ہے بیان نہیں ہوئے بلکہ اکثر اُن قصوں کی طرف ترہیب یا ترغیب کی غرض سے اجمالی اشارے کئے گئے ہیں لیکن جب کہ اکثر وہی قصے کتب سابقہ میں مفصل مذکور ہیں اور قرآن میں اُن کتابوں کی جا بجا تصدیق کی گئی ہے اس لئے ضرور تھا کہ پہلے سے مفسرین جہاں تک ممکن ہوتا قرآن مجید کے اُن اجمالی قصوں کی تفصیل کتب سابقہ کے موافق بیان کرتے اور دونوں بیانوں میں تطبیق کرتے یا عدم مطابقت کی وجہ بیان کرتے۔ اگرچہ یہ بات علمائے مسیحی کے اقرار سے بخوبی ثابت ہے کہ بہت سی مقدس کتابیں جن کا ذکر بائبل کی موجودہ کتابوں میں آیا ہے اب ناپید ہوگئی ہیں اور اس لئے یہ ضرور نہیں ہے کہ ہر قصہ جس کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے وہ موجودہ مجموعہ بائبل میں بھی پایا جائے لیکن جو قصے قرآن مجید میں اجمالاً یا تفصیلاً ایسے مذکور ہوئے ہیں جو بائبل میں بھی اسی طرح یا کسی قدر جزوی اختلاف کے ساتھ مندرج ہیں اُن کی تطبیق کرنی یا عدم مطابقت کی وجوہ بیان کرنی خاصکر اس زمانہ میں ایک ایسی بات تھی جسکی ضرورت کا کسی طرح انکار نہیں ہوسکتا۔

سرسید نے سب سے پہلے اس کمی کو پورا کیا ہے۔ انھوں نے ہر ایسے قصے یا واقعہ کا جو قرآن میں مذکور ہوا ہے۔ تا بمقدور بائبل میں سراغ لگایا ہے اور قرآن اور بائبل کی تطبیق کی ہے یا عدم مطابقت کی وجہ بیان کی ہے اور جس قصہ کا پتہ موجودہ بائبل میں نہیں لگا تا بمقدور اُس کا ثبوت اور ذریعوں سے دیا ہے۔ مثلاً طالوت اور جالوت کی لڑائی کا قصہ

جو سورہ بقرہ میں مذکور ہے۔ یہی قصہ شموئیل نبی کی کتاب میں بھی بیان ہوا ہے مگر اسمیں وہ مضمون نہیں ہے جس کا قرآن کی اس آیت میں ذکر ہے کہ "اِنَّ اللّٰہَ مُبْتَلِیْکُمْ بِنَھَرٍ فَمَنْ شَرِبَ مِنْہُ فَلَیْسَ مِنِّیْ وَمَنْ لَّمْ یَطْعَمْہُ فَاِنَّہٗ مِنِّیْ اِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَۃً م بِیَدِہٖ" لیکن یہی مضمون کتاب قضاۃ کے ساتویں باب میں۔ جہاں جدعون کی مدیانیوں پر لشکر کشی کا ذکر ہے مندرج ہے۔ اس لئے عیسائی مورخوں نے قرآن کے بیان پر یہ اعتراض کیا ہے کہ اس میں غلطی سے جدعون کے لشکر کے واقعہ کو طالوت کے لشکر کے واقعہ سے ملا دیا ہے حالانکہ دونوں واقعے بالکل جدا جدا ہیں اور مختلف زمانوں میں مختلف مقامات پر واقع ہوئے ہیں۔

مگر سرسید نے اپنی تفسیر میں علمائے مسیحی کے اقرار اور شہادت سے یہ ثابت کیا ہے کہ کتاب شموئیل کے بعض ابواب کے متعدد درس صحیح نہیں ہیں اور جان گیٹو کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "یہی کافی نہیں ہے کہ جس مقام کو ہم غلط سمجھیں اُسے الحاقی سمجھ کر خارج کر دیں اور باقی کو بلاکم وکاست صحیح جانیں کیونکہ ممکن ہے کہ جنھوں نے الحاق کیا تھا انھوں نے باقی حصوں میں بھی تصرف کیا ہو" اس کے سوا یہودی اور عیسائی عالموں کی شہادت سے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ شموئیل نبی کی کتابیں لکھے جانے کے زمانہ اور ان کے لکھنے والوں کے ناموں میں بڑے بڑے یہودی اور عیسائی عالموں میں اختلاف ہے۔ بعض تین نبیوں کی اور بعض یرمیاہ نبی کی لکھی ہوئی بتاتے ہیں اور بعض کی رائے ہے کہ شموئیل نبی کے بہت مدت بعد لکھی گئی ہیں اور اس سے بآسانی خیال میں آسکتا ہے کہ بعض واقعات الٹ پلٹ ہوگئے ہوں یا بعض تحریر میں نہ آئے ہوں۔

یا مثلاً قرآن مجید میں جو عیسیٰ علیہ السلام کے بچپن کے حالات کے ضمن میں خلق طیر کے واقع کی طرف اشارہ ہوا ہے وہ موجودہ عہد جدید کی کتابوں میں مذکور نہیں ہے اسلئے عیسائی اس کو ایک غلط واقعہ بیان کرتے ہیں۔ مگر سرسید نے اپنی تفسیر میں ثابت کیا ہے کہ گو یہ واقعہ موجودہ عہد جدید میں نہیں ہے لیکن وہ انجیلیں۔ جو اناجیل طفولیت کے نام سے اب تک موجود ہیں اور جن کو ایک زمانہ میں اکثر مشہور عیسائی عالم تسلیم کرتے تھے اور مدتوں ایشیا اور افریقہ کے گرجاؤں میں پڑھی جاتی تھیں۔ ان میں واقعہ۔ جس کا قرآن میں اجمالی ذکر ہوا ہے۔ بہت تفصیل کے ساتھ مذکور ہے اور ان انجیلوں کا تمام بیان جو اس واقعہ سے متعلق ہے تفسیر میں نقل کیا ہے جس سے عیسائیوں کو اب یہ کہنے کی

گنجائش نہیں رہی کہ خلق طیر کا ذکر جو قرآن میں آیا ہے اُسکی کچھ اصل نہیں ہے۔
یا مثلاً عیسائی قرآن کی اُن آیتوں کے مضمون پر اعتراض کرتے ہیں جن سے قوم عاد کا قوم نوح کے بعد اُن کا جانشین ہونا اور حضرت ہود کا قوم عاد کی ہدایت کے لئے مبعوث ہونا پایا جاتا ہے کیونکہ بائبل میں اس کا کچھ ثبوت موجود نہیں ہے، مگر سرسید نے سورۂ اعراف کی تفسیر میں اُن کتبوں کے بموجب۔ جو اول معاویہ بن ابی سفیان کے عہد میں عبدالرحمٰن حاکم یمن کو ملے تھے اور اب ۱۸۳۴ء میں انگریزوں کو یمن کی پیمائش کرتے ہوئے وہاں کے کھنڈرات میں دستیاب ہوئے ہیں۔ عیسائیوں کے دونوں اعتراضوں کو رد کیا ہے اور ریورنڈ فاسٹر نے جو غلط نتیجے اُن کتبوں سے نکالے ہیں اُن کی غلطی ثابت کی ہے۔
غرض کہ تاریخی اور جغرافی تحقیقات جو قرآن مجید کے قصوں سے متعلق ہے اُسکی طرف سرسید سے پہلے ہمارے مفسروں نے بہت ہی کم التفات کیا تھا۔ شاید اگلے زمانہ میں اس کی ضرورت نہ ہو اور ہر مسلمان کے یقین کے لئے کسی قصہ یا واقعہ کا قرآن میں مذکور ہونا ہی کافی ہو لیکن اس زمانہ میں اس کی نہایت ضرورت تھی۔ قطع نظر مخالفین کے اعتراضات کے جن کو ہر طرح کی نکتہ چینی کرنے کی آزادی ہے۔ خود تعلیم یافتہ مسلمانوں کی تشفی کے لئے ہر قصہ اور ہر واقعہ اور ہر نام اور ہر مقام کو۔ جو قرآن میں وارد ہوئے ہیں۔ زمانہ حال کی تاریخی اور جغرافی تحقیقات پر منطبق کرنا اور درصورت عدم تطبیق کے تاریخی وجغرافی تحقیقات کو غلط ثابت کرنا ضرور ہے۔
اگرچہ ہمارے قدیم مفسروں نے بھی اپنی تفسیروں میں اُمم سابقہ کے حالات کثرت سے قلمبند کئے ہیں۔ لیکن اول تو اُن کا ماخذ زیادہ تر وہ ضعیف روایتیں ہیں جو محدثین کے نزدیک اعتبار کے قابل نہیں اور اگر بالفرض اُن روایتوں کو اصول حدیث کے موافق صحیح بھی تسلیم کر لیا جائے تو بھی وہ صرف اُن راسخ الاعتقاد مسلمانوں کے لئے کافی ہو سکتی ہیں جن کے دل شکوک وشبہات سے بالکل پاک ہیں نہ کہ عیسائیوں کے لئے جو قرآن مجید کے قصوں پر مورخانہ نکتہ چینیاں کرتے ہیں اور نہ تعلیم یافتہ مسلمانوں کے لئے جو یوروپین مصنفوں کے اعتراضات اُن کی کتابوں میں دیکھتے ہیں۔
قرآن مجید میں بعضے ایسے قصے بھی بیان ہوئے ہیں جو بائبل میں مذکور نہیں ہیں جیسے ذوالقرنین کا قصہ، یا اصحاب کہف کا قصہ، سرسید نے ان قصوں کی تحقیقات

میں بھی کیا منبعی کوشش کی ہے۔ چنانچہ ان دونوں قصوں کے متعلق انھوں نے دو علحدہ رسالے لکھے ہیں اور دونوں کا جس قدر بیان قرآن مجید میں ہوا ہے اُس کے تمام جزئیات کو تاریخ مسلمہ پر منطبق کرتے ہیں کوشش کی ہے، لیکن ذوالقرنین کے قصہ میں جو انھوں نے چی وانگتی فغفور چین کو ذوالقرنین کا مصداق ٹھیرایا ہے اُس پر بلاشبہ یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ قرآن میں جس قدر قصے اجمالاً یا تفصیلاً بیان ہوئے ہیں۔ اُن میں کوئی قصہ ایسا نہیں ہے۔ جو عرب یا اُس کے قرب وجوار میں مشہور و مسلم نہ ہو پس کسطرح قرین قیاس نہیں معلوم ہوتا کہ ایک ایسی اجنبی قوم اور اجنبی ملک کے بادشاہ کا قصہ۔ جسکے حالات سے نہ صرف عرب بلکہ دنیا کی اکثر قومیں عاص کر نزول قرآن کے زمانہ میں بالکل بے خبر تھیں اُس کتاب میں بیان کیا جائے جو عرب کے اہیوں کی ہدایت کے لئے نازل ہوئی ہو اکثر مفسروں نے سکندر رومی کو ذوالقرنین قرار دیا ہے اور ابوریحان بیرونی نے بنی حمیر کے بادشاہوں میں سے ابوکرب شمس بن عمیر بن افریقس کو اُس کا مصداق ٹھیرایا ہے مگر یہ دونوں قول سرسید کے قول سے بھی زیادہ مخدوش ہیں۔ حق یہ ہے کہ اس قصہ کی کوئی تفسیر ابتک ایسی نہیں کی گئی جس میں اس کے تمام جزئیات کو تاریخی اور جغرافی تحقیقات پر منطبق کیا گیا ہو؛ اور باوجود اس کے قرآن کے وظیفۂ مستمرہ کے بھی خلاف نہ ہو۔

دوسری خصوصیت

دوسری خصوصیت اس تفسیر کی یہ ہے کہ جو اعتراض زمانہ حال کے نکتہ چین مسلمانوں کے اُن مسائل و معتقدات پر وارد کرتے ہیں۔ جو اسلام کے ساتھ مخصوص سمجھے جاتے ہیں۔ جیسے۔ جہاد، حج، صوم رمضان، طلاق، حرمت ربا، معراج، بہشت و دوزخ وغیرہ وغیرہ۔ اُن اعتراضوں اور اُن مسائل و معتقدات پر جس صفائی کے ساتھ اس تفسیر میں بحث کی گئی ہے اور جن مناسب طریقوں سے مقتضائے وقت کے موافق اُن کو دفع کیا گیا ہے۔ اُس کی نظیر قدیم تفسیروں میں کہیں نہیں پائی جاتی۔ یہاں ہم اُن میں سے صرف دو مثالیں نہایت اختصار کے ساتھ بطور نمونہ کے ناظرین کی اطلاع کے لئے بیان کرتے ہیں۔

جہاد

سب سے بڑا معرکتہ الآرا جہاد کا مسئلہ ہے جس پر سرسید اپنی متعدد تصنیفات میں تفسیر لکھنے سے پہلے کافی بحث کر چکے تھے مگر تفسیر میں مسئلہ مذکور کے متعلق اُن تمام اعتراضات کی جڑ کاٹ دی گئی ہے جن کو تیرہ سو برس سے عیسائی قوموں نے اسلام کے مطعون کرنے کا

ایک زبردست آلہ بنا رکھا تھا اور جن کی بدولت واقعہ ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں کی پولیٹکل حالت کو نہایت سخت صدمہ پہنچا تھا۔ انھوں نے اول سورۂ بقرہ کی اُن آیتوں کی تفسیر میں جن میں مشرکین مکہ سے قتال کرنے کا حکم ہے۔ اجمالی طور پر جہاد کے متعلق ایک لطیف تقریر لکھی ہے جس کو کسی قدر اختصار کے ساتھ ہم اس مقام پر لکھتے ہیں " وہ اکثر لوگ اسلام پر یہ طعن کرتے ہیں کہ اس میں تحمل اور بردباری اور مذہب کے سبب سے جو تکلیفیں کافروں سے پہنچیں اُن کی صبر کے ساتھ برداشت نہیں ہے اور یہ باتیں مذہب کی سچائی اور نیکی اور اخلاق کے برخلاف ہیں۔ مگر یہ ایک بڑی غلطی ہے۔ بے شک قرآن مجید میں جو لڑائی کے احکام نہایت نیکی اور انصاف پر مبنی تھے اُن کو مسلمان بادشاہوں نے دینداری کے بہانہ سے اپنی خواہش نفسانی کے پورا کرنے اور ملک گیری کے لئے نہایت بداخلاقی اور ناانصافی سے برتا اور وحشی درندوں سے بھی بدتر کام کئے اور علمائے اسلام نے اُن کی تائید کے لئے ایسے مسئلے بیان کئے جو اسلام کی روحانی نیکی کے برخلاف تھے، مگر اُن کے ایسا کرنے سے جو بُرائی قرار دی جاوے وہ انہیں پر محدود ہے۔ جنہوں نے ایسا کیا۔ نہ اسلام پر"

" اسلام میں اگرچہ جابجا عفو و صبر و تحمل کی خوبیاں بیان کی گئی ہیں اور اُن پر رغبت دلائی گئی ہے مگر اسی کے ساتھ بدلا لینے کی بھی بغیر زیادتی کے اجازت دی ہے۔ کیا یہ قانون دنیا کے پیدا کرنے والے کے قانون قدرت کے مناسب نہیں ہے؟ اور کیا اس قانون سے زیادہ عمدہ اور سچا کوئی قانون ہوسکتا ہے؟ انسان جب اخلاق کی باتوں پر گفتگو کرتا ہے تو بہت سی ایسی باتیں اور ایسے اصول بیان کرتا ہے جو کان کو اور دل کو نہایت بھلے معلوم ہوتے ہیں اور سننے اور پڑھنے والے خیال کرتے ہیں کہ یہی اصول اخلاق کے اور یہی اصول اعلیٰ درجہ کی نیکی کے ہیں، مگر درحقیقت وہ ہوائی آواز سے زیادہ کچھ رتبہ نہیں رکھتے اور چونکہ وہ اصول فطرت انسانی بلکہ قانون قدرت کے برخلاف ہوتے ہیں۔ کبھی اُن پر عملدرآمد نہیں ہوسکتا"

"کوئی کتاب دنیا میں انجیل سے زیادہ اخلاق کو ایسی چمک سے دکھلانے والی جس سے آنکھوں میں چکاچوند آجاوے۔ نہیں ہے۔ مگر ہم کو دیکھنا چاہئے کہ اس کا لوگوں میں کیا اثر ہوا تھا انجیل میں لکھا ہے کہ " اگر کوئی تیرے ایک گال پر طمانچہ مارے تو دوسرا گال بھی اُس کے سامنے کردے"! بلاشبہہ یہ مسئلہ اخلاق کے خیال سے تو بڑا عمدہ معلوم ہوتا ہے مگر کسی زمانہ کے لوگوں نے اس پر عمل کیا ہے؟ اگر دنیا اس پر عمل کرے تو دنیا کا کیا حال ہو؟ اسی طرح آباد رہے؟

اور اسی طرح لوگوں کی جان اور مال امن میں رہے؟ نہایت دلچسپ جواب دیا جاتا ہے کہ "جب سب ایسے ہی ہو جاویں تو دنیا سے شر اُٹھ جاوے گر پوچھا جاتا ہے کہ کبھی ایسا ہوا ہے یا کبھی ایسا ہوگا؟ یہ سب ناشدنی باتیں ہیں جو خیال میں شدنی قرار دے کر انسان خیالی اور جھوٹی خوشی حاصل کرتا ہے۔"

"عیسائی مذہب جس کی جڑ ایسی نیکی اور نرمی اور اخلاق میں لگائی گئی تھی وہ پھولا اور پھلا اور سرسبز و شاداب ہوا۔ اس کو چھوڑ دو کہ وہ کس سبب سے بڑھا اور سرسبز ہوا۔ مگر دیکھو کہ اُس نے کیا پھل پیدا کیا؟ ایک بھی نصیحت اُس کی کام نہ آئی۔ اور خود مذہب نے جو خونریزی اور بے رحمی اور ناانصافی اور درندوں سے بھی زیادہ بدتر خصلت دکھائی وہ شاید دنیا میں بے مثل ہوگی اور جس نیکی میں اُس کی جڑ لگائی گئی تھی اُس نے کچھ پھل نہیں دیا۔ کیونکہ وہ قانون قدرت کے برخلاف لگائی گئی تھی۔ جو خوبی۔ کیا روحانی اور کیا اخلاقی اور کیا تمدنی۔ اب ہم بعض عیسائی ملکوں میں دیکھتے ہیں کیا یہ پھل اسی درخت کا ہے جس کی جڑ ایسی نیکی میں لگائی گئی تھی جو خلاف قانون قدرت تھی؟ حاشا وکلا، بلکہ یہ اُس کا پھل ہے کہ اُس درخت کو وہاں سے اکھاڑ کر دوسری زمین پر لگایا ہے جو قانون قدرت کی زمین ہے اور جس قدر کہ پہلی زمین کی مٹی اُس کی جڑ میں لگی ہوئی ہے اُسی قدر اُس میں نقصان ہے۔

"اسلام میں جو خوبی ہے وہ یہی ہے کہ اُس کے تمام قانون قانون قدرت کے مطابق اور عملدرآمد کے لائق ہیں۔ رحم کی جگہ۔ جہاں تک کہ قانون قدرت اجازت دیتا ہے۔ رحم ہے۔ معافی کی جگہ معافی ہے۔ بدلے کی جگہ بدلا ہے، لڑائی کی جگہ لڑائی ہے، ملاپ کی جگہ ملاپ ہے، اور یہی بڑی دلیل اُس کی سچائی کی اور قانون قدرت کے بنانے والے کی طرف سے ہونے کی ہے"

"اسلام فساد اور دغا اور غدر و بغاوت کی اجازت نہیں دیتا، جس نے اُن کو (یعنی مسلمانوں کو) امن دیا ہو۔ مسلمان ہو یا کافر۔ اُس کی اطاعت اور احسانمندی کی ہدایت کرتا ہے۔ کافروں کے ساتھ جو عہد و اقرار ہوئے ہوں اُن کو نہایت ایمان داری کے ساتھ پورا کرنے کی تاکید کرتا ہے۔ خود کسی پر ملک گیری اور فتوحات حاصل کرنے کو فوج کشی اور خونریزی کی اجازت نہیں دیتا، کسی قوم یا ملک کو اس غرض سے۔ کہ اُن میں بالجبر اسلام پھیلایا جاوے۔ حملہ کرکے مغلوب و مجبور کرنا پسند نہیں کرتا۔ یہاں تک کہ کسی ایک شخص کو بھی اسلام قبول کرنے پر مجبور کرنا نہیں چاہتا صرف دو صورتوں میں اُس نے تلوار پکڑنے کی اجازت دی ہے۔ ایک۔ اُس حالت میں

جب کہ کافر اسلام کی عداوت سے اور اسلام کو معدوم کرنے کی غرض سے۔ نہ کسی ملکی اغراض سے۔ مسلمانوں پر حملہ آور ہوں، کیونکہ ملکی اغراض سے جو لڑائیاں واقع ہوں۔ خواہ مسلمان مسلمانوں میں خواہ مسلمان و کافروں میں۔ وہ دنیاوی بات ہے۔ اس کو مذہب سے کچھ تعلق نہیں ہے دوسرے جبکہ اُس ملک یا قوم میں مسلمانوں کو۔ اس وجہ سے کہ وہ مسلمان ہیں۔ اُن کی جان و مال کو امن نہ ملے اور فرائض مذہبی کے ادا کرنے کی اجازت نہ ہو۔ مگر اس حالت میں بھی بتایا ہے کہ جو لوگ اُس ملک میں بطور رعیت کے رہتے ہیں۔ گو صرف بوجہ اسلام کے اُن پر ظلم ہوتا ہو تو بھی اُن کو تلوار پکڑنے کی اجازت نہیں دی، یا اُس ظلم کو سہیں یا ہجرت کریں یعنی اُس ملک کو چھوڑ کر چلے جاویں۔

"یہی بات ہے جس پر اسلام نے تلوار پکڑنے کی اجازت دی ہے۔ یہی لڑائی ہے جس کا نام جہاد رکھا ہے اور یہی لڑائی ہے جس کے مقتولوں کو روحانی ثواب کا وعدہ دیا ہے، کون کہہ سکتا ہے کہ اس قسم کی لڑائی ناانصافی اور زیادتی ہے؟ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ لڑائی اخلاق کے برخلاف ہے؟ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ لڑائی قانون قدرت اور انسان کی فطرت کے مخالف ہے؟ کون کہہ سکتا ہے کہ اس لڑائی کا حکم خدا کی مرضی کے برخلاف ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ اس حالت میں بھی لڑائی کا حکم نہ ہونا بلکہ دوسرا گال پھیر دینا خدا کی مرضی کے مطابق ہوگا؟

"لڑائی شروع ہونے کے بعد تلوار ہر ایک کی دوست ہوتی ہے۔ اس میں بجز اسکے کہ دشمنوں کو قتل کرو، لڑائی میں بہادری کرو، دل کو مضبوط رکھو، میدان میں ثابت قدم رہو۔ فتح کرو یا مارے جاؤ، اور کچھ نہیں کہا جاتا، وہی قرآن نے بھی کہا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ کوئی شخص اس موقع اور محل کو۔ جس کی نسبت قرآن میں لڑنے والوں کے دلوں کے مضبوط کرنے کی آیتیں نازل ہوئی ہیں چھوڑ کر اُن آیتوں کو عموماً خونخواری اور خونریزی پر منسوب کرے۔ جیسا کہ اکثر نادان عیسائیوں نے کیا ہے۔ تو یہ خود اُس کا قصور ہوگا نہ اسلام کا"

"لڑائی میں بھی جو رحم قانون قدرت کے موافق ضرور ہے اسلام نے اُس میں بھی فروگذاشت نہیں کیا۔ عورتوں کو، بچوں کو، بوڑھوں کو اور جو لڑائی میں شریک نہ ہوئے ہوں اُن کو قتل کرنے کی ممانعت کی، عین لڑائی میں اور صف جنگ میں جو مغلوب ہو جاوے اُس کے قتل کی اجازت نہیں دی۔ صلح کو اور معاہدہ امن کو قبول کرنے کی رغبت دلائی۔ باغ کو، کھیتوں کو جلانے کی ممانعت کی۔ قیدیوں کو احسان رکھکر یا فدیہ لیکر چھوڑ دینے کا حکم دیا۔ ثابت

ظالمانہ طریقہ جو لڑائی کے قیدیوں کو - عورت ہوں یا مرد - غلام اور لونڈی بنا لینے کا تھا اس کو معدوم کیا - اس سے زیادہ لڑائی کی حالت میں انصاف اور رحم کیا ہو سکتا ہے؟ ہاں یہ سچ ہے کہ مسلمانوں نے اسمیں سے کسی کی بھی پوری تعمیل نہیں کی؛ بلکہ برخلاف اس کے بے انتہا ظلم و ستم کیے - مگر جبکہ وہ اسلام کے حکم کے برخلاف تھے تو اسلام کو اُس سے داغ نہیں لگ سکتا - وہ بھی تو مسلمانوں ہی میں سے تھے جنہوں نے عمرؓ کو، عثمانؓ کو، علیؓ کو، حسینؓ کو ذبح کر ڈالا تھا، کعبہ کو جلا دیا تھا - پس اُن کے کردار سے اسلام کو کیا تعلق ہے -

سر سید نے سورۂ بقرہ کی تفسیر میں مسئلہ جہاد کے متعلق صرف اسی قسم کے اجمالی بیان پر اکتفا کیا ہے - مگر سورۂ انفال اور سورۂ توبہ کی تفسیر میں اس بحث کو نئے سرے سے بہت بڑے اہتمام کے ساتھ اُٹھایا ہے اور اپنی تفسیر کی چوتھی جلد قریب نصف کے اِسی مسئلہ کی تحقیقات پر لکھی ہے -

انھوں نے سورۂ توبہ کی تفسیر میں اول بطور الزامی حجت کے آنحضرتؐ کی لڑائیوں کا مقابلہ حضرت موسیٰ کے قتل و غارت سے - جو کہ توریت میں مذکور ہے کیا ہے - اور لکھا ہے کہ آنحضرتؐ کی لڑائیاں اُس کے مقابلہ میں بالکل رحمت تھیں - اور جو لوگ توریت کو اور حضرت موسیٰ کو مانتے ہیں اُن کے لیے حضرت مسیح کا یہ قول کافی ہے کہ " تو اُس تنکے کو جو تیرے بھائی کی آنکھ میں ہے کیوں دیکھتا ہے اور جو شہتیر تیری آنکھ میں ہے اُسے دریافت نہیں کرتا " اس کے بعد وہ لکھتے ہیں " مگر ہمارا یہ طریقہ نہیں ہے کہ ہم صرف حجت الزامی پر اکتفا کریں بلکہ ہمارا مقصود ہر امر کی تحقیق کرنا اور اُس کی اصلیت کو ظاہر کرنا ہے اسلیے ہم اس امر کو بخوبی تحقیق کرنا چاہتے ہیں "

اسکے بعد اُنھوں نے اُن تمام اعتراضات کا - جو قدیم سے عیسائی اسلام کے مسئلہ جہاد پر کرتے چلے آئے ہیں - لب لباب بیان کر کے اس بات کا دعویٰ کیا ہے کہ تمام لڑائیاں جو آنحضرت صلعم کے زمانہ میں مسلمانوں اور کافروں کے درمیان ہوئیں اُن سے صرف امن قایم رکھنا اور کفار کے شر سے اسلام اور اہل اسلام کو بچانا مقصود تھا نہ کہ زبردستی ہتھیاروں کے زور سے - جیسا کہ عیسائی کہتے ہیں - اسلام منوانا - اور اُس کے ثبوت میں اول اُن تمام واقعات کی تفصیل بیان کی ہے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ تیرہ برس تک برابر آنحضرت صلعم اور مسلمانوں نے مکہ معظمہ میں قریش کے ہاتھوں سے کیسی کیسی سختیاں اور ظلم و ستم برداشت کیے اور کیا کیا مصیبتیں جھیلیں اور کس بیم و ہراس کی حالت میں یہ زمانہ اسلام اور

اور بانی اسلام پر گذرا یہاں تک کہ جب آنحضرت کے شفیق چچا ابو طالب کا انتقال ہو گیا تو دین اسلام کے معدوم کرنے یعنی رسول خدا صلعم کے قتل کا نہایت پختہ طور سے منصوبہ باندھا گیا۔ دو دفعہ انھیں سختیوں اور ظلم و ستم سے تنگ آ کر بہت سے مسلمان مرد اور عورتیں ہجرت کر کے حبشہ کو چلے گئے اور آخر کار آنحضرت کو اور تمام مسلمانوں کو ہمیشہ کے لیے وطن مالوف چھوڑ کر مدینہ کی طرف ہجرت کرنی پڑی۔ قریش نے ہجرت کے بعد بھی مسلمانوں کے آزار پہنچانے میں کمی نہیں کی۔ حبشہ کے مہاجروں کا تعاقب اُنھوں نے سمندر کے کنارہ تک کیا اور جب وہ ہاتھ نہ آئے تو نجاشی کے پاس بہت سے تحفے اور ہدیے بھیجکر مسلمانوں کو اُس سے مانگا مگر نجاشی نے اُن کے دینے سے انکار کیا۔ اہل مدینہ کے ساتھ بھی جنھوں نے آنحضرت کی نصرت کا وعدہ کیا تھا یا جو مکہ سے ہجرت کر کے وہاں آئے تھے۔ قریش نے بُرائی کرنے میں کچھ کمی نہیں کی اور مدینہ پر بھی قریش کے حملہ کرنے کا برابر خطرہ لگا رہا۔

جب کہ اسلام اور اہل اسلام کی یہ حالت تھی تو سر سید لکھتے ہیں کہ ”ایسی حالت میں آنحضرت صلعم کو اور مہاجرین و انصار کو اپنے اور مدینہ کی حفاظت اور امن قائم رہنے کے لیے + + + چار امر لازمی تھے کہ بغیر اُنکے کبھی امن اور مطلوبہ حفاظت کسی طرح قایم نہیں رہ سکتی تھی۔ (۱) اس بات کی خبر رکھنی کہ قریش مکہ کیا کرتے ہیں اور کس منصوبہ میں ہیں۔ (۲) جو قومیں کہ مدینہ یا نواح مدینہ میں رہتی تھیں اُن سے امن کا اور قریش کی مدد نہ کرنیکا معاہدہ کرنا، لیکن عہد شکنی کی حالت میں اُن سے مقابلہ کرنا اُس منصوبہ کے لیے ایسا ہی ضروری تھا جیسا کہ امن کا معاہدہ کرنا، کیونکہ اگر عہد شکنی کی مکافات قایم نہ کیجاسے تو کوئی معاہدہ اپنے عہد پر قایم نہیں رہ سکتا اور امن مطلوبہ حاصل نہیں ہو سکتا (۳) جو مسلمان کہ مکہ میں بمجبوری رہ گئے تھے اور موقع پاکر وہاں سے بھاگ آنا چاہتے تھے اُن کے بھاگ آنے پر جسقدر ہو سکے اُن کی اعانت کرنا۔ (چنانچہ جو قافلہ مکہ سے نکلتا تھا ہمیشہ احتمال ہوتا تھا کہ شاید اُس کے ساتھ بہانہ کر کے کوئی مسلمان مدینہ کی طرف بھاگنے کے ارادہ سے نہ نکلا ہو (۴) جو گروہ قریش کا مکہ سے مدینہ پر حملہ کرنے کو نکلے یا کسی طرح یہ احتمال ہو کہ وہ مدینہ پر آنے والا ہے اُسکا ہتھیاروں سے مقابلہ کرنا، کیونکہ ایسا کرنا اُسی امن کے قایم رکھنے کے لیے لازمی اور ضروری ہے“

اسکے بعد وہ لکھتے ہیں کہ ”انکے سوا دو امر اور ہیں جو ہتھیاروں کے اُٹھانے کا باعث ہوتے ہیں (۱) یہ کہ کفار اُن مسلمانوں کو۔ جو اُنکے قبضہ میں ہوں۔ تکلیف اور ایذا دیتے ہوں اور اُنکی مخلصی

کے لیے + + لڑائی کی جاوے + + + کون شخص ہے جو اس لڑائی کو انسانی اخلاق اور انسانی نیکی کے برخلاف کہہ سکتا ہے - اور یہ اتہام کر سکتا ہے کہ وہ زبردستی اور ہتھیاروں کے زور سے مذہب قبلوانے کے لیے ہے (۲) یہ کہ کفار مسلمانوں کو اُنکے احکام مذہبی ادا کرنے کے لیے مانع ہوں - بشرطیکہ وہ اُن کی عملداری میں رہتے ہوں - کیونکہ اِس صورت میں اُن کو وہاں سے ہجرت کرنی لازم ہے نہ لڑائی - اگرچہ اس لڑائی کی بنیاد ایک مذہبی امر پر ہے لیکن اس کا مقصد اپنی مذہبی آزادی حاصل کرنا ہے نہ کہ دوسروں کو + + ہتھیاروں کے زور سے مذہب کا منوانا "

پھر لکھتے ہیں کہ " ایک اور امر ہے جو انھیں قسموں کی لڑائیوں کا ضمیمہ ہے - یعنی جس ملک یا قوم سے انھیں امور (یعنی مذہبی امور) کے سبب مخالفت ہے اور لڑائی مشتہر ہو چکی ہے اُس ملک یا قوم پر چھاپہ مارنا یا اُنکا اسباب اور اُن کی رسد اور اُنکے ہتھیاروں کو لوٹ لینا - اس زمانہ تہذیب میں بھی کونسی مہذب سے مہذب قوم ہے جو اس فعل کو نامہذب و ناجایز قرار دے سکتی ہے ؟ اور کون ہے جو ہتھیاروں کے زور سے مذہب کا قبلوانا قرار دے سکتا ہے - تمام لڑائیاں جو آنحضرت صلعم کے زمانہ میں ہوئیں وہ انھیں امور پر مبنی تھیں - ایک لڑائی بھی اس غرض سے نہیں ہوئی کہ مخالفوں کو زبردستی اور ہتھیاروں کے زور سے اسلام منوایا جائے "

اِسکے بعد لکھتے ہیں کہ " اِس دعویٰ کا ثبوت دو طرح پر ہو سکتا ہے، اول اُن احکام سے جو قرآن مجید میں لڑائیوں کی نسبت وارد ہیں اور جنسے ظاہر ہوگا کہ لڑائی کا حکم صرف امن قایم کرنے کے لیے تھا نہ زبردستی سے اسلام قبلوانے کے لیے - دوسرے اُن لڑائیوں کے واقعات پر غور کرنے سے جو آنحضرت صلعم کے زمانہ میں واقع ہوئیں + + اسکے بعد ایک امر اور بحث طلب باقی رہ جائیگا (یعنی یہ) کہ ایک پیغمبر کو اس قسم کی لڑائیاں لڑنا بھی زیبا ہے یا خاموشی سے گردن کٹوا کر اور سر کو طشت میں رکھوا کر دشمن کے سامنے جانے دینا ؟ یا کافروں کے ہاتھوں میں اپنے تئیں ڈلوا کر صلیب پر چڑھنا اور جان دینا ؟ سو ہم اسپر بھی اخیر کو بحث کرینگے "

اس کے بعد اُنھوں نے نہایت شد و مد سے دعویٰ کیا ہے کہ قرآن کی کسی آیت میں جبراً مسلمان کرنے کا حکم نہیں ہے بلکہ مسلمان کرنے کے لیے صرف وعظ اور نصیحت کرنے کی ہدایت ہے - پھر وہ آیتیں نقل کی ہیں جن میں مذہب کی آزادی کا حکم ہے مثلاً سورہ نحل میں آنحضرت کو حکم ہے کہ " دعوت اسلام کر حکمت اور موعظہ حسنہ کے ساتھ اور اُن سے بحث کر پسندیدہ طریقہ کے ساتھ "۔ یا سورۂ نور میں حکم ہے کہ " خدا اور رسول کی فرمانبرداری کرو

اور اگر تم پھر جاؤ گے تو ہمارے رسول کے ذمہ صرف حکموں کا پہنچا دینا ہے''، یا سورۂ قاف میں فرمایا کہ ''اے پیغمبر تو اُن پر جبر کرنے والا نہیں ہے'' اور سورۂ غاشیہ میں فرمایا کہ ''اے پیغمبر تو صرف نصیحت کرنے والا ہے کچھ اُنپر کروڑا نہیں ہے'' اور سورۂ یونس میں فرمایا کہ ''اے پیغمبر کیا تو اُن کو مجبور کرتا ہے کہ وہ مسلمان ہو جائیں'' اور سورۂ بقرہ میں صاف صاف فرما دیا کہ ''دین میں کچھ جبر و اکراہ نہیں ہے''۔

اسکے بعد مخالفین کے اِس اعتراض کا ذکر کیا ہے کہ قرآن کی یہ نصیحتیں اُسی وقت تک تھیں جب تک کہ آنحضرت مکہ میں تھے مگر جب مدینہ میں چلے گئے اور مہاجرین و انصار ایک جگہ جمع ہو گئے اور اسلام کو قوت حاصل ہو گئی اُس وقت یہ نصیحتیں بدل دی گئیں اور تلوار کے زور سے مسلمان کرنے کا حکم دیا گیا، پھر اس کا جواب اس طرح دیا ہے کہ اول تو سورۂ نور اور سورہ بقرہ ہجرت کے بعد مدینہ میں نازل ہوئی ہیں جب کہ اسلام کو بخوبی قوت ہو گئی تھی؛ حالانکہ انھیں سورتوں میں۔ جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا۔ یہ حکم ہے کہ رسول کا کام صرف حکموں کو پہنچا دینا ہے اور دین میں کچھ جبر و اکراہ نہیں ہے۔ دوسرے خدا کے احکام جو بطور اصل اصول کے نازل ہوئے ہیں وہ جگہ کے بدلنے یا قوت و ضعف کے تفاوت سے تبدیل نہیں ہو سکتے۔ پس جب کہ آپ مکہ میں تھے جب بھی اور جب مدینہ میں چلے گئے جب بھی یہی حکم تھا کہ کوئی شخص زبردستی سے مسلمان نہ کیا جائے۔ ہاں جب آپ مدینہ میں تشریف لے گئے تو بے شک لڑائی کا حکم ہوا مگر نہ اس لیے کہ لوگوں کو جبراً مسلمان کیا جائے بلکہ محض امن قائم کرنے کے لیے جیسا کہ آیندہ تفصیل بیان کیا جائے گا۔

اِس کے بعد صلح اور معاہدہ کی حالت میں جو مذہبی آزادی قرآن میں غیر مسلمین کو دی گئی ہے اُس کا مفصل ذکر کیا ہے اور قرآن کی وہ تمام آیتیں نقل کی ہیں جن میں صلح و معاہدہ کے احکام بیان ہوئے ہیں۔ پھر قرآن مجید کی وہ تمام آیتیں جن میں کفار سے لڑنے کا حکم ہے ایک ایک کر کے ذکر کی ہیں اور نہایت وضاحت اور صفائی کے ساتھ اُن سے ثابت کیا ہے کہ قرآن میں صرف تین قسم کے لوگوں سے لڑائی کا حکم ہوا ہے (۱) اُن لوگوں سے جو خود مسلمانوں سے لڑائی شروع کریں (۲) اُن لوگوں سے جنھوں نے دغابازی کی ہو اور معاہدوں کو توڑ دیا ہو (۳) اُن لوگوں سے جنھوں نے مسلمانوں کو یا اُن کے

بچوں اور عورتوں کو عذاب اور تکلیف میں ڈال رکھا تھا۔ ان تین صورتوں کے سوا کہیں قرآن میں لڑائی کا حکم نہیں دیا گیا۔ پھر اُنہوں نے آنحضرت صلعم کے زمانہ کی تمام لڑائیاں جو غزوہ اور سریہ کے نام سے مشہور ہیں بالاستیعاب بیان کی ہیں اور ۲ سنہ سے ۹ سنہ تک ۳۱ غزوات اور ۵۲ سرایا کا مفصل حال حدیث اور سِیَر جغرافیہ کی سولہ معتبر کتابوں سے لکھا ہے اور کمال خوبی اور صفائی کے ساتھ ثابت کیا ہے کہ ان ۸۳ واقعات میں ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ہے جو اس غرض سے کیا گیا ہو کہ لوگوں کو بجبر و بزور شمشیر مسلمان کیا جائے بلکہ یہ تمام لڑائیاں اور مقابلے یا تو دشمنوں کی مدافعت اور اُنکا حملہ روکنے کے لیے ہوئے تھے، یا اُنکا ارادہ فاسد معلوم ہونے کے بعد اُن کو منتشر کرنے کو، یا اُن کی عہد شکنی اور دغا بازی ظاہر ہونے کے بعد، اور یا اُن لوگوں کی مدد کے لیے جو خبر رسانی کی غرض سے بھیجے گئے تھے اور دشمنوں سے اُن کا مقابلہ ہو گیا۔ اسکے بعد وہ لکھتے ہیں کہ ”دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں ہے کہ جس نے ملک کا انتظام ہاتھ میں لیا ہو اور اُس کو اس قسم کی لڑائیاں نہ پیش آئی ہوں۔ پھر ان لڑائیوں کی نسبت یہ کہنا کہ زبردستی ہتھیاروں کے زور سے مسلمان کرنے کے لیے تھیں ایک ایسا غلط قول ہے جس کو کوئی ذی عقل بجز اسکے جس کے دل میں تعصب بھرا ہو تسلیم نہیں کر سکتا“

پھر لکھتے ہیں کہ ”جس قوم کی کسی ملک میں حکومت ہو جاتی ہے قدرتی طور پر اُس قوم کے نہ صرف مذہب کو بلکہ رسم و رواج عادات و اطوار کو ترقی ہوتی ہے اور لوگ اُس کی طرف مائل ہوتے جاتے ہیں اور یہ مقولہ کہ ”اَلْمُلْکُ وَالدِّیْنُ تَوْأَمَانِ ہر ایک قوم اور ہر ایک مذہب پر صادق آتا ہے۔ اسی طرح اسلامی حکومت کے سبب اُسی قدرتی قاعدہ سے اسلام کی ترقی کو بھی مدد پہنچی + + + + بلکہ اسلام کی تاریخ میں ایک ایسا عجیب واقعہ پایا جاتا ہے جو اور کسی مذہب کی تاریخ میں نہیں ہے کہ فاتح[1] قوم نے فتح کامل حاصل کرنے اور استقلال کامل پانے

[1] یہاں فاتح قوم سے مراد خوانین تاتار ہیں جن میں سب سے زیادہ نامور چنگیز خاں اور ہلاکو خاں ہوئے ہیں جو مسلمانوں کے سخت دشمن تھے چنانچہ چنگیز خاں کا قول تھا کہ خدا تعالیٰ نے مجھے مسلمانوں کے قلع و قمع کیواسطے بھیجا ہے“ اُنکی حکومت تمام ایران توران خوارزم دست قبچاق اور روس وغیرہ میں پھیلی ہوئی تھی۔ اسی سلطنت اور حکومت کے زمانہ میں اول برکہ خاں چنگیز خاں کا پوتا مسلمان ہوا تھا اور پھر سلطان احمد جس کا نام اسلام سے پہلے نکودار تھا اسلام لایا اور پھر رفتہ رفتہ تمام تاتاریوں میں اسلام پھیل گیا ۱۲

کے بعد اپنی مفتوح قوم (یعنی مسلمانوں) کا دفعۃً مذہب اختیار کر لیا"

اسکے بعد آنحضرت کی بت شکنی میں جسکو مخالفین اسلام مثل سلاطین اسلام کی بت شکنی کے قابل الزام سمجھتے ہیں) اور محمود و عالمگیر وغیرہ کی بت شکنی میں فرق بیان کیا ہے۔ اور لکھا ہے کہ "کعبہ ایک مسجد تھی حضرت ابراہیم کی بنائی ہوئی خدائے واحد کی عبادت کے لیے اُس کے بعد جب عرب بت پرست ہو گئے تو اُس مسجد میں اُنھوں نے بت رکھدیے جنکا برباد کرنا اور دین ابراہیم کا اُس (مسجد) میں جاری کرنا ابراہیم کے پہلوٹھے بیٹے کے فرزند کو لازم تھا قوم عرب۔ جسکا غالب حصہ ابراہیم کی نسل سے تھا اور جس نسل میں خود آنحضرت بھی تھے اُس قوم کو بتوں کی پرستش سے چھڑانا اور ابراہیم کے خدا کی پرستش سکھانا ضرور تھا۔ پس آنحضرت نے خود اپنی قوم کے بت توڑے تھے۔ اس سے دیگر اقوام کے مذہب کی آزادی کو ضائع کرنا لازم نہیں آتا۔

اسکے بعد لکھتے ہیں کہ "مسلمانوں کی تاریخ میں جہاں بت شکنی اور غیر مذہب کے معبدوں کے برباد کرنے کی مثالیں ملتی ہیں۔ اسی طرح ہزاروں مثالیں اسکے برخلاف بھی موجود ہیں۔ مسلمانوں کی سلطنت دنیا کے بہت بڑے حصہ میں پھیلی ہوئی تھی، اُس میں مختلف مذہب کی قومیں رہتی تھیں تمام سینگاگ اور تمام گرجے۔ جو زیادہ تر رومن کیتھلک مذہب کے تھے۔ بدستور قربانی اور گھنٹے بجانے تھے، تمام ملک میں ناقوس کی آواز گونجتی تھی، مندروں میں بت موجود تھے، ہر ایک قوم اپنے مذہب میں آزاد تھی، پس ان تمام حالات کو۔ جو نہایت کثرت سے تھے۔ بھول جانا اور چند واقعات کو۔ جو اُسکے برخلاف شخصی طبیعت سے واقع ہوئے تھے۔ پیش کرنا اور کہنا کہ اسلام نے مذہبی آزادی کو مٹایا تھا محض ناانصافی ہے۔

اسکے بعد آنحضرت کے غزوات کی نسبت لکھتے ہیں کہ "تمام انبیا جب کہ قوم کی اصلاح اور اُن کی درستی کو کھڑے ہوتے ہیں تو ابتدا میں عموماً اُن کے دشمن چاروں طرف ہوتے ہیں اگر وہ مخالفوں سے محفوظ رہنے کی کوشش نہ کرتے تو دنیا میں نہ آج یہودی مذہب کا وجود ہوتا اور نہ کسی اور مذہب کا، اور نہ عیسائی مذہب کا نام باقی رہتا اگر بعد حضرت مسیح کے اُسکے لیے ایسا زمانہ نہ آتا جس میں اُسکے پیرووں کی مخالفین سے حفاظت کی گئی اور بزور حکومت اُس کو ترقی دی گئی۔ قرآن میں نہایت عمدہ اور بالکل سچ بات خدائے تعالیٰ نے فرمائی ہے وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ

وَمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللهِ كَثِيرًا (یعنی اگر خدا لوگوں کو ایک دوسرے سے دفع نہ کرتا تو ڈھا دی جاتیں عیسائیوں اور درویشوں کی خانقاہیں اور یہودیوں کے معبد اور مسلمانوں کی مسجدیں جنمیں بہت زیادہ خدا کا ذکر کیا جاتا ہے) پس یہ کہنا کہ انبیا کو ایسی لڑائیاں نازیبا ہیں ایک ایسا قول ہے جسکو قانون قدرت مردود ٹھیراتا ہے۔ لوگ حضرت موسیٰ کے کاموں کو تو بھول جاتے ہیں اور غریبی اور مسکینی اور مظلومی کی مثال میں حضرت مسیح کو پیش کرتے ہیں، مگر حضرت مسیح نے جب اپنے تئیں خلقت کے سامنے پیش کیا اسوقت سے اُن کی وفات تک نہایت قلیل زمانہ قریب تین برس کے گذرا تھا اور صرف ستر آدمیوں کے قریب (اس عرصہ میں) اُنپر ایمان لائے تھے۔ اُن کو مطلق ایسی قوت جس سے وہ اپنے دشمنوں کو دفع کر سکیں حاصل نہیں ہوئی تھی اور اسی سبب سے کالوری کے پہاڑ پر وہ افسوسناک واقعہ (یعنی مصلوب ہونا) واقع ہوا۔ اسکے بعد اگر اُسکے (یعنی دین مسیحی کے) ایسے حامی نہ پیدا ہو جاتے جو دشمنوں کو دفع کر سکے تو آج دنیا میں ایک بھی گرجا اور ایک بھی خانقاہ نہ دکھائی دیتی۔ اسکے علاوہ آنحضرتؐ کو روحانی بادشاہی کے سوا سلیمان کیسی سلطنت کے انتظام میں داخل ہونے میں بہت بڑی مجبوری تھی، عرب میں بادشاہت کا وجود نہ تھا ہر ایک قبیلہ کا سردار اُنکا حاکم ہوتا تھا اور جسکو سب لوگ بڑا سمجھتے تھے اُسکو بمجبوری افسر بنانا اور تمام ملکی انتظام کرنا لازم تھا، جبکہ تمام قبائل رفتہ رفتہ مسلمان ہو گئے تو امکان سے خارج تھا کہ وہ لوگ سوائے آنحضرتؐ کے اور کسی کو اپنا سردار تسلیم کرتے اور تمام معاملات ملکی بجز آنحضرتؐ کے حکم کے اور کسی کے حکم سے تعمیل پاتے۔ پس ہر بات پر انصاف سے غور کرنا چاہیے نہ تعصب سے"

سرسید کی ان تمام تحریروں کا۔ جو کہ اُنہوں نے جہاد کے متعلق ۱۸۵۷ء سے لکھنی شروع کی تھیں اور جن کا تفسیر القرآن پر خاتمہ ہو گیا۔ یہ نتیجہ ہوا ہے کہ بہت سے منصف مزاج انگریزوں نے اس بات کو تسلیم کر لیا ہے۔ کہ دین اسلام میں جبراً مسلمان کرنے اور کفار سے عموماً جہاد کرنے کا حکم نہیں ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے اواخر ۱۸۷۱ء میں ہندوستان کے ایک بہت بڑے عربی داں حاکم نے ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب پر ریویو کرتے ہوئے لکھا تھا کہ "جہاد (ازروے اُصول اسلام) اُن لوگوں کے مقابلہ میں ہونا چاہیے۔ جو صرف کافر ہی نہیں بلکہ تعمیل شرائط اسلام میں مزاحمت بھی کرتے ہوں۔ الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوا عَن سَبِيلِ اللهِ، ++ جہاد کی شرط ضروری یہ ہے کہ حاکم کی طرف سے احکام اسلام کی تعمیل میں مسلمانوں پر جبر و تعدی یا مزاحمت ہوتی ہو + + اور جبر و تعدی و مزاحمت جو وجوب جہاد کے لیے شرط ہے وہ بھی معاملات

باہمی میں معتبر نہیں بلکہ معاملات مذہبی میں ہونی ضرور ہے +++ مسلمان جو انگریزی عملداری کے ظل حمایت میں رہتے ہیں جہاد کے باب میں اُن کو شریعت نے ایسی سخت قیود کے ساتھ جکڑ رکھا ہے کہ جب تک وہ تمام شرائط نہ پائے جائیں جہاد پر اقدام نہیں کر سکتے حالانکہ انگریزی عملداری میں اُن میں سے کوئی شرط بھی پائی نہیں جاتی بلکہ فی زمانہ مسلمانوں کو وہ امن حاصل ہے جو پیغمبر صاحب اور اُن کے ہمراہیوں کو نجاشی نصرانی فرمانروائے ابیسینیا کی حمایت میں حاصل تھا۔ پس جب تک اس طرح کا امن باقی ہے بغاوت ایک شرعی گناہ سمجھا جائیگا"

مسٹر ٹی ڈبلیو آرنلڈ جو ایک نہایت سچے اور منصف مزاج عیسائی ہیں اُنہوں نے تو اپنی کتاب پریچنگ اوف اسلام میں (جو ابھی شائع ہوئی ہے) اس بحث کا بالکل خاتمہ کر دیا ہے کہ قرآن کی رو سے غیر مذہب والوں کو بزور شمشیر مسلمان کرنے کا حکم ہے یا بذریعہ وعظ و نصیحت کے؟ اور اگر ہمارا قیاس غلط نہو تو اسمیں کچھ شک نہیں معلوم ہوتا کہ جن اسباب سے پروفیسر ممدوح کے دل میں پریچنگ اوف اسلام پر کتاب لکھنے کا خیال پیدا ہوا اور اُس میں کامیابی کی امید بندھی اُن میں ایک بڑا محرک سرسید کی تحریرات کا مطالعہ تھا۔

معراج

معراج کے مسئلہ پر بھی سرسید نے تفسیر میں نہایت مفصل بحث کی ہے جو اُن سے پہلے کسی مفسر نے نہیں کی۔ معراج جسمانی پر جو عیسائی یہ اعتراض کرتے تھے کہ یہ عقل سے بالکل خلاف ہے اُس کے الزامی جواب ازالۃ الاوہام وغیرہ میں عہد عتیق و عہد جدید کے حوالوں سے نہایت شرح و بسط کے ساتھ لکھے گئے ہیں۔ مگر یہ جوابات اُن لوگوں کے لیے کافی نہ تھے جو توریت و انجیل کو نہیں مانتے یا بالکل قید مذہب سے آزاد ہیں اسلیے ضرور تھا کہ معراج کے سوال پر محققانہ بحث کیجائے اور معراج کی حقیقت جو قرآن و حدیث سے پایہ ثبوت کو پہنچتی ہے اُس کو ظاہر کیا جائے۔ سرسید نے اس مسئلہ پر اپنی تفسیر کے ۴۰ صفحہ میں نہایت بسط کے ساتھ بحث کی ہے مگر ہم اس موقع پر صرف اُس کا لُبِّ لباب بیان کرینگے جن کو تفصیل دیکھنی منظور ہو وہ اصل تفسیر کو ملاحظہ کریں۔

اُنہوں نے اُن تمام روایتوں میں سے جو معراج کے متعلق حدیث اور سیر کی کتابوں میں قلمبند کی گئی ہیں۔ غالباً کوئی روایت باقی نہیں چھوڑی اور چونکہ ان روایتوں میں اسقدر اختلاف ہے کہ شاید ہی کسی اور مضمون کی روایات میں ایسا اختلاف ہوگا اسلیے معراج کے تمام جزئیات کے متعلق جس قدر اختلافات ہیں اُن سب کو اول جدا جدا بیان کیا ہے

مثلاً اس بات میں اختلاف کہ معراج کب ہوئی؟ یا یہ کہ معراج اور اسراء (جس کا ذکر قرآن مجید میں ہوا ہے) ایک واقعہ تھا یا دو جداگانہ واقعات تھے؟ یا معراج ایک دفعہ ہوئی دو دفعہ؟ یا معراج جسد کے ساتھ بیداری میں ہوئی یا روح کے ساتھ رویا میں؟ غرض اسی قسم کے بے شمار اختلافات جو روایات متعلقہ واقعہ معراج میں پائے جاتے ہیں اُن سب کو مع ہر ایک روایت کے بیان کیا ہے۔ پھر ان اختلافات کے اسباب اور وجوہ جو قرین قیاس تھے بیان کئے ہیں۔ بعد اسکے انہوں نے اس بات کا ثبوت دیا ہے کہ معراج اور اسراء درحقیقت ایک ہی واقعہ تھا اور وہ ابتدا سے اخیر تک روح کے ساتھ اور خواب کی حالت میں واقع ہوا تھا اور اس دعوی پر پانچ دلیلیں لکھی ہیں جن میں سے پہلی دلیل گویا اس شبہہ کا جواب ہے کہ سورۂ بنی اسرائیل کی پہلی آیت جسمیں مسجد حرم سے مسجد اقصیٰ تک جانا بیان ہوا ہے۔ اُس میں کوئی لفظ ایسا نہیں جو خواب میں جانے پر دلالت کرتا ہو۔ سو اسکے جواب میں اُنھوں نے سورۂ یوسف کی یہ آیت کہ "اِنِّیْ رَاَیْتُ اَحَدَ عَشَرَ کَوْکَبًا" اور صحیح مسلم کی چند حدیثیں پیش کی ہیں جن میں کوئی لفظ خواب پر صراحۃً دلالت نہیں کرتا حالانکہ سب کے نزدیک اُن میں خواب کا بیان ہے۔ دوسری دلیل میں سورۂ بنی اسرائیل کی یہ آیت پیش کی ہے "وَمَا جَعَلْنَا الرُّؤْیَا الَّتِیْٓ اَرَیْنٰکَ اِلَّا فِتْنَۃً لِّلنَّاسِ" (یعنی ہمنے نہیں گردانا اُس خواب کو جو تجھے دکھایا مگر ایک امتحان لوگوں کے لیے) قطع نظر اس کے کہ یہ آیت اسی سورۂ بنی اسرائیل میں واقع ہوئی ہے جس میں اِسراء کا ذکر ہوا ہے۔ صحیح بخاری سے دو حدیثیں عبداللہ ابن عباس کی نقل کی ہیں جن میں صاف صاف اس بات کی تصریح ہے کہ جس رویا کا اس آیت میں ذکر ہے یہ وہی رویا ہے جو رسول خدا صلعم کو لیلۃ الاسراء میں دکھایا گیا۔ تیسری دلیل میں بخاری اور مسلم سے مالک ابن صعصعہ اور انس ابن مالک کی روایتیں نقل کی ہیں جن سے صاف پایا جاتا ہے کہ معراج کے وقت آپ سوتے تھے۔ چوتھی دلیل یہ لکھی ہے کہ منجملہ صحابہ کے معاویہ، حسن، حذیفہ بن الیمان اور حضرت عائشہ کا یہ مذہب تھا کہ معراج خواب میں واقع ہوئی ہے نہ بیداری میں۔ پانچویں دلیل موافق اصول علم حدیث کے یہ لکھی ہے کہ جب عقل اور نقل میں بظاہر اختلاف پایا جائے تو نقل کے معنی اس طرح بیان کرنے چاہئیں جو عقل کے مطابق ہوں اور بڑے بڑے علما مثل امام سخاوی، ابن جوزی،

ابوبکر بن الطیب وغیرہم کے اقوال اس باب میں نقل کئے ہیں کہ حدیث کے موضوع ہونے کی نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ ہے کہ اُسکا مضمون عقل یا حس اور مشاہدہ کے خلاف ہو اس دلیل کے ذیل میں ایک لطیف بحث اس مضمون پر کی ہے کہ حدیثیں جو کتب احادیث میں جمع کی گئی ہیں اُن کے الفاظ بعینہ رسولِ خدا صلعم کے الفاظ نہیں ہیں بلکہ راویوں کے الفاظ ہیں جو اُنہوں نے اپنی سمجھ کے موافق بیان کئے ہیں اور اسکے ثبوت میں تابعین و تبع تابعین کے اقوال نقل کیے ہیں جن میں سے حسن اور سفیان ثوری کا یہ قول ہے کہ اگر ہم حدیث اُسی طرح بیان کرنی چاہیں جس طرح سُنی ہے تو ایک حرف بھی نہ بیان کر سکیں غرضکہ اس مطلب کو نہایت خوبی سے ثابت کیا ہے اور اُس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ معراج کی حدیثوں میں جس قدر واقعات عقل کے خلاف پائے جاتے ہیں ضرور ہے کہ اُن کی تاویل عقل کے مطابق کی جائے نہ یہ کہ جن روایتوں سے معراج کا خواب میں ہونا پایا جاتا ہے اُن کو تاویلات بعیدہ اور رکیکہ اور دلائل فرضیہ دور از کار سے ایسا واقعہ بنا دیا جائے جو حقیقت اور عقل دونوں کے خلاف ہو۔

تیسری خصوصیت

تیسری خصوصیت اس تفسیر کی یہ ہے کہ اُس میں برخلاف قدیم تفسیروں کے روایات کی طرف بغیر سخت ضرورت کے بہت ہی کم رجوع کیا گیا ہے۔ اس بات کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ ہماری قدیم تفسیریں باتفاق تمام محققین اہل اسلام کے عموماً بے سند اور موضوع و ضعیف حدیثوں اور یہودیوں کے قصوں سے بھری ہوئی ہیں اور اس کا ایک بدیہی ثبوت یہ ہے کہ جس قدر روایتیں تفسیر القرآن کے متعلق صحاح میں وارد ہوئی ہیں اگر اُن سب کو بعد حذف اسناد کے ایک جگہ جمع کیا جائے تو تمام مجموعہ معدود صفحات سے زیادہ نہوگا حالانکہ کتب تفاسیر کی تمام روایتوں اور قصوں کو اگر جمع کیا جائے تو کم سے کم ایک ضخیم جلد مرتب ہو سکتی ہے۔

اگرچہ روایات کے باب میں مفسرین کی بے احتیاطی اور عدم مبالات قدیم زمانہ میں بھی قابل الزام تھی لیکن اِس زمانہ میں۔ جبکہ ہر مذہب پر اعتراض اور نکتہ چینی کرنے کی ہر شخص کو آزادی ہے اور الحاد و دہریت کا ہر طرف زور شور ہے۔ ایسی روایتوں اور قصوں اور بے سروپا نیچرل افسانوں کو تفسیروں میں درج کرنا صرف یہی نہیں کہ اسلام کو مخالفین کے اعتراضوں کا نشانہ بنانا ہے بلکہ خود مسلمان نوجوانوں کو جو اس زمانہ کے علوم کی تعلیم پاتے ہیں اسلام سے بدگمان بلکہ متنفر کرنا ہے۔

چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ اس تفسیر میں برخلاف اکثر قدیم تفسیروں کے ہر ایک آیت کی تفسیر کے متعلق تمام اقوال مختلفہ نقل کر کے ناظرین کے ذہن کو پریشان نہیں کیا گیا بلکہ جو قول راجح معلوم ہوا صرف اس کو ذکر کیا گیا ہے اور باقی مرجوح اقوال کو یا تو بالکل ذکر نہیں کیا اور یا بشرط ضرورت ہر ایک قول میں جو کمزوری یا ضعف دیکھا اُس کو بھی بیان کر دیا ہے آجکل ایسی تفسیریں - جن میں قرآن کے معنی معین نہیں کیے جاتے اور ایک ایک آیت یا ایک ایک لفظ کی شرح میں متعدد احتمالات اور مختلف اقوال نقل کیے جاتے ہیں - اُن لوگوں کے دل میں - جو مذہب کو موروثی جیز نہیں سمجھتے اور تقلید کی قید سے آزاد ہیں - بجائے اس کے کہ مفسر کے تبحر اور احاطہ علمی کا نقش جمائیں ممکن ہے کہ دوسری قسم کے خیالات پیدا کریں اور جس کتاب کی نسبت خدا نے یہ فرمایا تھا کہ " لو کان من عند غیر اللہ لوجدوا فیہ اختلافا کثیراً " اُس میں بے شمار اختلافات دیکھ کر طرح طرح کے شکوک وشبہات میں پڑ جائیں - پس اسوقت زمانہ کا اقتضا ہر گز یہ نہیں کہ آیات قرانی کی تفسیر میں متعدد اقوال اور مختلف رائیں بیان کر کے اُن کو اُسی طرح غیر منفصل چھوڑ دیا جائے اور قرآن کے معنی معین نہ کیے جائیں -

پانچویں سب سے بڑی اور معرکۃ الآرا خصوصیت اس تفسیر کی - جیسا کہ پہلے حصہ میں مذکور ہو چکا ہے یہ ہے کہ اسلام میں - جہاں تک کہ معلوم ہے - سب سے پہلی کوشش اُن شبہات کے رفع کرنے کے لیے جو علوم جدیدہ کی تعلیم سے قرآن مجید کے بعض مضامین کی نسبت لوگوں کے دلوں میں پیدا ہو سکتے تھے اس تفسیر میں کی گئی ہے - اس بات میں جو کوشش بلیغ سرسید نے کی ہے اُس کا پورا پورا اندازہ - بغیر اسکے کہ اُنکی تفسیر کو اول سے آخر تک دیکھا جائے کسی طرح نہیں ہو سکتا - مگر چونکہ اُس میں بمقابلہ علوم جدیدہ کے ایک نئے علم کلام کی بنیاد ڈالی گئی ہے اور صدہا مقامات میں جمہور مفسرین سے اختلاف کیا گیا ہے اور ہر ایک آیت کے معنی ایک خاص اصول کے موافق بیان کیے گئے ہیں اس لیے ممکن نہیں کہ مفسر کے بیان میں کچھ لغزشیں نہ ہوئی ہوں - لیکن ایسے مستثنیات سے تمام تفسیر کی خوبی زائل نہیں ہو سکتی - بلکہ انصاف کا مقتضا یہ ہے کہ اگر تمام تفسیر میں ایک آیت کے معنی بھی اسلوب قرآن اور اصول عربیت کے موافق ایسے بیان کیے گئے ہوں جن کی رو سے کوئی اعتراض جو قدیم تفسیروں پر وارد ہوتا ہے - یقیناً رفع ہوتا ہو -

تو گو وہ معنی تیرہ سو برس میں کسی مفسر نے نہ لکھے ہوں ۔ بلاشبہ تسلیم کرنے کے قابل ہیں ۔
اگرچہ ہمارا ارادہ ۔ جیساکہ دیباچہ میں اشارہ کیا گیا ہے ۔ اس تفسیر کی مذکورہ بالا خصوصیت پر مفصل بحث کرنے کا تھا لیکن چونکہ یہ بحث بہت طولانی ہے جس کی ایک بائیوگرفی متحمل نہیں ہو سکتی اسکے سوا عام ناظرین کو اس مضمون سے چنداں دلچسپی بھی نہیں معلوم ہوتی اسلئے جو کچھ اس کے متعلق ہم نے لکھا ہے یا آیندہ لکھیں گے اسکو کسی باوقعت میگزین کے متعدد نمبروں میں وقتاً فوقتاً شائع کیا جائیگا ۔

ریفارمر (حاشیہ)

ظاہر ہے کہ سرسید نے اپنی تصنیفات اور عام تحریروں اور پبلک اسپیچوں کے ذریعہ سے اور نیز خود مثال بنکر قوم کے پولٹکل اور سوشل خیالات اور خاصکر اُردو لٹریچر میں ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیا ہے اور اسلئے اونکو قوم کا پولٹکل، سوشل اور لٹریری رفارمر کہا جا سکتا ہے، لیکن اس مقام پر رفارمیشن سے ہماری مراد قوم کے مذہبی خیالات کی اصلاح ہے جو فی الواقع ایک نہایت سخت دشوار کام تھا اور جسکی وجہ سے اُس قوم کے فدائی کو کافر دجال ملحد اور مرتد سمجھا گیا۔
اگرچہ سرسید کا اصل مقصد مسلمانوں کی پولٹکل اور سوشل حالت کا درست کرنا تھا لیکن چونکہ مسلمان اپنے مذہب کو ہمیشہ سے دین اور دنیا دونوں کا رہبر سمجھتے رہے ہیں اور کسی بات کو خواہ دینی ہو خواہ دنیوی ۔ جب تک کہ اُس کا ثبوت مذہب کی رو سے نہ دیا جاے ۔ تسلیم نہیں کرتے اور نیز مسلمانوں کی پولٹکل حالت کو بہت کچھ تعلق اُن کے مذہب کے ساتھ تھا ۔ اسلئے سرسید کو ۱۸۵۷ع کے بعد سے آخیر دم تک برابر مذہبی مباحث میں مشغول رہنا پڑا ۔
اس بات کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ جس طرح ہر مذہب میں جسقدر کہ بانی مذہب کا زمانہ بعید ہوتا جاتا ہے ۔ اسی قدر بہت سی باتیں جنکو اصل مذہب میں چنداں دخل نہیں ہوتا ۔ داخل ہوتی جاتی ہیں ۔ اسی طرح دین اسلام میں رفتہ رفتہ بہت سے امور ایسے شامل ہو گئے جو درحقیقت دین کی ذاتیات سے خارج تھے، مثلاً اصول عقائد میں صدہا مسائل ایسے داخل کر دیے گئے جنکا صدر اسلام میں کہیں پتا نہ تھا مگر اب وہی علم جس میں اُن مسائل پر بحث کی جاتی ہے ۔ منجملہ علوم دینیہ کے ایک نہایت مہتم بالشان علم ۔ موسوم بہ علم کلام ۔ سمجھا جاتا ہے، یا مثلاً فروع میں بے شمار جزئیات ۔ جن کی بنیاد محض قیاس پر ہے ۔ مثل نصوص کتاب و سنت کے واجب التسلیم سمجھی جاتی ہیں، مفسرین کی رائیں اور اُن کے اقوال ۔ جو اُنھوں نے آیات قرآنی کی تفسیر میں بیان کیے ہیں ۔ وہ بھی مثل آیات قرآنی کے واجب الاذعان مانے جاتے ہیں، اصول فقہ جو بڑھتے بڑھتے

ایک وسیع علم بنگیا ہے۔ وہ بھی دینیات میں ایک نہایت ضروری علم شمار ہوتا ہے، جسقدر رطب ویابس روایتیں اور بے سروپا قصے کتب تفسیر وسلوک وسیر میں درج کئے گئے ہیں وہ سب بغیر اسکے کہ اُن کو اصول تنقید کے موافق جانچا جائے رسول خدا صلعم کی طرف منسوب کی جاتی ہیں، صحاح میں جو حدیثیں امت کی اصلاح معاش سے علاقہ رکھتی ہیں اور جن کی نسبت آنحضرت صلعم نے فرمایا ہے کہ "انتم اعلم بامور دنیاکم" وہ بھی اُن حدیثوں کی طرح۔ جو تبلیغ رسالت سے متعلق ہیں۔ تعلیم دین میں شمار کی جاتی ہیں۔ اس کے سوا جب متعدد فرقے اسلام میں پیدا ہوگئے تو بہت سے خیالات دور از کار اپنے اپنے مذہب کی طرفداری اور تعصب کی وجہ سے ہر مذہب کے اجزاے غیر منفک بن گئے، پھر جہاں اسلام پہنچا اُن ملکوں کی اکثر رسمیں اور رواجات اور اوہام شدہ شدہ مذہب کے رنگ میں رنگے گئے اور اس طرح اسلام جسکی نسبت کہا گیا تھا کہ "الدین یسر" ہا ایک دفتر بے پایاں کا نام۔ جو دائرہ حصر واحصا سے خارج ہے۔ قرار پاگیا اور ان تمام حشو وزوائد کا اصل دین سے جدا کرنا ایسا ہی مشکل ہوگیا جیسا گوشت کا ناخن سے جدا کرنا! اگرچہ علم کلام، علم فقہ، اصول فقہ اور تفسیر مسلمانوں کے لئے سرمایہ افتخار اور قوم کی اعلیٰ درجہ کی دماغی اور ذہنی قابلیت کے نہایت روشن ثبوت ہیں۔ اور کچھ شبہہ نہیں کہ دین اسلام کو اُن سے بے انتہا مدد پہنچی ہے۔ مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ دینیات میں اونکو کتاب وسنت کے برابر درجہ دیا جائے ورنہ ضرور ہے کہ عربی صرف ونحو ومعانی وبیان ولغت کو بھی دینیات میں وہی درجہ دیا جائے جو علوم مذکورہ بالا کو دیا گیا ہے کیونکہ اسلام کو ان علوم سے بھی کچھ کم مدد نہیں پہنچی۔

اگرچہ اسلام کے ہر طبقہ اور ہر دورہ میں ایسے آزاد طبع اور روشن ضمیر لوگ ہمیشہ اُٹھتے رہے ہیں جنہوں نے تقلید کی بندشوں کو توڑ کر میدانِ تحقیق میں قدم رکھا ہے اور بڑے بڑے مہتم بالشان مسائل کے متعلق مذہب جمہور کی غلطیاں ظاہر کی ہیں۔ لیکن چونکہ وہ زمانہ اسلام کی حکومت اور مسلمانوں کے عروج اور ترقی کا تھا اور معترضین اسلام کی زبانیں آج کل کی طرح کھلی ہوئی نہ تھیں۔ لہذا جو ضرورتیں اسلام کو موجودہ زمانہ میں پیش آئیں اون سے وہ بزرگ بالکل بے خبر تھے، اسکے سوا ممالک اسلامیہ میں علماے اسلام کو یہ آزادی نہ تھی کہ بادشاہ وقت کے مذہب کے خلاف کوئی بات بیباکانہ زبان سے نکال سکیں۔ اس لیے علماے سلف میں سے کسی ایک شخص نے عام اصلاح کا کبھی ارادہ نہیں کیا! کسی نے احادیث کی تنقید کی طرف لوگوں کو متوجہ کیا اور انکے جانچنے کے قواعد مقرر کئے، کسی نے شرایع اور مصالح میں تفرقہ کیا اور جو حدیثیں شرائع سے متعلق

تھیں اُن کے لیے الگ اور جو مصالح سے متعلق نہیں اُن کے لیے الگ درجہ قرار دیا، کسی نے تقلید کی بندشوں کو توڑا، کسی نے اجماع اور قیاس کے حجت ہونے سے انکار کیا، کسی نے آیات متشابہات میں تاویل کرنے کی راہ کھولی، کسی نے مفسرین و واعظین کے بے سروپا قصوں اور بے سند روایتوں کی بے اعتباری ظاہر کی، کسی نے آیات منسوخہ کو جنکی تعداد پانسو تک پہنچگئی تھی بلکہ حصر و احصا سے خارج ہوگئی تھی بیس سے بھی کم میں محدود کیا، کسی نے متکلمین کے منطقیانہ استدلالات و توجیہات کو جوکہ وہ اپنے اپنے مذہب کی نصرت اور حمایت کے لیے آیات قرآنی کی تفسیر میں کرتے تھے مقصد شارع کے خلاف ثابت کیا، کسی نے تعمق و تشدد پر رد و قدح کی، کسی نے شرک و بدعت کے استیصال پر کمر باندھی اسی طرح مختلف زمانوں میں خاص خاص خرابیوں کی اصلاح ہوتی رہی مگر عام طور پر کسی کو اس بات کے کہنے کی جرأت نہوئی کہ خالص اسلام کی تعلیم قرآن مجید اور حدیث صحیح میں منحصر ہے باقی جو کچھ ہے وہ اسلام کی حقیقت سے خارج ہے نہ اسلام اُسکا جوابدہ ہے اور نہ مسلمان اُسپر اعتقاد رکھنے کے مکلف ہیں۔

سرسید نے۔ اگر غور کرکے دیکھا جاے۔ توشاید اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا کہ جو صداقتیں اہل اسلام کی تصنیفات میں فرداً فرداً صرف ضبط تحریر میں آئی تھیں اور اکابر علما کے سوا اُن سے کسی کو اطلاع نہ تھی۔ سرسید نے اُن سب کو ایک ہی بار خاص و عام پر علی الاعلان ظاہر کردیا کیونکہ جو ضرورتیں اسوقت خاصکر ہندوستان کے مسلمانوں کو درپیش تھیں وہ کسی خاص خرابی کی اصلاح سے رفع نہیں ہوسکتی تھیں۔ مسلمانوں کی سلطنت ہندوستان سے جاچکی تھی اور قومی تعصبات جو بعد سلب حکومت کے مفتوح قوم کو فاتح قوم کے ساتھ ایک مدت تک ضرور باقی رہتے ہیں۔ مذہبی تعصبات کے لباس میں ظہور کررہے تھے جس سے حکمران قوم کی نظر میں مسلمانوں کا اعتبار روز بروز کم ہوتا جاتا تھا اور اونکا مذہب سلطنت کے حق میں خطرناک خیال کیا جاتا تھا، مسلمانوں سے جو بُری بات سرزد ہوتی تھی وہ اونکے مذہب کی طرف منسوب کی جاتی تھی، فقہا کے فتوے جو مسلمانوں کی دنیوی ترقی کے مانع تھے۔ اکثر انہیں قومی تعصبات پر مبنی ہوتے تھے اور مسلمان ان کو وحی منزل کی طرح دل و جان سے قبول کرتے تھے، عیسائی مشنری مسلمانوں کی سیر اور تاریخ کی کتابیں اور اونکی تفسیریں دیکھہ دیکھکر اسلام اور بانی اسلام پر اعتراض کرتے تھے اور اسلام کو اُنکا جوابدہ سمجھ کر مسلمانوں سے جواب طلب کرتے تھے، تعلیم یافتہ مسلمان بہت سی باتیں مروجہ اسلام میں سائنس کے خلاف دیکھکر اسلام کی خالص تعلیم سے جو کتاب و سنت

میں منحصر ہے بد اعتقاد ہونے لگے تھے ؛ اور یہ تمام حالات اس بات کے مقتضی تھے کہ خالص اسلام میں اور اون چیزوں میں جو اسلام میں مل جلکر اوس کی ذات میں داخل ہوگئی ہیں امتیاز قایم کیا جائے اور جو مشکلات اس اختلاط اور امتزاج سے پیدا ہوئی ہیں اون کو رفع کیا جائے -

اگرچہ سرسید نے اپنی رفارمیشن میں اُن اصول سے جن پر قدیم محققین کی اصلاحیں مبنی تھیں بہت ہی کم تجاوز کیا ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ زمانۂ حال کی ضرورتوں کے اقتضا سے قدیم اصلاحوں میں خود بخود ایک قسم کی وسعت پیدا ہوگئی ہے - مثلاً تمام محققین اس بات پر متفق ہیں کہ خبر متواتر اور خبر مشہور کے سوا - جنکی تعداد کتب احادیث میں نہایت قلیل ہے جو حدیثیں خبر احاد کہلاتی ہیں اور جنسے صحاح ستہ اور تمام حدیث کی کتابیں بھری ہوئی ہیں مفید یقین نہیں ہیں بلکہ اون میں احتمال صدق اور کذب کا باقی ہے - اور اس اصول سے اُنھوں نے یہ نتیجہ نکالا تھا کہ خبر واحد - بشرطیکہ صحت کے درجہ کو پہنچ جائے - اُسپر صرف عمل کرنا واجب ہے مگر اُسپر اعتقاد رکھنا ضرور نہیں اور بعض کے نزدیک عمل اور اعتقاد دونوں ضرور نہیں - سرسید نے اس نتیجہ کو زیادہ وسیع کر دیا ہے - اونکی یہ رائے ہے کہ جب خبر واحد میں صدق و کذب کا احتمال باقی ہے تو کیا وجہ ہے کہ جس خبر واحد کی روسے اسلام پر کوئی اعتراض وارد ہوتا ہو خواہی نخواہی اُس خبر کو تسلیم کر لیا جائے - اور بعد تسلیم کرنے کے اس اعتراض کا جواب دوسری طرح پر دیا جائے بلکہ اُس اعتراض کے جواب میں صرف اسقدر کہنا کافی ہے کہ خبر واحد مفید یقین نہیں اور اس لیے جو اعتراض اوسکی روسے وارد ہوتا ہے اسلام اُس کا جوابدہ نہیں ہے یہ رائے صرف سرسید ہی کی نہیں بلکہ اُن سے پہلے بھی علماے اسلام نے اس اصول کو تسلیم کیا ہے - امام رازی سے فرقۂ حشویہ کے ایک شخص نے آنحضرت صلعم سے یہ روایت کی کہ " ماکذب ابراھیم الا ثلث کذبات " (یعنی ابراہیمؑ نے صرف تین جگہ جھوٹ بولا ہے) امام نے کہا " بہتر یہ ہے کہ ایسی روایتیں قبول نہ کی جائیں " اُس نے بطور تعجب کے کہا " اگر ہم اس روایت کو قبول نہ کریں تو راویوں کی تکذیب لازم آئیگی " امام نے کہا " اے مسکین اگر ہم قبول کرلیں تو ہم کو ابراہیم کی طرف جھوٹ کی نسبت کرنی پڑتی ہے اور اگر اوسکو نہ مانیں تو راویوں کی طرف جھوٹ کو منسوب کرنا ہوگا ، اور کچھ شک نہیں کہ ابراہیمؑ کو جھوٹ کی نسبت سے بچانا بہتر ہے بہ نسبت اسکے کہ چند مجاہیل کو جھوٹ سے بچایا جائے "

تھیں اُن کے لیے الگ اور جو مصالح سے متعلق نہیں اُن کے لیے الگ درجہ قرار دیا، کسی نے تقلید کی بندشوں کو توڑا، کسی نے اجماع اور قیاس کے حجت ہونے سے انکار کیا، کسی نے آیات متشابہات میں تاویل کرنے کی راہ کھولی، کسی نے مفسرین و واعظین کے بے سروپا قصوں اور بے سند روایتوں کی بے اعتباری ظاہر کی، کسی نے آیات منسوخہ کو جنکی تعداد پانسو تک پہنچگئی تھی بلکہ حصر و احصا سے خارج ہوگئی تھی بیس سے بھی کم میں محدود کیا، کسی نے متکلمین کے منطقیانہ استدلالات و توجیہات کو جو کہ وہ اپنے اپنے مذہب کی نصرت اور حمایت کے لیے آیات قرآنی کی تفسیر میں کرتے تھے مقصد شارع کے خلاف ثابت کیا، کسی نے تعمق و تشدد پر رد و قدح کی، کسی نے شرک و بدعت کے استیصال پر کمر باندھی اسی طرح مختلف زمانوں میں خاص خاص خرابیوں کی اصلاح ہوتی رہی مگر عام طور پر کسی کو اس بات کے کہنے کی جرأت نہوئی کہ خالص اسلام کی تعلیم قرآن مجید اور حدیث صحیح میں منحصر ہے باقی جو کچھ ہے وہ اسلام کی حقیقت سے خارج ہے نہ اسلام اُسکا جوابدہ ہے اور نہ مسلمان اُسپر اعتقاد رکھنے کے مکلف ہیں۔

سرسید نے۔ اگر غور کرکے دیکھا جاے۔ تو شاید اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا کہ جو صداقتیں اہل اسلام کی تصنیفات میں فرداً فرداً صرف ضبط تحریر میں آئی تھیں اور اکابر علما کے سوا اُن سے کسی کو اطلاع نہ تھی۔ سرسید نے اُن سب کو ایک ہی بار خاص و عام پر علی الاعلان ظاہر کردیا کیونکہ جو ضرورتیں اسوقت خاصکر ہندوستان کے مسلمانوں کو درپیش تھیں وہ کسی خاص خرابی کی اصلاح سے رفع نہیں ہوسکتی تھیں۔ مسلمانوں کی سلطنت ہندوستان سے جاچکی تھی اور قومی تعصبات جو بعد سلب حکومت کے مفتوح قوم کو فاتح قوم کے ساتھ ایک مدت تک ضرور باقی رہتے ہیں۔ مذہبی تعصبات کے لباس میں ظہور کررہے تھے جس سے حکمران قوم کی نظر میں مسلمانوں کا اعتبار روز بروز کم ہوتا جاتا تھا اور اونکا مذہب سلطنت کے حق میں خطرناک خیال کیا جاتا تھا، مسلمانوں سے جو بُری بات سرزد ہوتی تھی وہ اونکے مذہب کی طرف منسوب کی جاتی تھی، فقہا کے فتوے جو مسلمانوں کی دنیوی ترقی کے مانع تھے۔ اکثر انہیں قومی تعصبات پر مبنی ہوتے تھے اور مسلمان ان کو وحی منزل کی طرح دل و جان سے قبول کرتے تھے، عیسائی مشنری مسلمانوں کی سیر اور تاریخ کی کتابیں اور اونکی تفسیریں دیکھ دیکھکر اسلام اور بانی اسلام پر اعتراض کرتے تھے اور اسلام کو اُنکا جوابدہ سمجھ کر مسلمانوں سے جواب طلب کرتے تھے، تعلیم یافتہ مسلمان بہت سی باتیں مروجہ اسلام میں سائنس کے خلاف دیکھکر اسلام کی خالص تعلیم سے جو کتاب و سنت

میں منحصر ہے بد اعتقاد ہونے لگے تھے ؛ اور یہ تمام حالات اس بات کے مقتضی تھے کہ خالص اسلام میں اور اون چیزوں میں جو اسلام میں مل جلکر اوس کی ذات میں داخل ہوگئی ہیں امتیاز قایم کیا جائے اور جو مشکلات اس اختلاط اور امتزاج سے پیدا ہوئی ہیں اون کو رفع کیا جاوے -

اگرچہ سرسید نے اپنی رفارمیشن میں اُن اصول سے جن پر قدیم محققین کی اصلاحیں مبنی تھیں بہت ہی کم تجاوز کیا ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ زمانۂ حال کی ضرورتوں کے اقتضا سے قدیم اصلاحوں میں خود بخود ایک قسم کی وسعت پیدا ہوگئی ہے - مثلاً تمام محققین اس بات پر متفق ہیں کہ خبر متواتر اور خبر مشہور کے سوا - جنکی تعداد کتب احادیث میں نہایت قلیل ہے جو حدیثیں خبر احاد کہلاتی ہیں اور جنسے صحاح ستہ اور تمام حدیث کی کتابیں بھری ہوئی ہیں مفید یقین نہیں ہیں بلکہ اون میں احتمال صدق اور کذب کا باقی ہے - اور اس اصول سے اُنھوں نے یہ نتیجہ نکالا تھا کہ خبر واحد - بشرطیکہ صحت کے درجہ کو پہنچ جاوے - اُسپر صرف عمل کرنا واجب ہے مگر اُسپر اعتقاد رکھنا ضرور نہیں اور بعض کے نزدیک عمل اور اعتقاد دونوں ضرور نہیں - سرسید نے اس نتیجہ کو زیادہ وسیع کر دیا ہے - اونکی یہ رائے ہے کہ جب خبر واحد میں صدق و کذب کا احتمال باقی ہے تو کیا وجہ ہے کہ جس خبر واحد کی رو سے اسلام پر کوئی اعتراض وارد ہوتا ہو خواہی نخواہی اُس خبر کو تسلیم کر لیا جائے - اور بعد تسلیم کرنے کے اس اعتراض کا جواب دوسری طرح پر دیا جاوے بلکہ اُس اعتراض کے جواب میں صرف اسقدر کہنا کافی ہے کہ خبر واحد مفید یقین نہیں اور اس لیے جو اعتراض اوسکی رو سے وارد ہوتا ہے اسلام اُس کا جوابدہ نہیں ہے یہ رائے صرف سرسید ہی کی نہیں بلکہ اُن سے پہلے بھی علماے اسلام نے اس اصول کو تسلیم کیا ہے - امام رازی سے فرقۂ حشویہ کے ایک شخص نے آنحضرت صلعم سے یہ روایت کی کہ "ما کذب ابراھیم الا ثلث کذبات" (یعنی ابراہیمؑ نے صرف تین جگہ جھوٹ بولا ہے) امام نے کہا " بہتر یہ ہے کہ ایسی روایتیں قبول نہ کی جائیں " اُس نے بطور تعجب کے کہا " اگر ہم اس روایت کو قبول نہ کریں تو راویوں کی تکذیب لازم آئیگی " امام نے کہا " اے مسکین اگر ہم قبول کر لیں تو ہم کو ابراہیم کی طرف جھوٹ کی نسبت کرنی پڑتی ہے اور اگر اوسکو نہ مانیں تو راویوں کی طرف جھوٹ کو منسوب کرنا ہوگا ، اور کچھ شک نہیں کہ ابراہیمؑ کو جھوٹ کی نسبت سے بچانا بہتر ہے بہ نسبت اسکے کہ چند مجاہیل کو جھوٹ سے بچایا جاوے "

یا مثلاً اول اول سلف صالح آیات متشابہات کی تاویل بالکل جائز نہیں سمجھتے تھے پھر جب یونانی فلسفہ کا اسلام میں رواج ہوا اور آیات متشابہات کے ظاہری معنوں پر جو کہ علماے اسلام بیان کرتے تھے۔ ملاحدہ اور مخالفین اسلام نکتہ چینی کرنے لگے تو علما کو متشابہات کی تاویل کرنی پڑی۔ مگر نہایت محدود آیتیں تھیں جن کے حقیقی معنوں پر اُس زمانہ کے لوگ اعتراض کرتے تھے۔ اس لیے صرف وہی آیتیں مجازی معنوں پر محمول کی گئیں۔ اب چونکہ زمانہ علم وحکومت کی ترقی کا ہے اس لیے سرسید نے تاویل کو ان ہی آیتوں میں محدود نہیں رکھا۔ بلکہ اور بہت سی آیتوں کو جیسا کہ دوسری جگہہ ہم نے بیان کیا ہی مجاز و استعارہ وتمثیل پر محمول کیا ہے۔

یا مثلاً آیات منسوخہ کی تعداد پہلے پانسو سے بھی زیادہ مانی جاتی تھی۔ پھر۔ جیسا کہ شاہ ولی اللہ صاحب نے فوزالکبیر میں لکھا ہے سیوطی وغیرہ نے انکو بیس میں محصور کیا۔ پھر شاہ ولی اللہ نے نسخ کو صرف پانچ آیتوں میں محدود کر دیا۔ سرسید نے جب دیکھا کہ آیات منسوخہ کی تعداد پانسو سے گھٹتے گھٹتے پانچ تک پہنچ گئی تو ان کو یقین ہو گیا کہ قرآن مجید میں نسخ حقیقی بالکل واقع نہیں ہوا اور قرآن کی جس آیت سے مفسرین کو یہ شبہ ہوا ہی کہ قرآن کی آیتیں ایک دوسرے کی ناسخ ومنسوخ ہیں اور اوس آیت کا سیاق وسباق۔ جیسا کہ خطبات احمدیہ میں مفصل مذکور ہی۔ صاف دلالت کرتا ہے کہ وہاں نسخ سے مراد شرائع سابقہ کا قرآن سے منسوخ کرنا ہی نہ کہ قرآن کی ایک آیت کا دوسری آیت کو منسوخ کرنا۔ پس عیسائیوں کا اعتراض جو کہ وہ مسلمانوں کے مسئلہ نسخ پر کرتے ہیں۔ قرآن مجید پر وارد نہیں ہوتا۔

یا مثلاً اگلے محققین نے فروع میں تقلید شخصی کو اس بنا پر ضروری نہیں سمجھا کہ حق چاروں مذہبوں میں دائر ہے۔ مگر سرسید جس طرح تقلید کو فروع میں ضروری نہیں سمجھتے اسی طرح اصول میں بھی نہیں سمجھتے کیونکہ جس بنا پر حق چاروں مذہبوں میں دائر سمجھا گیا ہے اُسی بنا پر اوسکو اشاعرہ اور معتزلہ اور دیگر فرق اسلامیہ میں بھی دائر سمجھنا ضروری ہے۔ اور اسی وجہ سی اُنھوں نے اکثر اصولی مسائل میں معتزلہ کی پیروی کی ہے۔ اس راے میں بھی سرسید متفرد نہیں بلکہ اگلے محققین اہل سنت نے بھی اکثر مسائل میں اشاعرہ کے اصول سے اختلاف کیا ہے۔ چنانچہ اسی اختلاف کے سبب جب امام غزالی پر بدعت کی تہمت لگائی گئی اور وہ بہت بدنام کیے گئے اور ان کو بہت سی تکلیفیں پہنچیں۔ چنانچہ اسی اختلاف کے سبب جب امام غزالی پر بڑے دے ہوئی تو انھوں نے ایک رسالہ موسوم بہ "تفرقہ بین الاسلام والزندقہ" لکھا جس میں اپنے مخالفوں کی نسبت لکھتے ہیں کہ "وہ مذہب اشاعرہ سے

الگ ہونے کو۔ گو کہ وہ بالشت بھر ہی کیوں نہو۔ اور اُن کے خلاف کرنے کو۔ گو کہ وہ ذرا سی چیز ہی میں کیوں نہو۔ گمراہی جانتے ہیں،، مگر چونکہ امام غزالی کے وقت میں سلطنت کی طرف سے علماکو پوری مذہبی آزادی نہ تھی اس لیے اُنھوں نے چند جزوی باتوں کے سوا اشاعرہ کے اصول سے اختلاف نہیں کیا۔ لیکن سرسید بلاقید جس مسئلہ میں اختلاف کی ضرورت سمجھتے ہیں اشاعرہ کے اصول سے اختلاف کرتے ہیں۔

الغرض سرسید کی اصلاحات کو جہانتک دیکھا جاتا ہے اُن میں بہت ہی کم اصلاحیں ایسی ہونگی جنکی اصل محققین اہل اسلام کی تصنیفات میں موجود نہو۔ البتہ اگلے محققین کی اصلاحیں اُسی حد تک محدود رہیں جہانتک کہ اُس زمانہ کی حالت اور ضرورت مقتضی تھی۔ اور سرسید کی اصلاحات میں موجودہ زمانہ کی حالت اور ضرورت کے موافق زیادہ وسعت پیدا ہو گئی ہے۔

سرسید کی رفارمیشن کا منشا۔ جیسا کہ بعض لوگ خیال کرتے ہیں۔ یہ ہرگز نہ تھا کہ وہ اسلام میں ایک نیا فرقہ قایم کریں اور خود اُس فرقہ کے سرگروہ بنیں۔ وہ جس طرح نبی کے سوا کسی امام یا مجتہد یا اور کسی امتی کے مقتدا بنانے کو شرک فی النبوۃ کے لفظ سے تعبیر کرتے تھے اسی طرح خود کسی فرقہ کا مذہبی پیشوا بننے کو اشتراک فی النبوۃ سمجھتے تھے۔ چنانچہ لاہور میں جو اُنھوں نے اسلام پر لکچر دیا تھا اوس میں ایک فقرہ یہ بھی تھا "میری یہ خواہش نہیں ہے کہ کوئی شخص گو وہ میرا کیسا ہی دوست سے دوست ہو۔ میرے خیالات کی پیروی کرے۔ میں رسولوں کے سوا کسی شخص کا ایسا منصب نہیں سمجھتا کہ اُن باتوں میں۔ جو خدا اور بندوں کے درمیان دلی اور روحانی امور سے متعلق ہیں اور جس کو مذہب کہتے ہیں۔ وہ یہ خواہش کرے کہ لوگ اُسکی پیروی کریں۔ یہ منصب رسولوں کا تھا اور آخر کو جناب رسول خدا محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم پر۔ جنکا ازلی مذہب خدا ابداً لاباد تک قایم رکھیگا (اور ضرور قایم رکھے گا کیونکہ جیسا وہ ازلی ہے ابدی بھی ہے) ختم ہو گیا"۔ پس انکا ہرگز یہ مطلب نہ تھا کہ لوگ انکی پیروی کریں اور انکو اپنا مذہبی پیشوا جانیں بلکہ انکی رفارمیشن کا اصل مقصد صرف مسلمانوں کی دنیوی ترقی کے موانع کو دور کرنا اور عیسائی قوموں کے اس اعتراض کو دفع کرنا تھا کہ "اسلام ترقی اور شایستگی کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتا" اور چونکہ اس زمانہ میں مغربی تعلیم کے سوا کوئی ذریعہ دنیوی ترقی کا نہیں ہے اسلیے جو شبہات مغربی تعلیم سے اسلام کی نسبت پیدا ہوتے ممکن تھے اُن کا رفع کرنا بھی ضرور تھا پس یہی دو مقصد تھے جن کے لیے سرسید کو مذہبی مباحث میں پڑنا اور بہت سی باتوں میں جمہور سے اختلاف کرنا پڑا۔

سلطان عبدالعزیز خاں مرحوم نے ایک کونسل علما اور عقلا کی اس امر کی تحقیقات کے لیے منعقد کی تھی کہ دین اسلام دنیوی ترقی کا مانع ہے یا نہیں؟ کونسل نے اپنی تحقیقات کے بعد جو رپورٹ لکھی اُسکا ماحصل یہ تھا کہ "اسلام میں کوئی بات ایسی نہیں جو دنیوی ترقی کی مانع ہو، مگر مسلمانوں کو اپنی بہت سی رسوم و عادات کو، جو اگلے زمانہ میں مفید تھیں مگر حال کے زمانہ میں نہایت مضر ہو گئیں چھوڑنا ضرور ہے"۔ ظاہر ہے کہ کونسل نے جو کچھ اسلام کی نسبت لکھا وہ بالکل قرآن[1] اور حدیث کے مطابق تھا۔ بلکہ ہمارے نزدیک صرف اسلام ہی ایسا مذہب ہے کہ باوجود اوس کی سخت پابندی کے انسان دنیوی ترقی اور شایستگی کو کمال کے درجہ تک پہنچا سکتا ہے۔ بخلاف دیگر مذاہب کے جنسے دست بردار ہوئے بغیر ترقی کے میدان میں ایک قدم نہیں رکھا جا سکتا۔ لیکن اگر کونسل سے پوچھا جاتا کہ وہ کونسی رسوم و عادات ہیں جنکے چھوڑنے کے بعد مسلمان اپنے موجودہ مذہب کے موافق ترقی کی دوڑ میں شریک ہو سکتے ہیں؟ تو اسکا جواب دینا نہایت مشکل تھا۔ سرسید نے یہی مشکل کام اپنے ذمہ لیا تھا اور جو مشکلات انکو اس کام میں پیش آئیں وہ عنقریب کسی قدر اختصار کے ساتھ بیان کی جائینگی۔

سرسید کی نسبت یہ اعتراض اکثر سنا گیا ہے کہ مصلح یا مجدد مذہب ایسا شخص کیونکر ہوسکتا ہے جو علوم مروجۂ اسلام میں متوسط درجہ سے بھی کم درجہ رکھتا ہو۔ لیکن یہ اعتراض اوس شخص کی نسبت زیادہ موزوں ہوسکتا ہے جو علوم مروجۂ اہل اسلام میں کمال حاصل کرنیکے بعد مصلح یا مجدد مذہب بننے کا دعوی کرے۔ انسان جس مذہب کی سوسائٹی میں ہوش سنبھالتا ہے اُس مذہب کے ساتھ اسکو قدرتی لگاؤ ہوتا ہے، پھر جب اسی مذہب کی تعلیم پاتا ہے تو وہ لگاؤ روز بروز زیادہ ہوتا جاتا ہے، یہاں تک کہ جب وہ تعلیم کمال کے درجہ کو پہنچ جاتی ہے تو اوس مذہب کی تقلید اور اوسکا تعصب اوسکی رگ و پے میں سرایت کر جاتا ہے اور کسی بات میں خود غور اور تحقیق کرنے کی مطلق قابلیت باقی نہیں رہتی۔ اگر مثلاً حنفی مذہب کی تعلیم اوس کو ہوئی ہے۔ تو اُسکے دل میں کبھی بھول کر بھی یہ خیال نہیں آتا کہ اس مذہب میں کوئی غلطی ہوگی۔ یہ اصول بھی۔ کہ حق چاروں مذہبوں میں دائر ہے محض تقلیداً مانتا ہے کیونکہ عملاً حنفی مذہب کے

---

[1] خدا تعالیٰ قرآن میں فرماتا ہے "یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر" اور رسول خدا صلعم نے فرمایا "انما بعثتم میسرین ولم تبعثوا معسرین" اور فرمایا "الدین یسر" اور ابو موسیٰ اور معاذ بن جبل کو جب یمن میں بھیجا تو یہ نصیحت کی "یسرا ولا تعسرا" ۱۲

ایک مسئلہ میں بھی غلطی کا ہونا اُس کے نزدیک محال معلوم ہوتا ہے۔ باوجودیکہ بخاری کو اصح الکتب بعد کلام اللہ جانتا ہے مگر بیسیوں حدیثیں جو اسمیں صریح حنفی مذہب کے خلاف ہیں انکو قابل عمل نہیں سمجھتا ایسا شخص بلاشبہ کسی مذہب کا مصلح یا مجدد نہیں ہوسکتا بلکہ یہ منصب اوس شخص کا ہے جو حق و باطل اور خطا اور صواب میں تمیز کر سکتا ہے، ہر ایک امر پہ غور کرتا ہے اور جو بات صحیح معلوم ہوتی ہے اُسے اخذ کرتا ہے اور جو غلط معلوم ہوتی ہے اُسے چھوڑتا ہے۔ اول ایک بات کو صحیح جانتا ہے پھر جب اُس میں غلطی معلوم ہوتی ہے تو اُسی بات کو غلط قرار دیتا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ وہ غلط بات کو صحیح اور صحیح بات کو غلط سمجھ جائے۔ مگر یہ ممکن نہیں کہ جس بات کو دل میں غلط جانے اوسکو دنیا کی شرم یا اعتراض کے خوف سے صحیح کہے جائے۔ مصلح یا مجدد کو علوم مروجہ کی اتنی ضرورت نہیں جتنی اس بات کی ضرورت ہے کہ حق بات کہنے میں لومۃ لائم سے نہ ڈرے کیونکہ وہ کوئی نئی بات نہیں کہتا بلکہ جو صداقتیں محققین کی تحقیقات میں موجود ہیں اور تقلید نے اونکی طرف سے آنکھوں پر پردے ڈال رکھے ہیں انکو علی الاعلان ظاہر کرتا ہے۔

سرسید میں ابتدا سے وہ تمام خاصیتیں۔ جو ایک مصلح یا مجدد یا ریفارمر میں ہونی ضرور ہیں، موجود تھیں اونکی عمر کا بہت بڑا حصہ حق کی تلاش میں گذرا، کبھی صوفیت کا رنگ چڑھا، کبھی وہابیت کا زور شور رہا، کبھی غیر مقلدی کی لے بڑھی اور آخر کو تمام جستجو اور تلاش اس نتیجہ پر آکر ختم ہوگئی کہ الاسلام ھو الفطرۃ و الفطرۃ ھو الاسلام۔ بعضے لوگ سمجھتے ہیں کہ سرسید کے مذہبی خیالات میں اسقدر تبدیلیوں کا ہونا اونکے متلون مزاج ہونے کی دلیل ہے مگر یہ اُنکی نادانی ہے، حق بات تک ہمیشہ اسی طرح بتدریج رسائی ہوتی ہے، ابراہیم خلیل اللہ نے پہلے ستارہ کو پھر چاند کو اور پھر سورج اپنا رب سمجھا تب اس نتیجہ تک پہنچے کہ "اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ" محمد مصطفےٰ صلعم کو اگر وہ عقبات پیش نہ آتے جو حق تک پہنچنے سے پہلے پیش آتے ہیں تو قرآن میں آپ کی نسبت یہ ارشاد نہ ہوتا کہ "وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰی" جب انبیا علیہم السلام کا یہ حال ہو تو اور لوگ۔ جو طالب حق ہیں۔ جب تک کچھ دنوں اودہر اودہر ڈانواں ڈول نہ پھریں کیونکر ایک ہی جست میں منزل مقصود تک پہنچ سکتے ہیں؟ ہاں جو لوگ تقلید کے دائرہ سے قدم باہر رکھنا نہیں چاہتے اور جنکا یہ قول ہے کہ "اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓی اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓی اٰثَارِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ" اُن کو کچھ دشواری نہیں ہے۔ اُنہوں نے جس لیک پر اگلوں کو چلتے دیکھا ہے اُسی پر آنکھیں بند کیے چلے جاتے ہیں۔

بہرحال اگر سرسید مشرقی تعلیم کی اُس حد سے آگے بڑھ جاتے جہاں اُن کی تعلیم آکر ٹھیر گئی تو تقلید کے پھندے سے تا زیست اُن کا چھٹکارا ہونا دشوار تھا۔ یہ علوم مروجہ کی تکمیل بجائے اس کے کہ اُن کے کام میں کچھ مدد دیتی۔ وہ تمام قدرتی قابلیتیں جو اُن کی طبیعت میں رکھی گئی تھیں بالکل فنا کر دیتی اور جس دلیری اور آزادی سے انہوں نے ریفارمیشن کا کام انجام دیا اس کا حوصلہ اُن میں مطلق باقی نہ رہتا۔

وہ ایک خط میں جو انہوں نے ۱۸۸۹ء میں سید مہدی علی خاں کو لکھا تھا۔ لکھتے ہیں۔

"میرے پیارے مہدی! میں ہمیشہ آپ کو کہا کرتا ہوں کہ جو اثر مشرقی طریقۂ تعلیم کا انسان کے دل اور طبیعت پر ہوتا ہے۔ اُس سے آپ کبھی امین نہ رہیں۔ آپ سمجھتے ہیں کہ نبی آخر الزماں (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اُمی محض رکھنے میں کیا حکمت تھی؟ یہی حکمت تھی کہ نیچرل فطرت جو انسان کی جبلتوں کا جاری رہتا ہے۔ اوس کو کوئی بیرونی چیز مزاحم نہ ہو اور جو کچھ باہر سے خالص سے ملی ہو وہ میں ہمیشہ نیچر کے سرچشمہ کے جاری رکھنے پر متوجہ رہا کریں اور جس علم کی نسبت کہا گیا ہے کہ "العلم حجاب الاکبر" اُسکے پیرو ہرگز نہ ہوں"

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جو شخص مذہبی خیالات کی اصلاح کا دعویٰ کرے اُس میں مذہبی تقدس جو علماے دین کا شعار ہے۔ ضرور ہونا چاہیے۔ پس سرسید جیسا دنیا دار آدمی جو نماز روزہ تک کا پابند نہ ہو۔ اس منصب جلیل کے کیونکر لائق ہو سکتا ہے؟ سو اس اعتراض کے جواب میں اسکے سوا اور کیا کہا جا سکے کہ مذہبی تقدس۔ جو ہمارے علماے دین کا شعار ہے۔ اگر سرسید کو یہ درجۂ عالی حاصل ہو جاتا تو مسلمانوں کی خیر خواہی اور اسلام کی حمایت کرنے کی اُنکو فرصت ملنی دشوار تھی۔ کیونکہ اُنکی تمام عمر کسی مسلمان فرقہ کا رد لکھنے اور کسی کو کافر اور کسی کو فاسق بنانے اور طبقات و ونسخ کے تقسیم کرنے میں گذر جاتی اور اگر بالفرض اسلام اور مسلمانوں کی خیر خواہی کا سچا جوش بھی اُن کے دل میں ہوتا تو بھی وہ اس قابل نہ ہوتے کہ اسلام کی کچھ حمایت کر سکیں، یا مسلمانوں کے مصائب کا کچھ تدارک کر سکیں۔ یعنی اس بات کا سمجھنا اونکی طاقت سے باہر ہوتا کہ اسلام اور اہل اسلام کو کن مشکلات کا سامنا ہے اور اُن مشکلات کا کیونکر مقابلہ ہو سکتا ہے؟ کیونکہ مذہبی تقدس کی پہلی شرط یہ ہے کہ دنیا اور اہل دنیا کے حالات سے بالکل بے خبر ہوں۔

بات یہ ہے کہ مذہبی تقدس اور مشائخ و علما کی زی میں رہنا اور زہاد و عباد کیسی زندگی بسر کرنا اُن لوگوں کے لیے ضرور ہے جو مذہبی پیشوا کہلاتے ہیں جیسے واعظین جو امر بالمعروف اور نہی

عن المنکر کرتے ہیں یا مشایخ واہل اللہ جو تزکیۂ نفس وتصفیۂ باطن کی تعلیم وتلقین فرماتے ہیں۔ کیونکہ اگر وہ خود اُن صفات کا عمدہ نمونہ نہیں جو اوروں میں پیدا کرنی چاہتے ہیں تو اوسے لوگوں کو کچھ فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ برخلاف اُس شخص کے جو محض قوم کی اصلاح معاش کا ارادہ رکھتا ہو، انکو تنزل کے گڑھے سے نکالنا اور اونکے تنزل کے اسباب اور ترقی کے موانع دریافت کرنے چاہتا ہو، حکمراں قوم کو جو اوسکے ہم مذہبوں کی نسبت غلط فہمی ہو اوس کو رفع کرنا چاہتا ہو، علمی دنیا میں جو خیالات مذہب کی نسبت پھیل رہے ہوں اُنسے آگاہی حاصل کرنے کی فکر میں ہو۔ ایسا شخص جب تک گوشۂ عزلت سے نکلکر دنیا کے بیچوں بیچ زندگی بسر نہ کرے اور عمر کا ایک بہت بڑا حصہ اُسکے نشیب وفراز اور گرم وسرد کی آزمائش میں نہ گذارلے اور حاکم ومحکوم دونوں کے خیالات سے واقف نہو وہ کیونکر اپنے مقاصد میں کامیاب ہوسکتا ہے؟

یہی سبب ہے کہ ہمارے مقدس علما۔ جو دنیا سے الگ تھلگ رہنے کے سبب دنیا کے حالات سے بے خبر ہیں۔ انکی تحریریں۔ جو اس آزادی اور نکتہ چینی کے زمانہ میں اُنہوں نے مذہب کے متعلق لکھی ہیں یا لکھتے ہیں۔ وہ بجاے اسکے کہ غیر قوموں کے دل میں اسلام کی نسبت حسن ظن پیدا کریں۔ اُلٹی دین کے مضحکہ کا باعث ہوتی ہیں۔ پس اس زمانہ میں مذہبی مصلح جسکا مقصد مسلمانوں کی اصلاح معاشرت اور اسلام کی حقیقت دنیا پر ظاہر کرنا ہو۔ اُس شخص کے سوا جو دنیاداری کے لباس میں زندگی بسر کرے اور دنیا کے حالات سے باخبر ہو۔ دوسرا شخص نہیں ہوسکتا۔

اگرچہ ایک مصلح مذہب میں اس مشہور مقولہ کے موافق کہ "انظر الی ما قال ولا تنظر الی من قال"، مقتضاے عقل یہ ہے کہ بجاے افعال کے زیادہ تر اُس کے اقوال کو دیکھا جائے مع ذلک ہم سرسید کے افعال اور اخلاق وعادات میں وہ خوبیاں پاتے ہیں جو بڑے بڑے مشایخ واہل اللہ میں نہیں دیکھی گئیں اور جنکو ہم آگے چل کے کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کرینگے۔ بلاشبہ وہ آخر عمر میں بسبب فربہی مفرط اور کبرسن کے نماز روزے کے پابند نہ رہے تھے لیکن اپنے قصور کا اعتراف کرتے تھے جس کی نسبت کہا گیا ہے "الاعتراف یہدم الاقتراف"۔ حج اور زکوٰۃ کی آن میں کبھی استطاعت نہیں ہوئی اور قرض روپیہ لیکر جس طرح کہ انہوں نے لندن کا سفر کیا اسطرح سفر حج کرنے کو وہ ناجائز سمجھتے تھے۔ بیسیوں عیب۔ جو بڑے بڑے دینداروں اور پرہیزگاروں میں دیکھے گئے ہیں۔ اُنسے یہ شخص بالکل پاک تھا اور سامت کی خیرخواہی جسمیں

مخبر صادق نے تمام دین کو حصر کر دیا ہے اور فرمایا ہے کہ " الدین النصیحۃ " اُس میں تمام قوم سے سبقت لیگیا تھا - اُسنے جس کام کا بیڑا اُٹھایا تھا اس کے لیے زہد و تقدس کی نہیں بلکہ عقل اور راستبازی کی ضرورت تھی جسکی نسبت عمر فاروق رضؓ نے فرمایا ہے کہ " لاتنظروا الی صلوٰۃ امرئٍ ولا صیامہ ولکن انظروا الی عقلہ وصدقہ " (یعنی کسی کے نماز روزہ پر نظر نہ کرو بلکہ اُسکی عقل اور سچائی کو دیکھو)

سرسید نے جن مسائل میں علماے سلف سے اختلاف کیا ہے وہ دو قسم کے مسائل ہیں ایک وہ جن میں جمہور علماے اہل سنت اُنکے خلاف ہیں مگر محققین اہل اسلام میں سے اور لوگ بھی اُس طرف گئے ہیں دوسرے وہ جن میں سرسید بظاہر منفرد معلوم ہوتے ہیں اور یہ دوسری قسم کے اختلافات زیادہ تر قرآن کی تفسیر کے ساتھ مخصوص ہیں -

(مذہبی مسائل میں علماے سلف سے اختلاف)

دونوں قسم کے مذکورۂ بالا اختلافات کا منشا جیسا کہ ہم پہلے بیان کرچکے ہیں - یہ ہرگز نہ تھا کہ سرسید کوئی نیا فرقہ قایم کرنا اور خود اُس فرقہ کا سرگروہ بننا چاہتے تھے ، بلکہ یہ تمام اختلافات محض اس بات پر مبنی تھے کہ آجکل جو اعتراضات اسلام پر مخالفین اسلام کی طرف سے وارد کیے جاتے ہیں ، یا جو شکوک و شبہات تعلیم یافتہ نوجوان مسلمانوں کے دل میں اسلام کی نسبت پیدا ہوتے ہیں اُنکو رفع کیا جائے - اسی لیے ہم اُن تمام اختلافات کو اس عنوان کے ذیل میں درج کرنا چاہتے ہیں مگر جن دلائل پر یہ اختلافات مبنی ہیں اون کو سرسید کی تصنیفات میں دیکھنا چاہیے -

اگرچہ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ہر مسئلہ مختلف فیہ کی نسبت جو کچھ سرسید نے لکھا ہے وہی صحیح ہے اور ہر ایک اختلاف میں انہیں کی راے صائب ہے لیکن چونکہ اُنھوں نے موجودہ زمانہ کی ضرورت کے موافق ایک جدید علم کلام کی بنیاد ڈالی ہے اسلیے جو لوگ دین اسلام کے دوست ہیں اور اُسکو ہر قسم کے اعتراضات اور شکوک و شبہات سے پاک جانتے ہیں اُنسے امید ہے کہ سرسید کے مندرجہ ذیل اختلافات کو صرف اس نظر سے کہ وہ جمہور علماے اہل سنت کے خلاف ہیں ناقابل التفات نہ سمجھیں گے بلکہ ہر ایک اختلاف پر جو دلائل سرسید نے قایم کیے ہیں اُن پر نہایت بے تعصبی اور انصاف کے ساتھ غور کرینگے - اُنکا فرض ہے کہ ہر ایک مسئلۂ مختلف فیہ کے متعلق اول اس بات پر غور کریں کہ جس اعتراض یا شبہہ کے رفع کرنے کی غرض سے اُنھوں نے جمہور سے اختلاف کیا ہے وہ فی الواقع اس قابل ہے یا نہیں کہ اس کو رفع کیا جائے دوسرے یہ کہ جمہور سے اختلاف کیے بغیر وہ اعتراض یا شبہہ رفع ہوسکتا ہے یا نہیں ؟ تیسرے

جس طریقہ سے سرسید نے اُسکو رفع کرنا چاہا ہے اُس طریقہ سے اُس کا رفع ہونا ممکن ہے یا نہیں امید ہے کہ اگر ان تینوں باتوں پر ٹھنڈے دل سے غور کیا جائیگا تو اسلام کے حق میں بہت عمدہ نتائج پیدا ہونگے۔

اسوقت تمام علمی دنیا میں مذہب کی صداقت کا معیار یہ امر قرار پایا ہے کہ جو مذہب حقائق موجودات اور اصول تمدن کے برخلاف ہو وہ مذہب سچا نہیں ہوسکتا۔ اس معیار نے جو نتائج مذاہب کے حق میں پیدا کئے ہیں وہ یہ ہیں کہ تمام قومیں جو علمی اور تمدنی ترقی کی طرف متوجہ ہوئی ہیں وہ سب رفتہ رفتہ مذہب سے دست بردار ہوتی جاتی ہیں۔ عیسائیوں نے بائبل کو اٹھا کر بالائے طاق رکھدیا ہے، اور فی الواقع اگر وہ بائبل کے احکام یا نصیحتوں پر کاربند ہوتے تو ترقی کے میدان میں اُنکا قدم رکھنا ناممکن تھا؛ برہم سماج والوں نے ویدوں میں سے فقط ڈہائی انچھ پریم کے لیے ہیں۔ اور باقی کو بالکل خیرباد کہدیا ہے؛ آریہ سماج والے ویدوں کا جو مطلب بیان کرتے ہیں اُس کو نہ ساتن دہرم کے ہندو تسلیم کرتے ہیں اور نہ یوروپ کے بڑے بڑے سنسکرت داں اور وید کے محقق صحیح جانتے ہیں، پس درحقیقت اُنہوں نے بھی وید سے اپنے تئیں آزاد کرلیا ہے؛ سرسید کا یہ دعویٰ ہے کہ دنیا میں جتنی کتابیں آج الہامی مانی جاتی ہیں اُن میں صرف قرآن ہی ایک ایسی کتاب ہے جسمیں نہ کوئی چیز حقایق موجودات کے خلاف ہے اور نہ تمدن اور حسن معاشرت کی مانع۔ پس مسلمان عالموں کا اس بات پر غور کرنا۔ کہ جو کچھ سرسید نے اسلام کی حمایت کی غرض سے لکھا ہے اُس کی اس زمانہ میں فی الواقع ضرورت تھی یا نہیں اور اگر تھی تو سید کی تحریرات سے وہ ضرورت رفع ہوتی ہے یا نہیں؟ کچھ کم ضروری نہیں ہے۔

اب ہم اون اختلافات کا خلاصہ لکھتے ہیں جن میں دیگر محققین اہل اسلام بھی سرسید کے ساتھ شریک ہیں۔

(۱) اجماع حجت شرعی نہیں ہے (۲) قیاس حجت شرعی نہیں ہے (۳) تقلید واجب نہیں ہے (۴) قرآن کا کوئی حکم جو ایک آیت میں بیان ہوا تھا کسی دوسری آیت سے منسوخ نہیں ہوا اور نہ قرآن کی کسی آیت کی تلاوت منسوخ ہوئی اور سورۂ بقرہ کی اس آیت سے کہ ماننسخ من اٰیۃ اوننسہا قرآن کی کسی آیت کا ناسخ اور کسی کا منسوخ ہونا مراد نہیں ہے بلکہ اسکی بعض آیتوں سے شرائع سابقہ کے بعض احکام کا منسوخ ہونا مراد ہے (۵) قرآن میں کسی طرح کی زیادتی یا کمی یا تغیر و تبدل واقع نہیں ہوا۔ وہ جس طرح اور جس قدر نازل ہوا تھا اُسی طرح اور اُسی قدر زمانۂ نزول سے

آج تک محفوظ ہے اور جن روایتوں سے زیادتی یا کمی یا تغیر و تبدل کا ہونا یا بعض صحابہ کے اقوال سے قرآن کا توارد ہونا پایا جاتا ہے وہ سب موضوع و مفتری ہیں (۶) صحاح ستہ بلکہ صحیحین کی بھی تمام حدیثوں کو جب تک اصول علم حدیث کے موافق انکی جانچ نہ کی جاے - قابل وثوق نہیں سمجھنا چاہیے (۷) شیطان یا ابلیس کا لفظ جو قرآن مجید میں آیا ہے اُس سے کوئی وجود خارج عن الانسان مراد نہیں ہے بلکہ جو انسان میں جو نفس امارہ یا قوت بہیمیہ ہے وہ مراد ہے (۸) طیور منخنقہ جنکو نصاریٰ نے گلا گھونٹ کر مار ڈالا ہو مسلمانوں کو اُن کا کھانا حلال ہے (۹) چونکہ خبر واحد میں احتمال صدق وکذب باقی رہتا ہے اس لیے جو اعتراض اخبار آحاد کی بنا پر اسلام کی نسبت کیے جاتے ہیں اسلام اُنکا جوابدہ نہیں ہے (۱۰) سوا اُن کفار و مشرکین کے جنکا قرآن کی اس آیت میں ذکر کیا گیا ہے یا جو اس آیت کے مصداق ہوں کہ "انما ینھاکم اللہ عن الذین قاتلوکم فی الدین واخرجوکم من دیارکم وظاھروا علی اخراجکم ان تولوھم" تمام کفار و مشرکین سے دوستی و موالات کرنا جائز ہے (۱۱) عہد عتیق اور عہد جدید کی کتابوں میں تحریف لفظی واقع نہیں ہوئی بلکہ صرف تحریف معنوی ہوئی ہے مگر اسی کے ساتھ اُنکا اول سے آخر تک الہامی ہونا اور غلطی سے پاک ہونا غیر مسلم ہے (۱۲) ہر شخص اُن مسائل میں - جو قرآن یا حدیث صحیح میں منصوص نہیں ہیں آپ اپنا مجتہد ہے (۱۳) حضرت ہاجرہ جو اسمٰعیل ع کی ماں ہیں وہ - جیسا کہ بعض روایتوں میں مذکور ہے - درحقیقت لونڈی نہ تھیں بلکہ رقیون بادشاہ مصر کی بیٹی تھیں اور رقیون نے اُنکو صرف تربیت کے لیے حضرت سارا کے ساتھ کر دیا تھا (۱۴) وضع و لباس وغیرہ میں کفار کے ساتھ تشبہ شرعاً ممنوع نہیں ہے (۱۵) قرآن کی کسی آیت سے جبر پر اور کسی سے قدر پر استدلال کرنا - جیسا کہ متکلمین نے اپنے اپنے مذہب کی تائید کے لیے کیا ہے - مقصد شارع کے برخلاف ہے کیونکہ جن آیتوں سے اس مسئلہ کو استنباط کیا جاتا ہے اُن آیتوں سے بندوں کے مجبور یا مختار ہونے کا تصفیہ کرنا مقصود نہیں ہے ورنہ آنحضرتؐ مسئلہ مذکورہ کے متعلق بحث کرنے والوں پر غضبناک ہوکر یہ نہ فرماتے کہ "ابھذا امرتم ام بھذا ارسلت" (۱۶) معراج اور شق صدر دونوں رویا میں واقع ہوے ہیں نہ کہ بیداری میں کیا مسجد الحرام سے مسجد اقصیٰ تک اور کیا مسجد اقصےٰ سے آسمانوں تک (۱۷) اگرچہ ممکن ہے کہ جس طرح انسان سے فرد تر مخلوقات موجود ہے اسی طرح اُس سے

---

۱ یعنی خدا تم کو منع نہیں کرتا مگر اُن لوگوں کی دوستی سے جو تم سے دین کی بابت لڑے اور جنھوں نے تمکو تمہارے گھروں سے نکال دیا اور تمہارے نکالنے پر اوروں کی مدد کی ۱۲

بالاتر مخلوقات جن کا ہم کو علم نہیں۔ موجود ہو۔ لیکن ملائک یا ملائکہ کے الفاظ جو قرآن میں وارد ہوئے ہیں
اُن سے یہ مراد نہیں ہے کہ وہ کوئی جدا مخلوق انسان سے بالاتر ہے بلکہ خدائے تعالیٰ نے جو مختلف
قویٰ اپنی قدرت کاملہ سے مادّہ میں ودیعت کئے ہیں۔ جیسے پہاڑوں کی صلابت، پانی کا سیلان
درختوں کا نمو، برق کی قوتِ جذب و دفع و امثال ذلک۔ انھیں کو ملائک یا ملائکہ کے لفظ سے
تعبیر کیا گیا ہے (۱۸) آدم اور ملائکہ اور ابلیس کا قصہ جو قرآن میں بیان ہوا ہے یہ کسی واقعہ کی
خبر نہیں ہے بلکہ یہ ایک تمثیل ہے جس کے پیرایہ میں انسان کی فطرت اور اُس کے جذبات اور
قوتِ بہیمیہ جو اُس میں ودیعت کی گئی ہے اس کی برائی یا دشمنی کو بیان کیا گیا ہے اور اس قسم کی
اور بھی متعدد تمثیلیں قرآن میں موجود ہیں (۱۹) معجزہ دلیل نبوت نہیں ہوسکتا (۲۰) قرآن
میں آنحضرت صلعم سے کسی معجزہ کے صادر ہونے کا ذکر نہیں ہے (۲۱) آیہ "الذین اٰتینٰھم
ھم الکتاب یعرفونہ کما یعرفون ابناءھم" میں جو ضمیر مفعول لفظ یعرفونہ میں ہے
وہ ۔جیسا کہ عام مفسرین لکھتے ہیں آنحضرت کی طرف عائد نہیں ہوتی بلکہ جیسا ابن عباس، قتادہ
ربیع اور ابن زید سے منقول ہے تحویلِ قبلہ کے معاملہ کی طرف پھرتی ہے جس کا ذکر اس آیت سے
پہلے اور اُس کے بعد کیا گیا ہے (۲۲) آیۂ میراث سے وصیت کا حکم۔ جو آیۂ وصیت میں والدین
اور دیگر ورثہ کے لئے تھا منسوخ نہیں ہوا، پس جو وصیت وارث کے حق میں کی جائے وہ نافذ
ہے (۲۳) جو لوگ مشکل سے روزہ رکھتے ہیں وہ آیہ "وعلی الذین یطیقونہ فدیۃ طعام
مسکین" کے بموجب روزوں کے بدلے فدیہ دے سکتے ہیں۔ بعض دیگر علما فدیہ کی اجازت کو
خاص کر معمر لوگوں کے لئے مخصوص سمجھتے ہیں؛ مگر سرسید کے نزدیک یہ حکم عموماً اُن سب لوگوں
کے لئے ہے جن کو روزہ رکھنا شاق ہو، خواہ بڈھے ہوں اور خواہ جوان لیکن بہ نسبت
فدیہ دینے کے اُن کو روزہ رکھنا بہتر ہے (۲۴) جس ربا یعنی سود کی حرمت قرآن میں بیان
ہوئی ہے اُس سے اسی قسم کا ربا مراد ہے جیسا کہ زمانۂ جاہلیت میں عرب میں جاری تھا
اور جس کی مثال ہمارے ملک کے سود خواروں اور بنیوں میں۔ جن کا پیشہ سود خواری ہے۔
پائی جاتی ہے۔ مگر اس سے اُس منافع کی حرمت۔ جو پرامیسری نوٹوں پر لیا جاتا ہے۔ ثابت
نہیں؛ اس کے سوا کسی گورنمنٹ یا کمپنی کو جو ملک کی ترقی کے لئے روپیہ قرض لے سود پر روپیہ
دینا یا کسی جماعت کا۔ جو کسی رفاہ عام کے کام کے لئے چندہ جمع کرے۔ اُس روپیہ کا سود میں
لگانا اور اُس کے منافع سے رفاہ عام کا کام کرنا یہ بھی ربا میں داخل نہیں ہے (۲۵) قرآن میں

کوئی لفظ ایسا نہیں ہے جس سے حضرت عیسیٰ کا زندہ آسمان پر اُٹھایا جانا ثابت ہو (۲۶) شہدا کی نسبت جو قرآن میں آیا ہے کہ اُن کو مردہ نہ سمجھو بلکہ وہ زندہ ہیں۔ اس سے اُن کا علو درجات اور روحانی خوشی اور دنیا میں مثال قابل تقلید چھوڑنا مراد ہے اور نہ یہ کہ وہ درحقیقت زندہ ہیں اور مثل زندوں کے کھاتے پیتے ہیں (۲۷) صُور کا لفظ جو قرآن میں متعدد جگہ آیا ہے اُس سے فی الواقع کوئی آلہ مثل نرسنگے یا سنگہ یا ترئی یا قرنا کے مراد نہیں ہے بلکہ بعض استعارہ ہے جس طرح ترئی کی آواز پر لشکر جمع ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح خدا کی مشیت اور ارادہ سے بعث وحشر واقع ہوگا (۲۸) خدا تعالیٰ کی ذات وصفات اور اسماء وافعال کے متعلق جو کچھ قرآن وحدیثوں میں بیان ہوا ہے وہ سب بطریق مجاز واستعارہ وتمثیل کے بیان ہوا ہے اور اسی طرح معاد کے متعلق جو کچھ بیان ہوا ہے۔ جیسے بعث ونشر، حساب وکتاب، میزان، صراط، جنت، دوزخ وغیرہ وغیرہ وہ بھی سب مجاز پر محمول ہے نہ حقیقت پر (۲۹) قرآن میں جو خدا کا زمین وآسمان کو چھ دن میں پیدا کرنا بیان ہوا ہے۔ اس سے کسی واقعہ کی خبر دینی مقصود نہیں ہے بلکہ صرف یہودیوں کے اس اعتقاد کی تردید مقصود ہے۔ کہ خدا تعالیٰ نے زمین وآسمان کو چھ دن میں پیدا کرنے کے بعد ساتویں دن آرام لیا۔ اور اسی لئے جو کچھ اُن کا عقیدہ خلق زمین وآسمان کی نسبت تھا اُس کو قرآن میں اسی طرح بیان کرکے فرمایا کہ "وَمَا مَسَّنَا مِن لُّغُوبٍ" کیونکہ شارع کا مقصد حقائق اشیاء سے بحث کرنا یا جو باتیں حقائق کے برخلاف ہوں اُن پر ردوقدح کرنا نہیں ہے! بلکہ جو خیالات لوگوں کے دل میں خدا کی وحدانیت اور قدرت وعظمت کے خلاف نہ نشین ہوں اُن کا زائل کرنا ہے (۳۰) قرآن میں جو جا بجا قدیم قوموں میں بدیاں اور بداخلاقیاں پھیل جانے کے بعد اُن پر طرح طرح کے عذاب کا نازل اور کسی قوم کو آندھی اور طوفان سے، کسی کو زلزلے سے، کسی کو ٹڈیوں اور دیگر حشرات کے مسلط کرنے سے اور کسی کو کسی عذاب سے اور کسی عذاب سے برباد کرنا بیان ہوا ہے اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ درحقیقت اُن کے گناہ اور معاصی عذاب نازل ہونے کا باعث ہوئے تھے بلکہ ابتدائے آفرینش سے یہ خیال تمام قوموں میں چلا آتا تھا کہ جو ہولناک حادثے دنیا میں واقع ہوتے ہیں وہ انسان کے گناہوں کی کثرت کے سبب واقع ہوتے ہیں اور انبیا کا کام یہ ہے کہ جن خیالات پر لوگ مجبول ہوئے ہیں اگر وہ خیالات مقاصد نبوت کے منافی نہیں ہیں بلکہ ان کے تائید کرنے والے ہیں تو وہ اُن خیالات کی صحت یا غلطی سے کچھ تعارض نہیں کرتے۔ بلکہ اُنھیں خیالات کو موافق اُن سے خطاب کرتے ہیں (۳۱) خدا کا دیدار کیا دنیا میں اور کیا عقبیٰ میں نہ ان ظاہری آنکھوں سے ممکن ہے اور نہ دل کی آنکھوں سے (۳۲) قرآن مجید میں جو جنگ

بدر و حنین کے بیان میں فرشتوں کی مدد کا ذکر کیا گیا ہے اُس سے ان لڑائیوں میں فرشتوں کا آنا ثابت نہیں ہوتا (۳۳) صفات باری تعالیٰ عین ذات ہیں، نہ غیر ذات، اور نہ لاعین و لاغیر جیسا کہ اشاعرہ کا مذہب ہے (۳۴) حضرت عیسیٰ کا بن باپ کے پیدا ہونا قرآن کی کسی آیت سے ثابت نہیں ہوتا (۳۵) کوئی امر عادت الٰہی یا قانون طبیعی کے خلاف کبھی وقوع میں نہیں آتا (۳۶) قرآن میں جو کفار سے بطور معارضہ کے کہا گیا ہے کہ اگر تم کو اس کتاب کے من عند اللہ ہونے میں شک ہو تو اُس کی مثل کوئی سورۃ یا چند آیتیں تم بنا لاؤ اس سے۔ جیسا کہ اکثر اہل اسلام خیال کرتے ہیں یہ مراد نہیں ہے کہ ایسا فصیح کلام تم نہیں بنا سکتے۔ بلکہ یہ مراد ہے کہ ایسا کلام۔ جو عالم اور فلسفی اور حکیم سے لے کر جاہلوں، صحرا نشین بدوؤں اور اونٹ چرانے والوں تک سب کی ہدایت کے لئے یکساں مفید اور سب کی سمجھ اور علم کے موافق ہو۔ بنا لینا تمہاری طاقت اور قدرت سے باہر ہے۔ (۳۷) نبوت کا ملکہ نبی کی اصل فطرت میں ودیعت ہوتا ہے اور جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ "النبی نبیّ و لو کان فی بطن اُمّہ" وہ ماں کے پیٹ سے نبی پیدا ہوتا ہے اور جس طرح تمام ملکات اور قوائے فطری بتدریج ترقی کرتے ہیں۔ اسی طرح ملکۂ نبوت بتدریج ترقی پاتا ہے۔ یہاں تک کہ جب وہ کمال کے درجہ کو پہنچ جاتا ہے تو اُس سے وہ ظہور میں آتا ہے جو اُس کا مقتضا ہوتا ہے اور جس کو عرف عام میں بعثت سے تعبیر کرتے ہیں؛ اسی لئے جو وحی اُس پر نازل ہوتی ہے وہ کسی ایلچی یا قاصد (یعنی فرشتہ) کی وساطت سے نازل نہیں ہوتی بلکہ خود بخود ایک چیز اُسی کے دل سے اُٹھتی ہے اور اُسی پر گرتی ہے (۳۸) قرآن سے جنات کا ایسا وجود۔ جیسا کہ عموماً خیال کیا جاتا ہے کہ وہ ہوائی آگ کے شعلہ سے پیدا ہوئے ہیں اور ان میں مرد و عورت دونوں ہوتے ہیں۔ جس شکل میں چاہتے ہیں ظاہر ہو سکتے ہیں۔ آدمی کو نفع یا نقصان پہنچا سکتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ ثابت نہیں ہوتا (۳۹) انبیائے بنی اسرائیل اور قوم بنی اسرائیل کے قصے جو قرآن میں بیان ہوئے ہیں اُن میں جس قدر باتیں بظاہر قانونِ فطرت کے خلاف معلوم ہوتی ہیں وہ سب درحقیقت اُس کے مطابق بیان کی گئی ہیں مگر مفسرین اہل اسلام نے یہودیوں کی پیروی سے اُن کے معنی ایسے بیان کئے ہیں جو قانون فطرت کے خلاف ہیں (۴۰) طوفان نوح۔ جس کا ذکر قرآن مجید میں متعدد جگہ آیا ہے عام نہ تھا بلکہ اُسی قوم اور اُسی ملک میں محدود تھا جس پر حضرت نوح مبعوث ہوئے تھے (۴۱) حضرت اسحاق کی ولادت کے وقت حضرت سارا کی عمر اُس حد تک نہیں پہنچی تھی جب کہ عادتاً اولاد کا ہونا غیر ممکن ہے۔

اگر سرسید کی تصنیفات کو بالاستیعاب اول سے آخر تک دیکھا جائے تو غالباً مذکورۂ بالا مسائل کے سوا اور مسائل میں بھی بہت سے اختلافات نکلیں گے۔ مگر یہ سب اختلافات ایسے ہیں جن میں سرسید منفرد نہیں ہیں بلکہ ہر ایک مسئلہ میں کم یا زیادہ لوگ اکابر علمائے اسلام میں سے سرسید کے ساتھ متفق الرائے ہیں جیسے امام غزالی، امام رازی، امام الحرمین، قاضی ابن رشد، شیخ کبیر، شاہ ولی اللہ وغیرہ وغیرہ۔

اگر کسی کو اُن سب بزرگواروں کے نام اور اُن کے اقوال دیکھنے ہوں تو سرسید کی تصنیفات میں اور مولوی سید مہدی علی خاں کے مضامین میں جو زیادہ تر تہذیب الاخلاق کی سب سے پرانی جلدوں میں اور کسی قدر اخیر زمانہ کی جلدوں میں شائع ہوئے ہیں۔ دیکھ لے۔ اُن میں وہ لوگ بھی ہیں جو معجزہ کو دلیل نبوت نہیں سمجھتے، خرق عادت کا واقع ہونا محال سمجھتے ہیں، قرآن میں آنحضرت کے کسی معجزہ کا ذکر ہونا تسلیم نہیں کرتے، آیاتِ قرآنی جو بظاہر انبیائے بنی اسرائیل کے معجزات پر دلالت کرتی ہیں۔ ان کو ماول سمجھتے ہیں، عیسیٰ کا بن باپ کے پیدا ہونا تسلیم نہیں کرتے، ملائکہ سے قوای عالم اور شیطان سے انسان کی قوت بہیمیہ وسبعیہ مراد لیتے ہیں، جن کے وجود سے جیساکہ عموماً سمجھا جاتا ہے انکار کرتے ہیں، نبی پر متعارف فرشتوں کی وساطت سے وحی کا آنا تسلیم نہیں کرتے، قرآن کو محض باعتبار فصاحت و بلاغت کے معجزہ نہیں مانتے، شہدا کو درحقیقت زندہ اور کھاتے پیتے نہیں سمجھتے، مبدأ و معاد کے متعلق جو کچھ قرآن میں بیان ہوا ہے اُس کو مجازی معنوں پر محمول کرتے ہیں، طیور منخنقہ اہل کتاب کا کھانا مسلمانوں کے لئے حلال جانتے ہیں، قرآن میں نسخ کے قائل نہیں ہیں۔ غرضکہ جس قدر سرسید کے اختلافات ہم نے اوپر بیان کئے ہیں۔ اُن میں کوئی ایسا اختلاف نہیں ہے جس میں کچھ نہ کچھ لوگ محققین اہل اسلام میں سے سرسید کے ہمزبان نہ ہوں ہاں چند اختلاف سرسید نے علمائے سلف سے ایسے بھی کئے ہیں جن میں ظاہرا وہ منفرد معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن یقیناً نہیں کہا جا سکتا کہ سلف میں سے کوئی اُس طرف نہیں گیا اور وہ اختلافات یہ ہیں۔

(۱) اسلام نے غلامی کو ہمیشہ کے لئے موقوف کردیا ہے اور آیۂ منّ وفدا جو سورۂ محمد میں ہے وہ نہایت صراحت کے ساتھ اس بات پر دلالت کرتی ہے (۲) دعا ایک قسم کی عبادت ہے جیساکہ حدیث میں آیا ہے ”الدعاء ھو العبادۃ“ پس دعا کے مستجاب ہونے سے اُس مطلب کا جس کے لئے دعا کی جاتی ہے۔ حاصل ہونا مراد نہیں ہے بلکہ جو معنی عبادت کے قبول ہونے کے

ہیں وہی معنی دعا کے مستجاب ہونے کے ہیں (۳) آیت یا آیات بینات کے الفاظ - جو قرآن مجید میں
جابجا آتے ہیں ۔ اُن سے وہ احکام یا مواعظ و نصائح مراد ہیں جو خدا تعالیٰ نے بذریعۂ وحی کے
انبیا پر نازل فرمائے ہیں، نہ کہ معجزات جیسا کہ عموماً علمائے اسلام نے بیان کیا ہے (۴) حضرت
عیسیٰ کی نسبت جو یہودی کہتے تھے کہ ہم نے اُن کو سنگسار کر کے قتل کیا اور عیسائی کہتے تھے
کہ یہودیوں نے اُن کو صلیب پر قتل کیا تھا یہ دونوں قول غلط ہیں؛ بلاشبہ وہ صلیب پر چڑھائے
گئے مگر صلیب پر موت واقع نہیں ہوئی اور اسی لئے قرآن میں مَا قَتَلُوْہُ وَمَا صَلَبُوْہُ کے الفاظ
واقع ہوئے ہیں جس سے یہ مراد ہے کہ موت جو مصلوب کرنے سے مقصود تھی وہ واقع نہیں ہوئی۔
(۵) اگر مرد کو یہ احتمال بھی ہو کہ وہ متعدد ازواج میں عدالت نہ کرسکے گا تو اس کو ایک سے زیادہ
جورو کرنے کی اجازت نہیں ہے (۶) سارق کے لئے قطع ید کی سزا جو قرآن میں بیان ہوئی ہے
لازمی نہیں ہے کیونکہ اگر لازمی ہوتی تو فقہا اُس کو مال مسروقہ کی ایک خاص مقدار کے ساتھ
مشروط نہ کرتے اور نیز صحابہ کے وقت میں متعدد موقعوں پر سارق کو صرف قید کی سزا نہ دیجاتی
(۷) قرآن میں جن اور اجنہ کے الفاظ سے چھپے ہوئے یا پہاڑی اور صحرائی لوگ مراد ہیں نہ کہ وہ
وہمی مخلوق جو دیو اور بھوت وغیرہ کے الفاظ سے مفہوم ہوتی ہے (۸) سورۂ فیل (الم تر کیف)
میں جن الفاظ سے اصحاب فیل پر ابابیل کا کنکریاں پھینکنا مراد لیا جاتا ہے وہ درحقیقت مرض
چیچک سے استعارہ ہے جس کی نسبت تاریخ سے ثابت ہے کہ پہلے پہل مرض چیچک عرب میں اُسی سال
نمودار ہوا ہے جب کہ ابرہہ نے مکہ پر چڑھائی کی تھی (۹) حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ اور
تمام انبیائے سابقین کے قصوں میں جس قدر واقعات بظاہر خلاف قانون فطرت معلوم ہوتے ہیں
جیسے ید بیضا، عصا کا اژدہا بن جانا، فرعون اور اُس کے لشکر کا غرق ہونا، خدا کا موسیٰ سے
کلام کرنا، پہاڑ پر تجلی کا ہونا، گوسالۂ سامری کا بولنا، ابر کا سایہ کرنا من و سلویٰ کا اُترنا
یا عیسیٰ کا گہوارہ میں بولنا، خلق طیر، اندھوں اور کوڑھیوں کو چنگا کرنا، مُردوں کو زندہ کرنا،
مائدہ کا نزول وغیرہ وغیرہ - اُن کی تفسیر میں جو کچھ سرسید نے لکھا ہے وہ غالباً پہلے کسی مفسر نے
نہیں لکھا (۱۰) قرآن مجید میں دو طرح کا کلام پایا جاتا ہے ایک مقصود اور دوسرا غیر مقصود پس
جو کلام غیر مقصود ہے اُس سے کسی بات کے اثبات یا نفی پر استدلال نہیں ہوسکتا۔ مثلاً کفار کے
رحمت الٰہی سے محروم ہونے کو اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ "لا تفتح لهم ابواب السماء" چونکہ
اصل مقصود اُن کے حرمان کا بیان ہے اور اُس کو اس پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے اس لئے اس

کلام کو غیر مقصود سمجھا جائے گا اور اس سے اس بات پر کہ آسمان میں فی الواقع دروازے موجود ہیں استدلال نہو سکے گا (۱۱) شریعت اسلامیہ میں تمام احکام دو قسم کے ہیں ایک اصلی اور دوسرے محافظ احکام اصلی؛ جن احکام پر اسلام کی بنیاد قائم ہے وہ صرف احکام اصلی ہیں جن میں کوئی حکم ایسا نہیں جو قانون فطرت کے خلاف ہو؛ اور دوسری قسم کے احکام سے فقط احکام اصلی کی محافظت مقصود ہے نہ یہ کہ وہ خود مقصود بالذات ہیں؛ پس اُن کی نسبت یہ بحث بالکل بے محل ہے کہ وہ قانون فطرت کے مطابق ہیں یا نہیں لیکن چونکہ دونوں لازم و ملزم ہیں اس لئے عملاً دونوں کا درجہ برابر ہے۔ مثلاً نماز کے متعلق اصلی حکم صرف توجہ الی اللہ ہے باقی جس قدر احکام اُس سے متعلق ہیں مثل وضو اور قیام و قعود و رکوع و سجود اور استقبال قبلہ وغیرہ یہ سب اُس کے محافظ ہیں اور یہی وجہ ہے کہ مرض یا عذر کی حالت میں سب ساقط ہو سکتے ہیں مگر توجہ الی اللہ کسی حالت میں ساقط نہیں ہوتی۔ لیکن جب تک کوئی عذر مانع نہ ہو دونوں کا بجا لانا ضروری ہے۔

آزادیٔ رائے

اگرچہ مذہب کے متعلق رائے ظاہر کرنے کی موجودہ گورنمنٹ کی طرف سے آزادی تھی پھر بھی یہ کوئی آسان کام نہ تھا، اول تو مذہبی خیالات ایسی چیز ہیں کہ جس طرح اُن کا یقین کسی دلیل سے پیدا نہیں ہوتا اسی طرح وہ کسی دلیل سے زائل بھی نہیں ہوتا، اس کے سوا اسلامی سلطنتوں میں اگرچہ غیر قوموں کے مذہب سے بہت ہی کم تعرض کیا گیا مگر خود مسلمانوں کو مذہبی آزادی جیسی کہ چاہئے کبھی نصیب نہیں ہوئی۔ جس ملک میں جو فرقہ برسر حکومت ہوا اُس ملک میں ہمیشہ اُسی فرقہ کے مذہب نے رواج پایا، باقی تمام فرقے مضمحل و متلاشی ہو گئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں میں آزادی رائے بالکل معدوم ہو گئی اور تقلید کی بدترین غلامی تمام قوم کا شعار بن گئی۔ پس ایک ایسی آواز جس سے کبھی کسی کے کان آشنا نہ ہوئے تھے اُس کو مسلمان کیونکر بغیر نفرت اور کراہت کے سُن سکتے تھے۔ دوسرے آزادیٔ رائے کہ ایک ایسی چیز ہے کہ جب دفعۃً کسی غیر تربیت یافتہ قوم کو حاصل ہوتی ہے تو اختلافِ آرا، جو آزادی کو لازم ہے اُس قوم میں ہمیشہ مخالفت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ آزادی اُن کو اختلاف کرنا تو سکھا دیتی ہے مگر بسبب تربیت یافتہ نہ ہونے کے وہ اختلاف اور مخالفت میں کچھ فرق نہیں کر سکتے وہ جس رائے سے اختلاف کرتے ہیں اُن کی ہمیشہ یہی کوشش ہوتی ہے کہ یا اُس کو توڑ دیں یا خود ٹوٹ جائیں۔ مسلمانوں نے چونکہ انگریزی سلطنت میں آزادی کا نیا سبق پڑھا ہے۔ اس لئے جو بات اُن کی رائے یا عقیدہ کے خلاف یا اُن کی سمجھ سے بالاتر ہوتی ہے اُس سے ہمیشہ ایسا اختلاف

کرتے ہیں جو آخر کو منجر بہ مخالفت ہو جاتا ہے۔

ایک اور عام سبب مخالفت کا خاص کر مسلمانوں میں قومی تنزل ہے جس کے سبب سے ہمیشہ گری ہوئی قوموں میں خود غرضی بغض حسد جہالت وغیرہ خود بخود بڑھ جاتے ہیں؛ لوگ عموماً لڑائی جھگڑے مول خریدنے لگتے ہیں اور ذرا ذرا سی بات پر مخالف پارٹیاں قائم ہو جاتی ہیں۔ یہ ایسی مخالفت ہے کہ اگر سر سید رفارمیشن کا کام اختیار نہ کرتے اور مذہبی امور میں ایک حرف بھی جمہور کے خلاف زبان سے نہ نکالتے بلکہ عام انگریزی اسکولوں کے نمونہ پر ایک مدرسہ قائم کر دیتے تو بھی مخالفت سے ہرگز نہ بچ سکتے تھے۔ جب ندوۃ العلماء۔ جو خاص کر دینی تعلیم اور دینی اغراض کے لئے اکثر علمائے اسلام کے اتفاق سے قائم ہوئی ہے۔ مخالفت سے نہ بچی تو اور کسی کو اس سے بچنے کی کیا امید ہو سکتی ہے اگر ہمارا قیاس غلط نہ ہو تو کوئی اسلامی انجمن کوئی اسلامی مدرسہ اور کوئی مسلمانوں کی عام بھلائی کا کام آج کل ایسا نہیں کیا جاتا جس کی مخالفت نہ ہوتی ہو پس سر سید کو مخالفت سے کسی طرح مفر نہ تھا۔

اگرچہ اُن کے مذہبی خیالات کی نسبت اُسی وقت سے بدگمانی شروع ہو گئی تھی جب کہ اُنھوں نے انگریزوں کے ساتھ کھانے سے پرہیز ترک کر دیا تھا، مگر جب کہ اُنھوں نے "تبیین الکلام" کی پہلی جلد شائع کی تو اُس بدگمانی کو زیادہ ترقی ہوئی۔ سید مہدی علی خاں۔ جو آخر کو سر سید کی رفارمیشن کے سب سے بڑھکر مددگار ہوئے۔ اُن کو تبیین الکلام کا دیباچہ دیکھکر ایسا جوش آیا کہ باوجود جان پہچان نہ ہونے کے اُسی جوش و خروش میں اُنھوں نے سر سید کے دیباچۂ مذکور کے برخلاف ایک طول طویل خط لکھکر بھیجا۔ سر سید نے نہایت نرم الفاظ میں یہ جواب لکھا کہ "اب تقلید کا زمانہ نہیں رہا بلکہ عقل اور ہوش سے کام لینے کا وقت ہے" اس کے بعد جب سر سید کے پاس علیگڑھ جانا ہوا اور اُن کے مکان پر پہنچے تو دیکھا کہ وہ نماز پڑھ رہے ہیں دل میں خدشہ تو تھا ہی، یہ سمجھے کہ جدھر سر سید نماز پڑھ رہے ہیں یہ قبلہ کا رخ نہیں ہے۔ جب وہ نماز پڑھ چکے تو اپنا شبہ ظاہر کیا۔ سر سید نے یہ آیت پڑھی "اَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْہُ اللّٰہِ" جب اس پر خوب بحث ہو چکی تو سر سید نے کہا میں نے اس کوٹھی کو ٹھیک قبلہ رُخ بنایا ہے۔ پھر کمپاس لگا کر اُن کو اپنے کہنے کا یقین دلایا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ سر سید کی سچائی کا نقش اُن کے دل پر بیٹھا۔

جب سر سید نے غازی پور میں مدرسہ قائم کیا اگرچہ وہاں مسلمانوں کی طرف سے کچھ مخالفت نہیں ہوئی مگر پادریوں نے سخت مزاحمت کی اور مسٹر سپٹ جج غازی پور اور کرنل گریہم

ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ کے سوا ضلع کے تمام افسر پادریوں کے طرف دار ہو گئے مگر آخر کار سرسید کامیاب ہوئے اور مدرسہ قائم ہو گیا۔

جب وہ غازی پور سے بدل کر علی گڑھ میں آئے اور سائنٹفک سوسائٹی اور اُس کا پریس بھی جو اُس وقت تک سرسید کا پرائیویٹ چھاپہ خانہ تھا اُن کے ساتھ علی گڑھ میں منتقل ہو گیا اور سوسائٹی کا مکان بھی تیار ہو گیا اب سوسائٹی نے باقاعدہ اپنا کام شروع کیا۔ سب سے پہلے الفنسٹن ہسٹری اوف انڈیا کا ترجمہ انگریزی سے اُردو میں ہونے لگا اور اُس کے اجزا چھپ چھپ کر ممبروں کو تقسیم ہونے لگے۔ مصنف نے مسلمانوں کی سلطنت ہند کا حال شروع کرنے سے پہلے جہاں اسلام کا آغاز اور عرب میں آنحضرت صلعم کے پیدا ہونے کا حال بیان کیا تھا وہاں آپ کی نسبت (عیاذاً باللہ) پیغمبر باطل کا لفظ لکھا تھا اُردو میں بھی اُس کا اسی طرح ترجمہ بے کم و کاست کیا گیا۔ مگر سرسید نے جارج سیل کے ترجمۂ قرآن اور اُس کے دیباچہ سے اور کرنل کینڈی کی کتاب سے اور نیز تاریخ طبری سے چند مقام جن سے مصنف کے قول کی تردید ہو سکتی تھی فٹ نوٹ میں نقل کر دیئے تھے مگر اُن نوٹوں سے مسلمانوں کی ناراضی کم نہیں ہوئی۔ جب یہ حصہ چھپ کر ممبروں کے پاس پہنچا تو مولوی سمیع اللہ خاں نے اس امر پر کہ پیغمبر کے لفظ کے ساتھ باطل کیوں ترجمہ کیا گیا۔ سخت مخالفت کی اور ایک تحریر جس میں (بقول سرسید کے) اُن کے کفر و ارتداد پر اسی لفظ کے ترجمہ ہونے سے استدلال کیا گیا تھا۔ اخباروں میں شائع کرائی۔ اُس میں یہ بھی لکھا تھا کہ جو شخص سوسائٹی میں شریک ہو وہ کافر ہے۔ چنانچہ اکثر مسلمان بزرگوں نے سوسائٹی کی ممبری سے استعفیٰ دے دیا۔

اگرچہ ممکن تھا کہ ترجمہ میں باطل کا لفظ نہ لکھا جاتا مگر سرسید کا مقصد مسلمانوں کو اس بات سے آگاہ کرنا تھا کہ عیسائی اسلام اور بانیٔ اسلام کی نسبت کیا خیالات رکھتے ہیں اور اب اپنے مذہب کے طعنوں سے کان بند کر لینے کا وقت نہیں ہے بلکہ اس بات کی ضرورت ہے کہ غیر قومیں جو کچھ اسلام کے برخلاف کہتی ہیں اُس سے اطلاع حاصل کی جائے اور اُن کی غلط فہمیوں کو رفع کیا جائے یا اُن کے تعصبات کی قلعی کھول دی جائے۔ اخیر دم تک اُن کی یہی رائے رہی کہ اب وہ زمانہ نہیں ہے کہ مسلمان مخالفوں کے اعتراضوں اور طعنوں اور بدزبانیوں سے بے خبر رہیں چنانچہ پچھلے دنوں میں جو ایک نیٹو کرسچن نے ایک سخت کتاب موسوم بہ اُمہات المومنین چھاپ کر مسلمانوں کو مفت تقسیم کی تھی اکثر ذی علم مسلمانوں نے

ناگواری کے سبب اُس کو فوراً جلادیا۔ لیکن سرسید نے نہایت ٹھنڈے دل سے اُس کو اوّل سے آخر تک دیکھا اور فوراً اُس کا جواب لکھنا شروع کیا جس کو مرض الموت نے افسوس ہے کہ ختم نہ ہونے دیا۔

پھر لندن جانے سے پہلے جب اُنھوں نے ایک رسالہ احکام طعام اہل کتاب پر لکھکر شائع کیا تو عموماً اُن کو کرسٹان کا خطاب دیا گیا اور جا بجا اس کے چرچے ہونے لگے۔ جب ولایت کے سفر میں چند روز باقی رہ گئے تو اُنھوں نے اس خیال سے کہ انگریزی طریقہ پر کھانا کھانے سے بخوبی واقفیت ہوجائے۔ یہ معمول باندھ لیا تھا کہ مسٹر سماینہ جو بنارس میں ایک سوداگر تھے اور سرسید کی کوٹھی سے اُن کی کوٹھی ملی ہوئی تھی۔ ایک دن شام کا کھانا یہ اُن کے گھر پر جاکر کھاتے تھے اور ایک دن وہ ان کے گھر پر آکر کھاتے تھے۔ سرسید کا بیان ہے کہ " اتفاق سے اُنھیں دنوں میں مولوی سید مہدی علی خاں مرزا پور سے بنارس میں مجھسے ملنے کو آئے۔ رات کا وقت تھا اور میرے ہاں کھانے کی باری تھی۔ ہم دونوں میز پر بیٹھے کھانا کھارہے تھے کہ مہدی علی آپہنچے۔ یہ پہلی دفعہ تھی کہ مولوی مہدی علی نے ایک مسلمان کو اس طرح ایک انگریز کے ساتھ کھانا کھاتے دیکھا تھا، سخت نفرت ہوئی اور باوجود میرے ہاں مہمان ہونے کے کھانا نہ کھایا اور کہا کہ میں کھا چکا ہوں۔ صبح کو مجھے معلوم ہوا کہ اُنھوں نے اس وجہ سے کھانا نہیں کھایا۔ میں نے کہا کہ اگر آپ کو یہ طریقہ ناپسند ہو تو دوسرا بندوبست کیا جائے۔ اُنھوں نے سوچا کہ شرعاً تو ممنوع نہیں ہے صرف عادت کے خلاف دیکھنے سے نفرت ہوئی ہے۔ آخر قبول کرلیا اور سب سے پہلی دفعہ دن کا کھانا میرے ساتھ میز پر کھایا۔ دن تو اس طرح گزر گیا مگر رات کو یہ مشکل پیش آئی کہ رات کا کھانا مسٹر سماینہ کے ہاں تھا، میں نے اُن سے پوچھا کہ اگر آپ کو وہاں کھانے میں تامل ہو تو یہاں انتظام کیا جائے اُنھوں نے پھر اسی خیال سے کہ شرعاً ممنوع نہیں۔ اقرار کرلیا کہ میں بھی وہیں کھالوں گا۔ چنانچہ رات کو وہیں کھانا کھایا پھر ایک آدھ روز بعد مرزا پور واپس چلے گئے۔ الہ آباد میں ان کے ایک دوست کو یہ حال معلوم ہوگیا اُنھوں نے خط لکھ کر دریافت کیا کہ کیا یہ خبر سچ ہے؟ مولوی سید مہدی علی نے سارا حال مفصل لکھ بھیجا اُنھوں نے وہ خط بجنسہ ہمارے ایک نامہربان دوست کے پاس جو اٹاوہ میں رونق افروز تھے بھیجدیا اُنھوں نے تمام شہر میں ڈھنڈورا پیٹ دیا کہ مہدی علی کرسٹان ہوگئے مولوی صاحب کے گھر کے پاس ہی ایک پینٹھہ لگا کرتی تھی ہمارے شفیق نامہربان نے اُس گنواردل میں جاکر خط کا مضمون ایک ایک آدمی کو سُنایا اور تمام پینٹھ میں منادی کردی کہ بھائیو! افسوس ہے مولوی مہدی علی کرسٹان ہوگئے۔ جو سنتا تھا افسوس کرتا تھا اور کہتا تھا خدا سید احمد خاں پر لعنت کرے "

اس خبر کا مشہور ہونا تھا کہ مولوی صاحب کے گھر پر ہلاک خور نے کمانا، سقے نے پانی بھرنا، اور سب لگے بندھوں نے آنا جانا چھوڑ دیا گھر والوں نے ان کو لکھا کہ تمھاری بدولت ہم پر سخت تکلیف گزر رہی ہے تم جلدی آؤ اور اس تکلیف کو رفع کرو۔ اُنھوں نے ایک طول طویل خط انھیں بزرگ کو جنھوں نے یہ افواہ اُڑائی تھی حلتِ طعام اہل کتاب کے باب میں لکھا اور پھر خود اٹاوہ میں آئے اور سب کو سمجھایا کہ میں کرسٹان نہیں ہوں جیسا پہلے مسلمان تھا ویسا ہی اب ہوں۔ غرض بڑی مشکل سے لوگوں کا شبہہ رفع کیا۔

لطیفہ جب پہلی ہی دفعہ یہ خبر اٹاوہ میں پہنچی تو ایک سنی صاحب نے محسن الملک کے چچا سے کہ وہ بھی مثل اپنے تمام خاندان کے اثنا عشری تھے۔ جا کر کہا کہ میر صاحب رونے کا مقام ہے کہ مہدی علی کرسٹان ہو گئے۔ اُنھوں نے کہا میاں اب تم روؤ، ہم تو اُسی دن رو چکے تھے جب اُس نے اپنے باپ دادا کا مذہب چھوڑ کر تمھارا طریقہ اختیار کیا تھا۔

جب سرسید لندن جانے لگے کسی نے یہ مشہور کیا کہ مکہ کے بدلے لندن کے حج کو جاتے ہیں اور کسی نے کہا کہ لندن جا کر ٹکسالی کرسٹان ہو کر آئیں گے۔ غرض جو جس کے دل میں آیا سو کہا مگر سرسید نے جو کچھ دل میں ٹھان لیا تھا اُس پر استقلال کے ساتھ قائم رہے اور تاریخ معین پر بسم اللہ مجریھا و مرسہا کہہ کر جہاز میں سوار ہو لندن روانہ ہو گئے۔ راہ میں وہ دریائی سفر کے حالات اور جہاز کے واقعات لکھ کر وقتاً فوقتاً سوسائٹی کے اخبار میں چھپنے کو بھیجتے جاتے تھے اُسی کے ضمن میں اُنھوں نے یہ بھی لکھا تھا کہ " جہاز میں باورچی اور جانور ذبح یا صاف کرنے والا انگریز ہے، تحقیق کرنے سے معلوم ہوا کہ جو بڑے جانور ہیں اور جن میں خون زیادہ ہے۔ جیسے بھیڑ بکری مینڈھا وغیرہ اُس کو تو وہ ہمیشہ گردن کی شہرگ میں آرپار چھری مار کر ذبح کرتے ہیں کیونکہ اُن کے ہاں بھی دم مسفوح ناجائز یا حرام ہے یا اُس کے اخراج کا رواج ہے اور پرندوں میں مثل چوپاؤں کے دم مسفوح نہیں ہے اور اُن کی مثال دریائی جانوروں کی سی ہے پس ان کا ذبح صرف اُن کا مارڈالنا ہے اس لئے پرندوں کو ذبح نہیں کرتے بلکہ گردن توڑ کر مار ڈالتے ہیں۔" چونکہ اہل کتاب کا ذبیحہ مطلقاً جس طرح کہ وہ کرتے ہیں مسلمانوں کو اپنے مذہب کے موافق کھانا جائز ہے اس لئے سرسید نے لکھا تھا کہ " میں نے اور میرے ساتھیوں نے اُن دونوں قسم کے گوشتوں کے کھانے میں کچھ تامل نہیں کیا اور خوب مزے دار گوشت مٹن اور بیف اور مرغ و کبوتر کے کھائے والحمد للہ الذی جعل دیننا یُسراً ولا عسراً والصلوٰۃ والسلام علیٰ صاحب الشریعۃ السہلۃ الھدیٰ۔"

اور جہاں تک ہم کو معلوم ہے تمام ترک اور مصر و شام کے مسلمان جو عیسائی قوموں کے جہازوں میں سفر کرتے ہیں وہ بھی عموماً اسی طرح عیسائیوں کے ساتھ اُنھیں کے باورچیوں کے ہاتھ کا صاف یا ذبح کیا ہوا اور اُنھیں کے ہاتھ کا پکایا ہوا بے تکلف کھاتے ہیں۔

جب یہ خبر ہندوستان میں پہنچی تو مخالفین کو ایک اور ہتھیار سرسید پر ہاتھ صاف کرنے کو ملا، عیسائیوں کے ہاتھ کی گردن مروڑی مرغی کھانے کو اُنھوں نے سید کے کافر ہونے کا بہت بڑا ثبوت قرار دیا کیونکہ قرآن مجید کی رو سے منخنقہ حرام ہے پس جس شخص نے قرآن کے حکم سے انحراف کیا اُس کے کافر اور مرتد ہونے میں کیا کلام ہے؟

پھر لندن سے جو تحریر سرسید کی آتی تھی اور سوسائٹی کے اخبار میں چھپتی تھی اُس پر عام اخباروں میں برابر اعتراضوں کی بوچھار ہوتی تھی۔ ان کی ایک تحریر میں یہ فقرہ تھا کہ "ہندوستان کے لوگ انگریزوں کے ساتھ تربیت و شائستگی میں وہ نسبت رکھتے ہیں جو ایک وحشی بدصورت ایک لائق اور خوبصورت آدمی کے ساتھ رکھتا ہے" اس پر مدت تک اخباروں کے کالم سیاہ ہوتے رہے اور عام مجلسوں میں بہت دن تک اس کا چرچا رہا چنانچہ اُنھیں دنوں میں ایک جلسہ کی کیفیت جو بہ تقریب دعوت صاحبزادہ عبید اللہ خاں فیروز جنگ۔ مولوی سید مہدی علی خاں کے مکان پر منعقد ہوا تھا اور جس میں صاحبزادہ موصوف اور مولوی صاحب اور دیگر شرکائے جلسہ کے درمیان خوب مباحثہ ہوا تھا۔ سوسائٹی کے اخبار میں مفصل چھپی تھی۔

جب یہ تمام نکتہ چینی سے بھرے ہوئے اخبار سرسید کے پاس لندن میں پہنچے تو اُنھوں نے ایک مضمون جس کا عنوان "عذر از طرف گنہگار سید احمد" تھا۔ سوسائٹی اخبار میں چھپنے کو بھیجا جس میں اول تمام اہل وطن کی نکتہ چینیوں کا شکریہ ادا کیا تھا کہ اُنھوں نے میرے عیبوں سے مجھے آگاہ کیا اور آخر میں اہل سے وطن سے مخاطب ہو کر لکھا تھا کہ "وہ دن آنے والا ہے کہ تم میرے ان لفظوں کو جنہیں اب گالیاں سمجھتے ہو سوہالیاں سمجھو گے ۔۔۔۔۔۔ اے یارانِ وطن ؎

رات تھوڑی حسرتیں دل میں بہت　　صلح کیجے بس لڑائی ہو چکی

شکوہ و شکایت ہو چکے، بس اب گلے مل لیجئے اور اپنے ملک کی بھلائی پر متوجہ ہوجئے، اپنے ملک کے بچوں کی تربیت کا بندوبست کیجئے اور جو جو الزام ہمارے ملک پر ہیں اُن کو مٹائیے، دنیا میں اپنے ملک کو تربیت یافتہ اور شائستہ کر کے دکھلائیے اور جیلنے والوں کو اُٹھا رکھئے۔"

جب اس پر بھی اہل وطن کی مخالفت کم نہ ہوئی اور اخباروں میں برابر مخالفانہ مضامین

چھپتے رہے تو انہوں نے ایک تحریر جس کا عنوان "عرضداشت بخدمت اہل وطن" تھا سوسائٹی اخبار میں چھپنے کو بھیجی جس کی ابتدائی سطروں سے کسی قدر اس مخالفت کا اندازہ ہوتا ہے جو اس وقت تک ہندوستان کے مختلف اطراف سے ہو چکی تھی یا ہو رہی تھی۔ وہ اپنے کام اور کوشش کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں "پس جو میرا گناہ ہے وہ بجز اپنے ہم وطنوں کی عموماً اور اسلام کی خصوصاً خیرخواہی کے سوا اور کچھ نہیں ع نیست یارانِ طریقت غیر از یں تقصیر ما ...... اگرچہ میری اس دل سوزی کو میرے ہم وطنوں نے ناپسند ہی نہیں کیا بلکہ اُلٹا سمجھا اور کوئی الزام اور عیب اور بُرائی اور سخت کلامی نہیں چھوڑی کہ علانیہ اور خفیہ میری نسبت منسوب نہ کی ہو! مگر چونکہ میری یہ دل سوزی اپنے ہم وطنوں سے یا ہم قوموں سے کسی صلہ کی توقع پر نہ تھی۔ بلکہ اُس کا اجر خدا سے لینا ہے اس لئے میرے ہم وطنوں نے کوئی بات جو میرے ساتھ کی۔ مجھکو ناگوار نہیں گزری اور خدا نے مجھکو اپنے ارادہ پر مستحکم رکھا۔ نہ پرانے دوستوں کی باتیں بُری معلوم ہوتی ہیں، نہ نئے شفیقوں کی تشنیع رنج دیتی ہے۔ نہ کانپور کی مہیب آواز سے رنج ہوتا ہے، نہ لکھنؤ کی نغمہ سرائی سے دل دکھتا ہے، نہ الہ آباد اور آگرہ کی لطف آمیز باتیں رنج دلاتی ہیں، نہ مراد آباد اور رامپور کے فتوے اور دہلی کے اہل جبہ و خانقاہ حاجیانِ حرمین شریفین کی گفتار و رفتار دل کو دکھاتی ہے؛ عام علائی کے جوش نے کسی دوسری چیز کے سمانے کی دل میں جگہ نہیں چھوڑی والحمد للہ علی ذالک"

معلوم ہوتا ہے کہ سرسید نے جو بڑے بڑے منصوبے باندھے تھے اُن پر خاص کر مسلمانوں کی طرف سے سخت مخالفتوں کے ہونے کا اُن کو کامل یقین تھا اور ولایت سے وہ اُن مخالفتوں کے جھیلنے کے لئے تیار ہو کر آئے تھے۔ وہ ولایت سے مولوی سید مہدی علی خاں کو اخبار شعلہ طور کانپور کی مخالفانہ تحریر کا ذکر کرتے ہوئے ایک خط میں لکھتے ہیں " جو مضمون کہ اُس میں لکھا گیا آپنے پڑھا ہوگا اور اُمید ہے کہ اور بہت کچھ لکھا جائے گا۔ اگرچہ ایسی باتوں سے کبھی دل کو ملال ہوتا ہے یہ مقتضائے بشریت ہے مگر فی الفور رفع ہو جاتا ہے اور دل کو صرف دو خیالوں سے تسلّی ہوتی ہے؛ اول تو اس خیال سے کہ آج تک کوئی نیکی چاہنے والا ایسا نہیں ہوا جس کے مقابل میں کوئی نہ کوئی مخالف نہ کھڑا ہوا ہو آدم، نوح، ابراہیمؑ، موسیٰؑ، عیسیٰؑ، محمد رسول اللہ صلعم خلفائے اربعہ محی الدین جیلانی، مجدد الف ثانی محمد اسمٰعیل دہلوی، وعلیٰ ہذا القیاس؛ پس میں تو ان کی جوتیوں کے برابر بھی نہیں ہوں، میری مخالفت پر کمر باندھنی کچھ بڑی بات نہیں ہے۔ دوسرے اس خیال سے کہ میں دیکھتا ہوں جوں جوں مخالفتوں نے نیکی کا مقابلہ کیا ہے ووں ووں نیکی بڑھتی گئی ہے؛

پس اگر میرا کاروبار و میری نیت سچی اور نیک ہے تو انشاء اللہ تعالیٰ اس میں کچھ نقصان نہیں ہونے کا اور وہ اگر نیک نہیں ہے اور میں غلطی سے اس کو نیک خیال کر رہا ہوں تو بلا شبہ ٹوٹ جائے گا اور مخالف جو اس صورت میں ضرور ہے کہ نیکی پر ہونگے کامیاب ہونگے اور ایسی حالت میں مجھکو بھی اُن کی کامیابی پر خوشی کرنی ہوگی، نہ اپنی تدابیر کے ٹوٹنے اور اپنے دھوکے میں پڑے ہونے کا رنج۔"

اس خط اور نیز اُن کے دیگر خطوط سے جو ولایت سے اُنہوں نے مولوی صاحب ممدوح کو لکھے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کو اپنی سچائی پر اور اُس کی وجہ سے اپنی کامیابی پر پورا پورا بھروسہ تھا اور لوگوں کی مخالفت کی اُن کو مطلق پروا نہ تھی۔ ایک خط میں خطبات احمدیہ کی نسبت مولوی مہدی علیخاں کو لکھتے ہیں "بعد چھاپنے کے چند نسخے آپ کے پاس بھیجونگا؛ نادانم کہ مخدومم چہ میگوید؟ خدایا مخدومم مہدی اگر مرا کافر و مرتد داند باک نیست زیرا کہ ایں معاملہ مرا بالست نہ با مخدوم من مہدی۔ لیکن محبتِ من از و محبتِ او از من کم مگرداں۔ او خدا دانندۂ رازہائے پوشیدہ درونِ سینہا تو میدانی کہ من باتو و با دین حقۂ اسلام دادۂ تو چہ میکنم و چہ اعتقاد دارم؟ پس اگر مرا محبوبِ من مہدی لامذہب یا کافر گوید یا یسمع اللہ و امداد العلی مرتد داند مرا چہ باک؟ تو بر من مہربان باش۔"

الغرض جب سرسید لندن سے واپس آئے اور الہ آباد میں پہنچے تو ان کو معلوم ہوا کہ اضلاع شمال مغرب اور دہلی میں اس مضمون کے خطوط اور اشتہار جاری ہوئے ہیں کہ کوئی مسلمان سید احمد خاں سے نہ ملے اور نہ اُن کے ساتھ کھانا کھاوے اور جو ایسا کرے گا وہ دائرۂ اسلام اور جماعتِ اہل اسلام سے خارج ہو جائے گا۔ ہم نے سنا ہے کہ اسی مضمون کا ایک خط نواب ضیاء الدین احمد خاں مرحوم رئیس لوہارو کے پاس بھی جو سرسید کے بڑے گاڑھے دوست تھے دہلی میں پہنچا تھا۔ اُنہوں نے خط پڑھکر کہا کہ "خدا مارے یا چھوڑے، سید احمد کافر ہو یا مسلمان، مجھسے تو نہ ہو سکے گا کہ میں سید احمد خاں سے نہ ملوں اور اُن کے ساتھ کھانے اور کھلانے سے پرہیز کروں۔" سرسید کی زبانی معلوم ہوا کہ ولایت سے آنے کے بعد بہت دن تک اکثر لوگ اُن کے ساتھ کھانے سے پرہیز کرتے رہے۔ مگر رفتہ رفتہ بیمار اچھے ہونے لگے، پرہیز ٹوٹتا گیا۔ یہاں تک کہ مسلمانوں کا انگریزوں کے ساتھ کھانا جیسا کہ ظاہر ہے۔ اب ایک عام بات ہوگئی ہے۔ وہی لوگ جو میز اور کرسی اور چھری کانٹے کے نام سے بدکتے تھے اب انگریزوں کو اپنے گھر بلا کر اور خود اُن کے ہاں جا کر اُسی طریقے سے اُن کے ساتھ کھانا کھانا فخر سمجھتے ہیں اور کوئی شخص ان کو کرسٹان نہیں جانتا۔

لیکن مذکورۂ بالا مخالفتوں کو بمقابلہ اُس طوفان عظیم کے جو آگے چل کر اُٹھنے والا تھا محض

ایک چھیڑ چھاڑ اور نوک جھوک سمجھنا چاہیئے۔ جونہیں سرسید نے تہذیب الاخلاق جاری کیا اور کالج کے قائم کرنے کے لئے کوشش شروع ہوئی، مخالفت کی گھٹا چاروں طرف سے اُمنڈ گھمنڈ کر اُٹھی۔

مدرسۃ العلوم کے سب سے بڑے مخالف دو بزرگ تھے جو باوجود ذی وجاہت اور ذی رتب ہونے کے علوم دینیہ سے بھی آشنا تھے؛ ایک مولوی امداد العلی ڈپٹی کلکٹر کانپور اور دوسرے مولوی علی بخش خاں سب جج گورکھپور۔ اگرچہ یہ دونوں صاحب مذہبی عقائد و خیال کے لحاظ سے ایک دوسرے کے ضد حقیقی تھے یعنی پہلے سخت وہابی اور دوسرے سخت بدعتی، اور بہ ایسا اختلاف تھا کہ کسی بات پر دونوں کا اتفاق کرنا محال عادی معلوم ہوتا تھا؛ باوجود اس کے مدرسۃ العلوم کی مخالفت پر دونوں ہمزبان اور متفق الکلمہ تھے؛ یہاں تک کہ ہندوستان میں جس قدر مخالفتیں اطراف و جوانب سے ہوئیں اُن کا منبع انھیں دونوں صاحبوں کی تحریریں تھیں۔ اگر ان کی مخالفت کا باعث مذہبی جوش یا حمیت اسلامی ہوتی تو اُن کا کام نہایت تعریف کے لائق ہوتا مگر افسوس ہے کہ مسلمانوں کی تمام مخالفتوں کی طرح اُن کی مخالفت بھی محض ذاتیات پر مبنی تھی جس کے بیان کرنے کی یہاں ضرورت نہیں ایک اور وجہ ان کی یہ تھی کہ بعض جلیل القدر انگریز مدرسۃ العلوم کے سخت مخالف تھے اور اُن میں سے بعض کے ساتھ ان دونوں صاحبوں کو خاص تعلق تھا اس لئے سرسید کی مخالفت کو اُنہوں نے ایک ذریعہ ان کی خوشنودی اور اپنی سُرخروئی کا سمجھا تھا۔

پھر بہت سے دیسی اخباروں نے جب یہ دیکھا کہ سرسید سے بہت سے مسلمان عموماً بدگمان اور متنفر ہوتے جاتے ہیں تو اُنہوں نے اپنے اخباروں کی گرم بازاری اسی میں دیکھی کہ جہاں تک ممکن ہو کوئی پرچہ ایسا نہ نکلے جس میں سرسید اور اُن کے اعوان و انصار پر اعتراضوں کی بوچھاڑ نہ ہو۔ بعض مولوی جو زمانہ کے انقلاب سے نہایت کس مپرسی کی حالت میں تھے اُنہوں نے سرسید کی عام مخالفت سے اس طرح فائدہ اُٹھانا چاہا کہ اُن کی تصنیفات کا رد لکھنے پر کمر باندھی اور فی الواقع اس سے اُن کو بہت بڑی کامیابی ہوئی اُن کی کتابیں تمام ہندوستان میں شائع ہوگئیں اور کئی کئی بار اُن کے چھپنے کی نوبت آئی۔

الغرض سرسید کے خیالات اور اُن کی تحریرات کے برخلاف مستقل کتابیں اور رسالے لکھے جانے لگے۔ رسالۂ طعام اہل کتاب کے رد میں مولوی امداد العلی نے امداد الاحتساب لکھی،

مولوی محمد علی نے مزیل الاوہام نام ایک رسالہ شائع کیا، تہذیب الاخلاق کے توڑ پر خاص خاص اخبار اور رسالے جاری ہوئے، کان پور سے نور الآفاق اور نور الانوار اور مراد آباد سے لوح محفوظ نکلا، آگرہ سے تیرھویں صدی شائع ہوا، امداد الآفاق، شہاب ثاقب اور تائید الاسلام وغیرہ اضلاع شمال مغربی سے اور اشاعۃ السنہ پنجاب سے شائع ہوئے، سرسید کو ملحد، لامذہب، کرسٹان، نیچری، دہریہ، کافر، دجال اور کیا کیا خطاب دیئے گئے، اُن کے کفر کے فتووں پر شہر شہر اور قصبہ قصبہ کے مولویوں سے مُہریں اور دستخط کرائے گئے یہاں تک کہ جو لوگ سرسید کی تکفیر پر سکوت اختیار کرتے تھے اُن کی بھی تکفیر ہونے لگی، سرسید کے نام گالی اور دشنام کے بھرے ہوئے گمنام خط چاروں طرف سے آنے لگے اور ان گمنام خطوں کا سلسلہ جہاں تک کہ ہم کو معلوم ہے کم و بیش اخیر تک جاری رہا۔ سرسید نے ان نالائق خطوں میں سے ایک آدھ خط راقم کو بھی دکھایا ہے اور ایک خط جب کہ منشی سراج الدین احمد سرسید کی لائف لکھنے کا ارادہ رکھتے تھے سرسید کے پاس آیا تھا اور اُن کے پاس سرسید نے اس غرض سے بھیجا تھا کہ اُس کو نہایت جلی حرفوں میں میری لائف میں درج کر دینا چنانچہ وہ خط منشی صاحب کے مسودات میں ہم کو دستیاب ہوا ہے جس میں اول سے آخر تک نہایت مغلظ گالیاں۔ جو رذیل سے رذیل آدمی کی زبان پر بھی نہیں آسکتیں۔ بھری ہوئی ہیں۔ اگرچہ سرسید کی یہ خواہش تھی کہ وہ خط بجنسہٖ اُن کی لائف میں درج کیا جائے مگر ہماری غیرت تقاضا نہیں کرتی کہ اُس ملعون تحریر کو سرسید کی لائف میں نقل کر کے قوم کی نالائقی تمام دنیا پر ظاہر کریں۔

چونکہ سرسید کے مخالفوں کی عام تحریریں اور رسالے اور کتابیں اور میگزین اور اخبار زیادہ تر کذب و افترا اور تہمت و بہتان اور معاندانہ کج بحثیوں سے بھرے ہوتے تھے۔ اس لئے سرسید جہاں تک ہوسکتا تھا کسی کا جواب نہیں دیتے تھے اور اپنے دوستوں کو بھی جواب دینے سے منع کرتے تھے مگر اول اول جب کہ مخالفوں نے سرسید اور اُن کے بعض دوستوں کی نسبت غلط افواہیں اُڑانی شروع کیں اور لوگوں نے سرسید کو مجبور کیا کہ یا تو ان باتوں کا جواب دیجئے ورنہ سمجھا جائیگا کہ آپ کی نسبت مخالفوں کے الزامات سب صحیح ہیں اور نیز ان تحریروں سے چندے کے رک جانے کا بھی اندیشہ تھا اس لئے کبھی کبھی سرسید اور مولوی سید مہدی علی نے تہذیب الاخلاق میں اُن کے جواب لکھنے پر قلم اٹھایا ہے۔ ازاں جملہ سرسید کا مضمون ''دافع البہتان'' اور سید مہدی علی کا مضمون ''تکفیر مسلمانان'' اور ''سوال و جواب'' خصوصیت کے ساتھ دیکھنے کے لائق ہے۔

"دافع البہتان" سرسید کا وہ مضمون ہے جو اُنہوں نے مولوی علی بخش خاں مرحوم سب آرڈنیٹ جج گورکھپور کی کتاب تائید الاسلام کے جواب میں لکھا تھا اس مضمون کو سرسید نے ذیل کے فقرہ پر ختم کیا ہے۔

"جو کوئی میری اس تحریر کو دیکھے گا تعجب کریگا کہ جناب سید الحاج (یعنی مولوی علی بخش خاں) نے کیوں ایسے سخت اور محض غلط بہتان مجھ پر کئے ہیں؟ ظاہرا اس کا سبب .. .. یہ معلوم ہوتا ہے کہ جناب سید الحاج نے جب یہ رسالہ لکھا ہے قریب اسی زمانہ کے حج کو تشریف لے جانے والے تھے۔ اُنہوں نے خیال کیا ہوگا کہ لاؤ حج کو تو جاتے ہی ہیں جتنے گناہ کرنے ہیں سب کرلیں، حج کے بعد تو سب پاک ہی ہوجاوینگے جیسے کہ بعض آدمی جب مسہل لینا چاہتے ہیں تو خوب بد پرہیزی کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ مسہل سے سب کھایا پیا نکل جاویگا۔ مگر جناب سید الحاج کو معلوم کرنا چاہیئے کہ گو حج میں سب گناہ آپ کے معاف ہوگئے ہوں اور شبلی و جنید کے مرتبہ پر آپ پہنچ گئے ہوں مگر حق العباد نہ حج سے بخشے جاتے ہیں نہ کسی بشارت سے۔ آپ نے جو اتہام مجھ پر کئے ہیں۔ جب تک میں ہی نہ معاف کروں معاف نہیں ہوسکتے پس مقتضائے ایمانداری یہ ہے کہ آپ حج در احمد کا احرام باندھیئے اور گناہوں کی معافی چاہیئے ورنہ روز جزا اپنے کرتوتوں کا مزا آپ کو معلوم ہوجائے گا۔"

ایک اور مضمون سرسید نے اُنھیں مخالفتوں کے ہجوم کے زمانہ میں لکھا تھا جس کا عنوان "جانِ خود و یارانِ خود" ہے۔ یہ مضمون بھی نہایت لطیف اور دلچسپ ہے جس کے چند فقرے ہم اس مقام پر نقل کرتے ہیں۔

"ہمارے اور ہماری قوم کے حال پر حافظ کا یہ شعر صادق آتا ہے ؎

بدم گفتی و خرسندم عفاک اللہ نکو گفتی جوابِ تلخ می زیبد لبِ لعل شکر خارا

پُرانے دل بعضے تو ہم کو بُرا کہتے کہتے ٹھنڈے ہوگئے ہیں اور بعضے نئے دل جوش پر ہیں اور ہم کو بُرا کہنے پر نہایت تیز زبان مگر ہمارا دل اپنے کام سے ٹھنڈا نہیں ہے؛ ہم کو وہی جوش محبت و ہمدردی اپنی قوم کے ساتھ ہے، اُن کی دین و دنیا کی بھلائی اور تہذیب و شائستگی کی دن رات فکر ہے، اُن کے غصہ سے ہم کو رنج نہیں، ان کی سخت کلامی کا ہم کو غم نہیں؛ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ وہ نہیں جانتے اور ہم سمجھتے ہیں کہ وہ نہیں سمجھتے .. .. .. ہم کو پچھلوں کے حالات سے اور خود اپنے دادا محمد رسول اللہ صلعم کے حالات سے بالکل تسلی ہے ہم دیکھتے ہیں کہ جن لوگوں نے عام بھلائی پر کمر باندھی ہے اور اپنی قوم کی بہتری و بہبودی میں کوشش کی ہے ان کو دنیا کے ہاتھ سے اور بالتخصیص اپنی قوم کے ہاتھ سے کیا ملا؟ کوئی سولی

سولی دیا گیا، کوئی آرہ سے چیرا گیا، کوئی جلاوطن کیا گیا؛ پس ہم کو جو اپنی قوم کے ہاتھ سے ہونا چاہیے تھا اُس کا کروڑواں حصہ بھی ابھی نہیں ہوا۔ ہم کو دیکھنا چاہیے کہ ہماری قوم نے ہم سے کیا کیا؟ کچھ نہیں کیا، بہت کیا تو یہ کیا کہ دو چار خط گمنام دشنام کے لکھ بھیجے، ہم نے شکر کیا کہ ہمارا تو کچھ نہیں بگڑا اور اُن کا دل ٹھنڈا ہو گیا اس سے زیادہ کسی کو غصہ آیا اور کوئی اخبار نویس بھی اتفاق سے اُن کا دوست ہوا یا دو پیسہ اور ایک کاٹھ کی کل اُنکے ہاتھ میں ہوئی تو اُنہوں نے اپنے دل کے غصہ کو جھوٹ سچ باتیں چھاپ کر یا چھپوا کر ٹھنڈا کیا ہم تو اس پر بھی راضی ہیں؛ مگر اُس دن کا ہم کو افسوس ہے جب کہ وہ لوگ خود اپنی باتوں پر افسوس کریں گے اور سمجھیں گے جو سمجھیں گے۔

”ہم کو ملحد اور زندیق اور لامذہب کہنا کچھ تعجب نہیں ہے کیونکہ ہماری قوم نے خدا اسے واحد ذوالجلال کے سوا باپ دادا کے رسم ورواج کو اور اپنے قدیمی چال چلن کو دوسرا خدا مانا ہے اور پیغمبر آخرالزمان محمد رسول اللہ کے سوا اور بہت سے پیغمبر پیدا کیے ہیں، کتاب اللہ کے سوا انسانوں کی بنی ہوئی بہت سی کتابوں کو قرآن بنایا ہے، اور ہم اُس جھوٹے خدا اور فرضی پیغمبروں اور جعلی قرآنوں کو ایسا ہی برباد کرنے والے ہیں جیسے ہمارے جد امجد ابراہیم اپنے باپ آذر کے بتوں کے توڑنے والے تھے۔ ہم سچے خدائے واحد ذوالجلال کا جلال اور سچے پیغمبر محمد رسول اللہ کی نبوت اور سچی کتاب اللہ کی اطاعت دنیا میں قائم کرنا چاہتے ہیں۔ پھر وہ لوگ ہم کو ملحد و زندیق و لامذہب نہ کہیں اور نہ سمجھیں تو کیا کہیں اور کیا سمجھیں؟ کیونکہ ہم اُن کے خداؤں اور پیغمبروں اور قرآنوں کو نہیں مانتے۔“

”مگر طرفہ یہ ہے کہ ہم کو کرسٹان بھی کہتے ہیں اور ہماری قوم کے ایک اخبار نویس نے چھاپا کہ ہم عیسائی ہو گئے اور ایک گرجا میں جا کر بپتسما یعنی اصطباغ لیا۔ ہم کو اپنی قوم کے حال پر نہایت افسوس آیا کہ اب ہماری قوم کا یہ حال ہو گیا ہے کہ علانیہ جھوٹ بولنے اور جھوٹ چھاپنے میں شرم و غیرت و حیا نہیں آتی قومی ہمدردی جو خدا کی ایک بڑی نعمت ہے۔ خدا نے ہماری قوم کے دل سے کیسی مٹا دی ہے۔ اُس شخص کو یہ بھی غیرت نہ آئی کہ میں ایک مسلمان شخص کی نسبت کس دل اور غیرت سے ایسی جھوٹ بات چھاپ دوں۔ ان باتوں سے ہم کو بلحاظ اپنی ذات کے کچھ بھی رنج نہیں ہوتا۔ مگر جو رنج و غم اور افسوس ہوتا ہے وہ یہی ہوتا ہے کہ افسوس ہماری قوم پر خدا کی کیسی خفگی ہے جو ایسی حالتوں میں گرفتار ہیں ربنا ظلمنا انفسنا وان لم تغفر لنا وترحمنا لنکونن من الخاسرین۔“

مولوی امداد العلی نے جو تین استفتے ہندوستان کے تمام بڑے بڑے شہروں میں بھیجکر سرسید کے کفر وارتداد کے فتوے حاصل کیے تھے ان میں سے ایک استفتا اس مضمون کا تھا کہ

جس شخص کے ایسے اور ایسے عقائد اور اقوال و افعال ہوں وہ مسلمان ہے یا نہیں؟ اور دوسرا اس مضمون کا تھا کہ جو مدرسہ ایسا شخص فلاں فلاں اغراض سے قائم کرنا چاہے اُس میں چندہ دینا اور اُس کی اعانت کرنی مسلمانوں کو جائز ہے یا نہیں؟ اور تیسرا اُسی تاریخ ہندوستان کے ترجمہ کرانے کی بابت تھا جس میں مصنف نے آنحضرت صلعم کی نسبت اپنے عقیدہ کے موافق سخت اور ناملائم الفاظ لکھے تھے۔ یہ تمام فتوے اور استفتے مولوی امداد العلی نے اپنے ایک رسالہ کے آخر میں جسکا نام "امداد الآفاق برجم اہل النفاق بجواب پرچۂ تہذیب الاخلاق" ہے چھاپ کر اُس رسالہ کو تمام ہندوستان میں مفت تقسیم کیا تھا۔ اس کی ایک جلد ہماری نظر سے بھی گذری ہے؛ اُسکے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے جتنے فرقے ہندوستان میں ہیں کیا سنی کیا شیعہ، کیا مقلد کیا غیر مقلد، کیا وہابی کیا بدعتی، سب فرقوں کے مشہور اور غیر مشہور عالموں اور مولویوں کی ان فتووں پر مہریں یا دستخط ہیں اور خاصکر سنی مولویوں میں سے اکثر نے بہت شرح اور بسط کے ساتھ جواب لکھے ہیں۔ از انجملہ دلّی اور لکھنؤ کے دو سب سے بڑے عالموں کے جواب میں سے کچھ کچھ فقرے بطور نمونہ کے اس مقام پر نقل کیے جاتے ہیں جو تیرہویں صدی ہجری کے علمائے اسلام کی طرز تحریر کی ایک عمدہ یادگار ہیں۔

مولوی کریم اللہ صاحب مرحوم دہلوی لکھتے ہیں "در سنوح این سانحہ ایمان زدا ے وقوع این واقعہ ہوش ربا و ظہور این معاملہ فجیعت افزا و حدوث این حادثہ الحاد افشا کے تعمیر کرنا اور کرانا بقول و فعل اس قائل کے ایسے مکان کا اور معاونت کرنی ایسے طلبہ کی؛ و اپنے مال کو معصوم کو غیر معصوم کرنا اور ہمسایے ہونا اس خوش عقیدہ کے۔ کہ جس کا حال بد مآل اس سوال میں مذکور ہے۔ بالکل باطل، اور ایسے مکان ناپاک کا نام مدرسہ کہنا اور محل تعلیم و تحصیل سمجھنا آدمیت سے نکلنا ہے اور زمرۂ حیوانات میں داخل ہونا ہے۔ اعوذ باللہ من الحور بعد الکور بل بالکل عاطل بلکہ صرف کرنا مال کا ایسے محل میں موجب کندہ ہونا جہنم؛ اور ایسے بے محل میں ساعی ہونا ہیمہ اور حطب بننا لازم ..... الحاصل معاونت ایسے غارتی ایمان اور مال کی اور لعد سمجھنا اپنے مال کا خیال خام؛ نے سنے یوں سمجھے کہ میں اپنے ہاتھ سے جہنم میں مکان تعمیر کرتا ہوں اور اپنے اعمال صالحہ کو مٹاتا ہوں۔ پس مرد دیندار بلکہ تمامی سنی و شیعی و خارجی و سائر ہنود و تمامی سکنائے اہل زمین پر واجب اور متحتم ہے کہ ایسے کلام واہی اور ایسے واہی عقیدہ والے پر عقیدہ اپنا نہ جماویں بلکہ ہر فرد ہر مذہب کا اس شخص کو ہادم بنائے اپنے مذہب کو بوجھے اور اس امر لوچ پر دل نہاد نہ ہوئے اور اپنے دل میں اس کا انجام سوچے کہ

کیا جال بچھایا ہے"۔

مولوی عبدالحی صاحب مرحوم لکھنوی۔ جو علمائے فرنگی محل میں نہایت نامبرآوردہ تھے۔ مقفیٰ عبارت میں تحریر فرماتے ہیں "وجود شیطان اور اجنہ کا منصوص قطعی ہیں اور منکر اُس کا شیطان ہی بلکہ اس سے بھی زائد کیونکہ خود شیطان کو بھی اپنے وجود سے انکار نہیں اور وجود آسمان منصوص قرآنی ہے، منکر اُس کا مبتلائے وسواس شیطانی ہی بحرمت ... منخقہ طیور منصوص کلام عزب غفور ہی، اور سلف سے تاخلف اتفاق اس پر ماثور ہی، انکار اُس کا موجب گمراہی و فجور ہی ... مذہب نیچر خدا جانے کیا بلا ہے، ہر متشرع اور متدین کو اُس کے قبول سے ابا ہے ہر مسلمان کو حق جل شانہ اتباع شریعت محمدیہ پر قائم رکھے، اور مذہب نیچرا ور مشرب بدتر سے محفوظ رکھے۔ جو شخص کہ اعتقادات اُسکے فاسد ہیں۔ جو کہ سوال میں مسطور ہوئے ہیں وہ شخص مخرب دین ابلیس لعین کے وسوسہ سے صورت اسلام میں تخریب دین محمدی کی فکر میں ہی اور بنام تجدید مدرسہ جدیدہ افساد شریعت اُسکی منظور نظر ہی۔ جو چیزیں کہ اُسکے نزدیک موجب تہذیب ہیں اہل سنت کے نزدیک باعث تخریب ہیں تالحذر الحذر یا ایھا المسلمون والھرب یا ایھا المومنون"

ان تمام فتووں کا جواب اور جن عقائد و اقوال پر سرسید کی تکفیر کی گئی ہی اُن کا ثبوت محققین اہل اسلام کی تصنیفات اور اُن کے کلام سے مولوی سید مہدی علی خاں نے ان دو مضمونوں میں جو "تکفیر مسلمان" اور "سوال وجواب" کے عنوان سے تہذیب الاخلاق میں اُسی زمانہ میں چھپے تھے اور نیز دیگر مضامین میں بوجہ احسن دیا ہی اور سرسید کی تصنیفات میں بھی اُن کے جوابات متفرق طور پر مل سکتے ہیں اس لیے اُن تمام استفتاؤں اور فتووں اور اُن کے جوابات کا اس مقام پر نقل کرنا کچھ ضرور نہیں ہی۔ مگر سرسید کے دو ایک لطیفے جو مخالفوں کی نسبت تحریر کی رو میں اُنکے قلم سے ٹپک پڑے ہیں یہاں درج کیے جاتے ہیں۔

لطیفہ۔ جس زمانہ میں سرسید ولایت میں تھے اُنکے پاس اخبار شعلہ طور کانپور میں مولوی سید امداد العلی کا ایک مضمون سرسید کے خلاف چھپا ہوا پہنچا تھا؛ اُس میں تاریخ الفنسٹن کا وہی ترجمہ جس پر آخر کار سرسید کی تکفیر کا فتویٰ لکھا گیا بعینہ نقل کر کے صاحب مضمون نے لکھا تھا کہ "جس شخص نے یہ ترجمہ خود لکھا ہو وہ کیسا جہنمی ہی"۔ سرسید ولایت سے ایک خط میں مولوی مہدی علیخاں کو لکھتے ہیں "دیکھو دشمنی آدمی کو ایسا اندھا کر دیتی ہی اُسی اخبار (شعلہ طور) میں تاریخ ہندوستان کے مضمون کو نقل کر کے بشد و مد لکھا ہی کہ "جس شخص نے یہ ترجمہ خود لکھا ہو وہ کیسا جہنمی ہی" حالانکہ خود بھی اُسی

عبارت کو لکھتے ہیں! پھر مجھ میں اور اُن میں کیا فرق ہی؟ صرف اتنا کہ میں نے انگریزی سے نقل کیا اور اُنھوں نے اُردو سے،،

یہ نرا لطیفہ ہی نہیں ہی بلکہ اُس فتوے کے موافق جو مفتی سعد اللہ صاحب نے اسی ترجمہ کی بابت سرسید کی نسبت دیا ہو۔ مولوی امداد العلی بھی تکفیر کے مستحق ٹھیرتے ہیں! کیونکہ مفتی صاحب اپنے فتوے کی تائید میں شفائے قاضی عیاض سے نقل کرتے ہیں کہ "ایک شخص نے امام مالک سے پوچھا کہ اس شخص کا کیا حکم ہے جو کہتا ہی کہ قرآن مخلوق ہی؟ امام مالک نے حکم دیا کہ ان الفاظ کا بولنے والا کافر ہے اُس کو قتل کرڈالو۔ اُس نے کہا حضرت میں نے تو دوسرے شخص کا قول نقل کیا ہی۔ اُنھوں نے کہا ہم نے تو تجھی سے سنا ہی،، **لطیفہ** پھر جب کہ سرسید ولایت سے واپس آگئے اور تہذیب الاخلاق جاری ہوگیا اُس وقت مولوی امداد العلی نے سرسید کے پاس ایک اپنا رسالہ چھپا ہوا بھیجا جس میں اسی فتوے کی دہمکی دی گئی تھی اور لکھا تھا کہ "مفتی سعد اللہ صاحب کا فتوے تکفیر میں جناب سید احمد خاں کی۔ جو ترجمہ تاریخ پر مرتب ہوا ہی۔ راقم کے پاس موجود ہے معلوم نہیں کہ سید احمد خاں کے حوارین اُس فتوے پر بھی ایمان رکھتے ہیں یا نہیں،، سرسید تہذیب الاخلاق میں اسی دہمکی کی نسبت لکھتے ہیں "پہلے تو ہم گھبرائے کہ یہ مفتی سعد اللہ صاحب[۱] کون ہیں؟ یہ وہی ہیں جن کو ہم نے دلی میں دیکھا ہی؟ اور یہ وہی مفتی سعد اللہ صاحب ہیں جنہوں نے لکھنؤ میں ایک نیک بخت مسلمان آل رسول ابن علی اولاد نبی کے کفر اور قتل کا فتویٰ دیکر عشرۂ محرم میں اُن کا سر ہنومان گڑہی

---

[۱] مفتی سعد اللہ صاحب ہندوستان کے ایک مشہور عالم تھے جن کا قدیم وطن مراد آباد تھا۔ جس زمانہ میں سرسید کی آمد و رفت مفتی صدر الدین خاں مرحوم دہلوی کے مکان پر بہت زیادہ تھی غالباً اُسی زمانہ میں مفتی سعد اللہ صاحب بطور طالب علموں کے دلی میں وارد تھے اور مفتی صدر الدین خاں سے پڑہتے تھے۔ جب یہ تمام علوم عقلیہ و نقلیہ سے فارغ ہو چکے تو لکھنؤ میں جبکہ غالباً امجد علی شاہ زندہ تھے ان کو مذہب اہل سنت کے افتا کا معزز عہدہ مل گیا تھا اور اُس وقت سے واجد علی شاہ کے اخیر زمانہ تک یہ اُسی عہدہ پر مامور رہے۔ اسی زمانہ میں وہاں ایک بہت بڑا واقعہ مولوی سید امیر علی صاحب کے قتل کا گذرا تھا۔ ہنومان گڑہی میں ہندؤں نے ایک مسجد کو ڈہا کر مندر بنانا چاہا اور اہل دربار کو کچھ دے دلا کر راضی کر لیا تھا سید امیر علی کچھ جمعیت لیکر وہاں ہندؤں سے مقابلہ کرنے کو پہنچے۔ چونکہ سید امیر علی سنی المذہب تھے اسیلئے نائب نے مفتی سعد اللہ سے اس بات کا فتوے لکھوالیا کہ فوج بھیجکر سید امیر علی کو اس ارادہ سے رد کا جائے اور اگر وہ نہ مانیں تو ان کو قتل اور انکی جمعیت کو پراگندہ کر دیا جائے چنانچہ سید امیر علی شہید کیے گئے ۱۲

سے نیزہ پر چڑھا کر لکھنؤ میں لانا چاہا؛ تو ہمارا دل ٹھنڈا ہو گیا۔ اور سمجھے کہ آل رسول کے قتل و کفر پر فتوے دینا اُن کا قدیمی پیشہ ہے"

اگرچہ مولوی امداد العلی کی کوشش سرسید کے کفر و ارتداد کے فتوے حاصل کرنے میں حد غایت تک پہنچ گئی تھی؛ دلی، رامپور، امروہہ، مراد آباد، بریلی، لکھنؤ، بھوپال اور دیگر مقامات کے ساٹھ عالموں اور مولویوں اور واعظوں نے کفر کے فتوؤں پر مہریں اور دستخط کیے تھے؛ گویا ہندوستان کے تمام اہل حل و عقد کا اس حکم پر اجماع ہو گیا تھا، صرف خدا کی طرف سے اُسکی تصدیق اور تصویب باقی رہ گئی تھی سو مولوی علی بخش خاں نے یہ کمی بھی پوری کر دی۔ اُنہوں نے غالباً اسی غرض سے حج بیت اللہ کا ارادہ کیا اور مکۂ معظمہ میں جا کر مذاہب اربعہ کے مفتیوں کے سامنے دو استفتے عربی زبان میں پیش کیے جن میں سے ایک کا ترجمہ یہ ہے۔

"آپ کیا فرماتے ہیں اُس شخص کے باب میں جو ابلیس کے وجود خارجی سے انکار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اُس سے مراد قوت بہیمیہ ہے جو نفس انسان میں ہے، اور ملائکہ کا سجدہ آدم کے واسطے حقیقی سجدہ نہ تھا بلکہ اُس سے قویٰ کا مطیع ہونا مراد ہے، اور اَبیٰ وَ استکبرَ سے عدم اطاعت قوت بہیمیہ مراد ہے جو آدمی کی اغوا کرنے والی ہے نہ کہ حقیقی سجدہ سے انکار کرنا، اور کہتا ہے کہ افلاک اجسام نہیں ہیں بلکہ اُن سے فضائے بسیط یا سبع سیارات مراد ہیں، اور کہتا ہے کہ لونڈی غلام بنانا حرام ہو گیا ہے آیۂ اِمّا منّاً بعدُ و اِمّا فداءً سے اور یہ آیت نازل ہوئی ہے فتح مکہ میں اور یہ سب سے اخیر آیت ہے جو قیدیوں کے باب میں نازل ہوئی ہے، اور کہتا ہے کہ معراج خواب میں ہوئی تھی اور جسم کے ساتھ آنحضرتؐ کے جانے سے انکار کرتا ہے، اور انکار کرتا ہے شق صدر آنحضرتؐ کا، اور کہتا ہے کہ گلا گھونٹے ہوئے پرند حلال ہیں۔ پس ایسے شخص کے باب میں کیا حکم ہے؟

اس استفتے کے جواب میں مذاہب اربعہ کے چاروں مفتیوں[۵۱] نے جو مکہ معظمہ میں رہتے ہیں علٰحدہ علٰحدہ عبارت لکھی ہے اور ان چاروں صاحبوں کے جوابات کا ماحصل یہ ہے کہ "یہ شخص ضال اور مضل ہے بلکہ وہ ابلیس لعین کا خلیفہ ہے کہ مسلمانوں کے اغوا کا ارادہ رکھتا ہے اور اُس کا فتنہ یہود و نصاریٰ کے فتنے سے بھی بڑھکر ہے خدا اس کو سمجھے۔ واجب ہے اولوالامر پر اس شخص سے انتقام لینا اسکو تنبیہ کرنی چاہیے اور اگر جاہل ہو تو سمجھانا چاہیے پھر اگر باز آئے تو بہتر ہے ورنہ ضرب اور حبس سے اُسکی

[۵۱] یعنی شیخ عبدالرحمن بن شیخ عبداللہ سراج مفتی حنفیہ اور احمد بن زین دحلان مفتی شافعیہ اور محمد بن عبداللہ بن حمید مفتی حنابلہ اور حسین بن ابراہیم مفتی مالکیہ ۱۲

تادیب کرنی چاہیے اگر ولاۃ اسلام میں کوئی صاحب غیرت ہو۔ نہیں تو خدا اُس کو سمجھے گا اور اُسکی ضلالتوں اور رسوائیوں کی سزا دیگا" اسکے بعد سید محمد کتبی حنفی مدرس حرم شریف اور مولانا رحمۃ اللہ ہندی مہاجر مکہ معظمہ نے چاروں مفتیوں کے جوابوں کی تصویب کی ہی۔

پھر مولانا علی بخش خاں مدینہ منورہ گئے ہیں اور اسی قسم کا استفتا شیخ محمد امین بالی مفتی احناف کی خدمت میں پیش کیا ہی۔ اُن کے جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ "جو کچھ درمختار اور اُسکے حواشی سے معلوم ہوتا ہی اُس کا ماحصل یہ ہے کہ یہ شخص یا تو ملحد ہے یا صریح کفر کی کسی جانب مائل ہو گیا ہے یا زندیق ہے کہ کوئی دین نہیں رکھتا یا اباحی ہی کیونکہ منخنقہ کا کھانا مباح بتلاتا ہی۔ اور اہل مذہب (حنفی) کے بیانات سے مفہوم ہوتا ہی کہ ایسے لوگوں کی توبہ گرفتاری کے بعد قبول نہیں ہوتی؛ پس اگر اس شخص نے گرفتاری سے پہلے توبہ کر لی اور ان گمراہیوں سے رجوع کی اور توبہ کی علامتیں اُس سے ظاہر ہو گئیں تو قتل نہ کیا جائے ورنہ اُس کا قتل واجب ہی دین کی حفاظت کے لیے اور ولاۃ امر پر واجب ہی کہ ایسا کریں"

دوسرے استفتے کا ملخص یہ ہی کہ "اُس مدرسہ کے جواب میں آپ کیا فرماتے ہیں جس کے بانی کے ایسے اور ایسے عقائد اور اقوال ہوں اور جو یہ کہتا ہو کہ اہل اسلام کے اخلاق مہذب نہوں گے جب تک کہ وہ ستۃ ضروریہ میں یورپ کے فلاسفہ جدید کی پیروی نہ کرینگے اور یہ کہ تمام علوم دینیہ قدیمہ جو مسلمانوں نے مدون کیے ہیں بے فائدہ ہیں۔ اسلیے ضرور ہی کہ ایک مدرسہ قائم کیا جائے جس میں علوم جدیدہ کی تعلیم ہو اور اہل یورپ کے طریقہ پر ستۃ ضروریہ سکھائے جائیں۔ اور دینیہ میں سے ایسے مضامین انتخاب کیے جائیں جو فلسفہ جدیدہ کے خلاف نہوں۔ اور جب لوگوں نے اُس پر اعتراض کیا کہ یہ مدرسہ تو الحاد و زندقہ کا مدرسہ ہوگا۔ اور اُسکی اعانت سے انکار کیا۔ تو اُس نے یہ جواب دیا کہ میں اپنے معتقدات سے تو رجوع نہ کروں گا اور اپنے ارادہ سے بھی باز نہ آؤنگا مگر مدرسہ کا جو انتظام ہوگا وہ مجلس شوریٰ کی رائے کے موافق ہوگا۔ حالانکہ اس مجلس کے اکثر رکن اُسی کے گروہ کے ہیں اور اُن کی رائیں ہمیشہ بدلتی رہتی ہیں اور پچھلی پہلی کو منسوخ کرتی رہتی ہیں۔ پس ایسی حالت میں آیا مسلمانوں کو اُسکی اعانت کرنی جائز ہی یا نہیں۔ بینوا توجروا"

اس کا جواب بھی حرمین شریفین کے مفتیوں نے الگ الگ لکھا ہی جس کا ماحصل یہ ہی کہ "یہ مدرسہ جس کو خدا برباد اور اُسکے بانی کو ہلاک کرے اسکی اعانت جائز نہیں ہی اور اگر یہ مدرسہ بنکر تیار ہو جائے تو اُس کو منہدم کرنا اور اُسکے بانی سے اور اُسکے مددگاروں سے سخت انتقام لینا واجب ہی اور ہر شخص پر

نہیں حمیت اسلامی ہو واجب ہی اس مدرسہ کی مخالفت جہانتک کہ قدرت ہو اور ادنیٰ درجہ یہ ہی کہ دل سے اُس کا مخالف ہو،،

حسن اتفاق سے جس زمانہ میں یہ فتویٰ مولوی علی بخش خاں حرمین شریفین میں وہاں کے علما اور مفتیوں سے لکھوا رہے تھے حافظ محمد حسین نام ہندوستان کے ایک بزرگ وہاں موجود تھے جو حج اور زیارت کے ارادہ سے وہاں گئے تھے۔ ادہر تو مولوی علی بخش خاں نے عرب سے آکر مذکورہ بالا فتوؤں کی ہندوستان میں منادی کرانی شروع کی اور اُدہر اُس نیک دل مسلمان نے باوجودیکہ سرسید سے مطلق شناسائی نہ تھی ایک طول طویل مضمون میر سید کی تکفیر کی تردید میں انہیں دنوں میں اخبار کوہ نور لاہور میں چھپوا دیا۔ جو تہذیب الاخلاق میں نقل کیا گیا تھا اور جسکے چند فقرے ہم اس مقام پر نقل کرنے مناسب سمجھتے ہیں۔

وہ علمائے حرمین شریفین کے فتوؤں کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں "فتوے لکھنے لکھانے کا جو حال یہاں ہی (یعنی ہندوستان میں)، وہی وہاں (یعنی حرمین شریفین میں) ہے! جس مضمون سے چاہا فتویٰ لکھ لیا، جس سے دستخط کرانے ہوئے جو چاہا سمجھا کر دستخط کرا لیے۔ جیسے عالم یہاں ہیں ویسے ہی وہاں ہیں، صرف اتنا فرق ہی کہ ان کی زبان ہندی ہی اُن کی عربی وہاں جو ہندوستانی اہل سنت وجماعت کے عالم ہیں وہ دو گروہ ہیں؛ ایک بدعتی، دوسرے وہابی، جو بدعتی ہیں وہ وہابیوں کو کافر کہتے ہیں، جو وہابی ہیں وہ بدعتیوں کو بُرا کہتے ہیں۔ جب بدعتیوں کا دار چل جاتا ہی وہابیوں کو نکلوا دیتے ہیں، اجب وہابی غالب ہوجاتے ہیں بدعتی چپ ہو جاتے ہیں؛ ان دنوں بدعتیوں کا دار چل رہا ہی سید احمد خاں صاحب حرمین شریفین میں بھی مشہور ہیں؛ اکثر ہندوستانی اور بعض عرب انکے نام اور خلاف واقع حال سے واقف ہیں۔ وہاں مشہور ہی کہ سید احمد خاں لندن گئے تھے وہ انگریزوں سے اقرار کرکے آئے ہیں کہ ہم مسلمانوں کو جہانتک ہوسکیگا کرسٹان کرینگے اور دین اسلام سے پھیرینگے۔ اب وہ اپنے اقرار کے موافق مسلمانوں بہکاکر دین اسلام سے پھیرتے ہیں اور نئے نئے عقائد سکھلاتے ہیں۔ یہ جو فتوے میں لکھا ہی کہ یہود و نصاریٰ سے بھی اُن کا فتنہ بڑھکر ہے۔ اسکے یہی معنی ہیں کہ ظاہر میں مسلمان رہ کر اور دین اسلام کے نام سے وعظ و نصیحت کرکے عیسائی کرتے ہیں۔ جس کسی نے سید احمد خاں صاحب کا یہ حال سنا۔ وہ اُن سے نفرت کرنے لگا اور برا جاننے لگا۔ جب سے واقعی حال کہا گیا کہ سید احمد خاں ایسے آدمی نہیں ہیں، پکے مسلمان ہیں، ظاہر اور باطن میں یکساں ہیں، مسلمانوں کو مسلمان رکھا چاہتے ہیں، قرآن کے معنی جو

ہیں وہی کہتے ہیں، حدیث کو معتبر جانتے ہیں، جو حدیث نہیں ہے اُس کو بے اعتبار سمجھتے ہیں، اہل کتاب
کے ذبیحہ کو قرآن مجید کے موافق حلال کہتے ہیں، سور اور شراب کو حرام سمجھتے ہیں، انسانوں سے
انسانیت کی وجہ سے قرآن مجید کے مطابق دوستی رکھنی اور ہر ایک کی بھلائی چاہنی موجب ثواب
بتاتے ہیں، شیطان اور آسمان کے منکر نہیں مقر ہیں، صورت اور طرح میں جو بعض عالموں نے بیان
کی ہے اُنکے ہمزبان ہیں اکثروں کے ساتھی نہیں، امام کو امام جانتے ہیں پیغمبر نہیں مانتے، مفسر کو مفسر
مانتے ہیں الہامی نہیں جانتے، مجتہد کو مجتہد کہتے ہیں خاتم المجتہدین نہیں سمجھتے، ہر وقت اسی کوشش
میں رہتے ہیں کہ مسلمانوں کی دین و دنیا درست ہو، ہزاروں روپئے اپنے خرچ کرتے ہیں،
دل و جان سے ہر وقت اسی کے خواستگار ہیں، اپنا جان و مال مسلمانوں کے واسطے وقف کر رکھا
ہے، چاہتے ہیں کہ مسلمان دنیا میں مال دار ہو جائیں اور دین میں ایمان دار۔ یہ سنکر وہ سید احمد خاں
کی تعریف کرنے لگا، ہندوستانی نے کہا بہت اچھے آدمی ہیں اور عربی نے کہا طیب..... جناب
مولانا علی بخش خاں صاحب بہادر جب تک مکہ معظمہ میں رہے ان کو یہی شغل رہا، جب مدینہ منورہ میں
گئے وہاں بھی انہیں فتووں کی فکر رہی، حالانکہ مدت قیام مدینہ منورہ تھوڑی تھی یعنی آٹھ سات
روز کہ ضروری کام اور زیارات طیبات بھی مشکل سے انجام ہوتے ہیں؛ مولانا صاحب اسی انتظام
میں رہے سوالات کا مسودہ مسجد نبوی میں روضۂ مطہرہ کے روبرو ہوا، مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں اکثر
ہندوستانی اور عرب سے مولانا صاحب یہی ذکر فرماتے رہتے اور اسی کی بحث ہوتی رہتی۔ مولانا
صاحب شہاب ثاقب اور ایک سالہ کی کئی جلدیں لے گئے تھے، وہ بھی وہاں تقسیم فرمائیں۔ سید احمد خاں
صاحب کا کفر اور اسلام اور اُن کے کفر کے فتوؤں کا مدار انکا حال بیان کرنیوالوں پر منحصر ہے نہ مکہ
والے اُن کو جانیں، نہ مدینہ والے اُن سے واقف۔ اگر کوئی چاہے تو سو فتوے اُنکے اسلام کے
حرمین شریفین سے واقعی حال بیان کرکے لا سکتا ہے۔ سید احمد خاں صاحب کا اسلام مسلمانوں
کے دلوں پر نسلاً بعد نسل کندہ ہوتا چلا جائیگا۔ اور تھوڑے عرصہ بعد سید احمد خاں صاحب کے ساتھ
مجتہد و مجدد کا لفظ لکھنا شروع ہو جائیگا۔ وہ صرف اس سبب سے۔ کہ حرمین شریفین کے عالموں نے
اُن کے کفر کے فتوے دیدیے۔ کافر نہیں ہو سکتے؛

اگرچہ حافظ محمد حسین صاحب نے حرمین شریفین کے فتوؤں کی حقیقت اپنے مضمون میں
اچھی طرح ظاہر کر دی ہے پھر بھی ممکن ہے کہ ہندوستان کے ساٹھ عالموں کا سر سید کی تکفیر
پر اتفاق کرنا اور حرمین شریفین کے مفتیوں اور دیگر عالموں کا ان کے ساتھ ہمزبان ہونا بعض

ناواقف لوگوں کو سرسید کے مسلمان ہونے کی نسبت شبہہ میں ڈالے اور ممکن ہے کہ بعض ناظرین کتاب کے دل میں یہ خیال گذرے کہ تیس ۳۰ برس بعد ان دبے دبائے فتووں کا سرسید کی لائف میں ذکر کرنا گویا اُن کی تکفیر میں از سر نو جان ڈالنی ہے۔ مگر ہمارے نزدیک سرسید کی لائف ناتمام رہتی اگر اُن فتووں کا ذکر اُس میں نہ کیا جاتا درحقیقت یہ کفر و ارتداد کے فتوے نہیں ہیں بلکہ سرسید کے اعلیٰ درجہ کے مسلمان ہونے کے وثیقے ہیں۔ یہ تمغے ہمیشہ اُنہیں لوگوں کو نصیب ہوئے ہیں جو دنیا کی مخالفت کے خوف سے کبھی حق بات کہنے سے نہیں چوکے۔ امام غزالی اپنے ایک رسالہ میں لکھتے ہیں کہ "جس شخص پر لوگ حسد نہ کریں اسکو حقیر جان! اور جس کو کافر اور گمراہ نہ کہیں اسکو ناچیز سمجھ"۔ ابوالائمہ علی مرتضیٰؑ فرماتے ہیں" ایمان کے یہ معنی ہیں کہ جب سچ کہنا مضر ہو اور جھوٹ کہنا مفید۔ اُسوقت سچ کو جھوٹ سے مقدم سمجھا جائے) سرسید کو اپنی سچائی کی بدولت صرف مسلمانوں ہی کی مخالفت کا نشانہ بننا نہیں پڑا بلکہ اکثر موقعوں پر محض ملک اور قوم کی خیرخواہی کی بدولت جیسا کہ اُنکی بائیوگرفی جا بجا شہادت دیتی ہے۔ بڑے بڑے جلیل القدر افسروں اور حاکموں کی خفگی اور حد سے زیادہ ناراضی برداشت کرنی اور بعض اوقات اپنی جان کو خطرہ میں ڈالنا پڑا ہے۔ خدا تعالیٰ نے ایمان کی سچائی کا معیار یہ نہیں بتایا کہ کسی مفتی نے اُس کے کفر کا فتویٰ نہ دیا ہو بلکہ اُسکا صحیح معیار آزمائش میں پورا اُترنے کو قرار دیا ہے اور فرمایا ہے" اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَکُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَھُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ" (یعنی کیا لوگ یہ سمجھے ہیں کہ صرف اتنا کہکر چھوٹ جائینگے کہ ہم ایمان لائے اور اُنکی آزمائش نہ کی جائیگی) اب ہم پوچھتے ہیں کہ اس معیار کے موافق سید احمد خاں کا ایمان کامل ٹھیرتا ہے یا اُن لوگوں کا جنہوں نے اُس کو کافر اور واجب القتل ٹھیرا؟ غدر کے بعد۔ جب کہ مسلمانوں کی حمایت کرنا ایک سنگین جرم سمجھا جاتا تھا۔ اور دین اسلام من اور انتقام کا دشمن اور فتنہ و فساد کا بانی خیال کیا جاتا تھا۔ اُس سے زیادہ حمیت اسلامی اور جوش ایمانی کے امتحان کا وقت اور کونسا ہو سکتا ہے؟ اُسوقت اسی کافر واجب القتل کے سوا اسلام اور اہل اسلام کی حمایت کے لیے نہ اُن مستفتیوں میں سے کوئی اٹھا جنھوں نے اُس کے کافر و مرتد ہونے کے فتوے لکھوائے اور نہ اُن مفتیوں میں سے جنھوں نے اُس کے کفر و ارتداد کے فتووں پر آنکھیں بند کرکے مہریں اور دستخط کیے۔

در ہند چو او یکے و آں ہم کافر ✦ پس در ہمہ ہند یک مسلمان نہ بود

باوجود ان تمام مخالفتوں کے سرسید نے اپنے سخت ترین مخالفوں سے جب کہ وہ

کفر اور واجب القتل ہونیکے فتوے تمام ملک میں شایع کر چکے تھے۔ التجا کی کہ مدرستہ العلوم کی مذہبی تعلیم۔جس میں میری مداخلت سے آپ کو اندیشہ ہے۔ اُسکا انتظام اور اہتمام آپ اپنے ہاتھ میں لیجیے، میں اُسمیں کسی طرح کی شرکت نہیں چاہتا۔ اس پر مولوی امداد العلی نے اُنکو لکھا کہ "تم اپنے افعال و اقوال سے توبہ کرو اور ہم سے ہو جاؤ تو ہم شریک ہوتے ہیں"۔ مگر مولوی علی بخش خاں نے اس شرط پر منظور کیا کہ آپ کو اور آپ کی کمیٹی خزنتہ البضاعتہ کو امور مذہبی میں مداخلت نہ ہو بلکہ مذہبی تعلیم کے واسطے ایک اور کمیٹی مقرر کی جاے جس کے وہی لوگ ممبر ہوں جن پر عام اہل اسلام کو اطمینان ہے اور جو لوگ مذہبی تعلیم کے واسطے چندہ دیں اُس روپیہ سے سود حاصل نہ کیا جائے اور اُسکی آمدنی جائز صرف مذہبی تعلیم میں خرچ کی جاے سرسید نے اُنکی تمام شرطیں منظور کرلیں اور اُنکو قواعد مدرستہ العلوم میں داخل کر دیا اور مولوی صاحب کو لکھا کہ میں عنقریب یہ تمام خط کتابت ممبران کمیٹی خزنتہ البضاعتہ کے پاس بھیجکر منظوری حاصل کر لیتا ہوں۔ اگرچہ بعض ممبروں نے اس بات سے سخت اختلاف کیا کہ کمیٹی خزنتہ البضاعتہ کو تعلیم مذہبی سے کچھ تعلق نہ رہے مگر کثرت رائے سے وہی تجویز جو مولوی علی بخش خاں چاہتے تھے منظور ہو گئی اور یہ قرار پایا کہ اہل سنت کے مشہور دیندار عالموں میں سے بیس بزرگوں کی خدمت میں درخواست کی جائے کہ وہ تعلیم مذہب اہل سنت و جماعت کی کمیٹی کے ممبر انتخاب کریں۔ البتہ اتنا گناہ ہو گیا کہ مذہبی کمیٹی کے ممبروں کا انتخاب کرنے والوں میں بقول مولوی علی بخش خاں علمائے اہل سنت کے بہت سے نام کمیٹی خزنتہ البضاعتہ نے خود تجویز کر دیے اور منجملہ بیس بزرگوں کے دو یا تین ممبر کمیٹی خزنتہ البضاعتہ کے بھی مذہبی کمیٹی کے ممبر انتخاب کرنے کے لیے نامزد کیے گئے۔ جس وقت مولوی علی بخش خاں کے پاس اس روئداد کی نقل پہنچی وہ سخت ناراض ہوئے۔ آٹھ سو روپیے کا چندہ جو اُنھوں نے مدرستہ العلوم میں دینے کا وعدہ تھا۔ اوس کے دینے سے انکار کیا اور مدرستہ العلوم کی مذہبی کمیٹی کے اہتمام وغیرہ سے ہمیشہ کے لیے دست بردار ہو گئے۔ جن دیندار عالموں سے درخواست کی گئی تھی کہ کمیٹی مذہبی کے ممبر انتخاب کریں ان میں سے اکثر نے جواب تک نہیں دیا اور مولوی محمد قاسم صاحب اور مولوی محمد یعقوب صاحب نے یہ جواب دیا کہ ہرگاہ اس مدرسہ میں شیعہ بھی ہونگے اس لیے ہم شریک نہیں ہوتے۔

ان تمام واقعات کی طرف سرسید نے تہذیب الاخلاق کے ایک مضمون میں لطف آمیز اشارے کیے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ "جناب حاجی مولوی سید امداد العلی صاحب نے لکھا کہ" تم

اپنے افعال و اقوال سے تو یہ کہو اور ہم سے ہو جاؤ تو ہم شریک ہوتے ہیں" اگرچہ اس امر کو اُس بات سے جو پیش کی تھی کچھ تعلق نہ تھا با ایں ہمہ میں اُسکو قبول کر لیتا مگر مجھے خیال ہوا کہ اگر ہمارے محب قلبی منشی چراغ علی صاحب (جو شیعہ مذہب رکھتے تھے) مجھسے کہیں کہ تم ہم سے ہو جاؤ تو ہم شریک ہوتے ہیں تو پھر میں کیا کرونگا؟ بقول شخصے کہ "گوری کا جوبن ٹھکیوں ہی میں گیا" میرا تو یوں ہی تکا بوٹی ہو لیگا!!

جناب مولوی محمد قاسم صاحب اور جناب مولوی محمد یعقوب صاحب نے جو متعصبانہ جواب دیا اُس سے ہر شخص جسکو خدا نے عقل اور محبت اور حب ایمانی دی ہو گی نفرت کرتا ہوگا۔ شیعہ مذہب کی تعلیم کا سلسلہ بالکل علیحدہ ہے جس سے اہل سنت و جماعت کو کچھ تعلق نہیں، پس یہ کہنا کیا بیجا تعصب ہے کہ ہر گاہ اُس مدرسہ میں شیعہ بھی ہونگے اس لیے ہم شریک نہیں ہوتے۔ خدا کرے کہ وہ یہ خیال فرما کر کہ ہندوستان میں شیعہ بھی رہتے ہیں۔ مکہ معظمہ کو سدھاریں۔ مگر افسوس ہے کہ میں سنتا ہوں حج اور طواف میں بھی شیعہ ہوتے ہیں"

"افسوس ہے کہ شیعہ و سنی میں اس زمانہ میں بہ نسبت اُس زمانہ کے۔ جب کہ امام محمد اسمٰعیل بخاری شیعوں سے روایت کرنے میں کچھ مضایقہ نہیں فرماتے تھے۔ نفاق اور شقاق بہت زیادہ ہو گیا ہے۔ مگر حالت زمانہ کی ایسی ہے کہ اگر شیعہ اپنے تعصب سے سنیوں کو چھوڑیں اور سنی اپنے تعصب سے شیعوں کو چھوڑیں تو دونوں غارت اور برباد ہو جائینگے۔ ہندوستان میں مسلمان تعداد میں کم ہیں دولت میں کم ہیں، عہدوں میں کم ہیں، اگر پھر اُن میں بھی شیعہ[1] و سنی و خارجی و ناصبی اور وہابی و بدعتی کا تفرقہ پڑے تو بجز برباد اور غارت ہونے کے اور کیا نتیجہ ہے؟ ارے کمبخت متعصبو! تم آپس میں لڑا کرنا اور ایک دوسرے کو کافر کہا کرنا مگر جو بات سب کے فائدے کی ہے اُسمیں کیوں ایک دل ہو کر شریک نہیں ہوتے؟ عالمگیر نے ایک عامل کی بددیانتی کا ذکر نظیراً کسی دوسرے عامل سے کیا؟ اُس نے عرض کیا "حضور! پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہیں" عالمگیر نے کہا "ملے، مگر بوقت خوردن ہمہ برابر میشوند"۔ پس اے بزرگو! اس بات میں کیوں تعصب کو کام فرماتے ہو جس میں سب کا فائدہ مشترک ہو"

جناب سید الحاج مولانا حاجی علی بخش خاں صاحب سے جو معاملہ پیش آیا وہ تو طشت از بام ہے اُن کی اور ہماری تو وہی مثل ہو گئی "من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو" یعنی وہ ہم کو بد عہد کہتے

[1] خدا کا شکر ہے کہ سرسید کی چیخ پکار سے ہمارے علما اب اس تفرقہ کو مٹانے کی فکر میں ہیں چنانچہ ندوۃ العلما نے سب فرقوں کو شریک کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ اگرچہ بعض علما اس کے خلاف ہیں۔!!

ہیں۔ بہرحال کسی نے بدعہدی کی ہو، وہ بات جس سے کھنڈت پڑ گئی اس قدر ہے کہ تمام امور تعلیم مذہبی تنہا جناب ممدوح کو کیوں نہ سپرد کیے گئے دیگر بزرگانِ دین کو کیوں شریک کیا؟ وَمَا ھٰذَا اِلَّا شِقَاقٌ مُّبِیْنٌ"

سرسید کی مخالفت اگر محض دینداری اور حمیت اسلامی کی بنیاد پر کی جاتی تو کوئی تعجب کی بات نہ تھی بلکہ اُس کا نہ ہونا تعجب تھا کیونکہ اُس سے پایا جاتا کہ مسلمانوں کو دین و مذہب کی پروا نہیں رہی؛ چنانچہ اسی خیال سے سرسید اکثر کہا کرتے تھے کہ "جو لوگ میرے مخالف ہیں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ میں اسلام کے برخلاف ہوں۔ اور میرے خیالات سے اسلام کو نقصان پہنچتا ہے میں جو کچھ کہ وہ اپنی دانست میں اس خیال سے کرتے ہیں اُس پر وہ بزرگ تعریف کے لائق ہیں نہ مذمت کے" مگر افسوس اور نہایت افسوس ہے کہ زیادہ تر مخالفتیں محض نفسانیت، خودغرضی یا عناد پر مبنی ہوتی تھیں اور اسی لیے بجائے اِس کے کہ سرسید کے اقوال جو اُنہوں نے مذہبی مسائل کے متعلق جمہور کے خلاف لکھے ہیں راست راست بے کم و کاست بیان کیے جاتے۔ بیسیوں باتیں اُن کی نسبت غلط مشہور کی گئیں، اُنکی تفسیر کی نسبت اس بات کی عموماً شہرت دی گئی کہ سید احمد خاں نے قرآن کے تیس پاروں میں سے دس چھانٹ لیے ہیں اور بیس نکال ڈالے ہیں، اکثر یہ بھی سُنا گیا کہ اُنہوں نے سورۂ الرحمٰن میں "فبای آلاء ربکما تکذبان" صرف ایک جگہ رکھا ہے باقی مکرّر سمجھکر سورت میں سے نکال ڈالا ہے، حالانکہ وہاں تک تفسیر کی نوبت ہی نہیں پہنچی تھی۔

مولوی علی بخش خاں نے جو ایک کتاب موسوم بہ تائید الاسلام سرسید کے خلاف لکھی تھی اور جس کی بہت سی جلدیں وہ عرب میں شائع کرنے کو لے گئے تھے اُس میں بے شمار عقائد سرسید کی طرف ایسے منسوب کیے ہیں جو بالکل خلاف واقع ہیں؛ مثلاً یہ کہ مادہ مثل ذات باری تعالےٰ کے ازلی ہے، یا ذات باری تعالیٰ خود مادی ہے، یا یہ کہ باوجود قانون قدرت کے بعثت انبیا کی ضرورت نہیں، یا یہ کہ نبوتِ انبیای سابقین یا کُتب سماویہ کے انکار سے یا معاذاللہ قرآن شریف کے عمداً بول و براز میں آلودہ کرنے یا اُس کے پھینک دینے سے یا حلال کو حرام اور حرام کو حلال ٹھیرانے سے، یا معاذاللہ کسی نبی کو گالی دینے سے، یا بہشت و دوزخ اور قیامت کے انکار سے، یا ضروریاتِ دین کے انکار کرنے سے آدمی کافر نہیں ہوتا یا یہ کہ گرمی کے موسم میں رمضان کے تیس روزے فرض نہیں ہو سکتے، یا تھوڑی

سی شراب جو بکا متوالا نہ کردے یا اتنا جُوا کھیلنا جو بے قید نہ بنا وے حرام نہیں ہو سکتا، یا یہ صلوٰۃ سے مراد مطلق دعا پڑھ لینی ہے اور وہی واسطے ادائے فرض کے کافی ہے باقی جو ترکیب صلوٰۃ پنجگانہ کی مقرر ہے وہ اصول مخترعۂ علما کا اتباع ہے۔ اسی طرح اور بہت سے اتہامات سرسید کی نسبت کتاب مذکور میں کیے گئے ہیں جنکو سرسید نے اپنے مضمون دافع البہتان میں ایک ایک کرکے لکھا ہے اور ہر ایک کے تحت میں یہ فقرہ لکھتے جاتے ہیں کہ "لعنۃ اللّٰہ علی قائلہٖ وعلیٰ معتقدہٖ"

مذہبی عقائد اور اقوال کے سوا اور طرح طرح کے اتہامات اُس خیرخواہ خلائق پر لگائے جاتے تھے۔ اس بات کا تو سرسید کی وفات تک ہزاروں آدمیوں کو یقین تھا کہ اُنہوں نے اپنا سر دس ہزار روپے کو انگریزوں کے ہاتھ بیچدیا ہے؛ اکثر لوگ سمجھتے تھے کہ بعد مرنے کے انگریز اونکا سر کاٹ کر لندن لیجائیں گے اور لندن کے عجائب خانہ میں رکھیں گے۔

ایک بار یہی سر بیچنے کا تذکرہ سرسید کے سامنے ہوا؛ اُسوقت راقم بھی موجود تھا، اُس مرحوم نے نہایت کشادہ دلی کے ساتھ فرمایا کہ "جو چیز خاک میں ملکر خاک ہو جانے والی ہے اُسکے لیے اس سے زیادہ اور کیا عزت ہو سکتی ہے کہ دانشمند لوگ اُسکو روپیہ دیکر خریدیں، اُسکے ڈسکشن سے کوئی علمی نتیجہ نکالیں، اور اوسکی قیمت کا روپیہ قوم کی تعلیم میں کام آوے دس ہزار چھوڑ دس روپیے بھی اوسکی قیمت میں ملیں تو میرے نزدیک مفت ہیں"

منجملہ اُن بے شمار اتہامات کے جو سرسید پر لگائے جاتے تھے ایک وہ صریح بہتان تھا جو ۱۸۷۶ء میں بمقام بنارس اُنپر لگایا گیا۔ سرسید کے پنشن لیکر علیگڈھ آنے سے چند مہینے پہلے جب کہ حضور پرنس اوف ویلز بنارس میں تشریف لائے۔ اُن کی تشریف آوری کی یادگار میں ایک شفاخانہ بنارس میں بننا تجویز ہوا تھا اور جو کمیٹی یادگار قایم کرنے کے لیے مقرر ہوئی تھی اُس کے ایک ممبر سرسید بھی تھے۔ کمیٹی کی درخواست پر میونسپلٹی بنارس نے شفاخانہ کے لیے ایک قطعہ زمین دینا تجویز کیا جس میں علاوہ اور کچے گھروں کے ایک چھوٹا سا خام چبوترہ بھی تھا جسکو مسلمانوں نے نماز پڑھنے کے لیے عارضی طور پر بنا لیا تھا۔ میونسپلٹی نے خود اُس میدان کو صاف کرا دیا اور جس طرح اور گھروں کے مالکوں کو کمیٹی یادگار سے معاوضہ دلوایا تھا۔ اسی طرح اُس چبوترے کے معاوضہ میں ۳۲ روپیے دینے سے تجویز ہوئے۔ سرسید نے اس خیال سے۔ کہ یہ قلیل رقم مسلمانوں کے کس کام آئیگی۔ نواب لفٹنٹ گورنر

سے جو اُن دنوں بنارس آئے ہوئے تھے - عرض کرکے اُسی میدان کے قریب مسجد کے لیے ایک دوسرے قطعہ کے ملنے کی اجازت دلوا دی اور شفاخانہ کے چندے میں سے ڈھائی ہزار روپیہ مسلمانوں کو دلوا کر وہاں مسجد تعمیر کرا دی - بنارس کے مسلمان سرسید کے نہایت شکر گزار ہوئے اور مسجد کے پیشطاق پر یہ بیت کندہ کرانی تجویز کی ؎

درآداں سعید واز برائے طاعتِ یزداں ؎ بناگر دید ایں مسجد زسعیِ سید احمد خاں

مگر سرسید نے اس تجویز کو ناپسند کیا اور اس بیت کے کندہ کرانے کی اجازت نہیں دی۔

بنارس میں تو یہ کارروائی ہو رہی تھی اور تمام ہندوستان کے دیسی اخباروں میں یہ لکھا جا رہا تھا کہ سید احمد خاں نے شفاخانہ کے واسطے مسجد منہدم کرا دی - یہ شور وشغب ایک مدت تک ہندوستان کے نالایق اخباروں میں رہا مگر سرسید نے اس کی کچھ پروا نہ کی اور اصل حال سے اخباروں کو مطلع نہیں کیا - آخر سوسائٹی اخبار کے اڈیٹر نے ایک پرچہ میں لکھ دیا کہ ہم اصل حالات دریافت کرکے اپنے اخبار میں چھاپیں گے - سرسید نے اڈیٹر کی یہ تحریر اخبار میں دیکھکر اسکو لکھ بھیجا کہ مجھ پر سے الزام رفع کرنیکے لیے آپ اخبار میں کچھ نہ لکھیں اور اخبار نویسوں کو بکنے دیں چند روز بعد اڈیٹر کی شکایت اخباروں میں چھپنی شروع ہوئی کہ جو وعدہ کیا تھا وہ پورا نہ کیا کیونکہ سرسید پر سے الزام رفع کرنے کا کوئی پہلو ہاتھ نہ آیا - آخر علی گڑھ اخبار کے اڈیٹر نے مجبور ہو کر ۲۶ مئی ۱۸۷۶ء کے پرچہ میں تمام حال اول سے آخر تک بحوالہ کاغذات مثل میونسپلٹی بنارس کے تحریر کیا - اب اخباروں میں یہ چھپنا شروع ہوا کہ نہایت افسوس ہے نہ سرسید نے اصل حال سے مطلع کیا اور نہ سوسائٹی اخبار کے اڈیٹر نے مدت تک اس واقعہ پر کچھ روشنی ڈالی - تب سرسید نے تہذیب الاخلاق میں ایک آرٹکل لکھا جس میں تمام اخباروں کے اقوال - جو سرسید کے برخلاف لکھے گئے تھے نقل کرکے ہر ایک پرچہ پر جدا جدا ریمارک کئے ہیں - ازاں جملہ اودھ اخبار میں - جس کے اڈیٹر اُس وقت مرحوم غلام محمد خاں تپش تھے - یہ فقرہ چھپا تھا "اخبار سائنٹفک سوسائٹی میں یہ مضمون نہایت دیر میں چھپا، یعنی اُس وقت جب کہ سید صاحب کی بدنامی تمام دنیا میں مشتہر ہو چکی" اس پر سرسید مرحوم نے نہایت لطیف ریمارک کیا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں "اس کے عذر میں نہایت ادب سے اپنے شفیق کے سامنے حافظ کا یہ شعر پڑھتا ہوں -

درکوے نیک نامی مارا گذر ندادند ؎ گر تو نمی پسندی تغیر کن قضا را

لیکن اگر ہمارے دوست اس فقرہ کو یوں ارقام فرماتے تو شاید لفظ بدنامی کے صحیح معنی ہو سکتے" یہ مضمون نہایت دیر میں چھپا؛ یعنی اُس وقت جبکہ تمام اخباروں کی بدنامی دنیا میں ہو چکی" پھر لکھتے ہیں" ہم کو امید ہے کہ خدا وہ دن بہت جلد لائیگا کہ ہماری قوم بدنامی کے صحیح معنی سمجھے گی اور ہمارے ملک کے اخبار خود اپنی عزت کرنی سیکھیں گے"۔

اسی طرح بیسیوں اتہام سرسید پر، مدرسۃ العلوم، اُس کے طالب علموں پر لگائے جاتے تھے، مدرسہ کی نسبت ایسی خبریں اُڑائی جاتی تھیں جنسے لوگوں کے دل میں نفرت پیدا ہو یا اُس کے معاونوں کو رنج اور مخالفوں کو خوشی ہو، چنانچہ ایکدفعہ ایک ننگ اسلام و اہل اسلام نے مشہور کر دیا کہ جس کوٹھی میں ہائی اسکول کی جماعتیں پڑھتی ہیں اُسکی چھت گر پڑی اور بیس تیس طالب علم اُسکے نیچے دب گئے - اسی قسم کی اور بہت سی مثالیں ہیں مگر وہ جو مثل مشہور ہے کہ" اپنا گھٹنا کھولئے اور آپ ہی لاجوں مریئے" ایسی باتیں بیان کرنے سے سوا اس کے کہ اپنی اور اپنی قوم کی نالایقی سارے زمانہ میں مشہور ہو اور کوئی نتیجہ معلوم نہیں ہوتا۔

الغرض جب سرسید کے کفر و ارتداد اور واجب القتل ہونے کے فتوے اطراف ہندوستان میں شایع ہوئے تو انکی جان لینے کی دھمکیوں کے گمنام خطوط اُن کے پاس آنے لگے - اکثر خطوں کا یہ مضمون تھا کہ" ہم نے اس بات پر قرآن اُٹھایا ہے کہ تم کو مار ڈالینگے" ایک خط میں لکھا تھا کہ" شیر علی جسنے لارڈ میو کو مارا تھا۔ اُس نے نہایت حماقت کی اگر وہ تمکو مار ڈالتا تو یقینی بہشت میں پہنچ گیا ہوتا" سنہ ۱۸۹۱ء میں - جبکہ سرسید کالج کی طرف سے ایک ڈیپوٹیشن لیکر حیدرآباد گئے تھے اور حضور نظام (خلد اللہ ملکہ) کے ہاں بشیر باغ میں مہمان تھے - ایک مولوی نے ہمارے سامنے سرسید سے یہ ذکر کیا کہ کلکتہ میں ایک مسلمان تاجر نے آپکے قتل کا مصمم ارادہ کر لیا تھا اور وہ کسی شخص کو اس کام پر مامور کرنا چاہتا تھا - اس بات کی مجھکو بھی خبر ہوئی، چونکہ میں علیگڑہ کی طرف آنیوالا تھا اُس سے خود جا کر ملا اور اُس سے کہا کہ میں علیگڑہ جانیوالا ہوں - اور میرا ارادہ سید احمد خاں سے ملنے کا ہے۔ جب تک کہ میں اُنکے عقائد اور مذہبی خیالات دریافت کر کے آپ کو اطلاع نہ دوں آپ اس ارادہ سے باز رہیں چنانچہ میں علیگڑہ میں آیا اور آپ سے ملا اور بعد دریافت حالات کے اُس کو لکھ بھیجا کہ سید احمد خاں میں کوئی بات میں نے اسلام کے خلاف نہیں پائی تمکو چاہیئے کہ اپنے منصوبے سے توبہ کرو اور اپنے خیال خام سے نادم ہو - معلوم نہیں کہ اُس مولوی کا یہ بیان صحیح تھا

یا غلط مگر سرسید نے جو یہ حال سُنکر اُسکو جواب دیا وہ لطف سے خالی نہ تھا، اُنھوں نے کہا "افسوس ہے کہ آپ نے اُس دیندار مسلمان کو اس ارادہ سے روک دیا اور ہم کو ہمارے بزرگوں کی میراث سے جو ہمیشہ اپنے بھائی مسلمانوں ہی کے ہاتھ سے قتل ہوتے رہے ہیں۔ محروم رکھا"

ایک دفعہ خاص علیگڑہ میں کسی نے بذریعہ گمنام تحریر کے سرسید کو یہ دھمکی دی کہ اگر آیندہ تم گاڑی میں سوار ہوکر اپنی کوٹھی سے باہر نکلے تو تمھاری خیر نہیں، میں بندوق مارے بغیر ہرگز نہ رہونگا مگر سرسید نے اِن دھمکیوں کا کبھی کچھ خیال نہیں کیا؛ نہ اُنکی کسی عادت میں فرق آیا، اور نہ اُنھوں نے اپنی حفاظت کا کبھی کوئی خاص انتظام کیا۔ سرسید کی وفات سے چند مہینے پہلے ایک مخالف گروہ کی نسبت یہ مشہور ہوا کہ اُنکا ارادہ سید کے قتل کرنے کا ہے اور فی الحقیقۃ اُس گروہ کا جوش اُس حد کو پہنچا ہوا تھا کہ اُنسے ایسی حرکت کر بیٹھنا کچھ بعید نہیں معلوم ہوتا تھا۔ ایک دن سرسید کے بعض احباب نے اُنسے کہا کہ آپ سوار ہونا چھوڑ دیں اور کچھ زائد چوکیدار رات کے پہرے کے لیے کوٹھی پر مقرر ہونے چاہئیں اور ایسا انتظام ہونا چاہیے کہ کوئی اجنبی شخص بلا اطلاع اور بغیر تفتیش حال کے کوٹھی کے اندر نہ آنے پائے سرسید یہ باتیں سنکر تعجب کرتے تھے اور ہنستے تھے؛ یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے صلاح کاردوستوں کو نادان اور وسواسی سمجھتے ہیں اور ایسا انتظام کرنے کو ایک نہایت سبک حرکت خیال کرتے ہیں چنانچہ کسی طرح کا انتظام نہیں کیا گیا، نہ کسی کے آنے جانے کی روک ٹوک کی گئی، نہ چوکیدار رکھے گئے، نہ سوار ہونا موقوف ہوا۔

۱۸۸۸ء میں جب پہلی بار محمدن ایجوکیشنل کانفرنس کا منعقد ہونا لاہور میں قرار پایا تو خان بہادر برکت علی خاں جنکی تحریک سے لاہور میں اس جلسہ کا ہونا قرار پایا تھا۔ اُنکے ایک مخالف کی طرف سے کانفرنس کی تاریخوں سے ایک دن پہلے ایک نہایت گستاخ تحریر سرسید کے نام پہنچی جس میں علاوہ اور نالایق باتوں کے نہایت بُرے لفظوں میں یہ مطلب بھی ادا کیا گیا تھا کہ تم کانفرنس میں آنے کا ہرگز ارادہ نکرنا اور نہ جو حال کل رات کو خان بہادر کا کیا گیا ہے اُس سے بدتر تمھارا حال کیا جائے گا۔ سرسید نے جو وقت علیگڑہ سے لاہور کی روانگی کا مقرر تھا اسمیں کچھ تبدیلی نہیں کی صرف خان بہادر کی خیر و عافیت دریافت کرنے کے لیے چلنے سے پہلے اُن کو تار دیا اور جب اُن کی خیریت معلوم ہوگئی فوراً لاہور کو روانہ ہوگئے۔

اخبار رفیق ہند ابتدا میں سرسید کا حد سے زیادہ طرفدار اور مداح و ثناخواں تھا؛ چنانچہ

۱۸۸۴ء میں جب سرسید نے پنجاب کا سفر کیا اور لاہور میں پہنچے تو اسی اخبار میں سرسید کی نسبت ایک لمبی مدحیہ عبارت چھپی تھی جس کے سرے پر یہ شعر لکھا تھا ؎

مرحبا سید اولادِ نبیِ مدنی   جانِ جاں باد فدایت کہ وحیدِ زمنی

مگر جب دوسری بار یہ اخبار جاری ہوا تو سرسید کی مخالفت میں تمام اگلے پچھلے مخالفوں سے بعض ذاتی رنجشوں کے سبب گوئے سبقت لے گیا۔ وہی شخص جس کی نسبت پہلے "سید اولادِ نبی مدنی" لکھا گیا تھا اس پرچے میں اب کوئی برائی ایسی نہ تھی جو اُس کی طرف منسوب نہ کی گئی ہو، اور کوئی آلہ لوگوں کو اُس سے بدظن کرنے کا ایسا نہ تھا جو اس پرچے میں استعمال نہ کیا گیا ہو۔ سرسید کے دوست اُس کی زبان درازیاں دیکھ کر بگڑتے تھے اور اس کا جواب لکھنے پر آمادہ ہوتے تھے مگر سرسید سب کو منع کرتے تھے اور کسی کو اُس سے مقابلہ کرنے کی اجازت نہ دیتے تھے اور کہتے تھے کہ "موسم کی آندھی ہے چند روز میں خود بخود فرو ہو جائے گی۔"

اب سرسید کے انتقال کے بعد ۱۸۹۹ء میں وہ ایک مدت بند رہ کر تیسری بار پھر جاری ہوا ہے اور چشمِ بد دور اب بھی باوجود اس کے کہ سرسید دنیا سے رحلت کر چکے ہیں اپنی وضعداری نباہے چلا جاتا ہے لیکن اب سرسید کا نام صراحۃً کم لیتا ہے بلکہ جو کچھ سرسید یا اُن کے کاموں کے برخلاف لکھنا ہوتا ہے اُس کو علی گڑھ منتھلی پر ڈال دیتا ہے۔ مگر ہم خوش ہیں کہ سرسید کی مخالفت کی بدولت اب کی بار اُس میں خود بخود ایک ایسی خوبی پیدا ہو گئی ہے جو ملک کے حق میں نہایت مفید ہے، وہ یہ کہ وہ برخلاف اُن اخباروں کے جو ہندو مسلمانوں میں تفرقہ ڈالنا چاہتے ہیں دونوں قوموں میں آشتی اور مصالحت کی بنیاد ڈالتا معلوم ہوتا ہے۔ اُس کی یہ پالیسی جیسا کہ اُس کے مخالف خیال کرتے ہیں کیسی ہی غرض پر مبنی کیوں نہ ہو ملک کے حق میں بہرحال مفید ہے۔

ایک شخص نے چند اجزا سرسید کی لائف کے نام سے لکھ کر اُن کے پاس بھیجے جس میں بہت سی باتیں خلافِ واقع درج تھیں اور دعویٰ کیا ان کی تفتیش کی گئی تھی مگر مولف نے اپنا نام ظاہر نہیں کیا تھا۔ سرسید نے اُس پر یہ ریمارک اپنے اخبار میں چھپوا دیا: "ایک ہمارے شفیق غائبانہ نے جن سے ہم سے ملاقات ظاہری نہیں ہے، ہماری لائف اپنے خیال کے مطابق لکھ کر ہمارے پاس بھیجی ہے جس میں ایسی باتیں بھی ہیں جن سے ہم خود واقف نہیں ہیں۔ ہم اُن کا شکریہ ادا کرتے ہیں اور یہ رباعی حسبِ حال لکھتے ہیں

اے آنکہ مرا ندیدہ بشناختۂ   نادیدہ و تصویرِ من عیاں ساختۂ
با ایزدِ بے مثال مانندِ منم   کو را ندیدہ و بشناختۂ"

سب سے زیادہ سرسید کا ذکر خیر پنچ اخباروں میں ہوتا تھا جن کے اڈیٹر اور پروپرائٹر عموماً مسلمان تھے اور جن کی گرم بازاری صرف اس بات پر منحصر تھی کہ اپنی قوم کے خیر خواہ اور جان نثار پر پھبتیاں اڑائیں اُس کے کارٹون بنائیں اُس کی ہجو کے اشعار شائع کریں اُس کی خوبیوں کو عیب بنا کر دکھائیں اور اس طرح نہ صرف آپ کو بلکہ تمام قوم کو جس کے مذاق پر اخباروں کی برائی بھلائی کا انحصار ہے دنیا میں رسوا اور بدنام کریں۔ سرسید بھی ان اخباروں کے آوازے توازے سنتے سنتے اُن کے عادی ہوگئے تھے یہاں تک کہ جس اخبار میں اُن پر کوئی چوٹ نہ ہوتی تھی اُس کو دیکھکر تعجب کرتے تھے چنانچہ تہذیب الاخلاق میں ایک جگہ لکھتے ہیں "ہمارا حال تو اُس بڑھیا کا سا ہوگیا ہے جس کو بازار کے لونڈے چھیڑا کرتے تھے اور جب وہ چھیڑنے والے نہ ہوتے تو کہتی کیا آج بازار کے لونڈے مرگئے"

سرسید کی تمام تحریریں جو اُس مخالفت کے زمانہ میں تہذیب الاخلاق میں چھپتی تھیں نہایت لطیف اور دلچسپ ہوتی تھیں۔ ازاں جملہ دو تین فقرے مختلف مقامات سے اس مقام پر نقل کئے جاتے ہیں۔

ایک مقام پر لکھتے ہیں "ہمارے ایک دوست نے ہم سے نقل کی کہ ضلع سہارنپور میں ہمارے حال پر بحث ہو رہی تھی ... ایک صاحب نے کہا کہ "ہے تو کرستان مگر ہماری قوم کی بھلائی اگر ہوگی تو اُسی کرستان سے ہوگی" یہ نقل سنکر میں نہایت خوش ہوا اور میں نے کہا کہ اگر درحقیقت مجھے ایسا ہو تو اس کرستانی خطاب پر ہزار مسلمانی نثار ہے ... صائب نے ایک ناواقف شاعر سے پوچھا کہ صائب کیسا شعر کہتا ہے اُس نے نہایت دلی جوش سے کہا کہ "آں قرمساق ہمہ خوش میگوید" صائب کہتا ہے کہ "جیسی عزت مجکو قرمساق کے لفظ سے حاصل ہوئی اعلیٰ سے اعلیٰ خطاب سے بھی ممکن نہیں" اسی طرح خدا کرے کہ یہ لفظ کرستان کا میرے لئے عزت قومی کا باعث ہو"

ایک جگہ لکھتے ہیں "حضرات ہماری تو وہی مثل ہے۔ دھوبی کا کتا گھر کا نہ گھاٹ کا؛ از برادران دور واز بیگانگاں نفور، ایک گوشہ میں پڑا ہوں، نزدیک و دور یگانہ و بیگانہ سے لعن وطعن سنتا ہوں۔ جس طرح بیگانگاں مجھ سے نفرت کرتے ہیں برادران وطن بھی۔ الا ماشاء اللہ۔ اسی طرح متنفر ہیں۔ قصور یہ کہ اپنی دانست میں بھائیوں کا بھلا چاہتا ہوں، اُن کی عام رائے کی مخالفت سے نہیں ڈرتا بلکہ جو اُن کے بھلے کی ہے وہی کہتا ہوں۔ یہی کم بخت خصلت بے خبر ہے جس نے مجھکو اس حال پر پہنچایا ہے"

پھر ایک جگہ لکھتے ہیں "دنیا میں کوئی نہیں رہا؛ پیر نہ پیغمبر نہ زاہد خدا پرست نہ فاسق نفس پرست سب کو گذر نا ہے مگر میں سمجھتا ہوں۔ بشرطیکہ میری سمجھ کی غلطی نہ ہو کہ حضرت مرزا جانجاناں مظہر علیہ الرحمۃ

جن کو بلحاظ اُن نسبتوں کے جو مجھے اُن خاندان سے ہیں نانا سے پردادا کہنا زیبا ہے۔ اُن کا یہ شعر میری خاک مرقد کا کتابہ ہوگا۔

بلوح تربتِ من یافتند از غیب تحریرے — کہ این مقتول را جز بیگناہی نیست تقصیرے

سرسید نے جو لباس، طعام و مکان اور طرز و ماند و بود اور طرزِ معاشرت وغیرہ میں تعلیم یافتہ ترکوں کا طریقہ اختیار کیا تھا اور جس سے انگریزوں اور مسلمانوں میں میل جول پیدا کرنا مقصود تھا مسلمان تو اس طریقہ کو ناپسند کرتے ہی تھے بلکہ اُس کو عیسائی ہو جانیکے برابر سمجھتے تھے مگر تماشا یہ ہے کہ بعض متعصب اور مغرور انگریز بھی اس سے نہایت ناراضی ظاہر کرتے تھے اور گویا اس بات کا ثبوت دیتے تھے کہ انسانی اخلاق میں منو کے زمانے سے آج تک باوجود اس قدر علمی اور عقلی ترقیات کے ایک ذرہ برابر بھی ترقی نہیں ہوئی اور جو فرق منو نے شودر اور برہمن میں رکھا تھا وہی فرق اس زمانے کے اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ کے شائستہ لوگ حاکم و محکوم میں برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ اگرچہ فیاض طبع اور کشادہ دل انگریز جو ہندوستان میں رہ کر انگلستان کے اصلی جوہر یعنی آزادی کو کھو نہیں بیٹھتے وہ ان باتوں کا کچھ خیال نہیں کرتے اور ہندوستانیوں سے خواہ وہ کسی لباس میں ہوں ناک بھوں نہیں چڑھاتے مگر تنگ دل انگریزوں کو ہرگز گوارا نہیں کہ ہندوستانی جو ہماری جوتیوں کے تلے ہیں وہ ٹرکش کوٹ، پتلون اور ٹرکی ٹوپی اور انگریزی بوٹ پہنکر ہم سے ملنے کو آئیں۔ چنانچہ اسی بنا پر بعض اوقات اُن لوگوں کو جو وضع اور لباس میں سرسید کی پیروی کرتے تھے سخت مشکلیں پیش آئیں بلکہ خود سرسید اسی روک ٹوک کے سبب بعض یورپین افسروں سے باوجودیکہ برسوں ایک جگہ رہے کبھی نہ مل سکے مگر جس بات کو انہوں نے اپنے نزدیک بہتر سمجھا کسی کی مخالفت کے خوف سے اُس کو ترک نہیں کیا؛ جیسا سمجھا ویسا ہی کہا اور وہی کیا۔ جب کبھی اُن کو معلوم ہوا کہ کسی افسر یا حاکم اعلیٰ نے ہندوستان کے یورپین ڈریس پر اعتراض کیا ہے فوراً اخبار میں اُس کا جواب لکھا۔ یہاں تک کہ جب لارڈ ڈفرن نے اسی تبدیل لباس کے خلاف ایک عام مجمع میں کچھ تقریر کی اور وہ اخباروں میں چھپی تو سرسید نے ایک نہایت زبردست آرٹیکل اسکے برخلاف لکھکر اپنے اخبار میں شایع کیا اور اسطرح کے بے شمار آرٹیکل سوسائٹی اخبار کی جلدوں میں اُنکے لکھے ہوئے موجود ہیں۔

جو مسلمان سرسید کے مخالف تھے وہ بھی انگریزوں کی اس مخالفت سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ چنانچہ مولوی امداد العلی اپنی ایک تحریر میں لکھتے ہیں "بعض اہالیان ہند نے واسطے دھوکا دینے حکام وقت کے اپنا طریقہ مذہبی اور لباس ملکی اور وضع قومی چھوڑ کر برخلاف

لیتے ہیں انہوں اور ہم تو مولوی اور ہم پیشوں کے جاکٹ کوٹ پتلون پہننا اور میز و کرسی پر بیٹھکر چھری کانٹے
سے کھانا اس عداوت سے اختیار کیا ہے کہ ہم کو حکام وقت جن کے لباس اور طعام کی یہ وضع ہے -
اپنا مخلص اور مطیع اور خیرخواہ سمجھیں اور ان کے مخالف ہم کو حکام کا ہمسر مانند صاحب لوگوں کے
سمجھیں سو نتیجہ ان کے خبث طینت کا کہ نکلا ورنہ یہ بات یوں ظاہر ہے کہ اکثر حکام سوائے فریبی دغاباز سمجھنے
کے ان کو اچھا نہیں جانتے اور ان کی وضع اور چال چلن کو پسند نہیں کرتے۔"

باوجود ان تمام مخالفتوں کے جو مسلمانوں کی طرف سے ہوتی تھیں سرسید نے جو اُن کے مقابلہ
میں ابتدا سے خاموشی کا طریقہ اختیار کیا تھا بغیر اشد ضرورت کے کبھی اس کو ترک نہیں کیا نہ وہ
خود جواب دینا چاہتے تھے اور نہ کسی دوست کا اپنی طرف سے جواب دینا پسند کرتے تھے
چنانچہ ان کی بہت سی تحریریں دیکھی گئی ہیں جن میں انہوں نے اپنے دوستوں کو مخالفوں
کا جواب دینے سے روکا ہے بلکہ ایک دفعہ خود راقم کو ایک اسی قسم کی تحریر اخباروں میں چھپوانے
پر نہایت شرمندہ کیا - اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ان کو اپنی سچائی پر کس قدر بھروسہ تھا اور
کہاں تک وہ سلف کے اس سچے مقولہ پر یقین رکھتے تھے کہ " ما ذل ذوحقٍ ولو اتفق
العالم علی خلافہ "

انہوں نے ۱۸۷۹ء میں ولایت کے سوسائٹی اخبار کے اڈیٹر کو لکھا تھا " رد و قدح پر
متوجہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے اس لئے کہ جو بات جھوٹی ہے وہ تھوڑے ہی زمانے میں قتل
جھوٹے ہونے کے سبب آپ ہو جاویگی! خواہ وہ بات خود اس شخص کی (یعنی میری) ہو اور خواہ
اس کے مخالف کی - لیکن میں نہایت عاجزی سے آپ کی خدمت میں التماس کرتا ہوں کہ جو لوگ میری
برائی لکھیں آپ بلا تکلف ان کے اخبار میں نقل کیجئے مگر کوئی حرف بھی اس کے جواب کے طور پر
از قلم نہ فرمایا کیجئے! صرف اس کی صحت اور عدم صحت پڑھنے والوں کی رائے پر چھوڑ دیجئے امید
ہے کہ آپ اپنی عنایت سے میری التماس کو قبول فرماوینگے۔"

لیکن اگر کسی انگریز کا مضمون سرسید کے خیالات یا مدرسۃ العلوم کے خلاف کسی انگریزی
اخبار میں چھپتا تھا تو اس کا جواب دیئے بغیر وہ کبھی نہ رہتے تھے اور اکثر ایسے مضامین کا انگریزی
ترجمہ بھی ساتھ کے ساتھ چھپوا دیتے تھے جس زمانے میں انہوں نے مدرسۃ العلوم کی بنیاد
ڈالنے کا ارادہ کیا اکثر یورپین افسر ان کے مخالف ہو گئے تھے اور جیسا کہ پہلے حصے میں ذکر
ہو چکا ہے کمیٹی نے مدرسہ کے لئے جس قطعۂ زمین کے ملنے کی گورنمنٹ سے درخواست کی

تھی ضلع کے حکام اُس کا ملنا نہیں چاہتے تھے۔ خصوصاً ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم اضلاع شمال مغرب اور صاحب کلکٹر ضلع علی گڑھ سخت مخالف تھے۔ یہاں تک کہ جو مضمون کسی انگریزی اخبار میں مدرسہ یا بانیٔ مدرسہ کے خلاف چھپتا تھا سرسید کو انھیں دونوں صاحبوں پر اس کے لکھنے کا گمان ہوتا تھا۔ چنانچہ انڈین آبزرور مطبوعہ ۱۸۷۲ء میں جو ایک سخت آرٹکل مدرسۃ العلوم اور سرسید بلکہ تمام مسلمانوں کے برخلاف چھپا تھا اس پر بھی سرسید کو یہی خیال ہوا کہ ان دونوں افسروں میں سے کسی کا لکھا ہوا ہے۔ اس پر سرسید نے دو آرٹکل تہذیب الاخلاق میں لکھے جن کا انگریزی ترجمہ ساتھ ہی ساتھ چھاپا تھا اُس میں سے چند فقرے ہم اس مقام پر نقل کرتے ہیں۔

"انڈین آبزرور مطبوعہ ۸ ستمبر ۱۸۷۲ء میں آرٹکل لکھنے والے نے ہم کو (یعنی مسلمانوں کو) سخت متکبر اور متعصب کہا ہے۔ اور یہی سبب ہم کو گورنمنٹ کالجوں اور اسکولوں سے کم فائدہ حاصل کرنے کا قرار دیا ہے۔ اس آرٹکل کو پڑھ کر اول اول تو ہم کو بہت تردد اور خوف معلوم ہوا تردد تو اس بات کا ہوا کہ یہ کس کا لکھا ہوا ہے؟ مسٹر ڈی پی آئی کا؟ یا مسٹر سی اس کا؟ اور خوف اس بات کا ہوا کہ اگر پچھلے کا ہو تو اب نہ ہو کہ وہ کبھی ہمارے ملک کا لفٹنٹ گورنر ہو جاوے اور مسلمانوں کی زندگی اُس کے ہاتھ میں پڑ جائے۔ مگر چونکہ اُس آرٹکل کے مضمون اکثر وہی ہیں جو بدت ہوئی کہ ہم سن چکے تھے اس لئے وہ ہمارا تردد اور خوف دونوں جاتے رہے۔"

"مگر ہم کہتے ہیں کہ ہاں ہم (یعنی مسلمان) متکبر بھی ہیں اور متعصب بھی، پر کیوں نہ ہم ایسا طریقہ تعلیم اختیار کریں جس سے ہمارے تکبر اور تعصب میں بھی خلل نہ آوے اور ہم تعلیم بھی پاویں۔"

"انڈین آبزرور کا آرٹکل لکھنے والا ہم کو طعنہ دیتا ہے کہ ہم اس مسلمانوں کے کالج قائم کرنے کے لئے کافروں (یعنی انگریزوں) سے کیوں مدد لی جاتی ہے؟ اور یہ بھی لکھتا ہے کہ "اگر ایسا مدرسہ خود مسلمانوں ہی کی کوشش سے قائم ہوگا تو یہ ترقی و بہتری کی دلی خواہش کا ثبوت ہوگا؛ لیکن اگر لارڈ نارتھ بروک صاحب جیسے لوگوں کی سخاوت سے قائم ہوا تو کچھ دلی خواہش کا نشان

۱؎ یعنی ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن ۱۲ ۲؎ یعنی سول سرونٹ ۱۲

کا سراغ لگانا بہتر معلوم ہوتا ہے کیونکہ جو امر تیس برس پہلے محال معلوم ہوتا تھا اس کا اس قدر جلد وقوع میں آجانا بلاشبہ اس کے اسباب کی عظمت پر دلالت کرتا ہے اور چونکہ قوم کو ابھی سرسید جیسے بہت سے کامیاب شخصوں کی ضرورت ہے اس لئے اُمید ہے کہ اُن کی کامیابی کے اسباب کا بیان کرنا فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔

ممکن ہے کہ سرسید کی کامیابی کی نسبت یہ خیال کیا جائے کہ اُنہوں نے جتنے کام کئے وہ سب زمانہ کے مقتضا کے موافق کئے اور اس لئے زمانہ خود اُن کی تائید کرنے والا تھا۔ پس اُن کی کامیابی اُسی قدر تعریف کے لائق ہے جیسے اُس تیراک کی تیراکی جو دریا کے بہاؤ پر بے تکان تیرتا چلا جاتا ہے۔ مگر ہمارے نزدیک اس خیال میں کسی قدر غلطی ہے۔ زمانہ کا تقاضا اور چیز ہے اور زمانہ کا اقتضا اور چیز۔ بے شک زمانہ کا تقاضا یہی تھا کہ مسلمان اپنی حالت درست کریں، وقت کی ضرورتوں کو سمجھیں اور خوابِ غفلت سے بیدار ہوں مگر اُس کا اقتضا بالکل اس کے برخلاف تھا؛ اُس کا اقتضا وہ تھا جو ملکہ سبا نے سلیمانؑ کا پیغام سن کر اپنے درباریوں سے کہا تھا کہ "اِنَّ الْمُلُوْکَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً"۔ حکمراں قوم جب مفتوح ہوتی ہے۔ خواہ فاتح قوم دانشمند اور منصف ہو اور خواہ وحشی اور ظالم۔ دونوں صورتوں میں اُس کا میلان پستی اور تنزل کی طرف ہونا ایک قدرتی بات ہے۔ اُس کو درحقیقت گورنمنٹ نہیں گراتی بلکہ وہ آپ ہی اپنے بل میں گرتی چلی جاتی ہے۔ جس چال پر وہ قدیم سے چلی آتی ہے اس کے خلاف دوسری چال چلنا اُس کے لئے ایسا ہی دشوار ہوتا ہے جیسے کسی جسم کا اپنی طبیعی حرکت کے خلاف حرکت کرنا۔ مفتوح قوم کو۔ گو کہ اُس کی اقبالمندی کا زمانہ بالکل ختم ہوگیا ہو۔ مدت دراز تک اقبال مندی کے خواب برابر نظر آتے رہتے ہیں اور اُس کی اُمیدوں کا طلسم بدستور بندھا رہتا ہے۔ ان کو اپنی پستی اور تنزل کا شعور مطلق نہیں ہوتا اور اپنی حالت کی اصلاح کا کبھی بھول کر بھی ان کے دل میں خیال نہیں گزرتا۔ اگر بالفرض اپنے تنزل پر متنبہ ہوتے ہیں تو اُس کو زمانہ کی ناانصافی اور اپنی حق تلفی پر محمول کرتے ہیں، اپنی نالائقی کی طرف ہرگز منسوب نہیں کرتے۔ اسی بھلاوے میں وہ گرتے گرتے اُس گہرے گڑھے میں جا پڑتے ہیں جہاں سے اُبھرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔

ہندوستان کے مسلمانوں کی بھی ایسی ہی حالت تھی؛ وہ کچھ تو ڈیڑھ سو برس سے پست ہوتے چلے ہی آتے تھے۔ اسی طرح یہ ہوا کہ واقعۂ ۱۸۵۷ء نے اُن کو اور بھی نیچے گرا دیا۔ اب اُن کے اُبھرنے کی بظاہر کوئی صورت باقی نہ رہی تھی اور وہ وقت کچھ دور نہ تھا کہ امریکا اور آسٹریلیا کے قدیم باشندوں کی طرح ملک میں اُنکا عدم اور وجود برابر ہو جائے پس اگر دنیا فی الواقع عالم اسباب ہے تو اس میں شک کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ مسلمانوں نے ابتک جو کچھ اپنی پولٹکل حالت میں ترقی کی ہے وہ صرف سرسید کی چہل سالہ کوششوں کا نتیجہ ہے۔

کرنل گریہم سرسید کی لائف میں ایک موقع پر لکھتے ہیں کہ "غدر کے زمانہ میں اور اُسکے بعد بہت مدت تک مسلمانوں پر ایک بدلی چھائی رہی۔ اُس خوفناک زمانہ کے تمام مکروہات اُن کی طرف منسوب کیے جاتے تھے اور کچھ شک نہیں کہ یہ تعصب (یعنی انگریزوں کا) زیادہ تر بے جا تھا۔ مسلمانوں کو اسکا بہت رنج تھا اور یہ بات اُن کو بُری معلوم ہوتی تھی۔ بظاہر کسی شخص نے اُن کی حمایت کی حامی نہیں بھری سید احمد خاں نے یہ مشکل کام اپنے ذمہ لیا اور جہانتک اسکی قدرت میں تھا اُسنے مسلمانوں کی بگڑی ہوئی بات کو پھر بنا دیا"

تھیوڈور مارلین اپنے اُس آرٹکل میں۔ جو سرسید کی وفات کے بعد مئی ۱۸۹۸ء کے کالج میگزین میں چھپا تھا۔ لکھتے ہیں کہ "غدر سے پہلے اور اُس کے بعد چند سال تک تقریباً تمام انگریز مسلمانوں کو بدگمانی کی نظر سے دیکھتے تھے اور اعتبار کے اعلیٰ عہدوں پر اُنکو ترقی دینے اور اُنکی خواہشوں کے ساتھ ہمدردی ظاہر کرنے پر کسی طرح رضامند نہیں ہوتے تھے۔ نہایت نمایاں انقلاب جو فی الحال اینگلو انڈینز کے خیالات میں ظاہر ہوا ہے یہ سرسید ہی کی تلقین کا نتیجہ ہے + + + + اُسنے مسلمانوں کے دل میں جہاں نفرت اور بدگمانی تھی وہاں اعتماد اور وفاداری کا درخت لگا دیا اور انگریزوں کو یقین دلا دیا کہ مسلمان وفادار ہیں"۔

اکیڈمی نام ایک ولایت کا اخبار مورخہ ۱۹۔ دسمبر ۱۸۸۵ء کرنل گریہم کی لائف آف سید احمد خاں پر ریویو کرتے ہوئے لکھتا ہے "کم سے کم اس قدر تسلیم کرنا ضروری ہے کہ اسلامی دنیا کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے کوئی دقیقہ فروگذاشت کرنا نہیں چاہیے۔ کروسیڈ کا زمانہ گذر گیا" اب اسلام دوسری جانب جوش ظاہر کر رہا ہے۔ اگرچہ اولڈفیشن مسلمان سویلزیشن کی ترقی کے مخالف ہیں مگر اسمیں ایک آزاد خیال گروہ بھی موجود ہے۔ یہ گروہ صرف ٹرکی ہی میں نہیں ہے بلکہ

ہندوستان میں بھی موجود ہے - اس ملک (یعنی انگلستان) کے لیے جو مسلمانوں کی سب سے زیادہ آبادی کا مالک ہے - نہایت ضروری ہے کہ اس امر کی نسبت عمدہ واقفیت حاصل کرے - اس سوال کے فیصلہ پر - کہ آیا اسلام اور شایستگی باہم موافقت رکھتے ہیں یا نہیں - پانچ کرور آدمیوں کی آیندہ زندگی کا مدار ہے - کیا یہ آبادی (یعنی ہندوستان کے مسلمان) روز بروز مخالف ہوتی جائیگی ؟ کیا اس کے سرگروہ ممبر جہالت کے ساتھ کسی دوسری جگہ ہمدردی کرینگے تاکہ ہمارے دشمنوں کے ہاتھوں میں - جو اور ملکوں میں ہیں - چلے جائیں ؟ اگر ایسا ہے تو انگلستان جسقدر جلد مصائب کے مقابلہ کے لیے تیار ہو اُسی قدر بہتر ہے - مگر اس معاملہ میں کرنل گریہم کی کتاب "سید احمد خاں" نے ایک خفیہ روشنی ڈالی ہے - یہ ایک کتاب ہے جو مغربی خیالات کی ہمدردی کا ایک عجیب و غریب تماشا دکھلاتی ہے - جو ایک انگریزی زبان سے ناواقف شیخ العرب کے خون نے ظاہر کیا ہے"

غرض کہ یہ خیال کرنا ٹھیک نہیں کہ سرسید کو جو کچھ کامیابی ہوئی وہ صرف اس وجہ سے ہوئی کہ اُنکی کوششیں زمانہ کے مقتضا کے موافق تھیں، بلکہ اُنکی کامیابی صاف اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ جو کوششیں استقلال، دانائی اور راستبازی کے ساتھ کی جاتی ہیں وہ زمانہ کے اقتضا پر غالب آسکتی ہیں -

سب سے بڑا ثبوت اس کا - کہ زمانہ کا تقاضا جب تک کوئی زبردست ہاتھ اُسکی پشتی پر نہو کچھ نہیں کرسکتا - یہ ہے کہ مدت دراز سے گورنمنٹ ہندوستان میں تعلیم نسوان جاری کرنا چاہتی ہے اور بیس پچیس برس سے تمام تعلیم یافتہ ہندو مسلمانوں میں اسکا جوش پھیلا ہوا ہے، اخباروں اور میگزینوں میں سب سے زیادہ اسی مضمون کا زور شور رہے، بیسیوں ناول اور رسالے اسی باب میں لکھے گئے ہیں اور لکھے جاتے ہیں، جابجا اسی غرض سے کمیٹیاں قایم ہیں ؛ اس سے زیادہ زمانہ کا تقاضا اور کیا ہو سکتا ہے ؟ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ آج تک جیسی کہ چاہیے کامیابی نہیں ہوئی کیونکہ اس کا کوئی زبردست حامی مثل سید احمد خان کے کھڑا نہیں ہوا -

ہمارے نزدیک سرسید کی کامیابی کا اصل سبب یہ تھا کہ اُنکی ذات میں وہ تمام خصلتیں اور اخلاق بالطبع موجود تھے جو ایک رفارمر کی ذات میں جمع ہونے ضرور ہیں - رفارمر کے لیے سب سے زیادہ ضروری چیز سچائی اور راستبازی ہے کہ جس بات کو وہ اپنے نزدیک قوم

کے حق میں بہتر سمجھے۔ اگرچہ ایک زمانہ اُس کا مخالف ہو۔ اُس کے ظاہر کرنے میں کچھ پس و پیش نہ کرے۔ راستبازی کی مثال بعینہ ایسی ہے جیسے ریختہ کی چنائی جو عین برسات کے موسم میں کی جائے؛ راستباز آدمی کو بلاشبہہ بہت سی مخالفتوں کا نشانہ بننا پڑتا ہے اور اسلیے اُس کی کامیابی میں بہت دیر لگتی ہے مگر جو ردّا ایک دفعہ رکھا گیا پھر اسکو جنبش نہیں ہوتی۔ سرسید کو اپنی راستبازی کی بدولت بعض اوقات۔ جیسا کہ اس کتاب میں جابجا بیان ہوا ہے۔ سخت خطرات پیش آئے ہیں مگر بہت جلد وہ تمام خطرے رفع ہو گئے اور راستی نے اپنا پائدار نقش دلوں پر بٹھا دیا۔ استقلال جسکی نسبت کہا گیا ہے کہ "الصبر مفتاح الفرج" وہ بھی بغیر راستبازی کے پیدا نہیں ہوتا کیونکہ جس کو اپنے کام پر بھروسہ نہیں ہوتا وہ کبھی اپنے ارادہ پر قایم نہیں رہ سکتا چنانچہ سرسید نے۔ جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں۔ سید مہدی علی خاں کو ولایت سے لکھا تھا کہ "جوں جوں مخالفوں نے نیکی کا مقابلہ کیا ہے تُوں تُوں نیکی بڑھتی گئی ہے پس اگر میرا کاروبار سچا اور میری نیت نیک ہے تو انشاء اللہ تعالےٰ اس میں کچھ نقصان نہیں ہونے کا"

اکثر خیال کیا جاتا ہے کہ گورنمنٹ میں سرسید کا رسوخ و اعتبار سب سے بڑھکر اُنکی کامیابی کا باعث ہوا ہے۔ بلاشبہہ مدرسۃ العلوم کے قایم کرنے اور اُسکو موجودہ حالت تک پہنچانے میں اس خیال کو ایک خاص حدتک صحیح مانا جا سکتا ہے مگر جس طرح سرسید کے رسوخ سے اُس کی تائید ہوئی ہے اسی طرح مزاحمت بھی کچھ کم نہیں ہوئی؛ اسی رسوخ و اعتبار کی بدولت ایک مدت تک سرسید کی نسبت لوگوں کو طرح طرح کی بدگمانیاں رہیں۔ ہزاروں آدمی یہ سمجھتے تھے کہ انگریزی تعلیم کی اشاعت سے مسلمانوں کو عیسائی یا لامذہب بنانا منظور رہے اور ہزاروں یہ خیال کرتے تھے کہ مدرسہ قوم کے فائدہ کے لیے قایم نہیں کیا گیا بلکہ اس لیے قایم کیا گیا ہے کہ انگریزی سلطنت کو زیادہ استحکام ہو۔ اگرچہ اس خیال کا دوسرا جز صحیح تھا مگر پہلا جز اس لیے غلط تھا کہ حالتِ موجودہ میں مسلمانوں کی قومی زندگی اسی بات پر موقوف ہے کہ انگریزی سلطنت کو زیادہ استحکام ہو۔

بہرحال سرسید کے رسوخ سے مدرسہ کو یقیناً بہت کچھ فائدہ پہنچا ہے۔ خصوصاً سرجان اسٹریچی کی گورنمنٹ نے سرسید کا حوصلہ ہی نہیں بڑھایا بلکہ اُنکے ارادوں میں جان ڈالی ہے اور جتنے لفٹنٹ گورنر اضلاع شمال مغرب میں اور جتنے وایسرائے کالج کے قیام کے بعد

آئے سب نے کالج پر مربیانہ توجہ مبذول رکھی ہے، مگر رفارمیشن کے عظیم الشان کام میں -
بجائے اس کے کہ یہ رسوخ ممد ومعاون ہوا ہو۔ اُسنے اور اُلٹی مزاحمت کی ہے ہر ایک
قوم اور خاصکر مسلمانوں کی قوم مذہبی خیالات کا مصلح اگر کسی کو تسلیم کر سکتی ہے تو اُسی
شخص کو کر سکتی ہے جس میں وہ تمام خصوصیتیں موجود ہوں جو مذہبی تقدس کے لیے
درکار ہیں نہ کہ ایسے شخص کو جس میں بظاہر اس قبیل کی کوئی حیثیت نہ پائی جائے بلکہ
سرتاسر اُس کی زندگی ایک دنیا دار آدمی کیسی زندگی ہو خصوصاً سلطنت میں تقرب اور رسوخ
پیدا کرنا۔ عام اس سے کہ مسلمانوں کی سلطنت ہو یا غیر مسلمانوں کی۔ مذہبی تقدس کے
بالکل خلاف سمجھا جاتا ہے باوجود اس کے سرسید نے لاکھوں مسلمانوں کے دل میں اپنی اکثر
اصلاحیں تہ نشیں کر دیں۔ پھر کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ گورنمنٹ میں اُنکا رسوخ اور اعتبار مطلقاً
اُنکی کامیابی کا باعث ہوا ہے۔

لیکن اگر فرض کر لیا جائے کہ سرسید کی تمام کامیابیوں کا مدار اسی رسوخ اور اعتبار پر تھا
تو بھی اصل سبب اُنکی راستبازی اور سچائی ٹھیرے گی کیونکہ برٹش گورنمنٹ میں ایک نیٹو کا
اِس قدر رسوخ و اعتبار پیدا کرنا۔ جب تک کہ اُسکی وفاداری اور خلوص کا سونا سخت امتحان
کی آگ پر تایا نہ گیا ہو۔ ہرگز ممکن نہیں۔

سب سے زیادہ اُنکے کاموں میں مدد اور اُنکے ارادوں کو تقویت اُنکے دوستوں نے
دی ہے اور یہ بھی ایک نتیجہ اُنکی راستبازی اور خلوص کا تھا۔ فی الواقع سرسید کو محض اپنی
صداقت اور بے ریا محبت کی بدولت ایسے سچے دوست اور اعوان و انصار ملے جو اس زمانہ
میں نادر الوجود اور عجائب روزگار سے تھے۔ شاید کسی کو یہ خیال ہو کہ سرسید کے اعوان و انصار
اُنکو اپنا مذہبی پیشوا سمجھکر اُنکے کاموں میں مدد دیتے تھے، سو اس سے زیادہ کوئی غلط خیال نہیں ہو سکتا
اُنکے دوستوں اور مددگاروں میں۔ جہانتک کہ ہم کو معلوم ہے۔ ایک شخص بھی ایسا نظر نہیں آتا
جو اُنکو اپنا مذہبی پیشوا جانتا ہو یا اُنکے تمام اقوال اور تمام رایوں کو تسلیم کرتا ہو۔ سرسید کے بہت
سے دوست ایسے بھی تھے جنکو قومی معاملات سے کچھ زیادہ دلچسپی نہ تھی بعض اُنکی کوششوں پر
ہنستے تھے اور اُنکی جد وجہد کو رائگاں سمجھتے تھے مگر ہر کام میں مدد دینے کو دل و جان سے حاضر
تھے۔ جب چندہ کی ضرورت ہوتی تھی پہلے دوستوں سے مانگا جاتا تھا پھر اور لوگوں کے
سامنے ہاتھ پسارا جاتا تھا۔ اگرچہ مقام اس بات کا مقتضی تھا کہ ان تمام بزرگوں نے جس

ذوق و شوق سے سرسید کے کاموں میں مدد دی ہے اور جس امنگ اور چاؤ سے مدرسۃ العلوم کے چندوں میں شریک ہوئے ہیں اور جو بیش بہا خدمتیں قوم کی اُن سے بن آئیں اُنکو مفصل بیان کیا جائے، خصوصاً اس وجہ سے کہ سرسید کی آخری تمنا - جو پوری نہ ہوئی یہ تھی کہ ایک کتاب بطور تذکرۂ احباب کے اپنے قلم سے لکھ جائیں؛ مگر امید ہے کہ جو شخص مدرسۃ العلوم کی ہسٹری لکھے گا وہ اس فرض کو فراموش نہ کریگا کیونکہ یہ ذکر اسی موقع سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔

لیکن ایک شخص جو سرسید کے کاموں کا صرف مددگار ہی نہ تھا بلکہ اس گاڑی کے ہانکنے میں گویا برابر کی جوڑ تھا - اگر اس موقع پر اُس کا ذکر قلم انداز کیا گیا تو ہمارے نزدیک سرسید کی کامیابی کا ایک بڑا سبب بیان کرنے سے رہ جائیگا - اُس شخص سے ہماری مراد محسن الملک سید مہدی علی خاں ہیں جو تمام قوم کے اتفاق سے سرسید کے بعد اُنکے جانشین ہوئے ہیں - یہی وہ شخص ہے جسنے سب سے پہلے سرسید کو سمجھا، اُنکی سچائی کو پرکھا، اُنکے منصوبوں کی تھاہ دریافت کی اور اُنکے مقاصد کی عظمت کا اندازہ کیا اُن کا اُسوقت ساتھ دیا جب کوئی ساتھی نہ تھا، اور اُسوقت مدد دی جب کسی سے مدد کی امید نہ تھی - سرسید ولایت میں خطبات احمدیہ لکھ رہے تھے اور سید مہدی علی ہندوستان سے اُسکے لیے میٹریل بھیجتے تھے وہ ولایت میں اُس کو چھپوا رہے تھے اور یہ ہندوستان سے اُسکی چھپائی کے لیے چندہ وصول کر کر کے روانہ کرتے تھے - جب سرسید ولایت سے واپس آئے اور کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان قایم کرنی چاہی اُسوقت اُنپر عجب مایوسی کا عالم تھا، جو منصوبے دل میں باندھ رکھے تھے اُنمیں سے کسی کے پورا ہونے کی امید نہ تھی - سید مہدی علی مرزاپور سے بنارس گیے اور سرسید کی ڈھارس بندھوائی، چنانچہ کمیٹی بڑی دھوم دھام سے قایم ہوئی جب کمیٹی نے - اس بات کے دریافت کرنے کو کہ مسلمان سرکاری کالجوں اور اسکولوں میں کیوں نہیں پڑھتے - انعامی رسالے لکھوانے کا اشتہار دیا سید مہدی علی نے نہایت کوشش سے ایک مبسوط اُس سے لکھا جو سب رسالوں میں اول درجہ کا تسلیم کیا گیا اور پانسو کا انعام جس کے وہ مستحق تھے - اپنے سے نیچے درجہ کا رسالہ لکھنے والے کو دلوایا - جب تہذیب الاخلاق جاری ہوا اور سرسید نے رفارمیشن کا کام علی الاعلان شروع کیا سید مہدی علی پہلے شخص تھے جنہوں نے نہایت دلیری سے سرسید کی تائید میں مضامین لکھنے پر کمر باندھی

جو معزز خطاب مولوی اور واعظ سرسید کو دے رہے تھے سید مہدی علی نے بھی اُنکا استحقاق پیدا کیا اور کفر کے فتووں کی بوچھار - جو اکیلے سید پر پڑ رہی تھی - آدھی اپنے سر پر لی -
سرسید کی تحریریں اکثر نشتر کا کام کرتی تھیں - مگر سید مہدی علی کی تحریروں نے مرہم کا کام کیا ؛ سرسید ہمیشہ مسلمانوں کو نفرین و ملامت کرتے تھے ، اگلے علما کی غلطیاں ظاہر کرتے تھے جو کچھ اپنی تحقیق ہوتی تھی - اکثر بغیر اس کے کہ سلف کے اقوال سے اُس پر استشہاد کریں - حوالۂ قلم کر دیتے تھے ، سید مہدی علی نے مسلمانوں کے اسلاف کے کارنامے بیان کر کے قوم کے دل بڑھائے اور جو کچھ سرسید کی تائید میں لکھا مستند اور معتبر کتابوں کے حوالہ سے لکھا - اُنکے اکثر مضامین بجائے خود بڑے بڑے رسالے ہیں جو نہایت چھان بین اور تلاش کے بعد لکھے گئے ہیں - تہذیب الاخلاق کے مضامین لکھنے میں باوجود اسکے کہ اُنکی صحت ہمیشہ نازک حالت میں رہی ہے وہ اسقدر منہمک ہو گئے تھے کہ سرکاری کام میں حرج واقع ہونے لگا - سُنا ہے کہ اُنکے بالادست افسر کو جب یہ حال معلوم ہوا تو اُسنے سرسید کو لکھا کہ مہدی علی کو سمجھا ؤ وہ اپنے کام کی طرف متوجہ ہوں ورنہ مجبوراً اُنکی نسبت رپورٹ کرنی پڑے گی -

مدرسۃ العلوم کو جو مالی مدد اُنہوں نے اپنی جیب سے اور اپنی کوشش سے پہنچائی اُسکا اندازہ کرنا مشکل ہے - سرسید سے کیا مدرسہ کے انتظام کے متعلق اور کیا مذہبی مسائل کے متعلق وہ اکثر اختلاف کرتے تھے مگر مخالفت کبھی نہیں کی - ہمیشہ سرسید کا دل ہاتھ میں رکھا اور مدرسہ کی مصلحت اسی میں سمجھی کہ سرسید کی رائے کا ہر حال میں اتباع کیا جائے - اگر سرسید نے انکی رائے کے خلاف بھی کوئی تجویز پیش کر دی اُس کو بھی طوعاً و کرہاً منظور کر لیا اور یہ سمجھا کہ اگر اُنکی رائے فی الواقع غلط ہے تو اسکا تدارک ممکن ہے - لیکن اگر مزاحمتوں کے سبب مدرسہ کے کام سے اُنکا جی چھوٹ گیا تو اسکا کچھ تدارک نہیں ہو سکتا -

حیدرآباد سے آکر اُنہوں نے علیگڈھ ہی میں رہنا اختیار کیا اور بہت سے عملی کام مدرسہ کے متعلق انجام دیے - محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کو ترقی دینے کی تدبیریں کیں اور اُس کی طرف مسلمانوں کو خاص توجہ دلائی اور خود ہر ایک اجلاس میں نہایت مفید لکچر اور اسپیچیں دیں پھر بمبی میں جاکر وہاں کے مسلمانوں کو مدرسہ اور کانفرنس کی طرف متوجہ کیا یہانتک کہ اُنہوں نے کانفرنس کو بمبئی میں بُلایا مگر سرسید کے کبرسن کے سبب وہاں کانفرنس کا منعقد

ہونا موقوف رہا۔ سرسید کی وفات سے پہلے وہ پھر علیگڑھ میں آئے اور اُنکے اخیر دم تک وہیں رہے اور اس آخری رفاقت میں بھی دوستی اور محبت کا حق پورا پورا ادا کیا سرسید کے وفات کے بعد جو غیر معمولی مستعدی اور سرگرمی قومی خدمات میں اُنسے ظہور میں آئی وہ اس بات کا کافی ثبوت ہے کہ اُس مرحوم کے بعد کوئی شخص محسن الملک سے زیادہ اُنکی جانشینی کے لیے مناسب نہ تھا۔ اُنھوں نے اپنی صحت اور طاقت سے بڑھکر چندہ جمع کرنے میں کوشش کی اور توقع سے زیادہ کامیابی حاصل کی۔

باوجود ان تمام خدمات کے اپنے ہر ایک کام کو ہمیشہ سرسید ہی کی طرف منسوب کیا اور اپنے تئیں ایک مشین سے زیادہ کبھی کچھ نہ سمجھا۔ اٹاوہ کے ایڈریس میں جب لوگوں نے اُنکی قومی خدمات کی تعریف کی اُنہوں نے اُسکے جواب میں صاف صاف کہدیا کہ ان خدمات کو میری طرف منسوب کرنا تہمت ہے، اس تعریف کا سید احمد خاں کے سوا کوئی مستحق نہیں سرسید کے بعد اُنکا جانشین بننے کی۔ جہانتک کہ ہم کو معلوم ہے۔ اُن کو مطلق خواہش نہ تھی مگر تقریباً تمام ٹرسٹی، تمام کالج اسٹاف، تمام کالج سٹوڈنٹس، صوبہ کے تمام اعلیٰ احکام اور افسر جو کالج کے بہی خواہ تھے، تمام ڈیلیگیٹ۔ جو ۱۸۹۸ء میں بمقام لاہور محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میں شریک ہوئے، تمام مسلمان اخبار اور عموماً تمام مسلمان۔ جنکو قومی معاملات سے دلچسپی تھی سب اس بات پر متفق تھے کہ اُن کو کالج ٹرسٹیز کا سکرٹری بنایا جائے اسلیے اُنکو اس کے سوا کچھ چارہ نہ تھا کہ اس جوئے کو اپنے کندھے پر رکھیں۔

الغرض سرسید کو ایسے دوستوں کا ملنا۔ جنکا نواب محسن الملک کو ایک عمدہ نمونہ سمجھنا چاہیے اُن کی کامیابی کا سب سے بڑا سبب تھا اور یہ محض اُنکی راستبازی اور قوم کی سچی ہمدردی کا نتیجہ تھا کہ ایسے ایسے مرغ زیرک خود بخود آکر جال میں پھنسجاتے تھے اور اُس زمانہ پر جو آزادی میں گذرا تھا افسوس کرتے تھے۔ جیسا کہ نظیری نے کہا ہے ؎

نالہ از بہر رہائی نہ کند مرغ اسیر ✦ خورد افسوس زمانے کہ گرفتار نبود

ایک اور خداساز تائید سرسید کے منصوبوں کی یہ ہوئی کہ پنجاب کے مسلمان جنہوں نے برٹش گورنمنٹ کی بدولت ایک مدت کے بعد نئی زندگی حاصل کی تھی اور اسلیے انگریزی تعلیم اور انگریزی خیالات کو خیر مقدم کہنے کے لیے تیار بیٹھے تھے۔ سرسید کی منادی پر وہ اسطرح دوڑے جیسے پیاسا پانی پر دوڑتا ہے۔ اُنہوں نے صرف یہی نہیں کہ مدرسۃ العلوم کو مالی مدد

پہنچائی۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ سرسید اور اُنکے کاموں کی کسی صوبہ نے عام طور پر ایسی قدر نہیں کی جیسی پنجاب والوں نے کی۔ کالج میں اُنھوں نے ہر ایک صوبہ سے زیادہ لڑکے تعلیم کے لیے بھیجے، ایجوکیشنل کانفرنس کے ساتھ انھوں نے سب سے زیادہ دلچسپی ظاہر کی، سرسید کی ہر قسم کی اصلاحیں اُنھوں نے سب سے زیادہ قبول کیں اور قوم کی بھلائی کے کاموں میں سب سے بڑھکر اُنھوں نے سرسید کی تقلید اختیار کی؛ یہانتک کہ اُنکو زندہ دلانِ پنجاب کے لفظ سے تعبیر کیا گیا۔ اُنھوں نے ہندوستان کے اور حصوں کی طرح سرسید کو مسلمانوں کی صرف دنیوی ترقی کا خواستگار مگر دین کا مخرب نہیں ٹھیرایا بلکہ اُن کو دُنیا' اور دین دونوں کا سچا خیرخواہ اور خیراندیش سمجھا۔ حق یہ ہے کہ قومی خدمات کی داد جو قوم کی طرف سے سرسید کو ملنی چاہیے تھی اُس کا حق پنجاب کے مسلمانوں کے برابر کسی صوبہ سے ادا نہیں ہو سکا اور جو تقویت برٹش گورنمنٹ کی امداد اور حضور نظام کی فیاضی اور بعض دیگر ریاستوں کے عطیوں سے ہوئی پنجاب کے عام مسلمانوں سے اُس سے کچھ کم تقویت سرسید کو نہیں پہنچائی۔

سرسید کی کامیابی کے اسباب میں اگر کالج اسٹاف کا ذکر نہ کیا جائے تو یہ ایک بہت بڑی ناانصافی ہو گی؛ بخصوصاً یوروپین اسٹاف کے بعض ممبروں نے باوجود غیر قوم اور غیر مذہب ہونے کے کالج کے انتظام اور اُسکی ترقی اور فروغ دینے میں درحقیقت سرسید کے دست و بازو کا کام کیا ہے۔ اُنھوں نے صرف اپنے منصبی فرائض پر۔ جن کے لیے وہ بلائے گئے تھے۔ بس نہیں کی بلکہ سرسید کے خاص مشن میں۔ جسپر کالج کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ معتدبہ حصہ لیا ہے۔ اُنھوں نے کالج کو گورنمنٹ اور مسلمانوں کا معتمد علیہ بنایا اور اُس کے ساتھ ایک خاص تعلق پیدا کیا جسکی وجہ سے سرسید کالج اور بورڈنگ ہوس کی طرف سے بالکل مطمئن اور فارغ البال ہو گئے۔ اُنھوں نے اپنے اقوال اور افعال سے ثابت کر دیا کہ وہ مسلمانوں کی درماندہ قوم کے سچے خیرخواہ اور اُنکے ترقی کے دل سے آرزومند ہیں۔ مگر درحقیقت یہ سب نتیجے اُسی مرحوم کی راستبازی اور صاف دلی کے تھے، اگر وہ یوروپین اسٹاف پر پورا پورا اعتماد نہ کرتے اور کالج اور بورڈنگ ہوس کی باگ اُنکے حوالہ نہ کر دیتے تو ہرگز امید نہ تھی کہ یوروپین پروفیسر اپنے معمولی فرائض سے ایک انچ آگے بڑھنے کا ارادہ کرتے۔

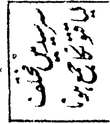
اگر سرسید کی ذات میں صرف راستبازی ہی کی صفت ہوتی اور اُس کے ساتھ فراخ حوصلگی اور کشادہ دلی نہ ہوتی تو شاید اُنکی کامیابی میں زیادہ دیر لگتی بلکہ ممکن تھا کہ اُن کو اپنی کوشش کا پھل اپنی زندگی میں دیکھنا نصیب نہ ہوتا مگر خوش قسمتی سے اُن کے ظرف میں زہر و انگبیں دونوں موجود تھے گو اُن کی راست گوئی نے بہت سے لوگوں کو بدکایا - مگر فراخ حوصلگی اور کشادہ دلی نے ایک زمانہ کو اُنکی طرف جھکا دیا - اُنہوں نے ابتدا سے اخیر تک جس کام کے لیے چندہ کھولا اُسمیں سب سے پہلے خود سبقت کی اور اپنی بساط اور حیثیت سے مراتب بڑھکر دیا وہ ایک بانی مدرسہ کی نسبت اپنے ایک دوست کو ولایت سے لکھتے ہیں۔

" افسوس کہ آپ نے اپنی تقریر میں یہ نہ فرمایا کہ خود بانی نے - جو فضل الٰہی سے اپنے شہر کے تمام مسلمانوں میں زیادہ ذی مقدور ہیں - کسقدر روپیہ دیا، اُسوقت البتہ آپ کی لعنت ملامت محتاجانِ شہر پر - جو نانِ شبینہ کو محتاج ہیں - درست و بجا ہوتی - میں سوسائٹی کے لیے سب سے بھیک مانگتا ہوں مگر دس ہزار کی سو روپیہ مجھ فقیر نے اپنے پاس سے دیا ہے؛ پس ایسی حالت میں اگر میں آپ سے سو روپیہ دینے کو کہوں تو کچھ مضائقہ نہیں "

اسکے سوا عزم جزم اور دلیری - جو ہر کامیابی کی جڑ ہے - اور دنیا کے تمام کامیاب شخصوں میں ہمیشہ دیکھی گئی ہے - سرسید میں معمولی آدمیوں سے بہت بڑھکر تھی - وہ مشکل سے مشکل کام کو - جب ضروری سمجھ لیتے تھے - بغیر تردد اور تذبذب کے اُسکو فوراً کر بیٹھتے تھے اور جب کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کا قطعی فیصلہ کر لیتے تھے پھر کبھی اُس میں پس و پیش نہ کرتے تھے - اس کے سوا ان میں اور اکثر خصوصیتیں ایسی تھیں جنکے بغیر کوئی چھوٹے سے چھوٹا اور بڑے سے بڑا کام دنیا میں انجام نہیں پا سکتا جیسے مستعدی، جفاکشی، فرائض کی پابندی، حزم و احتیاط وغیرہ وغیرہ -

ایک اور خداداد قابلیت انکی فصاحتِ بیان تھی جس میں سچی ہمدردی کے جوش نے کشش مقناطیسی پیدا کر دی تھی اور چھاپے کی آزادی نے اُس کے لیے ایک میدان صاف کر دیا تھا اگرچہ اس میں شک نہیں کہ اگر آزادی کا زمانہ نہ ہوتا اور گورنمنٹ کی طرف سے زبانوں پر مہر لگی ہوئی ہوتی تو سرسید کو اس طرح کھلے بندوں اپنی رائیں ظاہر کرنیکا موقع نہ ملتا مگر یہ بات فراموش کرنی نہیں چاہیے کہ جس وقت اُنہوں نے رسالۂ اسباب بغاوت لکھ کر گورنمنٹ میں پیش کیا وہ ایک ایسا نازک وقت تھا کہ اُسوقت کسی کو آزادانہ رائے

ظاہر کرنے کی جرات نہ تھی، چنانچہ کسی قدر انکو اپنی جرات اور دلیری کا خمیازہ بھگتنا بھی پڑا۔ بعض جلیل القدر انگریز اُنکے سخت مخالف ہو گئے جس سے کچھ دنوں وہ مارشل لا کی زد میں رہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر آزادی کا زمانہ نہ ہوتا تو بھی شاید یہ چشمہ اُبلے بغیر نہ رہتا۔



ایک شریف اور لائق انگلشمین نے۔ جب کہ سرسید زندہ تھے۔ ہمارے سامنے اُنکا ذکر کرتے وقت یہ کہا تھا کہ "یوروپ میں بلاشبہ ایسے لوگ کثرت سے پائے جاتے ہیں جو کسی خاص علم یا فن یا صنعت میں فرد کامل ہیں اور جن کا نظیر ایشیا میں ملنا مشکل ہے لیکن ایسے جامع حیثیات اشخاص۔ جیسے کہ سید احمد خاں ہیں۔ وہاں بھی کمیاب ہیں" اسی لیے الہ آباد میں ایک عام جلسہ کے موقع پر ایک لایق اور فاضل پنڈت نے یہ الفاظ[1] کہے تھے کہ "ہم مسلمانوں سے دولت میں زیادہ ہیں، تعلیم میں زیادہ ہیں، تعداد میں زیادہ ہیں، مگر افسوس ہے کہ ہم میں کوئی سید احمد خاں نہیں ہے؛ بلکہ اگر ہم میں بھی مل کر ایک ہو جائیں تو بھی سید احمد خاں کے برابر نہیں ہو سکتے"

فی الحقیقت یہ بات کچھ کم تعجب انگیز نہیں ہے کہ جس شخص کو تعلیم و تربیت کے زمانہ میں اسکول کی ہوا تک نہ لگی ہو اور جسے چالیس برس کی عمر تک تعلیم میں کسی قسم کا تجربہ حاصل نہ کیا ہو وہ تعلیمی معاملات میں ایسا امتیاز پیدا کرے کہ علمی دنیا میں اُسکو مسلمانوں کی تعلیم کا پروفٹ خیال کیا جائے۔ یا جس شخص نے ایک ایسی سوسائٹی میں ہوش سنبھالا ہو۔ جہاں دو برس سے کسی نے پالٹکس کا خواب تک نہ دیکھا تھا۔ وہ بغیر اس کے کہ کسی پولٹکل خدمت پر مامور رہا ہو انگلش گورنمنٹ میں ایک رکن سلطنت خیال کیا جائے۔ یا جو شخص مذہبی تعلیم میں متوسط سے بھی کم درجہ رکھتا ہو اور جس نے علوم جدیدہ کا ایک حرف کسی اُستاد سے نہ پڑھا ہو وہ مذہب اور سائنس میں مصالحت کرانے کا بیڑا اُٹھائے اور اسلام میں ایک نئے علم کلام کی بنیاد ڈال جائے۔ اسی طرح اور مختلف لیاقتیں جو اس شخص کی ذات میں جمع تھیں اُن میں سے ایک بھی ایسی نہیں معلوم ہوتی جو تعلیم یا اکتساب سے حاصل ہوئی ہو۔

اگرچہ سرسید کی تمام لیاقتوں کا اصل مخرج اُنکی غیر معمولی قابلیت اور استعداد تھی مگر اُس قابلیت کو قوت سے فعل میں لانے والی زمانہ کی ضرورتیں، اور اُن ضرورتوں کا پورا

[1] خان بہادر شمس العلما مولوی ذکاء اللہ نے اپنی ایک تحریر میں یہ قول نقل کیا ہے ۱۲

پورا احساس اور قوم میں اُن ضرورتوں کے رفع کرنے والوں کا قحط تھا جسنے سرسید کو۔ اُس معمار کی طرح جو تعمیر کے لیے آپ ہی اینٹیں پکائے، آپ ہی مصالح تیار کرے، آپ ہی پاڑ باندھے آپ ہی ٹوکری ڈھوئے، آپ ہی نقشہ بنائے اور آپ ہی عمارت چنے۔ ایک سر و ہزار سودا کا مصداق بنا دیا تھا۔ دنیا میں عموماً کام کرنے والے لوگ الگ ہوتے ہیں اور سوچنے والے الگ، ایک مصنف مشکل سے معماری و سنگتراشی کی طرف متوجہ ہو سکتا ہے۔ عمدہ لکھنے والے اکثر عمدہ بولنے والے نہیں ہوتے، مذہبی تحقیقات میں مصروف رہنے والوں کو ملکی معاملات سے بہت کم لگاؤ ہوتا ہے؛ مگر جہاں سب چیزوں کی ضرورت ہو اور ایک کے سوا کوئی اُس ضرورت کا احساس کرنے والا نہ ہو وہاں سب کام اُسی ایک کو کرنے پڑتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ سرسید کبھی ایک کام پر ہاتھ ڈالتے تھے کبھی دوسرے کام کی طرف متوجہ ہوتے تھے، ایک زمانہ میں اُنھوں نے اُردو ڈکشنری لکھنے کا ارادہ کیا، پھر اُسی زمانہ میں اُردو لٹریچر کی تاریخ لکھنے کے لیے میٹریل جمع کیا، اُس سے پہلے وہ صوبۂ شمال مغرب میں ایک عظیم الشان یتیم خانہ کی بنیاد ڈالنے والے تھے، انگریزی زبان سے علوم و فنون کی کتابیں ترجمہ کرنے کے لیے اُنھوں نے بڑے بڑے سامان کیے تھے، اگرچہ یہ سب کام ادھورے رہے مگر ان باتوں سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ جہاں قومی ضرورتیں ایک شخص کے سوا دوسروں کو محسوس نہیں ہوتیں۔ وہاں ایک فرد واحد کو کیا کیا کرنا پڑتا ہے۔

بہرحال اس میں شک نہیں کہ سرسید کی فطرت میں مختلف بلکہ متضاد کاموں کے کرنے کی قابلیت تھی جکی نسبت مسٹر آرنلڈ نے سرسید کی وفات کے بعد اپنی اسپیچ میں بمقام لاہور یہ الفاظ کہے تھے کہ " دنیا میں بڑے آدمی کثرت سے گذرے ہیں مگر اُن میں ایسے بہت کم نکلیں گے جن میں یہ حیرت انگیز اوصاف اور لیاقتیں جمع ہوں۔ وہ (یعنی سرسید) ایک ہی وقت میں اسلام کا محقق تعلیم کا حامی، قوم کا سوشل رفارمر، پولٹیشن، مصنف اور مضمون نگار تھا" اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ بقدر ضرورت اُنکی چند نمایاں لیاقتوں کا اس عنوان کے ذیل میں جدا جدا ذکر کریں۔

اگرچہ بظاہر سرسید کے پولٹکل ورکس میں چند تحریروں اور اسپیچوں کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا مگر درحقیقت۔ جیسا کہ اُنکی بائیوگرفی سے ثابت ہوتا ہے ۱۸۵۷ء کے بعد جو کچھ اُنھوں نے لکھا یا کہا یا کیا اُسکا بہت بڑا حصہ مسلمانوں کی پولٹکل حالت کی

اصلاح سے علاقہ رکھتا ہے - اس شخص نے نہ انگریزی تعلیم پائی تھی - جس کے بغیر انگریزی طرز حکومت کا ذہن نشیں ہونا قریب ناممکن کے تھا - اور نہ ملک میں کوئی نظیر کسی ایسے پولیٹیشن کی دیکھی جسکی تقلید کچھ کام آتی، اور نہ گورنمنٹ کی کسی ایسی خدمت پر مامور رہا جہاں ملکی معاملات کا کچھ تجربہ حاصل ہوتا؛ باوجود اسکے اُس نے اپنی مآل اندیش اور سلیم طبیعت سے خود ہی اس مشکل کو حل کر لیا - اور ایک ایسا پولٹکل کورس اختیار کیا جو بالکل صحیح اور بے خطا تھا -

وہ سلطنت مغلیہ کے ایک قدیم متوسل گھرانے کا ممبر تھا اور خود دارالخلافہ کی خاک سے پیدا ہوا اور قلعۂ معلی کے سایہ میں نشو ونما پائی؛ اس لیے یہ ایک نیچرل بات تھی کہ فاتح قوم کی حکومت کو وہ ناگواری کی نظر سے دیکھتا - مگر اس کی عقل اُسکی طبیعت پر غالب تھی، اسلیے قومی تعصبات اُسکو مغلوب نہیں کر سکے - اُس نے دیکھا کہ ہندوستان سے مسلمانوں کی حکومت کا اُٹھ جانا کوئی اتفاقی یا غیر متوقع امر نہ تھا بلکہ فی الحقیقۃ اُنمیں حکمرانی کی لیاقت باقی نہیں رہی تھی اور اُنکا دور پورا ہو چکا تھا اور اس لیے ضرور تھا کہ ہندوستان پر کوئی دوسری قوم حکمراں ہو - اُس نے انگریزی طرز حکومت کو نہایت غور سے دیکھا اور اس بات کا فیصلہ کر لیا کہ ہندوستان کے حق میں جہاں مختلف مذہب اور مختلف نسل کی قومیں آباد ہیں - اور خاصکر مسلمانوں کے حق میں - جو بتیس دانتوں میں زبان کی مانند ہیں - کسی قوم کی حکومت انگریزی حکومت سے بہتر نہیں ہو سکتی - پس بجاے اسکے کہ اُسنے برٹش حکومت کو ناگواری کی نظر سے دیکھا ہو - اُسکو مسلمانوں کی حکومت کا نعم البدل سمجھا اور اوسکی خیر خواہی کو ملک اور قوم کی خیر خواہی کا ایک سب سے عمدہ ذریعہ خیال کیا -

وہ جسقدر انگلش قوم کی دانشمندی اور شائستگی سے واقف تھا اُس سے زیادہ اُسکی ملکی اور جنگی طاقت سے باخبر تھا - اس کو غدر کے نازک موقع پر جب کہ فی الواقع سلطنت کے ارکان متزلزل ہو گئے تھے اور بڑے بڑے سمجھدار آدمیوں کو یہ امید نہ رہی تھی کہ ہندوستان میں انگریزی تسلط پھر قایم ہو گا - اگرچہ اپنی جان کے بچنے کی بہت کم امید تھی مگر انگریزی تسلط کے جلد از سر نو قایم ہو جانے کا پورا یقین تھا - اُسکے ایک دوست - جو اُسوقت بجنور میں موجود تھے - اُنکا بیان ہے کہ "عین اُس بدعملی کے وقت - جبکہ تمام روہیلکھنڈ میں کوئی یوروپین یا یوریشین باقی نہ تھا - سید احمد خاں ہمیشہ یہ کہا کرتے تھے کہ کم و بیش ایک سال بعد تمام ملک میں انگریزی

تسلط بدستور قایم ہوجائیگا۔ اور گورنمنٹ کے بے شمار خیر خواہوں میں کسی کے چہرہ سے وہ اطمینان اور استقلال ظاہر نہیں ہوتا تھا جیسا سرسید کے چہرہ سے ظاہر ہوتا تھا" ہم پہلے حصہ میں لکھ چکے ہیں کہ سرسید نے جب کہ تمام ضلع بجنور میں نواب محمود خاں کی دوہائی پھر رہی تھی۔ نواب کے مونہ پر صاف کہدیا تھا کہ انگریزی عملداری جانے والی نہیں ہے، آپ ملک گیری کا خیال دل سے نکال ڈالیں۔ اور جب کہ سرسید کا اثاث البیت اور کتابیں اور سب کچھ بجنور میں لٹ چکا تھا اور جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ وہ تاریخ سرکشی بجنور کے لیے نہایت اطمینان کے ساتھ میٹریل جمع کرتے جاتے تھے اور روزانہ تمام حالات قلمبند کرتے تھے اور تمام تحریریں جو کہ وہ نواب یا چودھریوں کو لکھتے تھے، جو اُنکے پاس سے وصول ہوتی تھیں، یا وہ خود آپس میں ایک دوسرے کو بھیجتے تھے سب بہم پہنچا کر اپنی کتاب میں درج کرتے تھے ایسا اطمینان سوا اُس شخص کے جو ملکی معاملات میں پُرانا تجربہ کار ہو یا جسکی رائے ایسے امور میں فطرۃً سلیم واقع ہوئی ہو۔ دوسرے کو ہرگز نہیں ہوسکتا۔

سرسید کی پولٹکل قابلیت پر اس سے زیادہ اور کیا شہادت ہوسکتی ہے کہ اُسنے غدر کے بعد اینگلو انڈین اخباروں اور اینگلو انڈین افسروں کی عام رائے کے برخلاف اپنی کتاب اسباب بغاوت میں نہایت زور شور کے ساتھ اس بات کی تردید کی کہ ۱۸۵۷ء کا غدر ایک ملکی بغاوت تھی یا اُسکی بنیاد برٹش حکومت کے خلاف کسی عام سازش پر تھی؛ اور اس امر کے ثابت کرنے میں کامیاب ہوا کہ اس سرکشی کا اصل باعث محض سپاہیوں کی عدول حکمی تھی جسنے رفتہ رفتہ اُن عام غلط فہمیوں کے سبب جو گورنمنٹ کی نسبت ملک میں پھیلی ہوئی تھیں۔ ملکی بغاوت کی شکل اختیار کرلی تھی۔ اُس نے جو اسباب ان غلط فہمیوں کے بتائے اُنپر پارلیمنٹ میں مدت تک مباحثے رہے اور آخرکار اُنمیں سے اکثر بالاتفاق تسلیم کیے گئے، یہانتک کہ گورنمنٹ نے اُنکا فوراً تدارک کیا۔

سرسید نے اس کتاب میں گورنمنٹ پر بہ نسبت نیشنل کانگرس کے کچھ کم نکتہ چینی نہیں کی مگر سرسید کی نکتہ چینی کئی باتوں میں کانگرس سے مختلف تھی۔ سرسید نے جو الزامات گورنمنٹ پر عاید کیے تھے اُنکی اطلاع گورنمنٹ اوف انڈیا اور پارلیمنٹ کے سوا کسی متنفس کو نہیں ہوئی اور کانگرس نے جو الزام گورنمنٹ پر لگائے اُنکی تمام ملک میں منادی کی گئی سرسید نے رعایا اور گورنمنٹ کی غلط فہمیاں دور کرنے میں کوشش کی اور کانگرس نے

غلط فہمیوں کے پھیلانے میں۔ سرسید نے اُن باتوں کی خواہش کی جن سے تمام ملک کا فائدہ متصور تھا اور کانگرس نے زیادہ تر اُن باتوں پر زور دیا جنسے صرف تعلیم یافتہ جماعتوں کو فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ سرسید کی تمام خواہشوں میں گورنمنٹ اور رعایا دونوں کی مصالح ملحوظ رکھی گئی تھیں اور کانگرس کی اکثر خواہشیں گورنمنٹ کی مصالح ملکی کے برخلاف تھیں۔ اسی لیے سرسید کی اکثر شکایتوں کا جوکہ اُسنے بنفس واحد اپنی طرف سے پیش کی تھیں۔ فوراً تدارک کیا گیا اور کانگرس کو۔ باوجودیکہ وہ تمام ملک کی قائم مقامی کا دعوے کرتی ہے۔ آجتک[1] ایک بات کے سوا جس کی بنیاد قانونی کونسل میں محض سرسید کی تحریک سے ۱۸۶۱ء میں پڑچکی تھی کسی بات میں نمایاں کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ چنانچہ اخبار سینیٹ جیمس بجٹ میں سرسید کی کتاب پر یہ ریمارک کیا گیا تھا کہ "ہمارے نزدیک سید احمد خاں کی شکایتوں کا اثر بہت جلد اور بہت وسعت کے ساتھ ہوا ہے بہ نسبت اُن شکایتوں کے جو لال موہن گھوس اور اُسکے اسکول کے نوجوان آدمی نہایت فصاحت کے ساتھ کرتے ہیں"

ایک اور ثبوت سرسید نے اپنی پولٹکل قابلیت کا ۱۸۷۱ء میں اُسوقت دیا جب کہ ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب "اور انڈین مسلمانز" نے ہندوستان سے لیکر انگلستان تک تمام حکمران قوم کے دل میں مسلمانوں کی طرف سے ہمیشہ کے لیے بدگمانی کا بیج بو دیا تھا۔ وہ تیرہ برس سے برابر اس کوشش میں تھے کہ جو بے اصل شکوک و شبہات حکمران قوم کے دل میں مسلمانوں کی نسبت پیدا ہوگئے ہیں اُن کو رفع کیا جائے اور جہانتک ممکن ہو انگریزوں اور مسلمانوں میں صفائی اور خلوص اور دوستانہ میل جول کو ترقی دیجائے۔ مگر ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب اُن غلط فہمیوں کو اور تقویت دینے والی اور گویا کہ سرسید کی تیرہ برس کی کوشش کو برباد کرنے والی تھی۔ اگرچہ۔ جیسا کہ پہلے بیان ہوچکا ہے۔ سرسید کو اسوقت کالج کی ابتدائی مشکلات کا سامنا تھا اور وہ رات دن اسی ادھیڑبن میں مصروف رہتے تھے باوجود اسکے کتاب مذکور کا شایع کرنا تھا کہ اُنہوں نے سب کام چھوڑکر اُس پر ریویو لکھنا اور پاینیر میں اُسکو چھپوانا شروع کیا۔ اس ریویو نے ڈاکٹر ہنٹر کی غلطیاں اور مسلمانوں کے مذہب سے اُنکی ناواقفیت انگریزوں کے دل میں تہ نشین کردی اور اس غلط خیال کو کہ اسلام بغاوت کی تعلیم دیتا ہے اور وہابی مسلمان گورنمنٹ کے لیے خطرہ کی چیز ہیں اُن کے دل سے

---

[1] یعنی لیجس لیٹو کونسل میں ہندوستانیوں کا بذریعہ الکشن کے ممبر مقرر ہونا ۱۲

حرف غلط کی طرح مٹا دیا - اُس نے اس غلط فہمی ہی کو رفع نہیں کیا بلکہ ضمناً یہ بھی ثابت کر دیا کہ ایسی نازک حالت میں جیسی کہ اُسوقت ہندوستان کی حالت تھی - ایسی تحریریں شایع کرنا جو حاکم و محکوم میں تفرقہ ڈالنے والی، حاکموں کے غصہ کو مشتعل کرنے والی اور محکوم قوم کو مایوس کرنیوالی ہوں - سراسر مصالح ملکی کے برخلاف ہیں - یہی وجہ تھی کہ سرسید کا ریویو نکلنے کے بعد ڈاکٹر ہنٹر نے اس مضمون کے متعلق پھر سانس تک نہیں نکالی اور انگریزی اخباروں نے بجاے اس کے کہ سرسید کی تردید کرتے - نہایت شد و مد کے ساتھ اُن کی تائید کی اور اُس بے چینی کی حالت میں جو حکمراں گروہ میں عموماً پھیلی ہوئی تھی - سرسید کے ریویو کا نکلنا نہایت غنیمت سمجھا گیا -

اگرچہ سرسید کی مذکورہ بالا تحریروں سے ملک اور قوم اور خود گورنمنٹ کے حق میں بہت عمدہ نتایج پیدا ہوئے - لیکن اُنکی اعلیٰ درجہ کی پولٹکل قابلیت کا بھید درحقیقت اینگلو اورنٹیل کالج میں چھپا ہوا ہے - اگر کوئی اصلی چیز مسلمانوں کو پولٹکل بے وقعتی سے نکالنے والی اور گورنمنٹ میں اُنکا اعتبار زیادہ کرنیوالی اور گورنمنٹ کو ہندوستان کی چھ کروڑ رعایا کی طرف سے مطمئن کرنے والی ہوسکتی ہے - تو وہ یہی محمدن کالج ہوسکتا ہے - اسی لیے سرسید کی وفات پر لندن کے بڑے بڑے نامور اخباروں نے اُنکی وفات کو ہندوستان کے مسلمانوں کی ایک نہایت اعلیٰ درجہ کی پولٹکل طاقت کے زوال سے تعبیر کیا تھا - اور اسی وجہ سے مسٹر کین ممبر پارلیمنٹ نے کالج کی نسبت یہ ریمارک کیا تھا کہ "وہ ایک خالص تعلیمی جوش کی نسبت زیادہ تر ایک پولٹکل جوش پھیلانے والا ہے" اور اسی واسطے سر آکلنڈ کالون نے اپنی اسپیچ میں اُن تدبیروں کی نسبت - جو سرسید نے رسالۂ اسباب بغاوت میں رعایا اور گورنمنٹ کی غلط فہمیاں رفع کرنے کے لیے بتائی تھیں - یہ الفاظ کہے تھے کہ "انہیں خیالات سے ہمارے ہندوستان کے انتظامی مسائل حل ہوں گے - اور انہیں خیالات کی دوسری صورت علیگڑھ کالج ہی"

سرسید کا سب سے اخیر کام ملکی معاملات کے متعلق مسلمانوں کو انڈین نیشنل کانگرس میں شریک ہونے سے روکنا تھا جس کا مفصل حال ہم پہلے بیان کرچکے ہیں اور جس کے اعادہ کی اب ضرورت نہیں ہے - مگر ہم کو اُنکی ایک لطیف تحریر دستیاب ہوئی ہے جو اُنہوں نے لندن میں ایک بڑے عالی رتبہ انگریز کو کسی وقت لکھ کر بھیجی تھی اور جس سے ملکی معاملات کے متعلق اُن کی اصلی رائے ظاہر ہوتی ہے - اُس چٹھی کے چند فقرے اس

مقام پر نقل کرنے مناسب معلوم ہوتے ہیں۔ جنسے سرسید کا ایک بہت بڑا اسٹیٹسمین ہونا ثابت ہوتا ہے۔

وہ لکھتے ہیں کہ "میں مسلمان ہوں، ہندوستان کا باشندہ ہوں، اور عرب کی نسل سے ہوں، انہیں دو باتوں سے کہ میں عرب کی نسل سے ہوں اور مسلمان ہوں آپ سمجھ سکتے ہیں کہ مذہب اور خون دونوں کے لحاظ سے میں سچا ریڈیکل ہوں۔ اہل عرب اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ بجائے اسکے کہ وہ خود اپنے اوپر حکومت کریں۔ کوئی اور اُنپر حکومت کرے۔ اسوقت تک اہل عرب آزاد ہیں۔ اور اپنے مشایخ کے جھنڈوں کے نیچے رہتے ہیں۔ وہ سلطان ٹرکی کو سلطان نہیں کہتے بلکہ اپنے ویران اور پتھریلے جزیرہ نما کا خادم سمجھتے ہیں۔ وہ اپنی آزادی کو تمام دنیا کی نعمتوں سے بہتر جانتے ہیں۔ اونٹ چراتے ہیں، جو پر زندگی بسر کرتے ہیں، اونٹنیوں کا دودھ پیتے ہیں۔ اور اپنی آزادی میں خوش رہتے ہیں"

"ابھی تک میری رگوں میں عرب کا خون گردش کرتا ہے اور پھر میرا مذہب یعنی اسلام جسپر مجھے پورا اور بچا یقین ہے۔ وہ بھی ریڈیکل اصولوں کو سکھلاتا ہے اور شخصی گورنمنٹ سے موافق نہیں اور نہ لمیٹڈ مانرکی کو مانتا ہے بلکہ موروثی حکومت نا پسند کرتا ہے۔ ایک پریزیڈنٹ جسکو لوگ منتخب کریں اُسکو اسلام پسند کرتا ہے اور اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ دولت ایک جگہہ اکھٹی رہے۔ اسی اصول کے موافق اسلام کے بانی نے یہ قاعدہ بنایا کہ بعد فوت ہو جانے کسی شخص کے اُسکی جائداد بہت سے آدمیوں میں تقسیم ہو جاوے کیونکہ کتنی ہی زیادہ جائدادکیوں نہو وہ بعد دو نسلوں کے یقیناً بہت سے حصوں میں تقسیم ہو جاوے گی پس میں دونوں طرح کیا بلحاظ مذہب اور کیا بلحاظ خون کے ریڈیکل ہوں"

لیکن ہمارا مذہب جسنے یہ خیالات آزادی کے میرے دل میں پیدا کئے۔ اُس نے اور باتیں بھی سکھلائی ہیں؛ ایک یہ کہ اگر خدا کے حکم سے ہم کسی ایسی قوم سے مفتوح ہو جائیں جو کہ ہم کو مذہبی آزادی دیتی ہے، انصاف سے ہم پر حکمرانی کرتی ہے۔ ملک میں امن قایم رکھتی ہے اور ہماری جان اور مال کو محفوظ رکھتی ہے۔ جیسا کہ انگریزی سلطنت ہندوستان میں کرتی ہے۔ تو اُس حالت میں ہم کو اُس کا تابعدار اور خیر خواہ رہنا چاہیے۔ دوسرے یہ کہ وہ ریڈیکل اصول جو ہم نے اپنے باپ دادا اور اپنے مذہب سے سیکھے ہیں اُنپر ہمکو صرف اسی حالت میں عمل کرنا چاہئے۔ جب کہ زمانہ کی حالت اُنکے عمل میں لانے کے موافق ہو نہ کہ اُس حالت میں جبکہ زمانے کے حالات

اُنکے موافق نہوں ؛ مثلاً جبکہ اُنکے اختیار کرنے سے ملک کے اندرونی امن یا گورنمنٹ کے قایم رہنے میں فرق آوے یا اُسکو کمزور اور ضعیف کردے۔ میں یقین کرتا ہوں کہ ہر ایک قوم اور ہر ایک خیال کے لوگ۔ خواہ وہ کنسرویٹو ہوں، خواہ لبرل اور خواہ ریڈیکل۔ سب اس اصول کو قبول کرینگے۔"

یہی خیالات جو اس تحریر میں درج ہیں سرسید نے کانگرس کی مخالفت کرنے سے پانچ برس پہلے ممبری کونسل کے زمانہ میں لارڈ رپن کے سامنے اپنی اسپیچ میں۔ جیسا کہ پہلے حصہ میں بیان ہوچکا ہے۔ اُسوقت ظاہر کئے تھے جبکہ کونسل میں سلف گورنمنٹ کے قانون کا مسودہ پیش تھا۔ اُس اسپیچ سے صاف ظاہر ہے کہ وہ ریپرزنٹیٹو اصول کو اُسی حالت میں پسند کرتے تھے جبکہ اُسکے جاری کرنے سے ملک میں سوشل اور پولٹکل خطرات کے پیدا ہونے کا اندیشہ نہو پس جو لوگ اُنکی پہلی تحریروں کو حال کی تحریروں کے خلاف سمجھتے ہیں یہ اُنکی سمجھ کی غلطی ہے ہاں اسمیں شک نہیں کہ ہندوستان میں قومی اختلافات کا خیال زیادہ تر اُنکو اُسوقت پیدا ہوا جبکہ ۱۸۶۷ء میں مسلمانوں کے خلاف شمال مغرب کے بعض سربرآوردہ ہندوؤں کی طرف سے نہایت سرگرمی کے ساتھ اس بات میں کوشش شروع ہوئی کہ تمام سرکاری دفتروں اور کچہریوں میں اُردو زبان اور فارسی خط کی جگہ ہندی بھاشا اور ناگری خط جاری کیا جائے پھر جسقدر ہندوؤں کی طرف سے وقتاً فوقتاً مخالفتیں ظہور میں آتی گئیں اُسی قدر وہ خیال زیادہ پختہ ہوتا گیا اور آخر کار اُنکو یقین ہوگیا کہ ہندوستان کی موجودہ حالت اس قابل نہیں ہے کہ اسمیں ریپرزنٹیشن کے اصول پر عملدرآمد ہوسکے۔

اول اول وہ گورنمنٹ کی خودمختاری کے سخت مخالف تھے۔ جیسا کہ اُنکی اسپیچ سے ظاہر ہے جو ۱۸۶۶ء میں علیگڈھ برٹش انڈیا ایسوسی ایشن قایم کرتے وقت جلسہ عام میں انہوں نے کی تھی اور اُنکی یہ باتیں صرف زبانی ہی نہ تھیں بلکہ غدر کے بعد اُنہوں نے اس بات کا عملی ثبوت بھی دیا تھا کہ جہاں انتظام ملک کا مدار قانونوں پر نہیں بلکہ زیادہ تر حکام کی زبان پر ہو وہاں رہنا وہ ہرگز پسند نہ کرتے تھے ؛ کیونکہ غدر کے بعد جبکہ قسمت دہلی صوبہ شمال مغرب سے نکال کر صوبۂ پنجاب کے ساتھ ملحق کی گئی۔ اُنہوں نے دہلی کی سکونت فوراً ترک کردی اور اپنے تمام بڑے بڑے کاموں کا مرکز علیگڈھ کو قرار دیا، یہانتک کہ ۱۸۶۶ء میں، جب کہ سر ڈونلڈ مکلوڈ صاحب لفٹننٹ گورنر صوبہ پنجاب نے دہلی میں دربار کیا جسمیں سرسید

کو بھی علیگڈھ سے بلایا گیا تھا۔ تو سرسید سے پرائوٹ ملاقات کے وقت صاحب ممدوح نے اس بات کی سخت شکایت کی کہ تم نے سائنٹفک سوسائٹی علیگڈھ میں جاکر قایم کی اور اپنے قدیم وطن دہلی کو اُسکے فوائد سے محروم رکھا۔ سرسید نے کہا کہ میں پنجاب گورنمنٹ کو جیسی کہ وہ اب ہے۔ ایک ڈسپاٹک گورنمنٹ کا نمونہ سمجھتا ہون اور اسی لئے جب سے کہ قسمت دہلی پنجاب میں شامل کی گئی۔ میں دہلی میں رہنا پسند نہیں کرتا۔ اسی کے قریب قریب اُنھوں نے ۱۸۶۹ء میں ڈی فرڈ پیرٹک صاحب سے۔ جو دلی میں ڈپٹی کمشنر رہ چکے تھے اور آخر کو پنجاب کے لفٹنٹ گورنر ہوئے۔ انگلستان جاتے ہوئے جہاز میں تقریر کی تھی جسکا ذکر اُنھوں نے اپنے سفرنامہ میں کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ "ایک دن پنجاب کے انتظام کی بھلائی بُرائی کا ذکر آگیا، میں نے کہا وہاں ایک ڈسپاٹک گورنمنٹ ہے اور بلاشبہ سکھوں کی عملداری سے ہزار درجہ بہتر ہے؛ لیکن شاید پنجاب کے لوگ اُس سے خوش ہوں کیونکہ اُنکو آگ (یعنی سکھوں کی عملداری) میں سے نکالکر دہوپ میں بٹھایا ہے؛ مگر ہم لوگ اُسکو پسند نہیں کرتے +++ جہانتک مجھکو معلوم ہے لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ غدر میں جہان اور سزائیں اہل دہلی اور اُسکے متعلق اضلاع کو دی گئیں منجملہ اُنہیں سزاؤں کے ایک یہ بھی سزا ہے کہ دہلی اور اُسکے متعلق اضلاع میں پنجابی انتظام کیا گیا اور بے قانونی ملک بنا دیا گیا"

اسکے بعد وہ سفرنامہ میں لکھتے ہیں کہ "حقیقت میں اب وہ زمانہ نہیں رہا جبمیں ڈسپاٹک گورنمنٹ کو لوگ پسند کرتے تھے اور نہ اب وہ بھلائیان ہیں جو ہزاروں بُرائیوں کے ساتھ اگلے زمانہ کی ڈسپاٹک گورنمنٹ میں ملی ہوئی تھیں اور جنسے اُن بُرائیوں کا علاج ہوتا تھا ع جو رگ زن کہ جرّاح و مرہم نہ ست اب اُنکا ہونا کسی ڈسپاٹک گورنمنٹ میں ممکن نہیں ہے۔ وہ لوگ جو یہ خیال کرتے ہیں کہ ہندوستان میں بجائے کانسٹیٹوشنل گورنمنٹ کے ڈسپاٹک گورنمنٹ۔ جیسی کہ قدیم سے تھی۔ زیادہ ترمفید ہوگی وہ نہایت غلطی میں ہیں"

لیکن آخر کار اُنکو یقین ہوگیا کہ جب تک مثل انگلستان کے ہندوستان کی تمام قومیں ملکر ایک قوم نہ بنجائیں۔ جو قریب ناممکن کے ہے اُسوقت تک ایک خاص کانسٹیٹوشنل گورنمنٹ ہندوستان کی حالت کے مناسب ہرگز نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ جو اسپیچ اُنہوں نے قانون سلف گورنمنٹ پر لارڈ رپن کے عہد میں کی تھی اسمیں نہایت مدلل طور پر اس مطلب کو بیان کیا تھا اور اصل مقصد اُس اسپیچ کا۔ جیسا کہ پہلے بیان ہوچکا ہے۔ یہ تھا کہ تمام ہندوستان

کے لوکل بورڈون میں دو ثلث ممبر الکشن سے اور ایک ثلث نومینشن سے مقرر کیے جائیں کیونکہ لارڈ رپن اضلاع متوسط کے سوا باقی صوبون میں کل ممبر الکشن سے مقرر کرنا چاہتے تھے مگر آخرکار جیسی کہ سرسید کی راے تھی وہی قاعدہ تمام صوبجات کے لئے مقرر کیا گیا جو اضلاع متوسط کے لئے قرار پایا تھا اور اسی قاعدہ کی بدولت تمام بورڈوں میں کم وبیش مسلمان ممبرون کی صورت آج تک دکھائی دیتی ہے ورنہ خاص خاص مقامات کے سوا کسی بورڈ کی ممبری پر اُنکی شکل نظر نہ آتی۔

اگرچہ اکسٹرا اسسٹنٹی اور منصفی کے لئے پنجاب میں مقابلہ کا امتحان نیشنل کانگرس کے قایم ہونے سے پہلے جاری ہوچکا تھا اور جسوقت سرسید نے کانگرس کے خلاف لکھنؤ میں اسپیچ دی اسوقت جو نتائج اس قاعدہ سے مسلمانوں کے حق میں مترتب ہونے والے تھے وہ ظہور میں نہیں آئے تھے مگر سرسید نے اُسی وقت اُس نقصان کا بخوبی اندازہ کرلیا تھا جو اس قاعدہ سے مسلمانوں کو پہنچنے والا تھا۔ چنانچہ پنجاب میں۔ باوجودیکہ وہاں مسلمانوں کی تعداد ہندو قوموں سے بہت زیادہ ہے۔ سنہ ۱۸۹۳ع سے سنہ ۱۸۹۶ع تک اکسٹرا اسسٹنٹی میں منجملہ ۲۵ کے صرف سات مسلمان کامیاب ہوئے اور منصفی میں منجملہ ۲۷ کے ایک مسلمان بھی کامیاب نہیں ہوا۔ اور اگر دونوں عہدوں کا مدار محض مقابلہ کے امتحان پر ہوتا اور کچھہ عہدے نومینیشن کے ذریعہ سے مقرر نہ کئے جاتے تو منصفون میں اب تک شاید ہی کوئی مسلمان نظر آتا اور اکسٹرا اسسٹنٹی پر بھی خال خال مسلمان باقی رہجاتے۔ علی ہذا القیاس وایسراے کی قانونی کونسل میں اگر نومینیشن کا اختیار گورنمنٹ اپنے ہاتھ میں نہ رکھتی تو ایک مسلمان کو بھی کونسل کی شکل دیکھنی نصیب نہ ہوتی۔ اسی قسم کے خیالات تھے جنکی وجہ سے سرسید نے مسلمانوں کو نیشنل کانگرس میں شریک ہونے سے روکا اور اسی لئے اُنھوں نے قانون سلف گورنمنٹ کے مسودہ پر اپنی اسپیچ میں کہا تھا کہ جب تک ہندوستان کی حالت مثل انگلستان کے نہ ہوجائے جہاں عیسائیوں کو یہودیوں کی نسبت ووٹ دینے میں کچھہ تامل نہیں ہوتا۔ اُسوقت تک انگلستان سے ریپرزنٹیٹو انسٹیٹیوشنوں کا اصول مستعار لینے میں بڑے بڑے مشکلات کے پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔

پولٹکل ایجیٹیشن کی نسبت سرسید کی یہ راے تھی کہ اُسکے بد اثر سے کوئی گورنمنٹ خواہ وہ ریپبلک ہو، یا پارلیمنٹری اور یا مانرکی محفوظ نہیں رہ سکتی ریپبلک گورنمنٹ میں اُسکا لازمی نتیجہ

بشرطیکہ ایجیٹیشن کو پوری قوت حاصل ہو جائے پریزیڈنٹ کی تبدیلی ہے اور پالیمنٹری گورنمنٹ میں وزرا کی تبدیلی اور اگر وہ گورنمنٹ مانز کی ہے تو اُسکا اثر سیدھا گورنمنٹ تک پہنچتا ہے جسکے معنی یہ ہیں کہ اگر ایجیٹیشن کرنیوالے اسکو تبدیل نہیں کر سکتے تو کم از کم اُسکی تبدیلی کی خواہش اُنکے دل میں ضرور ہوتی ہے۔

اُنکا قول تھا کہ "سلطنت شخصی ہو یا جمہوری، ایک امر میں دونوں کا اصول ایڈمنسٹریشن متحد ہوتا ہے؛ اور وہ یہ ہے کہ اپنی گورنمنٹ کو جس طرح ہو سکے قایم اور مضبوط رکھنا سب سے مقدم اور سب سے بڑا انصاف ہے اور اسکے بعد رعایا کے واجبی حقوق کی حفاظت کرنا ہے۔ پہلے امر کے متعلق ایک مہذب سلطنت یا سلطنت جمہوری بھی وہی کرتی ہے جو ایک نامہذب سلطنت یا شخصی سلطنت کرتی ہے کوئی نظیر دنیا میں ایسی نہیں ہے کہ ایسے وقت میں ایک مہذب یا جمہوری سلطنت نے وہ نہ کیا ہو جو ایک نامہذب یا شخصی سلطنت نے کیا ہو"

اُنکا قول تھا کہ اُن بادشاہوں میں سے جو ظالم کہلاتے ہیں دو ایک کے سوا جو درحقیقت مجنون تھے۔ کسی بادشاہ نے ظلم کرنے کے ارادہ سے ظلم نہیں کیا؛ بلکہ صرف اس خیال سے کیا کہ ویسا کئے بغیر اُنکی حکومت قایم نہیں رہ سکتی تھی۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ اُنکے اس خیال اور اندازہ میں غلطی ہو۔

اُنکی راے تھی کہ گورنمنٹ کا اچھا یا بُرا ہونا درحقیقت کوئی اصلی چیز نہیں ہے بلکہ اصل چیز رعایا کا بُرا یا اچھا ہونا ہے۔ اگر رعایا اچھی اور شایستہ ہے تو گورنمنٹ کو خواہ مخواہ شایستہ بننا پڑتا ہے اور اگر رعایا شایستہ نہیں ہے تو گورنمنٹ کو بھی ویسا ہی بننا پڑتا ہے۔ اسی لئے مسلمانوں کو اُن کی بڑی نصیحت یہی تھی کہ اگر انگریزی حکومت میں عزت سے رہنا چاہتے ہیں تو تعلیم اور سویلیزیشن میں ترقی کریں اور عزت حاصل کرنے سے پہلے اُس کا استحقاق پیدا کریں۔

اُنکی نہایت پختہ راے تھی کہ ہندوستان کے لئے انگلش گورنمنٹ سے بہتر۔ گو کہ اُس میں کچھ نقص بھی ہوں۔ کوئی گورنمنٹ نہیں ہو سکتی اور اگر امن و اماں کے ساتھ ہندوستان کچھ ترقی کر سکتا ہے تو انگلش گورنمنٹ ہی کے ماتحت رہ کر کر سکتا ہے۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ گو ہندوستان کی حکومت کرنے میں انگریزوں کو متعدد لڑائیاں لڑنی پڑیں مگر درحقیقت نہ انہوں نے یہاں کی حکومت بہ زور حاصل کی، اور نہ مکر و فریب سے، بلکہ درحقیقت ہندوستان کو کسی حاکم کی

اُسکے اصلی معنوں میں ضرورت تھی۔ سو اُسی ضرورت نے ہندوستان کو اُنکا محکوم بنادیا!!
اُنہوں نے کئی موقعوں پر یہ ظاہر کیا کہ "میں ہندوستان میں انگلش گورنمنٹ کا استحکام کچھہ انگریزوں کی محبت اور انکی ہوا خواہی کی نظر سے نہیں چاہتا۔ بلکہ صرف اسلئے چاہتا ہوں کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی خیر اسکے استحکام میں سمجھتا ہوں اور میرے نزدیک اگر وہ اپنی حالت سے نکل سکتے ہیں تو انگلش گورنمنٹ ہی کی بدولت نکل سکتے ہیں"۔

اگرچہ سرسید کو مسلمانوں نے عموماً اپنا مذہبی پیشوا نہیں مانا لیکن شاید ہندوستان میں ایسا ایک مسلمان بھی نہ ہو گا جو ملکی معاملات میں اُنکو قوم کا لیڈر نہ سمجھتا ہو اور اسکا بڑا ثبوت یہ ہے کہ سرسید کی ایک آواز پر۔ بہ استثنائے معدودے چند۔ ہندوستان کے تمام مسلمان کیا سنی، کیا شیعہ، کیا وہابی، کیا غیر وہابی، کیا پڑھے لکھے اور کیا ان پڑہ، کیا وہ لوگ جو اُنکی پارٹی میں گنے جاتے تھے اور کیا وہ جماعت کثیر جو ہر بات میں اُنکی مخالفت کرتی تھی، سب نے بالاتفاق نیشنل کانگریس سے صرف اس بنا پر علحدگی اختیار کی کہ سید احمد خاں کے نزدیک اُنکا اسمیں شریک ہونا مناسب نہ تھا اور لکھو کہا مسلمانوں نے اُن کاغذوں پر آنکھیں بند کر کے دستخط کر دیئے جو پیٹریاٹک ایسوسئیشن نے اس بات کے اظہار کے لئے ولایت بھیجے تھے کہ ہندوستان کے مسلمان کانگریس میں شریک نہیں ہیں۔

تعلیم

سرسید نے مسلمانوں میں تعلیم پھیلانے کی غرض سے جو غیر معمولی کوششیں کی ہیں اُنکی تفصیل پہلے اور دوسرے حصہ میں کافی طور پر بیان ہو چکی ہے۔ یہاں ہم صرف اُن بڑی بڑی باتوں کی طرف اشارہ کرینگے جنسے تعلیمی معاملات میں اُنکی عالی دماغی حسن تدبیر اور اصول اشاعت تعلیم سے ایک قدرتی مناسبت پائی جاتی ہے۔

تعلیم کے مسئلہ پر کبھی نظام تعلیم (ایجوکیشنل سسٹم) کے لحاظ سے اور کبھی طریقہ تعلیم کے لحاظ سے اور کبھی دیگر حیثیتوں سے بحث کی جاتی ہے مگر سب سے مقدم اور مہتم بالشان حیثیت۔ جس سے تمام حیثیتیں متفرع ہوتی ہیں۔ یہ ہے کہ کسی قوم میں ایک اجنبی اور غیر مانوس تعلیم جاری کرنے کی کیا سبیل ہے؟

جو قوم ہزار برس سے زیادہ عرصہ سے ایک ایسی تعلیم کی پابند چلی آتی ہو جسمیں عقلی اور

نقلی دونوں تعلیموں نے مل جلکر ایک مقدس مذہبی تعلیم کی بلکہ خود مذہب کی شکل اختیار کر لی ہو اُس قوم میں ایک نئی قسم کی تعلیم کا جاری کرنا - جو مضامین تعلیم اور ذریعۂ تعلیم دونوں کے لحاظ بالکل اُوپری اور غیر مانوس ہو - بعینہ ایسا ہے جیسے کسی قوم میں - جو اپنے مذہب کی سخت پابند ہو - ایک نئے مذہب کو جاری کرنا - یہی وجہ تھی کہ ۱۸۳۵ء میں جب گورنمنٹ نے ہندوستان میں انگریزی تعلیم جاری کرنی چاہی تو مسلمانوں کے ایک جم غفیر نے - جیسا کہ پہلے بیاں ہو چکا ہے - بذریعہ عرضداشت کے یہ شکایت پیش کی کہ گورنمنٹ کا انگریزی تعلیم پر اسقدر توجہ کرنا صاف اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اسکا ارادہ ہندوستانیوں کو عیسائی بنانے کا ہے - برخلاف اسکے ہندوؤں نے اس واقعہ سے گیارہ برس پہلے جب کہ گورنمنٹ نے اُنکے لئے سنسکرت کالج قائم کرنا چاہا تو اس سے ناراضی ظاہر کی اور انگریزی کالج قائم کرنے کے لئے گورنمنٹ سے اصرار کیا؛ کیونکہ اول تو اُنکے ہاں مذہبی تعلیم صرف برہمنوں کے خاص خاص افراد میں محدود تھی اور باقی تمام ہندو تو ہیں مسلمانوں کے عہد میں دنیوی ضروریات کے لئے ایک غیر قوم کی زبان سیکھنے کی عادی ہو گئی تھیں - دوسرے - جیسا کہ سرجان اسٹریچی نے اپنی کتاب انڈیا میں لکھا ہے - نہ ہندو مذہبی تعلیم کے خواہش مند تھے اور نہ اُنکا مذہب ایسا تھا جسکی تعلیم ہو سکے -

بہرحال مسلمانوں میں مغربی تعلیم کا جاری کرنا ایک نہایت مشکل کام قریب ناممکن کے تھا - چنانچہ ۱۷۹۲ء سے - جبکہ کورٹ اوف ڈائرکٹرز کے ایک نامور ممبر چارلس گرانٹ نے ہندوستان میں تعلیم پھیلانے کی صلاح دی تھی - اُسوقت تک - جبکہ ۱۸۷۰ء میں سرسید نے کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان قایم کی - گورنمنٹ کی تمام تدبیریں اور تمام کوششیں جو ہندوستان میں بغرض اشاعت تعلیم کی گئیں - مسلمانوں کے حق میں بے سود ثابت ہوئیں - علاوہ طرح طرح کی ترغیبوں کے - جو گورنمنٹ کی طرف سے تعلیم کی اشاعت کے لئے وقتاً فوقتاً ہوتی رہتی تھیں - خاص مسلمانوں کے چند معقول اوقاف گورنمنٹ کے ہاتھ میں تھے جنکو وقف کرنے والوں نے تعلیم کے لئے مخصوص کیا تھا - جیسے بنگال میں محسن فنڈ اور اضلاع شمال مغربی میں نواب فنڈ - مگر اُنسے بھی زیادہ تر غیر قومیں مستفید ہوتی رہیں - باوجودیکہ ۱۸۵۷ء میں ہائی ایجوکیشن کی ترقی کے لئے کلکتہ بمبئی اور مدراس میں یونیورسٹیاں قایم ہوئیں مگر ۱۸۷۵ء تک تمام ہندوستان میں مسلمان گریجوئٹس کی تعداد بمقابلہ ہندو گریجوئٹس کے مشکل سے اتنی ہو گی جتنا آٹے میں نمک ہوتا ہے

سرسید کو ۱۸۵۹ء میں - جبکہ وہ بجنور سے مراد آباد بدلکر گئے - تعلیم کی اشاعت کا خیال پیدا ہوا - اُس زمانہ سے لیکر اسوقت تک جبکہ کالج نے نمایاں ترقی کرلی - اُنکے تمام کاموں میں جو تعلیم کے متعلق اُنہوں نے انجام دئے ایک خاص ترتیب پائی جاتی ہے - جس پر غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس شخص نے ابتدا ہی میں وہ تمام مشکلات - جو وقتاً فوقتاً پیش آنے والی تہیں - اور ہر ایک مشکل کے ساتھ اُسکا حل - بخوبی ذہن نشین کرلیا تہا سب سے پہلے اُنکو تعلیمات پر خود غور کرنا اور تعلیم کے متعلق کسی قدر تجربہ حاصل کرنا ضروری تہا؛ چنانچہ اُنہوں نے اول اسی غرض سے دو اسکول پبلک چندہ سے قائم کئے جسے لوگوں کی اُس دلچسپی کا - جو اُنکو بہ نسبت سرکاری مدرسوں کے اپنے پرائوٹ اسکولوں کے ساتھ بالطبع زیادہ ہوتی ہے - بخوبی اندازہ ہوگیا اور اس بات کا یقین ہوگیا کہ اگر مسلمانوں کو کچھ دلچسپی ہوسکتی ہے تو خاصکر اُسی کالج سے ہوسکتی ہے جو قومی چندہ سے قائم کیا جائے -

اسکے بعد سائنٹفک سوسائٹی کی بنیاد ڈالی اور یہ خیال کیا کہ شمالی ہندوستان کے باشندے کیا ہندو اور کیا مسلمان - انگلش لٹریچر اور مغربی علوم کی حقیقت سے محض ناواقف ہیں؛ پس تاوقتیکہ دیسی زبان کے ذریعہ سے اُن میں یورپین سائنس اور لٹریچر کا مذاق پیدا کیا جائے اُسوقت تک انگریزی تعلیم کا ذوق و شوق اُنمیں پیدا نہیں ہوسکتا - اسی مقصد کے لئے اُنہوں نے علاوہ کتابوں کے ترجمہ کرانے کے سوسائٹی سے ایک اخبار نکالا جسمیں بے شمار علمی اور لٹریری مضامین انگریزی سے اُردو میں ترجمہ ہوکر شایع ہوئے اور جسنے فی الواقع اُردو لٹریچر کا رخ دوسری طرف پھیر دیا اور انگلش لٹریچر کی عظمت ہزاروں کے دل میں - جو سلیم الطبع تھے - نقش کردی - پھر زیادہ تجربہ اور زیادہ بصیرت حاصل کرنے کے لئے اُنہوں نے ولایت کا سفر اختیار کیا اور وہاں پہنچکر کیمبرج یونیورسٹی اور اسکے تمام انتظامات کو خود جاکر دیکھا اور اُسکے مقابلہ میں جو نقص ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں معلوم ہوئے انپر ایک پمفلٹ لکھکر انگلستان ہی میں شایع کیا؛ کیونکہ سرسید کا اصل مقصد - جو پورا نہ ہوسکا - ہندوستان میں واپس آکر ایک محمڈن یونیورسٹی قائم کرنے کا تھا اور اسلئے ضرور تہا کہ ہندوستان کی

۱۸۷۳ء میں جب کہ سرسید پہلے ہی بار چندہ کے لئے لاہور گئے ہیں اُسوقت اُنہوں نے راقم کے سامنے بابو نوین چندر سے ایک سوال کے جواب میں یہ کہا تہا کہ صرف اس خیال سے کہ یہ کالج خاص مسلمانوں کے لئے اُنہیں کے روپے سے قایم کیا جاتا ہے ایک طرف تو مسلمانوں میں اور دوسری طرف اُنکی ریس سے ہندوؤں میں (دیکھو صفحہ ۴۵۲)

نظام تعلیم میں جو نقص تھے اُنکو ظاہر کیا جائے۔ تاکہ ہندوستان میں ایک جدا یونیورسٹی قایم کرنے کی ضرورت ثابت ہو۔ پھر ہندوستان میں پہنچتے ہی اُنھوں نے ایک طرف تو کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان قایم کی جسکی تحقیقات سے ثابت ہو گیا کہ سرکاری کالجوں اور اسکولوں سے مسلمانوں کی تعلیمی ضرورتیں رفع نہیں ہوسکتیں۔ اور دوسری طرف مسلمانوں کو جگانے کے لئے ایک ماہواری رسالہ جاری کیا جسنے چند روز میں ایک مردہ قوم میں حرکت پیدا کردی۔

جب کالج قائم کرنے کا ارادہ ہوا اُسوقت اُنکو طرح طرح کی مشکلات کا سامنا تھا۔ اولاً مسلمانوں سے۔ جو قومی چندوں کے مفہوم سے ناواقف اور تعلیم سے متنفر بلکہ اُسکے مخالف تھے۔ چندہ وصول کرنا تھا۔ پھر جو موقع کالج کے لئے تجویز کیا گیا تھا وہ چند اضلاع کے بارعب مسلمان رئیسوں اور تعلقہ داروں سے گھرا ہوا تھا جنمیں سے بعض کالج کمیٹی کے ممبر بھی تھے اور ایک ایسے کام کی طرف سے۔ جسکو بہت سے ذی وجاہت مسلمان ملکر کرنا چاہتے تھے اور جسمیں مذہبی تعلیم بھی شامل تھی۔ گورنمنٹ کو مطمئن کرنا سب سے مقدم تھا۔ جس قطعہ زمین پر کالج کی نیو رکھنی منظور تھی وہ نزولی زمین تھی جہاں ایک زمانہ میں سرکاری چھاؤنی رہ چکی تھی اور اکثر حکام اور افسر نہیں چاہتے تھے کہ وہ زمین مسلمانوں کو دی جائے۔ مسلمان جنکی اولاد کی تعلیم کے لئے کالج قایم کیا جاتا تھا وہ تعلیم کے خرچ سے زیادہ کسی خرچ کو فضول اور بیکار نہیں سمجھتے تھے۔ اور سب سے زیادہ اس بات کا خیال تھا کہ کالج کی وقعت پبلک اور گورنمنٹ کی نظر میں جہانتک ہوسکے جلد پیدا کی جائے۔ کیونکہ جو بڑا منصوبہ سرسید نے اُسکے لئے اپنے دل میں باندہ رکھا تھا وہ بظاہر اُنکی زندگی میں پورا ہوتا نظر نہ آتا تھا اور مسلمانوں میں کسی سے یہ امید نہ تھی کہ سرسید کے بعد کالج کی وقعت اور اُسکا اعتبار ایک انچ آگے بڑھا سکے۔

سرسید نے ان تمام مشکلات کا مقابلہ کیا اور سب پر غالب آئے چندہ توقع بلکہ وہم و گمان سے بھی زیادہ وصول کرلیا۔ گورنمنٹ کو کالج کی طرف سے مطمئن ہی نہیں کیا بلکہ اُسکا مربی اور

(نوٹ بقیہ صفحہ سابق) توقع سے زیادہ جوش پیدا ہوگیا ہے'' اور پیر خاں بہادر برکت علی خاں سے پوچھا کہ کیوں حضرت اگر یہ قومی کالج نہوتا تو آپ ہماری مدارات اسی جوش محبت کے ساتھ کرتے اُنھوں نے صاف کہدیا کہ ہرگز نہیں اس سے صاف ظاہر ہے کہ سرسید اپنے کام کے شروع میں اس قومی فیلنگ سے بخوبی واقف تھے ۱۲

سرپرست بنا دیا۔ کالج کے لئے وہی زمین جس کا ملنا قریب ناممکن کے ہوگیا تھا۔ گورنمنٹ سے حاصل کی۔ مسلمانوں کو تعلیم میں اپنے بوتے اور طاقت سے بڑھکر خرچ کرنا سکھا دیا یہاں تک کہ وہ ولایت کی تعلیم کے مصارف بہ کشادہ پیشانی برداشت کرنے لگے۔ کالج کی عالیشان عمارتوں اور عمدہ اسٹاف اور بورڈنگ ہوس کے انتظام سے اس کی وقعت بہت جلد پبلک اور گورنمنٹ کی نظر میں پیدا کر دی۔ الغرض جو کچھ سرسید نے مسلمانوں کی تعلیم کے متعلق پچیس برس کے قلیل عرصہ میں کر دکھایا وہ ایک ایسا عظیم الشان کام تھا جو پچیس برس پہلے بالکل محال معلوم ہوتا تھا۔

ابتدائی کارروائیاں جو سرسید نے بطور بنیاد اور اساس اشاعت تعلیم انگریزی کے کیں خواہ اُن کو اتفاقی سمجھو اور خواہ یہ خیال کرو کہ وہ بہت سوچ سمجھ کر کی گئی تھیں۔ سب ایسی ضروری معلوم ہوتی ہیں کہ بغیر اُن کے شاید اصل مقصد تک پہنچنا سخت دشوار ہوتا۔ سرسید نے جو چند موقعوں پر سائنٹفک سوسائٹی کے مقاصد کو اپنی رائے کی غلطی کی طرف منسوب کیا ہے اور اس بات پر زور دیا ہے کہ یوروپین علوم کی اشاعت بذریعۂ دیسی زبانوں کے ملک کو حقیقی فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔ اس سے بعض لوگ سچ مچ یہ سمجھ گئے ہیں کہ سوسائٹی کا قائم کرنا محض بے سود تھا اور یہ کہ سرسید نے اپنی اس غلطی پر متنبہ ہونے کے بعد انگریزی تعلیم کی اشاعت کی طرف توجہ کی ہے مگر یہ اُن کی سمجھ کی غلطی ہے؛ سرسید کا جو خیال انگریزی تعلیم کی نسبت اخیر زمانہ میں تھا وہی خیال ان کا اس وقت تھا جبکہ مرادآباد میں انھوں نے ورنیکلر سکولوں کے خلاف اپنی رائے انگریزی اور اردو میں لکھکر شائع کی تھی اور وہی خیال اُس وقت تھا جبکہ سائنٹفک سوسائٹی کو قائم ہوئے کچھ بہت دن نہ گذرے تھے اور اُنھوں نے گورنمنٹ کی اس تجویز کی سخت مخالفت کی تھی کہ بجائے کلکتہ یونیورسٹی کے ورنیکلر یونیورسٹی قائم کی جائے۔ اسی طرح ترجموں کی ضرورت کو جیسا کہ وہ سوسائٹی کے قیام کے وقت ضروری اور لابدی سمجھتے تھے۔ اسی طرح اخیر دم تک اُس کو ضروری اور ملک کی عام تعلیم کو اُس کے بغیر ناممکن سمجھتے رہے۔ مگر اسمیں شک نہیں کہ اعلیٰ درجہ کی انگریزی تعلیم کی جگہ دیسی زبانوں میں مغربی علوم اور لٹریچر کی تعلیم دینے کو ملک کے حق میں کچھ بھلائی نہیں سمجھتے تھے اور اسی لئے جب سے اُن کو یہ خیال پیدا ہوا کہ گورنمنٹ بجائے انگلش ہائی ایجوکیشن کے مشرقی علوم کی تعلیم دینا اور مغربی علوم کو بذریعہ دیسی زبانوں کے شائع کرنا چاہتی ہے اُس وقت سے وہ اپنی ہر ایک تحریر میں ورنیکلر زبانوں

کے ذریعہ سے علوم کی تعلیم دینے پر سخت اعتراض کرتے تھے اور انگلش ہائی ایجوکیشن کے موقوف کرنے کو ملک کے حق میں نہایت مضر بتاتے تھے۔

جس زمانہ میں سرسید نے سوسائٹی قائم کی اُس وقت اُدھر تو مسلمان انگریزی کے نام سے کوسوں دور بھاگتے تھے اور اِدھر انگریزی تعلیم کی ضرورت کا لوگوں کو یقین دلانا مشکل تھا کیونکہ تمام عدالتوں میں دیسی زبان مروج تھی، اعلیٰ سے اعلیٰ عہدہ کے لئے جو اُس وقت تک ہندوستانیوں کو مل سکتا تھا خاص کر شمالی ہندوستان میں مشرقی زبانوں کی تعلیم کافی تھی کمپنی کی عملداری کو گئے ہوئے چند روز گذرے تھے اور ہندوستانیوں کو عملی طور پر اس بات کا یقین نہیں دلایا گیا تھا کہ وہ اعلیٰ اعلیٰ ملکی عہدوں میں حکمران قوم کے ساتھ شریک ہو سکتے ہیں پھر جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ یورپین سائنس اور لٹریچر کی عظمت۔ جب تک کہ انگریزی سے عمدہ عمدہ علمی اور لٹریری مضامین دیسی زبان میں ترجمہ کر کے شائع نہ کئے جائیں کسی طرح معلوم نہیں ہو سکتی تھی۔ جب کہ یہ حالت تھی تو کون کہہ سکتا ہے کہ مسلمانوں میں انگلش ہائی ایجوکیشن کی اشاعت سے پہلے سوسائٹی کا قائم کرنا اور ترجموں کا شائع کرانا بے سود یا غیر ضروری تھا۔

بے شک ہائی ایجوکیشن کی حمایت کے جوش میں سرسید کے قلم سے بعض مواقع پر ایسے الفاظ نکل گئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ترجموں کی غرض سے سوسائٹی قائم کرنے کو وہ اپنی ایک غلطی تسلیم کرتے تھے اور اسی بنا پر شمس العلماء مولانا شبلی نے "مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم" میں اسی غلطی کا۔ جس کو سرسید چھ سات برس پہلے ایجوکیشن کمیشن میں تسلیم کر چکے تھے۔ ذکر کیا ہے اور اس بنا پر۔ کہ مغربی علوم و فنون کا دیسی زبانوں میں ترجمہ ہونا ممکن نہیں ہے۔ سائنٹفک سوسائٹی قائم کرنے کو سرسید کی ایک غلطی قرار دیا ہے اور اپنے اس دعوے پر کہ ترجمہ ممکن نہیں زیادہ تر وہی دلیلیں[1] جو خود سرسید نے بعض مواقع پر بیان کی تھیں پیش کی ہیں۔ اگر مولانا کی یہ

[1] مولانا نے اس بات پر کہ جس طرح عباسیوں نے یونانی سے عربی میں ترجمے کرائے تھے اسطرح ہم مغربی علوم انگریزی سے اردو میں ترجمہ نہیں کرا سکتے۔ پہلی دلیل یہ لکھی ہے کہ لاکھوں روپیہ جو خلفائے عباسیہ نے ترجمہ پر خرچ کیا وہ اب غیر ممکن ہے؛ مگر یہ دلیل صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ واقعات اس کے خلاف شہادت دیتے ہیں گذشتہ تیس چالیس برس میں۔ بغیر اس کے سلطنت نے ترجمہ کا اہتمام اپنے ذمہ لیا ہو۔ جس قدر علمی اور لٹریری مضامین اور کتابیں انگریزی سے دیسی زبانوں میں ترجمہ ہوئیں۔ اگر ہمارا قیاس غلط نہ ہو۔ تو وہ کسی طرح خلفائے

اصلی رائے ہوتی تو ہم کو اس سے تعرض کرنے کی کچھ ضرورت نہ تھی - لیکن چونکہ اُنھوں نے خود سرسید کے بعض بیانات سے یہ رائے استنباط کی ہے - اس لئے ہم کو سرسید کے خیالات کا اصلی منشا ظاہر کرنا ضرور ہے -

شاید اس بات کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ ایک ریفارمر کی شان اور اُسکی حالت عام آدمیوں کی شان اور اُن کی حالت سے بالکل مختلف ہوتی ہے - وہ جس بات کو قوم کے لئے ضروری سمجھتا ہے اُس کی تائید کرتے وقت اس بات کی کچھ پروا نہیں کرتا کہ میں پہلے کیا

بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۵۴ اموید و عباسیہ کے عہد کے ترجموں سے کم ہونگے - دوسری دلیل اُنکی یہ ہے کہ اُس زمانہ میں علوم محدود تھے اور ترقی رک چکی تھی - جس قدر کتابیں ترجمہ کرلی گئیں گویا یونانیوں کے علوم پر احاطہ کر لیا گیا مگر اس زمانہ میں نہ علمی ترقی کی انتہا ہے - اور نہ کتابوں کے شمار کی کوئی حد ہے - جن کی تصنیف کا سلسلہ برابر جاری ہے" یہی دلیل غالباً سرسید نے بھی کسی موقع پر بیان کی ہے مگر یہ بھی صحیح نہیں ہے کیونکہ جس طرح اب علوم اور کتابیں غیر محدود ہیں اسی طرح ہندوستان میں ترجمہ کے وسائل بھی غیر محدود ہیں - عباسیوں نے صرف چند یہودی عیسائی اور مجوسی نوکر رکھ کر ترجمے کرائے تھے - کیونکہ یونانی زبان کی تعلیم کا کبھی مسلمانوں میں عام رواج نہیں ہوا بخلاف ہندوستان کے جہاں انگریزی کی تعلیم عام طور پر جاری ہے اور کاپی رائٹ کے قانون نے ہر تعلیم یافتہ کے دل میں ترجمہ کرنے کی اُمنگ پیدا کر دی ہے - پھر ہر ایک علم کی تمام کتابیں ترجمہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ ہر علم کے چند نامور مصنفوں کی کتابوں کا ابتداءً ترجمہ کر لینا کافی ہے - پھر جتنی صدیاں یورپ کی علمی ترقیات میں صرف ہوئی ہیں اور جتنی مدت میں انگریزی زبان نے ترقی کی ہے اور جس قدر عرصہ میں مغربی علوم مدون ہوئے ہیں - کم سے کم اُس سے نصف مدت کی مہلت ہندوستان میں اُن کے ترجموں کیلئے ملنی چاہئے؛ نہ یہ کہ جتنے دنوں تک سائنٹفک سوسائٹی علی گڈھ ترجمہ کا کام کرتی رہی ہے - اتنی مدت میں تمام مغربی علوم و فنون کے دیسی زبانوں میں منتقل ہونے کی توقع کی جائے - تیسری دلیل اُنھوں نے لکھی ہے کہ جب یونانی سے عربی میں ترجمے ہوئے اُس زمانہ میں عربی تمام ممالک میں حکومت کرنے والی زبان تھی اور کسی قوم نے اُس زبان میں علوم کو ترقی نہیں دی جو اُن پر حکومت کرنے والی تھی" یہ دلیل بھی تقریباً اسی تقریر کا اعادہ ہے جو سرسید نے ایجوکیشن کمیشن کی شہادت میں کی تھی - بلاشبہ تاریخ میں کوئی ایسی مثال موجود نہیں ہے کہ کسی محکوم قوم نے علوم کو اپنی زبان میں ترقی دی ہو لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ آیندہ بھی ایسا وقوع میں نہیں آ سکتا - حکومت کے اصول بدلنے سے دنیا کے تمام حالات بدل گئے ہیں - شایستہ سلطنتوں کی رعایا اب وہ کام کر سکتی ہے - جو خود سلطنتیں نہیں کرسکتیں

کہہ چکا ہوں یا کیا کرچکا ہوں۔ وہ اس بات کو کہ اُس کی پہلی کارروائی غلط ثابت ہو یا اُسکے افعال واقوال کو لوگ متناقض سمجھیں نہایت بہتر جانتا ہے بہ نسبت اس کے کہ جو امر اُس کے نزدیک سردست قوم کے حق میں ضروری ہے اُس میں کسی طرح کی فروگذاشت ہو جائے یہی وجہ تھی کہ سرسید نے اپنے اصلی اور قدیم خیالات کو۔ جو کہ وہ ہندوستان کے پالٹکس کی نسبت رکھتے تھے۔ اخیر زمانہ میں صرف اس بنا پر بالکل بدل دیا کہ وہ خیالات مسلمانوں کی پولٹکل حالت کے موافق نہ تھے؛ یہاں تک کہ نیشنل کانگریس کے بانی مسٹر ہیوم۔ جو سرسید کے قدیم دوست تھے۔ اُن سے ناراض ہو گئے اور انگلستان میں انھوں نے ہندوستان کے ایک شریف مسلمان سے نہایت تعجب کے ساتھ کہا کہ "مجھکو نیشنل کانگریس کا خیال صرف سید احمد خاں کی کتاب "اسباب بغاوت" کو دیکھکر پیدا ہوا تھا۔ مگر میں نہیں جانتا کہ اب اُس کو کیا ہو گیا"

سرسید کو جس وقت قوم کی بھلائی کا خیال پیدا ہوا اُس وقت مسلمانوں کی حالت پر یہ مثل صادق آتی تھی کہ "اونٹ رے اونٹ تیری کونسی کل سیدھی" ان میں صدہا باتیں اصلاح طلب اور اُنکے متعلق صدہا مشکلات حل طلب تھیں۔ اگر سرسید جزئیات کی اصلاح یا حل کرنے کا ارادہ کرتے تو عمر بھر میں ایک کام کے پورا کرنے سے بھی عہدہ برآنہ ہوتے۔ انھوں نے تمام خرابیوں کی اصلاح اور تمام مشکلات کا حل اس بات میں دیکھا کہ قوم میں تعلیم کی اشاعت کی جائے۔ مگر قومی تعلیم و تربیت خود ایک عظیم الشان کام تھا جس کے لئے صدیاں درکار تھیں اس لئے انھوں نے خیال

بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۵۵ - پہلے تمام رفاہ عام کے کام خود سلطنتوں کو کرنے پڑتے تھے اور رعایا کو۔ خواہ وہ رعایا بادشاہ کی ہم قوم ہو اور خواہ غیر قوم - ان کاموں سے کچھ سروکار نہ ہوتا تھا۔ مگر اب وہ سب کام خود رعایا کرتی ہے۔ وہ درسگاہیں اور یونیورسٹیاں اور ہوسٹل قائم کرتی ہے، ملکوں میں مذہب کی اشاعت کرتی ہے، علمی تحقیقات کے لئے علما کے قافلے اطراف عالم میں بھیجتی ہے، ترجموں کے ذریعہ سے غیر قوموں کے علوم اپنے ملک میں پھیلاتی ہے، ریلیں جاری کرتی ہے، دنیا کی خبریں بہم پہونچا کر ملکوں میں شائع کرتی ہے۔ غرض کہ ملک کے اندرونی انتظام اور بیرونی حملوں کی مدافعت کے سوا سب ملک کی بھلائی کے کام رعایا کرسکتی ہے۔ بے شک ہندوستان کی رعایا حالت موجودہ میں بہت سے بڑے بڑے رفاہ کے کام مثل انگلستان کی رعایا کے نہیں کرسکتی مگر طرز حکومت اُن کو آہستہ آہستہ سب باتیں سکھلاتی جاتی ہے چنانچہ جسقدر قومی رفاہ کے کام ہندوستان کی رعایا نے اس صدی کے اخیر نصف میں کئے ہیں ہندوستان کی تاریخ میں ہرگز اُنکی مثال نہیں مل سکتی۔ پس اس زمانہ کے حالات کو زمانہ گذشتہ کے حالات پر قیاس کرنا صحیح نہیں ہے ۱۲

کیا کہ سب سے مقدم مسلمانوں کو پولٹیکل بے وقعتی سے نکالنا اور ملک کی حکومت میں جس قدر حصّہ لینے کا حق گورنمنٹ نے اُن کو بحیثیت ہندوستان کی رعایا ہونے کے دیا ہے اُسکا اُن میں استحقاق پیدا کرنا ہے جو بغیر اس کے - کہ قوم میں ایک مناسب تعداد ہندوستان اور انگلستان کی یونیورسٹیوں کے گریجوئٹس کی پیدا ہو جائے - کسی طرح ممکن نہیں - اس کے سوا تمام ترقیات کی جڑ خیالات کی ترقی اور دماغی تربیت ہے جسکے لئے انگلش لٹریچر کی اعلیٰ درجہ کی تعلیم نہایت ضروری ہے پس جس بات کو انھوں نے ہائی ایجوکیشن یا لٹریری تعلیم میں مخل سمجھا اُس کی ہمیشہ مدافعت کرتے رہے اسی بنا پر وہ جس طرح اورنٹیل تعلیم اور ورنیکل تعلیم کے مخالف تھے اسی طرح - جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے - وہ ٹکنکل ایجوکیشن کے بھی اُس صورت میں سخت مخالف تھے کہ اُس سے لٹریری تعلیم کو صدمہ پہنچنے کا اندیشہ ہو - لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا بالکل غلط ہے کہ وہ درحقیقت ہندوستانیوں کے لئے ٹکنکل ایجوکیشن کی ضرورت نہیں سمجھتے تھے بلکہ اس کی وجہ بھی وہی ہائی ایجوکیشن یا لٹریری تعلیم کی حمایت تھی جس کی نسبت ان کو خیال ہو گیا تھا کہ گورنمنٹ اُس کو بتدریج موقوف کرنا چاہتی ہے -

اسی اصول پر - کہ جو سب سے اہم اور ضروری چیز ہے صرف اُسی پر سردست اکتفا کرنا چاہئے سرسید نے جس قدر کوشش کی وہ لڑکوں کی تعلیم کے لئے کی اور لڑکیوں کی تعلیم پر کبھی ہاتھ نہیں ڈالا یہاں تک کہ لوگوں نے اُن کو تعلیم نسواں کا مخالف تصور کیا - اگرچہ ہمارے نزدیک اصل سبب تعلیم نسواں کی طرف توجہ نہ کرنے کا یہ تھا کہ اول تو جب سے انکو مسلمانوں کی سوشل رفارم کا خیال پیدا ہوا اُس وقت سے اخیر دم تک وہ فیمل سوسائٹی سے بالکل علیحدہ رہے ؛ غدر سے چند روز بعد اُن کی والدہ اور بی بی کا انتقال ہو گیا اور دلی کی آمد و رفت بالکل موقوف ہو گئی - اگرچہ زنانہ سوسائٹی کی حالت سے وہ بے خبر نہ تھے مگر جو فیلنگ خود اُس سوسائٹی میں رہکر اور ہر وقت آنکھ سے اُن کی حالت دیکھکر ایک ذکی الحس آدمی کے دل میں پیدا ہو سکتی ہے وہ صرف سنی سنائی یا کبھی کبھی کی دیکھی ہوئی باتوں سے ہرگز پیدا نہیں ہو سکتی دوسرے اُن کے خاندان کی فیمل سوسائٹی کی حالت بہ نسبت اکثر مسلمان خاندانوں کے بہت عمدہ تھی ؛ اُن کے خاندان کی عورتوں سے میری اکثر رشتہ دار عورتوں کو ملنے کا اتفاق ہوا ہے جو اُن کے اخلاق و عادات اور لیاقت اور سنجیدگی کی حد سے زیادہ تعریف کرتی ہیں - خود سرسید نے ایجوکیشن کمیشن میں اور اپنی متعدد اسپیچوں میں اپنے خاندان کی عورتوں کے لکھے پڑھے

ہونے کا حال بیان کرکے اس خیال کی تردید کی ہے کہ مسلمان عورتیں عموماً جاہل ہوتی ہیں
یہی وجہ تھی کہ جب مرآۃ العروس پہلی ہی بار چھپکر شائع ہوئی تو جو نقشہ اُس میں عورتوں کی اخلاقی
حالت کا کھینچا گیا تھا اس کو دیکھکر سرسید کو نہایت رنج ہوا تھا اور وہ اُس کو مسلمان شرفا کی زنانہ
سوسائٹی پر ایک قسم کا اتہام خیال کرتے تھے۔

لیکن سب سے بڑا مانع تعلیم نسواں پر متوجہ ہونے کا یہ تھا کہ انھوں نے اُسکی دشواریوں کا
بخوبی اندازہ کر لیا تھا اور ان کے نزدیک ابھی وہ وقت بہت دور تھا کہ مسلمان شرفا کی لڑکیوں کی تعلیم
کا ایک باقاعدہ اور قابل اطمینان انتظام کرنا ممکن ہو۔ چنانچہ انگلستان جاتے ہوئے جب مس کارپنٹر
سے اُن کی ملاقات ہوئی اور اُنھوں نے ایک کتاب جسمیں ہندوستانیوں کی رائیں اور چٹھیاں
مس صاحبہ کی کوششوں کی نسبت درج تھیں۔ سرسید کے سامنے اس غرض سے کہ وہ بھی
اپنی رائے تعلیم نسواں کے متعلق اُس میں لکھ دیں۔ پیش کی تو سرسید نے اُس میں مندرجۂ ذیل
عبارت لکھی تھی جو اُن کے سفرنامہ میں درج ہے۔

"مجھکو بردوہ دخانی جہاز میں۔ جبکہ میں لندن کو جاتا تھا۔ مس کارپنٹر صاحبہ سے ملاقات حاصل
ہونے کی عزت اور بے انتہا مسرت حاصل ہوئی۔ جب سے میں نے اُن کا نام اور اُنکی کوششوں کا حال نسبت
تعلیم ہندوستانی عورات کے سنا تھا میں بہت مشتاق اُن کی ملاقات کا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ بطور نعمت غیر
مترقبہ اُن کی ملاقات ہوگئی۔"

"اُن کی عالی ہمتی اور بلند نظری اور تہذیب اخلاق اور نیک نیتی کا ثبوت خود وہی مضمون ہے جو انھوں نے
اختیار کیا ہے؛ یعنی اس گروہ کی تعلیم میں۔ جس کو خدا تعالےٰ نے مرد کے لئے بطور دوسرے ہاتھ کے بنایا
ہے اور جس کو نیک کاموں کے بخوبی انجام ہونے کے لئے مرد کا مددگار کیا ہے۔ کوشش کرنا۔ درحقیقت
یہ مضمون اور اُس پر اُن کی کوشش نہایت قدر کے لایق ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ نیک کام پر کوشش ہوئی
گو وہ کسی طرح پر ہو۔ نہایت اچھی ہے؛ کیونکہ اگر وہ کوشش درست بنیاد پر قائم ہوئی ہے تو وہ کامیاب
ہوگی اور اگر اُس میں کچھ غلطی ہے تو اُس سے امید ہے کہ اوروں کو اُس نیک کام پر کوشش کرنے کی
تحریک ہوگی۔ جس سے توقع ہے کہ کوئی نہ کوئی کوشش بغیر کسی غلطی کے شروع ہوگی اور بالکل ٹھیک

لہ یہ ایک شریف لیڈی برسٹل کی رہنے والی ڈاکٹر کارپنٹر کی بیٹی تھیں جنھوں نے ہندوستان کی عورتوں کی
جہالت کا حال سنکر ہندوستان کا ارادہ اس غرض سے کیا تھا کہ ہندوستانی عورتوں کی تعلیم میں کوشش کریں
اور اب واپس انگلستان کو جاتی تھیں ۱۲

نیک نتیجہ تک پہنچے گی۔"

"نیک کام پر کوشش کرنے والوں کی کوششیں کبھی کبھی اس لئے کہ وہ اُن لوگوں کی عادات و رسم و رواج کے مخالف طریقے پر - جن کی بھلائی کے لئے کوشش کی جاتی ہے - قائم کی گئی ہیں برباد ہوگئی ہیں حقیقت میں ایسا کرنا گویا نیچر کا مقابلہ کرنا ہے - اور خود اس نیکی کی رکاوٹ کا آلہ بننا ہے - خدا نے یوشع کیلئے سورج کا تھم جانا کہا، حالانکہ شاید وہ غلط تھا، کیونکہ اگر وہ واقع ہی ہوا تو شاید زمین کا تھم جانا صحیح ہوتا؛ مگر خدا نے نیک بات پھیلانے میں بالکل عام سمجھ کی - جو اس زمانہ میں تھی - رعایت کی - پس اگر اب ہم کسی نیک بات کے پھیلانے میں عام رواج کی رعایت نہ کریں گے تو خود خدا کی اس حکمت کو توڑیں گے اور خود اپنے لئے نقصان کا سبب ہوں گے۔"

"بہر حال میں خدا سے چاہتا ہوں کہ اس کارپنٹر صاحبہ کی کوششیں کامیاب ہوں اور ہندوستان میں کیا مرد اور کیا عورت سچائی اور علم کی روشنی سے - جو دونوں اصل میں ایک ہیں - روشنضمیری حاصل کریں۔"

سرسید کی اس تحریر سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ - گو وہ عورتوں کی تعلیم کو نہایت ضروری سمجھتے تھے مگر ہندوستانیوں کے اور خاصکر ہندوستان کے شریف مسلمانوں کے رسم و رواج الف و عادات اور مذہبی اوہام و خیالات سے اس کو اس قدر بعید جانتے تھے کہ سردست اس میں کوشش کرنے کو بے سود اور رائگاں سمجھتے تھے - اسی لئے انھوں نے بارہا اپنی اسپیچوں میں ایسے الفاظ استعمال کئے ہیں جن سے لوگوں کو اس بات کا شبہہ ہوگیا تھا کہ وہ عورتوں کی تعلیم کے بالکل مخالف ہیں - یہاں ہم اُن کی خاصکر اس اسپیچ کا - جو انھوں نے ۱۸۸۴ء میں بمقام گرداسپور خاتونان پنجاب کے ایڈریس[۱] کے جواب میں لکھکر دی تھی اور جو ہندوستان کی تاریخ میں پہلی اسپیچ تھی جس میں شریف ہندو و مسلمان اور عیسائی عورتوں کو مخاطب کیا گیا تھا خلاصہ نقل کرتے ہیں - ایڈریس میں سرسید کی اُن کوششوں کی شکرگزاری کے بعد - جو کہ وہ لڑکوں کی تعلیم کے لئے کر رہے تھے - اشارۃً اس بات کا بھی ذکر تھا کہ وہ عورتوں کی تعلیم پر بھی اسی طرح توجہ کریں - سرسید نے اس کے جواب میں کہا -

"اے میری بہنو! آج کی رات میرے لئے شب قدر سے کچھ کم قدر کی نہیں ہے - جو ایڈریس

---

[۱] یہ ایڈریس دراصل مسلمان عورتوں کی طرف سے جس کے بانی مبانی سردار محمد حیات خاں بہادر کی بیگم صاحبہ تھیں - دی گئی تھی مگر اس کے نیچے بعض ہندو اور عیسائی عورتوں کے بھی دستخط تھے ۱۲

تمہاری طرف سے مجھکو دی گئی ہے - وہ میرے لئے ایسی عزت ہی جو آج تک ہندوستان میں کسی کو نصیب نہیں ہوئی - میں تمہاری اس شفقت کا دل سے شکرگزار ہوں "

" اے میری بہنو! میں اپنی قوم کی مستورات کی بہت زیادہ قدر کرتا ہوں، ہماری قوم کے مردوں نے اپنے باپ دادا کی بزرگی کو خاک میں ملا دیا ہے مگر خدا کے فضل سے تم میں ہمارے باپ دادا کے بزرگ، نشان بدستور موجود ہیں - یہ سچ ہے کہ ہم مردوں میں شبلی اور جنید موجود نہیں ہیں - مگر خدا کا شکر ہے کہ تم میں ہزاروں لاکھوں رابعہ بصری موجود ہیں "

" تمہاری نیکی، تمہاری بردباری، تمہاری محبت، ہر قسم کی مشکلات کی برداشت اور اس پر صبر، بچوں کی پرورش، گھر بار کا انتظام، ہمارے فخر کا باعث ہے - اگر کوئی قوم تمام دنیا میں اپنے تئیں کسی قسم کا فخر دے سکتی ہے تو ہم اپنی قوم کی مستورات کو دنیا کی قوموں پر فخر دے سکتے ہیں - یہ ہمارا فخر تمہارے ہی سبب سے ہے "

" اے میری بہنو! میں اپنی قوم کی خاتونوں کی تعلیم سے بے پرواہ نہیں ہوں - میں دل سے اُن کی ترقی تعلیم کا خواہاں ہوں - مجھکو جہاں تک مخالفت ہے اس طریقہ تعلیم سے ہی جسکے اختیار کرنے پر اُن کے کوتاہ اندیش مائل ہیں - میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ تم اپنا پرانا طریقہ تعلیم اختیار کرنے پر کوشش کرو - وہی طریقہ تمہارے لئے دین و دنیا میں بھلائی کا پھل دے گا - اور کانٹوں میں پڑنے سے محفوظ رکھے گا "

اس کے بعد سرسید نے پرانا طریقہ تعلیم نسواں بہت تفصیل کے ساتھ بیان کیا اور پھر یہ کہا کہ " اے میری بہنو تم یقین جانو کہ دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں ہے جس میں مردوں کی حالت درست ہونے سے پہلے عورتوں کی حالت میں درستی ہوگئی ہو، اور کوئی قوم دنیا میں ایسی نہیں جس میں مردوں کی حالت درست ہوگئی ہو اور عورتوں کی حالت درست نہ ہوئی ہو، ان سچے واقعات نے میرے دل میں بہت کچھ اثر کیا ہے میں نے تمہارے لڑکوں کی تعلیم پر جو کوشش کی ہے اس سے تم یہ نہ سمجھو کہ میں اپنی پیاری بیٹیوں کو بھول گیا ہوں؛ بلکہ میرا یقین ہے کہ لڑکوں کی تعلیم پر کوشش کرنا لڑکیوں کی تعلیم کی جڑ ہے - بس جو خدمت میں تمہارے لڑکوں کے لئے کر رہا ہوں درحقیقت وہ لڑکوں لڑکیوں دونوں کے لئے ہے "

" میری یہ خواہش نہیں ہے کہ تم اُن مقدس کتابوں کے بدلے - جو تمہاری دادیاں نانیاں پڑھتی آئی ہیں - اس زمانہ کی مروجہ نامبارک کتابوں کا پڑھنا اختیار کرو جو اس زمانہ میں پھیلتی جاتی ہیں - مردوں کو جو تمہارے لئے روٹی کما کر لانیوالے ہیں، - زمانہ کی ضرورت کے مناسب کچھ ہی علم یا کوئی سی زبان سیکھنے

اور کیسی ہی نئی چال چلنے کی ضرورت پیش آئی ہو۔ مگر ان تبدیلیوں سے جو ضرورت تعلیم کے متعلق تمکو پہلے تھی۔ اُسمیں کچھہ تبدیلی نہیں ہوئی"

"تمہارا فرض تھا کہ تم اپنے ایمان اور اسلام سے واقف ہو، اسکی نیکی اور خدا کی عبادت کی خوبی کو تم جانو، اخلاق میں نیکی اور نیکدلی رحم و محبت کی قدر سمجھو اور ان سب باتون کو برتاؤ میں لاؤ، گھر کا انتظام اپنے ہاتھون میں رکھو، اپنے گھر کی مالک رہو، اسیرمثل شہزادی کے حکومت کرو اور مثل ایک لائق وزیرزادی کے منتظم رہو، اپنی اولاد کی پرورش کرو، اپنی لڑکیون کو تعلیم دیکر اپنا سا بناؤ، خدا پرستی خداترسی ہمسایون کے ساتھ ہمدردی اپنا طریقہ رکھو۔ یہ تمام سچی تعلیم نہایت عمدگی سے اُن کتابون سے حاصل ہوتی ہے جو تمہاری دادیان نانیان پڑھتی تھیں۔ جیسی وہ اُس زمانہ میں مفید تھین ویسی ہی اس زمانہ میں مفید ہیں۔ پس اس زمانہ کی نامفید اور نامبارک کتابون کی تمکو کیا ضرورت ہے؟ ہان یہ بات سچ ہے کہ تمہارے خاندانون کے مردون کی نالائقی اور جہالت سے تمہارے متعدد حقوق۔ جو خدا کے حکم سے تمکو ملے ہیں اور جنکا انسانیت کی رو سے تمہارا حق ہے۔ برباد ہوگئے ہیں! وہ حق تمکو پھر واپس دلانے کی یہی تدبیر ہے کہ تمہارے لڑکون کی تعلیم میں کوشش کیجائے۔ جب کہ وہ تعلیم یافتہ ہوجاوینگے وہ مغصوبہ حق از خود بے مانگے تمکو واپس ملین گے"

آخر میں سرسید نے ہندو اور عیسائی خاتونون کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ "اے میری ہندو اور عیسائی بہنو! تمنے جو اپنی محبت اور وطنی یگانگت سے اپنی مسلمان بہنون کے ساتھہ اس ایڈریس میں اور اس امداد میں جو مدرستہ العلوم کے غریب طالبعلموم کو دی گئی ہے۔ شرکت کی وہ ایک نمونہ تمہاری محبت اور یگانگت کا ہے۔ میں دل سے اُسکے لئے تمہارا شکریہ ادا کرتا ہون اور دعا دیتا ہوں کہ تمپر بھی خدا تعالے کی برکت ہو اور ہر طرح کی ترقی اور خوشی تمکو نصیب ہو۔ آمین"

اس اسپیچ سے صاف ظاہر ہے کہ سرسید اُس وقت تک جب تک کہ لڑکون میں تعلیم عام نہو جائے لڑکیون کیلئے ضروری مسائل مذہبی کی تعلیم کافی سمجھتے تھے۔ مگر اُنکی اسپیچ میں یہ بات قابل غور ہے کہ اُنہون نے جو صرف لڑکون کے تعلیم یافتہ ہو جانے سے یہ امید ظاہر کی ہے کہ اُس سے عورتون کے مغصوبہ حقوق بن مانگے از خود واپس ملجائین گے۔ اُنکی یہ امید پوری ہوتی نظر آتی ہے یا نہیں؟ اگرچہ تعلیم و تربیت کا نتیجہ یہی ہونا چاہیے کہ تعلیم یافتہ نوجوان عورتون کے حقوق پہچانین، اُن میں تعلیم کی کمی سے جس قدر عقل یا سمجھہ یا اخلاق کی کمی ہے اُسکو اسی طرح برداشت کریں جس طرح اُنکے اسلاف برداشت کرتے آئے ہیں، اُن سے جہانتک

کہ قوم میں تعلیم نہایت محدود ہے۔ اُن باتوں کی توقع نہ رکھیں جو یورپ کی ایک تعلیم یافتہ لیڈی سے رکھنی چاہیے۔ مگر افسوس ہے کہ ہمارے تعلیم یافتہ نوجوان تعلیم و تربیت سے بجائے تحمل و برداشت اور سلوک و درگذر اور قومی حمیت اور رقتِ جنسیت کے۔ یہ سبق سیکھتے ہیں کہ تمدن اور معاشرت کے جس درجہ پر اہل یوروپ کو صدیوں اور قرنوں کے بعد پہنچنا نصیب ہوا ہے اُنکو یونیورسٹی کی سند پاتے ہی اُسکے خواب نظر آنے لگتے ہیں اور مستثنیٰ صورتوں کے سوا ہر تعلیم یافتہ نوجوان کی یہ تمنا معلوم ہوتی ہے کہ اگر ممکن ہو تو لندن یا پیرس کی کسی لیڈی سے شادی کریں اور اگر یہ امر اُنکی قدرت سے باہر ہو تو غالباً وہ ایک مشن اسکول کی تعلیم پائی ہوئی نیٹو کرسچن عورت کو قوم کی اعلیٰ سے اعلیٰ خاندان کی لڑکی سے۔ جو باقاعدہ کسی اسکول کی تعلیم یافتہ نہو۔ بہتر اور افضل سمجھیں گے۔ پس جبکہ یہ حالت ہے تو اُنسے کیا امید ہوسکتی ہے کہ وہ اپنی قوم کی عورتوں کے مغصوبہ حقوق واپس دینگے؟ اُنکا بڑا اسلوک اپنی قوم کی ہم کفو لڑکیوں کے ساتھ یہی ہوسکتا ہے کہ وہ سرے سے اُنکے حقوق کا بوجھ ہی اپنے ذمہ نہ لیں بلکہ اُنکو بدستور جاہل اور ناتربیت یافتہ لڑکوں کے لئے چھوڑ دیں۔ اگرچہ ابھی تک سوسائٹی کے دباؤ نے بہت کچھ اُنکے جذبات کو دبا رکھا ہے لیکن آخر کار ایک طرف کی تعلیم اور دوسری طرف کی جہالت قوم کے حق میں یقیناً بُرے نتائج پیدا کریگی۔

مذہبی تحقیقات مذہب کے متعلق جو کچھ سرسید کی مذہبی خدمات اور فارمیشن کے بیان میں لکھا گیا اُس سے یا تو اُن کوششوں کا دکھانا مقصود تھا جو اسلام اور مسلمانوں کی خیرخواہی اور حمایت میں اُنسے ظہور میں آئیں اور یا اُس دلیری اور جرأت کا بیان کرنا تھا جو اُنھوں نے اپنی مذہبی تحقیقات کے اعلان کرنے میں ظاہر کی یہاں ہم اُنکی مذہبی تحقیقات کے متعلق ایک دوسری حیثیت سے بحث کرنا چاہتے ہیں جس سے اس بات کا اندازہ کرنا ممکن ہو کہ اس شخص میں مذہبی عقدوں کے حل کرنے اور اُنکی پیچیدگیوں کے سلجھانے اور مذہب کو حقائق محققہ پر منطبق کرنے کی کسقدر قابلیت تھی؟ نہ وہ واعظ تھا نہ مفتی نہ فقیہ تھا نہ محدث، نہ معانی و بیان کا ماہر تھا نہ منطق و فلسفہ کا مدعی تھا؛ باوجود اسکے زمانہ حال کے شبہات۔ جو لوگوں کے دل میں اسلام کی نسبت پیدا ہوتے تھے۔ اُنکا حل کرنے والا تمام ہندوستان میں صرف یہی ایک شخص تھا جسکی تحریریں مجروح دلوں پر مرہم کا کام کرتی تھیں اسکے پاس اطراف ہندوستان سے اسلام کی نسبت بیسوں حل طلب سوالات صرف اس وجہ سے آتے تھے کہ موجودہ

علماے اسلام اُنکا شافی جواب نہ دے سکتے تھے۔ چنانچہ بہت سے خطوط۔ جو سرسید نے اس قسم کے سوالات کے جواب میں لکھے ہیں۔ بعض احباب کے بھیجے ہوے اسوقت ہماری پاس موجود ہیں، بعض خطون کے جواب تہذیب الاخلاق یا انسٹیٹیوٹ گزٹ وغیرہ کے ذریعہ سے شائع ہوے ہیں اور بعض[1] اس مرحوم نے ہمارے سامنے لکھکر لوگون کو بھیجے ہیں۔ اکثر لوگ[2] دور دور سے قصد کرکے اسی غرض سے سرسید کے پاس آتے تھے اور اپنے شبہات بیان کرتے تھے اور مطمئن ہوکر واپس جاتے تھے۔ اسی طرح اس مرحوم کے پاس بہت سے لوگ شکریہ کے خط[3] بھیجتے تھے کہ آپ کی تصنیفات سے ہمکو یہ اور فائدے پہنچے ہیں۔

ہم پہلے لکھہ چکے ہیں کہ سرسید نے جسقدر اختلافات مذہبی مسائل میں علمائے سلف سے کئے

---

[1] ایک صاحب نے۔ جنکا نام احمد بابا مخدومی تھا۔ غالباً لاہور سے ۱۸۹۶ء میں سرسید کے پاس یہ سوال بھیجا تھا کہ قرآن مجید میں یحییٰ کی نسبت "بَرًّا بِوَالِدَیْهِ" اور عیسیٰ کی نسبت "بَرًّا بِوَالِدَتِي" آیا ہے اگر فی الواقع عیسیٰ کا کوئی باپ ہوتا تو اُنکا قول بوالدتی کی جگہ بوالدی نقل کیا جاتا۔ اگرچہ سرسید نے تفسیر میں اس مسئلہ پر مفصل بحث کی ہے مگر خاص کر اس شبہہ سے کچھہ تعرض نہیں کیا۔ اُنھون نے جواب میں یہ چند سطرین لکھہ بھیجین "جناب مخدومی! حضرت عیسیٰ تمام لوگون میں ابن مریم کرکے مشہور تھے۔ اس شہرت کے سبب قرآن مجید میں بھی انکو ابن مریم سے تعبیر کیا ہے۔ بہت لوگ اسی طرح اپنی مان کے نام سے مشہور ہوئے ہیں پس قرآن مجید میں جس طرح ابن مریم کہا گیا ہے بَرًّا بِوَالِدَتِي بھی کہا ہے۔ اس لفظ سے یہ سمجھنا کہ انکا کوئی باپ نہ تھا صحیح نہیں ہے۔ کیا سادات کو۔ جو بنی فاطمہ کرکے مشہور ہیں۔ آپ بن باپ کا پیدا ہوا خیال کرتے ہیں؟ والسلام"۔

[2] مولوی سید ممتاز علی بی۔ اے کے دل میں۔ جب کہ وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھتے تھے۔ اسلام کی نسبت طرح طرح کے شبہات پیدا ہوگئے تھے اُنھون نے سرسید کو۔ جو اُسوقت بتقریب ممبری کونسل کلکتہ میں تھے۔ اپنے شبہات لکھکر بھیجے۔ اُسوقت تک سرسید اُنکو نہیں جانتے تھے۔ مگر اُنھون نے فوراً اُنکو خط لکھا کہ خط و کتابت سے کچھہ فائدہ نہوگا، تم چند روز کے لئے کلکتہ چلے آؤ اور ریل کے کرایہ کی ضرورت ہو تو میں بھجوا دون۔ وہ فوراً کلکتہ چلے گئے اور چند صحبتون میں اُنکے تمام شبہات زائل ہو گئے۔

[3] انہیں خطون میں سے ایک خط ہمارے سامنے سرسید کے نام سیوگہ علاقہ مدراس کے اہل اسلام کی جماعت کی طرف سے۔ جسپر سید احمد قاضی سیوگہ اور شیخ بابن محمد منشی سیوگہ اور چار معزز مسلمانون کے دستخط تھے پہنچا تھا جسکو ہم نے سرسید صاحب سے مانگ لیا تھا۔ اوس میں سے چند فقرے ہم اُنہیں کی عبارت میں یہان نقل کرتے ہیں "جناب کی تفسیر ہر ایک مسلمان کے دل پر ایسی روشنی ڈالتی ہے جیسی اندھیری رات پر

ہیں اُن میں سے اکثر ایسے ہیں جن میں اور لوگ بھی اُنکے ساتھ شریک ہیں لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ اُنھوں نے محض اگلے محققین کی تقلید سے ان اختلافات پر مبادرت کی ہے۔ اول تو جس مقصد سے اگلے محققین نے جمہور سے اختلاف کیا ہے وہ مقصد سرسید کے مقصد کے ساتھ متحد و نہ تھا۔ سرسید کے تمام اختلافات کا اصل مقصد اسلام کی طرف سے معترضین کے اعتراضات یا متشککین کے شبہات کا رفع کرنا تھا بخلاف اگلے محققین کے جنکے اختلافات کا ہرگز یہ منشا نہیں ہو سکتا؛ کیونکہ جو اعتراضات آج کل مذاہب پر وارد کئے جاتے ہیں اُنسے اُن بزرگوں کے کان کبھی آشنا نہ ہوئے تھے۔ دوسرے جن لوگوں نے سرسید کی طرز تصنیف کو بنظر غور دیکھا ہے وہ اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ وہ جب تک کسی مسئلہ کی نسبت خود اپنی کوئی رائے قایم نہ کر لیتے تھے اُسوقت تک کتابوں کی طرف بہت ہی کم رجوع کرتے تھے پھر اگر کسی مصنف کا قول اُنکے موافق نکل آتا تھا تو اُسکو بھی اپنی راے کی تائید کے لئے لکھدیتے تھے ورنہ صرف اپنی راے لکھدینے پر اکتفا کرتے تھے۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ جب اُنکی تحریر چھپکر شائع ہو چکی اُسوقت حسن اتفاق سے کسی محقق کا قول سرسید کی راے کا موئد اُنکے کسی دوست کو معلوم ہوا؛ اور اُسنے یا تو سرسید کو اُس سے مطلع کر دیا اور یا بذریعہ تحریر کے کسی میگزین یا اخبار

بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۷۳ - پر آفتاب کی۔ اس تفسیر سے ہمکو بہت بڑا فائدہ یہ ملتا ہے کہ ایک تحصیل شدہ مولوی اور ایک اُردو خوان ہر دو کو برابر سمجھاتی ہے۔ جسکو عقل سے کچھ بھی تعلق ہے وہ بلا شبہ یہ کہہ سکتا ہے کہ اس تفسیر کے پڑھنے و سننے سے حق و باطل میں تمیز ہوتی ہے اور دل کو یقین ہو جاتا ہے کہ اسلام فطرت کے مطابق ہے۔ ہم آج تک مذہبی باتوں میں عقل کو دخل نہیں دیتے .... اور کبھی یہ نہیں خیال میں آیا کہ انسانی بات کیونکر ہو سکتی ہے ہاں یہ تو ضرور سمجھتے تھے نصاروں کے (یعنی نصارے کے) تین خدا یا ان ملکر ایک ہونا غیر ممکن ہے؛ بدستور ہنود کے ایک شخص کو تین مورتہ اور رو سے زیادہ کئی ہاتھ اور آدمی کو ہاتی کا سر لگائے جانا یہ سب غلط (یعنی عیسائیوں اور ہندوں کے ہاں جو ناممکن باتیں مانی جاتی ہیں اُنکو تو ہم غلط جانتے تھے) مگر وہی غیر ممکن بلکہ اُس سے زیادہ تعجب انگیز باتیں ہمارے علما و واعظین کی کرامت ہمکو دکھائی نہ دی۔ الحمد للہ اس حق گو تفسیر کی بدولت اس روحانی مہلک بیماریوں کو آج غسل صحت ملا .... مسلمانوں کے پاک دلوں میں وہ گندی گندی باتیں جمی ہوئی تھیں جیسے کعبہ میں بتان؛ اب اُنکا یک بیک دور ہونا خدا کے مقدس کلام کی سچی تفسیر کا نتیجہ ہے۔ ہم اس احسان کے بدلے اپنی کھال کی جوتیاں بنا دیں تو حضرت کی تفسیر کے ایک فقرہ کا معاوضہ نہوگا ۱۲

میں چھپوا دیا۔ اصل یہ ہے کہ سرسید کو مذہبی تحریرات میں جسقدر اپنے دماغ سے کام لینا پڑتا تھا اسقدر دوسرے مصنفون کی کتابون سے مدد ملنے کی اُنکو توقع نہ تھی اور اسلئے وہ خود کتابون کی طرف بہت کم رجوع کرتے تھے۔ یہی سبب ہے کہ اُنکی تصنیفات میں کتابون کے حوالے جتنے کے ہونے چاہئین تھے اُسنے بہت کم ملتے ہیں اور جسقدر ملتے ہیں اُن میں زیادتر ایسے ہیں جو اُنکے لئے اور لوگون نے تلاش کرکے بہم پہنچائے ہیں۔ اسکے سوا بہت سے مقامات اُنکی تصنیفات میں ایسے موجود ہیں جن میں اگرچہ اُنھون نے سلف کے اقوال سے اپنی راے پر استشہاد کیا ہے مگر جب اُن اقوال کے مجمل اور غیر شافی بیان کو سرسید کے مدلل اور شافی بیان کے مقابلہ میں دیکھا جاتا ہے تو دونون میں اسقدر فرق معلوم ہوتا ہے کہ مشکل سے اُن اقوال کو سرسید کی راے کا ماخذ قرار دیا جاسکتا ہے باوجود ان سب باتون کے ہم بے شمار تحقیقاتین سرسید کی مذہبی تصنیفات میں ایسی اچھوتی پاتے ہیں جنکو بظاہر اس چودھوین صدی کے محقق سے پہلے کسی کے قلم نے مس نہیں کیا اور بہت سے ایسے اُرجنل خیالات اور اُرجنل رائین دیکھتے ہیں جنکو اُسکی اولیات کے ساتھ تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

اُسی نے سب سے پہلے مذہب کی سچائی کا یہ معیار قرار دیا کہ اُسکی تعلیم میں کوئی بات فطرت انسانی یا فطرۃ اللہ کے خلاف نہو اور اُسی نے سب سے پہلے اس بات کا دعویٰ کیا کہ اس معیار پر جیسا کہ اسلام پورا اُترتا ہے دنیا کا کوئی مذہب ایسا پورا نہیں اُترتا۔

اُسی نے سب سے پہلے اس بات کو سمجھا کہ نبی کی عظمت اور بزرگی اس میں نہیں ہے کہ اُس سے معجزات اور پیشین گوئیان صادر ہون بلکہ اُسکی تمام عظمت اور تمام بزرگی یہیں ہے کہ جب منکرین اُس سے معجزہ طلب کرین تو اُنکو جواب دے کہ "انما الآیات عند اللہ" اور سبحان ربی ھل کنت الا بشراً رسولاً۔ اُسی کا ذہن سب سے پہلے اس نکتہ تک پہنچا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات کا قرآن میں مذکور نہونا جسکو مخالفین آپ کی نبوت کے عدم ثبوت کی ایک دلیل قرار دیتے ہیں۔ یہی سب سے بڑی دلیل آپ کی سچائی اور نبی برحق ہونے کی ہے۔

اُسی نے سب سے پہلے بتایا کہ قرآن میں سب سے بڑی وجہ اعجاز یہ ہے کہ اسکی تعلیم فطرت انسانی کے مطابق اور جاہل و عالم اور وحشی و شائستہ سب کی سمجھ کے موافق اور ہر زمانہ کی حالت کے مناسب ہے اور صرف بتاہی نہیں بلکہ اپنے دعوے کا ثبوت اُس حد تک پہنچا دیا جس سے

زیادہ مذہبی مسائل کا ثبوت ہرگز نہیں دیا جاسکتا۔

اُسی نے سب سے پہلے اس بات کو دریافت کیا کہ اسلام جو مدت دراز سے غیر قومون میں مطعون و متہم چلا آتا ہے اسکے مختلف اسباب میں سے ایک بڑا سبب یہ ہے کہ اُنھون نے مسلمان فاتحون اور کشورہ کشائون کی بے اعتدالیون کو ایک نتیجہ اسلام کی تسلیم کا قرار دیا ہے اور اوسکو مسلمانون کے کردار کا جوابدہ تصور کیا ہے حالانکہ اسلام ہر ایک طعنہ اور ہر ایک اعتراض سے اُسوقت تک بالکل بری ہے جب تک کہ خود اُسکی تعلیم میں کوئی بات قابل گرفت کے نہ پائی جائے۔

اُسی نے سب سے پہلے اسلام پر سے عیسائی قومون کا یہ الزام رفع کیا کہ شائستگی اور سویلیزیشن کے ساتھ جمع نہیں ہوسکتا اور مسلمان جب تک کہ مسلمان ہیں دنیوی ترقیات میں حصہ نہیں لے سکتے۔

اسی نے سب سے پہلے یہ ثابت کیا کہ آنحضرت صلعم کا کوئی غزوہ اور کوئی سریہ اس ارادہ پر مبنی نہ تھا کہ کفار کو تلوار کے زور سے اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا جائے بلکہ جسقدر چھوٹی یا بڑی لڑائیان آپ کے عہد میں کفارون کے ساتھ ہوئین اُنکا اصل مقصد امن قائم کرنا اور مسلمانون کی مذہبی آزادی کے موانع کو دور کرنا تھا اور اُسی نے نہایت روشن دلیلوں سے اس امر کا ثبوت دیا کہ قرآن میں ایک آیت بھی ایسی نہیں جس میں لوگوں کو جبراً مسلمان کرنے کا حکم ہو بلکہ بیشمار آیتین اسکے برخلاف صاف صاف دلالت کرتی ہیں کہ دین میں کسی قسم کا جبر و اکراہ نہیں ہے۔

اُسی نے سب سے پہلے اس نکتہ کو ظاہر کیا کہ اپنی مذہبی آزادی کے برقرار رکھنے کیلیے دین کے دشمنون سے لڑنا اور اُنکے ظلم و تعدی کا انتقام لینا یہی فطرت انسانی کا مقتضا ہے جسپر انسان عمل درآمد کرسکتا ہے نہ یہ کہ ایک گال پر طمانچہ کھاکر دوسرا گال بھی سامنے کردینا، کیونکہ نہ اسپر کبھی پہلے عمل ہوا ہے اور نہ آیندہ ہوسکتا ہے۔

اُسی نے سب سے پہلے نص قرآنی سے ثابت کیا کہ اُن کفار و مشرکین کے سوا جو مسلمانو سے محض دین کی بابت لڑین، اُنکو جلاوطن کرین اور اُنکے برخلاف لوگون کی مدد کرین کسی مشرک یا کسی کافر کتابی یا غیر کتابی کے ساتھ دوستی کرنا، اُنسے میل جول رکھنا اور صفائی و خلوص سے ملنا دین اسلام کی رو سے منع نہیں ہے۔

اُسی نے سب سے پہلے فقہا کی اس غلطی کو پکڑا کہ ہر ملک مسلمانون کے لئے یا دارالاسلام ہے یا دارالحرب اور ہر کافر حربی ہے یا ذمی، کیونکہ ہجرت اُولی میں جب مسلمان نجاشی کی پناہ میں جاکر رہے تو اُسوقت ابی سینیا پر نہ دارالاسلام کا اطلاق ہوسکتا تھا نہ دارالحرب کا، اور ابی سینیا کے عیسائیون پر نہ اہل حرب کا اطلاق صحیح تھا نہ اہل ذمہ کا۔ اور اسی طرح جن ملکون میں آج مسلمان عیسائی سلطنتون کے محکوم ہیں اور مذہبی امور میں اسلامی سلطنتوں سے بھی زیادہ آزاد ہیں اُن ملکون کو بھی دارالحرب کہہ سکتے ہیں نہ دارالاسلام اور عیسائی حکمرانون کو نہ اہل حرب کہہ سکتے ہیں نہ اہل ذمہ۔

اُسی نے سب سے پہلے نص قرآنی سے استدلال کیا کہ اسلام نے برخلاف شرائع سابقہ کے اسیران جنگ کے قتل کرنے یا غلام بنانے کو ہمیشہ کے لئے موقوف کردیا ہے۔

اُسی نے سب سے پہلے قرآن سے یہ مسئلہ استنباط کیا کہ اگر مسلمان کو اس بات کا احتمال بھی ہو کہ وہ متعدد ازواج میں عدالت نہ کرسکیگا تو اُسکو ایک وقت میں ایک سے زیادہ جورو کرنی جائز نہیں ہے۔

اُسی نے سب سے پہلے اس بات کا ثبوت دیا کہ طلاق کے مسئلہ میں یہودیون کے ہان افراط ہے اور عیسائیون کے ہان تفریط اور عتدال صرف اسلام میں ہے اور بس۔

اُسی نے سب سے پہلے رسول خدا صلعم کا نسب نامہ عدنان سے لیکر اسمٰعیل علیہ السلام تک زمانہ حال کے اصول مسلمہ کے موافق صحیح کرکے دکھایا اور مخالفین کے اس اعتراض کو دفع کیا کہ آنحضرت ؐ کا بنی اسمٰعیل میں سے ہونا ثابت نہیں ہے۔

اُسی نے سب سے پہلے عیسائی مصنفون کی اس غلط فہمی کو رفع کیا کہ مکہ کے قریب اسمٰعیل کا آباد ہونا محض بناوٹ اور افسانہ ہے اور بوسۂ حجر اسود، طواف کعبہ، اشہر حُرم کی تعظیم اور مکہ و منا و عرفات میں جو مناسک ادا کئے جاتے ہیں اُن میں سے کسی بات کو حضرت ابراہیم کے اصول سے تعلق نہیں ہے بلکہ بت پرستی کے اصول جو جنوبی عرب میں جاری تھے اُنسے تعلق ہے اُس نے نہایت روشن دلیلون اور تاریخی شہادتون اور بائیبل کے حوالون سے ثابت کیا کہ ان میں سے ایک بات بھی ایسی نہیں جسکی نظیر بنی اسحٰق یا بنی اسرائیل میں موجود نہو۔

اسی نے سب سے پہلے عیسائی مصنفون کے اس اعتراض کو دفع کیا کہ قوم عاد کا قوم نوحؑ کے بعد اُنکا جانشین ہونا۔ جیسا کہ قرآن سے پایا جاتا ہے۔ صحیح نہیں ہے۔

اُسی نے سب سے پہلے قدیم جغرافیون کی شہادت اور بائبل کے حوالون سے ثابت کیا کہ فاران کا لفظ جو حضرت موسیٰ اور حبقوق نبی کی بشارت میں آیا ہے اور جس سے مسلمان آنحضرت صلعم کی نبوت پر استدلال کرتے ہیں۔ اس سے وادی حجاز مراد ہے نہ وہ مقامات جن کو بعض عیسائی مصنفون نے مسلمانون کے برخلاف فاران کا مصداق قرار دیا ہے۔

اُسی نے سب سے پہلے اُن عظیم الشان فائدون کو بیان کیا جو دیگر مذاہب کو اور خاصکر دین عیسوی کو اسلام کی اشاعت سے پہنچے۔

اُسی نے سب سے پہلے دین اسلام اور مغربی علوم میں مصالحت کی نیاد ڈالی اور اسی غرض سے کم وبیش دو تہائی قرآن کی تفسیر لکھی اور ایسے اصول مقرر کئے جنکے بموجب آیندہ نسلیں اُسکے اِس دشوار کام کو پورا کر سکیں اور اگر اُس سے تفسیر قرآن میں کوئی لغزش ہوئی ہو تو انہیں اصول کے موافق اُسکی اصلاح کر سکیں۔

اُسی نے سب سے پہلے اس بات کو سمجھا کہ اسلام کے لئے اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ قرآن کی جن آیتون کے معنی علماے سلف نے۔ بہ پاس ادب، یا بخوفِ خرق اجماع، یا بسبب عدم ضرورت، یا اس وجہ سے کہ ممالک اسلامیہ میں علماے اسلام کو پوری پوری مذہبی آزادی نہ تہی۔ صاف صاف بیان نہیں کئے اور خاص خاص صورتون کے سوا تمام الفاظِ قرآنی کو اُنکے حقیقی معنون پر مقصور رکہا ہے، اب بہی اُنکو اسی حالت پر چہوڑ دیا جائے! بلکہ ضرور ہے کہ جو الفاظ درحقیقت بطور مجاز واستعارہ وتمثیل کے استعمال کئے گئے ہیں۔ اُنکے اصلی معنی بیان کئے جائیں۔ اور جو شبہات اُنکے حقیقی معنی مراد لینے سے پیدا ہوتے ہیں اُنکو رفع کیا جائے۔

اگرچہ مذہبی تحقیقات کا خداداد ملکہ جو سرسید کی طبیعت میں ودیعت تہا اُسکا ثبوت اُنکی ہرایک تحریر میں۔ جو غدر کے بعد اُنکی قلم سے نکلی۔ نمایان طور پر پایا جاتا ہے۔ مگر تفسیر القرآن جسمیں گویا نئے علم کلام کی بنیاد قایم کی گئی ہے۔ سب سے عمدہ نمونہ اُنکی تصنیفات کا ہے اور اسکا اندازہ اُس سیدہے سادے اور عام فہم طریقہ سے بخوبی ہو سکتا ہے۔ جو اس تفسیر میں بمقابلہ علوم جدیدہ کے اسلام کی حمایت کے لئے اختیار کیا گیا ہے۔ اس بات کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ جو طریقہ دین کی حمایت کا بمقابلہ یونانی فلسفہ کے ہمارے

قدیم متکلمین نے اختیار کیا تھا وہ اس زمانہ میں کچھ بکار آمد نہیں رہا یہاں تک کہ جو مصنفین اس زمانہ میں اُس طریقہ پر کاربند ہوتے ہیں اُنکی تصنیفات سے تعلیم یافتہ لوگوں کی تشفی نہیں ہوتی اور جو شبہات مذہب کی نسبت اُن کے دل میں خطور کرتے ہیں وہ بدستور کھٹکتے رہتے ہیں۔

آج کل ممالک عثمانیہ میں رسالۂ حمیدیہ کی بہت شہرت ہے طرابلس کے مشہور عالم شیخ حسین افندی نے ۱۳۰۶ھ میں وہاں کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے خیالات کی اصلاح کی غرض سے لکھا ہے اور جسپر شام کے بارہ جلیل القدر عالموں نے اور روم و شام و مصر کے بہت سے نامور اخباروں نے لمبی لمبی تقریظیں اور ریویو لکھے ہیں۔ چونکہ ممالک مذکور میں کسی مسلمان عالم کی یہ مجال نہیں کہ سلف کی تقلید کے دائرہ سے قدم باہر رکھ سکے اسلئے مصنف موصوف کا طریقۂ استدلال زیادہ تر اُنہیں اصول پر مبنی ہے جو قدیم متکلمین نے یونانی فلسفہ کے مقابلہ میں اختیار کیا تھا۔

مثلاً اس زمانہ کے نئے اکتشافات میں سے ایک مسئلہ یہ ہے کہ سورج اور تمام ثوابت و سیارات جو قدیم خیالات کے موافق آسمانوں میں جڑے ہوئے تسلیم کئے جاتے تھے درحقیقت ایسا نہیں ہے بلکہ سب ایک فضاے ممتد میں جسکی وسعت غیر متناہی ہے۔ جا بجا بکھرے ہوے ہیں اور بذریعہ کشش کے۔ جو منجملہ قوانین قدرت کے ایک زبردست قانون ہے۔ اپنی اپنی جگہہ پر قایم ہیں اور کبھی اُس حد سے تجاوز نہیں کرتے اور کوئی ایسا کرہ جو تمام عالم پر محیط ہو مثل آسمان یا عرش و کرسی وغیرہ کے اس فضا میں موجود نہیں ہے۔ یہ مسئلہ اب تھیوری کی حد سے نکلکر سائنس کے درجہ کو پہنچ گیا ہے۔ جسپر تمام یورپ اور امریکا کے ہئیات دانوں کا اتفاق ہے۔ اگرچہ حکماے اسلام میں سے ابوبکر العربی کی بھی یہی رائے تھی۔ مگر چونکہ اُسوقت تک کشش کا قانون معلوم نہیں ہوا تھا اسلئے وہ راے سائنس کے درجہ کو نہیں پہنچی تھی۔ چونکہ قرآن مجید میں سبع سمٰوات اور عرش و کرسی اور لوح و قلم اور جنت و جہنم کے الفاظ وارد ہوئے ہیں جو بظاہر اس نئی تحقیقات کے خلاف معلوم ہوتے ہیں اور جتنے بڑے بڑے کرہ دنکا اور ایسے اجسام عظیمہ کا جو زمین اور آسمان سب پر محیط ہیں اس فضا میں موجود ہونا سمجھا جاتا ہے۔ اسلئے مصنف رسالۂ حمیدیہ نے اسکا جواب دیا ہے کہ خدا تعالیٰ کا ہمارے اوپر سات آسمانوں کا پیدا کرنا اور اُنکے اوپر کرسی اور کرسی کے اوپر

عرش کا پیدا کرنا اور جو کچھ کہ ہوا یا آیندہ ہوگا اسکے ثبت کرنے اور لکھنے کے لئے لوح وقلم کا پیدا کرنا اور انسان کے اعمال کی جزا وسزا کے لئے بہشت و دوزخ کا پیدا کرنا وغیرہ وغیرہ۔ جیسا کہ نصوص شرعیہ میں وارد ہوا ہے۔ ان میں سے کوئی بات ایسی نہیں ہے جو تحت قدرت کاملۂ باری تعالے داخل نہو۔ پس جب تک کسی دلیل قاطع عقلی سے یہ ثابت نہو کہ ان میں سے کوئی چیز بالفعل موجود نہیں ہے یا انکا موجود ہونا محالات سے ہے اُسوقت تک کوئی وجہ نہیں کہ اُن کے وجود کا انکار کیا جائے۔

ہم یہاں اس امر سے بحث کرنا نہیں چاہتے کہ ان چیزون کے عدم وجود یا عدم امکان پر کوئی دلیل قاطع عقلی موجود ہے یا نہیں۔ لیکن ہمارے نزدیک اس میں شک نہیں کہ جن لوگون کے مذہبی خیالات کی اصلاح کی غرض سے مصنف موصوف نے یہ کتاب لکھی ہے اُن کے دل کا کانٹا ایسے بیانات سے نہیں نکل سکتا۔ اگرچہ ممکن ہے کہ ممالک اسلامیہ میں علانیہ ایسی تصنیفات پر چون وچرا نہ کی جائے لیکن جن لوگون نے علوم جدیدہ کی تعلیم پائی ہے اور اس تعلیم نے انپر اپنا پورا پورا اثر بھی کیا ہے۔ ایسے جوابون سے اُن کے دل کی خلش کا مٹنا دشوار ہے۔ کیونکہ جن باتون کو وہ مثل بدیہیات اولیہ کے یقینی سمجھے ہوئے ہیں اُنکا یقین محض احتمالات سے زائل نہیں ہوسکتا۔

مگر جو طریقہ سرسید نے اپنے شبہات کے رفع کرنے کا اختیار کیا ہے وہ بالکل شارع کے اس اصول کے موافق ہے کہ "کلموا الناس علی قدر عقولهم"۔ کیونکہ اسسے جہان تک کہ دیکھا گیا ہے۔ تعلیم یافتہ نوجوانوں کی خاطرخواہ تشفی ہوجاتی ہے اور قرآن کے بیان میں شک وشبہہ کرنے کی کوئی وجہ باقی نہین رہتی۔ سرسید کہتے ہیں کہ جس طرح قرآن کا بلفظہ کلام الہی ہونا مسلم ہے اسی طرح یہ بھی مسلم ہے کہ وہ انسان کی زبان میں نازل ہوا ہے۔ پس جس طرح انسان کے کلام کے معنی لگائے جاتے ہیں۔ اسی طرح خدا کے کلام کے معنی لگائے جائینگے ظاہر ہے کہ انسان کبھی الفاظ کو اُن کے حقیقی معنون میں استعمال کرتا ہے اور کبھی مجازی معنون میں؛ پس قرآن کے الفاظ سے بھی کہین حقیقی معنی مراد لئے جائین گے اور کہین مجازی معنی۔ بڑے بڑے جلیل القدر عالمون اور محققون نے اس بات کی تصریح کی ہے کہ قرآن میں انسان کی عقل اور سمجھ کے موافق۔ جو علمی ترقی سے پہلے اُسکی اصلی خلقت میں ودیعت تھی۔ خطاب کیا گیا ہے پس جو کچھ مبدا ومعاد کے متعلق قرآن میں بیان

ہوا ہے - ممکن نہیں کہ اُن الفاظ کو انکے حقیقی معنون پر محمول کیا جائے کیونکہ جس طرح انسان کی سمجھ خدا کی ذات وصفات واسماء افعال کی حقیقت سمجھنے سے قاصر ہے اسی طرح واقعات بعد الموت اُسکے فہم کی رسائی سے وراء الوراہیں اور کوئی لفظ یا الفاظ انسان کی زبان میں ایسے موجود نہیں ہیں - جنکے ذریعہ سے اُن حقائق و معارف کو کماہی ہی تعبیر کیا جاسکے - پس عرش و کرسی اور لوح و قلم اور جنت وجہنم اور اسی طرح تمام الفاظ جو مبدا و معاد کے متعلق قرآن مجید میں وارد ہوے ہیں وہ سب بطور مجاز و استعارہ کے اطلاق کئے گئے ہیں نہ بطور حقیقت کے - اسی طرح جو خیال عام انسانون کا آسمان اور زمین اور ستارون کی نسبت تہا اُسی کے موافق قرآن میں اُنکا ذکر کیا گیا ہے وہ آسمان کو مثل ایک چہت یا سائبان کے زمین پر چہایا ہوا تصور کرتے تہے سو اُنہیں کی سمجھ کے موافق فرمایا " وَجعلنا السماء سقفًا محفوظًا " و زمین کو مثل فرش کے بچہا ہوا جانتے تھے سو اُنہیں کے خیال کے مطابق کہا " والارض فرشناها " ، وہ ستارون کو آسمان میں جڑا ہوا تصور کرتے تہے سو اُنہیں کے تصور کے موافق فرمایا " انا زینّا السّماء الدنیا بزینة الکواکب " ، کیونکہ اصل مقصود آسمان اور زمین و ستارون کی حقیقت بیان کرنا نہ تہا - بلکہ مصنوعات کی عظمت سے جس طرح پر کہ وہ اُس کو تسلیم کئے ہوئے تہے - صانع کی عظمت وجلال کا تصور دلانا اور اوسکی طرف متوجہ کرنا مقصود تہا -

یہ ایک نہایت مختصر اور ناکافی خلاصہ ہے اُن تحریرون کا جو سرسید نے اس قسم کے شبہات رفع کرنے کی غرض سے تفسیر کے مختلف مقامات میں بہت شرح وبسط کے ساتہہ لکہی ہیں - اگر کسی کو زیادہ تفصیل دیکہنی منظور ہو وہ تفسیر کی جلدون کو اور اُنکے رسالۂ اصول التفسیر کو مطالعہ کرے -

یا مثلاً مصنف رسالۂ حمیدیہ نے آنحضرت صلعم کی نبوت پر خوارق عادت یعنے معجزات سے استدلال کیا ہے اور جو کچہہ معجزہ کے متعلق علم الکلام کی کتابون میں لکہا ہے اُسی کو زیادہ صفائی کے ساتہہ اپنی عبارت میں ادا کیا ہے - اگرچہ خرق عادت کو دلیل نبوت گرداننے پر قدیم سے ردوقدح ہوتی چلی آئی ہے یہان تک کہ خود اہل اسلام میں سے بعض محققین نے نہایت زبردست دلیلون سے ثابت کیا ہے کہ معجزہ کسی طرح دلیل نبوت نہیں ہوسکتا - مگر اس میں شک نہیں کہ جمہور متکلمین قدیم سے خرق عادت کو دلیل نبوت کہتے چلے آئے ہیں - لیکن اس زمانہ میں وہ تمام دلیلین جو خرق عادت کے ممکن ہونے یا اُسکے نبوت کے ثابت ہوتے پر

قایم کیجاتی تہیں سب بیکار ہوگئی ہیں ہر شخص جسنے زمانۂ حال کے علوم طبیعیہ کی تعلیم پائی ہے اور اونکو اچھی طرح سمجھا ہے وہ دل سے اس بات کا یقین رکھتا ہے کہ قوانین قدرت کبھی نہیں بدلتے اور اسباب و مسببات میں کبھی تخلف واقع نہیں ہوتا۔ سب سے بڑا شبہہ متکلمین کے استدلال پر یہ وارد ہوتا ہے کہ مثلاً جو معجزات آنحضرت صلعم کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں اُن میں سے کسی معجزہ کی نسبت یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اپنے دعوت اسلام کرتے وقت یا اسوقت جبکہ آپ سے معجزے طلب کئے گئے منکرین کو کوئی معجزہ دکہایا ہو۔ بلکہ برخلاف اسکے قرآن سے بخوبی ثابت ہے کہ جب کبھی کفار کی طرف سے معجزے طلب کرنے میں اصرار ہوا تو آپ نے اسکے سوا کچھ نہیں کہا کہ "انما الآیات عند اللّٰہ" یا "سبحان ربی هل کنت الا بشرا" یا "لو ان عندی ما تستعجلون به لقضی الامر بینی و بینکم" یا "ولو کنت اعلم الغیب لاستکثرت من الخیر وما مسنی السوء ان انا الا نذیر و بشیر لقوم یؤمنون"، حالانکہ نبوت کا ثبوت اگر معجزہ پر منحصر ہوتا تو کفار کو عندالطلب معجزہ دکہانا ضرور تہا۔ بعینہ ایسا ہی انجیل سے ثابت ہوتا ہے کہ جسقدر معجزات حضرت عیسیٰ کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں انمیں سے کوئی معجزہ عندالطلب نہیں دکہایا گیا بلکہ برخلاف اسکے متی باب ۴ و ۱۲ و ۲۶ و ۲۷۔ اور مرقس باب ۸ و ۱۴ و ۱۵۔ اور لوقا باب ۲۲ و ۲۳ سے ظاہر ہے کہ حضرت مسیح سے بارہا معجزے طلب کئے گئے مگر آپ نے اُن کے دکہانے سے انکار کیا،

نیز مصنف موصوف نے قدیم متکلمین کی طرح آنحضرت کے معجزات کی نسبت یہ بہی لکہا ہے کہ آپ سے خوارق عادت کا وقوع میں آنا تواتر معنوی کی حد کو پہنچ گیا ہے اور جو بات تواتر سے ثابت ہو اُسکا کسی طرح انکار نہیں ہوسکتا۔ لیکن اس زمانہ میں تواتر کو اُسی حالت میں مفید یقین مانا جاتا ہے جب کہ روایت میں کوئی مضمون دلیل قاطع عقلی یا قانون قدرت کے خلاف مندرج نہو۔

بہرحال کسی نبی کو نبوت کے ثبوت میں اُسکے خوارق عادت کو پیش کرنا۔ جیسا کہ قدیم متکلمین کا دستور تہا۔ اس زمانہ میں کچہ بکار آمد نہیں رہا بلکہ کسی نبی کی نسبت یہ ثابت ہونا کہ اُس نے خوارق عادات دکہانے کا کبہی دعویٰ نہیں کیا۔ یہی بڑی دلیل اسکی سچائی کی سمجہی جاتی ہے۔

سرسید نے برخلاف جمہور متکلمین کے خرق عادات کے واقع ہونے سے انکار کیا ہے

اور اس دعوے کی تائید میں کہ معجزہ دلیل نبوت نہیں ہو سکتا قاضی ابن رشد اندلسی کی ایک لمبی تقریر آنکی کتاب "الکشف عن مناہج الادلہ فی عقائد الملۃ" سے نقل کی ہے جسکا ماحصل یہ ہے کہ بعد تسلیم کرنے اس بات کے کہ خدا موجود، مرید، متکلم، قادر۔ اور مالک عبادت ہے اور وہ رسول بھیجا کرتا ہے اور اُنسے معجزات بھی صادر ہوا کرتے ہیں۔ یہ ثابت نہیں ہوتا کہ جنسے معجزے صادر ہوتے ہیں وہ خدا کے رسول ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے موقع پر جہاں آنحضرتؐ کے معجزات پر بحث کی ہے شاہ ولی اللہ صاحب کی کتاب تفہیمات سے اُنکا یہ قول نقل کیا ہے کہ "شق قمر ہمارے نزدیک معجزات میں سے نہیں بلکہ علامات قیامت میں سے ہے جیسا کہ خدا تعالےٰ فرماتا ہے" اقتربت الساعۃ وانشق القمر + + + اور خدا تعالےٰ نے اُن معجزات میں سے (یعنی آنحضرت کے معجزات میں سے) اپنی کتاب میں کچھ ذکر نہیں کیا اور نہ کہیں اُن کی طرف اشارہ کیا ہے"

اسکے بعد خود سرسید نے ایک نہایت مفصل اور شافی بحث فطرت انسانی پر اور اس بات پر کی ہے کہ انسان اپنی فطرت کی رو سے ہدایت کرنے والوں کا محتاج ہے اور اسی فطرت کا یہ ہے کہ جو گروہ کسی شخص کو دین یا شریعت کا ہادی سمجھتا ہے اُسکو جب تک انسانیت کے درجہ سے درا[illegible] نہیں ٹھیرالیتا اسکے دل کو صبر نہیں آتا یہاں تک کہ اسکو خدا اور خدا کا بیٹا تک کہنے کی جرات کر بیٹھتا ہے اور کم سے کم یہ کہ اُسمیں ایسے اوصاف اور معجزات اور کرامتیں ثابت کرتا ہے جنسے وہ باوجود انسان ہونے کے نوع انسان سے بالاتر سمجھا جاے اسکے بعد وہ لکھتے ہیں کہ "انہیں غلط خیالات کے سبب لوگوں نے انبیاء سے انکار کیا ہے چنانچہ قوم نوح، قوم عاد اور قوم ثمود نے انبیا کے انکار کرنے کی یہی وجہ بیان کی کہ "ان انتم الا بشر مثلنا" اور انہیں غلط خیالات کی وجہ تھی کہ مشرکین عرب بھی آنحضرت صلعم سے معجزوں کے طلبگار ہوتے تھے۔ کبھی کہتے تھے کہ اگر یہ پیغمبر ہیں تو کیوں نہیں انکے پاس فرشتے آتے؟ کیوں نہیں انکے پاس خزانہ اُتارا گیا؟ کبھی کہتے تھے کہ یہ تو عام انسانوں کی طرح کھاتے پیتے ہیں، بازاروں میں پڑے پھرتے ہیں! یعنی انسانوں سے زیادہ کوئی بات ان میں نہیں ہے کبھی آسمان سے پتھر برسوانے چاہتے تھے، کبھی آسمان کا ٹکڑا ٹوٹ کر گرنے کی خواہش کرتے تھے۔

اسکے بعد سرسید نے سورۂ کہف، سورۂ اعراف، سورۂ بنی اسرائیل اور سورۂ عنکبوت کی وہ آیتیں نقل کی ہیں جن میں آنحضرت کو حکم دیا گیا ہے کہ جو لوگ معجزہ یا علم غیب کے تجھسے متوقع ہیں اُنسے کہدے کہ اسکے سوا کچھ نہیں کہ میں ایک بشر ہوں مثل تمہارے جسکو وحی سے معلوم ہوا ہے کہ تمہارا خدا ایک خدا ہے اور بس! اور کہدے کہ میں بغیر خدا کی مشیت کے نہ اپنے تئیں نفع پہنچا

سکتا ہوں نہ نقصان، اور اگر میں غیب کا علم رکھتا تو کثرت سے بھلائیاں حاصل کر لیتا
اور برائی مجھکو چھوتی ہی نہیں، میں کچھ نہیں ہوں سوا اسکے کہ مومنوں کو ڈرانے
والا اور خوشخبری دینے والا ہوں اور بس، اور کہدے کہ پاک ہے میرا رب میں کچھ
نہیں ہوں مگر ایک انسان خدا کا بھیجا ہوا، اور کہدے کہ معجزے تو خدا کے پاس
ہیں، میں کچھ نہیں ہوں مگر ایک علانیہ ڈرانے والا۔

بہرحال معجزہ۔ جن معنوں میں کہ وہ عموماً بولا جاتا ہے۔ سرسید کے نزدیک
نہ اسکا وقوع میں آنا ممکن ہے اور نہ نبی کی تصدیق اُسپر موقوف ہے۔ اُنکے نزدیک نبی کی
سچائی کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اُسکی تعلیم تمام طبقات اُناس کی سمجھ کے موافق
اور جاہل اور حکیم اور خداپرست اور نفس پرست سب کو ایک نتیجہ پر پہنچانے والی ہو
وہ کہتے ہیں کہ "حکمائے آلہی اور انبیائے ربانی دونوں ایک سا کام کرتے ہیں، فرق
یہ ہے کہ حکما صرف اُن چند لوگوں کو تربیت کرسکتے ہیں جنکا دل و دماغ تربیت پاچکا ہے،
برخلاف اسکے انبیا تمام کافۂ انام کو تربیت کرتے ہیں جنکا بہت بڑا حصہ محض ناتربیت یافتہ
جاہل، وحشی، جنگلی، بدوی، بے عقل اور بددماغ ہوتا ہے اور اسی لئے انبیا کو یہ مشکل پیش آتی ہے کہ اُن
حقایق و معارف کو۔ جنکو تربیت یافتہ عقل ہی مناسب غور و فکر و تامل سے سمجھ سکتی ہے۔ ایسے الفاظ میں
بیان کریں کہ تربیت یافتہ دماغ اور کوڑمغز دونوں برابر فائدہ اُٹھادیں۔ قرآن مجید میں جو بے مثل
چیز ہے وہ یہی ہے کہ اُسکا طرز بیان ہر ایک کے مذاق اور دماغ کے موافق ہو اور باوجود اسقدر
اختلاف کے دونوں نتیجہ پانے میں برابر ہیں۔ انہیں آیات کی نسبت (یعنی جن آیتوں میں جنت اور حور
و قصور کا بیان ہو)، دو مختلف دماغوں کے خیالات پر غور کرو، ایک تربیت یافتہ دماغ خیال کرتا ہی کہ بہشت
وغیرہ کا جن الفاظ سے بیان ہوا ہی اُن سے بعینہ وہی اشیا مقصود نہیں بلکہ صرف اعلیٰ درجہ کی خوشی و راحت کو
فہم انسانی کے لائق تشبیہ میں لاتا ہی۔ اس خیال سے اُسکے دل میں ایک بے انتہا عمدگی جنت کی اور ایک ترغیب
اوامر کے بجالانے اور نواہی سے بچنے کی پیدا ہوتی ہے۔ اور ایک کوڑمغز ملایا شہوت پرست زاہد سمجھتا ہی
کہ درحقیقت بہشت میں نہایت خوبصورت اَن گنت حوریں ملیں گی، شرابیں پئیں گے، میوے کھاوینگے
اور شہد کی ندیوں میں نہاوینگے اور جو دل چاہیگا مزے اُڑاوینگے؛ وہ بھی اس لغو و بیہودہ خیال سے
دن رات اوامر کے بجالانے اور نواہی سے بچنے میں کوشش کرتا ہی، اور جس نتیجہ پر پہلا پہنچا تھا اُسی
پر یہ بھی پہنچ جاتا ہے اور کافۂ انام کی تربیت کا کام بخوبی تکمیل پاتا ہے۔ پس جس شخص نے قرآن مجید کے

ان حقائق پر جو فطرت انسانی کے مطابق ہیں غور نہیں کی اُسنے درحقیقت قرآن کو مطلق نہیں سمجھا اور اس نعمت عظمیٰ سے بالکل محروم رہا"

اس طریقہ استدلال میں۔ جو کہ سرسید نے اسلام کی سچائی ثابت کرنے کے لئے اختیار کیا ہے اور شیخ حسین افندی کے طریقہ میں۔ جو رسالہ حمیدیہ میں اختیار کیا گیا ہے۔ یہ فرق ہے کہ شیخ کے استدلال سے زیادہ تر وہ لوگ متاثر ہوتے ہیں جن پر نئی تعلیم نے کچھ اثر نہیں کیا اور جنکے دل ہر قسم کے شکوک و شبہات سے خالی ہیں؛ مگر جس جماعت کی تشفی کے لیے وہ کتاب لکھی گئی ہے۔ اُنپر اُسکا منتر کچھ کارگر نہیں ہوتا۔ برخلاف اسکے جو طریقہ سرسید نے اپنی تفسیر میں اسلام کی حقیت ثابت کرنے کا اختیار کیا ہے۔ اگرچہ پُرانے خیالات کے مسلمان جنکے لئے درحقیقت یہ تفسیر نہیں لکھی گئی۔ اوس کی کسی بات کو تسلیم نہیں کرتے۔ لیکن نئے خیالات کے لوگ۔ جو اس تفسیر کے مخاطب صحیح ہیں۔ وہ اُس سے خاطرخواہ تشفی پاتے ہیں۔

سرسید نے جن اصول پر قرآن کے معنی بیان کئے ہیں اُن میں ظاہرا کوئی بات ایسی نہیں معلوم ہوتی جسپر کچھ گرفت ہو سکے، مگر اسمین شک نہیں کہ بہت سی آیتون کے معنی بیان کرنے میں جن اصول کی اُن کو پابندی کرنی چاہئے تھی۔ اُن کی پابندی نہیں کی گئی اور اسی وجہ سے بعض آیات کی تفسیر میں سرسید کے بعضے ہم خیال آدمی اُن کے ساتھ متفق نہیں ہیں۔

مثلاً سرسید جس طرح کہ آنحضرت صلعم کے معجزات کا قرآن میں مذکور ہونا تسلیم نہیں کرتے اسی طرح اُنکے نزدیک انبیاے سابقین کے معجزات کا بھی قرآن میں کچھ ذکر نہیں ہے اور اسلئے اُنھون نے انبیاے سابقین کے ہر ایک ایسے واقعہ کو جو ظاہرا کسی امر خارق عادت پر دلالت کرتا ہے قانون قدرت کے مطابق ثابت کرنے میں کوشش کی ہے؛ مگر اُنکے بعض ہم خیال باوجود اسکے کہ وہ آنحضرتؐ کے معجزات کا قرآن میں مذکور نہ ہونا تسلیم کرتے ہیں اور یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ کوئی امر قانون قدرت کے خلاف وقوع میں نہیں آسکتا۔ مگر اُن کو اسمیں کچھ شک نہیں ہے کہ انبیاے سابقین کے اکثر واقعات۔ اگرچہ نفس الامر مین موافق قانون قدرت کے واقع ہوئے ہون۔ مگر قرآن مجید میں بطور خوارق عادات کے۔ جیساکہ عرب کے اہل کتاب اعتقاد رکھتے تھے۔ بیان کئے گئے ہین۔ اور اُنکے نزدیک قرآن کی یہ طرز بیان ہرگز اُس کی سچائی کے برخلاف نہیں ہے۔ کیونکہ قطع نظر اور دلائل کے خود سرسید نے متعدد آیتوں کی تفسیر اسی

اصول کے مطابق کی ہے کہ قرآن میں بہت سی باتیں - بلا لحاظ اس امر کے کہ وہ فی الواقع صحیح ہیں یا نہیں محض لوگوں کی معمولی سمجھ اور اُنکے اعتقاد کے موافق بیان کی گئی ہیں۔ اور یہ اصول درحقیقت اُنہوں نے شاہ ولی اللہ کی کتاب حجۃ بالغہ سے اخذ کیا ہے۔ جہاں وہ لکھتے ہیں کہ "شارع نے محض لوگوں کی معمولی سمجھ کے موافق - جو دقائق علم و حکمت تک پہنچنے سے پہلے اُنکی اصل خلقت میں ودیعت تھی - اُنسے خطاب کیا ہے" اور دوسری جگہ اسی کتاب میں شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ "انبیا کی شان اس بات کی مقتضی ہے کہ وہ لوگوں کے ساتھ اُنکی معمولی سمجھ اور عقل سے بڑھکر جسپر کہ وہ مجبور رہوئے ہیں - کلام نہ کریں"

اسی اُصول کے موافق سرسید نے اُس آیت کی تفسیر کی ہے جس میں زمین و آسمان کا چھہ دن میں پیدا ہونا بیان ہوا ہے اور جس پر سائنس کا یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ دنیا چھہ دن سے بہت زیادہ عرصہ میں پیدا ہوئی ہے - اُن کی تفسیر کا ماحصل یہ ہے کہ اس سے کسی حقیقت یا کسی خبر کا بیان کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ توریت میں بھی چونکہ اس موقع پر چھہ دن کا لفظ واقع ہوا تھا اور عرب کے تمام اہل کتاب اور دیگر قومیں جو اہل کتاب سے میل جول رکھتی تھیں سب کا یہ عقیدہ تھا کہ دنیا چھہ دن میں بنی ہے اسلئے شارع نے اسلام کا اصل مقصد - یعنی خدا کی الوہیت اور توحید کا یقین دلانا مخالفین کی سمجھہ کے موافق ان لفظوں میں ادا کیا ہے کہ "ان ربکم اللہ الذی خلق السموات والارض فی ستۃ ایام"

چونکہ سرسید کے قول کے موافق بزرگوں اور مقدس لوگوں کی طرف خوارق عادت کا منسوب کرنا انسان کی فطرت کا مقتضا ہے یہاں تک کہ اُن کی اکثر معمولی باتیں بھی معجزات یا کرامات تصور کیجاتی ہیں اور خاصکر انبیاء بنی اسرائیل کے قصے جو عرب کے اہل کتاب میں مشہور تھے اُن میں بہت سی باتیں بطور خوارق عادت کے مشہور چلی آتی تھیں اور قرآن میں اُن قصوں کا بیان کرنا مقصود بالذات نہ تھا بلکہ اُن میں جو باتیں مخاطبین کی ہدایت اور تہذیب نفس میں دخل رکھتی تھیں صرف اُنکا مجملاً ذکر کرنا منظور تھا اسلئے یہ ایک لازمی بات تھی کہ انبیاء بنی اسرائیل کے قصوں میں سے جسقدر کہ قرآن مجید میں بغرض روحانی تعلیم کے اخذ کیا جائے وہ اُنہیں پیرایوں میں بیان کیا جائے جو اہل کتاب کے دلوں پر مثل علوم متعارفہ کے نقش ہو رہے تھے - کیونکہ قرآن کا اصل مقصد اُن نصیحتوں کا بیان کرنا تھا جو اُن قصوں سے استنباط ہوتی تھیں نہ کہ اُن قصوں کی نسبت اُنیسویں صدی عیسوی کی سائنٹفک تحقیقات کا بیان کرنا۔ ہاں بلاشبہہ قرآن

کا۔ جو خاصکر توحید کی تکمیل کے لئے نازل ہوا تھا۔ یہ کام تھا کہ خرق عادت کا غلط خیال۔ جو توحید فی الصفات کا منافی تھا۔ اُسکی غلطی ظاہر کردے سو اُسنے نہایت تصریح کے ساتھ مستقل طور پر۔ نہ کہ انبیاء بنی اسرائیل کے واقعات کے ضمن میں اُسکی غلطی کو ظاہر کردیا اور خود خاتم النبیین کی زبان حق ترجمان سے بکرّات و مرّات علی رؤس الاشہاد کہلوا دیا کہ "انما الآیات عند اللہ و انما انا نذیر مبین"

الغرض باوجود ان جزئی اختلافات کے۔ جو سرسید کے اسکول کے بعض خاص بعض آیتوں کی تفسیر میں اُن کے ساتھ رکھتے ہیں۔ ظاہراً اُن اصول کو سب تسلیم کرتے ہیں جن پر اس تفسیر کی بنیاد رکھی گئی ہے اور غالباً مستثنیٰ مقامات کے سوا۔ جنکو ہم کسی دوسری تحریر میں بیان کرینگے جو کچھ کہ سرسید نے زمانۂ حال کے مسائل کلامیہ کی نسبت لکھا ہے اس کو صرف تسلیم ہی نہیں کرتے بلکہ اس زمانہ کی اسلامی فتوحات میں شمار کرتے ہیں۔ خصوصاً وحی اور اسکے نزول کی تحقیق نبوت کی حقیقت، قرآن کے معجز ہونے کا بیان جنت و دوزخ اور اُسکے نعیم و آلام کی حقیقت، آدم کے بہشت سے نکالے جانے کی تحقیق، معجزہ کی بحث، ملائکہ اور شیطان کی بحث، جبریل و میکائیل کی حقیقت، ناسخ و منسوخ کی بحث، سمت قبلہ کی تحقیق۔ حضرت عیسیٰ کے بن باپ پیدا ہونے کی تحقیق شہدا کو زندہ سمجھنے کی تحقیق، قطع ید سارق کے مسئلہ کی تحقیق، نفخ صور اور وزن اعمال کی تحقیق روح اور اسکے باقی رہنے کی بحث، آخرت اور قیامت کا بیان حشر اجساد کی بحث آفات ارضی و سماوی کا باعث انسان کے گناہوں کو قرار دینے کا بیان، خدا کے ساتھ موسیٰ کے کلام کرنے اور کوہ طور پر تجلی ہونے کی بحث، دیدار الٰہی کی بحث، بدر و حنین کی لڑائی میں فرشتوں کے آنے کی تحقیق طوفان نوح کی بحث، حضرت یعقوب کے نابینا ہونے کے بعد بینا ہونے کی تحقیق، معراج اور شق صدر کے مسئلہ کی تحقیق اور اسی قسم کی اور بہت سی تحقیقاتیں اور بحثیں خاصکر توجہ کے لائق ہیں

اگرچہ اس میں شک نہیں کہ سرسید نے اپنی تفسیر میں قرآن کے وہ سربمہر اسرار ظاہر کئے ہیں جنکے اعلان کرنے کی ممانعت قدیم سے ہوتی چلی آئی ہے مگر اس باب میں اُنہوں نے جو عذر کئے ہیں وہ بھی لحاظ کے قابل ہیں۔ اُنہوں نے اپنی تفسیر کے تیسری جلد میں علامہ ابن رشید کی ایک لمبی تقریر کا خلاصہ نقل کیا ہے جسکا ماحصل یہ ہے کہ مسائل غامضہ جو جمہور کے سمجھنے کے لائق نہیں ہیں اُن کو ایسے لوگوں کے سامنے۔ جو اُنکے اہل نہیں ہیں۔ بیان کرنے والا کافر ہے اور اُسکی وجہ اُنہوں نے یہ بیان کی ہے کہ مثلاً ایک شخص کسی نص کی تاویل کرتا ہے سو ظاہر ہے کہ اُس کا

مقصد ظاہری معنوں کو باطل کرنے اور تاویلی معنوں کے ثابت کرنیکا ہوتا ہے پس جب کہ عام آدمیوں کے نزدیک ظاہری معنے باطل ہو گئے اور تاویلی معنے اُنکی سمجھ میں نہ آئے اور وہ نص اصول دین سے علاقہ رکھتی ہے تو ظاہر ہے کہ کفر تک نوبت پہنچ جائے گی۔پس عام لوگوں کو سمجھا دینا چاہئے کہ یہ خدا کی باتیں ہیں۔خدا ہی ان کی حقیقت خوب جانتا ہے۔ انتہی ملخصاً

اس تقریر پر سرسید لکھتے ہیں کہ "نتیجہ اس تقریر کا یہ ہے کہ کوئی بات ہی شریعت کی۔جو بیان حقیقت تاویلات کی قسم سے ہو۔سوائے راسخین فی العلم کے کسی کے سامنے بیان نہ کیجاوے۔جس قسم کے لوگوں کو ابن رشید نے راسخین فی العلم میں قرار دیا ہے اس زمانہ میں تو ویسا شخص کوئی نہیں ہے بلکہ اگلے زمانہ میں بھی دو ایک کے سوا کوئی نہ تھا۔پس ضرورۃً لازم آتا ہے کہ تمام مقدم باتیں شریعت کی بطور ایک معماد چیتان یا مثل راز فرمین کے غیر معلوم رہنی چاہئیں"

"اگر ہمارا مذہب اسلام ایسا ہو کہ اُسکے اصول لوگوں کو نہ سمجھا سکیں جو اُنکو سمجھنا چاہتے ہیں۔یا اُن لوگوں کی تشفی نہ کرسکیں جنکے دل میں شبہات پیدا ہوئے ہیں بلکہ اُن سب کو اسپر مجبور کریں کہ ان باتوں کو اسی طرح مان لو تو ہم اپنے مذہب کی صداقت فی نفسہ اور بمقابلہ دیگر مذہب غیر حق کے کیونکر ثابت کرسکتے ہیں۔ایک عیسائی کہتا ہے کہ "تثلیث کا مسئلہ۔کہ تین تین ہی ہیں اور ایک ہی ہیں۔ایک الٰہی مسئلہ ہے" اسپر بے سمجھے یقین کرنا چاہیئے"۔پس اگر ہم مذہب اسلام کے بہت سے مسئلوں کی نسبت ایسا ہی کہنا قرار دیں تو کیا وجہ ہے کہ اُسکی تکذیب اور اسکی تصدیق کریں"

سوشل ریفارم

اگرچہ ہندوؤں میں اس صدی کے آغاز سے وقتاً فوقتاً ایسے اولوالعزم آدمی اُٹھتے رہے ہیں جنہوں نے اپنی قوم کی سوشل خرابیوں کی اصلاح پر کمر باندہی ہے۔ جیسے راجہ رام موہن رائے، بابو کیشب چندر سین، ایشر چندر ودیا ساگر، سریش چندر بٹا چارج، رام تنو لاہری، سوامی دیانند سرستی وغیرہ وغیرہ؛ مگر مسلمانوں میں ظاہرا دو شخصوں کے سوا۔کہ دونوں دلی کی خاک سے اُٹھے تھے۔کسی نے اس کام پر ہاتھ نہیں ڈالا۔ایک مولانا اسمٰعیل اور دوسرے سید احمد خان۔گو کہ زمانہ کے اقتضا سے مسلمانوں میں ایسے لوگ پیدا ہوتے جاتے ہیں جنکو قوم کی سوشل خرابیاں محسوس ہونے لگی ہیں مگر اتنی جرأت کسی کو نہیں ہوتی کہ تمام قوم کے برخلاف کسی بُری رسم یا ریت کو ترک یا کسی اچھی بات کو اختیار کیا جا سکے۔سرسید نے اپنی ایک تحریر میں اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اکثر لوگ ہیں جو بہت سی رسموں کو بُرا جانتے ہیں مگر اُن کو چھوڑ نہیں سکتے اور بہت سی باتوں کو اچھا جانتے ہیں مگر اُنکو اختیار نہیں کرتے۔بعضے تو یہ چاہتے ہیں

کہ گورنمنٹ مداخلت کرے تو قرار واقعی اصلاح ہو، مطلب یہ کہ ہم بدنامی سے بچیں اور گورنمنٹ بدنام ہو، اور بعضے کہتے ہیں کہ برادری کا اتفاق ہو تو کام چلے۔ اسکے بعد وہ لکھتے ہیں کہ "لوگ اصلاح اور ترقی کو اتفاق پر منحصر رکھتے ہیں + + + مگر میں سمجھتا ہوں کہ رسموں کی اصلاح اور ترقی کا ذریعہ اتفاق نہیں ہے بلکہ اختلاف ہے۔ جس شخص کے دل میں اصلاح کا خیال ہو اسکو چاہیے کہ خود نہایت استقلال اور مضبوطی اور بہادری سے تمام قوم سے اختلاف کرے اور اُس رسم کو توڑے یا اُس میں اصلاح اور ترقی کرے بے شک تمام قوم اُسکو بُرا کہیگی اور نکو بنائے گی مگر پھر رفتہ رفتہ لوگ اسکی پیروی کرنے لگیں گے اور جس طرح کہ اولاً وہ ہدفِ تیرِ ملامت ہوا تھا انجام کو وہی سب کا ہادی اور پیشوا اور مصلح قوم شمار کیا جائیگا۔

بلا شبہہ جس شخص میں قوم کے برخلاف کسی کام کے کرنے کی جرأت نہیں ہوتی وہ کسی قوم کا مصلح بننے کی لیاقت نہیں رکھتا۔ سرسید میں یہی چیز تھی جسنے اُنکو اس منصب جلیل کے لائق بنایا تھا ہم پہلے حصہ میں لکھ چکے ہیں کہ کسی شخص نے علتِ طعامِ اہلِ کتاب کے باب میں سرسید کی ایک تحریر دیکھکر یہ لکھا تھا کہ "کاش ہم سرسید صاحب کو اپنے قول کے موافق عمل کرتے ہوے بھی دیکھیں" سرسید نے فوراً اُسکے جواب میں لکھا کہ "نہایت کمینہ وہ آدمی ہے جو کہتا کچھ ہو اور کرتا کچھ ہو، اور اُس سے بھی زیادہ کمینہ وہ ہے جو شریعت کے حکم سے واقف ہو اور پھر رسم و رواج کی شرم سے یا لوگوں کے لعن و طعن کے ڈر سے اُسکے کرنے میں تامل کرے۔

جو کام سرسید کی ذات سے علاقہ رکھتے تھے اور جنکا کرنا نہ کرنا خود اُنکے اختیار میں تھا ان میں رسم و رواج کی پابندی کو اُنھوں نے بالکل چھوڑ دیا تھا۔ شادی غمی اور تیج تہوار میں جو فضول رسمیں قوم میں جاری ہیں سرسید کے گھر میں کہیں اُنکا نام و نشان نہ تھا۔ اُنھوں نے اُس بیٹے کا نکاح جو ہائی کورٹ کا جج تھا دلی میں جاکر ایسا چپ چپاتے کر دیا کہ چند عزیزوں اور دوستوں کے سوا کسی کو خبر تک نہیں ہوئی اور اس خوشی میں بجائے اسکے کہ توڑہ بندی یا دعوت وغیرہ میں زرِ خطیر خرچ کیا جاتا ایک مناسب رقم مدرسۃ العلوم کی نذر کرکے تقریب کو ختم کر دیا۔ پوتے کی بسملہ میں علیگڈھ سے دلی جانے کی بھی کچھ ضرورت نہیں سمجھی اور نہ کسی عزیز یا رشتہ دار کو اس تقریب میں وطن سے بُلایا۔ جب کانفرنس کا جلسہ ختم ہو چکا اُسی قومی مجمع میں بسملہ پڑھی گئی اور حاضرین کو معمولی شیرینی تقسیم ہونے کے بعد پانسو روپیہ مدرسہ کی نذر کیا گیا۔

سرسید کی کوشش سے جو نمایاں انقلاب مسلمانوں کی سوشل حالت میں ہوا وہ اس مغایرت اور نفرت کا دور ہونا تھا جو انگریزوں اور مسلمانوں کے درمیان مثل سمندر کے حائل ہو رہی تھی

حالانکہ دین اسلام اہل کتاب کے ساتھ دوستی اور میل جول رکھنے، انکا کھانا اور ذبیحہ کھانے اور اُنکے ہاں شادی کرنے کی صاف صاف اجازت دیتا تھا اور تمام ممالک اسلامیہ میں اُنکے ساتھ مسلمانوں کا یہی برتاؤ دیکھا اور سنا جاتا تھا باوجود اسکے ہندوستان کے مسلمان مثل ہندوؤں کے اُنکی ہر ایک چیز سے اجتناب کرتے تھے؛ اُنکے ہاں کی پکی ہوئی چیز بلکہ اُنکے ہاتھ کی مس کی ہوئی چیز کو نجس جانتے تھے اور اُن کے ساتھ کھانا کھانے کو عیسائی ہوجانے کے برابر خیال کرتے تھے۔ جسکا سبب کچھ تو ہندوؤں کی تقلید تھی جنسے صدہا رسمیں اور عادتیں ہندوستان میں آکر مسلمانوں نے سیکھی تھیں اور کچھ قومی تعصبات تھے جو ایک مدت تک مفتوح قوم کو نیچرل طور پر فاتح قوم کے ساتھ رہتے ضرور ہیں۔ مسلمانوں کی یہ نفرت اور کراہیت اس درجہ کو پہنچ گئی تھی کہ اس باب میں جو کچھ شریعت کا حکم ہے اُسکو علما عوام الناس کے سامنے صاف صاف بیان نہیں کرسکتے تھے؛ اور اگر کوئی عالم ایسی جرأت کر بیٹھتا تھا تو اُسکی بات کو کوئی تسلیم نہیں کرتا تھا اور اُسکی طرف سے کھٹک جاتا تھا۔ ایک اور وجہ بھی علما مسلمانوں کو انگریزوں کے میل جول سے مانع آتے تھے؛ انکو خوف تھا کہ حاکم و محکوم قوم کا میل جول خاصکر اُس صورت میں کہ حکمران قوم اپنے دین کی اشاعت میں سرگرم ہو۔ ضرور ہے کہ محکوم قوم کو حاکموں کے مذہب کی طرف مائل کرے۔

الغرض غدر سے پہلے مسلمان عموماً انگریزوں کی مخالطت سے اور ہر ایک بات میں اُنکے ساتھ تشبہ کرنے سے پرہیز کرتے تھے مگر انگریزوں کو مسلمانوں سے کوئی وجہ نفرت کی نہ تھی لیکن غدر کے بعد انگریز بھی مسلمانوں سے کھنچنے لگے اور دونوں قوموں کا جمع کرنا مثل اجتماع نقیضین کے محال ہوگیا۔ مگر سرسید کو خوب یقین ہوگیا تھا کہ مسلمانوں کی پولٹکل حالت کی اصلاح کے لیے جسطرح

---

[1] معتبر ذریعہ سے سنا گیا کہ شاہ عبدالعزیز صاحب کے زمانہ میں ایک شریف مسلمان مولوی نے - جو میاں دوآب کے کسی ضلع میں منصف یا صدر اعلیٰ تھے ایک روز کسی یورپین حاکم کے بنگلہ پر اُسکے ساتھ ایک میز پر بیٹھکر کھانا کھا لیا۔ یہ خبر فوراً مشہور ہوگئی، مولوی صاحب کی برادری نے اُن کو ذات سے خارج کر دیا۔ اُن نے ہرچند اہل برادری کے سامنے آیتیں اور حدیثیں پڑھیں مگر کسی نے التفات نہ کیا۔ یہاں تک کہ کچھ لوگ مولوی کے مخالف اور کچھ موافق دلی میں شاہ صاحب سے مسئلہ پوچھنے کو آئے۔ جب شاہ صاحب کے مدرسہ کے دروازہ پر پہنچے تو شاہ صاحب کے چھوٹے بھائی شاہ رفیع الدین اندر سے نکلتے تھے اُن لوگوں نے پہلے اُنہیں سے مسئلہ پوچھا۔ شاہ رفیع الدین نہایت صاف گو اور آزاد طبع آدمی تھے اُنھوں نے صاف صاف کہدیا کہ جنھوں نے مولوی کو ذات سے خارج کیا اُنھوں نے جھک مارا اسنے کوئی شرع کے خلاف نہیں کیا۔ مگر کسی نے اُن کا کہنا -

اُن میں مغربی تعلیم کا پھیلانا ضروری ہے۔ اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ اُنکے اور حکمران قوم کے سوشل تعلقات کو ترقی اور استحکام دینا ضروری ہے جب تک دونوں قوموں میں دوستانہ معاشرت اور میل جول پیدا نہو اور دونوں قوموں کو ایک دوسرے کے اصلی خیالات سے آگاہی حاصل نہو گی اُسوقت تک آپس میں صفائی اور خلوص اور اعتبار پیدا نہیں ہوسکتا۔

مگر یہ کوئی آسان کام نہ تہا؛ قطع نظر مسلمانوں کی مخالفت کے انگریزوں کی طرف سے بھی بہت سی رکاوٹیں نظر آتی تہیں۔ سب سے بڑا عذر انگریزوں کو یہ تہا کہ مسلمانوں کے ساتھ جنکی عورتوں کے پردہ کا رواج ہے۔ کسی طرح ہمارا دوستانہ میل جول نہیں ہوسکتا۔ اگرچہ سرسید اسکا یہ جواب دیتے تھے کہ مسلمان جس طرح اپنی عورتوں کو غیر قوم کے مردوں سے چھپاتے ہیں اُسی طرح اپنے مسلمان دوستوں اور دور کے رشتہ داروں سے بھی چھپاتے ہیں مگر اس سے باہمی دوستی اور یگانگت میں کچھ فرق نہیں آتا؛ پھر کیا وجہ ہے کہ پردہ کی پابندی سے ہماری انگریزوں کی دوستی اور سوشل تعلقات میں فرق آئے۔ مگر حق یہ ہے کہ ایسی دو مختلف قوموں میں دوستانہ میل جول ہونا غیر ممکن ہے جن میں سے ایک قوم میں عورتوں کا مردانہ سوسائٹی میں شریک ہونا اُسکے لئے باعث عزت سمجھا جائے اور دوسری قوم میں باعث شرم۔ لیکن باوجود ایسے سخت موانع کے سرسید نے اپنے مقصد میں توقع سے زیادہ کامیابی حاصل کی۔ اگرچہ یہ کہنا مشکل ہے کہ سرسید کی کوشش نے انگریزوں میں مسلمانوں کے ساتھ کہاں تک موانست پیدا کی ہے؟ اور اُنکی دیرینہ آرزو اس باب میں کس حد تک پوری ہوئی ہے؟ اور اگر سرسید کے ظاہری الفاظ کو دیکھا جائے تو اُنہوں نے ۱۸۸۴ء میں ایک موقع پر مسٹر بلنٹ ممبر پارلیمنٹ کے سامنے صاف صاف کہدیا تہا کہ "ہماری یہ خواہش پوری نہیں ہوئی"۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں کی سوشل مغائرت اور اُن کا سوشل برتاؤ جو غدر کے بعد تک انگریزوں کے ساتھ اُس میں جسقدر انقلاب گذشتہ تیس برس میں ہوا ہے

بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۸۰۔ نہیں مانا اور رہٹ شاہ صاحب کے پاس پہنچے۔ اُنہوں نے صورت حال سنکر ایک لمبی چوڑی تقریر کی جس کا ماحصل یہ تہا کہ اس مولوی نے ایسا کام کیا ہے کہ قریب کفر کے پہنچ گیا ہی جو لوگ مولوی کے مخالف تھے وہ یہ سنکر خوش ہوگئے مگر اسکے طرفداروں نے پوچھا کہ حضرت وہ اب کسی طرح مسلمان بھی ہوسکتا ہی؟ شاہ صاحب نے فرمایا کہ کفر کے قریب پہنچ جانے سے کوئی کافر نہیں ہوجاتا اس لئے وہ اسلام سے خارج نہیں ہوا مگر احتیاطاً اُسکو پانچوں کلمے اور آمنت باللہ پڑھوائو اور قدم شریف کا پانی پلواؤ اور پھر برادری میں شامل کرلو۔ اگر شاہ صاحب اس انداز سے تقریر نہ کرتے تو غالباً اُن کا کہنا بھی کوئی نہ مانتا اور اُن مولوی کو برادری میں شامل نہ کیا جاتا۔

اگر سرسید کا قدم درمیان میں نہ ہوتا تو اُسکے لئے ایک صدی بھی مشکل سے کافی ہوسکتی تھی۔ اگرچہ ابھی اس بات کا فیصلہ کرنا باقی ہے کہ طریق معاشرت میں انگریزون کی تقلید کرنا کہان تک ہماری حالت کے مناسب ہے لیکن اس میں کلام نہیں کہ سرسید نے مسلمانون کی ایک معتدبہ جماعت کو قومی تعصبات کی بیڑی اور ملکی رسم و رواج کی غلامی سے بالکل آزاد کردیا ہے اور وہ اس قابل ہوگئے ہیں کہ جس بات کو اپنے حق میں قرین مصلحت جانین اُسکو اختیار کرین اور جس بات کو مضر سمجھیں اُسکو ترک کرین۔

اگرچہ سرسید نے مسلمانون کی باہمی معاشرت کی عام اصلاح کے متعلق کوئی عملی کارروائی نہیں کی بلکہ اُنکی سوشل حالت جو انگریزون کے ساتھ تھی زیادہ تر اُسی کی اصلاح پر توجہ کی ہے لیکن درحقیقت اُنھون نے مذہبی خیالات کی اصلاح اور مغربی تعلیم کی اشاعت سے قومی سوسائٹی کی عام اصلاح کا بیج بو دیا ہے۔ اُن کو معلوم تھا کہ مسلمانون میں بہت سی سوشل خرابیان تو ہندوستان میں رہنے اور ہندؤن کے میل جول سے پیدا ہوئی ہیں، اور بہت سی غلط مذہبی خیالات کی بنیاد پر قایم ہوئی ہیں، اور بعض نے دیگر وجوہ و اسباب سے وجود پکڑا ہے؛ اور ان تمام خرابیون کی تعداد اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ اُن کی اصلاح کے لئے ایک طول طویل زمانہ اور بہت سی مصلح درکار ہیں۔ اسلئے بجائے اسکے کہ وہ جزئیات کی اصلاح کی طرف توجہ کرتے انہون نے جہان تک کہ ممکن تھا مسلمانون کے خیالات کی اصلاح میں جو تمام اصلاحون کی جڑ ہے۔ کوشش کی سب سے پہلے اُنھون نے مذہبی خیالات و اوہام کی اصلاح کو ضروری سمجھا کیونکہ جن باتون کو لوگ غلطی سے مذہب پر مبنی سمجھ لیتے ہیں اُنکا چھوڑنا قریب ناممکن کے ہوجاتا ہے۔ دوسرا سب سے بڑا ذریعہ خیالات کی اصلاح مغربی تعلیم کی اشاعت تھی جس نے یورپین اقوام کو حسن معاشرت میں تمام دنیا پر فائق کردیا ہے سو اُسکی اشاعت میں جو کارنمایان اُنھون نے کئے وہ سب پر ظاہر ہیں

تصنیف و تالیف

اگرچہ سرسید کی طبیعت ایسی ہمہ گیر واقع ہوئی تھی کہ جو کام اُنکو پیش آتا تھا اُس میں وہ ایسی دلچسپی ظاہر کرتے تھے کہ گویا وہی اُن کا خاص کام ضروری فرض تھا؛ کالج کی تعمیر، بجٹ کی تندہی، جلسون کا اہتمام، مہمانون کی مدارات، چندے وصول کرنے کی تدبیرین؛ غرضکہ ہر ایک کام کو وہ یکسان ذوق و شوق اور یکسان دلبستگی کے ساتھ انجام دیتے تھے مگر خود اُنکا یہ بیان تھا کہ جیسا تصنیف و تالیف میں میرا جی لگتا ہے ویسا اور کسی کام میں نہیں لگتا؛ اور فی الواقع جیسا کہ دیکھا گیا ہے۔ رنج میں خوشی میں، صحت میں بیماری میں، خلوت میں اور جلوت میں اس مشغلہ سے اُن کا جی نہیں اُکتاتا تھا۔ گرمی کی دوپہرون میں۔ جبکہ ایک صبح خیز آدمی ضرور آرام لینا

جاتا ہے۔ یہ شخص ہمیشہ تصنیف و تالیف میں مصروف پایا جاتا تھا، بیماری کی حالت میں اُن کو کبھی نہیں دیکھا کہ دوپہر کو پلنگ پر جاکر کر سید ہی کی ہو۔ بارہا ایسا اتفاق ہوتا تھا کہ علالت یا کسی اور وجہ سے رات کو نیند اُچاٹ ہو گئی اور اُنہوں نے میز کرسی پر بیٹھکر کسی مضمون کے لکھنے میں صبح کردی جہاں اور لوگ بیماری کی راتیں لوگوں کو جگاکر، یا قصے کہانیاں سُنکر، یا ہائے وائے کرکر بسر کرتے ہیں۔ یہ شخص اس جانکاہ اور دماغ سوز فکر سے دل بہلاتا تھا۔

جس زمانہ میں سرسید نے بائیبل کی تفسیر لکھنی شروع کی اُس زمانہ کا حال اُن کے قدیم دوست محمد سعید خان اس طرح بیان کرتے ہیں کہ میں اُن دنوں میں اکثر اُنکے ساتھ رہا ہوں سرسید نے اس زمانہ میں رات کو پلنگ پر سونا قطعاً ترک کردیا تھا؛ چونکہ اسوقت تک کرسی کی نشست کی عادت نہ تھی فرش ہی پر چاروں طرف کتابیں پھیلی رہتی تھیں اور کتابوں کے بیچ میں اُنکی نشست رہتی تھی کبھی کبھی بات چیت کے لئے مجھے بھی پکڑ بٹھاتے تھے، نہ خود سوتے تھے اور نہ مجھے سونے دیتے تھے، باتیں بھی کرتے جاتے اور تفسیر بھی لکھتے جاتے تھے، اور اس غرض سے کہ نیند نہ آئے بار بار خود بھی چائے پیتے تھے اور مجھے بھی پلواتے تھے۔ جب نیند کا بہت ہی غلبہ ہوتا تھا وہیں۔ کسی کتاب پر سر رکھکر گھنٹا آدہ گھنٹے سو رہتے تھے اور پھر اُٹھکر لکھنے لگتے تھے، اسی طرح ساری رات گذر جاتی تھی

سرسید کے دماغ میں تصنیف و تالیف کے متعلق دو خاصیتیں عجیب و غریب تھیں۔ ایک یہ کہ مختلف آدمیوں اور مختلف کاموں کے ہجوم میں اُن کے خیالات منتشر نہوتے تھے۔ اُنکے دفتر کا بڑا کمرہ جہاں وہ بیٹھکر کام کرتے تھے۔ صبح سے شام تک وہاں ہر قسم کے لوگ برابر آتے جاتے رہتے تھے اور ہر وقت دوستوں اور ملاقاتیوں اور ماتحت کام کرنے والوں کا مجمع رہتا تھا۔ اسی مجمع میں جہاں وہ اور سب کام کرتے تصنیف و تالیف کا دشوار گزار مرحلہ بھی وہیں طے کیا جاتا تھا، مشکل سے مشکل مضامین جو اکثر جمہور کی رائے اور مذہبی خیالات کے برخلاف ہوتے تھے اور جن میں قدیم علما اور مصنفین پر نکتہ چینی کرنے کی ضرورت اور غور و خوض کرنے کی سخت حاجت ہوتی تھی۔ اُن کے لئے بھی کبھی نہیں دیکھا کہ وہ خیالات کے مجتمع کرنے کے لئے کسی علحدہ کمرے میں جاکر بیٹھے ہوں، یا اور لوگوں کو اپنے پاس سے اُٹھا دیا ہو یا اُن کے پاس بیٹھنے سے تنگدل ہوئے ہوں، یا لوگوں کے اُٹھ جانے کے انتظار میں مضمون لکھنا ملتوی کردیا ہو۔ بے شک جب کوئی مہمان باہر سے آتا تھا، یا کسی دوست سے مدت کے بعد ملاقات ہوتی تھی، یا کسی اور خاص وجہ سے ایسا ہی ہوتا تھا کہ وہ لکھنا پڑھنا بند کردیتے تھے؛ مگر ایسا کبھی نہیں دیکھا گیا کہ حاضرین کے ہجوم کے سبب اُن کے خیالات پراگندہ ہو گئے ہوں اور اسلئے اُنہوں

نے مضمون لکھنے سے ہاتھ کھینچ لیا ہو۔ ہم نے خود دیکھا ہے کہ احباب جمع ہیں اور آپس میں دلچسپ بحثیں یا ہنسی چہل کی باتیں کر رہے ہیں۔ جنسے خواہی نخواہی ایک کامی آدمی کا دھیان بٹ جاتا ہے۔ مگر یہ شخص بدستور اپنے مضمون کی اُدھیڑ بن میں مستغرق ہے، کبھی لکھتا ہے اور کبھی سوچتا ہے اور دوستوں کے حرف و حکایت سے مطلق خبر نہیں ہوتا۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ اوروں کے لیے مجمع عام میں بیٹھکر تصنیف و تالیف کرنا غیر ممکن ہے، بلکہ ہمارا یہ مطلب ہے کہ مذہب کو اُنیسویں صدی کے سائنس پر منطبق کرنا یا کسی مذہبی مسئلہ کی نسبت جمہور کے برخلاف رائے قائم کرنا ایسی غیر مطمئن حالت میں سید احمد خان کے سوا دوسرے شخص کا کام نہ تھا۔

دوسری خاصیت شاید اس سے بھی زیادہ تعجب انگیز تھی۔ جب مصنف کسی ایسے مضمون پر قلم اُٹھاتا ہے جسکو اُس سے پہلے کسی نے نہ لکھا ہو اور جو ترتیب کے لباس سے ابتک عاری ہو (جیسی کہ عموماً سرسید کی مذہبی تحریریں ہوتی تھیں) تو اُسکے ذہن میں خیالات کا ایک بے ترتیب اور غیر منتظم انبار ہوتا ہے جسکا مرتب اور منتظم کرنا اور ہر ایک پوائنٹ کو اُسکے مناسب موقع پر رکھنا اُس مصنف کا فرض سمجھا جاتا ہے۔ مگر یہ ایک ایسا دشوار کام ہے کہ مصنف کو اکثر اوقات کئی کئی دفعہ ترتیب بدلنی اور بار بار کاٹ چھانٹ کرنی پڑتی ہے۔ لیکن جہانتک کہ دیکھا گیا ہے۔ سرسید جب کسی مضمون کو خود لکھنا یا کسی بیشدست سے لکھوانا شروع کرتے تھے (اگرچہ کیسا ہی مشکل اور طولانی مضمون ہو) یہ معلوم ہوتا تھا کہ اُسکے تمام پوائنٹس سلسلہ وار اپنے محل اور موقع پر اُنکی آنکھوں کے سامنے موجود ہیں، صرف اُنکو الفاظ کا لباس پہنانا باقی ہے چنانچہ مستثنیٰ حالتوں کے سوا کبھی ایسا نہوتا تھا کہ جس ترتیب سے اُنھوں نے کوئی مضمون لکھنا شروع کیا ہو اسکو بغیر کسی قسم کی تبدیلی کے اُسی چال سے آخر تک نہ پہنچا دیا ہو۔ اس مطلب کے زیادہ دلنشیں ہونے کے لئے ناظرین مندرجۂ ذیل مثال پر غور کریں۔

سرسید نے معراج کے مسئلہ کا بیان اپنی تفسیر کی چھٹی جلد میں ۱۴۱ صفحہ پر لکھا ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ اس مسئلہ پر زمانۂ حال کی ضرورت کے موافق نہ پہلے کسی نے ایسا لکھا ہے اور نہ آئندہ اُس سے زیادہ لکھنے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔ مگر اس مضمون کے لکھنے کی جو کیفیت ہمکو معلوم ہوئی ہے اُسکو سنکر اور پھر اس مضمون کی وسعت کو دیکھکر نہایت تعجب ہوتا ہے۔

مولوی سید وحید الدین سلیم جنہوں نے تفسیر کے لکھنے میں کئی سال تک برابر سرسید کو مدد دی ہے اُنکا بیان ہے کہ جب تفسیر کی نوبت سورۂ بنی اسرائیل تک پہنچی اور سید صاحب معراج کے

مسئلہ پر مفصل بحث کرنے کا ارادہ کیا تو مجھ سے کہا کہ ”جس قدر روایتیں صحاح اور دیگر کتب حدیث میں معراج اور شق صدر کے متعلق اور اس باب میں صحابہ کے اختلاف کے متعلق وارد ہوئی ہیں اور عقل و نقل کی تناقض کی صورت میں جو رائیں اور اقوال علما کے ہیں اُن سب کو آپ اس طرح پر کتابوں میں سے انتخاب کر کے نقل کر لیں کہ ایک ایک صفحہ پر اُن کو لکھتے جائیں اور دوسرا صفحہ کو چھوڑتے جائیں“ میں نے کتابیں دیکھنی شروع کیں اور بے شمار روایات و اقوال علما ۔ جو کہ سورۂ بنی اسرائیل کی تفسیر میں درج ہیں ۔ موافق ہدایت کے نقل کر کے سید صاحب کے سامنے پیش کیں ۔ میں سمجھتا تھا کہ جب میں تمام روایتیں اور اقوال نقل کر لونگا اس وقت سید صاحب ان کو دیکھکر معراج کے مسئلہ پر لکھنا شروع کریں گے ۔ مگر میرا یہ خیال غلط تھا ۔ انھوں نے اس مضمون کو اُس ترتیب پر جو اُن کے ذہن میں تھی بجائے خود اُسی وقت لکھنا شروع کر دیا تھا جب کہ مجھکو روایات وغیرہ کے نقل کرنے پر مامور کیا تھا ۔ وہ مسودہ کے ہر ایک صفحہ پر کہیں کہیں کچھ عبارت لکھتے تھے اور کہیں سفیدی چھوڑتے جاتے تھے ۔ یہانتک کہ میں ابھی اپنا کام پورا کرنے نہ پایا تھا کہ جو کچھ اُن کو لکھنا تھا وہ سب لکھ چکے اور اس مضمون کو کچھ کم ڈیڑھ سو صفحہ پر ختم کر دیا ۔ جب میں اُن بے شمار روایتوں اور اقوال کا دفتر لیکر پہنچا تو اُنھوں نے وہ تمام کاغذات لیکر اُن کو قینچی سے کترنا اور اُن ٹکڑوں کو جابجا سفیدیوں پر لئی سے چپکانا شروع کیا یہانتک کہ تمام پرچے جن کا شمار بتانا مشکل ہے جہاں جہاں ان کا موقع تھا چپکا دے اور کاتب کو صاف کرنے کے لئے دیدیا ۔ جب تمام مسودہ صاف ہو چکا اور میں نے اس کو اول سے آخر تک پڑھا تو مضمون کی ترتیب اور انتظام اور تمام روایات و اقوال علما کو اپنے اپنے موقع پر چسپاں دیکھکر میرے ہوش جاتے رہے“ وہ کہتے ہیں کہ سرسید کو مسودہ لکھتے وقت اُن روایات کے مضمون سے اُس سے سوا کچھ علم نہ تھا کہ جب میں کتابوں میں روایتیں تلاش کر رہا تھا اُس وقت جس قسم کے اختلافات اُن میں پائے جاتے تھے ان کا ذکر بالاجمال سرسید کے سامنے ہوتا رہتا تھا صرف اس قدر واقفیت پر اُنھوں نے تمام مضمون کا ناکا اپنے ذہن میں کھینچ لیا تھا اور ہر ایک روایت کا موقع اور محل جہاں جہاں کہ ہونا چاہئے تھا قرار دے لیا تھا ۔

اگرچہ یہ دونوں خاصیتیں ۔ جو ہم نے سرسید کی مصنفانہ قابلیت کے متعلق بیان کیں ۔ فی نفسہ عجیب ہیں مگر اُن سے سوا اُس شخص کے جو اُن کی طرز تصنیف کو بنظر غور دیکھتا رہا ہو دوسرا واقف نہیں ہو سکتا ۔ اب ہم ایک تیسری خاصیت کا ذکر کرتے ہیں جس کو ہر سمجھدار آدمی جو اُن کی تصنیفات کو دیکھیگا یقیناً تسلیم کرے گا اور اس سے ہماری مراد **قوت استدلال** ہے ظاہر ہے کہ سرسید کی بعض پولٹکل اور اکثر مذہبی تحریریں ایسی ہیں جن میں اُنھوں نے ایک جماعت کثیر یا جمہور اہل اسلام

سے اختلاف کیا ہے، باوجود اس کے اُن کو اپنے دعوے کے اثبات میں خلافِ توقع اکثر ایسی کامیابی ہوئی ہے جیسی کہ ایک مسلّم الثبوت رائے کی تائید کرنے والے کو ہونی چاہیئے۔

اسباب بغاوت میں جو کچھ اُنھوں نے لکھا وہ تمام اینگلوانڈینز بلکہ شاید انگلش نیشن کی رائے کے برخلاف تھا اور اسی لئے اس کا مارشل لا کے دور دورہ میں شایع کرنا خطرناک خیال کیا جاتا تھا۔ باوجود اس کے جس دھڑلے سے کہ اس کا بہت بڑا حصہ منوا یا گیا، اور جو کام کہ اُس نے اعیانِ سلطنت کے غیظ و غضب کی آگ بجھانے میں کیا اور جو عمدہ نتایج اس پر مترتب ہوئے اُس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ وہ کس قدر مدلل اور موجہ لکھا گیا تھا اور اس میں کیسے صحیح اصول پر استدلال کیا گیا تھا۔ اسی طرح ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب کا ریویو ایک ایسے خیال کی غلطی ثابت کرنے کے لئے لکھا گیا تھا جو عموماً مدبرانِ سلطنت کے دل میں جما ہوا تھا اور جس کو ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب نے اور بھی زیادہ پختہ کر دیا تھا۔ لیکن اس ریویو کے شایع ہونے سے۔ جیسا کہ پہلے مذکور ہوچکا ہے۔ اُس خیال کی غلطی علی العموم سب پر ظاہر ہوگئی۔

جس وقت کہ سرسید نے غلامی کے مسئلہ پر جمہور اہل اسلام کے برخلاف رسالہ لکھنے کا ارادہ کیا تو مولوی سید مہدی علی خاں نے اُن سے کہا کہ تم اس باب میں ایک حرف بھی اپنے دعوے کے ثبوت میں ایسا نہیں لکھ سکتے جو اصول اسلام کے موافق صحیح ہو۔ لیکن جب اُنھوں نے سرسید کا ابطال غلامی کا مضمون تہذیب الاخلاق میں اول سے آخر تک پڑھا تو اُن کو ماننا پڑا کہ اسلام نے فی الواقع ہمیشہ کے لیے غلامی کا استیصال کر دیا ہے یہاں تک کہ سرسید نے تہذیب الاخلاق میں ایک موقع پر صاف صاف لکھدیا ہے کہ جن مسائل میں ہم اور سید مہدی علی متفق ہیں اُنہیں میں سے ایک یہ ہے کہ "اسلام میں رقیت نہیں ہے"۔

مسلمانوں کا جہاد کا مسئلہ جو تمام عیسائی دنیا میں انگشت نما تھا اور جس سے بڑھکر کوئی بے رحمی اور ناخدا ترسی کا کام نہ سمجھا جاتا تھا۔ اُس کا مقابلہ۔ جیسا کہ ہم پہلے بیان کرچکے ہیں۔ سرسیّد نے انجیل کے اس مشہور اخلاقی حکم سے کیا ہے کہ "اگر کوئی تیرے ایک گال پر طمانچہ مارے تو دوسرا گال بھی اس کے سامنے کردے" اور نہایت عام فہم طریقہ سے ثابت کیا ہے کہ فطرت انسانی کے موافق اور قابل عمل در آمد جہاد کا حکم ہے جو قرآن میں آیا ہے نہ انجیل کا وہ اخلاقی حکم جو قرآن کی تعلیم پر اعتراض کرتے وقت مسلمانوں کے سامنے پیش کیا جاتا ہے اور جس پر نہ آجتک کبھی عمل ہوا ہے نہ آیندہ ہونے کی اُمید ہے۔

اسی طرح سرسید کی تصنیفات میں بے شمار مقامات ایسے نکلیں گے جو بادی النظر میں ممتنع الثبوت معلوم ہوتے ہیں مگر جب اُن دلائل پر نظر کی جاتی ہے جو سرسید نے اُن کے ثبوت میں پیش کی ہیں تو مخالفوں کو بھی۔ بشرطیکہ تعصب سے خالی ہوں۔ تسلیم کرنے کے سوا چارہ نہیں معلوم ہوتا۔

ہمارے نزدیک مصنفوں میں سرسید کا جو درجہ خاصکر مذہبی تصنیف و تالیف کے لحاظ سے قرار پاسکتا ہے اُس کا ٹھیک ٹھیک اندازہ کرنے کا ابھی وقت نہیں آیا، کیونکہ اُس وقت کچھ لوگ اُن کے حد سے زیادہ معتقد ہیں جن کو اُن کی تصنیفات میں کوئی لغزش یا خطا نہیں معلوم ہوتی۔ اور بہت بڑا گروہ اُن کے منکروں اور مخالفوں کا ہے جن کو اُن کی مذہبی تحریروں میں کفر و الحاد کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ پس جب تک یہ دونوں گروہ موجود ہیں اُن کی تصانیف کے باب میں بغیر حیف و میل کے رائے دینے کی کسی سے امید نہیں ہوسکتی۔

اس کے سوا اول تو مسلمانوں کے خیالات میں عموماً یہ بات جمی ہوئی ہے کہ اعلیٰ درجہ کی مذہبی تصنیفات کے لئے ضرور ہے کہ وہ عربی یا کم سے کم فارسی زبان میں ہوں۔ اردو زبان میں کیسے ہی محققانہ مضامین لکھے جائیں اور کیسے ہی بلند خیالات ظاہر کیے جائیں اُن کے نزدیک وہ اُردو کی معمولی کتابوں سے کچھ زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔ دوسرے جن لوگوں نے تقلید کے دائرہ سے نکل کر تحقیق کے میدان میں قدم رکھا ہے اُن کی تصنیفات ہمیشہ علمائے دین کے حلقوں میں ایک مدت تک مردود و مطرود رہی ہیں۔ لیکن چونکہ حق کبھی نہ کبھی ظاہر ہوئے بغیر نہیں رہتا اس لیے آخرکار لوگ اُن کے حسن و قبح کی چھان بین کی طرف متوجہ ہوئے ہیں، اور اُنھوں نے صواب کو خطا سے اور کھرے کو کھوٹے سے الگ کیا ہے، اور باوجود اُن کی غلطیاں ظاہر ہونے کے جن سے کسی محقق کا کلام محفوظ نہیں رہ سکتا۔ جس درجہ کے وہ مستحق تھے وہ درجہ اُن کو دیا گیا ہے۔

طرزِ تحریر

سرسید کی طرز تحریر پر کچھ ریمارک کرنا جس قدر ضروری ہے اُسی قدر مشکل بھی ہے ضرورت تو ظاہر ہے، کیونکہ بیوگرافر اگر بالفرض اپنے ہیرو کی تمام کلی و جزئی حیثیات پر بحث نہ کرسکے تو کم از کم اُس کی نمایاں اور مسلّم لیاقتوں کو دکھائے بغیر اپنے فرض سے عہدہ برآ نہیں ہوسکتا۔ پس سرسید کی طرز تحریر جس نے تیس پینتیس برس کے عرصہ میں اردو لٹریچر کا رُخ پھیر دیا اور مسلمانوں کے پولٹکل سوشل اور مذہبی خیالات میں انقلاب عظیم پیدا کردیا۔ اُس کے بیان سے کیونکر خاموش رہا جاسکتا

ہے۔ اور مشکل اس لیے کہ جس تحریر میں یہ تاثیر اور یہ کرشمہ تھا اُس کو ہم اُن متعارف خوبیوں سے۔ جو مشرقی لٹریچر میں کلام کی عمدگی کا معیار سمجھی جاتی ہیں۔ بظاہر معرا پاتے ہیں۔ پس اس بات کا دریافت کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے کہ جو تحریر تشبیہات و استعارات سے، صنایع لفظی و معنوی سے، شاعرانہ نزاکتوں سے اور فاضلانہ و منشیانہ تراش خراش سے خالی نظر آتی ہے اُس میں وہ کیا چیز تھی جس نے تھوڑی سی مدت میں ایسے غیر مترقبہ نتائج پیدا کر دئے۔ لیکن چونکہ سرسید کی بایوگرفی لکھنے کا مشکل کام ہم نے اپنے ذمہ لیا ہے اس لیے چار و ناچار ہم کو کچھ نہ کچھ لکھنا ضرور ہے۔

سرسید کی ابتدائی تحریریں غالباً سید الاخبار[1] میں درج ہونی شروع ہوئی تھیں جس کو اُن کے بڑے بھائی سید محمد خاں نے ۱۸۳۶ء یا ۱۸۳۷ء میں اُس وقت جاری کیا تھا جبکہ سرسید کی عمر سترہ یا اٹھارہ برس کی تھی۔ اگرچہ اُس وقت سے لیکر ۱۸۵۷ء تک اُنھوں نے متعدد کتابیں اور رسالے مذہب اور تاریخ کے متعلق لکھے اور اُن میں سے بعض کتابیں (جیسے آثار الصنادید) بدرجہ غایت مقبول اور مشہور بھی ہوئیں لیکن طرز تحریر میں اُس وقت تک کوئی ایسی صریح تبدیلی پیدا نہیں ہوئی جس کے لحاظ سے سرسید کو اُردو لٹریچر میں کسی ممتاز حصہ کا مستحق کیا جا سکے۔

البتہ یہ بات لحاظ کے قابل ہے کہ عبارت کی سادگی اور بے ساختگی۔ جو سرسید کی تحریر کی عام خاصیت ہے۔ وہ ۵۷ء سے پہلے کی تحریروں میں بھی جبکہ تصنع اور تکلف انشاپردازی کا زیور سمجھا جاتا تھا۔ برابر پائی جاتی ہے اور آثار الصنادید کا سب سے پہلا اڈیشن جسکی عبارت میں بہت کچھ ساختگی اور تکلف پایا جاتا ہے۔ وہ جیسا کہ سرسید خود اقرار کرتے تھے مولانا صہبائی کا لکھا ہوا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ گو اُس وقت طبع سلیم کے اقتضا سے خود سرسید کی طرز تحریر سیدھی سادی تھی مگر سوسائٹی کے اثر سے یقیناً سادی عبارت لکھنے کو وہ خود حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ جس کی وجہ سے اُنھوں نے اس بات کو گوارا نہ کیا کہ جن عمارتوں کی تحقیقات نہایت جانکاہ کوشش سے انجام کو پہنچائی ہے اُن کا حال اپنے سیدھی سادی عبارت میں جو اُس وقت خود اُن کی نظر میں کم وزن معلوم ہوتی تھی۔ تحریر کریں۔ مگر اس اڈیشن کے شایع ہونے کے بعد بہت جلد اس غلطی سے متنبہ ہوئے اور اس کو دوبارہ اپنے سیدھے سادھے نیچرل اسٹائل میں

---

[1] چونکہ سید احمد کا عرف اس زمانہ میں سید تھا اور اُن کے بھائی کو اُنسے بہت محبت تھی اس لیے اخبار کا نام اُن کے عرف کے لحاظ سے سید الاخبار رکھا تھا ۱۲

نہایت صحیح اور سچا مقولہ ہے کہ "اذا اراد اللہ شیئاً ھیأ اسبابہ"۔ چونکہ سرسید سے قوم کی اصلاح کا عظیم الشان کام ظہور میں آنا تھا اس لیے خدا تعالیٰ نے ان کی ذات میں وہ تمام خاصیتیں جمع کردی تھیں جو ایک رفارمر میں ہونی ضرور ہیں۔ انہیں خاصیتوں میں سے ایک یہ تھی کہ وہ ابتدا سے تحریر یا تقریر میں تصنع اور الفاظ کی تراش خراش سے نفرت رکھتے تھے اور گریمر کی پابندی سے فطرۃً آزاد تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اُنہوں نے جو اوّل اوّل دلی میں اپنے گرد شعرا کا جمگھٹا دیکھکر اُن کی دیکھا دیکھی شعر کہنا شروع کیا تھا کچھ بہت دن گذرے کہ وہ اُن تکلفاتِ لایعنی سے جو شاعری کے لئے لازم ہیں اور حقایق نگاری میں مخل ہوتے ہیں ہمیشہ کے لئے دست بردار ہو گئے۔ اُنھوں نے سیرت فریدیہ میں اپنے بچپن کا حال لکھا ہے کہ اُن کے نانا نے۔ جب کہ وہ بوستاں پڑھتے تھے۔ اُن کا سبق سُنا، سبق میں وہ شعر بھی تھا جس کا پہلا مصرع یہ ہے "وطمع راسہ حرف ست وہر سہ تہی"، اُنہوں نے اس کا ترجمہ کیا کہ "وطمع کے تین حرف تینوں خالی"، نانا نے تین دفعہ ٹوکا اور بہت خفا ہوئے مگر یہ وہی معنی کہے گئے، چونکہ محاورہ کے موافق ترجمہ بھی فصیح تھا اس لئے گریمر کا مطلق خیال نہ آیا۔ جو حال اُن کا اُس بچپن کے زمانہ میں تھا وہی اخیر دم تک باقی رہا۔ وہ تحریر یا تقریر کی رو میں گریمر کی کچھ پروا نہ کرتے تھے، وہ اُن قیدوں سے جو شاعروں اور منشیوں نے مقرر کی ہیں بالکل آزاد تھے، وہ اُن غلط لفظوں کو۔ جو عام فہم اور خاص و عام کی زبان پر جاری ہوں۔ صحیح الفاظ پر ترجیح دیتے تھے، اُنکی زبان دلی کی بول چال میں محدود نہ تھی بلکہ جو لفظ یا جو جملہ بے اختیار قلم سے ٹپک گیا وہی ان کی زبان اور وہی بول چال تھی غالباً اُنہوں نے کسی لفظ کے استعمال کرتے وقت یہ خیال نہ کیا ہوگا کہ یہ لفظ اہل زبان بولتے ہیں یا نہیں؟ اور کسی فقرہ کو لکھکر پھر یہ نہ دیکھا ہوگا کہ قواعد کی رو سے اُس کی ترکیب صحیح ہے یا نہیں؟

یہ خاصیت جس کو ہم نے بیان کیا ایک سچے رفارمر کے کلام میں ایسی ہی ضروری ہے جیسی سچائی اور راستبازی۔ وہ مثل شاعروں اور انشا پردازوں کے اپنے کلام کی بنیاد الفاظ کی شستگی اور ترکیبوں کی برجستگی پر نہیں رکھتا بلکہ اُس بے قراری آدمی کی طرح۔ جو گھر میں آگ لگی ہوئی دیکھکر ہمسایوں کو بے تابانہ آگ بجھانے کے لئے پکارتا ہے۔ ایسے الفاظ استعمال کرتا ہے جو گھبراہٹ کی حالت میں بے ساختہ انسان کے مونھ سے نکل جاتے ہیں۔ وہ واقعات

پر تشبیہ و استعارہ کے پردے نہیں ڈالتا بلکہ اُن کی ننگی تصویر کھلم کھلا سب پر ظاہر کرتا ہے وہ الفاظ و قواعد کا محکوم نہیں ہوتا بلکہ الفاظ اور قواعد کو اپنے جذبات کا محکوم رکھتا ہے۔

الغرض سرسید نے خیالات کے ظاہر کرنے میں بناوٹ اور تصنع کو کبھی دخل نہیں دیا، جس سادگی اور بے تکلفی کے ساتھ ابتدا میں مطلب نگاری شروع کی تھی غدر کے زمانہ تک جو کہ تقریباً بیس برس کا زمانہ ہوتا ہے اپنے اُسی سیدھے سادے اور نیچرل اسٹائل میں ہر قسم کی تحریریں۔ کیا کتابیں، کیا مضامین اور کیا مقدمات کے فیصلے اور تجویزیں۔ برابر لکھتے رہے۔ اس بیس سال کی مشق و مہارت نے۔ جو ایک انداز پر مستقل جاری رہی۔ ضرور ہے کہ اُنکی قلم میں ہر مطلب کے ادا کرنے اور ہر پیچیدہ مضمون کے سلجھانے کی ایک غیر معمولی طاقت پیدا کر دی ہوگی، کیوں کہ نیچرل قویٰ سے جب اُن کے مقتضا کے موافق برابر کام لیا جاتا ہے تو اُن سے اکثر فوق العادۃ کرشمے ظہور میں آتے ہیں۔ مگر ابھی وہ وقت نہیں آیا تھا جب کہ اِس سیدھی سادی تحریر کے اصلی جوہر کھلنے والے اور اس ٹھنڈی آگ کے شعلے بلند ہونے والے تھے۔

غالباً اس بات پر سب کا اتفاق ہوگا کہ تحریر کا اصل مقصد لوگوں کے دلوں پر اثر کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہے مگر اس امر میں سب کی رائے مختلف معلوم ہوتی ہے کہ اثر کس طرح پیدا ہوتا ہے؟ اسی ایک مقصد کے لیے کوئی الفاظ میں تراش خراش اختیار کرتا ہے اور کوئی سادگی کوئی کلام کی بنیاد متانت اور سنجیدگی پر رکھتا ہے اور کوئی مزاح و ظرافت پر، کوئی سوچ سوچ کر علمی اصطلاحیں اور فاضلانہ ترکیبیں استعمال کرتا ہے اور کوئی ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر اہلِ زبان کے محاورے اور روزمرے بہم پہنچاتا ہے، اسی طرح کوئی کسی ڈھنگ پر چلتا ہے اور کوئی کسی طریقہ پر۔ مگر حق یہ ہے کہ کلام کی تاثیر کو ان باتوں سے کچھ علاقہ نہیں ہے

جنگِ ہفتاد و دو ملت ہمہ را عذر بنہ
چوں ندیدند حقیقت رہِ افسانہ زدند

بے شک کلام کے موثر ہونے کے لیے اس کا سادہ اور بے تکلف ہونا ضرور ہے مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ جو کلام سادہ اور بے تکلف ہوگا وہ مؤثر بھی ضرور ہوگا۔ کلام کیسا ہی سادہ اور بے تکلف ہو۔ جب تک کہ متکلم کا دل آزادی اور سچائی سے بھرا ہوا نہ ہو۔ کبھی مؤثر نہیں ہو سکتا جس طرح تلوار کی کاٹ درحقیقت اُس کی بار میں نہیں بلکہ سپاہی کے کری ہاتھ میں ہے اس طرح کلام کی تاثیر اُس کے الفاظ میں نہیں بلکہ متکلم کی سچائی اور اُس کے اندرونی لاگ بان میں ہے۔ وہی الفاظ جو ایک

سچے اور دلسوز ناصح کی زبان سے نکلکر لوگوں کے دلوں پر تیر و سنان کا کام کرتے ہیں ممکن نہیں کہ ایک نمائیشی واعظ کی زبان پر اُن میں کچھ بھی اثر باقی رہے ۔ سچے ناصح کے لعن وطعن میں جو اثر ہوتا ہی وہ جھوٹے واعظ کی لیثارتوں میں نہیں ہوتا۔ سرسید کے کلام میں جو تاثیر تھی وہ درحقیقت اُن کی سچائی اور حق گوئی کا نتیجہ تھا ۔

باوجودیکہ مسلمان صدہا سال سے نہ صرف مذہب میں بلکہ علوم وفنون میں، لٹریچر میں، رسم ورواج میں، اخلاق وعادات میں، طریق معاشرت میں، غرضیکہ ہر چیز میں اگلوں کی لکیر پر فقیر چلے آتے تھے اور کوئی ایسی بات ۔جس سے کبھی اُن کے کان آشنا نہوئے ہوں ۔ہرگز سننی نہیں چاہتے تھے مگر سچ میں وہ کرشمہ ہے کہ نارنگی بن ہی وہ چکے بغیر نہیں رہتا ۔جو شخص سب سے پہلے تقلید کی بندشوں کو توڑکر اور سوسائٹی کی رکاوٹوں کو برطرف کرکے قوم کی اصلی بھلائی کے خیالات صاف صاف ظاہر کرتا ہی ۔گوکہ وہ قوم کے مذاق اور الف وعادت کے کیسے ہی برخلاف ہوں ۔اُن میں عجیب قسم کی کشش ہوتی ہے کہ اُن کے سننے کے لیے کیا موافق اور کیا مخالف سب کے کان کھڑے ہوجاتے ہیں اور دونوں فریق مختلف طور پر اُن سے متاثر ہوتے ہیں، پہلا ان کو حق سمجھکر بے چون وچرا قبول کرتا ہی اور دوسرا اُن میں مقبولیت کے آثار نمایاں دیکھکر خائف ہوتا ہی کہ مبادا یہ خیالات تمام قوم میں شایع ہوجائیں۔ سرسید کی تحریریں یہی چیز تھی جس نے اُن سیدھے سادے اور معمولی لفظوں میں جادو کا اثر پیدا کردیا تھا اور تمام قوم میں ہل چل ڈالدی تھی ۔

مگر اس بیان سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ سرسید کی تحریر جو بظاہر متعارف لفظی خوبیوں سے خالی معلوم ہوتی تھی درحقیقت اُس میں لفظی خوبیاں نہ تھیں بلکہ اصل بات یہ ہی کہ جب عمدہ پاکیزہ خیالات ایسے صاف اور معنی خیز لفظوں میں بیان کیے جاتے ہیں کہ لفظوں کے ساتھ ہی ساتھ معنی بھی ذہنوں میں اُترتے جاتے ہیں تو خیالات کی خوبی ناظرین کو الفاظ کی طرف متوجہ نہیں ہونے دیتی بلکہ محاسن لفظی خیالات کی شکوہ میں دب جاتے ہیں ۔اس کے سوا جب مصنف کی ہمت محض عمدہ خیالات کے پھیلانے پر مقصور ہوتی ہے تو اُس بیان میں محاسن لفظی کی اُسی قدر گنجایش ہوتی ہی جس قدر کہ ہر مقام کا مقتضا ہوتا ہے اور اس لیے وہ عبارت میں اسقدر گھل مل جاتے ہیں کہ جب تک بنظر غور نہ دیکھا جائے عام بیان اُن سے سادہ نظر آتا ہے ۔
یہی وجہ ہے کہ سرسید کی تحریر میں لفظی خوبیاں ایسی اُجاگر نہیں معلوم ہوتیں جیسی دیگر مصنفوں کے

کے کلام میں معلوم ہوتی ہیں ورنہ صنائع لفظی کے سوا اُس میں تمام محاسن لفظی و معنوی موجود ہیں تشبیہیں بھی ہیں، استعارے بھی ہیں، کنائے بھی ہیں، تمثیلیں برجستہ اور تلمیحیں نہایت لطیف ہیں، نہ بدلے اور لطیفے حد سے زیادہ دلکش اور دلفریب ہیں، کہاوتیں اور اشعار برمحل جا بجا نظر آتے ہیں مگر اس قبیل کی جو چیز ہے اُس میں ایسا بے ساختہ پن پایا جاتا ہے کہ گویا بے قصد و بے ارادہ مصنف کے قلم سے ٹپکی ہے۔

(۴) قدرتِ بیان

مگر جو چیز کہ سرسید اور دیگر مصنفوں اور مضمون نگاروں میں مابہ الامتیاز ہے وہ قدرتِ بیان ہے جس کے ثبوت کے لیے خود اُنکی مختلف تحریروں کا دیکھ لینا کافی ہے۔ مصنف کی قدرتِ بیان کئی شکلوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ ایک یہ کہ وہ ہر ایک مضمون کو اُسی پیرایہ میں بیان کر سکے جو اُس مضمون کی حالت کے مناسب ہے۔ کیونکہ ہر قسم کے کلام کا پیرایۂ بیان جدا ہوتا ہے۔ جس ڈھنگ پر ناول لکھا جاتا ہے اُس ڈھنگ پر تاریخ یا بایوگرافی نہیں لکھی جاتی۔ جہاں متانت اور سنجیدگی کا موقع ہوتا ہے وہاں ظرافت نازیبا معلوم ہوتی ہے۔ تشبیہ و استعارہ اگرچہ نظم و نثر کا زیور ہے مگر کسی سررشتہ کی سالانہ رپورٹ، یا کسی مقدمہ کے فیصلہ، یا کسی پبلک جلسہ کی روداد میں اُس سے زیادہ کوئی چیز بدنما نہیں ہوتی؛ اسی لئے کہا گیا ہے "ہر سخن وقتے و ہر نکتہ مکانے دارد" مگر بہت کم دیکھا جاتا ہے ہر مصنف پر اُس کی طبیعت کے میلان کے موافق رفتہ رفتہ کسی خاص پیرایۂ بیان کا رنگ چڑھ جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یا تو وہ ایک خاص مضمون کے سوا اور کسی موضوع پر کچھ نہیں لکھ سکتا اور یا جس موضوع پر قلم اُٹھاتا ہے اُس کو اُسی خاص رنگ میں رنگنا چاہتا ہے مثلاً بعضوں کا قلم حسن و عشق کے میدان میں خوب دوڑتا ہے، پس یا تو وہ ایسے مضمون پر قلم ہی نہیں اُٹھاتے جس میں حسن و عشق کی چاشنی نہ ہو اور یا جو مضمون لکھتے ہیں اُس کو اُسی سانچے میں ڈھالنا چاہتے ہیں۔ اسی طرح بعض کی طبیعت پر استعارہ اس قدر غالب ہو جاتا ہے کہ سیدھے رستے سے بھی چکر کاٹے بغیر نہیں گذرتے، بعضے ہر ایک مضمون میں ظرافت کی چاشنی دینی چاہتے ہیں اگرچہ نفس مضمون اُس سے ابا کرتا ہو۔ غرض کہ جس مصنف یا مضمون نگار کو دیکھئے اُس پر کوئی نہ کوئی بھوت سوار ہوتا ہے۔

مگر سرسید کی تحریروں کو ہم اس عام قاعدہ سے مستثنےٰ پاتے ہیں، اُن کی ہر قسم کی بے شمار تحریریں کیا تاریخی، کیا علمی، کیا مذہبی، کیا اخلاقی، کیا سوشل، کیا پولٹکل، کیا ادبی، اور کیا لیگل۔ علیگڑھ گزٹ

تہذیب الاخلاق، تصانیف احمدیہ، سالانہ رپورٹوں، عدالت کے فیصلوں، جلسوں کی رودادوں

اور پرائیوٹ خطوں وغیرہ میں موجود ہیں اُن کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایک شاخ میں وہی پیرایۂ بیان پایا جاتا ہے جو اُسکے لئے موزون اور مناسب ہے۔ حالانکہ مصنف کو خود خبر نہیں کہ کس مضمون کے لئے کونسا پیرایۂ بیان موزون ہے مگر تحریر کی قدرتی قابلیت بغیر قصد و ارادہ کے قلم کو اُسی راہ پر ڈالدیتی ہے جسپر اُسکو چلنا چاہیے۔ جسطرح پہاڑ کی رو رستے کے موڑ توڑ اور پیچ وخم کے ساتھ رخ بدلتی چلی جاتی ہے اسی طرح ہر مقام کے مقتضا کے موافق تحریر کا رنگ خود بخود بدل جاتا ہے۔ اگر علمی اور تاریخی مضامین میں دریا کے بہاؤ کیسی روانی ہے تو مذہبی اور پولٹکل تحریروں میں چڑھاؤ کی تیرائی کا سا زور ہے۔ اعتراضات کے جواب میں متانت اور سنجیدگی ہے تو بے دلیل دعوؤں کے مقابلہ میں ظرافت و خوش طبعی۔ نصیحتیں نشتر سے زیادہ دلخراش اور مرہم سے زیادہ تسکین بخش ہیں۔ غصہ مہربانی سے زیادہ پر لطف ہے اور نفرین آفرین سے زیادہ خوش آیند۔ وہی ایک قلم ہے جو اخلاق کے بیان میں ایک مورلسٹ کے ہاتھ میں معلوم ہوتی ہے تو عدالت کے فیصلوں میں ایک کہنہ مشق جج کے ہاتھ میں، اور سالانہ رپورٹوں اور جلسوں کی روئدادوں میں ایک تجربہ کار سکرٹری کے ہاتھ میں۔ یہاں ہم ایک نہایت معمولی مثال کے ذریعہ سے ناظرین کو اس بات کا خیال دلانا چاہتے ہیں کہ اس شخص کے قلم میں ہر ایک مطلب کو اُسکے مناسب پیرایہ میں بیان کرنے کی کس قدر قابلیت تھی۔

سر سید نے تہذیب الاخلاق کے ایک آرٹکل میں آدم کی سرگذشت ایک قصہ کے پیرایہ میں بیان کی ہے۔ وہاں اُس موقع پر۔ جبکہ آدم نے محض تنہائی اور سناٹے کے عالم میں حوا کو اچانک اپنے پہلو میں بیٹھے ہوئے پایا اور اُس سے بے انتہا خوشی حاصل ہوئی۔ خدا کے شکر کے چند الفاظ فرضی طور پر آدم کی زبان سے اس بات کا تصور دلانے کیلئے لکھے ہیں کہ آدم کا اُس غیر مترقبہ خوشی اور اوس کے وجد و ذوق میں کیا حال ہوا ہوگا؟ اور انسان کی اُس ابتدائی اور نیچرل حالت میں۔ جبکہ زبان میں لفظ موجود نہ تھے۔ کس قسم کے بول خدا کے شکر میں اُس کی زبان سے نکلے ہونگے؟ اور کیسے سیدھے سادے لفظوں سے اُس نے خدا کو پکارا ہوگا؟

گویا آدم کہتا ہے کہ جب میں نے اپنے ہمجنس (یعنی حوا) کو اپنے پہلو میں بیٹھا ہوا دیکھا تو میں بہت خوش ہوا اور تالیاں بجا کر خوب اوچھلا اور خوب کودا اور اوپر کو دیکھ دیکھ کر ایک بڑی ہستی کا خیال کرکے خوب گیت گائے اور نہایت ذوق و شوق میں یعنی چلایا اُدُو! اُدا! اُرے اُرا! ارے اُوا! ارے وہ جو ہے ارے وہ جو

اے وہ جو رہیگا! اے وہ جو رہیگا! اے وہ جو تو ہی ہے! اے وہ تو ہی ہے! میرا شکر ہے" اس انجان جانب کارنے میرا شکر لیا: اب تم سب اُسی برکت کے پھل پھول ہو" اگرچہ بادی النظر میں مثال بہت کم وزن اور حقیر معلوم ہو گی مگر موقع کا تصور کرنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ جو حالت ان لفظوں سے ظاہر ہوتی ہے اُسکے بیان کرنے کے لئے ان سے بہتر الفاظ ملنے کسقدر مشکل تھے۔

دوسرے۔ مشکل سے مشکل اور پیچیدہ سے پیچیدہ مطلب اسطرح سلجھا کر ادا کرجانا کہ جو مضمون لفظوں میں سماتا نظر نہ آتا ہو وہ ایسی خوبی سے ادا ہو جائے جیسے انگوٹھی پر نگین جڑ دیا۔ اس لحاظ سے جو قدرت سرسید کے قلم میں دیکھی گئی ہے وہ فی الواقع نادر الوجود تھی۔ قرآن مجید میں بیشمار مقامات ایسے ہیں کہ سرسید کی تفسیر سے پہلے سے ناممکن معلوم ہوتا ہے کہ اُن مقامات کی معنی اُس اصول کے موافق قرار دئے جاسکیں جسکے مطابق سرسید نے تمام قرآن کی تفسیر کرنے کا دعویٰ کیا ہے! مگر تفسیر دیکھنے کے بعد مستثنیٰ مقامات کے سوا کوئی مقام ایسا نظر نہیں آتا جسکی تفسیر اُسی اصول کے موافق پوری نہ اُتر گئی ہو۔ اگرچہ اسکی مثالیں قرآن کی تفسیر میں جابجا موجود ہیں مگر ایک نہایت بدیہی مثال آدم کے قصہ کا بیان ہے۔ اس قصہ کی نسبت جو کہ قرآن مجید میں مذکور ہے۔ اگرچہ علمائے سلف میں سے بھی بعض محققین نے یہی لکھا ہے کہ یہ کسی واقعہ کی خبر نہیں بلکہ انسان کی فطرت کا بیان بطور تمثیل کے کیا گیا ہے مگر علمائے سلف اس فرکی طرف ایک مجمل اشارہ کرکے آگے بڑھ گئے ہیں؛ کسی نے قصہ کی تمام جزئیات کو تمثیل کے قالب میں ڈالکر نہیں دکھایا۔ سرسید نے اول تہذیب الاخلاق میں اسی مضمون کو ایک فرضی قصہ کے پیرایہ میں بیان کیا ہے اور پھر تفسیر میں بحیثیت ایک مفسر کے تمام قصہ کے جزئیات کو انسان کی فطرت اور اُسکے قویٰ پر ایسی خوبی سے منطبق کیا ہے کہ اُنسے پہلے کسی سے یہ کام بن نہیں آیا۔ پس صرف اسی مضمون کو تہذیب الاخلاق یا تفسیر میں دیکھنے سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس شخص کو بذریعۂ تحریر کے مشکل مشکل عقدوں کے سلجھانے پر کس قدر قدرت تھی۔

تیسرے۔ واقعات و حالات کے حسن و قبح کی تصویر اس طرح کھینچنا کہ جو بُرائیاں بسبب اُلفت و عادت کے دلوں میں کُھب گئی ہوں اُنکی بُرائی، اور جو خوبیاں سوسائٹی کے اثر سے نظروں سے چھپ گئی ہوں اُنکی خوبی فوراً دلوں پر نقش ہو جائے۔ یہ کمال بھی جو سرسید کی تحریر میں دیکھا

دیکھا جاتا ہے دوسری جگہ آجتک نہیں دیکھا گیا اور اُسکی مثالین خاصکر تہذیب الاخلاق کی قدیم اور جدید جلدون میں بکثرت موجود ہیں۔

مثلاً وہ ایک آرٹکل میں مسلمانون کے کھانا کھانے کا طریق اسطرح بیان کرتے ہیں کہ ہندستان میں مسلمانون کے کھانا کھانے کا بھی وہی طریق ہے جو ہندوؤن کا ہے! صرف اتنا فرق ہے کہ ہندو چوکے میں بیٹھتے ہیں، مسلمان دسترخوان بچھاکر بیٹھتے ہیں۔ جسطرح ہندو سب طرح کا کھانا ایک ساتھ اپنے آگے رکھہ لیتے ہیں اسی طرح مسلمان بھی قابون اور رکابیون اور غوریوں اور تشتریون اور پیالون میں سب طرح کا کھانا اور سب قسم کی روٹی اور ہر طرح کے کباب اور فیرنی کے خوانچے اور بورانی کے پیالے اور اچار مربے کی پیالیان سیتلا کے پوجاپے کی طرح سب اپنے آگے رکھہ لیتے ہیں اور اُس ایک دسترخوان پر کوئی فیرنی کلمۂ شہادت کی اُنگلی سے اور کوئی (دست بخیر) چارون انگلیون سے چاٹ رہا ہے، کوئی پلاؤ میں اروی کا سالن ملا ملاکر کھا رہا ہے، کسی نے سالن ملا ہوا پلاؤ کھاکر نان آبی سے لتھڑا ہوا پنجۂ مبارک پونچھکر روٹی کو سالن میں ڈبو ڈبو کر کھانا شروع کیا ہے۔ کسی نے بورانی کے پیالے کو موںہ سے لگا کر سڑ پا پیرا اور یہ کہکر۔ کہ واللہ بڑی تیز ہے۔ اوہ اوہ کرنا شروع کیا ہے۔ تمام جھوٹے برتن اور نیم خوردہ کھانا اور چچوڑی ہوئی ہڈیاں اور روٹی کے ٹکڑے اور سالن میں کی نکلی ہوئی کھیان سب آگے رکھی ہوئی ہیں اس عرصہ میں جو شخص پہلے کھا چکا ہے اُسنے ہاتھ دہونا، کھنکار کھنکار کر گلا صاف کرنا، اور بیسن سے دانت رگڑنے، اور زبان پر دو انگلیان رگڑ رگڑ کر صاف کرنا شروع کیا ہے۔ اور اور بے تکلف بیٹھے کھانا نوش فرماتے ہیں۔ نہ اُن ہاتھ موںہ دہونے والون کو خیال ہے کہ ہم کھانا کھانے والون کے قریب کیسی حرکات ناشایستہ کرتے ہیں اور نہ کھانا کھانے والون کو اُن لوگون کی کریہ آواز سننے اور زرد زرد ہلدی ملے ہوئے رنگ کا لعاب نکلنے اور بلغم کے لوتھڑے تھو تھو کرکے چلمچی یا تاش میں تھوک دینے اور تباسی کی طرح اُس کے پانی پر تیرتے پھرنے کی پرواہ ہے۔ نعوذ باللہ منہا!!"

یا مثلاً ایک ارٹکل میں بے تہذیب آدمیونکی بحث و تکرار کی تصویر اس طرح کھینچی ہے کہ جب[۱] کتے آپس میں ملکر بیٹھتے ہیں تو پہلے تیوری چڑھاکر ایک دوسرے کو بُری نگاہ سے آنکھین بدل بدل کر دیکھنا شروع کرتے ہیں، پھر تھوڑی تھوڑی گونجیلی آواز اُنکے نتھنون سے نکلنے لگتی ہے، پھر تھوڑا جبڑا کھلتا ہے اور دانت دکھلائی دینے لگتے ہیں، اور حلق سے آواز نکلنی شروع ہوتی ہے، پھر باچھین چرکر کانون سے جالگتی ہیں، اور ناک سمٹ کر ماتھے پر چڑھ جاتی ہے، ڈاڑھون تک دانت باہر نکل آتے ہیں، موںہ سے جھاگ نکل پڑتے

---

[۱] یہ مضمون اصل میں انگریزی سے لیا گیا ہے مگر سرسید کا اسمیں کچھہ تصرف ہے جسکے سبب سے وہ بہ نسبت اصل کے بہت زیادہ عجیب ہو گیا ہے

ہیں اور عنیف آواز کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور ایک دوسرے سے چمٹ جاتے ہیں، اسکا ہاتھ اُس کے گلے میں اور اُسکی ٹانگ اسکی کمر میں، اسکا کان اُسکے منہ میں اور اُسکا ٹینٹوا اسکے جبڑے میں، اس نے اُسکو کاٹا اور اُس نے اسکو پچھاڑ کر بھنبوڑا۔ جو کمزور رہا دم دبا کر بھاگ نکلا۔"

"نامہذب آدمیوں کی مجلس میں بھی آپس میں اسی طرح پر تکرار ہوتی ہے۔ پہلے صاحب سلامت کر کر آپس میں مل بیٹھتے ہیں، پھر دھیمی دھیمی بات چیت شروع ہوتی ہے، ایک کوئی بات کہتا ہے، دوسرا بولتا ہے واہ! یوں نہیں، یوں ہے، وہ کہتا ہے واہ! تم کیا جانو، وہ بولتا ہم کیا جانو، دونوں کی نگاہ بدل جاتی ہے، تیوری چڑھ جاتی ہے، رُخ بدل جاتا ہے، آنکھیں ڈراونی ہو جاتی ہیں، باچھیں چڑھ جاتی ہیں، دانت نکل پڑتے ہیں، تھوک اُڑنے لگتا ہے، باچھوں تک کف بھر آتے ہیں، سانس جلدی چلتا ہے، رگیں تن جاتی ہیں، آنکھ ناک بھوں اور ہاتھ عجیب عجیب حرکتیں کرنے لگتے ہیں، عنیف عنیف آوازیں نکلنے لگتی ہیں، آستین چڑھا ہاتھ پھیلا اُسکی گردن اسکے ہاتھ میں اور اسکی ڈاڑھی اُسکی مٹھی میں لپاڈگی ہونے لگتی ہے، کسی نے بیچ بچاؤ کر کر چھڑا دیا تو غراتے ہوئے ایک اُدھر چلا گیا اور ایک ادھر، اور اگر کوئی بیچ بچاؤ کرنے والا نہوا تو کمزور نے پٹ کر کپڑے جھاڑتے سر سہلاتے اپنی راہ لی۔"

"جسقدر تہذیب میں ترقی ہوتی ہے اُسی قدر اس تکرار میں کمی ہوتی ہے۔ کہیں غرفش ہو کر رہجاتی ہے کہیں توں تکار تک نوبت آجاتی ہے، کہیں آنکھیں بدلنے اور ناک چڑھانے اور جلدی جلدی سانس چلنے ہی پر خیر گذر جاتی ہے؛ مگر ان سب میں کسی نہ کسی قدر کتوں کی مجلس کا اثر پایا جاتا ہے۔ پس انسان کو لازم ہے کہ اپنے دوستوں سے کتوں کی طرح بحث و تکرار کرنے سے پرہیز کرے۔"

اگرچہ سرسید نے۔ جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ اُردو زبان اور اُردو لٹریچر کو طرح طرح سے مدد پہنچائی ہے مگر جو بے بہا مدد خاصکر اُنکے لٹریری ورکس سے اُردو لٹریچر کو پہنچی ہے اُسکے لحاظ سے اُنکو فادر اوف اُردو کہنا کچھ مبالغہ نہیں ہے۔ اگرچہ سرسید کے سوا اور بھی بہت سے لائق مصنف، مترجم اور مضمون نگار ملک میں موجود ہیں جو نئے نئے خیالات اور نئے نئے اسلوبوں سے اُردو زبان کو سرمایہ دار کر رہے ہیں؛ لیکن ہر شخص کی طرز تحریر میں۔ گو کہ وہ فی نفسہ کیسی ہی عمدہ اور اعلیٰ درجہ کی ہو۔ یہ قابلیت نہیں ہوتی کہ وہ عام تحریروں کو اپنی سطح پر لے آئے؛ بعضے اسٹائل ایسے اچھوتے اور شارع عام سے ایسے بعید ہوتے ہیں کہ اور لوگ اُنکا تتبع کرنے کی دسترس اپنے میں نہیں پاتے، اور بعضے ایسے سپاٹ اور سیٹھے پھیکے ہوتے ہیں کہ اُنکی طرف کسی کی توجہ مائل نہیں ہوتی، اور اسلئے دونوں قسم کے اسٹائلوں کا عام لٹریچر پر کوئی معتدبہ

اثر نہیں ہوتا۔ سرسید کی طرز تحریر میں یہی خصوصیت تھی کہ اُس کی لطافت اور خوبی کے سبب لوگ عموماً اُس کو شوق اور توجہ سے پڑھتے تھے اور اُسکی سادگی اور بے تکلفی دیکھکر ہر ایک کے دل میں ویسا ہی لکھنے کا حوصلہ پیدا ہوتا تھا۔ اگرچہ بیان کی قدرت اور اُسکا زور اور تاثیر جو اُس شخص کی خاص خاص تحریروں میں پائی جاتی ہے وہ تو اُسی کے دل و دماغ کا حصہ تھا۔ دوسرے کی تحریر میں اُس کا ڈھونڈنا لاحاصل ہے۔ مگر جو صفائی اور سلاست تہذیب اور شایستگی اور گھلاوٹ آج عام تحریروں میں دیکھی جاتی ہے، اور جسقدر آرٹیکل نگاری کا سلیقہ اخباری دنیا میں پھیلا ہے اور جہان تک اہل قلم میں ہر قسم کے معاملات پر آزادانہ رائے زنی اور نکتہ چینی کرنے کا حوصلہ پیدا ہوا ہے اگر ذرا غور کرکے دیکھا جائے تو یہ سب اُسی ایک قلم کی آواز بازگشت ہے؛ اور اسکا اندازہ اسطرح ہوسکتا ہے کہ جو اخبارات سائنٹفک سوسائٹی علیگڑھ کا اخبار نکلنے سے پہلے ملک میں جاری تھے اُنکا مقابلہ اُن اخبارون کے ساتھ کیا جائے جو اُسکے بعد جاری ہوے اور جو اخبار یا میگزین تہذیب الاخلاق سے پہلے شایع ہوتے تھے اُنکا موازنہ اُن اخباروں یا میگزینوں سے کیا جائے جو اسکے بعد شایع ہوئے؛ اس مقابلہ سے صاف معلوم ہو جائیگا کہ اُردو اخبارون نے ان پرچون سے کیا سبق حاصل کیا ہے۔ اگرچہ سرسید کی دیگر تصانیف سے بھی اُردو لٹریچر کو بہت کچھ مدد پہنچی ہے مگر سوسائٹی اخبار اور تہذیب الاخلاق نے خاصکر اُس میں ترقی کی روح پھونکی ہے کیونکہ اُنکے مضامین جلد جلد شایع ہوتے تھے اور مہینے میں کئی کئی دفعہ پبلک کی نظر سے گذرتے تھے اور یہ سلسلہ بتیس برس تک برابر جاری رہا۔

بے شک یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان دونون پرچون میں سرسید کے سوا اور بھی بہت سے لکھنے والے تھے خصوصاً سید مہدی علی خاں قدیم تہذیب الاخلاق میں گویا سرسید کے برابر کے شریک تھے اور اسلئے کوئی وجہ نہیں کہ جو لٹریری فوائد اُن پرچوں سے مرتب ہوے انکو صرف سرسید کی تحریرات سے منسوب کیا جائے۔ لیکن چونکہ یہ سب لوگ سرسید کے قدم بہ قدم چلنے والے اور اُنہیں کے اسٹائل کی پیروی کرنے والے تھے اسلئے اگر اُن تمام فوائد کو صرف سرسید کی تحریروں سے منسوب کیا جائے تو کچھ بے جا نہیں۔

چونکہ اس مقام کو ہم تہذیب الاخلاق کے نتایج کے ذکر میں مفصل بیان کرچکے ہیں اسلئے یہاں اسپر زیادہ بحث کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتے۔

معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں اُنکو فارسی نظم و نثر لکھنے کا بھی شوق رہا ہے۔ اگرچہ فارسی زبان

مین جیسا کہ وہ خود بیان کرتے تھے - انہوں نے معمولی کتابوں کے سوا جو مکتبوں میں پڑہائی جاتی تہیں کوئی علمی درجہ کی کتاب نہیں پڑہی تہی مگر جن مجلسوں اور صحبتوں میں اُنکا ابتدائی زمانہ گذرا تہا اُنیں دن رات فارسی نظم و نثر کا چرچہ رہتا تہا - مولانا صہبائی سے اُنکی دوستی اخوت کے درجہ کو پہنچی ہوئی تہی - مولانا سے جو طالب علم مکان پر فارسی پڑہنے آتے تہے ابتدا میں وہ سرسید ہی کے مکان پر اُنکو تعلیم دیا کرتے تہے - مفتی صدالدین خاں کے ہاں بہی اُنکا ایک پہرا ہر روز ہوتا تہا جہاں صہبائی اور شیفتہ اور مومن وغیرہم کا مجمع رہتا تہا - مرزا غالب کو وہ چچا کہتے تہے اور مرزا اُنپر بزرگانہ شفقت کی نظر رکہتے تہے - نواب ضیاءالدین احمد خاں اُنکے نہایت گاڑہے دوست تہے - اور یہ سب لوگ فارسی نظم و نثر میں کمال رکہتے تہے اسلئے ضرور تہا کہ فارسی لٹریچر پر اُنکی توجہ مائل ہو - مگر باوجودیکہ یہ سب لوگ بیدل یا ابوالفضل یا جلالای طباطبا یا اور مشہور نازک خیال نثاروں کی پیروی کرنے والے تہے - لیکن ظاہرا سرسید نے فارسی نثر میں بہی مثل اُردو کے سادگی سے کبہی تجاوز نہیں کیا - اگرچہ اُنکی ابتدائی فارسی تحریرین ایک رسالہ کے سوا جو مسئلہ تصور شیخ کے بیان میں ہے - دستیاب نہیں ہوئین - مگر عذر کے بعد کی جو بعض تحریرین ملی ہیں اُنیں ویسی ہی سادگی اور بے تکلفی پائی جاتی ہے جیسی اُنکی اُردو تحریروں میں دیکہی جاتی ہے - ازانجملہ ایک وہ فارسی لکچر ہے جو اُنہوں نے سائنٹیفک سوسائٹی قایم کرتے وقت کلکتہ کی مجلسِ مذاکرہ علمیہ میں پڑہا تہا اور جو اُنکے لکچروں کے مجموعہ میں چہپ گیا ہے - اسکے سوا اُنکا ایک اور فارسی خط منشی سراج الدین احمد کے مسودات میں ہمکو ملا ہے جو اُنکو حیدر آباد میں دستیاب ہوا تہا اور جو سرسید نے ۱۳ - اگست ۱۸۸۱ع کو حاجی سید محی الدین خاں رضوی کے نام اُنکے خط کے جواب اور بندرہ سو روپیہ چندہ کے شکریہ میں لکہا تہا چونکہ یہ خط کہیں نہیں چہپا ہے اسلئے اُس کے تلف ہو جانے کے خیال سے ہم اُسکو بجنسہ اس مقام پر نقل کرتے ہیں -

"مخدوما و ملاذا! نامہ یافتم و متحیر گشتم - خواندم و برخواندم - بلند پایگی نویسندہ اش راخود آن نامہ نشان می داد - تحیر دران بود کہ مخاطب آن کیست ؟ بغلط خود را دانستم و باز برگشتم کہ انچہ دران نامہ مرقوم است سزاوار ہیچو منے دامن آلودہ، کمترین مخلوقے، ہیچ میرزے، گم کردہ راہے نمیتواند شد، بجز آن کہ اوصاف حمیدہ و اخلاق پسندیدۂ شما شخص خیالی خود را باخود اوصاف خود را مخاطب ساختہ باشد - سخنے دیگر قرار دادن نمی توانم - و اگر باز ین فرد تر آیم و خود را مخاطب آن نامہ انم حاشا کہ بدون اختیار مذہب وحدت وجود این

چنیں توانم دانست، تاکہ من کہ حجابِ خودم از میان برخیزم و تفاوتِ من و تو و تو و من از میان برافتد وہمہ انچہ نوشتہ اید خود شما مصداق آن باشید۔ ولعد درمن قال "تو خود حجابِ خودی احمد از میان برخیـــز"

"راست فرمودہ اند کہ رضویت ذریعۂ یک گوہری ست نہ وسیلۂ یکجہتی" مگر الحمد للہ کہ با ما و شما یک گوہری و یکجہتی ہردو متحقق ست، گو این نسبت ہائے من با شما باعثِ ننگ و عارِ شماست داورا سببِ عزت۔ خداوند کہ محبت پیشہ ام و بجز محبت درکشت سینہ ام نہ کشتہ اند۔ الطاف و عنایت بشمار اشکر گزارم و با این محبت جان نثار۔ مبلغ یکہزار و پانصدر و پیہ سکۂ انگریزی کہ بجہتِ تعمیر بورڈنگ ہوس مرحمت فرمودہ اند رسید۔ قوم را عزت افزودہ، و دلم را تقویت داد، و ساعدِ سعی ما را قوت بخشید۔ سپاس آن ازین قوم نا سپاس دشوار، مگر اجرکم علی اللہ صلۂ آن کافی ست من شکریہ آن عطیہ بجا می آرم، و روزے می آید۔ و آن دور نیست۔ کہ تمام قوم و اخلاف شان نسلاً بعد نسلٍ بہ شکر گزاریِ ہمچو شما بزرگان۔ کہ در صلاح و فلاح قوم از قدم و قلم و درم دریغ نہ فرمودہ اند۔ رطب اللسان و عذب البیان خواہد بود"

"انچہ بر حالِ زارم دل سوختہ اند و حسرت فرمودہ۔ مخدوما احسانِ شما، مگر ہیچ جائے دل سوختن و حسرت نمودن نیست۔

حسن شہرت عشق رسوائی تقاضا میــکند جرم معشوق و گناہِ عاشق بیچــارہ نیست

اگر قوم ما راچشم بصیرت بودے و مآلِ کار خود فہمیدے ما و شما را این کوشش و کشاکش ضرور نہ بودے ہرگاہ حال این ست پس از ان قوم بجز بدگوئی و افترا پردازی و نافہمی واز ما بجز صبر و تسلیم و رضا دیگر چہ توقع بود۔۔۔۔۔۔ الضاف را از دست نمیدہم و با کسے بدظنی روا نمیدارم، دوستانِ دشمن نمائے من بدنیستند، حق بجانب شان ہم ست، چہ آنہا سخنے می شنوند و راہے می بینند کہ گاہے از اسلافِ خود شان نشنیدہ ندیدہ بودند۔ دیرینہ غلطی ہائے ما رفتہ رفتہ استحکامِ آیاتِ قرآنی بہم رسانیدہ بلکہ از ان ہم مستحکم تر گشتہ۔ پس کسی کہ این اغلاط را وانماید چگونہ از غیظ و غضب شان مصئون و از سب و شتم شان مامون تواند شد۔ آنہا از معارضات طلبانِ ملل دیگر۔ کہ بر این غلط ہائے دیرینۂ ما وار و ساختہ آن را بہ اسلام نسبت میدہند۔ واقف نیستند، واز اشکلات کہ باعتبارِ علوم جدیدہ وتحقیقات حدیثہ بر اصول مقررۂ اسلاف ما از فقہا و محدثین و مفسرین واقع میشود و بر اصل اسلام۔ اطلاع ندارند۔ بگوشِ شان و بگوش اسلاف شان بمقابل سخن ہائے خود شان بجز کلمۂ آمنا و صدقنا صدائے دیگر نہ رسیدہ۔ یک گونہ غلغلہ شارے در عہد خلفائے عباسیہ بسببِ تراجم فلسفۂ یونان بہم رسیدہ بود، علمای اسلام بدافعتِ آن برخاستند۔ تعجب این کہ ہم خود معترض بودند و ہم خود مجیب، مخالفے

بمقابل نہ داشتند، خود گفتند و خود شنیدند و دانستند کہ فتح یافتند۔ قبول می کنم کہ فتح یافتند مگر حالا نہ آن مدعیان اند و نہ آن دعوے، نہ آن جام ست نہ آن ساقی، نہ آن بادہ ست نہ آن مینا، خود آن فلسفہ از پا در افتادہ است و آن جام مینا شکستہ، بنائے نو بر اساس نو بنا شدہ۔ پس کسی کہ دعوی اسلام دارد و اسلام را حق میداند و غلط را در آن امکان نمی بیند ارد چگونہ آن غلط ہا را باور کند و اسلام و اسلامیان را رسوا سازد۔ پس این در انکار آن و آنہا در تکفیر این معذور اند، و این امری ست کہ فطرت انسانی انسان را بر آن مجبور مے سازد۔ بہ این رہبر (یعنی دلیل) ما را واجب و لازم ست کہ ہمہ مکفران و لاعنین خود را معذور داریم، و از سب و شتم شان رنجیدہ نہ شویم، و صدق و صفا را پیشۂ خود داریم و ہمہ را معاف کنیم تا از مواخذۂ عقبیٰ و داوری داور بے ہمتا ہم ایمن باشند۔ اما مخالفت و افترا نسبت بہ مدرسۃ العلوم کہ کار صلاح و فلاح قومی ست ۔ عفو آن بہ اختیار من نیست کہ حقوق عباد بر گردن شان ست او شان دانند و خدائے شان ۔ قل کفی باللہ بینی و بینکم شہیدا یعلم ما فی السموت والارض والذین آمنوا بالباطل وکفروا باللہ اولٓئک ہم الخاسرون ۔ والسلام علیکم و رحمۃ و برکاتہٗ،،

العبد المفتقر الی اللہ الصمد

سید احمد

کبھی کبھی وہ اُردو تحریرون میں بھی ایک آدہ فقرہ فارسی کا لکھدیتے تھے جو لطف سے خالی نہ ہوتا تھا۔ سید مہدی علی خاں نے اُنکو ولایت سے خط بھیجا ہے جس میں کسی موقع پر سر سید کی طرف خطاب کرکے یہ مصرع لکھا ہے " آنی کہ بدیدارت خلقی ست تماشائی " اسکے جواب میں سر سید جبکہ ہندوستان میں اُنپر لعن وطعن کی بھرمار ہورہی تھی۔ اُنکو لکھتے ہیں" مصرعۂ اول کہ خطاب بہ من فرمودہ اند اگر بجاے لفظ دیدارت احوالت بودے نہایت مناسب حال من بودے " آنی کہ بہ احوالت خلقی ست تماشائی " اگر غم ست ہمیں قدر ست کہ نے دانم خدائے من تماشاے کدام احوال من مے کند انہ ہو الغفور الرحیم۔

گناہ من از نامدے در شمار ترا نام کے بودے آمرزگار

اے خداے من! اے رحیم و غفور من! اے محبوب و مطلوب من! خلق را بگذار ہر چہ خواہد تماشائے من کنند تو مرا نیک تماشا کن ؎

نمی گویم درین گلشن گل و باغ و بہار از من بہار از یار و گل از یار و باغ از یار و یار از من

آہ چہ گفتم و کجا رفتم خداے من از من جدا نیست، مرا گذاشتن نمی تواند، پس چرا پریشان شوم، چرا اندیشہا کنم

حمد وثنای اوسرایم کہ عین حمد وثنای خود است، منصور انا الحق گفت پایۂ بلند داشت، من صرف الحق گویم او خدا از من بشنود مستجاب کن"

فارسی میں بھی سرسید کی قلم اُسی آزادی سے چلتی تھی جیسے اُردو میں۔ وہ اس بات کی کچھ پروانہ کرتے تھے کہ کوئی لفظ اہل زبان کے محاورہ کے خلاف نہ لکھا جائے لیکن اصل مطلب بہت صفائی اور بے تکلفی سے ادا کر جاتے تھے۔ مثلاً جسطرح اُردو میں اُنے حرف ندا کی جگہہ او کا لفظ خاص خدا کے لئے استعمال کرتے تھے اسیطرح فارسی میں بھی یہی لفظ بول جاتے تھے۔ اُردو میں تو اتنی گنجایش بھی تھی کہ نہایت بے تکلف اور لنگوٹیے یار کو اُو کہکر پکار سکتے ہیں مگر فارسی میں کہیں بھی او کا لفظ اسے کی جگہہ استعمال نہیں کرتے۔ اسی طرح اور بھی بعض الفاظ اُنکی فارسی تحریروں میں محاورہ کے خلاف نظر آتے ہیں مگر معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایک مطلب کو وہ جسطرح اُردو میں بے تکلف ادا کر سکتے تھے اُسی طرح فارسی میں کر سکتے تھے۔

پبلک اسپیکنگ

پبلک سپیکنگ (یعنی مجمع عام میں اسپیچ یا لکچر دینا) یہ بھی منجملہ اُن اوصاف کے ہے جو سرسید اور اُنکے معاصرین میں مابہ الامتیاز تھے مشہور ہے کہ تین چیزیں تین چیزوں کے ساتھ بہت کم جمع ہوئی ہیں، قوت نظری قوت عملی کے ساتھ، ذہن حافظہ کے ساتھ اور تحریر تقریر کے ساتھ۔ یعنی سوچنے والے اکثر کام کرنے والے نہیں ہوتے اسی طرح ذہین آدمی قوی الحفظ کم ہوتے ہیں اور اسی طرح جنکی قلم میں زور ہوتا ہے اُنمیں قوت گویائی نہیں ہوتی مگر یہ عجیب و غریب شخص جیسا سوچنے والا تھا ویسا ہی کام کرنے والا تھا، اور جیسا ذہن والا تھا ویسا ہی حافظہ والا تھا اور جیسا لکھنے والا تھا ویسا ہی بولنے والا تھا۔ وذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء۔

سرسید کی تقریر کی نسبت یہ ریمارک کیا گیا ہے کہ اُنکی کامیابی کا سب سے بڑا ذریعہ اُنکی قوت تقریر تھی۔ اور جہانتک غور کیا جاتا ہے یہ راے بالکل صحیح معلوم ہوتی ہے کیونکہ تحریر کا اثر مدت کے بعد ظاہر ہوتا ہے اور صرف معدود آدمی اُس سے متاثر ہوتے ہیں بخلاف تقریر کے کہ اُسکا اثر آن واحد میں بجلی کی طرح تمام سامعین کے دلوں میں دوڑ جاتا ہے تحریر ہر شخص پر جو اُسکو پڑھتا ہے فرداً فرداً اثر کرتی ہے اور اسلئے وہ اثر ایک سے دوسرے میں سرایت نہیں کرتا، مگر تقریر کا اثر تمام مجلس پر دفعتہً واحدۃً پڑتا ہے اور اسلئے تمام حاضرین ایک ہی طرح کی حالت سے متاثر ہوتے ہیں۔ تحریر میں اثر کرنے والے صرف الفاظ اور معانی ہوتے ہیں اور

تقریر میں اُنکے ساتھ سپیکر کا لب و لہجہ اُسکی طرز ادا، اُسکی آواز کا سوز و گداز اور اسکا اعضاء جوارح کی حرکات بھی شامل ہوتی ہیں اور اسکا تماشہ ہم نے خود اپنی آنکھ سے دیکھا ہے۔

سرسید نے پنجاب کا پہلا سفر ۱۸۷۳ء میں کیا تھا جب کہ تہذیب الاخلاق کو جاری ہوئے پورے تین برس گذر چکے تھے۔ اُسوقت راقم بھی لاہور میں موجود تھا۔ بلا شبہہ جس گرمجوشی کے ساتھ اہل لاہور نے ریلوے اسٹیشن پر سرسید اور اُنکے ہمراہیوں کا استقبال کیا تھا اور جس چاؤ اور امنگ اور فیاضی اور فراخ حوصلگی کے ساتھ اُن معزز مہمانوں کی مدارات کی گئی اور جس شوق سے بیرونجات کے لوگ سید صاحب کی آمد آمد سنکر لاہور میں آئے اس سے معلوم ہوتا تھا کہ فی الواقع تہذیب اخلاق نے سرسید اور اُنکے کام کی عظمت کا نقش عموماً اہل پنجاب کے دلپر بٹھادیا ہے۔ مگر ۲۹- دسمبر کو جو لکچر کہ سرسید صاحب نے راجہ دھیان سنگھ کے دیوانخانہ میں جہان کئی ہزار آدمیوں کا مجمع تھا۔ دیا اُسکا سمان مجھکو ہمیشہ یاد رہیگا۔ سامعین پر ایک سکتہ کا عالم تھا کوئی مسلمان ایسا نہوگا جو زار و قطار نہ روتا ہوا اور جو اپنی بساط سے زیادہ چندہ دینے پر آمادہ نہو۔ اگر میرا قیاس غلط نہو تو میرے نزدیک جو اثر تہذیب الاخلاق نے تین برس میں اہل پنجاب پر کیا تھا اس لکچر نے دو تین گھنٹے میں اُسکو دوچند کر دیا خصوصاً مندرجہ ذیل الفاظ نے تمام حاضرین کی حالت دگرگون کر دی تھی۔ اُنہون نے کہا۔

"اے بزرگان پنجاب! میں فرض کرتا ہون کہ میں بدعقیدہ ہون، مگر میں آپ سے پوچھتا ہون کہ اگر ایک کافر مرتد آپ کی قوم کی بھلائی پر کوشش کرے تو کیا آپ اسکو اپنا قوم کا بدخواہ نہ سمجھیں گے آپ کے دولت سرا بنانے میں۔ جس میں آپ آرام فرماتے ہیں اور آپکے بچے پرورش پاتے ہیں، آپ کے لئے مسجد بنانے میں۔ جس میں آپ خدائے واحد ذوالجلال کا نام پکارتے ہیں۔ چوہڑے، چمار، قلی، کافر، بت پرست، بدعقیدہ سب مزدوری کرتے ہیں مگر آپ نہ کبھی اُس دولت خانہ کے دشمن ہوتے ہیں، اور نہ کبھی اُس مسجد کے منہدم کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں، پس آپ مجھکو بھی اس مدرسۃ العلوم کے قایم کرنے میں ایک قلی چمار کی مانند تصور کیجئے اور میری محنت اور مشقت سے اپنے لئے گھر بننے دیجئے اور اس وجہ سے کہ اُسکا بنانے والا یا اُس میں مزدوری کرنے والا ایک قلی چمار ہے۔ اپنے گھر کو مٹ ڈھایئے کیا آپ صاحب مجھ بدبخت نامہ سیاہ کی شامت اعمال سے اپنی تمام قوم کو اور انکی اولاد کو نسلاً بعد نسلٍ

---

[1] ایک صاحب جو غالباً نارمل اسکول لاہور میں ہیڈ ماسٹر تھے اور سو ڈیڑھ سو سے زیادہ تنخواہ نہیں پاتے تھے اُنہون نے پانسو روپیہ چندہ کی فہرست میں لکھا تھا۔

ڈبونا اور خراب وخستہ حالت میں ڈالنا چاہتے ہیں؟ اگر آپ صاحب میری حالت کو بدتر جانتے ہو اُس سے عبرت پکڑو، اور برائے خدا اپنی قوم کی اپنی اولاد کی بھلائی و بہتری کی فکر کرو"

یہی الفاظ۔ جو اسوقت معمولی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ اُس موقع پر جب سرسید کے مونہہ سے نکلے تھے انہیں کچھ اور ہی جادو بھرا ہوا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تقریر میں لفظوں اور معنون کے سوا کچھ اور چیز بھی ہوتی ہے جو تحریر میں نہیں ہوتی۔

سرسید کے اخیر زمانہ میں کسی لائق یورپین نے اُنکے لکچروں پر ریویو کرتے ہوئے لکھا تھا کہ اگر یہ سچ ہے کہ درخت اپنے پھلوں سے پہچانا جاتا ہے۔ اگر یہ صحیح ہے کہ اچھا وہی ہے جسکا انجام اچھا ہو تو جو کامیابی سرسید کو بذریعۂ اپنی لاثانی فصاحت کے حاصل ہوئی ہے اُس سے اُنکی نیکدلی اور اسلامی حمیت کامل طور پر ثابت ہوتی ہے۔ اُنکے لکچروں نے عجیب غریب اثر کیا ہے اور اُس فصاحت کے بحر ذخار نے انقلاب عظیم پیدا کر دیا ہے۔ اسکا پورا پورا اندازہ کرنے کے لئے تھوڑی دیر کو قوم کی اُس دردناک حالت کا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھینچ لینا کافی ہے جب کہ سرسید کی فصاحت نے ان لکچروں کی صورت میں اپنا مشن شروع کیا۔

کرنل گریہم لکھتے ہیں کہ "وہ (یعنی سید) ایک پیدائشی اوریٹر ہیں۔ جب وہ اپنے خاص مقصد کے متعلق جوش میں بھری ہوئی تقریر کرتے ہیں تو اُنکی طرز تقریر مسٹر گلیڈسٹن سے مشابہ ہوتی ہے۔ اُس جوش کے ضبط کرنے کی کوشش میں اُنکے ہونٹھ کانپنے لگتے ہیں، آواز دردناک ہو جاتی ہے اور چہرہ متغیر ہو جاتا ہے؛ اور یہ تمام درد وغم کی علامتیں اُن کے سامعین پر بجلی کی طرح اثر کرتی ہیں۔

قومی اور ملکی مجمعوں میں سپیچ یا لکچر دینے کا طریقہ قدیم یونان روما اور عرب میں برابر جاری تھا اور زمانۂ حال میں فرانس انگلینڈ اور امریکا میں نہایت ترقی پر ہے۔ لیکن جہانتک دیکھا جاتا ہے ہندوستان میں اُنیسویں صدی سے پہلے کہیں اُسکا سُراغ نہیں پایا جاتا۔ اور اسکی وجہ ظاہر ہے؛ جب تک سلطنت کی طرف سے رعایا کو ہر قسم کے خیالات اور رائیں ظاہر کرنے کی آزادی نہیں ہوتی کسی ملک میں عمدہ اوریٹر یا سپیکر پیدا نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ جب سے برٹش گورنمنٹ نے اس ملک میں آزادی کا سایہ ڈالا ہے یہاں بھی ایسے لوگ پیدا ہونے لگے ہیں جنمیں سے بعض بنگالی لیڈروں نے پبلک سپیکنگ میں بڑی شہرت حاصل کی ہے لیکن جہانتک سنا گیا ہے اُن لوگوں کی تمام اوریٹری اور فصاحت انگریزی زبان میں منحصر ہے

گویا جو سڑک پر کارپٹ اور فاکس وغیرہ تیار کرتے ہیں آنکھیں بند کرکے اُسی سڑک پر پڑ لیتے ہیں' اپنی زبان میں کوئی واضح بیل نہیں ڈالی۔ سید احمد خان پہلا شخص ہے جسنے اپنی ملکی زبان میں پبلک سپیکنگ کی راہ نکالی ہے۔ نہ وہ انگریزی زبان جانتا تھا جسمیں بڑے بڑے اوریٹروں اور فصیحوں کے لکچروں اور اسپیچوں کے نمونے موجود ہیں' اور نہ اُن اصول و قواعد سے واقف تھا جو یورپین زبانوں میں اس فن کی تکمیل کے لیے مقرر کئے گئے ہیں' اور نہ اپنی زبان میں کوئی ایسی مثال دیکھی تھی جس سے اس راہ میں کچھ مدد ملتی۔ جسطرح اوسکے تمام اوصاف فطری اور پیدائشی تھے اسی طرح سپیکنگ کی لیاقت بھی محض خداداد تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپنی اسپیچ یا لکچر کے لکھنے' یا پہلے سے اُسکے لئے تیار ہونے کا بالکل محتاج نہ تھا۔ ہم پہلے حصہ میں۔ جہاں انگلستان کے سفر کا حال بیان کیا گیا ہے۔ لکھ چکے ہیں کہ سمٹونین سوسائٹی آف سول انجینیرس کے سالانہ جلسہ میں۔ جہاں انگلستان کے متعدد ڈیوک اور لارڈ اور بڑے بڑے نامور انجینیر موجود تھے اور جسکا موضوع انجینیرنگ کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ وہاں جب انجینیروں کی تقریریں ہو چکیں تو سر سید نے ایک ایسے فن کے متعلق جس سے وہ محض ناآشنا تھے ایسی برجستہ تقریر کی کہ تمام اہل جلسہ اُسکی داد دیتے دیتے تھک گئے اور اس تقریر کرنے کا خیال اُنکو اُسی وقت پیدا ہوا جب جلسہ کے اختتام پر پریسیڈنٹ نے اُنکے آنے کا شکریہ اور خوشی ظاہر کی اور اُسکا جواب دینا ضرور

جو لکچر کہ سرسید نے ۱۸۸۴ء میں بمقام لاہور اسلام پر دیا تھا وہ سب سے بڑے شہادت اُنکے پیدائشی اوریٹر ہونے کی ہے۔ لاہور کے تعلیم یافتہ مسلمانون نے سرسید کی منظوری بغیر پروگرام میں لکچر دینے کی تاریخ چھپوا دی تھی اور سرسید چند وجوہ سے جنکا ذکر سفرنامۂ پنجاب میں تفصیل کے ساتھ کیا گیا ہے مذہب پر لکچر دینا ہرگز نہیں چاہتے تھے مگر لوگوں کے اصرار سے اُنکو مجبور ماننا پڑا۔ لیکن نہ اُنکو زیادہ غور کرنے کی مہلت ملی اور نہ کچھ لکھنے کی نوبت آئی کیونکہ ملاقاتیوں کا صبح سے رات کے دس گیارہ بجے تک برابر تانتا بندھا رہتا تھا۔ باوجود اسکے جب اُس طول طویل لکچر کو دیکھا جاتا ہے تو تعجب ہوتا ہے کہ کس طرح بغیر قلمبند کئے ایسی عمدگی اور حسن ترتیب کے ساتھ ایسے پیچ در پیچ اور نازک مطالب کو یوں سُلجھا کر بیان کیا ہوگا؟ کیونکہ وہ کوئی معمولی وعظ نہ تھا بلکہ اُن تمام شبہات کا جواب دینا تھا جو سرسید کے مذہبی خیالات کی نسبت لوگوں کے دلوں میں جاگزین تھے' یا اُن دلائل کا بیان کرنا تھا جنسے تعلیم یافتہ مسلمانون کو اسلام کی سچائی کا یقین ہو' یا اُن

ضرورتوں کا ذکر کرنا تھا جنہوں نے سرسید کو تفسیر قرآن لکھنے پر مجبور کیا۔ اور ان سب باتوں کے بیان کے لئے بہت کچھ غور و فکر اور مہلت درکار تھی۔ سفرنامۂ پنجاب کے مؤلف سید اقبال علی لکھتے ہیں کہ "مجھکو سید صاحب سے اکثر ملنے اور بات چیت سننے کا اتفاق ہوا ہے۔ میں نے اسقدر موثر کلام اُنکا ہی اس سے پہلے کبھی نہیں سنا تھا"

یہ تو اُس لکچر کا حال ہے جو مذہب پر دیا گیا تھا۔ اس سے بھی زیادہ عجیب وہ پولٹکل لکچر تھا جو نیشنل کانگریس کے خلاف انہوں نے لکھنؤ میں دیا تھا۔ ہم نے سنا ہے کہ اُسکا خیال اُنکو چند گھنٹے پہلے ہوا تھا باوجود اسکے وہ ایسا جامع زوردار مدلل اور پرزور تھا کہ اُسکے بعد ہزاروں تحریریں اور تقریریں اس باب میں اُسکے موافق اور مخالف ہوئیں مگر اُس آگے سب ہیچ تھیں

افسوس ہے کہ سرسید کی بہت سی اسپیچیں اس سبب سے کہ اردو زبان کے لئے شارٹ ہینڈ رائٹنگ (یعنی مختصر نویسی) کا کوئی قاعدہ مقرر نہیں ہوا تلف ہوگئیں؛ ورنہ جسقدر اُنکی اسپیچیں اخباروں میں چھپی ہوئی موجود ہیں اسی قدر بلکہ شاید اُنسے کچھ زیادہ ایسی ہونگی جو قلمبند نہیں ہوئیں بارہا لوگوں نے اُنسے چاہا کہ آپ اپنی اسپیچ پہلے لکھوالیا کریں اور جلسہ میں اُسی کو پڑھ دیا کریں مگر خاص خاص حالتوں کے سوا اُنہوں نے کبھی ایسا نہیں کیا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ لکھی ہوئی اسپیچ کا جلسہ میں پڑھنا مجھے وبال معلوم ہوتا ہے طبیعت کی آمد رک جاتی ہے اور جوش اور ولولہ بالکل باقی نہیں رہتا۔ سفرنامۂ پنجاب میں اُنکی جسقدر اسپیچیں اور لکچر چھپے ہوئے ہیں اُن میں ایک ہی غالباً ایسا نہیں جو اُنہوں نے لکھکر پڑھا ہو؛ سب برجستہ اور برمحل زبانی تقریریں کی گئی تھیں جو سید اقبال علی کی حیرت انگیز زود نویسی کے سبب قلمبند ہوگئیں ورنہ یہ بھی سب تلف ہو جاتیں۔

سرسید کی سب سے زیادہ زوردار اور موثر وہ اسپیچیں ہوتی تھیں جو کسی پبلک جلسہ میں اپنی رائے کے خلاف بہت سی تقریریں سنکر نہایت جوش کی حالت میں بے ساختہ اونکے مونہ سے نکلتی تھیں۔ خصوصاً تعلیمی معاملات میں جب اُنکی رائے یا پالسی کے خلاف کسی جلسہ میں تقریریں ہوتی تھیں۔ خواہ وہ ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس ہو یا ایجوکیشن کمیشن کا یا سنٹ کی مجلس ہو یا سنڈیکیٹ کا جلسہ ہو۔ اُسوقت عنانِ صبر اُنکے ہاتھ میں نہیں رہتی تھی؛ اُنکی آواز سے تمام ہال گونج اُٹھتا تھا اور فریق مخالف اُنکے رعب میں دب جاتا تھا۔ مگر باوجود اسقدر جوش و خروش

کے اُنکی تقریر کبھی تہذیب و شایستگی کی حد سے تجاوز نہ کرتی تھی بے شک اپنے قومی جلسون میں وہ اکثر مسلمانون کو نفرین و ملامت کرتے تھے مگر اُسمین دلسوزی اور ہمدردی کا پہلو اسقدر غالب ہوتا تھا کہ نفرین و ملامت کسی کو ناگوار نہ ہوتی تھی۔

وہ فرمایشی لکچر دینا اور فرمایشی اسپیچ کرنی بالکل نہیں جانتے تھے اور وقت کی راگنی کے سوا کوئی راگنی نہ گا سکتے تھے۔ کبھی کبھی جو بعض اشخاص اُنکو کسی ایسی تقریر کرنے پر جسکا اونکی طبیعت میں کچھ جوش نہ ہو۔ مجبور کرتے تھے اور سرسید کو اُنکی خاطر بھی عزیز ہوتی تھی تو وہ باول ناخواستہ صرف اُنکی ہٹ پوری کرنے کے لئے کھڑے ہوجاتے تھے مگر جو تقریر وہ کرتے تھے اُسمیں کچھ جان نہ ہوتی تھی۔

سرسید کی طبیعت کا جوشیلا پن جیسا اُنکی اسپیچون سے ثابت ہوتا ہے ایسا اور کسی چیز سے نہیں ہوتا۔ اسپیچ کرتے وقت جہان کہین ایسا موقع آپڑتا تھا اُن سے طبیعت کا اُبال ضبط نہو سکتا تھا۔ لاہور میں جو سب سے آخری وفد اُنکا جانا ہوا اور وہان کسی موقع پر تقریر کرتے وقت انکو جوش آیا اُسوقت انکی حالت ایسی متغیر ہوگئی کہ وہ فوراً خاموش ہوکر بیٹھہ گئے اور دو دن روز کھانے کی طرف مطلق رغبت نہیں ہوئی۔ ہم نے سنا ہے کہ ڈاکٹر نے اُنکی یہ حالت دیکھکر سخت ممانعت کردی تھی کہ آپ پبلک جلسون میں اب تقریر کرنی بالکل چھوڑ دیں ورنہ جان کا اندیشہ ہے۔ چنانچہ اُسکے بعد اُنھون نے چند مختصر تقریرون کے سوا کہین کوئی لمبی اسپیچ نہیں دی۔

سرسید میں وہ تمام اوصاف جمع تھے جو ایک اورٹیر میں ہونے ضروری ہیں۔ انکا حافظہ فطرۃً نہایت قوی تھا۔ گو آخر عمر میں بسبب کبرسن کے نسیان پیدا ہوگیا تھا مگر بچپن اور جوانی اور کہولت کے زمانہ کے واقعات اور معلومات سب ازبر تھے اور اسلئے اُنکی جنرل انفورمیشن نہایت وسیع تھی، اور چونکہ واقعات سے نتائج استخراج کرنے کا اعلیٰ درجہ کا مادہ خدا نے دیا تھا اسلئے اُس معلومات میں اور بھی زیادہ وسعت پیدا ہوگئی تھی۔ ہر ایک معاملہ کی نسبت۔ جو کہ اُنکو پیش آتا تھا خواہ مذہب سے متعلق ہو، خواہ رسم و رواج اور معاشرت اور اخلاق سے، خواہ پالٹکس سے اور خواہ تعلیم سے۔ وہ ایک مستقل اور غیر مذبذب رائے اپنے ذہن میں رکھتے تھے اور اسلئے کسی معاملہ پر اُنکو زیادہ غور کرنے کی بہت ہی کم ضرورت ہوتی تھی اور اگر کبھی ایسی ضرورت ہوتی تھی تو ذہن بہت جلد نتیجہ تک پہنچ جاتا تھا۔ تصور کی قوت کا یہ حال تھا کہ تقریر کرتے وقت تمام پوائنٹس جو اُنکو اپنی اسپیچ میں بیان کرنے منظور ہوتے تھے گویا سب مسلسل اور ترتیب وار اُنکے ذہن میں

موجود ہوتے تھے اسی لئے ہمنے نہیں دیکھا کہ جسطرح عام سپیکر ایک پرچہ پر کچھ نوٹس قلمبند کر لیتے ہیں اور تقریر کے وقت ہر ایک پوائنٹ پر اسی ترتیب سے گفتگو کرتے ہیں۔ سرسید نے کبھی ایسا کیا ہو۔ اُن کو بہ نسبت ایک کاغذ کے پرچہ کے اپنی ذہنی ترتیب پر زیادہ بھروسا ہوتا تھا۔ اس کے سوا چہرہ کی بناوٹ۔ جو کہ وجاہت اور ہیبت و وقار کی بولتی تصویر تھی۔ اور آواز کی گونج۔ جس میں جوش کے وقت شیر کی سی گرج محسوس ہوتی تھی۔ یہ دو بڑے معاون اُن کے بیان کی تاثیر کے تھے۔ پھر زبان پر پوری قدرت اور ہر مطلب کے دلنشین کرنے کا خداداد سلیقہ اور عین وقت پر مناسب الفاظ کا سوجھ جانا اُنکی خصوصیات میں سے تھا۔ مگر سب سے بڑی چیز جو اُنکو دیگر سپیکروں سے علاحدہ ممتاز ٹھیراتی ہے وہ قومی ہمدردی کا سچا جوش اور ولولہ تھا جسکے سبب جو بات منہ سے نکلتی تھی وہ دل ہی سے اُٹھتی تھی اور دل ہی میں جاکر بیٹھتی تھی۔

سرسید کی سحر بیانی غالباً اُن لکچروں اور اسپیچوں سے زیادہ ثابت ہوتی ہے جو اُنھوں نے مدرسہ کے قیام کی ابتدائی کوششوں کے وقت مختلف مقامات میں دی ہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ لوگ قوم اور قومیت کے اصلی مفہوم سے عموماً ناواقف تھے اور قومی کاموں میں مدد دینا جب کہ اُس سے ثواب آخرت کی توقع نہو۔ محض فضول جانتے تھے اور اسلئے انگریزی تعلیم میں جسکو وہ خلاف مذہب سمجھتے تھے۔ مدد ملنے کی اُنسے ہرگز توقع نہ تھی۔ اُنکو اس بات کا یقین دلانا قریب ناممکن کے تھا کہ قوم کی مدد کرنا بعینہٖ اپنی اور اپنے خاندان کی مدد کرنا ہے۔ وہ اس بات سے محض بے خبر تھے کہ انگریزی تعلیم کو قومی ترقی میں کیا دخل ہے اور سرکاری نوکری کے سوا اُس سے تجارت وصنعت اور تمدن اور معاشرت میں کیا مدد ملتی ہے۔ اُنکو اس بات کا سمجھانا نہایت مشکل تھا کہ دین کا اعزاز اور دین کی ترقی بغیر دنیوی ترقی کے ناممکن ہے۔ دولتمند اس بات کے سمجھنے سے قاصر تھے کہ ہمکو اپنی اولاد کی تعلیم کی کیا ضرورت ہے اور متوسط اور ادنیٰ درجہ کے لوگ سرکاری مدارس کو اُنکی تعلیم کے لئے کافی سمجھتے تھے۔ تعلیم کے ساتھ تربیت کی ضرورت تو عام ذہنوں سے اسقدر بعید تھی کہ ابتک بھی مستثنےٰ شخصوں کے سوا لوگ اُسکو اچھی طرح نہیں سمجھے۔ گورنمنٹ کالجوں اور اسکولوں کو چھوڑ کر خاص قوم کے روپئے سے کالج قایم کرنے کی ضرورت اور مصلحت سے سب بے خبر تھے۔

یہ ادراسی قسم کے اور بہت سے خیالات اُس ابتدائی حالت میں عام مسلمانوں کے ذہن سے محض اجنبی اور ناآشنا تھے جنکا لوگوں کے ذہن نشین کرنا خاصکر اُس شخص کے جسکی طرف سے قوم میں عموماً بدگمانی پھیلی ہوئی ہو حد سے زیادہ دشوار تھا۔ جن باتوں کے سمجھانیکے لئے آج کل کی اسپیچوں میں صرف اجمالی اشارے کافی ہوتے ہیں اُسوقت اُنکی الف بے تے سے شروع کرنے اور اصل مقصد سے پہلے لمبی لمبی تمہیدیں اُٹھانے کی ضرورت تھی باوجود اسکے سرسید نے جس صفائی سے ان تمام خیالات کو اپنی ابتدائی اسپیچوں میں بیان کیا ہے اُسکو دیکھکر تعجب ہوتا ہے۔ یہ باتیں لوگوں کے ذہن سے اسقدر بعید تھیں اُنکو ایسی خوبی کو سمجھایا ہے کہ کوئی بات اجنبی نہیں معلوم ہوتی بلکہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا بھولی ہوی باتوں کو ایک شخص یاد دلا رہا ہے اور جو نقش دھندلے ہو گئے تھے اُنکو اجال رہا ہے۔ اُن اسپیچوں پر بالکل اس شعر کا مضمون صادق آتا ہے ؎

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا ۔۔۔ میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

پٹنی ریڈنگ کے جلسہ میں اُسنے اس بات کے سمجھانے کو کہ دولتمندوں کی اولاد کو تعلیم کی کیا ضرورت ہے رئیسوں کی مخاطب ہو کر کہا "اے رئیسو اور اے دولتمندو! تم اپنی دولت وحشمت پہ مغرور ہو کر یہ مت سمجھو کہ گو قوم کی بُری حالت ہو مگر ہمارے بچوں کے لئے سب کچھ ہے! یہی ان لوگوں کا خیال تھا جو اس سے پہلے تھے مگر اب انہیں کے بچوں کی وہ نوبت ہے جسکے لئے ہم آج اس اسٹیج پر کھڑے ہیں۔"

ایک دوسری اسپیچ میں اس مطلب کو اسطرح بیان کیا ہے "نواب جلیل اللہ خاں شاہجہانی کا نام آپ لوگوں نے سنا ہوگا، اُنکے پروتے کو میں نے اپنی آنکھ سے دیکھا کہ لوگوں کے پانو دابتے آتا تھا اور دو چار پیسے لیجاتا تھا۔ تغلق آباد کے گانوں میں جسقدر مسلمان گھیارے آباد ہیں جو سارے دن گھاس کھود کر شام کو بیچتے ہیں۔ میں نے خوب تحقیق کیا ہے کہ سلطان محمد عادل تغلق شاہ کی اولادیں ہیں + + + + دنیا میں گذرے ہوے زمانہ کے واقعات سے ہمکو عبرت اور نصیحت پکڑنی چاہئے + + + دیکھو ہوشیار رہو، یہی حال ہماری قوم کا ہونے والا ہے، کوئی آثار بھلائی اور بہتری کے اُنمیں نہیں دکھائی دیتے بلکہ برخلاف اسکے تنزل اور ادبار کی علامتیں موجود ہیں"

ایک اور موقع پر رئیسوں کو بورڈنگ ہوس میں اولاد کے رکھنے کی ضرورت اسطرح سمجھائی ہے "اے صاحبو! تعلیم وتربیت کی مثال کمہار کے آوے کی سی ہے کہ جب تک تمام کچے برتن بہ ترتیب ایک جگہ

نہیں چھنے جاتے اور ایک قاعدہ واں کمہار کے ہاتھ سے نہیں پکائے جاتے وہ کبھی نہیں پکتے۔ پھر اگر تم یہ چاہو کہ ایک، ہانڈی کو آوے میں رکھکر پکا لو وہ ہرگز درستی سے نہیں پک سکتی۔ تم خیال کرو کہ جناب ملکہ معظمہ وکٹوریہ کو کسقدر دولت، وحشمت اور سلطنت اور اختیار حاصل ہے، انکے بعد اسمعیل پاشا خدیو مصر کو دیکھو کہ کیا کچھ دولت وحکومت انکو حاصل ہے، یہ لوگ بھی اپنی اولاد کی پوری تعلیم اپنے گھر پر نہیں کر سکتے۔ آپ نے سنا ہوگا کہ حضور پرنس اوف ویلز فرزند ارجمند ملکہ معظمہ اور ولیعہد ہندوانگلنڈ یونیورسٹی آکسفورڈ کے ایک طالب علم ہیں اور جس زمانہ میں کہ میں لندن میں تھا میں نے اپنی آنکھ سے حسن پاشا خدیو مصر کے فرزند کو دیکھا کہ یونیورسٹی اکسفورڈ میں تعلیم پاتے تھے۔ لباس شاہی اور تاج خسروی سے یہ والا قدر شاہزادے طالب علمی کے لباس کو اور جو کونیا سلیٹ ٹوپی کو جو اس یونیورسٹی میں طالب علموں کے لئے مقرر ہے زیادہ معزز سمجھتے تھے۔

ایک دوسرے موقع پر تعلیم کے اخراجات کی ضرورت اسطرح جتائی ہے "آہ کیا افسوس کی بات ہے کہ تم اپنے عزیز بیٹے کی بسم اللہ میں ہزاروں روپیہ خرچ کر دیتے ہو اس خوشی میں کہ ہمارا بیٹا پڑھنا شروع کرنے کے لائق ہوا، مگر اس جگہہ کے بنانے اور قایم کرنے کی کچھہ فکر نہیں کرتے جہاں وہ پڑھے اور تمہاری اس خوشی کو۔ جو قبل از وقوع تمنے اُس کو فرض کر لیا ہے، پورا کرے۔ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ بغیر بوئے ہم کھیتی کے کاٹنے کی توقع کرتے ہیں اور جس غلطی میں پڑے ہیں اُسکی درستی کی کچھہ فکر نہیں کرتے"

ایک موقع پر قومی امداد کی طرف لوگوں کو متوجہ کرنے کے لئے یہ تمثیل بیان کی ہے۔

"انسان کے اعضا میں تکرار ہوئی ہر ایک عضو نے خود غرضی اختیار کی۔ تھوڑی دیر کے بعد معدہ بھوک کے مارے بے چین ہوا! پانوں نے کہا کہ میں کیوں چلکر غذا بہم پہنچاوں؟ ہاتھوں نے کہا کہ ہم کیوں غذا کو مونہ تک پہنچاویں؟ آنکھوں نے کہا کہ ہم اُس میں کے بال کبھی کیوں دیکھیں؟ ناک نے کہا کہ غذا کا سڑا اُبسا ندا ہونا میں کیوں سونگھوں؟ مونہ نے کہا کہ میں کیوں چبا کر حلق میں نگلوں؟ سب آپ آپ کو لیکر چپکے ہو رہے۔ دو ایک دن تو جوں توں گذر گئے؛ پھر تو پانو لڑکھڑانے لگے، ہاتھ کانپنے لگے، مونہ ہلانے کی طاقت نہ رہی، آنکھوں میں اندھیرا آنے لگا۔ تب تو سب گھبرائے کہ یہ کیا ہوا؟ اسوقت عقل کے پاس گئے اُسنے کہا کہ خود غرضی نے تمہارا یہ حال کیا ہے، تمنے جانا کہ دوسرے کے کام سے ہمکو کیا مطلب ہے؟ حالانکہ وہ حقیقت میں تمہارا ہی کام تھا اور اوس کا نقصان تمہارا ہی نقصان تھا۔ اسی طرح سمجھو کہ اگر ہر ایک ضلع کے مسلمان یہ خیال کریں کہ دوسرے ضلع کے کالج میں مدد کرنے سے ہمکو کیا فائدہ ہے تو نہایت بڑی غلطی اور حقیقت میں اپنا ہی نقصان ہے"

ایک اور جگہہ گورنمنٹ مدراس نے جو تحقیقات وہان کے مسلمانون کی تعلیم کے متعلق کی تہی اُسکا ذکر کرتے وقت اُنہون نے کہا کہ "اُس چہٹی میں ترچناپلی کے مسلمانون کا یہ حال مندرج ہے کہ "خاص مانع ترقی تعلیم مسلمانانِ ترچناپلی اُنکا افلاس ہے جسمیں بہت سی مسلمان مبتلا ہیں گو وہ مفلس ہیں مگر مغرور رہیں جب میں نے (یعنی صاحب چہٹی نے) مسلمانون کے لڑکون کو بلا فیس اسکول میں داخل کرنا چاہا تو معلوم ہوا کہ کپڑے اُنکے پاس نہیں ہیں" اور بغیر کپڑا پہنے وہ نہیں آسکتے غریب سے غریب مسلمان ہرگز اپنے لڑکون کو ویسے آدہے ننگے پن کی حالت میں باہر نہ آنے دیگا جیسے کہ بڑے دولتمند ہندو اپنے لڑکون کو مدرسون میں بہیج دیتے ہیں"

"اے عزیزو! اب اس سے زیادہ کونسی بدبختی اور بدنصیبی ہے جسکے مسلمانون پر آنے کی تم راہ دیکھتے ہو؟ + + + اگرچہ ہم اپنے ان غریب محتاج بہائیون کی غیرت پر فخر کرتے ہیں اور وہ جو اپنی عزت اور شرم کا لحاظ کرتے ہیں حد سے زیادہ اُسکی تعریف کرتے ہیں اور یقین کرتے ہیں کہ وہ پاک خون - جو مسلمانون کی نسل میں ابراہیم خلیل اللہ سے چلا آتا ہے - انہیں بہی ہے' مگر اُنکی مصیبت پر دل لرز جاتا ہے' اور سبکو اپنی زندگی تلخ معلوم ہوتی ہے' اور تمام عیش و آرام خاک میں ملجاتا ہے - اور کون تم میں سے ایسا ہے کہ ایسی دردناک حالت اپنی قوم کی سنے اور اُسکا دل نہ بہر آوے؟ اے بہائیو! ان تمام واقعات سے میں اُن لوگون کو - جو اپنی اولاد کی اور اپنی قوم کی تربیت کی کچہہ پروا نہیں کرتے - خبردار کئے دیتا ہون کہ دیکہو کیا ہوا!! اور سمجہو کہ آیندہ کیا ہوگا!!

اسیطرح سرسید نے اپنی ابتدائی اسپیچون میں طرح طرح سے قومی تعلیم کی طرف لوگون کو متوجہ کیا ہے' کہیں یورپ کی تمام ترقیات کی جڑ تعلیم کو قرار دیکر اُسکی ترغیب دی ہے' کہیں تمام ہندوستانیون کو متفق ہوکر خود اپنی تعلیم کا بوجہہ اُٹہانے کی تاکید کی ہے' کہیں ہندوستان کے امرا کی فیاضی کا یورپ کے دولتمندون کی فیاضی سے مقابلہ کرکے اُنکی حقیقی فیاضی کے مفہوم سے خبردار کیا ہے' کہیں ہندون اور مسلمانون کے اسلاف کی علمی ترقیات کا ذکر کرکے اُن کو غیرت دلائی ہے اور جہل و بے علمی کی حالت میں سلف کے علم و فضل پر فخر کرنے کی مذمت کی ہے' کہیں علوم قدیمہ کا علوم جدیدہ سے مقابلہ کرکے علوم جدیدہ کی ضرورت ثابت کی ہے' غرض کہ جو کچہہ زمانۂ حال کے سپیکر تعلیم کے متعلق عام مجمعون میں بیان کرتے ہیں اُس میں شاید ہی کوئی بات ایسی ہوگی جسکی بنیاد سرسید نے اپنے مشن کے آغاز کی اسپیچون میں نہ ڈالی ہو' اور گوکہ اب وہ عام اسپیچون میں معمولی باتیں معلوم ہوتی ہون مگر سرسید کی ابتدائی اسپیچون میں

وہ عام ہندوستانیوں کے لئے بالکل نئی تہیں اور ایسی اہم اور ضروری تہیں کہ آجتک تمام سپیکر اُسی بنیاد پر عمارت چنتے چلے جاتے ہیں۔

شکل و شمائل، اوضاع و عادات، اخلاق و خصائل اور مذہب

شکل و شمائل

سرسید کے چہرہ کی بناوٹ اور بدن کی ترکیب اور تمام ہیئات مجموعی ایسی واقع ہوئی تہی کہ صرف اُنکی صورت دیکہنے سے باطنی عظمت کا خیال پیدا ہوتا تہا۔ جسنے کبہی اُن کو نہ دیکہا ہو وہ بہی بغیر کسی قسم کے تعارف کے جب پہلے ہی بار انکو دیکہتا ہوگا تو ضرور ایک گریٹ مین تصور کرتا ہوگا۔ یہ بات مشہور ہے کہ خودداری اور تمکنت اور کسی چیز کو دیکہکر تعجب ظاہر نہ کرنا اور اپنے تئیں لئے دئے رہنا انگریزوں کی قومی خصلت ہے؛ مگر ایک دوست کا بیان ہی کہ سرسید جب نینی تال گئے ہیں تو میں بہی وہاں موجود تہا، جسوقت انکا جہبان ہوٹل میں پہنچا اکثر مسافر انگریز جو ہوٹل میں ٹہیرے ہوئے تہے۔ اپنے اپنے کمرہ سے اُنکے دیکہنے کو باہر نکل آئے اور جب تک سرسید اپنے کمرے کے اندر نہیں گئے نہایت تعجب سے انکو برابر دیکہتے رہے۔

کرنل گریہم نے اُنکے چہرہ کو شیر ببر سے مشابہ لکہا ہے۔ اس تشبیہ کو عموماً پسند اور تسلیم کیا گیا ہے۔ بمبئی گزٹ میں کرنل گریہم کی کتاب پر۔ جسکے اول میں سرسید کی تصویر چہاپی گئی ہے۔ ریویو کرتے وقت یہ لکہا تہا کہ "کتاب شروع کرنے سے پہلے ہم سید احمد کی طرف ایک لطف انگیز دل کی کشش پاتے ہیں؛ تصویر کیا ہے؟ گویا ایک شیر کیسی پر رعب و باہیبت صورت کا بہادر اور دلیر ہمارے سامنے کہڑا ہے، ہم حیران ہو کر سوچتے ہیں کہ اُس قدیم جنگجوئی کے زمانہ میں اس شخص کا پیشہ کیا ہوتا جب کہ مسلمانوں کی بہادری نے منجملہ انسانی ضروریات کے قوم کی تعلیم کی ضرورت کا خیال اُنکے دل میں پیدا نہیں ہونے دیا تہا" ہم کہتے ہیں کہ اُسکا جب بہی یہی پیشہ ہوتا جو اب تہا، وہی بہادری اور اولوالعزمی جو اگلے زمانہ میں ملکوں کو فتح کراتی تہی یا لوٹ مار سکہاتی تہی وہی اب دلوں کو فتح کراتی ہے اور جہل و تعصب کو تاخت و تاراج کرتی ہے۔

سرسید کو جو صریح فوقیت اور امتیاز بہ اعتبار جسمانی اور دماغی قابلیت کے اپنے عام ہمجنسوں میں تہا یہ ایک عمدہ شہادت اس بات کی ہے کہ جو پیوند یا ازدواج دو اجنبی خاندانوں میں متحقق ہوتا ہے اُس سے غیر معمولی نتائج پیدا ہوتے ہیں؛ سرسید کے پردادا ہرات کے سادات میں سے

تھے جو شاہجہاں یا عالمگیر کے عہد میں ہندوستان میں آئے تھے اور اُنکی ننہال کے لوگ کشمیر سے بعنوان تجارت سلطنت مغلیہ کے اخیر زمانہ میں اس ملک میں وارد ہوئے؛ پس دونوں خاندانوں میں اوپر سے کوئی قرابت یا رشتہ نہ تھا، صرف دوستی اور ملاقات کے سبب جو سرسید کے دادا اور نانا میں تھی - اُنکے والدین کا ازدواج وقوع میں آیا تھا - اب خواہ اسکو حسنِ اتفاق سمجھو اور خواہ نواب دبیر الدولہ کی دانشمندی کا نتیجہ قرار دو کہ انہوں نے اپنی بیٹی کے لئے ایسا بر انتخاب کیا جسکے صلب سے ایسا عجیب و غریب شخص پیدا ہوا -

حلیہ سرسید کا حلیہ یہ تھا، رنگ سرخ و سفید، پیشانی بلند، سر بڑا اور موزوں، بھوین جدا جدا آنکھیں روشن نہ چھوٹی نہ بہت بڑی، ناک نسبتًہ چہرہ کی شان کے مقابلہ میں کسیقدر چھوٹی، کان ملبے، گلے میں دائیں جانب رسولی[1] جو ہمیشہ ڈاڑھی میں چھپی رہتی تھی - چہرہ کی ہئیات مجموعی باوجود عبوس اور پُر رعب ہونے کے دلکش، جسم بہت فربہ، قد لمبا مگر جسم کی فربہی کے سبب میانہ، ہڈی چکلی، ہاتھہ پاؤں اور تمام اعضا نہایت قوی اور زبردست اور متناسب بدن ٹھوس، وزن ساڑھے تین من، عنفوان شباب میں رسولی نہ تھی اور بدن بھی زیادہ فربہ نہ تھا مگر ہاپے کی وجاہت دلالت کرتی تھی کہ جوانی میں بہت خوبصورت ہونگے -

اگرچہ سرسید کا چہرہ خاموشی اور فکر کے وقت نہایت عبوس اور ڈرا تا معلوم ہوتا تھا مگر بقول کرنل گریہم کے گفتگو کے وقت اُس سے مسرت اور زندہ دلی اور گرمجوشی ٹپکتی تھی - جسطرح اخلاق میں مطلق تصنع نہ تھا اسی طرح بات چیت میں بالکل بناوٹ نہ تھی - زبان دلّی کی تھی مگر لب و لہجہ دلّی کا سا نہیں معلوم ہوتا تھا؛ محض سیدھے سادے طور پر عام فہم بول چال میں وہ ہر قسم کی باتیں کرتے تھے - زبان قینچی کی طرح جلدی نہیں چلتی تھی اور نہ زیادہ محاورہ یا لغت زبان پر آتے تھے -

جب کسی نئے آدمی سے پہلی ملاقات ہوتی تھی تو وہ اور لوگوں کی طرح بات چیت کرنے کی تقریبیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر نہیں نکالتے تھے؛ اگر دوسرا کوئی بات پوچھتا تو جواب دیدیتے ورنہ خاموش بیٹھے رہتے - بعض اوقات اس برتاؤ سے ناواقف آدمی اُنکو مغرور سمجھتے تھے مگر وہ کسی کی بدگمانی کے خیال سے اپنا نیچر نہیں بدلتے تھے -

---

[1] سرسید کے والد کے گلے میں بھی رسولی تھی جسکی نسبت اُنکا بیان تھا کہ حضرت شاہ غلام علی صاحب کی ہمت اور توجہ سے بالکل اچھی ہو گئی تھی ۱۲

اوضاع و عادات

ولایت جانے سے پہلے اُنکا لباس ہندوستانی وضع کا رہا مگر جب ولایت کا ارادہ کیا تو مسٹر ہٹن نے - جو اُنکے دوست تھے - انگلستان سے اُنکو لکھا کہ یہاں آؤ تو ترکی لباس پہنکر آنا، اگر یہاں ہندوستانی لباس میں آئے تو یہاں کے لوگ تماشہ بنا لینگے۔ بہ ظاہر اُنہوں نے اسی وجہ سے ترکی لباس اختیار کیا تھا مگر درحقیقت - جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں - یہ تبدیل لباس کا ایک بہانہ تھا؛ وہ پہلے ہی ہندوستان کے مسلمانوں میں ایک قومی لباس کی بنیاد ڈالنے کا ارادہ کر چکے تھے اور اس مقصد کے لئے انہوں نے ترکی لباس سے بہتر کسی لباس کو نہیں سمجھا تھا۔

یورپین طریقہ پر بود و باش رکھنا، کوٹھی بنگلوں میں آبادی سے الگ رہنا، میز کرسی لگا کر کھانا کھانا اُنھوں نے ولایت جانے سے پہلے ہی اختیار کر لیا تھا۔ قطع نظر اِسکے - کہ یہ طریقہ انگریزوں کے میل جول کا ایک ذریعہ تھا۔ بڑا فائدہ اُس سے یہ تھا کہ وہ ہندوستانی سوسائٹی میں رہکر کوئی بڑا کام ہرگز انجام نہ کر سکتے تھے۔

دنیا کا عام قاعدہ ہے کہ انسان جس سوسائٹی میں ہوش سنبھالتا ہے - اُسکی رسموں اور طریقوں سے ایسا مانوس ہو جاتا ہے کہ اُنمیں اصلاح کی ضرورت اُسکو کبھی محسوس نہیں ہوتی اور اگر بعض کو محسوس ہوتی ہے تو یہ جراَت نہیں ہوتی کہ اُنکو چھوڑ دیں یا اُنمیں کچھ تبدیلی کر سکیں مگر سرسید کی طبیعت اِس قاعدہ سے مستثنٰی تھی اور ایسی ہی طبیعت والوں کی بدولت انسان وحشی چوپایوں کی حالت سے اس درجہ تک پہنچا ہے - غدر کے بعد جب سے کہ انکا میل جول انگریزوں کے ساتھ زیادہ ہوا وہ اپنے ہاں کے طریق خورد نوش کو ناپسند کرنے لگے اور اُسکو بتدریج بدلنا شروع کیا، چنانچہ اول اول وہ عرب کے طریقہ کے موافق فرش پر بیٹھکر اور ایک چوکی پر جو زمین سے چند انچ اونچی ہوتی ہے - کھانا رکھکر کھاتے تھے مگر ولایت سے واپس آنیکے بعد وہ میز کرسی پر کھانے لگے۔

مہمانداری

دوستوں اور مہمانوں سے اُنکا دسترخوان بہت کم خالی ہوتا تھا - جس دن کوئی مہمان نہ ہوتا وہ کھانا کھاتے وقت بشاش نہیں معلوم ہوتے تھے اور جس دن زیادہ مہمان ہوتے اُسدن اُنکے گھر عید ہوتی تھی - اگرچہ مہمانوں کی خاطر و مدارات قدیم سے اُنکی ایک جبلی خصلت تھی مگر جب سے علیگڑھ مسلمانوں کی تعلیم کا مرکز بنا اُسوقت سے اُنکا گھر مہمان سرا بنگیا تھا شاید ہی کوئی دن ایسا ہوتا ہوگا کہ اُنکے ہاں کوئی مہمان نہ ہو - رات کے کھانے پر اُنکے ہاں اکثر پر لطف صحبت ہوتی تھی کیونکہ

علمی، تاریخی اور سوشل ہر قسم کے مسائل پر گفتگو ہوتی تھی اور اسی کے ساتھ ہنسی اور چہل کی باتیں بھی ہوتی رہتی تھیں۔ کھانوں میں زیادہ تعدد اور تلون نہیں ہوتا تھا مگر کھانا عموماً عمدہ ہوتا تھا۔ اگر کسی موقع پر کھانا عمدہ نہیں ملتا تھا تو جیسا ملتا تھا خوشی سے بغیر ناک موں چڑھائے سیر ہو کر کھالیتے تھے۔ فصل کی ترکاریاں اور فواکہ خصوصاً آم اور خربوزے نہایت مرغوب تھے۔ سنا ہے کہ پہلے خوراک زیادہ تھی مگر بڑھاپے میں بہت گھٹ گئی تھی البتہ بعد کھانا کھانے کے کوئی پاؤ یا پاؤ سیر دودھ دونوں وقت بلا ناغہ پی لیتے تھے اور اسکے بعد پپیا دو پپیا پھیچنے یا دال سیو کھا کر مونہ صاف کرتے تھے۔ ولایت جانے سے پہلے پان زردہ کھانے اور حقہ پینے کی بہت عادت تھی مگر ولایت جاتے وقت پان کھانا یک قلم ترک کر دیا تھا اور بجائے حقہ کے سگرٹ پینے لگے تھے۔

کسی قسم کی مسکرات کا تمام عمر میں اُنہوں نے کبھی استعمال نہیں کیا۔ مرنے سے نو دس برس پہلے ایک دفعہ وہ سخت بیمار پڑے تھے، ڈاکٹر نے کولی ہلکی سی شراب اُنکو لئے تجویز کی اُنکے ایک دوست نے اُنسے ڈاکٹر کی تجویز کا ذکر کیا، اُنہوں نے شراب پینے سے انکار کیا اور مومن کا یہ شعر پڑھا

عمر ساری تو کٹی عشق بتان میں مومن آخری وقت میں کیا خاک مسلمان ہونگے

کرنل گریہم لکھتے ہیں کہ "جب وہ (یعنی سرسید) لندن میں تھے ایک دفعہ ڈیوک اوف آرگائل کے یہان ڈنر پر بلائے گئے، جب شراب سامنے آئی تو اُنہوں نے کہا میں نوح کی شراب نہیں پیتا صرف آدم کی شراب (یعنی پانی) پیتا ہون"

اگرچہ آخر میں سرسید بتقاضائے سن بیمار رہنے لگے تھے لیکن اِس سے پہلے اُنکی صحت ہمیشہ نہایت عمدہ رہی۔ معلوم ہوتا ہے کہ بچپن میں صحیح المزاج ہونے کے سبب اُنکو دوا اُٹھائی پینے کا بہت ہی کم اتفاق ہوا تھا، یہی وجہ تھی کہ اگر دوا ذرا بدمزہ ہوتی تو وہ اس پیرانہ سالی میں بھی بچوں کی طرح ناک مونہ چڑھائے بغیر نہیں پیتے تھے۔ عفت و پرہیزگاری اور محنت اور کھانے پینے میں مناسب احتیاط ان سب باتوں نے اُنکے مزاج کو اور بھی زیادہ اعتدال پر رکھا۔ بینائی اخیر تک عمدہ رہی، اگرچہ عینک لگانے کی عادت ہو گئی تھی مگر دن ہو یا رات لکھنے پڑھنے کا کام بے تکلف مثل جوان آدمیوں کے کرتے تھے۔ البتہ نسیان بڑھ گیا تھا، دانت بھی جھو جھرے ہو گئے تھے، چلنا پھرنا اُٹھنا بیٹھنا نہایت دشواری سے ہوتا تھا، کسی جلسہ میں کھڑے ہو کر اب دو چار منٹ سے زیادہ تقریر نہیں کر سکتے تھے، باوجود اسکے تصنیف

اور تحریر کا کام - جو بمنزلہ ستۂ ضروریہ کے ہوگیا تھا - اخیر دم تک برابر جاری رہا -

لہو و لعب سے نفرت

اگرچہ بچپن اور عنفوان شباب میں اُنکو میلے تماشون کا بہت شوق تھا مگر جب سے بہائی کا انتقال ہوا تھا یہ شوق گویا بالکل جاتا رہا تھا، صرف علمی تماشون میں مثل سرکس یا تھیٹر وغیرہ کے کبھی کبھی شریک ہو جاتے تھے؛ باایںہمہ تھیٹر کو ہندوستان کے حق میں نہایت مضر خیال کرتے تھے -

ظرافت

ظرافت اور خوش طبعی اُنکی جبلت میں داخل تھی مگر جسطرح اُنکی اور باتون میں بناوٹ نہ تھی اسی طرح ظرافت و خوش طبعی میں تصنع نہ تھا - تحریرمیں، تقریرمیں، بات چیت میں جو لطیفہ یا شوخی اُنکو سوجھ جاتی تھی - اگرچہ کیسی ہی شرم و حجاب کی بات ہو - اُن سے ضبط نہ ہو سکتی تھی مگر ہر ایک امر کے بیان کرنے کا خدا نے ایسا سلیقہ دیا تھا کہ کوئی بات تہذیب کی حد سے متجاوز نہ ہونے پاتی تھی - زیادہ تر اُنکو ظرافت اور شوخی اُن لوگون کے مقابلہ میں سوجھتی تھی جو اُنکی تکفیر یا تضلیل کرتے تھے؛ وہ اُنکو کافر یا مرتد کہکر اپنا دل ٹھنڈا کرتے تھے اور یہ اسطرح پر اپنے دل کا بخار نکالتے تھے - پادریون سے بھی اُنکا دل بہت دکھا ہوا تھا اسلئے کبھی کبھی بالمشافہ اُنسے بھی نوک جھوک ہو جاتی تھی -

ایک دفعہ وہ ریل میں سوار تھے، کسی اسٹیشن پر دو انگریز اُنکی گاڑی میں آبیٹھے، ایک اُنمین سے پادری تھا، اسکو کسی طرح سے معلوم ہوگیا کہ سید احمد خان یہی شخص ہے، سرسید سے کہا "مدت سے آپکی ملاقات کا اشتیاق تھا، میں آپ سے خدا کی باتین کرنی چاہتا تھا" سرسید نے کہا "میں نہیں سمجھا آپ کس کی باتین کرنی چاہتے ہیں؟ اُسنے کہا خدا کی، سرسید نے کمال سنجیدگی سے کہا "میری تو کبھی اُنسے ملاقات نہیں ہوئی، اسلئے میں اُنکو نہیں جانتا"، پادری نے متعجب ہوکر کہا "ہیں! آپ خدا کو نہیں جانتے! اُنہون نے کہا "بھی یہ کیا موقوف ہے، جس سے ملاقات نہو اُسکو کوئی بھی نہیں جانتا"، پہر کسی شخص کا نام لیکر پوچھا کہ "آپ اُسکو جانتے ہیں؟ پادری نے کہا "نہیں میں اُس سے کبھی نہیں ملا"، سرسید نے کہا "پہر جس سے میں کبھی نہ ملا ہون، نہ میں نے کبھی اُسکو اپنے ہان کہانے پر بلایا ہو، نہ مجھکو اُسکے ہان کہانے پر جانے کا اتفاق ہوا ہو، اُسکو میں کیونکر جان سکتا ہون"، پادری یہ سنکر خاموش ہو رہا اور دوسرے انگریز سے انگریزی میں کہا کہ یہ تو سخت کافر ہے - پہر سرسید سے اُسنے کوئی بات نہیں کی اگر تقریر کا سلسلہ آگے چلتا تو اسکو معلوم ہو جاتا کہ خود اُسکا عقیدہ

کے موافق خدا ایسا ہی ہونا چاہیے جسکے ساتھ ملنا جلنا کھانا پینا لیں دیں انسان کے مانند ہوسکے۔

ایک دفعہ دلی کے مشینری کالج اور علی گڑھ کالج کا میچ تھا اور دلی سے کالج کے دو پروفیسر جو پادری تھے۔ میچ کھیلنے کے لئے اپنے طلبہ کو ساتھ لیکر علیگڑھ آئے تھے۔ سرسید نے انکو ڈنر پر بلایا۔ جبکہ مسٹر بک بھی اُنکے ساتھ تھے۔ کھانے کے بعد پادری صاحب سرسید سے مخاطب ہو کر بولے کہ "بہت اچھی بات ہے کہ آپ کے کالج میں مذہبی تعلیم بھی ہوتی ہے" کیونکہ سچا مذہب ہی ایسی چیز ہے جو انسان میں نیکی پیدا کرتا ہے،، پادری صاحب اسلام کو تو جسکی تعلیم علیگڑھ کالج میں ہوتی ہے۔ سچا مذہب کہہ ہی نہیں سکتے تھے، لامحالہ اُنکی مراد عیسائی مذہب سے تھی اور عیسائی مذہب کی بدولت جس قدر دنیا میں خونریزی ہوئی ہے اُسکی مثال کسی مذہب میں نہیں مل سکتی۔ سرسید نے پادری صاحب کی تقریر سنکر کہا کہ "دنیا میں مذہب سے زیادہ کوئی بد تر چیز اور تمام بُرائیوں اور جرائم کا مخزن نہیں ہے"۔ تاریخ شاہد ہے کہ جسقدر ظلم اور بے رحمیاں اور قتل اور خونریزیاں دنیا میں صرف مذہب کے سبب سے ہوئی ہیں وہ ایک طرف اور جو جرائم شیطان نے کرائے ہیں وہ ایک طرف رکھے جائیں تو بھی مذہبی جرائم اور بُرائیوں کو غلبہ رہیگا پادری صاحب یہ سنکر چپ ہو گئے اور مسٹر بک سے مکان پر آکر کہا کہ میں نے تو اس شخص کو بڑا اتھیولوجین سنا تھا مگر اب معلوم ہوا کہ یہ بالکل غلط تھا۔

بعض اوقات سرسید کسی مسئلہ کی نسبت اپنے عقیدہ کا اظہار ظرافت کے پیرایہ میں ایسے طور پر کر جاتے تھے کہ بظاہر ایک ہنسی کی بات معلوم ہوتی تھی مگر درحقیقت وہ اُنکی اصلی رائے اُس مسئلہ کی نسبت ہوتی تھی۔ جس زمانہ میں وہ بنارس میں تھے انکا ایک آرٹکل تہذیب الاخلاق میں اس مضمون پر شایع ہوا تھا کہ اجماع۔ جیسا کہ اہل سنت سمجھتے ہیں حجت شرعی نہیں ہے۔ شیعوں میں سے ایک سید صاحب۔ جو بنارس میں ملازم تھے۔ اس آرٹکل کو پڑھکر خوشی خوشی اُنسے ملنے کو آئے۔ پہلے کبھی اُنسے ملاقات نہیں ہوئی تھی، سرسید سے اُس آرٹکل کا ذکر کر کے کہنے لگے "کیوں جناب! جب آپ کے نزدیک اجماع حجت نہیں تو خلیفہ اول کی خلافت کیونکر ثابت ہوگی؟ سرسید نے کہا حضرت! نہ ہوگی تو اُنکی نہ ہوگی، میرا کیا بگڑیگا وہ یہ سنکر اور بھی زیادہ خوش ہوئے اور سمجھے کہ کچھ پانی مرتا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد کہنے لگے "کیوں جناب! اس اختلاف کے وقت۔ جب کہ کچھ لوگ خلیفہ اول کا ہونا چاہتے تھے اور

کچھ جناب امیر کا۔ اگر آپ اُسوقت ہوتے تو کسکے لئے کوشش کرتے؟ سرسید نے کہا۔ حضرت مجھے کیا غرض تھی کہ کسی کے لئے کوشش کرتا؟ مجھسے تو جہانتک ہوسکتا اپنی ہی خلافت کا ڈول ڈالتا اور سوبسوے کامیاب ہوتا"۔ یہ سنکر اُنکا جی جھوٹ گیا اور جوتیاں پہن کر گھر کا رستہ لیا۔

بہ ظاہر یہ ایک لطیفہ معلوم ہوتا ہے مگر درحقیقت اس پیرایہ میں اُنہوں نے اپنی اصلی راے مسئلۂ خلافت کے متعلق ظاہر کی ہے۔ اُنکے نزدیک۔ جیساکہ اُنہوں نے اپنی تحریرات میں جابجا ظاہر کیا ہے۔ کوئی شخص خاتم النبیینؐ کے بعد من حیث النبوۃ انکا جانشین نہیں ہوسکتا تھا اور۔ اسلئے وہ کسی کی خلافت کے ماننے یا نہ ماننے کو ضروریات دین میں سے نہیں سمجھتے تھے بلکہ خلافت کو محض دنیوی سلطنت کی ایک صورت جانتے تھے اور اسی بنا پر جو کچھ خلفا نے اپنے اپنے عہد میں کیا اُسکا ذمہ دار اسلام کو نہیں ٹھیراتے تھے، بلکہ خود انہیں کو اُسکا جواب دہ اور ذمہ دار سمجھتے تھے۔

سرسید کے لطیفے خاصکر اُن آرٹکلوں میں پائے جاتے ہیں جن میں معترضین و مخالفین کا ذکر خیر یا اُنکی طرف خطاب ہے اور سب سے زیادہ اُنکے پرایوٹ خطوں اور رقعوں میں نظر آتے ہیں جو وہ اپنے خالص اور بے تکلف دوستوں کو وقتاً فوقتاً لکھتے تھے۔

ایک دفعہ۔ جب کہ راقم بھی علیگڑہ میں سرسید کے مکان پر ٹھیرا ہوا تھا۔ خان بہادر مولوی سید فریدالدین احمد صاحب آرڈنٹ جج کا رقعۂ دعوت سرسید کے نام آیا؛ رقعہ کے خاتمہ پر انہوں نے اپنا نام اسطرح لکھا تھا "جانی فرید" (یعنی گنہگار فرید) سرسید نے جو اُسکا جواب لکھا اُسکے عنوان پر وہی الفاظ۔ جو مولوی صاحب نے اپنی نسبت لکھے تھے۔ لکھدے یعنی "جانی فرید"۔

اس قسم کے ہزاروں چٹکلے سرسید کی پبلک اور پرائیوٹ تحریروں میں ملتے ہیں جنکو جمع کیا جاے تو ایک مستقبل رسالہ لطائف و نوادر کا مرتب ہوسکتا ہے؛ مگر ایک شخص کی زندگی ایسے مہتم بالشان واقعات سے بھری ہوئی ہے کہ اُنہیں کا سمیٹنا یوگر فر کی طاقت سے باہر ہے چہ جائیکہ اسکے لطائف و نوادر کو جمع کرنا اور اس شعر کا مصداق بننا ؎

"بخوں آلودہ دست و تیغ غازی مانَد بے تحسیں — تو خواہی۔ زیبِ اسپ و زینتِ برگستواں بینی"

سرسید کی شوخیِ طبع جیسی جوانی اور کہولت کے زمانہ میں تھی ویسی ہی بڑھاپے میں اخیر عمر تک رہی۔ مرنے سے چار برس پہلے۔ جبکہ اُنہوں نے تیسری بار تہذیب الاخلاق جاری

نواز ... [illegible]

کیا۔ اُسکے اشتہار کے ساتھ۔ جو اُنہوں نے ایک چھوٹا سا آرٹکل بطور تمہید کے لکھا تھا اس کے آخر میں لکھتے ہیں "گو ہمارا دل کیسا ہی لوٹا ہوا ہو مگر امید ہے کہ اب کا تہذیب الاخلاق اگر پہلے سے اچھا نہ ہو گا تو بُرا بھی نہ ہو گا۔ اور اگر وہ مکاتبات دلچسپ بھی تہذیب الاخلاق میں چھپنے لگے جو ہم میں اور نواب محسن الملک مولوی مہدی علی میں بعض مسائل کی نسبت ہونے والے ہیں اور جیسے قصہ آدم یاد آ جائیگا اور کبھی سید احمد کو حکم ملیگا کہ مہدی علی کو سجدہ کرو اور کبھی مہدی علی کو حکم ہوگا کہ سید احمد کو سجدہ کرو تب تو تہذیب الاخلاق نہایت ہی دلچسپ ہو جاویگا۔ اور خدا نکرے کہ اُن دونوں میں سے کوئی یہ کہے کہ خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَخَلَقْتَہٗ مِنْ طِیْنٍ۔"

مطالعہ کی عادت ابتدا سے اُنکی رفیق رہی۔ جس زمانہ میں وہ فتحپور سیکری میں منصف تھے اُسوقت مولانا نور الحسن مرحوم آگرہ میں منصف تھے۔ سرسید کی اُنسے نہایت گہری دوستی تھی۔ مطالعہ کے وقت کتاب کے مشکل مقامات۔ جو سمجھہ میں نہ آتے تھے۔ اُنکے سمجھنے کے لئے ہر اتوار کو وہ گھوڑے پر سوار ہو کر فتحپور سے آگرہ میں مولانا کے پاس آتے تھے۔ کئی برس تک بلا ناغہ اُنکا یہی دستور رہا۔ وہ کہتے تھے کہ میرا گھوڑا رستے سے ایسا آشنا ہو گیا تھا کہ ایکبار آگرہ سے چھوٹ کر فتحپور اپنے تھان پر پہنچ گیا تھا۔

سرسید کا مطالعہ نہ صرف دل بہلانے یا عبارت کا لطف اُٹھانے کے لئے ہوتا تھا اور نہ کتاب دانی کی غرض سے۔ جیسا کہ مدرس اور طلبہ کتاب کے ایک ایک لفظ اور جملہ اور ترکیب پر غائر نظر کرتے ہیں، بلکہ اُنکا مطلب صرف مصنف کے خیالات سے اطلاع حاصل کرنا ہوتا تھا۔ جو بات کتاب میں اُنکے کام کی ہوتی تھی اُسپر پنسل سے نشان کر دیتے تھے، اور اگر کوئی مضمون کسی اخبار میں کام کا ہوتا تھا اُس ورق کو الگ کر کے اپنے اخبار کی فائل میں۔ جو ہر وقت سامنے رکھا رہتا تھا۔ چپاں کر دیتے تھے۔ جو مہتم بالشان سوالات ملک میں دائر ہوتے تھے اگر اُنکے متعلق کوئی عمدہ مضمون کسی اخبار میں نظر پڑ جاتا تھا اُسکو زیادہ غور سے دیکھتے تھے اور ہر ایک سوال کے متعلق اپنی ایک مستقل رائے قایم کر لیتے تھے۔ اگر کبھی ضرورت سمجھتے تھے تو اسپر چھوٹا یا بڑا آرٹکل لکھکر چھپنے کو بھیجدیتے تھے۔ جو مضمون اُنکے خلاف اخباروں میں چھپتے تھے اُنکو بہت شوق اور توجہ سے دیکھتے تھے اور اکثر حاضرین کو بھی سناتے تھے۔ انگریزی اخباروں کی بعض خبریں، یا نوٹس یا کوئی ضروری آرٹکل کسی انگریزی داں سے پڑھوا کر سن لیتے تھے اور جو بات سمجھہ میں نہ آتی اُسکا ترجمہ

کرا لیتے تھے۔

کتابیں اکثر اُنکے مطالعہ میں مذہبی دیکھی گئی ہیں، تصنیف کی حالت میں صرف یا تو کتاب خود دیکھ لیتے تھے اور یا کوئی دوسرا شخص مقام مطلوب نکالکر اُنکو دکھا دیتا تھا۔ اگر کوئی لطیف بات مضمون کتاب کے خلاف یا اُسکی مؤید یا اُسکے متعلق ذہن میں آجاتی اسیوقت اُسپر کچھ لکھا اور اخبار میں چھپنے کو بھیجدیا۔

غدر کے بعد سے پریس ہمیشہ اُنکے ہاتھ تلے رہا اسلئے یہ عادت انکی طبیعت ثانی بن گئی تھی کہ مضمون لکھنے کے بعد، جب تک کہ وہ شائع نہ ہو جاتا۔ اُنکو چین نہ پڑتا تھا۔ یہی حال کتاب کی تصنیف کا تھا، ادہر ایک پہ اِنشٹ ختم ہوا اور اُدہر چھپنے کے لئے بھیجا گیا، مسودہ پر بار بار نظر ڈالنا اور زیادہ کاٹ چھانٹ کرنا اُنکا دستور نہ تھا، البتہ مسودہ صاف کرنے کے لئے وہ کاتب کو دیدیتے تھے، اور جب صاف ہو جاتا تو کتابت کی تصحیح کے ارادہ سے اُسکو ایک نظر دیکھ لیتے تھے۔

تصنیف کی حالت

تصنیف کی حالت میں جب کوئی مشکل مقام پیش آجاتا اور زیادہ غور کی ضرورت ہوتی تو وہ تنہا ہوتے یا مجمع میں، بالکل اُسمیں مستغرق ہو جاتے تھے، چہرہ عبوس ہو جاتا، ہنسی یا تبسم پاس نہ آتا، لوگ آپس میں باتیں کرتے مگر اُنکو کچھ خبر نہ ہوتی تھی۔ ایسے موقع پر آنکھیں بندکرکے لیٹ جاتے تھے اور جب تک طبیعت راہ نہ دیتی برابر اُسی خیال میں منہمک رہتے، جب عقدہ حل ہو جاتا فوراً چہرہ پر بشاشت آجاتی۔ اگر اُسوقت کوئی مخاطب صحیح پاس ہوتا تو بعض اوقات اپنا ساختہ اُسکے روبرو بیان کرتے، اگر اور لوگ بھی اُسکو پسند کرتے تو خوش ہوتے، اگر کوئی اعتراض کرتا تو اسپر بحث کرتے یا خاموش ہو جاتے مگر فوراً تسلیم کبھی نہ کرتے تھے۔

خطوں کا جواب دینا

خطوں کا جواب دینے میں وہ نہایت فیاض تھے۔ جو خط کہ پانی پت سے علیگڑھ بھیجا جاتا ہے اگر وہاں پہنچتے ہی اُسکا جواب لکھا جائے تو تیسرے دن وہاں سے جواب آجاتا ہے، مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میرے خط کا جواب کبھی چوتھے دن آیا ہو یا بالکل نہ آیا ہو۔ دوستوں کو معذوری کی حالت کے سوا وہ ہمیشہ پرائوٹ خطوط اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے، البتہ مدرسہ وغیرہ کے متعلق جو خط لکھنے ہوتے تھے وہ اکثر بیندست لکھتا تھا اور وہ خود بتاتے جاتے تھے لیکن جو فضول تحریریں لوگ اُنکے پاس بھیجتے تھے اُنکا کچھ جواب نہ دیتے تھے۔ جس خط کا جواب

لکھ چکتے اُسکو فوراً چاک کر ڈالتے تھے۔ کبھی اُنھوں نے کسی کی تحریر کو۔ اِس خیال سے کہ اُسکو الزام دینے یا شرمندہ کرنے کا موقع رہے۔ اپنے پاس دستاویز بنا کر نہیں رکھا جب کسی خالص و مخلص دوست کی زیادہ بیماری کی خبر آتی تو جب تک صحت نہ ہوتی وہ برابر تار پر تار یا خط پر خط بھیجتے رہتے۔ جو خط کہ وہ اپنے بے تکلف اور خالص و مخلص دوستوں کو لکھتے تھے اُنکا انداز تحریر فی الواقع ایسا دلکش اور دلنشین ہوتا تھا کہ جادو یا افسوں یا حب کا عمل کہا جائے تو کچھ مبالغہ نہ ہوگا۔ افسوس ہے کہ ابتک کسی نے اُنکے خطوط جمع کرنے کی طرف توجہ نہیں کی، اگرچہ امید نہیں ہے کہ اُنکا دسواں حصہ بھی اب فراہم ہو سکے لیکن جسقدر دستیاب ہوں اُنکا جمع کرنا نہایت ضرور ہے۔ وہ ایک ایسا مجموعہ ہوگا جو غیروں کو اپنا بنانا اور وحشیوں کو رام کرنا سکھائیگا، وہ سچی دوستی اور سچی محبت کا نمونہ ہوگا، وہ آیندہ نسلوں کو یاد دلائیگا کہ ہمارے اسلاف کیسے بے ریا اور کیسی محبت والے ہوتے تھے؟ کسطرح دوستوں کا دل اپنی مٹھی میں رکھتے تھے؟ اور کیونکر اُنکے دلوں کو شکار کرتے تھے۔

جب وہ ولایت سے ہندوستان آنے کو ہیں اُنھوں نے مولوی مہدی علی خاں کو اپنے آنے کی اطلاع دی ہے اُسمیں لکھتے ہیں کہ "چوتھی یا پانچویں کو الہ آباد پہنچکر آپ کے دیدار فرحت آثار سے مشرف ہونگا اور آپ کے قدموں کو مثل نعلین بوسہ دونگا۔ اگرچہ آپ کے قدم میرے ناپاک لبوں سے ناپاک ہو جاوینگے مگر امید ہے کہ آپ مرمت سے دھو دینگے؛ خنزیر خود ناپاک ہے مگر جس پاک چیز کو وہ مس کرے دھونے سے پھر پاک ہو سکتی ہے"

"افسوس میں نے غلطی کی جو اپنے تئیں خنزیر سے تشبیہ دی، وہ تو مجھسے بہت اعلیٰ ہے،

خدا نے اُسکو یاد کیا ہے، مجھے تو سوائے مہدی علی کے اور کوئی یاد بھی نہیں کرتا"

اسکے بعد مولوی مہدی علی کی تحریرات جو اخباروں میں کچھ سرسید کے موافق اور کچھ مخالف چھپی تھیں اُنکا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "بعض مقام مجھکو اُسمیں کھٹکتے ہیں (یعنی جو میرے خلاف) ہیں اُس سے میرا دل عجیب طرز پر خوش ہوتا ہے جیسے کوئی سوداگر یہ دیکھے کہ ایک نہایت بیش بہا و بے نظیر ہاتھی اُسکی اوگی میں آن پھنسے اور وہ یقین کرے کہ اب وہ نکلنے والا نہیں"، یہ ایک معمولی مثال ہے اُن محبت آمیز باتوں کی جو سرسید کی دوستانہ تحریروں میں عموماً دیکھی جاتی ہیں؛ اور اس بات کی تصدیق سید مہدی علی خاں سلمہم اللہ خود کرینگے کہ وہ فی الواقع سید کی اوگی میں پھنسے تھے یا نہیں اور پھنسکر اُسمیں سے نکلنے کا اُنکو موقع ملا یا نہیں؟

محنت اور جفاکشی کی قابلیت بھی سرسید کے خاص اوصاف میں سے تھی۔ قطع نظر اسکے کہ ابتداسے انکو کام کرنے کی عادت رہی اُنکے قویٰ میں فطرۃً مشکلات کے برداشت کرنے اور کسی کام سے ہمت نہ ہارنے کی لیاقت اور استعداد رکھی گئی تھی اور ظاہرا اُنکی غیر معمولی ذہانت بھی اُنکی دائمی غور و فکر اور دماغی محنت کا نتیجہ تھا کیونکہ بچپن میں، جیسا کہ خود سرسید کے بیان سے معلوم ہوا ہے۔ وہ باعتبار ذہانت و جودت کے اپنے ہمچشموں میں کچھ امتیاز نہ رکھتے تھے، مگر چونکہ اُنھوں نے اپنے تمام قویٰ سے۔ جو خدا تعالیٰ نے اُنکے نفس میں ودیعت کیے تھے۔ پورا پورا کام لیا تھا اسلئے اُنکے ذہن اور حافظہ اور عقل سب کو جلا ہوگئی تھی۔ کہتے ہیں کہ نیوٹن اسکول میں کچھ ذہین لڑکا نہیں معلوم ہوتا تھا، جب اُس سے بڑے بڑے کار نمایاں ظاہر ہوئے اور اُس سے لوگوں نے پوچھا کہ تمنے اتنی نئی باتیں کیونکر نکالیں تو اُسنے یہی جواب دیا کہ "میں استقلال کے ساتھ برابر غور کرتا رہا" محنت سے ایسے بڑے بڑے کام ظہور میں آئے ہیں کہ بعض حکما کو شبہہ ہو گیا ہے کہ آیا ذہانت بغیر محنت کے فی نفسہ کوئی چیز ہے یا نہیں؟

بہرحال سرسید کے تمام قوای عقلیہ کی جلا کرنے والی اور انکو ترقی کے اعلیٰ درجہ پر پہنچانے والی اونکی دائمی محنت اور متصل غور و فکر اور استقلال تھا۔ سید میر محمد مرحوم امام جامع مسجد دہلی بیان کرتے تھے کہ "جس زمانہ میں سید صاحب دلی سے رہتک بدل کر گئے ہیں میں بھی اُنکے ساتھ گیا تھا۔ وہ صبح سے دس بجے تک مولوی نوازش علی صاحب سے۔ جنکو دلی سے ہمراہ لے گئے تھے سبق پڑھتے تھے بس بیس بائیس صفحے شرح جامی اور قطبی کے وہ ہر روز پڑھ لیتے تھے، میں بھی اُنکے ساتھ پڑھنے کے لئے گیا تھا مگر اس رفتار سے اُنکے ساتھ نہ چل سکا اور واپس دلی چلا آیا۔ سبق کے بعد وہ کھانا کھا کر تھوڑی دیر قیلولہ کرتے تھے، پھر کچہری جاتے اور شام تک کچہری کرتے، وہاں سے آکر شام کے کھانے اور نمازوں سے فارغ ہو کر سو رہتے، کوئی تین ساڑھے تین گھنٹے سوتے تھے، اسکے بعد ہمیشہ بلاناغہ اُٹھ بیٹھتے اور صبح تک برابر مطالعہ کرتے تھے۔ جب تک میں رہتک میں رہا برابر اُنکا یہی قاعدہ دیکھا"

یہ تو اُس زمانہ کا حال ہے جب سرسید کی عمر ۲۶ برس کی تھی اُس سے آٹھ نو برس بعد مراد آباد اور غازیپور میں بھی۔ جبکہ وہ تبیئن الکلام لکھتے تھے۔ اُنکی محنت کا حال۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ اسی کے قریب قریب تھا۔ ولایت میں خطبات احمدیہ کے لکھنے میں اُنھوں

سنہ ڈیڑھ برس برابر ایسی محنت شاقہ کی جس سے آخرکار اُنکے پاؤں میں ایک مرض پیدا ہوگیا جو اخیر دم تک زائل نہیں ہوا، اُنکے پاؤں اور پنڈلیاں سوج جاتی تھیں اور تلووں میں درد ہوتا تھا مہینے مہینے دو دو مہینے برابر تکلیف رہتی تھی، چند روز کو افاقہ ہو جاتا تھا پھر وہی شکایت پیدا ہو جاتی تھی۔ باوجود ان مشکلات کے اُنھوں نے خطبات احمدیہ کو ولایت ہی میں پورا کیا اور وہیں چھپوایا۔

جس زمانہ میں وہ سائنٹفک سوسائٹی کا مکان بنوا رہے تھے سخت گرمی کا موسم تھا شام تک لو چلتی تھی، وہ کچہری سے آکر گھر کی ٹٹی اور پنکھا چھوڑ سیدھے سوسائٹی پہنچتے تھے اور ظہر و عصر اور مغرب کی نمازیں وہیں پڑھتے تھے، اُنکے دوست محمد سعید خاں بیان کرتے تھے کہ اکثر مجھے بھی وہ ساتھ لیجاتے تھے، میرا گرمی اور لُو کے مارے بُرا حال ہوتا تھا مگر وہ بے تکلف سارا دھوپ اور لو اور گرمی کا وقت وہیں راج مزدوروں میں بسر کرتے تھے۔

اخیر زمانہ میں۔ جو کہ شیخوخت کا زمانہ تھا۔ اُنکی محنت جوانی اور کہولت کے زمانہ سے بھی زیادہ حیرت انگیز تھی۔ وہ اُس پیادہ سیاح کی طرح جو صرف سیر ملک میں سیاحت کے لئے داخل ہو۔ جوں جوں آگے بڑھتے جاتے تھے اُسیقدر اُنکی چال زیادہ تیز ہوتی جاتی تھی اُنکا اس عارفانہ مقولے پر پورا پورا عمل تھا کہ "ضاعف فی الکبر ھمتک فان وقتک قد دنی و عما قلیل تدعی" (یعنی بڑھاپے میں اپنی ہمت دوچند کر کیونکہ تیرا وقت قریب آپہنچا ہے اور عنقریب تیری بُلاوُ ہونے والی ہے)

وہ تقریباً ہمیشہ صبح کے چار بجے سے شام کے آٹھ بجے تک برابر جاگتے اور مختلف کاموں میں مصروف رہتے تھے، دوپہر کو سخت بیماری کے سوا کبھی پلنگ پر جا کر لیٹتے تھے اگر کبھی رات کو نیند نہ آتی اور دن کو نیند کا غلبہ زیادہ ہوتا تو بھی وہ اپنی نشستگاہ سے نہیں اُٹھتے تھے، جو ایسا ہی نیند کا خمار ہوا تو وہیں کرسی یا تکیہ کے سہارے سے ذرا کمر سیدھی کر لیتے تھے، اگر اس میں کبھی آنکھ لگ گئی تو ذرا سی آہٹ سے فوراً کھل جاتی تھی اور پھر اپنے کام میں لگ جاتے تھے۔ چونکہ بڑھاپے اور زیادہ فربہی کے سبب وہ اپنے میں پھرتی اور چالاکی کی قابلیت نہیں دیکھتے تھے اسلئے جن کاموں میں پُھرتی کی ضرورت ہوتی تھی اُنکے لئے بہت پہلے سے تیار ہو جاتے تھے۔ ریل پر وقت سے دو دو گھنٹے پہلے جا بیٹھتے تھے، کسی ڈنر یا دعوت یا جلسہ یا دربار میں جانا ہوتا تو وقت معین سے بہت پہلے

تیار ہو بیٹھے تھے کسی حاکم اعلیٰ کو ایڈریس دینی ہوتی تھی تو دس دس بارہ روز پہلے سب کام لیس کر رکھتے تھے؛ غرض کہ ہر ایک کام کی تیاری وہ اُسوقت سے شروع کرتے تھے جب کسی کو اُسکا سان گمان بھی نہ ہوتا تھا۔

تصنیف و تالیف کے علاوہ۔ جو اُنکا ایک لازمی مشغلہ تھا۔ مدرسہ کے متعلق تمام اہم اور ضروری کام یا تو وہ خود اپنی ذات سے کرتے تھے یا اپنی نگرانی میں اپنے پیشدستوں سے لیتے تھے مثلاً مدرسہ کی سالانہ آمدنی اور خرچ کا بجٹ بنانا اور اُسکا خلاصہ گورنمنٹ میں بھیجنے کے لئے مرتب کرنا، سالتمام کی رپورٹ لکھنی، ہر دوسرے تیسرے مہینے اجنڈا تیار کرنا اور اسکے تمام کاغذات چھپوا کر ٹرسٹیوں کے پاس بھیجنے اور اُنکو ووٹ بھیجنے کے لئے اکثر کئی کئی دفعہ تقاضے کے خط لکھنے، پھر ہر ایک جلسہ کی روئداد لکھکر اور چھپوا کر ٹرسٹیوں کے پاس بھیجنی، گورنمنٹ سے، سررشتۂ تعلیم سے؛ طالب علموں کے مربیوں سے، بینک سے، اور ٹرسٹیوں سے وقتاً فوقتاً خط کتابت کرنا، روزانہ آمدنی اور خرچ کو روزنامچہ میں درج کرنا، عمارتوں کے نقشے تجویز کرنے اور اُنکے موافق ہر ایک عمارت کو اپنی نگرانی میں تیار کرانا، اُنکے لئے ہر قسم کا سامان اور مصالح اپنی رائے اور تجویز سے منگوانا، ہر ایک عمارت کے لئے مناسب کتبہ یا تاریخ تجویز کرنی، اور اُسکو اپنے اہتمام میں کندہ کرانا۔ تیار شدہ عمارتوں کی تابمقدور خبر رکھنی اور اُنکے نقصانات کا تدارک کرنا، کالج اور تعمیر کے اخراجات کے لئے چندہ جمع کرنے کی نت نئی تدبیریں سوچنی اور اون تدبیروں کے موافق عمل درآمد کرنا اور اخبار اور خطوط کے ذریعہ سے چندہ کی تحریک کرنا، اگر روپیہ بہم نہ پہنچے تو قرض سے مدرسہ کا کام چلانا، کالج یا بورڈنگ ہوس کے انتظام کے متعلق جب کوئی شکایت گزرے تابمقدور اُس کے تدارک کی فکر کرنا اور جب کوئی مناسب یا ضروری تجویز منظور ہو جائے اُسکے پورا کرنے کے لئے ہر قسم کی تدبیر عمل میں لانا، اُردو اخبارات جو اطراف و جوانب سے آتے تھے اُن سب پہ ایک نظر ڈالنا اور بعض انگریزی اخباروں کو کسی اپنے پیشدست سے پڑھوا کر سننا، ہمیشہ قوم کے اہم معاملات سے۔ جو اخباروں میں درج ہوتے تھے نوٹس لینا اور اپنے اخبار میں اُن پر بحث کرنا اور بعض ضروری مضامین کا ترجمہ انگریزی میں کرا کر کبھی اپنے اخبار میں اور کبھی کسی معتبر انگریزی اخبار میں شائع کرانا، ہفتہ میں دو بار اخبار کے پروفوں کا خود صحیح کرنا، اپنی یا دوستوں کی کتابیں۔ جو فروخت کی غرض سے مدرسہ کے فائدہ کے لئے ہمیشہ چھپتی رہتی تھیں یا کانفرنس کی رپورٹیں اور لکچر یا کالج کا بجٹ یا رپورٹ سالتمام یا ٹرسٹیوں

کے اجلاس کی روئدادیں۔ غرضکہ جو کچھ اُنکے اہتمام مین چھپتا تھا سب کی کاپیوں یا پروفوں کا اصل سے خود بمقابلہ کرانا اور آپ اُنکی تصحیح کرنا اور اپنے سامنے اُنکے پیکٹ بنواکر مطبع میں بھیجنا، مدرسہ کی تجارتی کتابوں کے خود اشتہار چھپواکر اُنکو آپ فروخت کرنا اور اُن کا حساب کتاب رکھنا، کالج کے متعلق تمام حساب کتاب کے رجسٹروں، بجٹوں، رپورٹوں اور روئدادوں وغیرہ کی اور کالج لائبریری کے متعلق اور نیٹیل زبانوں کی کتابوں کی جلدیں بندھواکر الماریوں میں اپنے سامنے احتیاط سے رکھوانا، یوروپین حاکم اور افسر اور ارکان سلطنت جو اکثر کالج کے ملاحظہ کو آتے رہتے تھے اُنکی مدارات اور استقبال وشایعت کا خود انتظام کرنا، اُنکے دربار کے لئے ہال کو خاص اپنے اہتمام میں آراستہ کرانا، اُنکے واسطے ایڈریس تیار کرنا اور اُسکو انگریزی میں ترجمہ کرانا اور چھپوانا، اور پھر ایڈریس اور اُسکا جواب اور تمام جلسہ کی کارروائی کو اخبار کے ذریعہ سے شائع کرنا، محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے موقع پر خواہ اُسکا اجلاس علیگڑھ میں ہو اور خواہ کسی دوسرے شہر میں۔ سب کام چھوڑ کر آٹھ دس روز تک برابر اُسکی کارروائی اور انتظام میں ہر وقت مصروف رہنا، یہ اور اسی قسم کے بے شمار چھوٹے بڑے کام یہ شخص اس ضعیفی کے زمانہ میں سرانجام کرتا تھا۔ اگر ان تمام کاموں سے قطع نظر کیجائے اور صرف چندہ جمع کرنے اور اسکی تدبیریں سوچنے ہی کے کام پر غور کیجائے تو یہی ایک ایسا کام تھا کہ اگر دوسرا شخص اسی کام کو اپنے ذمے لے لیتا تو پھر وہ اور کسی کام کا نہیں رہ سکتا تھا۔ تعمیرات کا کام ہی کوئی آسان کام نہ تھا جسکے لئے کم سے کم ایک لایق اوورسیر رکھنے کی ضرورت تھی، مگر سرسید نے یہ بوجھ بھی اپنے سر دھر لیا تھا۔ یہانتک کہ سات آٹھ لاکھ کی عمارت صرف اپنی تجویز اور اپنے اہتمام سے بنوا ڈالی۔

باوجود ان تمام بکھیڑوں کے وہ اپنی خاص طرز کی تصنیف کا نہایت کٹھن اور دشوار گزار مرحلہ بھی انہیں مشغلوں کے ضمن میں طے کرتے تھے۔ دوستوں کے بے شمار خطوں کے جواب اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے، مہمانوں کی حالت کے موافق اُنکی آسایش کا انتظام کرتے تھے۔ اُنکے لانے کے لئے مختلف اوقات میں ریلوے اسٹیشن پر سواری بھیجتے تھے اور جبتک اُنکا قیام رہتا تھا ہر وقت اُنکا خیال رکھتے تھے۔ سچ یہ ہے کہ جو مستعدی اور ہمت اور ہر ایک بات کی خبرداری اور ہر ایک فرض کی نگہداشت اس شخص میں بڑھاپے میں دیکھی گئی ہے وہ کسی توانا اور تندرست نوجوان میں بھی نہیں پائی جاتی اور یہ کہنا کچھ مبالغہ میں

داخل نہیں ہے کہ ایک محض نا واقف شخص بھی صرف اُسکے روزمرہ کے کام دیکھکر اسقدر ضرور سمجھ سکتا تھا کہ اس شخص کی خلقت معمولی آدمیوں کی خلقت سے جداگانہ تھی متنبی نے کیا خوب کہا ہے

وَاِذَا كَانَتِ النُّفُوسُ كِبَاراً تَعِبَتْ فِي مُرَادِهَا الْاَجْسَامُ

(یعنی جب نفوس انسانی اعلیٰ درجہ کے ہوتے ہیں تو اعضاے انسانی اُنکے ارادے پورے کرتے کرتے تھک جاتے ہیں)

باوجود اسقدر مصروفیت اور کاموں کی کثرت کے انکی زندہ دلی نہایت تعجب خیز تھی - وہ جہاں تک ممکن ہوتا تھا رنج اور افسردگی کو کبھی پاس نہ آنے دیتے تھے اور خانگی بکھیڑوں اور خرخشوں سے تا بمقدور الگ تھلگ رہتے تھے - جس طرح اُنکے باپ گھر کے تعلقات سے آزاد تھے اسی طرح سرسید اپنے پرایوٹ معاملات سے بہت ہی کم سروکار رکھتے تھے اور یہی اثر اُنکی اولاد میں پایا جاتا تھا یہی وجہ تھی کہ قومی کاموں کے متعلق کوئی کیسا ہی معقول عذر کرے اور مکروہات خانگی کے سبب کیسی ہی مجبوری بیان کرے وہ ہرگز نہ سنتے تھے اور جب تک سب کام چھوڑ کر اُنکی فرمایش پوری نہ کیجاتی تھی وہ کسی عذر کو قابل سماعت نہ سمجھتے تھے - وہ ہمیشہ جب کام سے خالی ہوتے تھے ہنسی دل لگی اور دوستوں کی صحبت سے اپنے دل کو خوش کرتے تھے - بچوں سے، بوڑھوں سے، جوانوں سے، دوستوں سے، ملازموں سے، انگریزوں سے اور ہندوستانیوں سے بشرطیکہ دل ملا ہوا ہو اور کسی طرح کی مغائرت نہو - ہنسی اور چہل کیے بغیر نہ رہ سکتے تھے - یہی زندہ دلی تھی جو اُنسے ایسی سخت محنت کراتی تھی اور تکان اور ماندگی اور رنج و ملال کو کبھی پاس نہ آنے دیتی تھی - اگرچہ جس زمانہ میں ہمنے اُنکو دیکھا ہے اُنکی ہنسی اور چہل صرف باتوں میں رہگئی تھی مگر جیسا کہ سنا گیا ہے - ابتدا میں اُنکی شوخیاں صرف بات چیت ہی میں محدود نہ تھیں - کرنل گراہم جو اُنکے قدیم دوست تھے - لکھتے ہیں کہ "وہ اسقدر خوش طبعی اور تمسخر کرتا ہے جسقدر کہ کوئی آدمی کرسکتا ہے"، کبھی رات کے وقت ایک رسی سے سانپ سا بناکر حاضرین کو ڈرا دینا، کبھی پھانگ اور ڈراونی آواز سے اونگتوں کو چونکا دینا، کبھی کسی سوتے ہوئے کی چھاتی پر چڑھکر اُسپر اپنا سارا بوجھ ڈال دینا اور اسی طرح کی اور بہت سی باتیں - جن میں بعضی بیان نہیں کیجا سکتیں اُنکے دوستوں سے سُنی گئی ہیں -

بعض اوقات اُنکے ماتحت یا ملازم جنسے بے تکلفی تھی اُنکو ایسا جواب دیتے تھے جس سے اُنہیں شرمندہ ہونا چاہیئے تھا مگر وہ کبھی بُرا نہ مانتے تھے بلکہ خوب قہقہے لگاتے تھے اور خوش ہوتے تھے۔ منشی غلام نبی خاں مرحوم نے اس امر کے متعلق ایک دلچسپ نقل بیان کی، وہ کہتے تھے کہ "حافظ عبد الرحمن جو ۵۷ء میں سید صاحب کے رفیق رہے وہ رہتک میں بھی اُنکے ساتھ تھے، اگرچہ وہ سرکاری نوکر تھے مگر سید صاحب قلت تنخواہ کے سبب اُنکو اپنے پاس رکھتے تھے، اُنسے اکثر ہنسی ہنسی کی باتیں ہوا کرتی تھیں، حافظ جی اپنی ترقی کے لئے اکثر کہا کرتے۔ مگر چونکہ ترقی کی گنجایش نہ تھی۔ سید صاحب ہنسی سے یہ کہکر ٹال دیتے کہ تمہارا خط اچھا نہیں اور نہ کبھی اچھا ہو سکتا ہے کیونکہ تم بدصورت ہو اور بدصورت کبھی خوشنویس نہیں ہو سکتا۔ ایک دن حافظ جی نے کہا آپ تو ماشاء اللہ بہت وجیہ ہیں، آپکا خط کیوں اچھا نہیں؟ سید صاحب نے کہا میرے گلے کی رسولی نے میری وجاہت کو بگاڑ دیا ہے اس واسطے میں بھی بدصورت ہو گیا ہوں، پس میرا خط کیونکر اچھا ہو سکتا ہے"

"ایک دن سید صاحب نے حافظ جی سے کہا۔ بھلا صاحب اگر تم بادشاہ ہو جاؤ تو مجھے کیا عہدہ دو؟ حافظ جی نے وہ تمام سلوک۔ جو سید صاحب اُنکے ساتھ کرتے تھے۔ بیان کرکے کہا میں آپکی بڑی خاطر کرونگا دونوں وقت آپ کو اپنے ساتھ کھانا کھلاؤں، رات کو آپ کا پلنگ اپنے پلنگ کے برابر بچھواؤں اور پنکھا کروں اور چمپی کروں، سید صاحب نے کہا ان باتوں کو جانے دو، یہ بتاؤ کہ مجھے عہدہ کیا دو؟ حافظ جی نے ذرا روکھی صورت بناکر کہا حضرت اسمیں مجبور ہوں، چونکہ آپ کا خط اچھا نہیں اسلئے کوئی عہدہ نہ دے سکونگا۔ سید صاحب اور تمام لوگ یہ گرم فقرہ سنکر پھڑک گئے اور بہت دیر تک ہنستے رہے" غرض کہ سر سید نے تا مقدور کبھی غم اور رنج کو پاس نہیں آنے دیا۔ شہر میں، بیرونجات میں، آبادی میں، جنگل میں، جہاں کہیں ہوتے اُنھوں نے اپنی خوشی اور دل لگی کا کچھ نہ کچھ سامان ضرور مہیا کر لیا۔

وہ اپنی باتوں سے نہ صرف بڑوں کو بلکہ بچوں کو بھی تسخیر کر لیتے تھے، یہانتک کہ جو وحشت بچوں کو بڑے بوڑھوں کی صحبت سے ہوتی تھی وہ اُن میں باقی نہ رہتی تھی۔ اُنھوں نے اپنے بھتیجے کو، اپنے بیٹوں کو اور اخیر عمر میں پوتے کو اپنے سے ایسا مانوس رکھا کہ مائیں بھی بچوں کو اپنے ساتھ ایسا مانوس نہیں رکھ سکتیں، اُنکا برتاؤ اُن سب کے ساتھ بالکل ایسا رہا جیسا ہمجولیوں کا ایک دوسرے کے ساتھ ہوتا ہے۔ مراد آباد میں اُنکے بھتیجے کو کنکوے

لڑانے کا شوق حد سے زیادہ بڑھ گیا سرسید چاہتے تھے کہ یہ دہشت جاتی رہے مگر اُسپر جبر کرنا گوارا نہ تھا، آخرلاچار ہوکر ایک دن کہا کہ بھی آج تمھاری پتنگ بازی کی ہم بھی سیر دیکھینگے، شام کو جب کہ پیچ پڑ رہا تھا اور دونوں طرف سے ڈھیل دی جا رہی تھی۔ آپ بھی وہاں پہنچے اور ہاتھ بڑھا کر چلتی ڈور کو تھام لیا اور جب پیچ کٹ گیا تو پکار پکار کے کئی دفعہ کہا ہم ہارے ہم ہارے" یہ دیکھکر فریق ثانی کا جوش کم ہوگیا، دوسرے دن کوئی دوسرے پتنگ لڑانی کو نہ اُٹھا اور پتنگ بازی کا خاتمہ ہوا۔

سرسید کی ذہانت بھی۔ جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں۔ اُنکی لگاتار محنت اور مسلسل دماغی ریاضت کا ایک نتیجہ تھا۔ ایک یورپین مصنف نے لکھا ہے کہ "میں ایسے بہت سے لوگوں سے واقف ہوں جو بڑے ذہین مشہور تھے لیکن آخر کو یہ معلوم ہوا کہ وہ اصل میں بڑے محنتی تھے" سرسید کی ذہانت کی نسبت ایک انگریز نے سید محمود صاحب سے کہا کہ "تمہارے باپ کا دماغ گویا ہر گویا ٹائپ کے حرفوں کی الماری ہے جسطرح اُس الماری میں جس حرف کی ضرورت ہوتی ہے وہ فوراً ملجاتا ہے اسی طرح ہر سوال کا جواب اُسکے دماغ میں ہر وقت موجود رہتا ہے" فی الواقع سرسید کے انتقال ذہنی کا یہی حال تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یا تو وہ ہر ایک ضروری سوال پر جو ملک میں دائر وسائر ہوتے تھے۔ بجائے خود غور کرکے اُسکی نسبت ایک پختہ رائے قائم کرلیتے تھے اور اسلئے جب وہ سوال معرض بحث میں آتا تو اُنکو اُسکا جواب دینے میں زیادہ تامل کرنا نہیں پڑتا تھا، اور یا یہ کہ دماغی ریاضت اور برابر غور و فکر کرنے کی عادت نے انہیں یہ ملکہ پیدا کر دیا تھا کہ وہ اکثر سوالات کی نسبت ادنیٰ تامل سے ایک سنجیدہ اور معقول رائے ظاہر کرسکتے تھے۔

بہرحال یہ تمام نتیجے دائمی غور و فکر اور نور فطرت کے روشن رکھنے اور آپ اپنی تعلیم کرنے کے تھے۔ تقلید کی عادت۔ خواہ امور مذہبی میں ہو، خواہ مسائل علمی میں اور خواہ معاملات دنیوی میں۔ انسان کو کبھی اپنے اوپر بھروسا اور اعتماد کرنے نہیں دیتی۔ وہ ہمیشہ بچوں کی طرح، جو چلنے میں اوروں کا سہارا ڈھونڈھتے ہیں، ہر معاملہ میں دوسروں کا مونہ تکتا رہتا ہے۔ سرسید کو زمانہ کی ضرورتوں نے اول مذہبی تقلید سے نجات دی جس سے اُنکو مذہبی مشکلات میں اپنی طبیعت پر زور ڈالنے اور اپنی رائے اور سمجھ پر تکیہ کرنے کی ضرورت اور عادت ہوئی، پھر رفتہ رفتہ یہ عادت اونکی طبیعت ثانی ہوگئی اور ہر قسم کے سوالات

یہ غور کرنا اور سوچنا اور اپنی مستقل رائے قایم کرنا اُنکا ویترہ ہو گیا اور اسطرح اُنکے قوای عقلیہ بتدریج جلا پاتے رہے۔

سرسید کی غیر معمولی ذہانت اور بے نظیر جنییس کا سب سے بڑا ثبوت اُنکی مذہبی تحقیقات یا وہ تدبیریں ہیں جو اُنسے مدرستہ العلوم کے قایم کرنے اور اُسکو ترقی دینے میں ظاہر ہوئیں اور جنکا ذکر اس کتاب میں بقدر ضرورت اپنے اپنے موقع پر ہو چکا ہے اور اگر کسی کو انکی عالی دماغی کی مجسم تصویر دیکھنی ہو تو سید محمود کو دیکھ لینا کافی ہے جنکی نسبت مسٹر وائٹلی سٹوکس ممبر لیجس لیٹف کونسل ولیسرائے کشور ہند نے کونسل میں۔ یہ الفاظ کہے تھے "نہایت نامور باپ کا مور بیٹا" ہم یہاں صرف انکے بعض لطیف خیالات کا ذکر کرتے ہیں جنسے اُنکی طبیعت میں ایک خاص مناسبت فنون لطیفہ کے ساتھ پائی جاتی ہے۔

ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ منجملہ اُن بے شمار تدبیروں کے۔ جو چندہ وصول کرنے کیلیے اُنہوں نے وقتاً فوقتاً اختیار کیں۔ ایک تدبیر نواب مختار الملک مرحوم کی خدمت میں اُس تصویر کا بھیجنا تھا جس میں مسلمانوں کی حالت کو ایک تباہ شدہ جہاز کی صورت میں ظاہر کیا گیا تھا اور مدرستہ العلوم کو ایک کشتی کی شکل میں دکھایا تھا جو جہاز والوں کو اُس تباہی سے نکالنے کے لئے جہاز کی طرف آرہی تھی۔ اس تصویر کی مفصل کیفیت پہلے حصہ میں بیان ہو چکی ہے یہاں صرف یہ جتانا ہے کہ سرسید کا ذہن کیونکر اس خیال کی طرف منتقل ہوا؟ اُنہیں دنوں میں مدرستہ العلوم پر ایک نظم لکھی گئی تھی جس میں ایک یہ شعر بھی تھا۔

لہ یہ وہ مشہور اور نامور لیگل ممبر کونسل قانونی وایسرائے کشور ہند ہے جو ۱۰ برس کونسل ہند میں اول سکرٹری اور پھر قانونی ممبر رہا۔ انیگلو انڈین کو ڈ ۱۸۸۷ء میں اُنکا یہ فقرہ درج ہے کہ "مجھکو استعاعت کے زیادہ ذریعے ہائی کورٹ کے ججوں کے فیصلے ہوے ہیں جو انڈین لا رپورٹ میں ۱۸۸۲ء سے ۱۸۸۶ء تک چھپے ہیں، یہ ایسے فیصلے ہیں جو اہل ہند کے رسوم و خیالات ہی پر روشنی نہیں ڈالتے بلکہ عموماً (اگر میرا یہ کہنا گستاخی نہو) اپنے لاجکل استدلال اور علمیت کے لحاظ سے قابل تعریف ہیں اور اُن میں سے کسی فیصلہ کے پڑھنے سے بہ نسبت اُن فیصلوں کے زیادہ لطف اور زیادہ فائدہ حاصل نہیں ہوسکتا جو مولوی سامی ایار ہندو، اور سید محمود مسلمان کے ہیں۔ جن قوموں میں ایسے مقنن پیدا ہوے ہیں اُنکے لئے کوئی قانونی اصول ایسا باریک اور دقیق نہیں ہوسکتا جو اُنکو دشوار معلوم ہو اور کوئی طریقہ عمل درآمد قانونی ایسا پیچیدہ نہیں ہوسکتا کہ اُنکے فہم سے باہر ہو ۱۲

دوسرے امید نے جھلکی سی اک دکھلائی ہے ایک کشتی ڈوبتے بیڑے کو لینے آئی ہے

ظاہرا سرسید کو اس تصویر کے بنوانے کا خیال اسی شعر کو دیکھکر پیدا ہوا تھا کیونکہ یہ نظم اُس تصویر کے بھیجنے سے پہلے شایع ہو چکی تھی مگر شاعر کا خیال ایک عقیم اور غیر منتج خیال جس میں اس سے زیادہ کوئی کرشمہ نہ تھا کہ ایک معقول شے (یعنی تعلیم) کو ایک محسوس چیز (یعنی سفینۂ نجات) کے ساتھ تشبیہہ دی گئی تھی۔ لیکن جو مضمون سرسید نے اس سے استنباط کیا اُسکا یہ نتیجہ ہوا کہ نواب مختار الملک کے دل میں۔ جنکو اسوقت تک قومی معاملات سے چندان دلچسپی نہ تھی۔ کالج کی محبت کا بیج بویا گیا جو رفتہ رفتہ ایک گھنا اور سرسبز اور سایہ دار درخت بن گیا۔

اسی قسم کی دوسری مثال وہ بکس تھا جس میں سرجان اسٹریچی کو ہندوستان سے رخصت ہوتے وقت کالج کمیٹی کی طرف سے ایڈریس دیا گیا تھا اور جسکو سرسید نے خاص اپنی تجویز سے بنوایا تھا۔ اس بکس پر اُن جانوروں کی تصویریں کہدوائی گئی تھیں جن کے ناموں پر زمانۂ جاہلیت میں عرب کے نام رکھے جاتے تھے اور اسلئے عرب کے بہت سے قبیلے اُنہیں ناموں سے مشہور تھے، جیسے قرش یا قریش (ویل مچھلی) ثعلب (لومڑی) کلب (کتا) جمل (اونٹ) اسد (شیر) ذئب (بھیڑیا) وغیرہ وغیرہ۔ پھر ان سب تصویروں کے مونہہ سے بجائے سانس کے ایک ایک تار نکالا گیا تھا اور یہ سب تار ایک مقام پر جاکر منتہی ہوئے تھے جہاں انگریزی الفاظ میں یہ مطلب ادا کیا گیا تھا کہ "ہم سب قبیلے متفق اللفظ سرجان اسٹریچی کا شکریہ تہ دل سے ادا کرتے ہیں" اور اس سے گویا تمام مسلمانوں کی شکرگذاری کا اظہار مقصود تھا۔

اسی قبیل سے کھجور اور اونٹ کی تصویر ہے جو سب سے پہلے سرسید نے انگریزی خطبات احمدیہ کے ہر ایک خطبہ کے سرے پر ولایت میں چھپوائی تھی اور جو عرب کی خصوصیات میں شمار ہونے کے سبب ایک علامت دین اسلام کی قرار دی تھی اس میں سے کھجور کی علامت ہمنے پچھلے دنوں میں ایک چینی کی تشتری پر بنی ہوئی دیکھی تھی جس سے خیال ہوتا تھا کہ شاید اسی کتاب کو دیکھکر ولایت کے کسی کارخانہ دار نے یہ مارک اُن ظروف کے لئے اختیار کیا ہے جو ممالک عرب میں بھیجے جاتے ہیں۔ اور اسی قبیل کا وہ نشان ہے جس میں ہلال کو اور صلیب کو جو تاج قیصری میں بنی ہوئی ہے ایک جگہہ جمع کرکے مدرسۃ العلوم کے کتبوں

اور اُس کے کتب خانہ کی کتابوں پر ثبت کیا گیا ہے اور جس سے اسلام اور کرسچینیٹی کی مصالحت اور تاج قیصری کے ساتھ مسلمانوں کی وفاداری کا اظہار مقصود ہے۔

ایک اور مثال سرسید کے انتقال ذہنی کی سنہ نبوی کا بجائے سنہ ہجری کے قرار دینا اور تہذیب الاخلاق کا سال ماہ شوال سے شروع کرنا ہے۔ ظاہرا سرسید سے پہلے سنہ نبوی کا خیال کسی کے ذہن میں نہیں گذرا۔ جس زمانہ میں کہ سرسید آئین اکبری کی تصحیح کرتے تھے اُس میں ایک جگہہ سنہ ہجری کی نسبت ابوالفضل کا یہ قول اُنکی نظر سے گذرا تھا کہ "ازین سنہ بوے ناکامی مے آید" یعنی یہ سنہ آنحضرت صلعم اور تمام مہاجرین کی اُن مصائب کو یاد دلاتا ہے جنکے سبب اُنکو وطن مالوف چھوڑنا اور مکہ سے مدینہ کو ہجرت کرنا پڑا۔ اُس زمانہ میں سرسید نے ابوالفضل کے اُن الفاظ سے بہت بُرا مانا تھا اور اُسکے حاشیہ پر قائل کی نسبت لعنت یا اُسکا کوئی مرادف لفظ لکھا تھا۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ آخر کار ابوالفضل کے اسی بے ادب جملہ سے اُنکے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ تہذیب الاخلاق کا سال تاریخ بعث سے شروع کیا جائے کیونکہ درحقیقت اسلام میں کوئی واقعہ آنحضرت صلعم کی بعث سراپا برکت کے برابر اعظم الشان نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ یہ امید نہیں ہے کہ جو سنہ تیرہ سو برس تک مسلمانوں میں متداول رہا ہو اُسکی جگہہ کوئی دوسرا سنہ قایم ہوسکے مگر اس نظر سے کہ سنہ نبوی تاریخ بعث ختم المرسلین کو یاد دلاتا ہے اگر مسلمان کم سے کم سیر اور اسماء الرجال کی کتابوں اور قومی میگزینوں وغیرہ میں سنہ ہجری کے ساتھ سنہ نبوی بھی لکھا کریں تو بہت مناسب معلوم ہوتا ہے۔

اسی طرح سب سے پہلے سرسید ہی نے اُس غلطی کو محسوس کیا تھا جو سنہ فصلی اور سنہ عملی میں فرق نہ کرنے سے سرکاری دفتروں میں ہمیشہ سے چلی آتی تھی اور جیسا کہ ہم پہلے حصہ باب ۲ میں بیان کر چکے ہیں، تاریخ بجنور میں اُنہوں نے اُن مشکلات کو گورنمنٹ پر ظاہر کیا تھا جو اس غلطی سے لازم آتی تھیں۔ اگرچہ وہ تاریخ ۵۷ء کے ہنگامہ میں تلف ہوگئی تھی مگر ۱۸۶۰ء اور ۱۸۶۱ء میں جو سرکلر گورنمنٹ نے اُس غلطی کے تدارک کے لئے جاری کئے اُنسے خیال کیا جاتا ہے کہ وہ اُسی تحقیقات کا نتیجہ تھا جو سرسید نے تاریخ بجنوری میں درج کی تھی

اسی طرح کی اور بہت سی مثالیں ہیں جنسے اُنکے ذہن کی جودت اور بلند پردازی پائی جاتی ہے مگر یہاں بطور نمونہ کے اسی بیان پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

اگرچہ غدر کے بعد سرسید نے فکر شعر کی طرف کبھی زیادہ توجہ نہیں کی مگر عمارات مدرسۃ العلوم اور تہذیب الاخلاق کے پرچون وغیرہ کی تاریخون کے ایسے عمدہ عمدہ ماوے اُنھوں نے نکالے ہیں جنکو دیکھکر تعجب ہوتا ہے کہ ایسے کثیر الاشغال آدمی کا ذہن کیونکر ان تاریخوں تک پہنچا۔ ہمارا ارادہ ہے کہ اُن کی تمام تاریخون کو جمع کرکے کسی میگزین یا اخبار میں شایع کریں گے۔

اخلاق اور عقل

سب سے زیادہ گران وزن اور جامع الفاظ۔ جو کسی کی تعریف میں بولے جاسکتے ہیں اسکے سوا خیال میں نہیں آتے کہ فلان شخص اعلیٰ درجہ کا دل و دماغ رکھتا ہے۔ لیکن اکثر ان الفاظ کا استعمال اپنے محل پر نہیں ہوتا کیونکہ لیاقت۔ جو دماغ سے علاقہ رکھتی ہے۔ اور نیکی جو دل سے علاقہ رکھتی ہے۔ یہ دونون اکثر ایک جگہہ جمع نہیں ہوتیں۔ مگر سرسید میں جسطرح بعض دیگر متضاد لیاقتیں جمع تھیں، اسی طرح اسکو خدا تعالیٰ نے دل اور دماغ دونوں اعلیٰ درجہ کے عنایت کئے تھے، یہانتک کہ اُسکی نسبت یہ کہنا مشکل تھا کہ اُسمیں نیکی زیادہ ہے یا عقل۔ لیکن جہانتک غور کیا جاتا ہے اُسکی رایوں میں تو شاید خطا کی گنجایش ہو مگر اُسکے اخلاق رذائل سے بالکل پاک معلوم ہوتے تھے۔ اسی لئے مسٹر بک نے اُسکے مرنے کے بعد اپنی اسپیچ میں کہا تھا کہ "گو اُسکی لیاقتیں بہت بڑی تھیں مگر اُسکے اخلاق اُنسے بھی بڑے تھے"۔

ایک حکیم کا قول ہے کہ "جو شخص بدکاری سے پاک ہو، معاملات میں منصف ہو، بات کا پکا ہو، نامعقول پر مہربان ہو، نفس اور عماید استقلال ہو، اور بڑے بڑے کاموں پر دلیری کے ساتھ مستعد ہو۔ وہ شریف ہے"۔ اس تعریف میں اگر فیاضی کی صفت اور زیادہ کی جائے تو کچھ شک نہیں کہ وہ سرسید کے حق میں جامع و مانع ہوگی۔ جو اقتدار کہ یہ شخص محض اپنی اخلاقی طاقت سے ہزارون غیر شخصون کے دلوں پر رکھتا تھا وہ کسی کو اپنے گھر کے آدمیوں پر بھی حاصل نہیں ہوتا جس قدر اُسکے دوست اور ملنے والے تھے سب اُسکے مداح اور ثنا خوان تھے، سب اُس سے محبت رکھتے تھے، سب کو اُسپر اعتبار تھا اور سب کو اُسکا دنیا سے اُٹھ جانا ایسا ہی شاق گذرا تھا جیسے کسی خاندان کے ممبرون کو اپنے مربی اور سرپرست کا مرجانا شاق گذرتا

ہے۔ اس سے زیادہ کسی شخص کے حسن اخلاق کا کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔ سب سے بڑی دلیل اُسکی اخلاقی عظمت کی وہ غیر معمولی کامیابی تھی جو اُسکو اپنے مقاصد میں ہوئی؛ کیونکہ لیاقتیں کیسی ہی اعلیٰ درجہ کی ہوں جب تک اُنکے ساتھ اعلیٰ درجہ کے اخلاق نہوں کچھ کام نہیں آسکتیں۔

اُسنے تقریباً ساٹھ برس اپنی عمر کے۔ پبلک لائف میں بسر کیئے جن میں سے اخیر کے تیس برس ایسی حالت میں گذرے کہ ایک زمانہ اُسکی عیب جوئی کی گھات میں رہا، اور دوست اور دشمن سب کو اُسکے ادنیٰ ادنیٰ کام دیکھنے اور پرکھنے کا موقع ملا، مخالفین کی ہمیشہ یہ آرزو رہی کہ کوئی ایسی بات ہاتھ آئے جس سے سرسید کا اعتبار لوگوں کے دلوں سے جاتا رہے اور مدرسہ کی اعانت منقطع ہو جائے باوجود اسکے کسی کو ایسا موقع نہیں ملا کہ اُسکے کیرکٹر پر کوئی معقول گرفت کرتا یا اُسکے چال چلن میں کوئی فیہ نکالتا۔ سوا اسکے کہ اُسکو کافر و ملحد و نیچری و کرسٹان کہکر دل ٹھنڈا کیا گیا اور اُسپر الزام لگائے گئے جنکا علم خدا کے سوا کسی کو نہ تھا۔ کسی سے کچھ بن نہ آیا۔ جیسا کہ کہا گیا ہے رباعی

یاروں میں نہ پایا جب کوئی عیب و گناہ کافر کہا واعظ نے اُنہیں اور گمراہ
جھوٹے کو نہیں ملتی شہادت جس وقت لاتا ہے خدا کو اپنے دعوے پہ گواہ

اگرچہ انسان کے اخلاق کی تھاہ دریافت کرنی نہایت مشکل ہے مگر معاملات کی کسوٹی اور مخالفوں کی چھان بین ایسے دو معیار ہیں کہ سچ کو جھوٹ سے اور کھرے کو کھوٹے سے جدا کیئے بغیر نہیں رہتے۔ اگر سرسید کی سچائی میں رائی برابر بھی فرق پایا جاتا تو مخالف اُسکو پربت بنا دیتے مگر چند صریح تہمتوں کے سوا اسکا دامن اخیر دم تک ہر ایک داغ اور دھبے سے پاک رہا۔ شمس العلما ڈاکٹر مولانا نذیر احمد اور نواب محسن الملک نے ٹھیک لکھا تھا کہ "علم بالانساب اگرچہ علم مظنون ہے مگر اس شخص کے بارے میں تو اُسکے افعال اُسکے نسبت کی تصدیق کرتے ہیں"

اگرچہ اس بات کا انکار نہیں ہو سکتا کہ سرسید میں جہاں بہت سی خوبیاں تھیں انہیں کے ساتھ کچھ کچھ کمزوریاں بھی پائی جاتی تھیں مگر جہانتک کہ ہمکو معلوم ہے وہ اُن عیوب سے جو انسان کی خساست اور دناءت پر دلالت کرتے ہیں یقیناً پاک تھا۔ اُسکے اخلاق کا اُسکے ہمنشینوں اور جلیسوں پر اثر پڑتا تھا، اُسکو دیکھکر قومی خدمات کا جوش دلوں میں پیدا ہوتا، اُسکی جفاکشی اور مستعدی اوروں کو جفاکش اور مستعد بنا تی تھی، اُسکی سچائی اور ہمت اور

استقلال عمدہ ترین ناصح تھے جو اُس کی پیروی کرنے کی ترغیب دیتے تھے اور اگر ہمارا قیاس غلط نہو تو وہ اپنے ہائی کیرکٹر سے قوم میں عمدہ اخلاق کا بیج بو گیا ہے۔

اگرچہ سرسید کی زندگی کے واقعات سے۔ جو اس کتاب میں بیان کئے گئے ہیں اُنکے اخلاق کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے مگر یہاں ہم اُن خاص خصلتوں کا کسی قدر تفصیل کے ساتھ ذکر کرنا چاہتے ہیں جنکو اُنکی کامیابی میں بہت بڑا دخل معلوم ہوتا ہے اور جو اُسکے تمام افعال و حرکات و سکنات میں ایسی نمایاں تھیں کہ اُنسے شاید ہی اُنکا کوئی دوست اور ملنے والا انکار کر سکے۔

راستبازی

اولاً راستبازی اور وہ تمام اوصاف جو ایک راستباز آدمی میں ہونے ضرور ہیں جیسے صدق مودت، حمیت، دلیری اور آزادی وغیرہ۔ اس شخص کی خصوصیات میں سے تھے۔ کسی حکیم کا قول ہے کہ "اگر سچائی کسی مجسم شکل میں ظاہر ہوتی تو ضرور شیر کی صورت میں ظاہر ہوتی" اس قول کی تصدیق جیسی سرسید کو دیکھکر ہوتی تھی شاید ہی کسی دوسری صورت سے ہوتی ہو۔ اُسنے محض اپنی راستبازی کی بدولت ایک عالم کو اپنا مخالف بنایا مگر جس بات کو سچ جانا اُسکے کہنے میں کبھی تامل نہیں کیا۔ جس بات پر دل سے یقین کرلیا اُسی کے موافق کہا اور ویسا ہی کیا۔ جس بات میں ملک یا قوم کی بھلائی سمجھی اُسکے کہنے اور کرنے میں کسی کی مخالفت کی کچھ پروا نہیں کی۔ یہ ممکن ہے کہ سرسید سے کسی بات کے سمجھنے میں غلطی ہوئی ہو مگر جہانتک کہ اُن کی طبیعت اور جبلت کا اندازہ ہو سکتا تھا یہ بات نہایت مستبعد معلوم ہوتی تھی کہ اُنھوں نے اپنے کانشنس کے خلاف کوئی کام کیا ہو۔

وہ جب کوئی بات کسی اپنے دوست سے سچائی کے خلاف سرزد ہوتی دیکھتے تھے تو اُنکو نہایت رنج ہوتا تھا اور اکثر وہ اُسکو متنبہ کیے بغیر نہیں رہتے تھے۔ اُنکا ایک دوست۔ جو اخبار کا اڈیٹر تھا۔ اُس کے اخبار میں چند خط ایک عورت کے نام سے چھپے تھے۔ جب وہ پرچہ سرسید کی نظر سے گذرا تو اُنھوں نے اُسکو لکھا کہ "کیا آپ کو یقین دلی ہے کہ وہ خط درحقیقت کسی عورت کے لکھے ہوئے ہیں؟ اگر ایسا یقین نہیں ہے تو کیا یہ کانشنس کے برخلاف نہیں ہے کہ جس بات کو تم صحیح نہیں سمجھتے اُس کو بطور سچ کے ظاہر کرو؟ میری نصیحت یہ ہے کہ ہر ایک کام میں تم اپنے دل کو ٹٹولو کہ جو کچھ تم کہتے ہو یا کرتے ہو آپ کا دل اس کو سچ جانتا ہے یا نہیں؟ اگر نہیں جانتا اور اُسکو

سچ کے طور پر بیان کیا تو خلاف کانشنس بلکہ خلاف ایمان داری کے کام کیا - آپ مجھکو معاف کیجیے گا ، بہ سبب اس کے کہ آپ سے محبت ہے یہ کڑوی نصیحت کی ہے ،،

جب اُنکے اڈیٹر دوست نے اس نصیحت کا شکریہ لکھا تو اسکا جواب اُنہوں نے اس طرح لکھا ہے " میں اس خیال سے - کہ آپ میری کسی تحریر کا بُرا نہ مانیں گے - جو میرے دل میں آتا ہے لکھ بھیجتا ہوں - خصوصاً اپنے خاص دوستوں کی نسبت میری خواہش ہے کہ ہر اخلاق میں وہ اعلیٰ درجہ پر ہوں ؟ اور سب اخلاق سے مقدم سچائی ہے جسکے معنی یہ ہیں کہ ہم اپنے آپ کو سچا جانیں اور یہ سچائی جیسی کہ قول سے متعلق ہے ویسی ہی فعل سے بھی متعلق ہے ، ایسی ہی پرائیوٹ خطوط سے اور ایسی ہی اخبار سے ،،

اُنکے ایک نہایت عزیز اور خالص دوست کو ایک زمانہ میں ایسے افسر سے سابقہ پڑا تھا جو نماز پڑھنے پر تعرض کرتا تھا اور اس امر کی اطلاع اُنہوں نے سرسید کو بھی کی تھی اُنکو اسی باب میں سید صاحب لکھتے ہیں " بھائی ..... کل میں سارے دن متردد رہا ، کیونکہ تمہارا کوئی خط نہیں آیا تھا - آج خط آیا اور حال معلوم ہوا - گو میں کبھی وقت کی نماز پڑھتا ہوں اور کسی وقت کی نہیں پڑھتا ، اور وقت بے وقت کا بھی خیال نہیں کرتا ، دو دو اکھٹی بھی ملا کر پڑھ لیتا ہوں ، ریل میں جتنا سفر ہو مجھ سے ادا نہیں ہو سکتی ؛ یہ سب باتیں مجھ میں ہیں ، اور نالائقی اور شامت اعمال سے ایسی سستی نماز میں ہے ، مگر تم نے اس معاملہ میں - جو پیش آیا - نہایت لچرپنا کیا - نماز جو خدا کا فرض ہے اُسکو ہم اپنی شامتِ اعمال سے - جس خرابی سے ہو - ادا کریں یا قضا کریں ، لیکن اگر کوئی شخص یہ کہے کہ تم نماز نہ پڑھو اس کا صبر ایک لمحہ بھی نہیں ہو سکتا ، یہ بات سُنی بھی نہیں جا سکتی - میری سمجھ میں نماز نہ پڑھنا صرف گناہ ہے - جسکے بخشے جانے کی توقع ہے اور کسی شخص کے منع کرنے سے نہ پڑھنا یا سستی میں ڈالنا میری سمجھ میں کفر ہے جو کبھی بخشا نہ جائیگا - تم کو یا تو پہلے ہی خود اپنی شامت اعمال سے ایسا طریقہ اختیار کرنا تھا جو کبھی اس قسم کی بحث نہ آتی اور جب ایسا طریقہ اختیار نہیں کیا تھا تو پھر لجلجانا ، اور گڑگڑانا ، اور حضور رخصت ہی دیں ، تنخواہ کاٹ لیں ، کہنا واہیات تھا تڑاق سے اپنی استعفا دے دینا تھا ، صاف کہدینا تھا کہ میں اپنے خدائے عظیم الشان قادرمطلق کے حکم کی اطاعت کروں گا نہ آپ کی - کیا ہوتا ؟ نوکری نہ میسر ہوتی ، فاقے مرجاتے نہایت اچھا ہوتا والسلام ؛

سرسید نے ایک موقع پر دلی کے ایک نہایت مقدس عالم سے - جو اپنے شاگردوں اور معتقدوں کو رفع یدین کی تاکید کرتے تھے مگر خود کبھی ہاتھ نہیں اُٹھاتے تھے - کہا کہ

"حضرت نہایت تعجب کی بات ہے کہ آپ باوجود مقتدائے دین ہونے کے صرف طعن و ملامت کے خوف سے جس بات کو دل سے حق جانتے ہیں اُس کے موافق کبھی عمل نہیں کرتے - ہم ہزاروں گناہ کرتے ہیں اور دنیا کے مکروہات میں پھنسے ہوئے ہیں، مگر جو بات حق معلوم ہوتی ہے اُس کے کرنے میں ایک لمحہ توقف نہیں کرتے اور لوگوں کے طعن و ملامت سے نہیں ڈرتے" سرسید کے کہنے کا اُنکو ایسا اثر ہوا کہ اُنہوں نے اُسی روز جامع مسجد میں جاکر علی الاعلان رفع یدین کیا لیکن معلوم نہیں کہ وہ ہمیشہ اُس پر قائم رہے یا نہیں -

اس شخص نے اگر سچ پوچھیے تو اپنی آزادانہ تحریروں سے اُردو لٹریچر میں سچائی اور آزادی کی بنیاد ڈال دی اُسنے لوگوں کو مجبور کیا کہ سچ بات کے کہنے میں کسی کے طعن و ملامت سے نہ ڈریں - تہذیب الاخلاق کے جاری ہونے سے پہلے جو لوگ عام رائے کے خلاف کوئی بات کسی اخبار میں لکھنی چاہتے تھے اُس میں کبھی اپنا نام ظاہر نہ کرتے تھے اُس نے تہذیب الاخلاق میں مضمون لکھنے کی یہ شرط قرار دی کہ جو لوگ ٹٹی کے اوجھل شکار کھیلنا اور اپنا نام پبلک پر ظاہر کرنا نہیں چاہتے اُنکا کوئی مضمون اُس میں درج نہ ہوگا - نتیجہ رفتہ رفتہ لوگوں کی جھجک نکلنی شروع ہوئی؛ یہانتک کہ ہر شخص اپنے نام سے کُھلم کُھلا اپنے خیالات ظاہر کرنے لگا - اور بڑے بڑے لایق اور ذی علم اور دیندار لوگ صدہا مضمون عام رائے کے برخلاف اپنے نام سے شایع کرنے لگے -

بعضے لوگ یہ سمجھتے تھے کہ سرسید نے جو قرآن کی تفسیر میں اکثر آیات کے معنی جمہور کے خلاف بیان کیے ہیں اسپر اُنکو خود یقین نہیں ہے بلکہ صرف یہ مقصود ہے کہ قرآن پر سائنس کی روسے کوئی اعتراض وارد نہ ہو - یہ حال سرسید کو بھی معلوم ہوا، اُنہوں نے نہایت جوش میں آکر کہا کہ" اگر دین اسلام کے حق ہونے میں مجھے ذرہ برابر بھی شک ہوتا تو میں فوراً اسلام کو ترک کر دیتا" وہ سید مہدی علی خاں کو ایک خط میں لکھتے ہیں" میں سچ اپنے دل کا حال لکھتا ہوں، اگر خدا مجھکو ہدایت نہ کرتا اور تقلید کی گمراہی سے نہ نکلتا اور میں خود تحقیقات حقیقت اسلام پر متوجہ نہ ہوتا تو یقینی مذہب کو چھوڑ دیتا"

اُس نے اپنی راستی اور صفائی گوئی سے صرف اُن مسلمانوں ہی کو مخالف نہیں بنایا جو پُرانے خیالات رکھتے تھے اور جنسے کسی طرح موافقت کی امید نہ تھی بلکہ جو بات اُسکو حق معلوم ہوئی اُسکے کہنے میں کبھی اس بات کا خیال نہیں کیا کہ دنیا میں کوئی دوسرا شخص

بھی اس بات میں میرے ساتھ اتفاق کرنے والا ہے یا نہیں۔ نیشنل کانگرس کے خلاف لکچر دینے سے پہلے تمام تعلیم یافتہ ہندو بنگالہ سے کشمیر تک سرسید کو ملک کا سچا خیرخواہ جانتے تھے اُنکی نہایت تعریف کرتے تھے، مسلمانوں کی نسبت بہت زیادہ اُنکی قدر کرتے تھے، اخباروں میں اُنکی نسبت مدحیہ آرٹکل چھاپتے تھے، اپنی قومی مجلسوں کی طرف سے اُن کے سامنے ایڈریس پیش کرتے تھے۔ پبلک اسپیچوں میں انکا ذکر خیر کرتے تھے، سرسید کو معلوم تھا کہ اگر کانگرس کے خلاف ایک حرف بھی کہا تو کم سے کم تعلیم یافتہ ہندو قاطبۃً مخالف ہو جائینگے۔ مگر جب اُنکو پختہ یقین ہو گیا کہ کانگرس کی اکثر خواہشیں ناممکن الوقوع اور خاصکر مسلمانوں کے حق میں مضر ہیں اور مسلمانوں کا اُسمیں شریک ہونا پولٹکل خطرات کا باعث ہوگا اُنہوں نے نہایت زور شور سے مسلمانوں کو اُسکی شرکت سے روکا اور کانگریشین گروہ کی ناراضی کا کچھ خیال نہ کیا۔ بنگالیوں نے اُن کو خود غرض خوشامدی اور ٹائم سرور سب کچھ کہا، صدہا آرٹکل بنگالی اخباروں میں اُن کے برخلاف چھپ گئے کے۔ سی۔ اس۔ آئی کا خطاب جو حضور ملکۂ معظمہ قیصر ہند نے اُن کو عنایت فرمایا اُسکو بنگالیوں نے کانگرس کی مخالفت کرنے کا صلہ قرار دیا، مسٹر ہیوم جو سرسید کے دوست تھے وہ اُن سے سخت بدگمان ہو گئے، بعضے ایجوکیٹڈ مسلمان بھی اُن کی طرف سے کھٹک گئے، مگر سرسید نے کسی بات کی کچھ پروا نہیں کی اور جہانتک ممکن تھا مسلمانوں کو کانگرس میں شریک ہونے نہیں دیا۔

سرسید کو کوئی بات اس سے زیادہ شاق نہیں گذرتی تھی کہ اُنپر راستبازی کے خلاف کوئی الزام لگایا جائے کیونکہ یہ شخص فی الواقع راستی کو اپنا دین و ایمان سمجھتا تھا۔ جس زمانہ میں وہ ولایت میں تھے اُنہوں نے ہندوستان کے طریقۂ تعلیم پر۔ جو اُسوقت یہاں جاری تھا۔ ایک پمفلٹ لکھ کر شائع کیا تھا جس میں ہندوستان کے طریقۂ تعلیم پر بہت کچھ نکتہ چینی کی تھی؛ ازانجملہ ایک دیہاتی مدرسہ کی نسبت۔ جس کا اُنہوں نے ہندوستان میں خود معائنہ کیا تھا۔ یہ لکھا تھا کہ مکان مدرسہ میں گائے بندھی ہوئی تھی اور مدرس اور لڑکے سب غیر حاضر تھے۔ وہ پمفلٹ جب ہندوستان میں پہنچا تو سر ولیم میور۔ جو اُس وقت شمالی مغربی اضلاع میں لفٹنٹ گورنر تھے۔ اُنکی نظر سے بھی گذرا۔ چند روز بعد اُنہوں نے ایک پبلک اسپیچ میں کہا کہ "میں نے ضلع میں دورہ کرتے ہوئے کافی طمانیت حاصل کی ہے کہ تعلیم کی حالت عمدہ

ہے اور اُس محنت اور کوشش کے نشان ظاہر ہیں جو سید احمد خاں کے نتائج کے مخالف ہے"

یہ اسپیچ مع اُردو ترجمہ کے اخبار میں چھپکر ولایت پہنچی اور سرسید کی بھی نظر سے گذری ترجمہ کے الفاظ سے وہ یہ سمجھے کہ سر ولیم میور نے مجھپر دروغگوئی کا الزام لگایا ہے۔ انکو نہایت رنج ہوا اور جب ہندوستان میں واپس آئے تو الہ آباد میں ہز آنر سے ملنے نہیں گئے سیدھے بنارس چلے گئے۔ ہز آنر کے پرائیوٹ سکرٹری کی چٹھی سرسید کے نام بنارس میں پہنچی جسمیں لکھا تھا کہ "نواب لفٹنٹ گورنر آپ کے مع الخیر ہندوستان میں پہنچنے سے خوش ہوئے ہیں اور آپ کی خیریت اور سید محمود کی تعلیم کا حال معلوم کرنے کے خواہشمند ہیں اور اپنک انتظار کر رہے ہیں"

سرسید نے اس کے جواب میں نہایت صفائی سے تمام وجہ اپنے خط نہ بھیجنے اور ملنے نہ آنے کی اور سید محمود کی تعلیم کی کیفیت مفصل لکھ بھیجی۔ یہ چٹھی ۷ نومبر کی تھی، سر ولیم نے نویں نومبر کو اُسکا جواب اپنے ہاتھ سے لکھا جس کا ترجمہ یہ ہے۔

"مائی ڈیر سید احمد! آپ کی ساتویں نومبر کی چٹھی نے مجھکو اس قدر حیران اور رنجیدہ کیا کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ اس بات کے کہنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ میں نے خواب میں بھی آپ پر کسی خلاف واقع بات کہنے کا الزام لگانے کا خیال نہ کیا ہوگا۔ میں اُن نتائج سے جو آپ نے نکالے ہیں اب بھی اختلاف رکھتا ہوں مگر اس سے آپ پر کوئی الزام لگانا ظاہر نہیں ہوتا"

"مجھکو نہایت افسوس ہے کہ آپ نے فوراً مجھکو براہ راست کیوں نہ لکھا، آپ کے ایسا نہ کرنے سے مجھکو اور بھی رنج ہوتا ہے، گویا آپ نے اس قدر اعتبار اور بھروسا مجھپر نہ کیا جسکی میں آپ سے ہمیشہ امید کرتا تھا اور شاید امید کرنے کا حق بھی رکھتا تھا"

"مسٹر بریکلی نے اُردو الفاظ کا مطلب مجھپر ظاہر کیا تھا اور میں نے ایک نوٹ لکھا تھا جس میں ظاہر کر دیا تھا کہ میں نے ایک لمحہ بھی کسی ایسے مطلب کا خیال نہیں کیا تھا اور میں نے اپنی تحریر کو۔ جس طرح پر ضرورت ہو۔ استعمال کرنے کی اجازت دیدی تھی۔ چونکہ اس معاملہ کا اس سے زیادہ کوئی تذکرہ نہیں

لہ سرسید نے اپنے پمفلٹ میں ایک دیہاتی مدرسہ کے معائنہ سے۔ جہاں گاے بندھی ہوئی اور مدرس اور طلبہ غیر حاضر تھے۔ یہ نتیجہ نکالا تھا کہ ہندوستان کے عام دیہاتی مدارس کی یہ حالت ہے مگر سر ولیم میور اس نتیجہ کو صحیح نہیں سمجھتے تھے نہ یہ کہ جس گانوں کے مدرسہ کا انھوں نے پمفلٹ میں حوالہ دیا تھا اُنکا وہ بیان غلط تھا ۱۲

ہوا میں نے خیال کیا کہ وہ اظہار کافی تھا اور گزٹ سرکاری میں اُس کے شائع کرنے کی کوئی ضرورت نہیں سمجھی"

"کیپٹن للنگسٹن آپ کو اس مضمون کے متعلق مندرجۂ بالا خط کتابت کے حوالہ سے آیندہ لکھیں گے اس وقت میں صرف اتنا کہونگا کہ میں آپ کے بیٹے کے ایسے عمدہ حالات سننے سے نہایت خوش ہوا ہوں اور آپ کو اسطرف یا جب کبھی میرا کیمپ بنارس میں پہنچے تو وہاں دیکھ کر خوش ہونگا"

سرسید نے اس چٹھی کا فوراً شکریہ ادا کیا اور لکھا کہ "آپ کے عنایت نامہ سے تمام بوجھ میرے دل پر سے اُٹھ گیا ہے"

کرنل گرہیم یہ تمام واقعہ اپنی کتاب میں نقل کر کے لکھتے ہیں کہ "سر ولیم نے سید احمد خاں کو اجازت دیدی تھی کہ میری چٹھی کو جس طرح چاہیں شائع کر دیں۔ اگر کوئی اور دیسی جنٹلمین ہوتا تو فوراً ایسا کرتا مگر سید نے اُس کو پڑھکر ڈال دیا اور مجھکو بڑی تلاش سے وہ چٹھی ملی"

کرنل موصوف کا یہ خیال ہندوستانیوں کے کیرکٹر کی ناواقفیت پر مبنی ہے۔ بے شک ایسی طبیعت اور ایسے رتبے کے ہندوستانی جیسے کہ سرسید تھے بہت کم نکلیں گے کہ ایک موہوم شبہہ پر صوبہ کے گورنر سے ناراضی کا اظہار کر بیٹھے اور گورنر کی طرف سے ایسی مہربانی کے ساتھ اُن کی دلجوئی کی گئی مگر ہندوستانی شرفا میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو محض اپنی نمود کے لیے حکام کی ایسی تحریروں کا شائع کرنا۔ جیسی کہ سر ولیم کی تحریر سرسید کے نام تھی۔ نہایت سبک اور حقیر بلکہ ایک کمینہ حرکت سمجھتے ہیں۔

اسی طرح کا ایک معاملہ ولیم صاحب کمشنر میرٹھ کے ساتھ گذرا۔ جب سائنٹفک سوسائٹی علیگڑہ کا مکان بنکر تیار ہوا تو صاحب ممدوح کو اوسکے افتتاح کی رسم ادا کرنے کیلیے بلایا گیا تھا۔ اُنکے دل میں عنایت اللہ خاں مرحوم رئیس بھیکن پور ضلع علیگڑہ کی طرف سے ایام غدر کے متعلق کچھ شبہات تھے، اس لیے وہ افتتاح کی رسم میں انکا شریک ہونا نہیں چاہتے تھے اُنہوں نے سرسید سے کہا کہ "اس جلسہ میں اگر عنایت اللہ خاں شریک ہونگے تو ہم نہیں آنے کے" سرسید نے کہا "یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ جس شخص نے نہایت فیاضی سے سوسائٹی کی امداد کی ہے اور جو اس کا پریسیڈنٹ بھی ہے اُس کو شریک نہ کیا جائے" اُنہوں نے ہرگز اس بات کو گوارا نہ کیا کہ عنایت اللہ خاں مرحوم کی عدم موجودگی میں افتتاح کی رسم ادا کی جائے۔ آخر مسٹر بریلی نے۔ جو علیگڑہ میں سشن جج تھے اور سوسائٹی کے بڑے معاون اور سرسید کے دوست تھے۔ بڑی مشکل

سے صاحب کمشنر کو راضی کیا اور اُنکو عنایت اللہ خاں کی موجودگی میں یہ رسم ادا کرنی پڑی سرسید کا اس باب میں اصرار کرنا زیادہ تر اسوجہ سے تھا کہ اُنکے نزدیک صاحب کمشنر کے شبہات محض بے اصل سے تھے اور وہ خود عنایت اللہ خاں کو ہر ایک الزام سے پاک صاف جانتے تھے۔

جن یوروپین افسروں نے ابتدا میں مدرستہ العلوم کی مخالفت کی تھی یا اُس کے لیے سرکاری زمین ملنے میں مزاحم ہوئے تھے سرسید نے اُنسے پرائیوٹ طور پر ملنا جلنا ترک کر دیا تھا اور کبھی اُنکے ساتھ ظاہرداری کا برتاؤ نہیں کیا؛ یہانتک کہ ہم نے سنا ہے کہ جب حضور سرجان اسٹریچی ہندوستان سے ولایت کو جانے لگے اور کالج کمیٹی علیگڑھ کی طرف سے اُنکو ایڈریس دینا قرار پایا تو جو مسودہ ایڈریس کا انعقاد جلسہ سے پہلے سرسید نے لکھکر جناب ممدوح کے ملاحظہ کے لیے بھیجا تھا اُس میں جہاں کالج کے محسنوں کا شکریہ لکھا تھا اُن افسروں کی شکایت بھی صراحۃً یا کنایۃً لکھی تھی جو اُس میں خلل انداز ہوئے تھے۔ اگرچہ جناب ممدوح کے ایما سے آخر کار وہ شکایت آمیز الفاظ سرسید کو مسودہ میں سے نکالنے پڑے مگر سرسید نے ہز آنر سے صاف صاف کہدیا کہ جس طرح ہم اپنے محسنوں کا احسان نہیں بھول سکتے اسی طرح نامہربان افسروں کی شکایت ہمارے دل سے فراموش نہیں ہوسکتی۔

سرسید نے یوروپین ڈریس۔ جیسا کہ پہلے لکھا جاچکا ہے۔ محض انگریزوں کی تقلید سے اختیار نہیں کیا تھا، بلکہ زیادہ تر اُسکا منشا یہ تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کا قومی لباس اُنکے ہم وطن قوموں سے مختلف ہونا چاہیے؛ اور چونکہ مصر و قسطنطنیہ و ایران اور اکثر ممالک اسلامیہ میں مسلمان ٹرکش ڈریس یا اُس کے قریب قریب پہنتے ہیں۔ اس لیے اُنھوں نے خود ترکی لباس اختیار کرکے اپنی قوم کے لیے ایک مثال قائم کی تھی۔ باوجود اسکے کہ اُنکو اس فیشن کے سبب اکثر مواقع پر سخت مشکلات پیش آئیں مگر اُنھوں نے جو وضع مسلمانوں کے لیے مناسب سمجھکر اختیار کی تھی اُس سے کبھی سرِمو تجاوز نہیں کیا۔ دلی میں دربار قیصری کے موقع پر۔ جب کہ حضور نظام کو کالج کمیٹی کی طرف سے سپاس نامہ دیا گیا۔ سرسید اُسکو خود صرف اسوجہ سے پیش نہ کرسکے کہ وہاں جوتا اُتار کر جانا ضرور تھا۔ چنانچہ کمیٹی کے اور ممبروں نے سپاس نامہ پیش کیا اور سرسید اُنکے ساتھ شریک نہیں ہوئے۔ بنارس کے کمشنر مسٹر ٹی کارمیکل سے وہ جوتا پہنکر آنے کی شرط پر ملے، حالانکہ کمشنر موصوف جوتا اوتروائے بغیر کسی ہندوستانی کو اپنے بنگلے میں نہ آنے دیتے تھے۔ مسٹر واشن جب تک علیگڑھ میں کلکٹر رہے ہم نے سنا ہے کہ سرسید

کبھی اُن سے نہیں ملے، کیونکہ وہ چاہتے تھے کہ سید احمد خاں جوتا اُتار کر اُنکے کمرے میں جائیں مگر اُنہوں نے اسکو منظور نہیں کیا - نواب کلب علی خاں مرحوم رئیس رام پور کے ہاں صرف چندے کی غرض سے وہ اُس وقت گئے تھے جب کہ مدرسہ نہایت بے سروسامانی کی حالت میں تھا اور امداد کی نہایت اشد ضرورت تھی - نواب صاحب کے دربار کا قرینہ یہ تھا کہ وہ خود پلنگڑی پر بیٹھے رہتے تھے اور جو شخص ملنے جاتا تھا اُس کو فرش پر دوزانو بیٹھنا پڑتا تھا، ہمنے سنا ہے کہ سرسید نے جب تک کرسی پر بیٹھنے اور جوتا پہنے رہنے کی اجازت حاصل نہیں کرلی وہاں جانے کا ارادہ نہیں کیا -

سرسید جیسے خود راستباز تھے اسی طرح راستبازوں کی دل سے قدر کرتے تھے - جس زمانہ میں وہ مسٹر کرک کی جگہ صدرامین مقرر ہو کر رہتک گئے ہیں اُس وقت خان بہادر منشی غلام نبی خاں مرحوم رئیس میرٹھ وہاں نوکری کے امیدوار تھے پھر چند روز بعد وہ نائب سررشتہ دار کلکٹری مقرر ہو گئے تھے - اُس وقت حسنِ اتفاق سے رہتک میں چند لایق اور ذی علم اہلکار سرکاری دفتروں اور عدالتوں میں موجود تھے جنکی سرسید کے ہاں آمد و رفت تھی - خان بہادر نے اُن سے یہ خواہش کی کہ مجھے سید صاحب سے ملوادو - اُنہوں نے کہا بہت اچھا مگر وہ لامذہب ہیں - یہ فقہا کی اصطلاح[1] سے ناواقف تھے اُنہوں نے یہ سمجھا کہ سید صاحب قید اسلام سے آزاد ہیں ایک دن سید صاحب اور دیگر اہلکار ایک جگہ جمع تھے نماز کا وقت آگیا، سب نے سید صاحب کو امام بنایا منشی غلام نبی خاں چونکہ نہایت کھرے اور سچے آدمی تھے اُن کو تعجب ہوا کہ ان لوگوں نے ایک لامذہب (یعنی غیرمسلم) کو کس طرح امامت پر کھڑا کر دیا - جوہیں سرسید نے نیت باندھی اُنہوں نے الگ چادر بچھا کر نماز پڑھنے کا ارادہ کیا - سرسید نے نماز ہی میں یہ معلوم کر کے نیت توڑ دی اور منشی صاحب سے کہا کہ آپ نماز پڑھائیے - اُنہوں نے کہا میں امامت کی لیاقت نہیں رکھتا، لیکن آپ اپنا مذہب مجھے بتلائیں، اُسوقت اگر میرا دل ٹھکیگا تو میں خود آپ کا مقتدی ہونگا ورنہ مجھے معاف فرمائیگا سید صاحب نے کہا میں شافعی مذہب رکھتا ہوں - منشی صاحب نے کہا تو بسم اللہ میں آپ کے

---

[1] مذہب کا لفظ جو آجکل دین کے معنوں میں بولا جاتا ہے فقہا کی اصطلاح میں اسکے یہ معنی نہیں ہیں بلکہ وہ ائمہ اربعہ میں سے ہر ایک امام کے طریقہ کو مذہب کہتے ہیں اور اسی لیے وہ لامذہب اُس کو کہتے ہیں جو کسی خاص امام کے طریقہ کا پابند نہو ۱۲

پیچھے بڑی خوشی سے نماز پڑھونگا۔ آخر سرسید ہی نے نماز پڑھائی۔

یہ واقعہ منشی صاحب نے مجھسے خود بیان کیا تھا اور کہتے تھے کہ "اس موقع پر میری یہ صفائی دیکھکر سید صاحب مجھپر حد سے زیادہ مہربان ہو گئے تھے۔ باوجودیکہ میں اُسوقت اُن کے ایک ادنی ماتحت اہلکار کی حیثیت رکھتا تھا۔ جس روز میں اُنکی خدمت میں حاضر ہوتا وہ بلاتکلف میرے مکان پر تشریف لے آتے تھے، حالانکہ اُنکی عادت کسی کی سفارش کرنے کی نہ تھی باوجود اسکے اُنہوں نے گنتری صاحب جنٹ مجسٹریٹ رہتک سے ایک نہایت نازک توقع پر میری سفارش کی، دوسری دفعہ جو وہ ایک مہینے کے لیے رہتک بدل کر گئے تو مکان علحدہ کرایہ کو نہیں لیا بلکہ صرف اس نظر سے۔ کہ وہاں کے لوگوں کی نگاہ میں میری وقعت زیادہ ہو۔ میرے ہی غریب خانہ پر آکر اُترے، اور مہینے بھر تک وہیں قیام کیا۔ پہلی دفعہ جب وہ علحدہ مکان میں رہتے تھے ایک روز میں سخت بیمار ہو گیا تھا جس سے پیشاب اور پاخانہ بند ہو گیا، مجھے نوکر ہوئے چند روز گذرے تھے اور میری تنخواہ صرف تیس روپیہ ماہوار تھی اور ایک آدمی کے سوا کوئی نوکر نہ تھا غرض کہ عجیب بیکسی کی حالت تھی، صدر امینی کے ناظر نے۔ جو میرے مکان کے قریب رہتا تھا۔ میرے حال کی اطلاع پاکر سید صاحب کو رات کے نو بجے خبر کی۔ تھوڑی دیر بعد کیا دیکھتا ہوں کہ سید صاحب یونانی حکیم کو ساتھ لیے چلے آتے ہیں اور ہوسپٹل اسسٹنٹ کو جلنانہ سے لانے کے لیے آدمی بھیجکر آئے ہیں تھوڑی دیر میں ڈاکٹر بھی آگیا مگر حکیم کو دیکھکر ڈاکٹر نے کہا کہ اگر اُنکے علاج سے فائدہ نہو تو مجھے پھر اطلاع دی جائے اور یہ کہکر چلا گیا، اتفاق یہ کہ حکیم صاحب کے علاج سے کچھ نفع نہوا، سید صاحب نے ڈاکٹر کو پھر بلایا اور رات کے دو بجے اُس نے آکر جلاب دیا یہانتک کہ صبح کی نماز کے وقت جاکر مجھے اجابت ہوئی اور میری تکلیف بالکل رفع ہو گئی۔ سید صاحب تمام رات میرے غریب خانہ پر جاگتے رہے اور جب مجھے افاقہ ہو لیا تو صبح کی نماز پڑھکر اپنے مکان پر تشریف لے گئے۔ جس شفقت اور بزرگانہ عنایت کے ساتھ اُنھوں نے میری تیمارداری میں وہ رات بسر کی اُس کو میں تمام عمر فراموش نہ کرونگا"

منشی صاحب کہتے تھے کہ" دلی میں مولوی امام بخش صہبائی نے سید صاحب سے پوچھا کہ تم نے غلام نبی میں کیا بات دیکھی جو اُسپر اسقدر مہربان ہو، سید صاحب نے کہا، کچھ نہیں صرف اتنی بات ہے کہ جیسا میں سڑا ہوں[۱] ایسا ہی وہ سڑا ہے"

---

[۱] چونکہ سچا آدمی مصلحت اندیش نہیں ہوتا اور اپنے کھرے پن سے لوگوں کو اپنا مخالف بنالیتا ہے اسلیے اُنھوں نے آپ کو اور منشی صاحب کو سڑا یعنی دیوانہ قرار دیا ۱۲ -

جس زمانہ میں کہ سرسید انگلستان میں تھے اور اُنکی آزادانہ تحریریں جو ہندوستان میں آکر بذریعہ سوسائٹی اخبار کے شایع ہوتی تھیں اُنپر چاروں طرف سے اعتراضوں کی بوچھار پڑتی تھی اُن دنوں میں مولوی سید مہدی علی خاں اُنکو برابر مخالفت کے خط بھیجتے تھے کہ ایسی تحریریں یہاں نہ بھیجنی چاہئیں۔ ایک دفعہ اُنہوں نے گردن مڑوڑی مرغی کا ذکر نہایت صفائی اور آزادی سے لکھ بھیجا جس پر یہاں بہت سے لے دے ہوئی اور مولوی صاحب ممدوح نے اپنے خط میں اُس تحریر پر بہت افسوس ظاہر کیا۔ اس کے جواب میں سرسید نے اُنکو ایک لطیف تحریر بھیجی ہے جسکے چند فقرے یہاں نقل کیے جاتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں ''جن لفظوں میں میں نے غیر ذبح کی ہوئی مرغی کھانے کا ذکر لکھا اور جسنے آپ کو افسوس ہوا اُسکا عذر کرتا ہوں اور معافی چاہتا ہوں، ہاتھ جوڑکر ہندوستانی طور پر نہ شرعی طور پر توبہ کرتا ہوں۔ افسوس کہ مجھے ایسے لفظ لکھنے نہ آئے جسنے آپکو افسوس نہ ہوتا۔ برائے خدا معاف کیجیے، جب میں وہ لفظ لکھ رہا تھا تم میرے دل میں اور میری آنکھوں کے سامنے تھے۔ میں جانتا تھا کہ تم ناپسند کروگے۔ بھائی! کیا تم یہ بات پسند کرتے ہو کہ میں بُرا کروں اور اُسکو اس لیے چھپاؤں کہ لوگ بُرا نہ کہیں؟ ہم کو اپنے خدا سے معاملہ ہے جسکے ہاتھوں سے ایسے تنگ آئے ہیں کہ کچھ بیان نہیں ہو سکتا جو کام کرتے ہیں وہ دیکھتا ہے، جو بات کہتے ہیں سن لیتا ہے، جو دل میں لاتے ہیں جان لیتا ہے، ایسا پیچھے چمٹا ہے کہ نہ جہاز میں چھوڑے، نہ زمین پر چھوڑے، نہ رات کو الگ ہو، نہ دن کو الگ ہو، نہ غیر ذبح مرغی کھاتے وقت پیچھا چھوڑے۔ پس جب میں نے نہایت سچے دل اور درست اعتقاد سے ایسے دوست اور سچے رفیق خدا سے شرم نہ کی تو پھر بھائی مہدی علی سے کیا ڈر کرتا؟ میں اُس کو قرآن مجید سے جائز سمجھتا ہوں نہ روایت شاذہ سے۔ والیِ مصر کے ساتھ بعض علماء بھی تھے، سب انگریزوں کے ساتھ غیر ذبح کئے ہوئے جانور چٹ کرتے تھے۔ بہرحال میں اس میں گفتگو نہیں کرتا، شاید میں غلطی پر ہوں۔ صرف معافی چاہتا ہوں''

(نمبر ۱) دوسرے محبت اور الفت کا مادہ سرسید میں معمولی آدمیوں سے بہت زیادہ تھا اور اسی لیے اُن کے تمام تعلقات میں محبت کا ظہور بدرجۂ غایت پایا جاتا ہے۔ وہ اپنے ایک دوست کو ایک دوسرے دوست کی نسبت جس سے کچھ شکر رنجی ہوگئی ہے۔ لکھتے ہیں۔

''وہ دوستی و محبت کے معاملات و برتاؤ سے محض ناواقف ہیں کسی پر وہ عاشق نہیں ہوئے، کسی سے اُنہوں نے دل نہیں لگایا، اُنکو مزا دوستی اور محبت کا مطلق معلوم نہیں ہے یہ ہے کہ جس شخص نے ایک گھڑی بھی عشق نہیں برتا وہ نہ خدا کی دوستی کا مزا جانتا ہے نہ انسان کی دوستی کا اور نہ محبت کے لائق ہے''

۔ ایک اور خط میں - جو سید مہدی علی کا مضمون گردن مڑوڑی مرغی کے برخلاف اخبار میں دیکھکر اُنکو لکھا ہے - وہ لکھتے ہیں "آپ نے جو کچھ میرے مُردار مرغی کھانے کی نسبت اخبار میں لکھا آپ یقین کیجیے کہ اُس نے عجب لطف مجکو دیا ہے - پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ کبھی دولتِ عشق مجازی بھی تم کو نصیب ہوئی ہے یا نہیں ؟ کیونکہ بغیر اُس کے آدمی میں اور مٹی میں کچھ فرق نہیں ہے "

اہل و عیال انسان کی محبت سب سے پہلے اپنے کُنبے کے ساتھ ظاہر ہوتی ہے جو کہ ایک نیچرل تعلق ہے کسی کا قول ہے کہ "جسکے دل میں اپنے کنبے کی محبت نہیں اُسکو کسی سے محبت نہیں" سرسید کو ہمیشہ اپنے کنبے کے ساتھ حد سے زیادہ لگاؤ رہا ہے - بھائی کی موت کا صدمہ اُن کو بیس برس تک نہیں بھولا - سُنا ہے کہ اُنکے عزیز اُنکے سامنے بھائی کا ذکر اس لیے نہیں کرتے تھے کہ اُنکا داغ تازہ ہو جائیگا - بہت مدت کے بعد اُنکی بھتیجی کے منہ سے باپ کا کچھ ذکر نکل گیا تھا ، سرسید کی حالت ایسی متغیر ہوگئی کہ گویا آج ہی بھائی کا انتقال ہوا ہے -

بھائی کے مرنے کے بعد اُنہوں نے صغیر سن بھتیجے کو اس طرح پرورش کیا جیسے مائیں اپنے بچوں کو پرورش کرتی ہیں - باوجودیکہ بھائی زندہ تھیں بھتیجے کو کبھی اپنے سے جدا نہیں کیا سفر و حضر میں ہمیشہ اپنے ساتھ رکھا ، مدتوں اپنے ساتھ ایک پلنگ پر سلایا ، اور ہر طرح سے اُسکی دلداری اور دلجوئی کی - غدر میں جب سارا کنبہ دلی میں تھا اور آپ بجنور میں تھے اُس وقت بھی بھتیجے اُنکی جان کے ساتھ تھا -

جب سرسید کی بی بی[1] کا انتقال ہوا اُسوقت اُنکی عمر کچھ اوپر چالیس برس کی تھی اور تین صغیر سن بچے جنکی پرورش اور رکھ رکھاؤ اکیلے باپ سے ہونا سخت دشوار تھا - موجود تھے ، ہرچند دوستوں نے سمجھایا کہ دوسری شادی کر لو ، تاکہ اپنی زندگی بھی آسائش سے گذرے اور بچوں کی پرورش میں بھی آسانی ہو ، مگر محبت اور وفاداری نے ہرگز اجازت نہ دی اُنکے ایک دوست کا بیان ہے کہ "میں اُنکو ہمیشہ دوسرے نکاح کی ترغیب دیا کرتا تھا ، وہ سنکر ہنسی میں ٹال دیتے تھے ، ایک دن وہ برآمدہ میں ٹہل رہے تھے ، میں نے پھر وہی ذکر چھیڑا ، اُنہوں نے دردناک لہجہ میں کہا کہ "محمود کی ماں کہاں سے آدے گی "

---

[1] سرسید کی بی بی - جیسا کہ معتبر ذریعوں سے سنا گیا ہے - فی الواقع ایسی نیک سرشت اور لایق بیوی تھیں جنکے بعد سرسید کا دوسرا نکاح کرنا بہ نسبت نکاح نہ کرنے کے زیادہ تعجب انگیز ہوتا - وہ بھی اُسی نانا کی نواسی تھیں جسکے سرسید نواسے تھے اور اس لیے نیک دلی اور عالی حوصلگی دونوں میاں بیوی میں یکساں پائی جاتی تھی - سرسید کے بعض احباب کا بیان ہے کہ اگر کبھی سرسید کی غیبت میں اُنکے مکان پر جانا ہو گیا ہے تو ہماری ویسی ہی مدارات ہوئی ہے جیسی اُنکی موجودگی میں ہوتی تھی ، ہم کو بالکل یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا سرسید صاحب خود مکان پر موجود ہیں -

پھر میں نے یہ ذکر کرنا چھوڑ دیا

جب وہ انگلستان گئے تو وطن سے بیٹی کی سخت بیماری کا تار پہنچا، اُنہوں نے فوراً وہاں سے تار دیا کہ اگر ہمارے پہنچنے تک اُسکے بچنے کی امید ہو تو ہم واپس ہندوستان آنے کو تیار ہیں مگر دوسرا تار اُسکے مرنے کا پہنچا جس سے اُنکو ایسا سخت صدمہ ہوا کہ جب تک ولایت میں رہے غمگین اور افسردہ خاطر رہے اور جب ولایت سے واپس آئے تو دلی جانے کو ہرگز جی نہ چاہتا تھا، باوجودیکہ اُن دنوں میں دیوانی کی بڑی تعطیل تھی۔ صرف ایک دو روز دلی میں ٹھیرے، اور ساری تعطیل علیگڑھ، مرزاپور اور بنارس میں بسر کی۔

اپنی والدہ کے ساتھ جیسی اُنکو دلبستگی تھی ایسی بہت ہی کم سُنی گئی ہے اور جیسی کہ وہ جوانی میں ماں کی اطاعت کرتے تھے اور اُنکے غصہ اور خفگی کی برداشت کرتے تھے اس طرح بچے بھی اپنے ماں باپ کا کہنا نہیں مانتے۔ وہ کہتے تھے کہ مجھکو ماں کے مرنے کا اتنا رنج نہیں ہوا جتنا کہ بھائی کے مرنے کا ہوا تھا، کیونکہ غدر کے مصائب کا زمانہ تھا اور ہر وقت یہ خیال رہتا تھا کہ ایسا نہو میں پہلے مرجاؤں اور میری والدہ کی زندگی تلخی اور سختی میں گذرے اُنہوں نے مرنے سے چند سال پہلے میرٹھ میں۔ جہاں اُنکی والدہ مدفون ہیں۔ ایک پبلک اسپیچ میں اپنی ماں کا ذکر کیا، معاً اُنکا دل بھر آیا اور اس بڑھاپے میں اُنکو ماں کے ذکر پر روتا دیکھکر لوگ متعجب ہوگئے۔ بھائی کے نواسوں کی نہایت شفقت کے ساتھ اُنہوں نے سرپرستی کی اور اُن کو اعلیٰ درجہ کی تعلیم دلوائی، اپنے خالہ زاد بھائی کے نواسوں کو اُنہوں نے بالکل اپنی اولاد کی طرح اپنے پاس رکھا اور جب تک وہ انگلستان نہیں گئے اُنکی تعلیم و تربیت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔

حب وطن

اپنے وطن کے ساتھ ہر شخص کو عموماً الفت اور موانست ہوتی ہے خصوصاً ایسے وطن کے ساتھ جیسے کہ دلی ہے جہاں پردیسی بھی آکر زمین پکڑ لیتے ہیں، سرسید کی محبت اپنے وطن کے ساتھ عجیب طرح کی تھی؛ ایک زمانہ تو وہ تھا کہ اُنکو دلی کی منصفی سے دوسری جگہ ترقی پر بھیجتے تھے اور وہ وہاں سے ہرگز نکلنا نہیں چاہتے تھے۔ یہ تو وہ زمانہ تھا کہ دلی میں چند خاندان نام و نمود کے باقی تھے اور ہر قسم کے اہل کمال اور اہل ہنر زمانہ کی بساط کے موافق وہاں موجود تھے، قلعہ کا چراغ اگر ٹمٹما رہا تھا گر گل نہوا تھا، سرسید کو جو زندہ دل

سوسائٹی وہاں میسر تھی دوسری جگہ اُسکے ملنے کی امید نہ تھی۔ مگر غدر کے بعد جب وہاں کے مسلمان بالکل مٹ گئے اور دلی ایک قالب بے روح رہگئی اب اُسی حب وطن کا یہ تقاضا ہوا کہ جن آنکھوں سے اُسکی بہار دیکھی تھی اُنھیں آنکھوں سے اُس کی خزاں کیونکر دیکھی جائے۔ گو بظاہر سر سید نے دلی ہمیشہ کے لیے چھوڑدی تھی مگر آدم کو بہشت چھوڑنے کا بھی اتنا ہی افسوس ہوا ہوگا جتنا کہ سر سید کو دلی چھوڑنے کا افسوس تھا۔ اُنکے آرٹکلوں میں یا اسپیچوں اور لکچروں میں یا پرائیوٹ خطوں میں جہاں دلی کا ذکر آگیا ہے اُنکا دل اُمڈے بغیر نہیں رہا۔

وہ اپنی کتاب راہ سنت پر ریمارک کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں "یہ باتیں تو اُن صحبتوں کی یادگار ہیں جنکی یاد سے آنسو بھر آتے ہیں، کہاں وہ صحبتیں، کہاں وہ مجلسیں، کہاں وہ آزردہ کہاں وہ شیفتہ اور کہاں وہ صہبائی کہاں وہ علما و صلحا۔ صرف یاد ہی یاد ہے"

ایک اور آرٹکل میں۔ جہاں اُردو اخباروں کا ذکر کیا ہے۔ وہ یوں لکھتے ہیں "اُس اُجڑے شہر کے اخباروں کا بھی۔ جسکا نام لیتے دل بھر آتا ہے۔ ہم دل سے شکر ادا کرتے ہیں.... ہمارے وطن کے اخبار ہم سے اس لیے ناراض ہیں کہ مدرسۃ العلوم دہلی میں کیوں نہ مقرر ہوا؟ بھائی! کہاں ہے وہ دلی اور کہاں ہیں وہ دہلی والے؟ جو نقش کہ مٹ گیا اُسکا اب کیا نام لینا ہے، مرثیہ پڑھا کرو اور دلی والوں کو رو یا کرو"

جس زمانہ میں ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس دلی میں تجویز ہو رہا تھا اُنھوں نے اپنے ایک دوست کو یہ لکھا تھا کہ "آپ کی سب کوششیں اور تدبیریں اور خیالات بے سود ثابت ہونگے، نہ دہلی میں کوئی انتظام کرنے والا ہے اور نہ دہلی اس لایق رہی ہے، وہاں کے مسلمانوں پر مسلمانوں کے گھروں پر مسلمانوں کے محلوں پر ابتک نحوست برستی ہے، انکی طبیعت، اُنکے اخلاق، راہ و رسم، سوشل حالت ایسی تبدیل ہوگئی ہے کہ جب کبھی دلی جاتا ہوں اور کسی سے ملاقات ہوتی ہے تو اُس کی باتیں سنکر متعجب ہوتا ہوں کہ یہ لوگ کس ملک اور کس دیس کے رہنے والے ہیں؟ خدا نے دلی سے سب کچھ چھین لیا، ذلک تقدیر العزیز العلیم"

سر سید کی طبیعت میں ایک خاص صفت تھی جو بڑے بڑے کاموں کا بوجھ اُٹھانے والوں میں ہونی نہایت ضرور ہے۔ وہ دل بجھانے والی اور ہمت توڑنیوالی تقریروں سے ہمیشہ دور دور اور الگ تھلگ رہنا چاہتے تھے۔ اگر ایسا نہ کرتے تو جسقدر قومی اور ملکی اور مذہبی خدمات اُنھوں نے انجام دی ہیں اُس کا عشر عشیر بھی اُن سے سر انجام نہو سکتا۔ سید

حامد مرحوم کے انتقال کا صدمہ اُنپر نہایت سخت ہوا تھا، وہ وقت اُنہوں نے بالکل کھانا نہیں کھایا اور پندرہ بیس روز تک اُنکی حالت نہایت نازک رہی، مگر جس وقت بیٹے کا دم نکلا اور گھر میں کہرام مچا وہ شمس العلما مولوی ذکاءاللہ کے مکان پر چلے گئے اور جب تک لوگ انکو دفن کرکے نہ آئے وہیں چپ چاپ بیٹھے رہے اور پھر اُس روز سے علیگڈھ گئے ایک آدھ بار سے زیادہ پھر کبھی جاکر گھر کی صورت نہیں دیکھی یہی وجہ تھی کہ اُنہوں نے دلی کا غم بھلانے کے لیے دلی کی بود و باش ہی ہمیشہ کے لیے ترک کر دی تھی - اُنکے بعض ہموطن کہتے ہیں کہ اگر دلی سے کچھ انس ہوتا تو وہ دلی کو چھوڑکر علیگڈھ میں مدرستہ العلوم قائم نہ کرتے، یہ بالکل ایسی ہی بات ہے جیسے کوئی کہے کہ اگر بنی امیہ کو وطن سے اُنس ہوتا وہ اندلس میں جاکر اپنی سلطنت قائم نہ کرتے - دلی جو سینکڑوں برس مسلمانوں کا دارالحکومت رہا اور اس لیے پُرانے خیالات اور قومی و مذہبی تعصبات کا مرکز تھا وہاں سرسید کے منصوبوں کا پورا ہونا بلا تشبیہ ایسا ہی مشکل تھا جیسا مکہ میں اسلام کا نشو و نما پانا -

اگر غور کرکے دیکھا جائے تو سرسید کے دل میں قوم کی بھلائی کا خیال اور قومی ہمدردی کا جوش زیادہ تر دلی ہی کی تباہی اور بربادی نے پیدا کیا، فتح دہلی کے بعد جس وقت وہ میرٹھ سے اپنی ماں اور خالہ کی خبر لینے کو دلی پہنچے اُنہوں نے تمام شہر کو بالکل ویران پایا؛ یہانتک کہ - جیسا پہلے بیان ہو چکا ہے - پیاسوں کے لیے پانی کی ضرورت ہوئی تو ایک صراحی پانی کے لیے اُنکو خود قلعہ جانا پڑا، جس دوست یا عزیز کا حال دریافت کیا اُس کو مقتول سنا یا مفقود، جس قلعہ میں سلاطین کے عیش و عشرت کے سامان دیکھے تھے اُسکے در و دیوار سے اُنکے خون کی بو آتے دیکھی - اگرچہ اُس وقت ہزاروں ایسے بھی تھے جو مرگ انبوہ کو جشن سمجھتے تھے مگر سرسید جیسے ذکی الحس آدمی کے لیے یہ انقلاب ایک تازیانہ تھا، دلی کا وہ سناٹا دیکھکر ایک ایسی چوٹ اُنکے دل پر لگی جو رفتہ رفتہ زخم اور آخر کار ناسور بن گئی مسلمانوں کی تعلیم کا خیال بھی اگر سچ پوچھیے تو دلی ہی کی حالت دیکھکر اُنکے دل میں پیدا ہوا - غدر سے پہلے جیسے دلی کے لوگ دنیا کے حالات سے بے خبر تھے ایسے شاید ہی کسی دوسری جگہ کے لوگ ہوں - سرسید کہتے تھے کہ "ایک دفعہ جو میں رہتک سے کسی تعطیل میں دلی آیا تو وہاں کے ایک معزز آدمی نے مجھسے پوچھا کہ آپ کہاں گئے تھے؟ اور جب میں نے رہتک کا نام لیا تو اُنہوں نے تعجب سے کہا کہ کیا رہتک بھی انگریزوں کی عملداری میں ہے؟ وہ

یہ بھی کہتے تھے کہ "دلی کے اکثر پڑھے لکھے آدمی ہر ایک مجسٹریٹ کو مٹکاف کہتے تھے کیونکہ پہلے مجسٹریٹ کا نام مٹکاف تھا"

اپنے دوستوں سے

جو برتاؤ سرسید کا اپنے دوستوں کے ساتھ تھا وہ اس زمانہ کے دوستوں سے بالکل نرالا تھا۔ جہانتک اُنکا حال دیکھا گیا اُنکی خوشی بلکہ اُنکی زندگی کا مدار صرف دو چیزوں پر معلوم ہوتا تھا؛ کام اور دوستوں کی ملاقات۔ اُنکو شاید ہی کبھی ایسی خوشی ہوتی ہو جیسی اپنے خالص و مخلص دوستوں سے مل کر ہوتی تھی۔ وہ فی الواقع دوستوں کو زندگانی کا ایک عنصر سمجھتے تھے اُنکا اس مقولہ پر پورا پورا عمل تھا کہ "اگر ساری دنیا قبضہ میں ہو اور کوئی دوست نہو تو وہ ہیچ ہے اور اگر ساری دنیا کے بدلے میں ایک درست ہاتھ لگ جائے تو ارزاں ہے"
باوجودیکہ دن بھر میں اُنکا کوئی گھنٹہ بلکہ کوئی منٹ کام سے خالی نہوتا تھا۔ اور ایسے شخص کو تنہائی زیادہ پسند ہونی چاہیے۔ باایںہمہ دوستوں سے کبھی اُنکا جی نہ اُکتاتا تھا۔ ابتدائی ملاقاتوں میں وہ بہت روکھے پھیکے معلوم ہوتے تھے، ناواقف آدمی اُنکو پہلی ہی بار دیکھکر نہایت عبوس اور خشک مزاج سمجھتا تھا مگر جس قدر اُنسے زیادہ ربط بڑھتا جاتا تھا اُسی قدر اس مقولہ کی تصدیق ہوتی تھی کہ "اَلرَّغْبَۃُ اِلَی الْکَرِیْمِ تُخَاطِبُکَ وَتُقَرِّبُکَ مِنْہُ وَتَرَدُّعُ بِعُیُوْبِ الْحِشْمَۃِ بَیْنَکَ وَ بَیْنَہٗ[۱]" کرنل گریہم لکھتے ہیں کہ "میں اُس کو (یعنی سرسید کو) ایک چوتھائی صدی سے جانتا ہوں میرا اور اُنکا تعلق بمنزلہ ایک رشتہ دار کے ہے نہ کہ بطور ایک دوست کے، جتنی زیادہ اُنکی میری واقفیت بڑھتی گئی اُسی قدر اُنکی قدر و منزلت میرے دل میں زیادہ ہوتی گئی"

سرسید اپنا دشمن تو شاید ہی کسی کو سمجھتے ہوں مگر جنکو وہ اپنا دوست جانتے تھے وہ بھی تعداد میں کچھ کم نہ تھے۔ قوم کی عام خیرخواہی نے ہزاروں بلکہ لاکھوں کے دل میں اُنکی جگہ کر دی تھی، اُنھیں میں بہت سے ایسے بھی تھے جنکی دوستی یارانہ کے درجہ تک پہنچ گئی تھی۔ وہ اپنی اور اُنکی چیز میں کچھ فرق نہ سمجھتے تھے۔ سرسید کا گھر اُنکا ہوٹل یا سرائے تھا اور اُنکا دل سرسید کی مٹھی میں تھا۔ وہ جب اور جسقدر چاہتے تھے اُنکے نام بغیر پوچھے چندہ لکھدیتے تھے اور اُنکو طوعاً و کرہاً قبول کرنا پڑتا تھا۔

---

[۱] یعنی کریم النفس آدمی کی طرف جس قدر جھکو گے اُس سے زیادہ میل جول ہوگا اور مغائرت دور ہوتی جائے گی ۱۲

دوستی کے متعلق ایک کتاب میں یہ حکایت لکھی ہے کہ "ایک روز امام محمد باقرؑ نے اصحاب سے کہا کہ تم میں کوئی ایسا شخص ہے؟ کہ دوست کی جیب میں ہاتھ ڈال کر جسقدر نقدی کی ضرورت ہو اُسمیں سے نکال لے۔ سب نے عرض کیا "لا واللہ یا ابن رسول اللہ" آپ نے فرمایا "بس تو تم میں کوئی دوستی کے لائق نہیں ہے۔" مگر سرسید کا حال اپنے دوستوں کے ساتھ اور اُنکے دوستوں کا حال سرسید کے ساتھ بالکل ایسا ہی تھا کہ ایک دوسرے کی جیب سے جو چاہتے نکال سکتے تھے۔

سرسید کے دوستوں میں سے اُنکے ایک نہایت عزیز دوست خرچ کرنے میں کبھی اعتدال اور میانہ روی سے تجاوز نہیں کرتے مگر کبھی ایسا نہیں ہوا کہ سرسید نے اُنسے چندہ مانگا ہو اور اُنھوں نے انکار کیا ہو۔ وہ اپنی جبلی عادت کے موافق بطور ظرافت کے کہا کرتے ہیں کہ قومی ہمدردی تو ہم کو معلوم نہیں کس چیز کو کہتے ہیں ہاں مگر سید احمد خاں کی زبان میں ضرور جادو تھا کہ جہاں روپیہ دو روپیہ دینا مشکل معلوم ہوتا تھا وہاں اُنکے ایک اشارے پر آنکھ بند کر کے سیکڑوں پوجیاتے تھے۔

سرسید ایک آرٹکل میں لکھتے ہیں کہ "اگرچہ اس طرح پر متواتر امداد کی درخواست کرنے سے شرم آتی ہے مگر ہمارے دوستوں کی فیاضی ہم کو شرمندہ نہیں دیتی۔ ہم نے بھی اس مقولہ پر عمل کرنا اختیار کر لیا ہے کہ "خانۂ دوستاں بروب و در دشمنان مکوب" جس امر کی ضرورت ہوتی ہے دوستوں ہی سے سوال کرتے ہیں اور کچھ شرم نہیں کرتے۔ اور حق یہ ہے کہ اگر دوستوں ہی سے نہ مانگیں تو کس سے مانگیں؟ لیکن اُنکا شکریہ ہم پر واجب ہے ایک دوست پر کالج کے کسی فنڈ کا چندہ کسی قدر باقی تھا، ہم نے اُنسے کہا کہ تھوڑا سا روپیہ رہ گیا ہے اس کو بیباق کر دو۔ اُنھوں نے کہا بیباقی کا تو آپ نام نہ لیجیے، جب تک زندگی ہے بیباقی تو نہ ہوگی، آج اس چندہ کی باقی ہے کل دوسرے چندہ کی، اسی طرح باقیدار مرجاؤنگا، پس بیباقی تو نہ ہوئی ہے نہ ہوگی، مگر جس قدر روپیہ چاہو لے لو"

اس کے بعد لکھتے ہیں کہ "درحقیقت یہی حال ہے کوئی زمانہ ایسا نہیں ہوتا کہ ہم اپنے دوستوں سے کالج کے کسی نہ کسی فنڈ کے لیے چندہ نہ مانگتے ہوں۔ مگر ہمارے دوست بھی ہمارے اس شعر کو کبھی کبھی پڑھ لیا کریں ؎

گر بگر ز لبت بوسہ گرفتیم مرنج + سرخی لعل لبت بیں کہ چہ زیبا بود دست

انھیں دوستوں میں سے بعض کے ساتھ نہایت بے تکلفی تھی۔ وہ جو کچھ چاہتے

تھے سرسید کو کہہ بیٹھتے تھے، اُن پر دُو در رد اعتراض کرتے تھے، اُن کے مذہبی خیالات اور رایوں پر نکتہ چینیاں کرتے تھے، اُن سے ہر قسم کی ہنسی اور چہل کی باتیں ہوتی تھیں، وہ ہمیشہ سرسید کی جھڑکیاں کھاتے تھے اور خفگیاں سہتے تھے مگر نہ کبھی سرسید کو اُن سے ملال ہوتا تھا اور نہ وہ اُن کی خفگی یا جھڑکی کا برا مانتے تھے۔ اُن کے حسب حال یہ شعر تھا۔

تعزیر جرم عشق ہے بے صرفہ محتسب　　بڑھتا ہے اور ذوق گنہ یاں سزا کے بعد

جب کسی دوست کی طرف سے کوئی ایسی بات ظہور میں آتی تھی جس سے مغائرت کا خیال پیدا ہوتا ہو تو اُن کو یہ امر نہایت شاق گزرتا تھا۔ منشی غلام نبی خاں مرحوم کا بیان ہے کہ "میں رہتک سے میرٹھ جاتا تھا، جب دلی پہنچا تو ایک دوست کے مکان پر ٹھیرنا ہوا، وہاں میں نے سنا کہ سید صاحب بجنور سے آئے ہوئے ہیں۔ میں اُن کی خدمت میں پہنچا، انہوں نے فوراً میرا اسباب فرودگاہ سے منگوایا اور فرمایا پانچ چار روز یہاں ٹھیرنا پڑے گا، پھر ہم تم یہاں سے ساتھ چلیں گے، میں ٹھیر گیا۔ انہوں نے شہر کے مشاہیر سے مجکو ملوایا، اتفاق سے محمد بخش خاں صدر الصدور میرٹھ بھی وہاں آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے سید کو لکھا کہ میرٹھ تک مجھے بھی اپنی گاڑی میں شریک کر لینا، سید صاحب نے اُن کو لکھ بھیجا کہ میری گاڑی میں منشی غلام نبی شریک ہیں اس لئے آپ کی گنجائش نہیں، مجھے شرکت کے لفظ سے یہ خیال گزرا کہ نصف کرایہ گاڑی کا مجھے دینا پڑے گا۔ غرض کہ میں سید صاحب کے ساتھ دلی سے میرٹھ کو روانہ ہوا، راہ میں اپنی نالائقی سے میں نے نصف کرایہ سید صاحب کے سامنے پیش کیا، انہوں نے نہایت غضب آلود نگاہ سے میری طرف دیکھا اور بہت دیر تک خاموش بیٹھے رہے۔ مجھے اپنی اس کمینہ حرکت سے ایسا انفعال ہوا کہ بیان نہیں ہو سکتا آخر مجکو معافی مانگنی پڑی اور پھر کرایہ کے باب میں اُن کے سامنے دم نہیں مارا۔"

اسی طرح انہوں نے ایک دوست کو کسی قدر روپیہ کا چک بھیجا مگر اُس نے واپس کر دیا اور لکھا کہ میں یہ روپیہ نہ لونگا اس کے لئے مجھ سے بہتر مصرف موجود ہیں، سرسید نے اُس کا یہ جواب لکھا کہ "آپ کا عنایت نامہ پہنچا جس میں چک مرسلہ کا ذکر تھا اُس کو پڑھکر میں تم پر نہایت خفا ہوا، جو محبت و یکجہتی مجکو تم سے ہے وہ اس لائق نہ تھی کہ تم ایسے کلمات لکھتے جو ایک غیر شخص کو لکھنے زیبا ہیں خبردار اس قسم کے خیالات ہمارے ساتھ ہرگز مت کرو۔ اگر تم رقعۂ مرسلہ کو کام میں نہ لاؤ گے تو نہایت آزردگی ہوگی اور یقین ہوگا کہ تم یکجہتی نہیں سمجھتے، اب دوبارہ اس باب میں نہ لکھنا۔"

جس دوست کے ساتھ سرسید کی زیادہ خصوصیت ہوتی تھی وہی اکثر مورد عتاب رہتا تھا مگر اُس عتاب کی قدر وہی خوب جانتے تھے جو اُس کے مورد ہوتے تھے۔ خان بہادر مولوی

سید زین العابدین خاں جن پر سب سے زیادہ خفگی اور ناراضی رہتی تھی وہی آج سب سے زیادہ سرسید کو یاد کرتے ہیں اور روتے ہیں اور دنیا میں کسی دوست یا عزیز کو ویسا غمخوار اور غمگسار نہیں پاتے۔ سرسید کا ایک خط ہاتھ لگا ہے جو انہوں نے علالت کی حالت میں اپنے ہاتھ سے لکھ کر خان بہادر کو رام پور بھیجا تھا۔ نہ اس میں عرفی شوق و آرزو کا اظہار ہے نہ جدائی کی معمولی شکایت ہے مگر اس کے ہر ہر لفظ سے محبت ٹپکی پڑتی ہے۔ لکھتے ہیں۔

"مکرمی زینو! ابھی تمہارا خط پہنچا، کچھ شبہ نہیں کہ تم کو مجھ سے جدا ہونے کا ایسا ہی رنج ہوا جیسا کہ تم نے لکھا، تم تو اس رنج کو کسی قدر لکھ بھی سکے، مگر مجھ کو تمہارے چلے جانے سے جو رنج ہے وہ لکھا بھی نہیں جا سکتا۔ زبان کھجلاتی ہے اور کوئی یہاں نہیں ہے کہ اس کو برا کہوں، دل میں غصہ آتا ہے اور کوئی یہاں نہیں ہے جس پر غصہ نکالوں۔ ہاتھ کھجلاتے ہیں اور کوئی یہاں نہیں ہے جس کو ماروں۔ حقیقت میں تمہارے جانے سے مکان سونا نہیں ہوا بلکہ دل سونا ہو گیا۔ صبح کو اٹھ کر خدا یاد نہیں آتا مگر تم یاد آتے ہو[1] اے کہ ہرگز فراموشت نکنم۔ کا نقشہ ہو گیا ہے۔"

نواب محسن الملک نے ایک موقع پر سرسید کا ذکر خیر کرتے وقت کہا کہ:۔

"میں نے کسی شخص کی ذات میں اس قدر خوبیاں جمع نہیں دیکھیں، میری ان سے پہلی ملاقات ۱۸۶۳ء میں ہوئی تھی؛ اس وقت سے آج تک ایک بات بھی ان میں ایسی نہیں دیکھی جس کو برا کہہ سکوں اس شخص کی سی سچی محبت اور وفاداری دنیا میں کہیں نہیں دیکھی، البتہ کتابوں میں بہت کچھ لکھا دیکھا ہے یہی وجہ ہے کہ نہ بھائی سے اس قدر محبت ہو سکتی ہے اور نہ باپ سے جیسی کہ اس شخص کی محبت خدا نے ڈال دی ہے۔"

اسی محبت کی کشش تھی کہ محسن الملک نے حیدرآباد سے آکر وطن مالوف کی طرف رخ نہیں کیا بلکہ علی گڑھ کو اپنا ہیڈ کوارٹر بنایا اور کبھی ایک دو دن سے زیادہ اٹاوہ میں جا کر قیام نہیں کیا، اور اگر حفظ صحت کا خیال ان کو مجبور نہ کرتا تو غالباً وہ سرسید کی زندگی میں علی گڑھ کو چھوڑ کر کبھی بمبئی نہ جاتے۔ نظیری نے کیا خوب کہا ہے ؎

درس ادب اگر بود زمزمۂ محبتے جمعہ بہ مکتب آورد طفل گریز پائے را

سرسید کی خفگی اور غصہ میں جو کشش تھی وہ کسی کی مہربانی اور عنایت میں بھی نہیں دیکھی گئی۔ سید مہدی علی

[1] خان بہادر ہمیشہ بلا ناغہ صبح کے چار بجے سرسید کی کوٹھی پر آتے تھے اور گھنٹہ آدھ گھنٹہ وہاں ٹھہر کر پھر ہوا خوری کو جاتے تھے یہ اس صبح کی ملاقات کی طرف اشارہ ہے ۱۲

کو ہمیشہ اُن کے عتاب آمیز خط جاتے تھے چنانچہ وہ خود ایک جگہ لکھتے ہیں کہ " مہدی علی کو سوائے غصہ اور خفگی کے کبھی کچھ نہیں ملا " باوجود اس کے سید مہدی علی کا معاملہ اُن کے ساتھ شمع و پروانہ کا سا تھا الہ آباد کے جلسۂ کانفرنس میں جس ذوق و شوق اور وجد کی حالت میں اُنھوں نے اپنا لکچر دیتے وقت تمام حاضرین کے سامنے سرسید سے خطاب کیا تھا وہ اکثر لوگوں کو یاد ہوگا خصوصاً اُس وقت کا سماں کبھی دل سے فراموش نہ ہوگا جب کہ اُنھوں نے سرسید مخاطب ہوکر یہ اشعار پڑھے تھے ؎

دلبرانِ ماہ پیکر دیدہ ام | در جمالت چیزِ دیگر دیدہ ام
این چہ نورست اینکہ تاباں از توہست | ہفت کوکب نور افشاں از توہست
تو مکمل از کمالِ کیستی | مظہرِ نورِ جمالِ کیستی

سرسید نے ایک آرٹکل میں جو غالباً محبت پر لکھا ہے مسٹر لسٹیلی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ :-
" انسان کو دشمن کے ساتھ بھی ایسا برتاؤ رکھنا چاہیے کہ اُس کو دوست بنا لینے کا موقع رہے اور دوست سے اس طرح برتاؤ کرنا چاہیے کہ اگر کبھی وہ دشمن ہوجائے تو اُس کے ضرر سے بچنے کی جگہ باقی رہے " اس قول کو نقل کرکے وہ خود لکھتے ہیں کہ " اس کا پہلا حصہ جو دشمن کے ساتھ برتاؤ کرنے کا ہے وہ تو نہایت عمدہ ہے مگر پچھلی بات جو دوست کے ساتھ برتاؤ برتنے کی ہے اُس میں سمجھ کی کچھ بھی بات نہیں بلکہ نری مکاری ہے - ایسے برتاؤ سے انسان زندگی کی بہت بڑی خوشی سے محروم رہتا ہے، اپنے دلی دوستوں سے بھی دل کی بات نہیں کہہ سکتا یہ سچ ہے کہ بعضے دوست دشمن ہوجاتے ہیں اور دوست کے بھید کو کھول دیتے ہیں مگر دنیا اُنھیں کو دغاباز اور بُرا کہتی ہے، دوست پر بھروسا کرنے والے کو نا سمجھ نہیں کہتے - ہاں البتہ دوستوں کے منتخب کرنے میں بڑی سمجھ چاہیے "

سرسید نے جو کچھ لکھا ہے یہ خاص اُن کے دلی خیالات تھے اور جہاں تک ہم کو معلوم ہے اُن کا ہمیشہ اسی کے موافق عمل درآمد رہا - وہ بے شک زود آمیز اور زود پیوند تھے بلکہ اس شعر کے حقیقی مصداق تھے ؎

نہ عیب نست کہ بیگانہ وار می گزری | کہ ہر کہ زود گسل نیست دیر پیوند ست

مگر جب کسی سے دل مل جاتا تھا - پھر خواہ وہ شخص ہندو ہو یا عیسائی یا یہودی یا مسلمان اُس سے کسی طرح کی مغائرت اور بیگانگی باقی نہ رہتی تھی - اُنھوں نے اپنے پوتے سید مسعود کی بسم اللہ کی تقریب میں بمقام علی گڑھ ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسوں کے بعد تمام ممبروں اور وزیٹروں کے سامنے ایک تقریر کی تھی جس کے آخر کے چند فقرے یہاں نقل کرنے مناسب معلوم ہوتے ہیں -

اُنھوں نے کہا "اے حضرات! گو میں نے اس وقت قوم ہی کا گیت گایا ہے مگر اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ ہم کو اور قوموں سے محبت اور برادرانہ محبت نہیں ہے۔ ہماری قوم خراب حالت میں ہے اس لئے اُسی کا گیت گایا جاتا ہے ورنہ ہم اور قوموں سے بھی ایسی ہی محبت رکھتے ہیں جیسی اپنے عزیزوں سے اس وقت اس کے علانیہ دو ثبوت موجود ہیں۔ ایک یہ کہ سید محمود اور مسٹر راس سے نہایت دوستی اور برادرانہ اور عزیزانہ محبت ہے، جب سید مسعود پیدا ہوا تو مسٹر راس اور اُن کی میم صاحبہ نے موافق انگریزی رسم کے جو نہایت محبت پر دلالت کرتی ہے۔ اپنا نام اُس مولود مسعود کو دیا اور ہم نے نہایت خوشی سے اُن کا نام اُس کے نام کے ساتھ شامل کیا اور اسی سبب سے اُس کا نام سید راس مسعود قرار پایا۔

"دوسرا نمونہ (راجہ جیکشن داس بہادر سی۔ ایس۔ آئی کی طرف نہایت جوشِ محبت کے ساتھ اشارہ کرکے کہا) ہمارا یہ ڈاڑھی منڈا دوست یہاں موجود ہے اور سید راس مسعود کو اپنی بغل میں بٹھائے ہوئے ہے۔ ان کو میں اپنا معزز اور محسن بھائی سمجھتا ہوں، اور سید محمود ان کو چچا کہتے ہیں اور سید راس مسعود دادا، پس ہم اپنے دوستوں سے محبت رکھنے میں کچھ بھی فرق نہیں کرتے "

سرسید جس کو دوست سمجھ لیتے تھے اُس کی طرف سے فی الواقع اُن کا دل ایسا صاف ہو جاتا تھا کہ اُس کی نسبت بُرائی کا کبھی تصور بھی نہیں آتا تھا۔ کسی کی شکایت یا سعایت یا درانداز ی ان کو دوست سے۔ جب تک کہ علانیہ اور متواتر اُس سے دوستی کے خلاف باتیں سرزد نہ ہوں بدگمان نہ کر سکتی تھی۔ لیکن اسی کے ساتھ جب کسی کی نسبت اُن کو یقین ہو جاتا تھا کہ وہ دوست نہیں پھر اُس سے مطلق تعلق باقی نہ رہتا تھا۔ ظاہرداری کا ملنا فی الحقیقت اس شخص کو نہ آتا تھا! اُن کے حال پر بعینہ یہ شعر منطبق ہوتا تھا ؎

مرنجاں دلم را کہ ایں مرغِ وحشی   زبامے کہ برخاست مشکل نشیند

وہ سید مہدی علی خاں کو ایک خط میں لکھتے ہیں کہ "میں تو اُس شخص کو کافر و بے ایمان سمجھتا ہوں جو دوست کی نسبت خیال کرے کہ اُس نے خلاف دوستی و محبت کے کوئی بات کہی ہو گی۔ میں تو دوست کے گالی دینے اور بُرا کہنے کو بھی دوستی پر حمل کرتا ہوں، اور درحقیقت دوستی ہی کے سبب سے وہ بات ہوتی ہے۔ مگر جب کہ حقیقت میں خلاف محبت اور دوستی کے کوئی بات ہو تو پھر شیشۂ محبت جو نہایت نازک ہے کسی طرح ثابت نہیں رہ سکتا۔ اگرچہ دوستی اور محبت ایسی سخت چیز ہے کہ ہتھوڑوں سے اور ہزاروں صدموں سے نہیں ٹوٹتی؛ مگر وہ نازک بھی ایسی ہے کہ باریک سے باریک شیشے اور حباب کو بھی اُس سے نسبت نہیں۔ ایک ادنیٰ سی خلافِ محبت بات کرنے سے ٹوٹ جاتی ہے اور جس قدر محبت زیادہ بڑھتی جاتی ہے اُس کی نزاکت زیادہ

ہوتی جاتی ہے۔"

سر سید کو کسی دوست نے لکھا کہ فلاں دوست سے بھی آپ چندہ طلب کریں۔ اُس کے جواب میں آپ لکھتے ہیں کہ "جو ملال اُن کی طرف سے میرے دل میں ہوا ہے وہ اب تک کم نہیں ہوا۔ پھوٹ جائے وہ آنکھ جو کسی کو دیکھے اُس نگاہ سے جو اُس کے دل میں نہیں ہے، گل جائے وہ زبان جو وہ کہے جو اُس کے دل میں نہیں ہے، ٹوٹ جاوے وہ ہاتھ جو وہ لکھے جو اُس کے دل میں نہیں ہے۔"

اُن کا قول تھا کہ دوستی کے آگے رشتۂ قرابت کی کچھ حقیقت نہیں۔ وہ ولایت سے سید مہدی علی خاں کے نام کے خط میں مولوی زین العابدین خاں کی نسبت لکھتے ہیں "جس قدر آپ نے مولوی زین العابدین کی محبت کا میری نسبت ذکر لکھا ہے درحقیقت وہ بہت کم ہے۔ اُس کا فرغارت کن ایمان کو جیسا کہ وہ ہے۔ میں ہی خوب جانتا ہوں۔ اب آپ کو میری طبیعت کا حال بخوبی معلوم ہو گیا، میں رشتے ناتے کی سچی محبت اور دوستی کے آگے کچھ بھی حقیقت نہیں سمجھتا۔"

اگرچہ سر سید ہر ایک معاملہ میں نہایت آزادانہ خیالات رکھتے تھے مگر دوستی کے معاملات میں بڑے کنسرو ٹو معلوم ہوتے تھے۔ وہ اپنے خالص و مخلص دوستوں سے اُسی قسم کی توقعات رکھتے تھے جیسے اگلے زمانہ کے وضعدار اور باوفا دوستوں کے حالات سننے میں آئے ہیں۔ قطع نظر پرائیوٹ باتوں کے پبلک معاملات میں بھی۔ جو زیادہ مہتم بالشان ہوں۔ اُن کی یہ خواہش معلوم ہوتی تھی کہ دوست اُن کی رائے کے موید ہوں اور اگر کوئی دوست اُن کی رائے سے اختلاف کرتا تھا تو اُن کو حد سے زیادہ ملال ہوتا تھا۔

جب سے ان کو مسلمانوں کی تعلیم کا خیال ہوا وہ اپنے ہر ایک دوست سے اس بات کے متوقع تھے کہ اُن کے کام میں دل سے مدد دیں۔ جن قدیم دوستوں نے توقع کے موافق تعلیمی معاملات میں اُن کو مدد نہیں دی اُن کے ساتھ وہ ربط و ضبط جو قدیم سے چلا آتا تھا قائم نہ رہا اور نئے دوست جو ان معاملات میں اُن کے مددگار تھے اُن کو وہ اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں سے بھی زیادہ عزیز اور پیارا سمجھتے تھے۔ خان بہادر برکت علی خاں کی نسبت اُن کی اخیر دم تک یہ تمنا رہی کہ کالج میں ایک ممتاز مکان اُن کی یادگار میں تیار کرائیں۔ سردار محمد حیات خاں کو وہ اپنا قوت بازو سمجھتے تھے قاضی رضا حسین رئیس پٹنہ، خلیفہ سید محمد حسن خاں وزیر پٹیالہ۔ مولوی چراغ علی اور میر ظہور حسین کے مرنے کا ان کو ایسا رنج ہوا تھا کہ اپنے کسی عزیز کے مرنے کا بھی کسی کو اُس سے زیادہ صدمہ نہیں ہو سکتا۔ نواب انتصار جنگ سے اگرچہ وہ ٹرسٹی بل کے اختلاف کی وجہ سے کسی قدر آزردہ ہو گئے

مگر چونکہ مدرسہ کی امداد اُن کے برابر ایک آدھ کے سوا کسی نے نہیں کی اس لئے وہ ملال چند روز بعد بالکل جاتا رہا تھا اور ان کی ویسی ہی جگہ دل میں ہوگئی تھی جیسی قدیم سے چلی آتی تھی۔ نواب عماد الملک کو اُن کی نیکی اور راستبازی اور علم و فضل اور مدرستہ العلوم کی حقیقی خیر خواہی اور خیر اندیشی کی وجہ سے وہ ایسا ہی عزیز رکھتے تھے جیسے سید محمود کو اور اُن کی نسبت یہ کہتے تھے کہ وہ انسان نہیں بلکہ ایک نور جسم ہے۔ شمس العلماء مولانا نذیر احمد کی نسبت ایک ناواقف آدمی نے اُن کے سامنے بطور شکایت کے کہا کہ باوجود اس قدر مقدور ہونے کے اُنہوں نے قومی تعلیم میں کچھ مدد نہیں دی۔ سرسید نے بدمزہ ہو کر اُن کے چندوں کی تفصیل بیان کی جو وہ ابتدا سے مدرسہ میں دیتے رہے ہیں اور جو مقبولیت اور رونق اُن کے لکچروں سے ایجوکیشنل کانفرنس کو ہوئی اُس کا ذکر کر کے کہا کہ یہ شخص ہماری قوم کے لئے باعثِ فخر ہے اُس کی نسبت پھر ایسا لفظ زبان سے نہ نکالنا۔ شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ جنہوں نے کالج کے چندوں کے سوا سوسائٹی کے مقاصد میں اپنے ترجموں سے بے نظیر امداد دی تھی۔ اور سید زین العابدین، میر تراب علی، سید مہدی علی، مولوی مشتاق حسین، راجہ جے کشن داس، حاجی اسمٰعیل خاں اور مرزا عابد علی بیگ کو وہ مثل اپنے اعضا و جوارح کے سمجھتے تھے۔ الغرض یہ شخص دوستی و محبت کے باب میں اس عربی شعر کا حقیقی مصداق تھا ؎

واذا رایت صدیقہ وشفیقہ لم تدر ایھما ذوالارحام

(یعنی تو اس کے دوست اور سگے بھائی کو دیکھ کر یہ تمیز نہیں کر سکتا کہ بھائی کونسا ہے اور دوست کونسا)

پرانے رفیقوں سے نباہ

اسی جبلی مہر و محبت کا مقتضا تھا کہ وہ اپنے رفیقوں اور نوکروں اور لگے بندھوں کو تا بمقدور عمر بھر اپنے ساتھ نباہنا چاہتے تھے۔ جس شخص کے قدم اُن کے ہاں جم گئے پھر نہ وہ اُس کو اپنے پاس سے جدا کرنا چاہتے تھے اور نہ وہ اُن سے جدا ہونا چاہتا تھا۔ اول تو وہ کسی کی شکایت سنتے نہ تھے اور اگر کوئی کسی ملازم کی شکایت کرتا تھا تو اُس کا کچھ اثر نہ ہوتا تھا۔ اُن کے ایک قدیم ملازم کی لوگوں نے اُن سے بارہا شکایت کی مگر وہ کسی طرح اُن کے دل سے نہ اُترا، ہمیشہ اُن کا معتمد علیہ اور سفر و حضر میں اُن کے ہمراہ رہا اور آخر اُنھیں کی رفاقت میں مر گیا۔ اُس کے بعد چھوٹے بھائی کو داروغگی ملی جس کی آوارگی اور بدچلنی حد سے گزر گئی تھی مگر وہ بھی اخیر دم تک اُن سے نہ چھوٹ نہ سکا۔

حافظ عبدالرحمٰن مرحوم۔ جو سید محمود کے بچپن کے اُستاد تھے۔ ۴۵ برس سرسید کے ساتھ رہے اور وہیں اُن کا خاتمہ ہوا۔ مرتے وقت اُنہوں نے سید محمود اور سرسید کو بُلایا جب دونوں کو دیکھ لیا فوراً روح پرواز کر گئی۔ سرسید کو اُن کے مرنے کا ایسا قلق ہوا کہ ایک وقت کھانا نہیں کھایا اور

کئی دن تک اُن کے مرنے کا رنج والم رہا۔ منشی ذوالفقار جوان کے بچ کا حساب کتاب لکھتا تھا اُس کے مرنے کا بھی ان کو کچھ کم صدمہ نہیں ہوا۔ اسی طرح کی اور بہت سی حکایتیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس شخص کا خمیر مہر و محبت سے ہوا تھا۔

فیاضی

سیر چشمی اور فراخ حوصلگی بھی سرسید کے خاص اوصاف میں سے تھی۔ اُنہوں نے اپنی کمائی سے نہ کبھی مال جمع کرنے کا ارادہ کیا اور نہ اولاد کے لئے کوئی جائداد خریدی بلکہ جو کچھ کمایا اُس کو یا اپنی ضروری آسایش اور سچی عزت اور نیک نامی کے ذرائع میں صرف کیا یا کنبے کی خبر گیری، مستحقوں کی امداد، اولاد کی تعلیم، ملک اور قوم کی بھلائی اور مذہب کی حمایت میں اُٹھایا وہ ۳۷ برس سرکاری ملازمت میں رہے اور اس عرصہ میں سو روپیہ سے لے کر آٹھ سو روپیہ ماہوار تک تنخواہ پاتے رہے جب تک سید محمود ہائی کورٹ کے جج رہے ایک ہزار ماہوار باپ کو دیتے رہے۔ نوکری کے بعد اخیر دم تک چھ سو روپیہ ماہوار پنشن کی آمدنی رہی مگر کبھی اُن کی آمدنی خرچ کو مکتفی نہیں ہوئی۔ اُن کے ایک معزز رشتہ دار کا بیان ہے کہ "جب دلّی کی منصفی سے اُن کو ترقی کے ساتھ باہر بھیجنے لگے تو اُن کی والدہ نے جو اُن کی طبیعت اور خصلت سے خوب واقف تھیں صرف اس خیال سے جانے نہیں دیا کہ جس قدر زیادہ آمدنی ہوگی اُسی قدر خرچ بڑھ جائیگا، پھر اپنا گھر چھوڑ کر باہر جانے سے کیا فائدہ"

ابتدا سے اُن کا یہ حال رہا کہ جس کام کی لہر اُن کے دل میں اُٹھی اُس پر روپیہ صرف کرنے میں اُنہوں نے کبھی پیش و پس نہیں کیا۔ وہ اپنے کھانے پہننے کے اخراجات میں تنگی کر سکتے تھے اور کرتے تھے مگر اپنے شوق کے کاموں میں اُنہوں نے کبھی مضائقہ نہیں کیا جس کتاب کی اُن کو تلاش ہوئی اگر وہ بیس گنی قیمت پر بھی ملی تو اُس کو لئے بغیر نہیں چھوڑا۔ ریاضی کے متعلق آلات جمع کرنے کا اُن کو شوق ہوا صدہا روپیہ اُس میں صرف کر ڈالا۔ کسی تصنیف کے لئے میٹریل جمع کرنے میں، کسی کتاب کے چھپوانے کے اہتمام میں، کسی سوسائٹی یا انجمن یا مدرسہ قائم کرنے میں وہ ہمیشہ اپنی بساط سے بہت زیادہ خرچ کرتے رہے، ساری عمر تصنیف و تالیف میں گزری مگر کبھی حق تصنیف سے فائدہ نہیں اُٹھایا اور کبھی کسی کتاب کی رجسٹری نہیں کرائی۔ اُن کی کتابیں اور مضامین جس کا جی چاہتا چھاپ لیتا تھا، اُنہوں نے کبھی کسی سے تعرض نہیں کیا۔

جب تک مذہبی خیالات میں انقلاب پیدا نہیں ہوا وہ ثواب کے معمولی کاموں میں

بہت شوق سے شریک ہوتے تھے۔ محمد سعید خاں صاحب کا بیان ہے کہ "بجنور میں غدر سے پہلے تین مسجدوں کے بننے میں اُنہوں نے کافی مدد دی، موضع بینسوبہ جو بجنور اور دلی کے رستے میں پڑتا تھا وہاں ایک سرائے تھی جس میں سرسید آتے جاتے کھانا کھانے کے لئے ٹھہرا کرتے تھے اُس سرائے میں بھٹیاروں نے ایک مسجد بنانی شروع کی تھی، اُس مسجد کی ابھی بنیاد ہی بھری گئی تھی کہ دو بھٹیاروں کو وہاں کے برہمنوں نے مار ڈالا اور اس لئے مسجد کی تعمیر بند ہو گئی سرسید نے اُس کی تعمیر نا تمام دیکھ کر کچھ روپیہ اپنے پاس سے دیا اور کچھ دلی سے اپنے رشتہ داروں مردوں اور عورتوں سے وصول کر کے پورا کر دیا۔ پھر خاص بجنور میں بکر قصابوں نے ایک مسجد کی بنیاد ڈالی تھی، اُس کے بنوانے میں بھی اُنہوں نے بہت مدد دی، مگر وہ ابھی پوری نہ ہوئی تھی کہ غدر ہو گیا غدر کے بعد سرسید نے فوراً اس کی تعمیر جاری کرائی اور اُس کو مکمل کرا دیا۔ اسی طرح کاندھلہ میں ایک مسجد مولوی مظفر حسین مرحوم و مغفور بنواتے تھے۔ سرسید نے روپیہ بھیجنا چاہا، مولوی صاحب نے کہا کہ تمہاری تنخواہ کا روپیہ مسجد میں نہیں لگایا جا سکتا، سرسید نے رجسٹری کی آمدنی میں سے وہاں کئی سو روپیہ بھیجا۔"

مگر جب وہ خیالات بدل گئے اور سہارن پور کی جامع مسجد کے لئے اُن سے چندہ طلب کیا گیا تو اُنہوں نے یہ جواب دیا کہ:۔

"میں خدا کے زندہ گھروں کی تعمیر کی فکر میں ہوں اور آپ لوگوں کو اینٹ مٹی کے گھر کی تعمیر کا خیال ہے۔"

مستحقوں کی امداد اور دستگیری کرنے کی بھی اُن کی نسبت بے شمار مثالیں سُننے میں آئی ہیں، خصوصاً غدر کے بعد جب کہ مسلمان شرفا کے صدہا خاندان تباہ و برباد گئے تھے۔ اُن کے دوست محمد سعید خاں کہتے تھے کہ "مراد آباد میں جو شکستہ حال اشراف صورت مسلمان اُن کے مکان کے برابر سے گزرتا اُس کو خود بُلا لیتے تھے اور علیٰحدہ لیجا کر اُس کا حال دریافت کرتے تھے اور ایسے طور پر اُس کے ساتھ سلوک کرتے تھے کہ کسی کو خبر نہ ہو۔" اُن کے ایک معزز اور ثقہ دوست کی روایت ہے کہ "مدت تک غدر کے بعد اُن کا یہ حال رہا کہ اپنی تنخواہ میں سے صرف بقدر اخراجات ضروری کے رکھ کر باقی کل روپیہ دلی میں تقسیم کرنے کے لئے بھیج دیتے تھے۔ بعض اشخاص غدر کے آفت رسیدہ لوگوں کے ساتھ سرسید کا برتاؤ دیکھ کر بہ تصنع اپنے تئیں مفلوک اور مصیبت زدہ ظاہر کرتے تھے اور سرسید اُن کے اصل حال سے واقف ہونے کے بعد بھی اُن کے ساتھ اسی طرح سلوک کرتے تھے۔" محمد سعید خاں صاحب کا بیان ہے کہ

لوگ اطراف وجوانب سے دربار میں شامل ہونے کو آئے ہوئے تھے۔ ایک شخص بظاہر معقول اور سفید پوش سید صاحب کے مکان پر آئے اور اُن کو الگ لیجا کر کہا کہ میں دربار میں شریک ہونے کے لئے آیا تھا۔ مگر میرا آدمی اسباب لیکر بھاگ گیا اور میں بالکل بے سروسامان رہ گیا ہوں۔ سر سید نے اُن کو معقول خرچ دیا اور کھانا اپنے ساتھ کھلایا۔ جب وہ چلے گئے تو معلوم ہوا کہ یہ شخص اسی نواح کا رہنے والا ہے اور اسی طرح لوگوں کو چل دیکر مانگ کھاتا ہے۔ تین چار روز بعد وہ پھر تشریف لائے اور کچھ اور طلب کیا سید صاحب نے پھر کچھ خرچ دیا اور کھانا بھی ساتھ کھلایا۔ غرض کہ تین دفعہ دربار ہونے سے پہلے وہ اُن کے پاس آیا اور ہر دفعہ اُس کو کچھ دیا اور کھانا اسی طرح ساتھ کھلایا ۔

اُس زمانہ میں سر سید کو یہ خیال تھا کہ سیکڑوں شریف اور خاندانی افلاس میں مبتلا ہیں اور جس حیلے سے روٹی ملتی ہے حاصل کرتے ہیں۔ مگر جب سے اُنھوں نے مدرسۃ العلوم قایم کیا اُن کا حال بالکل اس کے برخلاف تھا، وہ سائل کو کبھی اپنے دروازے پر پھٹکنے نہ دیتے تھے اور بجائے اس کے کہ شخصی امداد کو کوئی کار خیر سمجھتے ہوں۔ اُس کو ایک قسم کی معصیت جانتے تھے اور یہ خیال کرتے تھے کہ ایسے لوگوں کی امداد کرنا اُن کو ہمیشہ کے لئے دریوزہ گر بنانا ہے۔ اسی لئے اُن کی تمام فیاضی اور داد و دہش قوم کی تعلیم میں منحصر ہو گئی تھی جس درشتی اور سختی کے ساتھ وہ سائل کو جھڑکتے اور اُس پر دُوردُور کرتے تھے اُس کو دیکھکر ناواقف آدمی اُن کو سخت بداخلاق اور بدمزاج تصوّر کرتا تھا مگر وہ اُن کا غصّہ اور دُور دُور کرنا سراسر مصنوعی ہوتا تھا، اُن کا یہ قول تھا کہ لوگوں کے اخلاق درست کرنے کے لئے بداخلاق بننا نہایت ضرور ہے۔

سر سیّد کی جوانمردی اور فیاضی صرف داد و دہش ہی میں محدود نہ تھی بلکہ اُن کی مثال ایک پھلدار درخت کی سی تھی جو اپنے پھل سے اپنے سایہ سے اور اپنی لکڑی سے غرض کہ ہر طرح سے مخلوق کو فائدہ پہنچاتا ہے۔ غدر کے بعد اُنھوں نے اکثر بے گناہ مسلمانوں کی، جن کی نسبت حکّام کو اشتباہ ہو گیا تھا، صفائی کرائی، بعض اشخاص جو فتح دہلی کے بعد گورنمنٹ کے خوف سے باغیوں کی فوج میں شامل ہو گئے تھے، مگر درحقیقت بے گناہ تھے ان کو بطور خود وہاں سے بلا کر اُن کی تحقیقات کرائی اور اُن کی بریت پر خود گواہی دیکر اُن کو بری کرایا۔ مُرادآباد کے مسلمانوں کو بعض ناخدا ترس ہندوستانیوں کے شر سے بچایا جو محض مذہبی تعصب کے سبب اُن کو پھانسیاں دلوانے پر کمربستہ تھے، بعض مسلمان جو سرکاری فوج کے ہاتھ سے

دلی پر حملہ ہونے کے وقت بے قصور مارے گئے تھے اُن کے درماندہ وارثوں کی پنشنیں[1] مقرر کرائیں۔ مولانا عالم علی مرحوم مُرادآبادی کی صفائی کرلنے میں جو کوشش سرسید نے کی وہ ہم پہلے کسی موقع پر بیان کرچکے ہیں۔ غرض کہ اس شخص نے مسلمانوں کو کیا من حیث القوم اور کیا من حیث الافراد فائدہ پہنچانے میں کبھی کمی نہیں کی۔

غریب پیشہ وروں اور مزدوروں کے ساتھ جو فیاضانہ برتاؤ اس شخص کا تھا اُس کا ایک ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ جب سے وہ مستقل طور پر علی گڑھ میں مقیم ہوئے مزدوروں کی مزدوری اور گاڑیوں کا کرایہ پہلے کی نسبت عموماً زیادہ ہوگیا۔ وہ ہمیشہ اُن لوگوں کو اُن کی توقع اور حوصلے سے بہت زیادہ دیتے تھے اور جہاں کہیں اُنکا رہنا ہوا یہ لوگ اُن کے نہایت شکرگزار اور ثناخواں رہے۔ اُن کے ایک دوست کا بیان ہے کہ "میں بنارس میں اُن سے ملنے گیا تھا۔ دریا پر پہونچا تو شام ہوگئی تھی اور کشتی کی آمدورفت بند ہوگئی تھی، ہرچند ملاحوں سے کہا کہ کشتی لگادو، مگر اُنھوں نے نہ مانا۔ لیکن جب اُن کو معلوم ہوا کہ یہ جج صاحب کے ہاں جانے والے ہیں فوراً کشتی لگادی اور مجھے پار اُتار دیا۔ کشتی سے اُتر کر میں نے ملاحوں کو کچھ دینا چاہا مگر اُنھوں نے کچھ نہ لیا اور یہ کہا کہ سرکار (یعنی سرسید) ہم کو بہت کچھ دیتے ہیں ہم اُن کے مہمان سے ہرگز کچھ نہ لیں گے۔" ایسا ہی ایک واقعہ ریل کے مزدوروں کا سُنا ہے۔ جو سرسید کے نام پر بلا مزدوری کام کرتے تھے۔

سالم نام ایک یہودی صنعائی یمن کا رہنے والا غازی پور میں سرسید کے پاس آیا اور کہا کہ تمام ہندوستان میں معاش کی تلاش کے لئے پھرا ہوں، کہیں کوئی صورت نہیں نکلی سرسید نے پوچھا کہ کیا تنخواہ لوگے؟ اُس نے دس یا پندرہ روپیہ کہے، سرسید نے کہا میں تم کو پچیس روپیہ مہینا دوں گا، مجھے عبرانی سکھاؤ۔ سرسید کے ایک دوست کہتے تھے کہ اُس نے خوشی کے مارے بڑھکر سرسید کی ڈاڑھی چوم لی اور یہ کہا کہ آج تک مجھے ایسا کوئی شخص نہیں ملا جس نے درخواست سے زیادہ دیا ہو۔ سرسید نے اُس کو نوکر رکھ لیا، مگر چوں کہ وہ مسرف اور آوارہ مزاج تھا اس لئے اُس کو بقدر ضرورت دیتے رہے اور اُس کی باقی تنخواہ جمع کرتے رہے۔ جب وہ وطن کو جانے لگا تو

---

[1] مولانا صہبائی کے نواسے محمد حمید الدین کا ایک خط ہمارے سامنے تھا جس سے سرسید کے نام آیا تھا جس میں لکھا تھا کہ "مولانا امام بخش صہبائی مرحوم جو اس عاجز کے نانا تھے ایام غدر میں اُن کے بے گناہ قتل ہونے پر عالی حضرت نے جناب نانی صاحبہ و دیگر درماندگان کا وظیفہ سرکار انگریزی سے مقرر کرادیا تھا، جب تک نانی صاحبہ زندہ رہیں بدستور وظیفہ ملتا رہا۔ بندے نے والدین سے سُنا تھا کہ جو احسانات آنجناب کے اس خاندان کے ساتھ ہوئے ہیں وہ بیان سے باہر ہیں" ۱۲

کئی سو روپیہ۔ جو اُس کا چڑھا ہوا تھا حساب کر کے اُس کے حوالے کر دیا۔

جس زمانہ میں سرسید مولوی نوازش علی مرحوم سے دلّی میں پڑھتے تھے میر محمدؐ مرحوم امام جامع مسجد دہلی بھی اُن کے ساتھ پڑھتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ جب سید صاحب چند روز کے لئے قایم مقام صدر امین مقرر ہو کر رہتک جانے لگے تو اُنھوں نے مولوی صاحب سے کہا کہ آپ بھی رہتک چلئے۔ مولوی صاحب ہنسنے لگے اور کہا کہ میں بھلا کیوں کر جا سکتا ہوں؟ ایک جماعت کثیر طلبہ کی مجھسے پڑھتی ہے۔ ان کو کس پر چھوڑ کر جاؤں؟ انھوں نے کہا سب طلبہ کو بھی ساتھ لے چلئے۔ مولوی صاحب کو اور زیادہ تعجب ہوا کہ اتنے طالب علم کہاں گئے کہاں سے؟ سید صاحب نے کہا آپ ان کے کھانے پینے کا تو فکر کیجئے نہیں خدا رازق ہے لیکن یہ سمجھ لیجئے کہ اگر آپ نہ چلیں گے تو میں رہتک جانے سے انکار کر دوں گا اور اس سے میری آیندہ ترقی رُک جائے گی۔ آخر مولوی صاحب کو اس کے سوا کچھ بن نہ آیا کہ وہ مع طالب علموں کی جماعت کے اُن کے ساتھ ہو لئے اور جب تک رہتک رہنا ہوا سب کا خرچ سید صاحب کے ذمے رہا۔

سرسید کی اس قسم کی فراخ حوصلگی کی مثالیں بے شمار ہیں جن کی تفصیل کی اس کتاب میں گنجایش نہیں۔ اگرچہ یہ خصلت عام مسلمانوں کے حق میں اُن کی موجودہ حالت کے لحاظ سے نہایت خطرناک ہے کیوں کہ اب مسلمان بغیر کفایت شعاری کے صفحۂ ہستی پر قایم نہیں رہ سکتے مگر سید کی حالت عام مسلمانوں سے بالکل مستثنےٰ تھی۔

در حق او شہد و در حق تو سم　　　در حق او مدح و در حق تو ذم

سرسید اگر گھر کے انتظام اور نون تیل لکڑی کے حساب کتاب کی طرف متوجہ ہوتے تو وہ تمام ملکی اور قومی اور مذہبی خدمات، جو اُنھوں نے گزشتہ چالیس برس میں سرانجام کیں وہ کون کرتا؟ اُنھوں نے ایسے کاموں کے لئے، جو ہندوستان میں اور خاص کر مسلمانوں میں بالکل نئے تھے اور جن پر خرچ کرنے کی اُن کو بالکل عادت نہ تھی۔ دس بارہ لاکھ سے کم روپیہ وصول نہ کیا ہوگا، اگر وہ کفایت شعاری کو کام فرماتے اور اپنی پاکٹ بالکل نہ جھاڑ دیتے تو اوروں کے کیسوں میں کیوں کر ہاتھ ڈال سکتے تھے، اگر وہ اپنے گھر کو مہمانسرا نہ بناتے تو علی گڑھ کا ایک ویران قطعہ تمام ہندوستان کے مسلمانوں کی تعلیم کا مرکز کیوں کر بن سکتا تھا۔ اگر وہ ہزارہا روپیہ اپنے پاس سے صرف کر کے اطراف ہندوستان میں چندہ کے لئے سفر نہ کرتے

بلکہ اپنا سفر خرچ کمیٹی کے ذمے ڈالتے تو مسلمانوں میں جو ہر وقت اعتراض کرنے کا موقع ڈھونڈتے تھے۔ کیوں کر اپنا وقار قائم رکھ سکتے تھے، اگر وہ یوروپین طریقہ پر ہائی لائف نہ رکھتے تو ہندوستان کے ارکان سلطنت کو اپنے کاموں کی طرف کیوں کر متوجہ کر سکتے تھے، شمس العلما مولانا نذیر احمد نے سچ کہا تھا کہ "سید احمد خاں کے ظاہر حال سے دھوکا ہو سکتا ہے کہ ادنیٰ درجہ کے انگریزوں کی طرح ماندوبود کرتے ہیں، گورنروں کو مہمان رکھتے ہیں ان کے ہم نوالہ ہیں جس کے دل میں ایسا واہمہ گزرے اس کو اس بات پر بھی نظر کرنی چاہیئے کہ سید کو چار و ناچار فیلبانوں کے ساتھ دوستی رکھنی پڑتی ہے اور وہ بڑے پھاٹک بغیر نہیں ہو سکتی۔ اگر انگریزوں کی طرح ہائی لائف نہ رکھیں تو اعلیٰ درجہ کا انگریز یا اعلیٰ درجہ کا نیٹو ان کی طرف رُخ نہ کرے۔"

بہر حال اس باب میں سر سید کی ایک خاص حالت تھی، اگر کوئی دوسرا شخص بھی گھر بار لٹا کر قوم کو اسی طرح فائدہ پہونچا سکے تو وہ بلاشبہ قوم کا سرتاج ہے اور بیشک روپیہ صرف کرنے کا طریقہ اس سے بہتر کوئی نہیں جانتا۔ مسٹر سموائل اپنی کتاب سلف ہلپ میں لکھتے ہیں کہ "جو شخص اپنے روپے سے لوگوں کو نفع نہیں پہنچاتا وہ بہت ہی ذلیل آدمی ہے۔ جوانوں کو خیال رکھنا چاہیئے کہ جوانی کی کفایت شعاری کہیں بڑھاپے میں جا کر خست نہ بنجائے اور جو کام (یعنی کفایت شعاری) پہلے فرض اعظم تھا وہی گناہ عظیم نہ بنجائے۔"

اگرچہ سر سید کی زندگی برابر آسودگی کے ساتھ گزری اور ان کی حیثیت ایک متوسط الحال شریف ہندوستانی کی حیثیت سے بہت زیادہ رہی مگر خدا تعالیٰ نے ان کا حوصلہ بھی بلکہ ان کی حیثیت کے زیادہ فراخ اور وسیع و بلند پیدا کیا تھا، اس لئے اُن کی آمدنی کبھی ان کے اخراجات کو مکتفی نہیں ہوتی تھی اور ہمیشہ مقروض رہنا ایک لازمی سی بات ہو گئی تھی۔ وہ اپنے ایک دوست کو۔ جو مقروض ہو گئے تھے۔ اس طرح لکھتے ہیں "قرضہ کی پریشانی بلاشبہ بہت رنج دہ ہے جس کے مزے سے میں خوب واقف ہوں، بہت کم مسلمان ہوں گے جو اس رنج میں مبتلا ہوں، مگر میں تو اپنے دل کو اس طرح تسلّی دے لیتا ہوں کہ مقروض ہونا بھی خدا کی رحمت ہے، میں اس حدیث پر پورا یقین رکھتا ہوں کہ "صَاحِبُ المَالِ کافرٌ"، جس پر حضرت ابو ذر غفاریؓ کا یقین و عمل تھا۔ کافر کے لفظ سے کیا مراد ہے اس بحث کو چھوڑ دو جو اس کی مراد ہو وہ ہو۔ لیکن ہم ابو ذر تو بن نہیں سکتے مگر خدا کی رحمت ہے جو اس نے ہم کو مقروض رکھکر کفر سے بچایا ہے، پس میرے دل کی تسلّی کو تو یہ خیال

کافی ہے"۔ معلوم نہیں کہ سرسید کو اس حدیث کے یقین نے مال جمع کرنے سے باز رکھا تھا یا جب مال جمع نہ ہو سکا تب اس حدیث پر یقین ہوا؟ درحقیقت یہ اُن کا حسنِ بیان تھا جس سے مخاطب کو تسلی دینا مقصود تھا ورنہ روپیہ پیسے کی محبت سرے سے اُن کی سرشت ہی میں نہیں پیدا کی گئی تھی اور وہی اثر اُن کی اولاد میں موجود تھا کہ باوجود معقول آمدنی کے ہمیشہ مقروض اور تہیدست رہی۔

سرسید کے ایک دوست ایک زمانہ میں اُن کے خانگی اخراجات کا حساب لکھا کرتے تھے اُن کا بیان ہے کہ جب مہینا ختم ہوا میں تمام اخراجات کا مختصر گوشوارہ بنا کر اُن کے دکھانے کو لے گیا، سرسید نے کہا "بس مجھے دکھانے کی کچھ ضرورت نہیں، یوں ہی چلنے دو، میں دیکھوں گا تو ناحق میرے دل کو صدمہ ہوگا"۔ حق یہ ہے کہ جو شخص رات دن اوروں کی صلاح و فلاح کی فکر میں رہیگا وہ اپنے خانگی انتظام کی طرف کیوں کر متوجہ ہو سکتا ہے؟ ولیم پٹ۔ جو اُن لوگوں میں سے تھا جنھوں نے انگلستان کو انگلستان بنایا ہے اُس کی نسبت لارڈ مکالے نے لکھا ہے کہ "نہ اُس کے بیوی تھی نہ بچے۔ نہ محتاج رشتہ دار تھے اور نہ اسراف کی عادت تھی، باوجود اس کے جب وہ مرا تو ہوس آف کامنس کو اُس کا قرضہ ادا کرنے کے لئے چار لاکھ روپیہ منظور کرنا پڑا۔ اگر وہ ہفتہ میں پندرہ منٹ بھی انتظام خانگی کے لئے صرف کرتا تو ان تمام اخراجات کا معقول انتظام ہو جاتا۔ اُس کے نوکروں کی لوٹ نہایت حیرت انگیز تھی، ایک ہفتہ میں صرف گوشت کا بل ساڑھے بارہ من کا تھا اور اسی کے قریب مرغ مچھلی اور چائے کا"۔

اگرچہ سرسید بمقابلہ وزیراعظم انگلستان کے ایک نہایت غریب اور کم حیثیت آدمی تھے مگر خانگی انتظام کے متعلق اُن کی بے اعتنائی بہ نسبت ولیم پٹ سے کچھ کم نہ تھی، صرف اتنا فرق تھا کہ ولیم پٹ کو یقین تھا کہ جس سلطنت کی بہتری کے لئے وہ اخیر دم تک کوشش کرتا رہا وہ اُس کا قرضہ ادا کرنے کی متکفل ہوگی مگر غریب سید کو چار لاکھ چھوڑ چار سو کا بھی ادا کرنے والا کوئی نظر نہ آتا تھا، اور اسی لئے، جہاں تک کہ ہم کو معلوم ہے۔ جس طرح کہ اُس نے وارثوں کے لئے کوئی معتدبہ جائداد نہیں چھوڑی اسی طرح قرضہ کا بوجھ بھی کسی پر نہیں ڈالا۔ اگر بالفرض کچھ قدر قلیل کسی کا دینا باقی رہ گیا ہوگا تو سید کی پولیٹکل پنشن۔ جو اُن کے بعد ایک نسل تک جاری رہنے والی ہے۔ اُس قرضہ کے لئے کافی سے بہت زیادہ ہے۔

انتقام کا خیال نہ ہونا | مخالفوں اور دشمنوں کی برائیوں کا تحمل کرنا اور کبھی اُن سے انتقام لینے کا ارادہ

نہ کرنا یہ بھی سرسیّد کے اُن اوصاف میں سے تھا جو اُن کی ذات کے ساتھ مخصوص تھی اس شخص کے صرف اقوال ہی سے نہیں بلکہ زیادہ تر اُس کے افعال سے ثابت ہوتا ہے کہ بُرائی کا بدلا لینا تو درکنار اُس کو کسی کی بُرائی یاد بھی نہیں رہتی تھی۔ بلا شبہ محمدن کالج کی بدخواہی یا جن اصول پر سرسید نے اُس کو قایم کیا تھا ان میں رخنہ ڈالنا اُس کو حد سے زیادہ ناگوار گزرتا تھا مگر جن لوگوں کی بُرائیاں اُس کی ذات تک محدود تھیں اور کالج تک اُن کا علانیہ طور پر کچھ اثر نہ پہونچتا تھا اُن کی نسبت قطعی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ اُن کی بُرائیاں اُس کو محسوس بھی ہوتی تھیں یا نہیں؟

اُن کے ایک دوست راوی ہیں کہ "مُرادآباد میں جب کہ سرسید وہاں صدرالصدور تھے۔ محکمہ صاحب جج کے ایک ہندو کلرک کو سرسید سے کچھ رنجش تھی، وہ اکثر گمنام عرضیاں ان کی شکایت کی اعلیٰ افسروں کو لکھا رہتا تھا۔ ایک بار جب کہ پولیس کا نیا انتظام ہوا تھا اُس نے ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس کو ایک عرضی لکھ بھیجی کہ صدراعلیٰ کے بھتیجے نے ایک عورت کو مار ڈالا ہے اور اُن کے گھر میں اس کی لاش موجود ہے فوراً تلاشی لی جائے۔ اُسی وقت پولیس کا عملہ اُن کے مکان پر چڑھ آیا۔ سرسید نے مکان میں پردہ کرادیا اور تلاشی لی گئی۔ مگر چوں کہ وہ محض اتہام تھا کوئی چیز برآمد نہیں ہوئی۔ سرسید کو اس کا نہایت رنج ہوا، مُرادآباد کا کوتوال اس جرم میں۔ کہ بغیر موجودگی مدعی کے تلاشی لی گئی۔ برخاست کیا گیا۔ سرسیّد اور اُن کے اکثر دوستوں کو خوب معلوم ہوگیا تھا کہ فلاں کلرک نے یہ عرضی لکھی تھی مگر سرسید نے اس کی کچھ پروا نہیں کی۔ جب وہ غازی پور بدل گئے اور کسی وجہ سے وہ کلرک نوکری سے علیٰحدہ ہوگیا تو ایک موقع پر جب کہ سرسیّد کے ایک معزز یوروپین دوست کسی اعلیٰ عہدہ پر ترقی پاکر غالباً سنٹرل انڈیا کو جاتے تھے اور جاتے ہوئے غازی پور میں ٹھیرے تھے۔ اُن کو ایک لائق انگریزی داں کی ضرورت ہوئی۔ چوں کہ سرسید اُس کلرک کی انگریزی لیاقت سے واقف تھے اُنھوں نے اُسی کی سفارش کی اور اُس کو گھر سے بلوایا چنانچہ وہ صاحب اُس کو دو سو روپیہ ماہوار کا نوکر رکھکر لے گئے۔" جو صاحب اس حکایت کے ناقل ہیں یہ کہتے تھے کہ "مدت کے بعد وہ کلرک مجھ سے ملا تو اُس نے صاف صاف بیان کیا کہ میں نے سید احمد خاں کے ساتھ برائی کرنے میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا، مگر اُس نے میرے ساتھ یہ سلوک کیا کہ مجھے دو سو کا نوکر رکھوا کر بھیجدیا۔ اُس نے کہا کہ حقیقت میں سید احمد خاں ایسا شخص ہے کہ جس کے سر پر اُس کی جوتیوں کی خاک پڑجائے اُس کی نجات ہوجائے۔"

جب رفیق ہند میں سرسید کے خلاف نہایت سخت سخت آرٹکل شائع ہونے لگے اور منشی سراج الدین اڈیٹر سرمور گزٹ نے اُس کا جواب لکھنے پر قلم اُٹھایا تو سرسیّد نے اُن کو لکھتے

ہیں "میں نے آپ کا اخبار مؤرخہ ۸ رجنوری پڑھا، بلا شبہ میں آپ کی محبت کا۔ جو آپ کو مجھ ناچیز سے ہے ممنون اور احسان مند ہوں اور آپ کو اُس تحریر کی نسبت جو اُس پرچہ میں ہے۔ بوجہ جوش محبت معذور سمجھتا ہوں، مگر جانے دو، جو جس کا دل چاہے کہے، ہمارا کیا بگڑتا ہے؟ اگر ہمارے بُرا کہنے سے اُن کا دل خوش ہوتا ہے خوش کر لینے دو، تم بھی اُس بُرا کہنے سے خوش ہو، کیوں کہ وہ ہمارے دھوبی ہیں، ہم کو گناہوں سے پاک کرتے ہیں:"

جب منشی سراج الدین نے اس کا جواب لکھا تو پھر سرسیّد نے اُن کو اسی مضمون کے متعلق دوسرا خط لکھا ہے۔ اُس میں لکھتے ہیں "ہم کو خدا نے دنیا میں اس لئے پیدا کیا ہے کہ سب کی بھلائی چاہیں۔ بُرا کرنے والے کی بُرائی سے ہم کو کیا کام ہے؟ ہم کو اپنا دل، اپنا کام، اپنی زبان بھلی رکھنی چاہیئے، بُرائی کرنے والوں پر افسوس کرنا چاہیئے۔ اس سے زیادہ کچھ کرنا خود اپنے آپ کو بھی ویسا ہی کرنا ہے۔ جو لوگ بُرا کہنے والے ہیں اُس کی نسبت ہم کو صبر و تحمل چاہیئے۔ اگر وہ بُرائی ہم میں ہے اُس کے دُور کرنے میں کوشش لازم ہے، اگر نہیں ہے تو خدا کا شکر کرنا چاہیئے کہ وہ بُرائی ہم میں نہیں ہے۔ بُرا کہنے والے کی نسبت خیال ہی نہیں چاہیئے کہ کون ہے؟ دنیا میں ہے بھی یا نہیں؟ پس یہی آرام و آسایش کا طریقہ ہے۔ اگر تم بھی چاہتے ہو کہ دنیا میں آرام سے رہو یہی طریقہ اختیار کرو۔"

"میرے نزدیک منشی ۔ ۔ ۔ کی کسی بات کے درپے ہونا نہیں چاہیئے، خدا کی۔ دُنیا میں بہت مختلف اقسام کی خلقت ہے، ہر ایک اپنا کام کرتا ہے، تم اپنا کام کرو، مگر جان لو کہ ہمارا کیا کام ہے۔ نیکی بھلائی اور اپنے کام سے مطلب، دوسرے کے کام سے کچھ غرض نہیں۔ جس سے دل رُکا ہوا ہو اس سے مت ملو، کیوں کہ اُس سے مل کر خوشی نہ ہوگی، یا منافقانہ طریقہ پر ظاہرداری کرنی پڑے گی۔ نہ ملنے میں بہ نسبت ملنے کے آرام ہے، اسی طرح اُن کی باتوں کی پرواہ نہ کرنے میں، بالکل آرام ہے۔"

اگرچہ سرسید فطرۃً نہایت عالی ظرف اور عالی حوصلہ پیدا ہوئے تھے اور عفو و اغماض اُن کی سرشت میں داخل تھا مگر اُن کی والدہ کی ابتدائی روک ٹوک اور حسن تربیت سے یہ تمام ملکات اُن کی طبیعت میں اور بھی زیادہ راسخ ہوگئے تھے۔ اُسی نیک اور عاقل ماں نے۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ بیٹے کے دل میں یہ بات ڈالی تھی کہ سب سے بہتر تو یہ ہے کہ بُروں کی بُرائی سے بالکل درگزر کی جائے اور اگر بدلا ہی لینے کا خیال ہو تو اُس بڑے اور زبردست

انتقام لینے والے کے انصاف پر چھوڑ دینا چاہیئے، اُسی نے لڑکپن میں یہ سبق پڑھایا تھا کہ بُرائی کرنے والوں کے ساتھ بُرائی کرنا خود آپ کو ویسا ہی بنانا ہے۔ اُسی تعلیم و تلقین کا یہ نیتجہ تھا کہ جن لوگوں نے اُس کے واجب القتل ہونے کے فتوے حرمین میں جاکر لکھوائے، جنھوں نے اُس کو کافر و ملحد و کرسٹان اور دجّال ٹھیرایا، جنھوں نے گمنام خطوں میں اُس کو گالیاں لکھکر بھیجیں اور قتل کی دھمکیاں دیں۔ اُن کی نسبت اُس نے علی رؤس الاشہاد یہ کہا کہ "میں اپنے کسی بھائی سے کسی ہمجنس سے نہ دنیا میں بدلا لینا چاہتا ہوں نہ قیامت میں، میں نہایت ناچیز ہوں مگر اُس رسول کی ذریت میں ہوں جو رحمۃ للعالمین ہے، میں اپنے دادا کی راہ پر چلوں گا اور تمام لوگوں کو جنھوں نے مجھکو بُرا کہا، جنھوں نے مجھپر اتہام کیا یا آیندہ کہیں اور کریں سب کو معاف کروں گا۔"

فی الحقیقت اچھی ماں اولاد کے حق میں خدا کی رحمت ہے جو اُس میں عمدہ اخلاق کی بنیاد ڈالتی ہے اور بُرائیوں کا رُخ نیکی کی طرف پھیر دیتی ہے۔ سرسید کے بچپن اور جوانی کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی طبیعت غیظ و غضب پر مجبول ہوئی تھی مگر ماں کے حسن تربیت نے گویا اُن کی ماہیت بالکل بدل دی تھی۔ اُن کے رشتہ داروں کے بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ ماں نے بیٹے کو کبھی کسی ماماں یا نوکر پر بھی سختی یا بد زبانی نہیں کرنے دی اور اگر کبھی کوئی ایسی حرکت اُن سے صادر ہوگئی تو اُن کو ایسی سزا دی گئی جو عمر بھر فراموش نہو۔ چنانچہ ایک بار جیساکہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں۔ ایک نوکر پر زیادتی کرنے کے جرم میں اُن کو گھر سے نکال دیا گیا۔ اور کئی دن کے بعد جب کہ اُنھوں نے نوکر سے قصور معاف کرالیا۔ تب گھر میں آنے کی اجازت ملی اگرچہ۔ جیساکہ حدیث میں آیا ہے۔ پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل سکتا ہے۔ مگر جبلت نہیں بدل سکتی لیکن عمدہ تربیت جس طرح گھوڑے کی توسنی اور سرکشی کو چالاکی سے بدل دیتی ہے اسی طرح انسان کے غیظ و غضب کو اولوالعزمی اور دلیری کے سانچے میں ڈھال دیتی ہے اور وہی چیز جو پہلے درندوں کی خصلت معلوم ہوتی تھی اب بڑے بڑے عظیم الشان ارادوں کی شکل میں ظہور کرتی ہے۔ سرسید میں یہ انقلاب نمایاں طور پر نظر آتا تھا۔ اُن کا جبلی غیظ و غضب فی الواقع ہمجنسوں کی حمایت اور جوش ہمدردی کے ساتھ بدل گیا تھا۔ اُن کو پرائیوٹ معاملات میں۔ سوا اس کے کہ کبھی کبھی نوکروں پر دودھ کا سا اُبال آجاتا تھا۔ بہت ہی کم غصے ہوتے دیکھا ہے، جو کچھ اُن کا غصہ یا افسوس تھا وہ قوم کی غفلت یا نالایقی پر تھا یا اُن کی تباہی و بربادی پر، یا قومی کاموں کی مخالفت اور مزاحمت پر یا قوم کے بیجا تعصبات اور

اُن کی پولیٹیکل بے وقعتی پر۔

ممکن ہے کہ بمقتضائے بشریت کسی کی طرف سے اُن کے دل میں کچھ رنج ہو مگر اُن کے ظاہر حال اور قول و فعل سے یہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ دنیا میں کسی کو اپنا دشمن نہیں سمجھتے تھے۔ کبھی اس شخص کو کسی کا ذکر بُرائی کے ساتھ کرتے نہیں دیکھا جو لوگ اُس کو لوگوں کے سامنے علانیہ گالیاں دیتے تھے اُن کا نام بھی وہ ہمیشہ ادب کے ساتھ لیتا تھا۔ اُس کے دل کی صفائی کا سب سے بڑا گواہ اُس کا اخبار تھا جو چھبیس[۲۶] برس جاری رہا مگر کبھی کسی کی مذمت یا بُرائی اُس میں نہیں لکھی گئی وہ جس طرح اپنے اخبار کو چھیڑ چھاڑ اور ہزل و حرف گیری و کج بحثی سے پاک رکھتا تھا اسی طرح اپنے اخبار نویس دوستوں کو ان لغویات سے بچنے کی نصیحت کرتا تھا۔ وہ ایک اخبار کے اڈیٹر کو لکھتا ہے جس میں بطور رپنچ اخباروں کے کسی کا ہزل آمیز خط چھپ گیا تھا "کیا آپ کا اخبار بھی مثل دیگر نالایق اخباروں کے نا مہذب ہونے کو ہے؛ نہایت افسوس اور کمال درجہ افسوس ہے کہ مضمون مذاق نوشتہ ۔ ۔ ۔ آپکے اخبار ۳۰ اپریل میں چھپا ہے آپ کا اخبار روز بروز ترقی کرتا جاتا تھا، لوگوں کا خیال اُس طرف رجوع تھا کیا اُس کا ارادہ ہے کہ اپنی تمام عزت و قدر کھودے"۔

اُسی اڈیٹر کو دوسرے خط میں لکھتے ہیں "میں دوستانہ صلاح دیتا ہوں کہ آپ اپنے اخبار کو مہذب بنائیں بدگو کے ساتھ اگر بدگوئی کی تو دونوں برابر ہو جاتے ہیں۔ میری نسبت لوگ کیا کیا کچھ نہیں لکھتے ہیں؟ کیا مجھے لکھنا نہیں آتا"؟

ایک دفعہ منشی سراج الدین احمد اڈیٹر سرمور گزٹ نے اپنے اخبار میں ریاست بھاولپور کی شکایت لکھدی کہ وہاں سے علی گڑھ کالج کے لئے کچھ چندہ نہیں پہنچا۔ سرسید نے فوراً اُن کو متنبہ کیا اور لکھا کہ "سرکار بھاولپور نے دو دفعہ ہزار ہزار روپیہ کالج کے لئے اور چند روز ہوئے کہ ایک ہزار روپیہ واسطے تعمیر مسجد کے مرحمت کیا ہے۔ چونکہ اس کی اطلاع آپ کو ضرور تھی اس لئے فی الفور یہ مختصر نیاز نامہ روانہ کرتا ہوں"۔

الغرض اُس کے تمام جذبات اور تمام پیشن ایک قومی ہمدردی کے جوش میں بالکل جذب ہوگئے تھے، اُس کا غصہ تھا تو قوم کے لئے شکایت تھی تو قوم کے لئے حرص و طمع تھی تو قوم کے لئے اور خود غرضی تھی تو قوم کے لئے، اپنے لئے کھانے پینے اور سونے کے سوا کچھ باقی نہ رہا تھا۔

خود غرضی کا الزام | سرسید پر اکثر خود غرضی کا الزام لگایا گیا ہے۔ بیشک خود غرضی کو اگر زیادہ وسیع

معنوں میں لیا جائے تو ایک لحاظ سے اُن کو خود غرض کہا جا سکتا ہی۔ جو عظیم الشان کام اُنھوں نے قوم کی ترقی کے لئے اختیار کیا تھا اور جس کے بغیر وہ قوم کی حالت کا درست ہونا غیر ممکن سمجھتے تھے۔ بلا شبہ اُن کی یہ خواہش تھی کہ ہندوستان کے چھ کروڑ مسلمان یکدل و یک جان ہو کر اپنی تمام ہمت، طاقت اور استطاعت اُس کام کے پُورا کرنے میں صرف کر دیں اور جب تک اُس کو منتہائے ترقی تک نہ پہونچالیں دوسرے کام کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھیں۔ یہاں ہم کو اس سے کچھ بحث نہیں کہ اُن کی یہ خواہش ممکن الوقوع تھی یا نہیں ؟ اور آیا فی الواقع ۔جیسا کہ وہ سمجھتے تھے مسلمانوں کی بھلائی کا صرف یہی ایک رستہ تھا کہ سب مل کر اُن کے کام میں مدد کریں ؟ مگر اس میں شک نہیں کہ وہ ایسا ہی سمجھتے تھے۔ اگر اسی کا نام خود غرضی ہے تو ہم کو اپنی قوم کی بہبودی کے لئے ایسے بہت سے خود غرضوں کی ضرورت ہی اور ہم اُمید کرتے ہیں کہ اگر مسلمانوں میں ایسے دس بیس بلکہ دو چار خود غرض بھی اور پیدا ہو جائیں تو ساری قوم کا بیڑا پار ہو جائے۔ دُنیا میں ایسے نیک آدمیوں کی کچھ کمی نہیں ہی جو ہر ایک کے کام میں مدد دینے اور ہر ایک گاڑی میں کندھا لگانے کو موجود ہیں، لیکن ایسے افراد صدیوں اور قرنوں کے بعد پیدا ہوتے ہیں جو تمام دنیا کو اپنا معاون و مددگار بنانے کا ارادہ رکھتے ہوں۔ اُن کو اپنے کام کی بڑائی کا ایسا یقین ہوتا ہی کہ اُس کو تمام دُنیا کے کاموں سے مقدم جانتے ہیں اور چوں کہ اور لوگ بھی جوں جوں اُن کے کام کی حقیقت کھلتی جاتی ہی۔ اُس کو ویسا ہی یقین کرتے جاتے ہیں اس لئے اُن کے دل میں اپنے کام کی عظمت روز بروز زیادہ ہوتی جاتی ہی۔

حُبِّ جاہ کا الزام | بعض اصحاب یہ بھی فرماتے ہیں کہ سیّد احمد خاں نے جو کچھ قوم کی خیر خواہی کے پردہ میں کیا اُس سے محض اپنی ناموری اور شہرت اور گورنمنٹ میں اعزاز حاصل کرنا مقصود تھا۔ وہ لوگ ہیں جو اس حسرت میں مرے جاتے ہیں کہ ہم کو بھی ویسی ہی ناموری اور اعزاز حاصل ہو جائے مگر چوں کہ اُس کا استحقاق نہیں رکھتے اس لئے کبھی اپنی مُراد کو نہیں پہنچتے۔ وہ نہیں جانتے کہ عزت چاہنے سے عزت حاصل نہیں ہوتی بلکہ عزّت کے لایق کام کرنے سے عزّت حاصل ہوتی ہی جو لوگ قوم کی خیر خواہی کی آڑ میں اپنی شہرت اور اعزاز چاہتے ہیں نہ اُن سے قوم کو کچھ فائدہ پہنچتا ہے اور نہ خود اُن کو شہرت اور عزت نصیب ہوتی ہے۔ لیکن جو شخص سچے دل سے قوم کی بھلائی کے کام کرتا ہے۔ عام اس سے کہ وہ اپنی شہرت و عزت کا خواہاں ہو یا نہو۔ وہ قوم کو بھی فائدہ پہونچاتا ہی اور خود بھی شہرت و عزت حاصل کرتا ہے۔ اسی لئے کہا گیا ہے

کہ "فَوِّضْ مَدْحَكَ وَ ذَمَّكَ اِلٰی اَفْعَالِكَ فَاِنَّهَا تَمْدَحُكَ بِصِدْقٍ اِنْ اَحْسَنْتَ وَتَذُمُّكَ بِحَقٍّ اِنْ اَسَأْتَ۔"[1]

جو لوگ سرسیّد کی نسبت ایسے پست خیال رکھتے ہیں اُن کے جواب میں اُس سے زیادہ کہنا فضول ہے جو نواب عماد الملک نے سرسیّد کی دعوت کے جلسہ میں۔ جو نظام کلب حیدرآباد میں ۱۸۹۱ء میں منعقد ہوا تھا کہا تھا کہ "کاش مسلمانوں میں سید احمد خاں کے سوا کوئی دوسرا شخص ایسا ہی پیدا ہو جائے جو اپنی ناموری اور شہرت کے خیال سے قوم کے لئے ایسے مفید کام کر کے دکھا دے جیسے کہ اس شخص کے ہاتھ سے سرانجام ہوئے ہیں۔"

اپنی رائے پر وثوق منجملہ اور بڑے بڑے اوصاف کے ایک وصف۔ جس کو سرسید کے تمام کارہائے نمایاں کی بنیاد سمجھنا چاہیئے۔ اُن میں یہ تھا کہ اُن کو اپنی ہر ایک رائے پر۔ خواہ مذہبی مسائل سے متعلق ہو اور خواہ کسی اور معاملہ سے۔ ہمیشہ ایسا وثوق معلوم ہوتا تھا کہ کسی دلیل یا برہان یا مخالف پارٹی کی مجاری سے اُس میں تزلزل آنے والا نہیں۔ اسی لئے اُن کو عموماً خودرائے اور ہٹیلا کہا جاتا تھا۔ یہ تو ظاہر ہے کہ اُن کی ہر ایک رائے جس پر اُن کو اصرار ہوتا تھا۔ ہمیشہ صائب اور غلطی سے پاک نہیں ہوسکتی تھی۔ مگر اس میں شک نہیں کہ اگر اُن کو اپنی رایوں پر ایسا وثوق۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا۔ نہ ہوتا۔ تو جو بڑے بڑے کام اُن سے بَن آئے اُن میں سے ایک بھی ظہور میں نہ آتا۔ اُنھوں نے قوم کی بھلائی کے لئے جتنے کام اُٹھائے وہ سب قوم کے خیالات سے بالاتر اور اُن کی سمجھ سے باہر تھے۔ یہاں تک کہ ولایت میں۔ جیسا کہ اُن کے بعض خطوط سے معلوم ہوتا ہے۔ وہ اپنے منصوبوں سے سید مہدی علی خاں کے سوا اپنے اور دوستوں کو بہت کم مطلع کرتے تھے۔ کیونکہ کسی سے یہ اُمید نہ تھی کہ ان کی رائے سے اتفاق کرے گا اور اُن کی ہمّت بندھوائیگا۔ پھر جب ہندوستان میں آکر اُنھوں نے اپنے منصوبے علی الاعلان پورے کرنے کا ارادہ کیا تو۔ جیسا اُن کو خیال تھا۔ ہزاروں مخالف کھڑے ہوگئے اور جہاں تک ہوسکا اُن کے کاموں میں کھنڈت ڈالی۔ باوجود اس کے ہر ایک کام میں اُن کو توقع سے زیادہ کامیابی ہوئی۔ مخالفتیں روز بروز کم ہوتی گئیں اور آخر کار اُن کے کام نہایت عظمت اور وقعت کی نگاہ سے دیکھے جانے لگے۔ اگر اُن کی رائیں متزلزل ہوتیں اور اُن کو اپنی تجویزوں اور منصوبوں پر کامل وثوق نہ ہوتا تو کیوں کر ایسے

---

[1] یعنی اپنی تعریف اور مذمّت اپنے کاموں کو سونپ دو کیوں کہ وہی تمہاری بھلائی کے سچے مدّاح اور تمہاری بُرائی کی سچے مذمّت کرنے والے ہیں۔ ۱۲

کاموں پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت ہو سکتی تھی سارا زمانہ مخالف ہو، اور کیوں کر اُن کی کوششیں اس درجہ تک کامیاب ہو سکتی تھیں۔ پھر جس قدر اُن کی تجویزیں اور منصوبے پورے ہوتے گئے اور جس قدر لوگوں کی مخالفت بیجا اور ناواجب ثابت ہوتی گئی اُسی قدر اُن کو اپنی رایوں پر زیادہ وثوق ہوتا گیا اور اپنی ہر ایک رائے پر اُن کا اصرار روز بروز بڑھتا گیا۔ اب چاہو اس خصلت کو اُن کی خود رائی اور ہٹیلے پن کے ساتھ تعبیر کرو اور چاہو یہ سمجھو کہ دنیا میں جتنے بڑے آدمی ہوئے ہیں اور جن سے مخلوق کو عظیم الشان فائدے پہنچے ہیں وہ سب ایسے ہی قوی اور مضبوط دل والے تھے کہ جو ارادہ کرتے تھے اُس پر ثابت قدم رہتے تھے اور جو منصوبہ باندھتے تھے اُس کو پورا کر کے چھوڑتے تھے۔ اُن کی رائیں مستقل اور غیر متزلزل ہوتی تھیں وہ اپنی غلط رایوں پر بھی ویسا ہی اصرار کرتے تھے جیسا صحیح رایوں پر، کیوں کہ وہ اُنھیں رایوں کو اپنے نزدیک صحیح سمجھتے تھے۔

بایں ہمہ اس بات سے انکار نہیں ہو سکتا کہ آخر عمر میں سرسید کی خود رائی یا وثوق کہ اُن کو اپنی رایوں پر تھا وہ حدِ اعتدال سے متجاوز ہو گیا تھا۔ بعض آیات قرآنی کے وہ ایسے معنی بیان کرتے تھے جن کو سن کر تعجب ہوتا تھا کہ کیوں کر ایسا عالی دماغ آدمی ان کمزور اور بودی تاویلوں کو صحیح سمجھتا ہے؟ ہرچند کہ اُن کے دوست اُن تاویلوں پر ہنستے تھے مگر وہ کسی طرح اپنی رائے سے رجوع نہ کرتے تھے۔ کالج کے متعلق بھی اخیر زمانہ میں اُن سے بعض امور ایسے سرزد ہوئے جن کو لوگ تعجب سے دیکھتے تھے، مگر درحقیقت ان میں سے کوئی بات بھی تعجب کے قابل نہ تھی۔ جو حیرت انگیز کامیابی باوجود سخت مخالفتوں اور مزاحمتوں کے سرسید کو اپنے مقاصد میں ہوئی اُس کا لازمی نتیجہ تھا کہ آخر عمر میں۔ جو کہ قویٰ کے انحطاط اور ضعف کا زمانہ تھا۔ ان کو اپنی اصابت رائے پر جتنا کہ چاہیے تھا اُس سے زیادہ اعتماد ہو جائے اور وہ اپنی عقل اور سمجھ خطا اور غلطی سے پاک سمجھنے لگیں اس کے سوا اخیر عمر کے صدمات نے بھی اُن کے دل و دماغ پر کچھ کم اثر نہیں کیا تھا۔ قطع نظر اس کے انسان کا منتہائے کمال یہ ہے کہ اُس میں عیب کم اور خوبیاں زیادہ ہوں، نہ یہ کہ وہ عیبوں سے بالکل پاک ہو۔ پس سرسید میں باوجود بیشمار خوبیوں اور حیرت انگیز اوصاف کے اس قسم کی کمزوریوں کا پایا جانا بجائے اس کے کہ اُن کے اخلاقی نقص کی دلیل ہو۔ اُن کے اعلیٰ درجہ کی اخلاقی فضیلت اور کاملیت پر دلالت کرتا ہے گویا شاعر نے سرسید ہی کی شان میں یہ شعر کہا تھا ؎

مِنْ شَرِّ اَعْیُنِهِمْ عَیْبٌ وَاحِدٌ ۔ فَاسْتَعِذْ — تَخُصُّ الْاَنَامُ اِلَى الْكَمَالِكَ

(یعنی تیرے کمالات دیکھکر لوگوں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی ہیں سو اُن کی نظر بد سے بچنے کے لئے کسی عیب کی پناہ دے)

مذہب | سرسید کی مذہبی خدمات و اصلاحات اور مذہبی تحقیقات کے متعلق جو کچھ اُن کی تصنیفات سے ثابت ہُوا۔ بقدر ضرورت بیان ہو چکا ہے یہاں ہم ان کے وہ مذہبی خیالات دکھانے چاہتے ہیں جو اُنھوں نے اپنے پرائیویٹ خطوں میں یا کسی پبلک تقریر میں ظاہر کئے ہیں اور جن سے اُن کے دل کی اصلی کیفیت اور اعلیٰ واردات منکشف ہوتے ہیں؛ کیوں کہ تصنیفات میں جو کچھ لکھا جاتا ہے وہ بعد غور و خوض کے تمام پہلو اور جوانب دیکھکر لکھا جاتا ہے؛ اور جہاں تک مصنف کے امکان میں ہوتا ہے وہ اپنی تصنیف کو کم سے کم اُن لوگوں کی نکتہ چینی سے بچانے میں ضرور کوشش کرتا ہے جن کو وہ اپنے نزدیک مخالف صحیح جانتا ہے۔ برخلاف اس کے پرائیویٹ خطوط جو وہ اپنے محرم اور ہمراز دوستوں کو لکھتا ہے اور پبلک تقریریں جنھیں سوچنے اور غور کرنے کا بہت کم موقع ملتا ہے اُن سے اُس کے دل کی ننگی تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے اور اُس کے دلی خیالات روز روشن کی طرح سب پر ظاہر ہوتے ہیں پس مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے مذہبی خیالات جو کھلے طور پر اُنھوں نے اپنے رازدار دوستوں کو لکھے ہیں یا کسی پبلک جلسہ میں بے ساختہ اور برجستہ ظاہر کئے ہیں یا جو ایسے ہی کسی اور طریق سے ہم تک پہنچے ہیں اس عنوان میں کسی قدر ترتیب کے ساتھ بیان کئے جائیں۔

حقیقت اسلام کا یقین | جہاں تک کہ سرسید کے اقوال اور افعال اور خیالات سے استدلال ہو سکتا ہے اُن کو دین اسلام کی حقیقت پر ایسا یقین معلوم ہوتا ہے کہ اس سے زیادہ تصور میں نہیں آسکتا اگرچہ اُن کے مذہبی خیالات اور مذہبی عقائد مسلمانوں کے کسی خاص فرقہ کے خیالات اور عقاید کے تابع نہ تھے، مگر اُن کا ایک عقیدہ بھی شاید ایسا نہ نکلے گا جو اصولاً کسی نہ کسی اسلامی فرقہ کے عقیدہ سے مطابقت نہ رکھتا ہو۔ اُن کو اہل سُنّت کی قدیم اصطلاح کے موافق زیادہ سے زیادہ مبتدع کہا جا سکتا ہے جیساکہ اکثر اکابر اسلام کو کہا گیا ہے لیکن اُن کی نسبت کافر یا ملحد یا نیچری یعنی نیچرلسٹ کہنا اُسی قسم کا بہتان ہے جیسا کہ ہر زمانہ اور ہر ملک اور ہر مذہب میں محققوں اور مصلحوں پر کیا گیا ہے۔

اُنھوں نے جو لکچر ۱۸۸۴ء میں بمقام لاہور اسلام پر دیا تھا۔ اُس میں اپنے عقائد صاف صاف بیان کئے تھے۔ اس لئے اوّل ہم اُس لکچر کے چند مقامات اس مقام پر نقل کرتے ہیں

لیکن ہر ایک عقیدہ کے ساتھ جو کچھ اُنھوں نے بطور دلیل کے بیان کیا ہے اُس کو اُن کے لکچر میں دیکھنا چاہیئے۔

اوّل اُنھوں نے کہا کہ "میں ایک جاہل آدمی ہوں نہ مولوی ہوں، نہ مفتی، نہ قاضی اور نہ واعظ نہ میری یہ خواہش ہے کہ کوئی شخص، گو وہ کیسا ہی دوست ہو۔ وہ میرے خیالات کی پیروی کرے؛ میں رسولوں کے سوا کسی شخص کا ایسا منصب نہیں سمجھتا کہ اُن باتوں میں جو خدا اور بندوں کے درمیان دلی اور روحانی امور سے متعلق ہیں اور جن کو مذہب کہتے ہیں۔ وہ یہ خواہش کرے کہ لوگ اُس کی پیروی کریں یہ منصب رسولوں کا تھا اور آخر کو جناب رسولِ خدا محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر۔ جن کا ازلی سنت خدا ابدالاباد تک قایم رکھے اور ضرور قایم رکھے گا کیوں کہ جیسا وہ ازلی ہے ابدی بھی ہے۔ ختم ہو گیا"

توحید | پھر کہا کہ "وہ چیز جس پر یقین کرنے سے کوئی شخص مسلم یا مسلمان کہا جا سکتا ہے وہ خدا کی توحید جو شخص خدا کو برحق جانتا ہے اور اُس کی توحید پر یقین رکھتا ہے وہ مسلمان ہے۔ یہی رُکن اوّل اور رکن اعظم اسلام کا ہے اور باقی ارکان اُس کے تحت میں اور اُس کے ساتھ اس طرح ملے ہوئے ہیں جیسے کسی خاص دوا کی معجون ہو اور اُسی کے ساتھ اُس کے اجزا بھی ملے ہوئے ہوں خدا کو واحدِ مطلق اور خالق تمام چیزوں کا جاننا اور سمجھنا۔ نہ صرف جاننا اور سمجھنا بلکہ اُس پر یقین کرنا۔ اسلام ہے اور جو اُس پر یقین کرے وہ مسلم ہے۔"

پھر کہا کہ "خدا پر اور وحدانیت پر اُس وقت یقین ہو سکتا ہے جب اُس کی ذات اور صفات پر جو حقیقت میں متحد ہیں۔ اور اُسی کے استحقاقِ عبادت پر۔ جو اُس کو لازم ہے۔ پورا پورا یقین ہو۔ اُس کی ذات کا یقین تو اُس کے موجود بالذات ازلی و ابدی وحدہٗ لاشریک لہٗ ہونے پر یقین ہوتا ہے۔ اس کی صفات کا یقین اُس کے مانند صفات کا کسی دوسرے میں نہ ہونے پر یقین کرنا ہے۔ تمام صفتیں جو خدا سے منسوب کی جاتی ہیں۔ عالم، رحیم، حی، اور مثل ان کے اور جو اُن کا مفہوم ہماری ذہن میں آتا ہے اور جن میں اور لفظ کا اشتراک بھی بوجہ نامتصوّر ہوتا ہے اُس مفہوم سے اور اُس اشتراک سے بھی خدا کی صفات کو مبرا اور منزہ ماننا اس کی صفات پر یقین ہوتا ہے۔ اُس کے استحقاقِ عبادت پر یقین یہ ہے کہ کوئی شے سوا خدا کے مستحق عبادت نہیں۔ جو شخص کہ اس طرح سے خدا پر یقین رکھتا ہے وہ مسلمان ہے ...... ہاں ایسے شخص کی نسبت جو صرف خدائے واحد کو مانتا ہے میں یہ ضرور کہوں گا کہ وہ محمدی نہیں ... محمدی ہونے کے لئے ضرور ہے کہ ہم اُس شخص پر بھی جس نے ہم کو توحید کی نعمت دی ... جس کی وجہ سے ہم نے خدا کو جانا اور اُس کی صفات کو پہچانا۔ یقین کریں۔ خود عقل ہی ہم کو ہدایت کرتی ہے کہ جس سے ہم کو

ہدایت ہوئی کس طرح ہوسکتا ہی کہ ہم اُس کے ہادی ہونے پر یقین نہ کریں اسلام جس کو میں نے ایسے استحکام سے سچّا بتایا اُس کی ہدایت محمّد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کی ہی۔ پس اُس کی تصدیق بالضرور دوسرا رکن اسلام کا ہی جو پہلے رکن سے منفک نہیں ہوسکتا"

اُس تمام تقریر کا نتیجہ یہ ہے کہ جو شخص خدا کو مانتا ہی اور وحدہٗ لاشریک جانتا ہے اور اُس پر یقین رکھتا ہی اور کسی نبی کی تصدیق نہیں کرتا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی تصدیق نہیں کرتا اُس کی نسبت یہ کہنا کہ محمدی نہیں یا مرادف معنی لے کر یہ کہنا کہ وہ مسلمان نہیں۔ بالکل صحیح ہے مگر اُس کو کافر بمعنی مشرک کہنا یا موحد نہ کہنا اسلام کے اصول کی رو سے درست نہیں۔ ۔ ۔ موحدین محض کے مخلد فی النار ہونے یا نہونے پر قدیم سے علما میں بحث چلی آتی ہے؛ کوئی کہتا ہی کہ مخلد فی النار ہوں گے، کوئی کہتا ہے کو بعد عذاب کے نجات پا دیں گے۔ اس بحث کو انھیں عالموں کے حلے چھوڑ دو اور ہم کو اپنے حبیب کے اس قول پر رہنے دو کہ "علیٰ رغم انفِ ابی ذرٍّ"[1]

فرائض منصوصہ | پھر کہا کہ توحدانیت اور رسالت کی تصدیق کے بعد اور چیزیں بھی اسلام کے ساتھ ہیں جن کو خدا تعالےٰ نے فرض قرار دیا ہے، مثلاً نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ وغیرہ۔ ان فرائض کے ادا نہ کرنے والے کو ہم گنہگار اور اُن کے منکر کی نسبت وہی کہیں گے جو رسالت کے منکر کی نسبت کہا ہی کہ وہ محمدی نہیں یا بمعنی مرادف مسلمان نہیں۔ اُس کے مخلد فی النار ہونے یا نہونے کی وہی بحث پیش آجاتی ہے جو ابھی موحد محض کی نسبت میں نے بیان کی"

شرک فی النبوۃ | پھر کہا کہ وہ شرک کی بحث۔ جو کہ اسلام کا پورا دشمن ہی اور جس کے ساتھ اسلام جمع ہی نہیں ہوسکتا بہت بڑی ہی، مگر میں اس وقت ایک شمہ اُس کا بیان کروں گا جس طرح خدا کو اپنی ذات وصفات میں وحدت ہی اسی طرح رسول کو تبلیغ احکام شریعت کے قرار دینے میں وحدت ہی اور کسی کو اُس میں شرکت نہیں پس جو شخص رسول کے سوا کسی اور شخص کے احکام کو دین کی باتوں میں اس طرح پر واجب العمل سمجھتا ہے کہ اُس کے برخلاف کرنا گناہ ہے اور اُسی کی تابعداری کو باعث نجات یا ثواب سمجھتا ہی۔ وہ بھی ایک قسم کا شرک کرتا ہی جس کو میں شرک فی النبوت سے تعبیر کرتا ہوں۔ خدا نے یہود و نصاریٰ دونوں کو اسی بات

---

[1] یہ اُس حدیث کی طرف اشارہ ہی جس کو بخاری اور مسلم نے روایت کیا ہی ابوذر غفاری سے اور جس کا مضمون یہ ہے کہ آنحضرت نے ابوذر سے فرمایا "ما من عبد قال لا الٰہ الا اللہ ثم مات علیٰ ذلک الا دخل الجنۃ" اُنھوں نے یہ سُن کر تین بار از راہ تعجب یہ الفاظ عرض کئے کہ وان زنیٰ وان سرق ؟ اور آپ نے ہر دفعہ یہی فرمایا کہ وان زنیٰ وان سرق اور تیسری دفعہ اُس کے ساتھ یہ بھی فرمایا کہ علیٰ رغم انف ابی ذر۔ ۱۲

پر ملزم ٹھیرا کر فرمایا "اتخذوا احبارھم ورھبانھم ارباباً من دون اللّٰہ" پس اس طرح کی

آئمہ مجتہدین | پیروی ارباباً من دون اللہ تک پہنچا دیتی ہے۔ میری اس تقریر سے آپ یہ تصور نہ کریں کہ میں آئمہ مجتہدین کے برخلاف رائے رکھتا ہوں، نہیں، میں اُن کو امت کا سرتاج اور اُن کے اجتہادوں اور اختلافوں

مقلدین | کو باعث رحمت سمجھتا ہوں۔ یہ بھی آپ خیال نہ کریں کہ میں اُن کے پیرو مقلدین کو برا کہتا ہوں یا تقلید کو بُرا جانتا ہوں مگر اس قدر ضرور سمجھتا ہوں کہ مقلدین کے بعض افعال اس حد تک ضرور پہنچ گئے ہیں کہ

غیر مقلدین | اُنہوں نے اپنی غلطی سے۔ نہ کہ اُن کی تقلید سے اُنکو ارباباً من دون اللہ تک پہنچا دیا ہے جو لوگ اس مسئلہ تقلید کے برخلاف ہیں اور عدم تقلید کے مسئلہ کی پیروی کرتے ہیں اور اس کے اجرا میں کوشش کرنی چاہتے ہیں اُن کی بھی میں عزت کرتا ہوں میں سمجھتا ہوں کہ دونوں کا مقصود ایک ہے اور دونوں خدا اور رسول کی خوشنودی چاہتے ہیں مگر افسوس ہے کہ ان دونوں فرقوں کے سبب باہم رنج و عداوت پیدا ہوئی ہے یہ شیطان کے وسوسے ہیں جو گروہ اسلام کو متفرق کرنے اور قوت کو ضعیف کرنے کی فکر میں ہے حقیقت میں اسلام لا الٰہ الا اللّٰہ محمد رسول اللّٰہ کہنا اور اُسپر دل سے یقین رکھنا اور سب کلمہ گویوں کو بھائی سمجھنا ہے۔ باہمی اختلاف کی وجہ سے اسلام کے مجمع کو متفرق کرنا اصول اسلام کے برخلاف ہے، اور اس کی برکت کی ناشکری ہے جو خدا نے دی ہے اور جسکو فَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِکُمْ کے لفظوں سے تعبیر کیا ہے۔"

نبوت پر استدلال | پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر مندرجہ ذیل تقریر کی "ایک ایسے شخص نے جو ریتیلے کنکریلے ملک میں پیدا ہوا، چھوٹی عمر میں یتیم ہوگیا، جسنے نہ کسی دارالعلوم میں تعلیم پائی، نہ سقراط اور بقراط اور افلاطون کے مسائل کو سنا، نہ کسی استاد کے سامنے تعلیم کو بیٹھا۔ نہ حکما اور فلاسفروں اور پولٹکل و مارل سائنس کے عالموں کی صحبت اُٹھائی۔ بلکہ چالیس برس اپنی زندگی کے ناتربیت یافتہ اور بداخلاق اونٹ چرانے والوں میں بسر کئے۔ چالیس برس تک بجز ایسی قوم کے۔ جو بت پرستی اور باہمی جنگ وجدال میں مبتلا تھی اور چوری اور زناکاری پر مرد عورت کو فخر تھا۔ اور کسی کو نہیں دیکھا، وہ دفعۃً اپنی تمام قوم کے برخلاف اُٹھا، چاروں طرف سے وہ بت پرستی میں گھرا ہوا تھا مگر اُس نے کہا تو یہ کہا لا الٰہ الا اللّٰہ! اس نے صرف یہ کہا ہی نہیں بلکہ تمام قوم سے بھی جو سینکڑوں برس سے لات ومنات وعزّیٰ کو پوجتی آتی تھی یہی کہوا دیا، ان تمام بداخلاقیوں اور امِ مورل عادتوں کو تمام قوم سے مٹوا دیا۔ بتوں کو زمین پر گروایا، اُن کو توڑ ڈالا، اور خدا کے نام اور خدا کے پرستش کو تمام عرب کے جزیرہ نما میں بلند کیا۔ وہ جزیرہ جو ابراہیمؑ اور اسمعیلؑ کے بعد سے ہزاروں ناپاکیوں سے ناپاک ہوگیا تھا پھر اُسکو اُسکی اصلی پاکی اور دین ابراہیمؑ

کی بزرگی تک پہنچا دیا - چالیس برس بعد کس نے یہ نور اُسکے دل میں ڈالا؟ جس نے نہ صرف جزیرۂ عرب کو بلکہ تمام دنیا کو روشن کر دیا"

"اُسنے لا الہ الا اللہ کی تعلیم کے بعد جو احکام دین کے اور اخلاق کے لوگوں کو بتائے کیا کوئی فلاسفر اس سے زیادہ بتا سکتا تھا جو اس اُمی نے بتائے؟ صرف بتائے ہی نہیں بلکہ اپنے پاک دل اپنی پاک زبان کے اثر سے لوگوں کے دلوں میں بٹھلا دئے - یہ کام وہ تھا جو نہ کسی فلاسفر سے ہو سکتا تھا نہ کسی سلطان مقتدر سے -

پھر کیا چیز اُس بچہ میں تھی جس نے نہ جزیرۂ عرب کو بلکہ تمام دنیا کو خدائی کا کرشمہ دکھلایا؟ کوئی سخت سے سخت دہریہ اور لا مذہب بھی اگر ایسے شخص کو معاذ اللہ نبی نہ مانیگا تو اُسکو یہ ماننا تو ضروری پڑے گا کہ اگر بعد خدا کے کوئی دوسرا شخص بزرگ ہے تو یہی ہے - روحی فداک یا رسول اللہ - پس جو شخص نبوت کی حقیقت کو سمجھ لیگا تو امکان سے خارج ہے کہ محمد رسول اللہ کی تصدیق نہ کرے"

اعجاز قرآن

پھر قرآن کے معجز ہونے پر مندرجۂ ذیل تقریر کی "قرآن مجید جو تیرہ سو برس سے معجز یقین کیا جاتا ہے میں بھی اُسکو معجز مانتا ہوں مگر ہمارے قدما نے صرف ایک اور یہی دلیل اُسکے معجز ہونے کی قرار دی تھی؛ یعنی فصاحت اور کلام کی عمدگی اور وہ بھی اس وجہ سے کہ آجتک کسی بشر سے نہ کسی فصیح اور بلیغ سے اُسکی ایک یا دس آیتوں کے برابر بھی ویسا فصیح کلام نہیں کہا گیا - باوجودیکہ اُسنے بطور مقابلہ کے کہا گیا کہ اگر کہہ سکتے ہو تو کہہ لاؤ - بلا شبہہ میں بھی قرآن مجید کو ایسا ہی فصیح و بلیغ تسلیم کرتا ہوں . . . لیکن یہ دلیل . . . ایسی نہیں ہے جو غیر معتقد لوگوں کے مقابلہ میں پیش کیجا سکتی ہو اور اُسکے دل کو تسلی دیسکتی ہو - میں ایک دلیل رکھتا ہوں جسکو میں اس دلیل سے زیادہ مضبوط سمجھتا ہوں - وہ دلیل کیا ہے وہ ہدایتیں انسان کے لئے ہیں جو قرآن مجید میں بیان کی گئی ہیں - کوئی اور ہدایت اُسکے مثل ٹھیک نہیں ہو سکتی - میں اسکو بھی معجزہ بلکہ اصلی معجزہ قرآن مجید کا سمجھتا ہوں"

"قرآن مجید اُس زمانہ میں نازل ہوا جو جاہلوں اور ناواقفوں اور ناتربیت یافتہ لوگوں کا زمانہ تھا؛ وہ اُس زمانہ کے جاہل لوگوں کی ہدایت کے لئے ہی تھا اور اُن اعلیٰ درجہ کے تعلیم یافتہ لوگوں کی ہدایت کے لئے بھی تھا جو اُس وقت کی دنیا میں تھے اور جو آیندہ دنیا میں ہونے والے تھے؛ ضرور تھا کہ اُسکی ہدایتیں اس طرح پر بیان کی جائیں کہ اُس سے ایک صحرائی اونٹ چرانے والا بدو اور ایک اعلیٰ درجہ کا حکیم سقراط اور بقراط دونوں برابر فائدہ اُٹھائیں - قرآن مجید ہی صرف ایسا کلام ہے جس میں یہ صفت موجود ہے اور جس سے مختلف درجوں بلکہ متضاد حیثیتوں کے لوگوں کو یکساں ہدایت ہوتی ہے - ایک

نجاہل بدو، ایک مقدس مولوی اُسکے لفظی معنوں سے جیسی ہدایت پاتا ہے ایسا ہی ایک فلاسفر اُنہیں الفاظ کے مقصود سے ویسی ہی ہدایت پاتا ہے اور کسی لفظ کو نیچر یا فلسفہ سے خلاف نہیں پاتا۔ کسی زبان میں فرنچ، لیٹن، عربی، فارسی، سنسکرت، وغیرہ میں کوئی ایسی کتاب لکھدو یا اگلے زمانہ کی لکھی ہوئی بتادو جس میں اعلیٰ سے اعلیٰ مضامین فلسفہ اور حکمت کے بھرے ہوئے ہوں اور پھر نہایت دلکش اور سہل الفاظ میں اور پھر اُس سے جاہل اور عالم عامی اور فلسفی سب کو یکساں فائدہ حاصل ہو اور سب کے دل پر یکسان اثر ڈالے، نہایت ناممکن ہے۔ مگر قرآن مجید ہی ہے جس میں یہ تمام خوبیاں موجود ہیں اور یہی اُسکا اصلی اور سچا اور واقعی معجزہ ہے۔ اُسکے مسائل جیسے اُس زمانہ میں سچے تھے جبکہ زمین ساکن مانی جاتی تھی، ویسی ہی اب بھی سچے اور قابل تسکین ہیں جبکہ سورج ساکن اور زمین گھومتی مانی جاتی ہے اور اگر یہ حکمت و فلسفہ جو اس زمانہ میں سچی مانی جاتی ہے اگر آئندہ غلط ثابت ہو۔ جیسے یونانی حکمت اب غلط ثابت ہوئی ہے۔ اور حکمت و فلسفہ کے بالکل نئے اصول سچے ثابت ہوں تو بھی میں دعویٰ کرتا ہوں کہ قرآن مجید ویسا ہی سچا ثابت ہوگا جیسا کہ اب سچا ہے اور غور کرنے کے بعد ثابت ہوگا کہ جو کچھ غلطی تھی وہ ہمارے علم کا نقصان تھا"

(ارکان مفروضہ) پھر نماز و روزہ وغیرہ کی نسبت اسطرح بیان کیا غیر مشتبہ منصوص مسائل۔ جیسے نماز روزہ حج اور زکوۃ ہیں اور جو خدا تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرض بتائے ہیں۔ اُنکو میں بھی اسی طرح فرض سمجھتا ہوں جیسے ایک جاہل مسلمان یقین کرتا ہے۔ لیکن جب اُنپر مخالف کا حملہ ہوتا ہے تو اُنکی لمیت اور اصلیت بتانی ضرور پڑتی ہے اگر یہ بحث پیش ہو کہ ہاتھ مونہ دہونے کو یعنی وضو کو عبادت سے۔ جسکا تعلق دل سے ہے۔ کیا تعلق ہے؟ حدیث کے بعد بے محل مونہ میں کلی کرنے سے کیا تعلق ہے؟ نماز کو جو ایک روحانی فعل ہے اُٹھنے بیٹھنے سر نیچا اور سر اونچے کرنے سے کیا علاقہ ہے؟ تو بمجبوری ہمکو اسکی اصلیت اور نماز کے ارکان کی لمیت پر بحث کرنی ہوگی اور سمجھانا پڑے گا کہ وضو کیوں فرض کیا گیا ہے؟ اور نماز کے ارکان کیوں قرار پائے ہیں"

(دین اسلام) پھر دین اسلام کی نسبت اسطرح بیان کیا "میرا عقیدہ ہے کہ مذہب اسلام ایک مکمل اور آخری مذہب ہے۔ مجھکو خدا کے اس قول پر یقین کامل ہے کہ الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دینا" مگر جب مفسرین (خدا اُنپر رحمت کرے) اس تکمیل کے یہ معنی بتائیں کہ خدا نے فلان جانور کو حلال اور فلان جانور کو حرام بتا کر دین کو کامل کر دیا ہے تو میں اُنسے مخالفت کرتا ہوں گو کہ وہ فخر الدین رازی ہوں، یا ملا علی نیشاپوری یا اُنسے بڑھکر اور کوئی۔ اور

اُن بزرگون کی خدمت میں عرض کرتا ہوں کہ جناب اگر یہی معنی تکمیل دین کے ہیں تو سلام! میں کہتا ہوں کہ یہ تفسیر غلط ہے، دین اسلام خدا کی توحید کے کامل طور پر بتانے سے اُس کے ہرایک فروع واصول کو روشن کر دینے سے مکمل ہوا ہے یہی تکمیل دین کی ہے اور اسی تکمیل کے سبب وہ آخر دین ہے اور اسی تکمیل کے سبب قیامت تک بلکہ قیامت کے بعد ہی بغیر تبدیل کے قایم رہیگا"

حمایت اسلام کی وجہ

پھر لکچر کے اختتام پر یہ الفاظ کہے کہ "جو تائید اسلام کی میں نے اپنی والنست میں اختیار کی ہے وہ اسوجہ سے نہیں کی میں مسلمان ہوں اور مسلمان کے گھر میں پیدا ہوا ہوں اور خواہ نخواہ مجھکو اسلام کی تائید کرنی چاہیے میں اس بات کو اچھا نہیں سمجھتا۔ جو شخص جس مذہب میں پیدا ہوا ہے خاموشی سے اس میں چلے جانا دوسری بات ہے، اور اُسکی تائید پر مستعد ہونا دوسری بات ہو، پہلی بات اُس شخص کو زیبا نہیں ہر جس نے پورا یقین اُسپر خود نہ کر لیا ہو۔ میں نے خالی الذہن ہو کر اسلام پر بہت کچھ غور کی ہے اور نہایت غور و فکر کے بعد میرے دل میں اس بات کا یقین ہوا ہے کہ دنیا میں کوئی مذہب سچا ہے تو وہ اسلام ہی ہے" اور میں اس دلی یقین پر اُسکی تائید کرتا ہون۔ نہ اس وجہ سے کہ میں مسلمان کے گھر میں پیدا ہوا ہون اور مسلمان ہون"

یہان تک سرسید کی اُس تقریر کا خلاصہ تھا جس میں اُنھون نے بمقام لاہور اسلام کی نسبت اپنے خیالات ظاہر کئے تھے اب ہم اُنکے بعض پرائوٹ خطوط سے چند مقالات التقاط کرتے ہیں جو اُنھون نے مذہبی خیالات کے متعلق اپنے دوستوں کو لکھے ہیں۔ ان خطوں میں کچھہ تو وہ ہیں جو ہم کو منشی سراج الدین احمد کے مسودات میں دستیاب ہوئے ہیں اور کچھہ بمبئی اور دوستون سے بہم پہنچائے ہیں۔

حقیقت اسلام کا یقین

اگرچہ سرسید عام لوگون کے کافر و ملحد کہنے سے کچھہ ناراض نہ ہوتے تھے مگر جو لوگ انکے حالات سے بخوبی واقف تھے اگر وہ اُنکی نسبت ایسا خیال ہی کرتے تھے تو انکو سخت ناگوار گذرتا تھا جب وہ ہندوستان سے ولایت جانے کو تھے ایک خط حکیم غلام نجف خاں مرحوم نے جنکے ساتھہ اُنکی اور انکے بڑے بھائی کی دوستی اُخوت کے درجہ تک پہنچ گئی تھی۔ اُنکے پاس بھیجا تھا جس میں غالباً اس قسم کی کوئی بات ہوگی کہ ولایت جاکر مذہب کو نہ چھوڑ دینا یا عیسائی نہ بنجانا۔ انھون نے ولایت پہنچکر اُسکا یہ جواب بھیجا۔

"حامدنے آپ کا عنایت نامہ مجھے دیا تھا۔ میں نے خیال تھا کہ جب میں ولایت سے پھر کر آؤں گا اور آپ سے انشاء اللہ تعالیٰ ملوں گا اُسی وقت جواب دونگا۔ حقیقت میں وہ عنایت نامہ محبت آمیز ہنسی

کی بات تھی، نہ جواب لکھنے کے لایق۔ اگرچہ میں یقینی سمجھتا تھا کہ آپ کے خیالات وہی قدیم ٹپہ اسنے وقیانوسی ہندوستانیون کے سے ہیں، حال کے زمانہ کی جو باتیں ہیں نہ وہ ذہن میں آتی ہیں اور نہ پسند ہوتی ہیں، مگر خاص جس امر کی نسبت آپ نے مجھے لکھا اُس کا نہایت تعجب ہے؛ اس لئے کہ میری نسبت اس قسم کے خیالات کی البتہ جاہل ناواقف آدمی کو گنجایش ہو سکتی ہے، یا دشمن دعا سے جو کچھ چاہیں خیال کر سکتے ہیں مگر آپ کو اس قسم کا خیال کیون ہوا؟ شاید بمقتضاے محبت ایسا خیال ہوا ہو اس لئے کہ دوست کو ہمیشہ بڑے بڑے خیالات گذرتے ہیں۔ جیسا کہ میں خود اپنی تحقیق سے۔ نہ تقلید سے۔ دین اسلام کو حق سمجھتا ہون اُسقدر یقین آپ کے شہر کے بڑے بڑے لمبی ڈاڑہی والون کو اور ہزار ہزار دانہ کی تسبیح والون کو اور جو مکہ مدینہ سے پیر و خلیفہ و مرشد کا جبہ و دستار لےکر آتے ہیں اُنکو بھی نہیں ہے والسلام"

تقلید کی مخالفت

ایک خط میں سید مہدی علی خان کو لکھتے ہیں "میں سچ اپنے دل کا حال لکھتا ہون کہ اگر خدا مجھکو ہدایت نہ کرتا اور تقلید کی گمراہی سے نہ نکالتا اور میں خود تحقیقاتِ حقیقتِ اسلام پر متوجہ ہوتا تو یقینی مذہب کو چھوڑ دیتا۔ فرض کرو کہ تقلید چھوڑنے میں میں کسی مسئلہ یا عقیدہ میں غلطی میں پڑون، چندان نقصان نہیں، مسلمان تو رہونگا ... جناب مذہب اسلام تو آفتاب سے بھی زیادہ روشن اور سب کی آنکھون کے سامنے ہے وہ کوئی معما اور بدرجاچ کا شعر نہیں جس کے حل کرنے کو مولوی امام بخش صہبائی اور میر حسین معائی درکار ہون۔ خدا فرماتا ہے "هو الذى بعث فى الامّيّين رسولا منهم" ذرا مہربانی سے قرآن کھولکر ملاحظہ فرمائیے اُس میں یہی لفظ ہیں یا بجائے اُنکے یہ الفاظ ہیں "هو الذى بعث فى الفلسفيّين رسولا"

تقلید کی مخالفت

ایک اور خط میں لکھتے ہیں "بھائی جان سنو! اب یہ وقت نہیں رہا کہ میں اپنے مکتوباتِ ضمیر کو مخفی رکھون۔ میں صاف کہتا ہون کہ اگر لوگ تقلید[1] نہ چھوڑینگے اور خاص اُس روشنی کو جو قرآن و حدیث سے حاصل ہوتی ہے نہ تلاش کرینگے اور حال کے علوم سے مذہب کا مقابلہ نہ کرینگے تو مذہب اسلام ہندوستان سے معدوم ہو جائیگا۔ اسی خیرخواہی نے مجھکو برانگیختہ کیا ہے جو میں ہر قسم تحقیقات کرتا ہون اور تقلید کی پرواہ نہیں کرتا؛ ورنہ آپ کو خوب معلوم ہے کہ میرے نزدیک مسلمان رہنے کے لئے اور بہشت میں داخل ہونے کے لئے ائمہ کبار تو درکنار مولوی جٹو کی بھی تقلید کافی ہے۔ لا اله الا الله محمد رسول الله کہ لینا ہی ایک ایسی طہارت ہے کہ کوئی نجاست باقی نہیں رہتی۔ پس میں چاہتا ہون کہ بدلائل و مباحثہ مجھکو قائل کر دیا جائے کہ میری یہ راے صحیح ہے یا غلط؟ اور میں دشمن اسلام ہون یا مثل ابوبکرؓ اور عمرؓ کے دوست اسلام ہون؟ آیا میں جو اسلام کو ابوحنیفہؒ اور شافعیؒ سے زیادہ دوست رکھتا ہون

---

[1] یہان تقلید سے مراد ہر امر میں سلف کی پیروی کرنا ہے نہ کہ تقلید مصطلح فقہا ۱۲

اور یقین کرتا ہوں کہ ابو حنیفہؒ اور شافعیؒ تو درکنار، ابو بکر اور عمر بھی بالفرض اگر کچھ غلطی کریں تو بھی اسلام میں کچھ نقص نہیں ہو سکتا، اور میرا یہ اعتقاد کہ اگر تمام عالم کافر ہو جائے یا تمام عالم فرشتہ ہو جائے تو خدا کی خدائی میں کچھ زیادتی یا نقصان نہیں ہوتا، اُسی طرح اسلام کے مسائل کا حال ہے کہ اگر تمام مجتہدین صواب پر ہوں یا خطا پر اصل اسلام کی جو روشنی ہے اُس میں کچھ نقص نہیں ہے پس یہ اعتقاد میرا صحیح ہے یا غلط؟

پھر اسی خط میں لکھتے ہیں "لوگوں نے جو اخباروں میں مجھکو بُرا بھلا لکھا اس سے آپکو غصہ آگیا معلوم نہیں کہ آپ نے آرٹکل میں کیا لکھا ہوگا؟ مگر مجھکو کہانتک بچاؤ گے؟ میں تو ہدف تیر ہائے ملامت ہو گیا ہوں اور روز بروز ہوتا جاؤنگا۔ شاید بعد میرے کوئی زمانہ آوے جب لوگ میری دلسوزی کی قدر کریں۔

ایک اور خط میں لکھتے ہیں "میں سچ کہتا ہوں کہ جس قدر نقصان اسلام کو تقلید نے پہنچایا ہے اتنا کسی چیز نے نہیں پہنچایا۔ شخص اسلام کے حق میں تقلید سنکھیا سے بھی زیادہ زہر قاتل ہے۔ بلاشبہہ ہم نے علما کو مثل یہود و نصاریٰ کے ارباباً من دون اللہ سمجھ لیا ہے خدا اس گناہ سے سب مسلمانوں کو بچائے۔ آمین! اور میرے دوستوں کو اور مولوی مہدی علی میرے پیارے دوست کو سب سے پہلے آمین کہنا آمین ثم آمین"

تعصب

ایک اور خط میں لکھتے ہیں "تعصب جو برخلاف شریعت ہے، ہندوستان کے مسلمان اُس میں گرفتار ہیں خدا کی نامہربانی اُنکی طرف رجوع ہے... پھر اسکا علاج کیا ہے؟ خدا کے ساتھ لڑائی غیر ممکن ہے۔ دنیا میں جو کتابیں تصنیف ہو رہی ہیں اور ہر روز چھپتی ہیں اور بکتی ہیں اُن میں جو حالات مسلمانوں کے لکھے جاتے ہیں اُنکو دیکھکر دماغ کو دل جاتا ہے، بہت سی باتیں اُن میں بلاشبہہ سچ ہیں اور درحقیقت ہم نے ایسا طریقہ اختیار کیا ہے جس سے اسلام کو بدنامی ہے.... میرے صرف ایک لفظ لکھنے سے کہ "حیوان ہیں" نالائقوں کو اس طیش کھانے کا بہانہ ہاتھ لگ گیا ہے اور انگریزی اخباروں اور تاریخوں میں جو اوصاف چھپتے ہیں اُنسے کم بخت کو غیرت نہیں آتی۔

خرافات علما

ایک اور خط میں خطبات احمدیہ کے بعض مضامین کے متعلق لکھتے ہیں "افسوس صد افسوس ہمارے ہاں کے مولویوں نے ایسے صاف اور روشن مذہب کو ایسی لغو اور مہمل کہانیوں میں ڈالدیا ہے اور جب کوئی چاہتا ہے کہ اُسکی تحقیقات اور اُس پر غور کیا جائے تو اُسکو کافر، لامذہب، مرتد، عیسائی، حرام خور، مری مرغی کھانے والا بتاتے ہیں"

"آیہ یاتی من بعدی اسمہ احمد کا نہایت عمدہ بیان مسٹر گڈفرے نے اپنی کتاب لکھا ہے اور عجوبا

بجنسہ اس آیت کا موجود ہونا انجیل یوحنا میں ثابت کیا ہے اور وہ وہی مشہور لفظ فارقلیط کا ہے۔ مگر جسطرح پرکہ اُسکو مسٹر ہگنز نے ثابت کیا ہے اُسکو پڑھکر مسلمان متعصب مولویون کو غیرت کرنی چاہیے کہ جو کام اُنکے کرنیکا تھا کہ اُسکو ایک غیر مذہب کے منصف شخص نے کیا۔ میں نے اُس میں کچھ اضافہ نہیں کیا، بعینہ مسٹر ہگنز کی تحریر نقل کردی ہے،،

”مگر ایک اور عمدہ بات میں نے یہ ثابت کی ہے کہ نام آنحضرت کا صلعم توریت میں موجود ہے چنانچہ عبری توریت میں وہ لفظ اور نشان عظائل آنحضرت کے بجنسہ نکالے ہیں مگر افسوس ہے کہ اسپر بھی میں کافر ہون اور یاران بادفروش وعظ گو مسلمان!! کیا اُنہوں نے خدا کو بھی اپنا ہی سا نادان یقین کیا ہے؟ میں یقین کرتا ہون کہ جسقدر لوگ مجھکو بُرا کہتے ہیں اگر خدا مجھے اُسپر صبر کامل عطا کرے تو میرے سلئے ایک نہایت عمدہ زادِراہ دوسری دنیا کے سلئے ہے جہان ہمیشہ رہنا ہے، ایسا کس کا نصیب جسکو نہایت عمدہ زادِراہ وہاں کے لئے ہاتھ آوے،،

طعام اہل کتاب

ایک اور خط میں درباب طیور منخنقۂ اہل کتاب کے لکھتے ہیں ”جو کچھ غصہ آپ کو مجھ پر درباب گردن مروڑی ہوئی مرغی کے ہے وہ میری گردن پر، مگر میں آپ کو یقین دلاتا ہون کہ علمای ترکستان (یعنی ٹرکی) نے بلا کسی تامل کے اسکو جائز کیا ہے، تمام ترک۔ جنکی خاک پا ہونے کی بھی ہمکو لیاقت نہیں ہے۔ سب بے تامل کہاتے ہیں۔ ایک بہت بڑے دیندار عالم نے۔ جو ترکستان (یعنی ٹرکی) سے آیا تھا اور ایسا سخت مذہب میں تھا کہ باوجود میرے اصرار کے فوٹو گراف کی تصویر کھچوانے سے انکار کیا۔ درباب گردن مروڑی مرغی کے مجھسے کہا کہ ”ھذا اقصور النصاری لا باس لنا فی اکلہ قلا اَحَلَّ اللّٰہ لنا طعام اھل الکتاب“ علاوہ اسکے جو شخص احتیاطاً اسکا مرتکب ہو نہایت عمدہ بات ہے مگر اسکو مسئلہ شرعی ٹھیرانا اور اُسکے مرتکبین کو آکل حرام قرار دینا نہایت مضر اور اسلام کے پانوں پر بدست خود تیشہ زدن ہے۔ اس فقرہ کے معنی آپ کی سمجھ میں نہیں آئینگے؛ انشاءاللہ عنقریب خدمت عالی میں حاضر ہوکر اسکی تفسیر عرض کرونگا،،

[illegible]

ایک شخص نے اُنسے دریافت کیا کہ جو شخص منکر خدا ہو وہ بھی۔ جیسے کہ بعض لوگ کہتے ہیں۔ مہذب ہوسکتا ہے یا نہیں؟ اسکے جواب میں سرسید لکھتے ہیں ”سوائے توحید ذات باری تعالی کے ماننے کے تہذیب نفس انسانی اور شایستگی حاصل نہیں ہوسکتی،،

[illegible]

سرسید مذہبی مسائل میں اُس میدان سے۔ جسکو اُنہون نے اسلام اور اہل اسلام کی حمایت کے لئے لازم پکڑ لیا تھا۔ سرمو تجاوز کرنا نہیں چاہتے تھے۔ اگر کوئی ثبوت بلکہ خدائی

کا بھی دعویٰ کرتا تو اُن کو اُسکا رد لکھنے سے کچھ سروکار نہ تھا۔ وہ اکثر معترضین کے حملوں یا اعتراضوں کو ہنسی میں ٹال دیتے تھے اور اپنے دوستوں کو فضول بحثوں سے جن سے مسلمانوں میں تفرقہ پڑنے کے سوا کوئی نتیجہ پیدا نہو۔ ہمیشہ روکتے رہتے تھے اور کبھی کبھی ایسے مسئلہ سے تعرض نہ کرتے تھے جو اُن کے دائرہ کی حدود سے باہر ہو۔

ایک شخص نے مرزا غلام احمد صاحب قادیانی کی نسبت۔ جنکو صاحب الہام اور مثیل مسیح ہونے کا دعویٰ ہے۔ ایک طول طویل خط سرسید کو لکھا۔ اُسکے جواب میں وہ لکھتے ہیں "مخدومی! ہر شخص یہان تک کہ شہد کی مکھی بھی الہام کا دعویٰ کر سکتی ہے مگر اُس کا نتیجہ کیا؟ اور کسی کو کسی کے الہام سے کیا فائدہ اور نقصان پہنچ سکتا ہے؟ نادان ہیں وہ جو اُن سے جھگڑا کرتے ہیں۔ السلام"

ایک اور شخص نے مرزا صاحب کے خیالات کی مخالفت میں کچھ لکھنے کا ارادہ سرسید سے ظاہر کیا اُسکے جواب میں وہ لکھتے ہیں "آپ جو رسالہ نسبت مرزا غلام احمد صاحب قادیانی لکھنا چاہتے ہیں کیا آپ کو کچھ مالیخولیا ہو گیا ہے؟ اس لغو حرکت سے کچھ فائدہ نہیں اور مجھکو ہرگز اس قدر فرصت نہیں ہے کہ نسبت حضرت مسیح کے دوبارہ آنے کے۔ جو محض غلط روایات پر مبنی ہے۔ کچھ لکھون"

منشی سراج الدین نے اُنسے دریافت کیا کہ گھر میں تصویر رکھنی کیسی ہے؟ اُس کے جواب میں لکھتے ہیں "اِن چیزون کو موجودہ حالت میں بحث میں لانا مسلمانوں کی ترقی میں ہرج ڈالنا اُنکو متوحش اور زیادہ متنفر کرنا ہے۔ یہ امور نہایت جزئیات ہیں جنکی بحث سے ترقی تعلیم اور ترقی تہذیب میں ہرج پڑیگا۔ پس اُسکو ہرگز بحث میں نہیں لانا چاہیے پہلے امور معظم اور اصول کو رائج کرنا چاہیے، تصاویر و تماثیل کے جائز و ناجائز ہونے کے دلائل موجود نہیں، اسکی نسبت فیصلہ کرنا اور ناجوازی و جواز کی وجہ بتانا نہایت دقیق اصول پر مبنی ہے۔ تصاویر کا رواج خود بخود ہوتا جاتا ہے۔ پس جو بیل کہ چل رہا ہے اُسکو آر مارنے کی کچھ ضرورت نہیں ہے"

کسی نے سرسید کو بذریعۂ تحریر کے اطلاع دی کہ ایک مولوی صاحب نے آپ کی مصنفہ کتابون کو اپنے ایک شاگرد سے۔ جو رئیس اعظم ہے۔ چھین کر آگ میں جلا دیا۔ سرسید اُسکے جواب میں لکھتے ہیں "اُسکو (یعنی مولوی کو) اس عمل سے کیا فائدہ ہوا؟ اگر وہ ہمارے مطبع سے بہت سی کتابیں خرید کر جلاتا تو مطبع کو بھی فائدہ ہوتا اور اُسکا بھی دل ٹھنڈا ہوتا"

مستورات کے پردہ کی نسبت اُنکی رائے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے بالکل برخلاف تھی - وہ ہندوستان میں مسلمانوں کی حالت کو اس قابل نہیں سمجھتے تھے کہ اُنکی عورتیں منہ کھولے بے حجاب بازاروں میں پھریں - ایک دفعہ شاید مولوی عبدالحلیم شررنے اپنے اخبار میں اُنکی نسبت لکھدیا تھا کہ وہ پردہ کے مخالف ہیں اسپر منشی سراج الدین نے اُنسے اس باب میں اُنکی رائے دریافت کی - سرسید اُنکے خط کے جواب میں لکھتے ہیں "میں پردہ کی رسم کا متعدد وجوہ سے نہایت طرفدار ہوں" اور بالتخصیص ہندوستان میں - اس میں میرا کچھ اجتہاد نہیں ہے نہ میں نے کبھی اسپر غور کیا، مگر فقہائے اسلام کا یہ مسئلہ ہے کہ منہ اور ہاتھ پہنچے تک اور پاؤں ٹخنے تک ستر میں داخل نہیں ہیں فقہائے متاخرین نے بسبب فساد اوقات زمانہ کے منہ کو بھی پردہ میں داخل کیا ہو - مولوی شرر نے میری نسبت غلط لکھدیا ہے، شاید میں نے کسی کے سامنے کہا ہوگا کہ شرعاً منہ اور ہاتھ پردہ میں داخل نہیں ہیں، اُن کو چاہیے کہ خود فقہ کی کتابیں دیکھیں"

ایک دفعہ کسی شخص نے مسئلہ متعہ پر بحث کرتے ہوئے اخبار میں سرسید کی نسبت یہ لکھدیا کہ اُن کی رائے ہے کہ حضرت علی مرتضیٰ نے متعہ کیا ہے - اُنھوں نے فوراً اخبار نویس کو لکھا کہ "میرا ہرگز یہ عقیدہ نہیں کہ جناب علی مرتضیٰ علیہ السلام یا ائمہ اطہار میں سے کسی ایک نے بھی متعہ کیا ہے"

سرسید سے - جیسا کہ ہم پہلے کسی موقع پر لکھ چکے ہیں - اکثر لوگ اُن مسائل مذہبی کی نسبت رائے پوچھتے تھے جن پر آج نئے خیالات کے لوگوں کی توجہ مبذول ہو اور سرسید سب کام چھوڑ کر ایسے سوالات کا جواب فوراً لکھتے تھے -

وبا کسی نے اُن سے پوچھا ہے کہ جہاں وبا ہو وہاں سے دوسری جگہ چلا جانا جائز ہو یا نہیں؟ اُسکے جواب میں لکھتے ہیں "جس شہر میں وبا ہو وہاں سے چلا جانا وبا سے بچنے کو - مع اس اعتقاد کے کہ اگر خدا نے اس فعل سے ہمارا وبا سے بچنا مقدر کیا ہے تو بچینگے اور مقدر نہیں کیا تو باوجود چلے جانے کے نہیں بچنے کے - خلاف شرع و احکام رسول خدا صلعم نہیں ہے - مذہب اسلام کا اصول یہ ہے کہ ہر کام کے لئے جو اسباب ہوں اُن اسباب کو فاعل حقیقی نہ سمجھے بلکہ فاعل حقیقی خدا کو سمجھے جو علۃ العلل تمام افعال و واقعات کا ہے .... جسطرح کہ آدمی امراض میں دوا کرتا ہے اور جانتا ہے کہ یہ دوا امراض کے لئے مفید ہے مگر اسکے ساتھ ہی یقین کرتا ہے کہ اگر خدا نے صحت مقدر کی ہے تو صحت ہوگی - اسی طرح جہاں وبا ہے وہاں سے چلا جانا مثل دوا کے ہے - اگر خدا نے بچنا مقدر کیا ہے تو اس

دوسرے فقرہ سے فائدہ ہوگا" اور صحیح بخاری میں جو حدیثیں ہیں اُنکا بھی یہی مطلب ہے - ایک حدیث میں
ہے "فلا تخرجوا فرارا منہ" مگر اس حدیث کے الفاظ پورے نہیں، اسکے بعد جو حدیثیں ہیں اُنکے الفاظ پورے
ہیں "فلا تخرجوا فرارا منہ" اس سے صاف مطلب یہ ہے کہ وہاں سے یہ سمجھکر چلا جانا کہ ہم اُس سے بھاگ کر بچ جاویں
گے منع ہے۔ یہ یقین کہ اگر اللہ نے مقدر نہیں کیا (ایسے بچیں) تو بھاگ کر نہیں بچ سکتے"

"وہاں جہاں وبا ہے وہاں نہ داخل ہونا اور وبا کے مقام سے چلا جانا دونوں کی یکساں حالت ہے....
اگر وباء کی طرف جانا منع ہو تو جہاں وبا ہے وہاں سے جانے کا امتناع غلط ہو جاتا ہے اُسی دلیل سے
جس دلیل سے کہ ایسے مقام سے چلا جانا منع ہوتا ہے - حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب شام کو جارہے
تھے اور معلوم ہوا کہ وہاں وبا ہے انھوں نے صحابہ سے صلاح کی اور آخر کار یہ فیصلہ ہوا کہ مت جاؤ ۔ اُسوقت ابوعبیدہؓ نے
کہا "افرارا من قدر اللہ" اسکے جواب میں حضرت عمرؓ نے کہا "نعم نفر من قدر اللہ الی قدر
اللہ" پس اس جواب سے ٹھیک مسئلہ حل ہوجاتا ہے اور یہی جواب اُس شخص کی جانب سے ہوتا ہے جو اس
مقام سے جہاں وبا ہے چلا جاوے اور کوئی شخص اُسکو کہے کہ افرارا من قدر اللہ تو اُس کا
جواب یہی ہوگا کہ نعم نفر من قدر اللہ الی قدر اللہ - پس جب ان تمام حدیثوں اور اُنکے الفاظ و
مقاصد پر غور کرو تو یہی مطلب و حکم پایا جاتا ہے جو میں نے بطور خلاصہ کے اول لکھدیا ہے - یہ بات کہ جو
اقربا جن کی تیمارداری اُسکے ذمہ ہے اور وہ مبتلا ہوں اور وہ شخص وبا کے ڈر سے اُنکو چھوڑ جاوے -
یہ ایک دوسرا گناہ ہے، عام بحث سے اسکو تعلق نہیں - اُس شخص کی نسبت وہ حدیث ہے جو بخاری
"اجر الصابر فی الطاعون" میں مذکور ہے

شعائر اسلام کا ادب

اسلام اور شعائر اسلام کا ادب، قرآن مجید کا ادب، اور خدا اور رسول کے نام کی تعظیم
سرسید کے دل میں کسی اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ کے صوفی خوش اعتقاد سے کچھ کم نہ تھی، بلکہ بعض
موقعوں پہ اس سے بھی کچھ بڑھی ہوئی معلوم ہوتی تھی یہاں چند شہادتیں بطور نمونہ کے ذکر کی
جاتی ہیں -

بمبئی کے ایک شخص نے یہ رائے ظاہر کی تھی کہ اُردو تحریروں میں علامات وقف وہی
مقرر کرنے چاہئیں جو قرآن مجید میں لکھے جاتے ہیں - سرسید نے اُنکو لکھا "ہم نہیں پسند
کرتے کہ جو علامتیں مدت سے قرآن مجید کی تحریر میں مخصوص ہوگئی ہیں وہ اُردو تحریر میں مروج کیجائیں
اور آیت و مطلق وغیرہ جو خاص اصطلاحات قرآن مجید کی ہیں اور تحریروں پر بولی جائیں - گو شرعاً و عقلاً
اس میں کچھ قباحت نہو الا تعظیما للقرآن المجید ایسا کرنا ہم پسند نہیں کرتے"

خطوں پر جو اکثر لوگ بسم اللہ الرحمن الرحیم یا حامداً و مصلیاً لکھدیا کرتے ہیں اُسکی نسبت وہ ایک جگہہ لکھتے ہیں "ہمکو نہایت افسوس ہے کہ لوگوں نے اسلام کے مقدس الفاظ و مضامین کو ایک دل لگی کی بات بنالیا ہے اور سمجھتے ہیں کہ یہ نہایت دینداری اور خدا پرستی اور نہایت اتقا اور ٹھیٹ سنت پر چلنے کا کام ہے؛ حالانکہ اس سے زیادہ اسلام اور اُسکے مقدس الفاظ و مضامین کی بے ادبی نہیں ہوسکتی مسلمانوں کے اس قسم کے برتاؤ سے اسلام کی برکت و منزلت اُنکے دل میں نہیں رہی بعوض اسکے کہ اسلام کی باتوں سے اُنکے دل میں نیکی خضوع اور خشوع پیدا ہوا تھی اور قساوت پیدا ہوتی ہے۔ حدیث نبوی کا بھی جس میں خدا کے نام سے کام شروع کرنے کا حکم ہے، یہی منشا معلوم ہوتا ہے کیونکہ اُسکے الفاظ یہ ہیں "کُلُّ اَمرٍ ذِی بَالٍ لَم یُبدَاُ بِبِسمِ اللّٰہِ فَھُوَ اَبتَرُ" اس سے صاف ظاہر ہے کہ جو امر ذی بال یعنی عظمت اور شان والا نہو وہ اس حکم سے مستثنےٰ ہے"

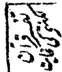
ایک صاحب نے ایجوکیشنل کانفرنس میں یہ رائے ظاہر کی تھی کہ کانفرنس کے جلسوں میں تحسین کے موقع پر بجائے تالی بجانیکے سبحان اللہ یا مرحبا یا جزاک اللہ کہا جایا کرے اور راجلاس کے موقع پر ایک ہنبرہ کہا جایا کرے۔ پھر کھڑے ہو کر لوگ اسپیچ کیا کریں۔ سرسید نے اس سے ناراضی ظاہر کی اور کہا "ایسے جلسوں میں جیسے کہ ہمارے جلسے دنیوی اغراض کے لئے ہوتے ہیں اُن الفاظ کو استعمال کرنا جو شعائر الدین میں سے ہیں اُنکی ہتک حرمت کرنا ہے اور لاتحلو اشعائر الدین میں داخل ہے۔ کیا یہ افسوس کی بات نہیں ہے کہ ہم ایک عاشقانہ شعر پڑھیں اور مے ناب کی خوبی کسی شعر میں باندھیں، یا ایک معشوق کے ہجر و وصال اور اُسکے خط و خال اور عشوہ و ناز تو بہ شکن کو دلچسپ نظم میں ادا کریں، اور سننے والے اُسکی تحسین میں اُن کلمات کا استعمال کریں جو خاص رب واحد معبود وغیرہ نے اپنی عبادت میں استعمال کرنے کے لئے بطور شعائر اللہ مقرر کئے ہیں۔ افسوس کہ جس وقت ہمارے دوست ہمکو نصیحت کرتے ہیں اُس وقت اُن کو اُن الفاظ کی عظمت کا اور ہمارے کاموں کی خست کا خیال نہیں رہتا اور چاہتے ہیں کہ ہم اپنے خسیس اور ذلیل کاموں میں خدا کی عظمت اور اُسکے شعائر کی حرمت کو بھول جادیں اور انہیں ذلیل دنیاوی کاموں میں شعائر اللہ کو گڈمڈ کرکے اُسکی عظمت کو لوگوں کے دلوں سے کھودیں۔ کیا ہمکو زیبا ہے؟ کہ اپنے لغو اور ذلیل دنیاوی کاموں میں اُس متبرک۔ پیر رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے (باِبی انت و امی یا رسول اللہ) کھڑے ہو کر وعظ فرمایا قرآن مجید لوگوں کو سنایا، خطبات روحانی ارشاد فرمائے صحابہ اور ائمہ علیہم السلام نے اس سنت کو اختیار کیا اور اب ہماری مسجدوں کے لئے مخصوص ہے پھر وہی سنت ادا کیجاتی ہے۔ نقل بناکر

کٹرے ہوں .... یہی خیالات ہیں جنکے سبب سے لوگ ایسی باتیں کربیٹھتے ہیں جنسے ہمارا دل توکانپ جاتا ہے۔ایک اخبار نکالا جاتا ہے جس کا نام (توبہ توبہ) منشور محمدی رکھا جاتا ہے۔کیوں اُسکا دل پھٹ نہ گیا اور کیوں اُس کا قلم ٹوٹ نہ گیا جو اُس نے ان لفظوں کو لکھا۔ایک اخبار نکالا جاتا ہے جس کا نام اسلام رکھا جاتا ہے وہ نہیں سمجھتا کہ کس مقدس نام کو کس جگہہ استعمال کرتا ہے اور اسلام کی عظمت کو دل سے بھلاتا ہے؟ ایک اخبار نکلتا ہے اور مخبر صادق (ہائے افسوس کس دل سے) اُس کا نام رکھا جاتا ہے۔کوئی اخبار الصدیق کے نام سے مشہور ہے"

ایک دفعہ محمدن ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس میں ایک رزولیوشن اس مضمون کا پیش ہوا کہ کانفرنس کے چندہ کی آمدنی جمع رکھنے کو (یا اور کسی غرض کے لئے) ایک شخص امین قوم مقرر ہونا چاہیے۔سرسید نے یہ مضمون سنکر آبدیدہ ہوکر دردناک آواز سے کہا کہ "امین قوم تو صرف ایک شخص تھا سو گذر گیا اب کوئی امین قوم نہیں ہو سکتا، ہاں اس عہدہ کا نام امانت دار قوم ہوسکتا ہے،" چونکہ آنحضرت صلعم ابتداے عمر سے عرب میں امین کے لقب سے مشہور تھے اسلئے اس لقب کا اطلاق کسی دوسرے شخص پر ہونا اُنہوں نے گوارا نہیں کیا۔

ایک شخص نے سرسید سے استفسار کیا تھا کہ اگر نماز میں قرآن شریف کا ترجمہ پڑھ لیا جاوے تو آپ کے نزدیک کچھ قباحت تو نہیں۔اسکے جواب میں اُنھوں نے یہ لکھہ بھیجا "مخدومی نماز میں قرآن مجید بلفظہ نہ پڑھنے اور اوسکا ترجمہ پڑہ لینے میں بجز اسکے اور کچھہ قباحت نہیں کہ نماز نہیں ہوتی"

ایک اور شخص نے اُنسے دریافت کیا تھا کہ قرآن کا ترجمہ۔جو آپ نے اپنی تفسیر میں کیا ہے۔اگر قرآن سے علحدہ چھاپ لیا جاوے تو آپ اس کی اجازت دیتے ہیں یا نہیں؟ اسکے جواب میں اُنھوں نے لکھا "اول تو بتلاؤ کہ ایسے مردود ترجمہ کو خریدے گا کون؟ دوسرے یہ کہ جو ترجمہ تفسیر کے ساتھہ کیا گیا ہے وہ نہایت سرسری طور پر ہوا ہے اگر صرف ترجمہ چھاپا جاوے تو نظر ثانی کا محتاج ہے اُس کا اہتمام اس طرح پر کہ صرف اُردو بغیر متن قرآن کے چھاپا ہو ہرگز پسند نہیں ہے، نہ میں اُس کی اجازت اپنی زندگی میں دونگا۔میں اسکو نہایت عظیم گناہ سمجھتا ہوں۔لیکن اگر مع متن قرآن مجید چھاپا جائے تو میں نظر ثانی کرنے کی محنت گوارا کرونگا والسلام"



قرآن مجید کی تفسیر لکھنے سے سرسید کا مقصد۔جیسا کہ عموماً خیال کیا جاتا ہے۔یہ ہرگز

نہ تھا کہ اُسکے مضامین عام طور پر تمام اہل اسلام کی نظر سے گذرین چنانچہ ایک دفعہ ایک مولوی نہایت معقول اور ذی استعداد اُنکے پاس آئے اور کہا کہ میں آپکی تفسیر دیکھنے کا مشتاق ہون اگر آپ مستعار دیں تو میں دیکھنا چاہتا ہون - سرسید نے اُنسے کہا کہ آپ کو خدا کی وحدانیت اور رسول صلعم کی رسالت پر تو ضرور یقین ہوگا ؟ اُنھوں نے کہا " الحمد للہ " پھر کہا کہ آپ حشر و نشر اور عذاب و ثواب اور بہشت و دوزخ پر اور جو کچھ قرآن میں قیامت کی نسبت بیان ہوا ہے سب پر یقین رکھتے ہونگے ؟ اُنھون نے کہا " الحمد للہ " سرسید نے کہا بس تو میری تفسیر آپ کے لئے نہیں ہے، وہ صرف اُن لوگون کے لئے ہے جو مذکورۂ بالا عقائد پر پختہ یقین نہیں رکھتے یا اُن پر معترض یا اُن میں متردد ہیں -

سرسید نے ایک موقع پر اپنی تفسیر کی نسبت کہا کہ " اگر زمانہ کی ضرورت مجھکو مجبور نہ کرتی تو میں کبھی اپنے خیالات کو ظاہر نہ کرتا بلکہ لکھکر اور ایک لوہے کے صندوق میں بند کرکے چھوڑ جاتا اور یہ لکھ جاتا کہ جب تک ایسا زمانہ نہ آوے اسکو کوئی کھول کر نہ دیکھے - اور اب بھی میں اُسکو بہت کم چھپاتا ہون اور گران بیچتا ہون تاکہ صرف خاص خاص لوگ اُسکو دیکھ سکیں، سردست عام لوگون میں اُسکا شائع ہونا اچھا نہیں "

رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سرسید کو ایک خاص تعلق اور نہایت درجہ کی ارادت اور سچی محبت معلوم ہوتی تھی - وہ ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ جس حدیث کا مضمون آنحضرت صلعم کی جلالت شان کے منافی ہو میرے نزدیک وہ یقینی موضوع و مفتریٰ ہے اگرچہ تمام محدثین کا اُسکی صحت پر اتفاق ہو - بعض روایتون پر جنکے ذریعہ سے مخالفون کو آنحضرت پر طعن کرنے کا موقع ملا ہے - وہ بعض اوقات نہایت غیظ میں آکر یہ کہہ اُٹھتے تھے کہ اگر اسکا راوی میری حکومت میں یہ روایت کرتا تو میں اُسپر مفتری کی حد جاری کرتا -

منشی سراج الدین نواب انتصار جنگ سے روایت کرتے ہیں کہ " سید صاحب کے کفر کا فتویٰ جو مولوی امداد العلی نے علما کے پاس مُہر و دستخط کے لئے بھیجا تھا - جب وہ مولوی سراج احمد مرحوم سنبھلی کے پاس پہنچا تو اُنھون نے اُسکو پڑھکر یہ کہا کہ " میں ایسے شخص کی نسبت کفر کے فتوے پر کیونکر دستخط کرسکتا ہون جس کو میں نے اپنی آنکھ سے آنحضرت صلعم کے ذکر پر چشم پر آب اور زار زار روتے دیکھا ہے ؟

سرسید نے اپنی تفسیر میں ایک موقع پر اپنے چند فارسی اشعار لکھے ہیں جن میں سے دو شعر

یہاں نقل کئے جاتے ہیں جن سے اُن کے دل کا لگاؤ جو آنحضرت کے ساتھ تھا ظاہر ہوتا ہے ؎

قدا دارم دلِ بریانِ زعشقِ مصطفیٰ دارم ندارد ہیچ کافر سازو سامانے کہ من دارم
زجبریلِ امین قرآن بہ پیغامے نمی خواہم ہمہ گفتارِ معشوق است قرآنے کہ من دارم

جس زمانہ میں کہ وہ سر ولیم میور کی کتاب لائف آف محمد کا جواب لکھنے کی تیاری کر رہے تھے اُنہوں نے ولایت سے مولوی سید مہدی علی خاں کو ایک خط میں یہ الفاظ لکھے تھے

"مصمم ارادہ کر لیا ہے کہ آنحضرت صلعم کی سیرت میں۔ جیسا کہ پہلے سے ارادہ تھا۔ کتاب لکھی جاوے اگر تمام روپیہ خرچ ہو جاوے اور میں فقیر بھیک مانگنے کے لائق ہو جاؤں تو بلا سے، قیامت میں یوں تو پکارا جاؤں گا کہ اُس فقیر مسکین احمد کو۔ جو اپنے دادا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر فقیر ہو کر مر گیا۔ حاضر کرو مارا ہمیں تمغۂ شاہنشاہی بس است"

سر سید کو اس وجہ سے کہ وہ مسلمانوں کی دنیوی ترقی کے لئے کوشش کرتے تھے، امرا سے ملتے تھے، حاکمانِ وقت سے میل جول رکھتے تھے اور خود دنیا داروں کیسی زندگی بسر کرتے تھے۔ کہا جا سکتا تھا کہ وہ دنیا دار ہیں لیکن انکی حالت پہ نظر کرنے سے بمشکل انکو عرفی معنوں میں دنیا دار کہہ سکتے تھے۔ ایک بزرگ کا حال۔ جو بظاہر تعلقات میں گھرے ہوئے معلوم ہوتے تھے مگر دل کو کسی چیز سے تعلق نہ تھا۔ لکھا ہے کہ وہ اپنے اصطبل کے گھوڑے دیکھ رہے تھے، کسی نے طنز کے طور پر کہا کہ جس دل میں خدا ہو اُس میں گھوڑے نہیں سما سکتے۔ اُنہوں نے کہا "این میخہا در گِل زدہ ام نہ در دل" سر سید کا حال دیکھکر اس مقولہ کی بخوبی تصدیق ہوتی تھی اور معلوم ہوتا تھا کہ ایسے لوگ اب بھی دنیا میں موجود ہیں جو باوجود کثرت تعلقات کے ہر ایک تعلق سے آزاد ہیں۔

یہ شخص اپنے فرائض کے سوا۔ جنکو وہ اپنے اوپر لازم سمجھتا تھا درحقیقت کسی چیز سے تعلق نہ رکھتا تھا۔ باوجود قطعی مایوسی کے۔ جو اُسکو مسلمانوں کی ترقی کی طرف سے تھی اور جسکو وہ اکثر پرائیوٹ صحبتوں میں نہایت افسوس کے ساتھ ظاہر کرتا تھا۔ اُسکی کوششیں اخیر دم تک برابر جاری رہیں۔ حالانکہ اُسکو یقین تھا کہ مسلمانوں پر مردنی چھا گئی ہے اور قومی زندگی کی رمق اُن میں مطلق باقی نہیں رہی باوجود اسکے وہ دن رات اُنکی ترقی کی تدبیروں میں مصروف تھا اور جن کاموں کو وہ بے سود لاحاصل سمجھتا تھا اُن میں اُسکی سرگرمی و دلچسپی دیکھکر یہ معلوم

ہوتا تھا کہ گویا ہر ایک کام میں اُسکی جان اٹکی ہوئی ہے - یہ اُسی کی ہمت اور اُسی کا حوصلہ تھا جو اسکی ذات پر ختم ہو گیا -

وہ اپنے نہایت عزیز اور خالص دوست اور مددگار نیاز محمد خاں رئیس جالندھر کو اُنکے تعزیتی تار کے جواب میں لکھتے ہیں "آپکا تار ہمدردی کا پہنچا، جو دلی محبت اور عنایت آپ کی مجھ ناچیز پر ہے اُسکا میں صرف شکرگزار ہی نہیں ہوں بلکہ میں بھی اُسکو نہایت محبت و قدر سے دیکھتا ہوں - اگرچہ حامد مرحوم کے انتقال سے سخت صدمہ ہوا ہے لیکن خدا نے صبر دیا ہے اور حکم دیا ہے کہ قومی بھلائی کے کام میں زیادہ مصروف ہو - کیونکہ وقت موت معلوم نہیں ہے اور تو بھی جلد آنے والا اور دنیا اور عزیز قوم کو چھوڑنے والا ہے، پس قومی بھلائی میں زیادہ کوشش کرو - والسلام

وہ اُن لوگوں میں سے نہ تھا جو لوگوں کو دنیا سے نفرت دلاتے ہیں اور خود مال و دولت جمع کرتے ہیں بلکہ وہ وہ شخص تھا جو ایک امید موہوم پر - کہ شاید قوم دنیوی ذلت سے نکلے اپنا دھن تن من سب قوم پر قربان کر گیا - اُسنے اپنے اُس بڑے فرض کے ادا کرنے کی جلدی میں جسکے لئے ولایت کا سفر اختیار کیا تھا - اپنی ہزاروں روپیہ کی جائداد اور اثاث البیت اور ہزاروں روپیہ کی کتابیں ٹکے دھڑے کے بھاؤ فروخت کر دیں اور اُسکے دل پر ذرا میل نہ آیا، اُسنے غدر کے بعد لاکھ روپے سے زیادہ مالیت کا تعلقہ لینے سے ایسی بے پروائی کے ساتھ انکار کر دیا کہ کوئی دو چار بیگھہ زمین کے لینے سے بھی اسطرح انکار نہیں کر سکتا، وہ اکثر ایسی تنگی کی حالت میں کہ گھر میں خرچ کرنے کو ایک پیسا نہ ہوتا تھا اپنی ساری تنخواہ خزانہ سے منگوا کر مدرسہ کی ضرورتوں میں اُٹھا دیتا تھا اور جب تک مدرسہ کا روپیہ وصول نہ ہوتا آپ قرض دام کرکے گذارہ کرتا تھا، جب وہ مرض الموت میں مبتلا ہوا تو بقول مسٹر آرنلڈ کے نہ اُسکے پاس رہنے کو گھر تھا نہ مرنے کو، اور جب وہ مرا تو اُسکی تجہیز و تکفین کے لئے ایک پیسا گھر میں سے نہ نکلا - کیا اس سے زیادہ کوئی زاہد کوئی صوفی کوئی درویش دنیا سے بے تعلق ہو سکتا ہے ؟ اور کیا ہم کو ہندوستان کے کروڑوں مسلمانوں میں کوئی ایسا کافر مل سکتا ہے؟ وللہ در من قال سہ

دولت بغلط نبود از سعی پشیماں شو کافر نتوانی شد ناچار مسلماں شو

اگرچہ سرسید کی تمام زندگی دنیاداروں کی زی میں بسر ہوئی مگر اس میں شک نہیں کہ شاہ غلام علی صاحب کی خانقاہ کا رنگ جو ابتدائے عمر میں اُنپر چڑھ گیا تھا وہ نفس واپسین

تک بدستور چڑھا رہا۔ اُنکے بعض خوابوں سے جو ضمیمہ کتاب میں نقل کئے گئے ہیں اُن کی طبیعت کو ایک خاص تعلق طریقۂ نقشبندیہ کے ساتھ پایا جاتا ہے۔ نیز اُنہوں نے اپنی اکثر تحریروں میں مشایخ نقشبندیہ کا ذکر ایسے طور پر کیا ہے جس سے اُس تعلق کا کافی ثبوت ملتا ہے خصوصاً شاہ غلام علی صاحب کا ذکر کرتے ہوئے ہمیشہ اُنکے چہرہ سے ایک رقت آمیز بشاشت ظاہر ہوتی تھی۔ باوجودیکہ مدت سے یہ کوچہ چھٹ گیا تھا وہ مرنے سے چند سال پہلے زیادہ تر اسی ارادہ سے دلی گئے کہ شاہ صاحب کے مزار پر حاضر ہوں۔ اور ہمیشہ حضرت مجدد کے مزار پر جانے کے لئے سرہند جانے کا قصد رکھتے تھے۔ ایک خط میں سردار محمد حیات خاں صاحب کو لکھتے ہیں "مائی ڈیر حیات! آپ کا عنایت نامہ پہنچا . . . . بعد برسات پٹیالہ جانا ہوگا۔ آپ کی ملازمت کو بھی جی چاہتا ہے اور سرہند میں حضرت مجدد کے مزار کی زیارت کا ارادہ ہے کیا عجب ہے کہ ملتان تک آنا ہو جائے۔ ملتان میں کن کن بزرگوں کی زیارت ہے، اُنسے اجازت لے لیجئے اور یہ بھی دریافت فرما لیجئے کہ کیا عنایت ہوگا۔"

تصور شیخ کے مسئلہ کے متعلق جس پر طریقۂ نقشبندیہ میں سالک کی ترقی کا دار و مدار ہے۔ جو خیالات سرسید نے ۱۸۵۲ء میں اپنے رسالہ موسومہ بہ نمیقہ میں ظاہر کئے تھے وہی خیالات وہ اُسکی نسبت اخیر دم تک رکھتے تھے۔ مگر جس طرح وہ اور باتوں میں کسی کے مقلد نہ تھے اسی طرح تصوف میں بھی اُنکے خیالات بالکل آزاد تھے۔ وہ کہتے تھے کہ دنیا میں رہکر دنیا سے بے تعلق رہنا اور جو قوٰی خدا تعالیٰ نے انسان میں ودیعت کئے ہیں اُنکو اپنے اپنے موقع پر بغیر افراط و تفریط کے استعمال کرنا تمام تصوف کا خلاصہ ہے یہی اُنکا قول تھا اور اسی کے موافق اُنکا عمل تھا۔

وہ ایک دوست کو اُسکے خط کے جواب میں لکھتے ہیں "سب سے بڑا کام انسان کے لئے دنیا میں یہ ہے کہ دنیا کو برتے اور دل کو اُس سے تعلق نہو۔ مولانا روم فرماتے ہیں "چیست دنیا از خدا غافل بُدن" مگر میرے نزدیک اس میں کسی قدر غلطی ہے خدا سے غافل ہونا انسان کی طاقت سے باہر ہے خود خدا ایسا ہمارے پیچھے پڑا ہے کہ اگر ہم چھوڑنا بھی چاہیں تو نہیں چھوٹتا اسی طرح ہم بھی خدا کے ایسے پیچھے پڑے ہیں کہ اگر خدا خود چاہے تو ہمکو چھوڑ نہیں سکتا۔ بھلا دیکھیں تو خدا ہمکو اپنے بندے اور اپنے مخلوق ہونے سے خارج تو کردے، خدا کی قدرت سے خارج ہے سہ

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی ... تا کس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

پس از خدا غافل بُدن چہ معنی دارد؟ دنیا ہارسے برتنے کے لئے ہے ہم خوب چھین سے اُسکو برتیں مگر دل کو اُس سے تعلق نہ ہو۔ پس یہی سب سے بڑا کام ہے اور یہی تعلق کفر ہے جسکی نسبت رسول مقبول نے فرمایا "صاحب المال کافر"

ایک اور دوست کو جنکی بیوی کا انتقال ہوگیا ہے اُنکے خط کے جواب میں لکھتے ہیں "آپ کا عنایت نامہ درد انگیز پہنچا جو رنج آپ کو ہے وہ بلاشبہ ہمدردی کے لائق ہے۔ لیکن اسکے لاعلاج کا یہ علاج نہیں ہے کہ انسان آسی میں غلطاں و پیچاں رہے اور اُن فرائض کو جنکے لئے خدا نے اُسکو پیدا کیا ہے چھوڑ بیٹھے رضا بالقضا۔ جو اہل اللہ کا مقولہ ہے۔ نہایت عمدہ اور قلب نیا ہے۔ ہر ایک انسان کو اُسپر عمل کرنا چاہیے ..... میری دانست میں آپ کو اتباع والدہ صاحبہ جنکا حق تمیع امور پر مقدم ہے لازم ہے۔ آپ اُنکی صلاح کو مان لیں اور شادی کرلیں امید ہے کہ آپ کی حالت موجودہ اور آئیندہ درست ہو جائیگی۔ ایک بیوی کی وفات کے بعد دوسری بیوی کرلی کسی طرح اخلاق کے برخلاف نہیں ہے۔ آنحضرت صلعم کو خدیجۃ الکبریٰ سے نہایت محبت تھی اُنکے بعد آپ نے نکاح فرمایا کون شخص ہے جو کسی شخص یا اخلاق میں آنحضرت صلعم سے زیادہ اپنے تئیں قرار دے سکتا ہے؟ تمام حالات و مشکلات جو آپ نے لکھی ہیں وہ سب واردات حالیہ ہیں جو کبھی قایم نہیں رہتیں۔ انسان کو چاہیے کہ اُن واردات حالیہ کو دل سے علیحدہ کرکے سوچے کہ اُس کو کیا کرنا چاہیے۔ میری سمجھ میں والدہ صاحبہ کی اطاعت اور اُن کو رنج کی حالت میں نہ رکھنا تمام اخلاق اور عبادتوں اور کانشنس کے جذبوں سے افضل ہے۔ والسلام"

سرسید کی مذہبی زندگی میں دو ایسی متضاد خاصیتیں پائی جاتی تہیں جو ایک مذہبی آدمی میں بہت کم جمع ہوتی ہیں۔ حالانکہ اسلامی حمیت انمیں کوٹ کوٹ کر بھری تھی باوجود اسکے مذہبی تعصبات سے وہ بالکل پاک تھے۔ جس بے تعصبی سے اُنہوں نے فصل خصومات کا کام انجام دیا اور جس طرح کہ ہر مذہب و ملت کے لوگوں کے ساتھ اُنکا برتاؤ بحیثیت ایک جج ہونے کے یکساں اور بے طرفدارانہ رہا اُسکو جیساکہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ ہر قوم اور ہر فرقہ کے لوگوں نے برابر تسلیم کیا ہے۔ یہی حال اُنکے برتاؤ کا دوستی و ملاقات اور سوشل معاملات میں تھا اور یہی رنگ اُن مذہبی جھگڑوں کے متعلق تھا جو سنی، شیعہ، مقلد، غیر مقلد اور ہندو مسلمانوں میں ہمیشہ پیش آتے ستے اور پیش آتے ہیں۔ اُنکے نہایت گاڑھے دوست جنکی دوستی اُخوت کے درجہ کو پہنچ گئی تھی ہر مذہب اور ہر طریقہ کے لوگوں میں موجود تھے جنکے ساتھ اخیر دم تک اُن کی یکجہتی

دیگرگی کا یکساں حال رہا۔ گائے کی قربانی پر جو ہندو مسلمانوں میں ہمیشہ تکرار رہتی ہے اُسکی نسبت جو کچھ انکا خیال تھا اسکو ہم پہلے کسی موقع پر ظاہر کر چکے ہیں اسی طرح وہ شیعوں کی نسبت اپنے ایک دوست کو لکھتے ہیں "بہت سے شیعہ ہیں جنسے ہم سے نہایت دوستی ہے وہ اپنے گھر میں ہمارے بزرگوں پر تبرہ کیا کرتے ہیں، کیا کریں، ہمارا کیا نقصان ہے"

ایک سال بقر عید کے موقع پر کالج کے چند طالب علموں نے شریک ہوکر ایک گائے قربانی کے لئے خرید لی۔ عین بقر عید کے دن نماز عید کے بعد سرسید کو خبر ہوئی کہ کالج میں گائے کی قربانی ہونے والی ہے۔ یہ سنکر وہ ازخود رفتہ ہوگئے، فوراً سوار ہونے کے لئے گاڑی تیار کرائی اور اپنی کوٹھی سے کالج تک آدمیوں کی ڈاک لگا دی یہانتک کہ وہ گائے طالب علموں سے چھین کر اُسکے مالک کو واپس دی گئی اور طالب علموں کو سخت ملامت کی اور آیندہ کے لئے قطعی ممانعت کردی کہ کالج کے احاطہ میں کبھی کوئی ایسا نہ کرنے پائے۔

سرسید نے انجمن پنجاب کے ایڈریس کے جواب میں جو الفاظ کہے تھے اُن سے اس باب میں اُنکے اصلی خیالات ظاہر ہوتے ہیں۔ اُنہوں نے کہا "میری تمام آرزو یہ ہے کہ بلالحاظ قوم اور مذہب کے تمام انسان آپس میں ایک دوسرے کی بھلائی پر متفق ہوں۔ مذہب سب کا بیشک علیحدہ علیحدہ ہے مگر اُسکے لحاظ سے آپس میں کوئی دشمنی کی وجہ نہیں ہے۔ فرض کرو کہ ایک دسترخوان پر مختلف قسم کے کھانے موجود ہیں، اُن میں سے کوئی کسی کھانے کو پسند کرتا ہے اور کوئی کسی کو، مگر اس اختلاف طبایع کی وجہ سے اُس دسترخوان پر بیٹھنے والوں کو باہم کچھ رنج نہیں ہوتا۔ اسی طرح اس دنیا میں مختلف مذہبوں کی وجہ سے مختلف مذہب والوں میں کوئی وجہ باہمی رنج کی پیدا نہیں ہوسکتی۔ ہر شخص اپنے ایمان کا مختار بلکہ میری رائے میں اُسپر مجبور ہے۔ اس لئے کہ جس چیز کا یقین اُسکے جی میں ہے اُسی کو وہ اختیار کرے گا، وہ یقین دوسروں کے دل میں اثر نہیں کرتا، اچھا ہے تو اُسکے لئے اور بُرا ہے تو اُسکے لئے؛ لیکن آپس کی محبت میں، جو انسانوں کی راحت میں سب سے بڑا جزو ہے۔ اُس سے کچھ نقصان نہیں آسکتا"

یہی وجہ تھی کہ سرسید ہمیشہ پبلک جلسوں میں جہاں ہندو مسلمان جمع ہوتے تھے دونوں قوموں کو اتحاد و اتفاق اور ایک دوسرے کی خیرخواہی و خیراندیشی کی نصیحت کرتے تھے۔ ایک موقع پر اُنہوں نے اپنی اسپیچ میں کہا "ہندوستان میں خدا کے فضل سے دو قومیں اس طرح آباد ہیں کہ ایک کا گھر دوسرے سے ملا ہے، ایک کی دیوار کا سایہ دوسرے کے گھر میں پڑتا ہے، ایک آب و ہوا میں

دونوں شریک ہیں، ایک دریا کا پانی پیتے ہیں، مرنے جینے میں ایک دوسرے کے رنج و راحت میں شریک ہوتا ہے، ایک کو دوسرے سے بغیر ملے چارہ نہیں، پس کسی چیز کو - جو معاشرت سے علاقہ رکھتی ہے ان دونوں کا علیحدہ علیحدہ رکھنا دونوں کو برباد کر دیتا ہے“

پھر آگے چلکر اُنھوں نے کہا کہ ”قوم کا لفظ ملک کے باشندوں پر بولا جاتا ہے، گو اُن میں بعض بعض خصوصیتیں بھی ہوتی ہیں - اے ہندو مسلمانو! کیا تم ہندوستان کے سوا اور ملک کے رہنے والے ہو؟ کیا اسی زمین پر تم دونوں نہیں بستے؟ کیا اسی زمین میں تم دفن نہیں ہوتے یا اسی زمین کے گھاٹ پر جلائے نہیں جاتے؟ اسی پر مرتے ہو اور اسی پر جیتے ہو تو یاد رکھو کہ ہندو اور مسلمان ایک مذہبی لفظ ہے، ورنہ ہندو مسلمان اور عیسائی بھی جو اسی ملک میں رہتے ہیں اس اعتبار سے سب ایک ہی قوم ہیں“

ایک اور موقع پر اسی باب میں اُنھوں نے مندرجۂ ذیل تقریر کی ”میرے نزدیک یہ امر چنداں لحاظ کے قابل نہیں ہے کہ اُنکا (یعنی ہندو مسلمانوں کا) مذہبی عقیدہ کیا ہے؟ کیونکہ ہم اُس کی کوئی بات نہیں دیکھ سکتے، لیکن جو بات کہ ہم دیکھتے ہیں وہ یہ ہے کہ ہم سب - خواہ ہندو ہوں یا مسلمان - ایک ہی سرزمین پر رہتے ہیں، ایک ہی حاکم کے زیر حکومت ہیں، ہم سب کے فائدہ کے مخرج ایک ہی ہیں، ہم سب قحط کی مصیبتوں کو برداشت کرتے ہیں - یہی مختلف وجوہات ہیں جنکی بنا پر میں ان دونوں قوموں کو - جو ہندوستان میں آباد ہیں - ایک لفظ سے تعبیر کرتا ہوں کہ ”ہندو“ یعنے ہندوستان کی رہنے والی قوم“

ایک اور اسپیچ میں اُنکے یہ الفاظ تھے ”اب ہندوستان ہی ہم دونوں کا وطن ہے، ہندوستان ہی کی ہوا سے ہم دونوں جیتے ہیں، مقدس گنگا جمنا کا پانی دونوں پیتے ہیں ہندوستان ہی کی زمین کی پیداوار ہم دونوں کھاتے ہیں، مرنے میں جینے میں دونوں کا ساتھ ہے، ہندوستان میں رہتے رہتے دونوں کا خون بدل گیا، دونوں کی رنگتیں ایک سی ہوگئیں، دونوں کی صورتیں بدل کر ایک دوسرے کے مشابہ ہوگئیں مسلمانوں نے ہندوؤں کی سیکڑوں رسمیں اختیار کر لیں، ہندوؤں نے مسلمانوں کی سکڑوں عادتیں لے لیں، یہاں تک ہم دونوں آپس میں ملے کہ ہم دونوں نے ملکر ایک نئی زبان پیدا کر لی - جو نہ ہماری زبان تھی نہ اُنکی“

”اے میرے دوستو! میں نے بارہا کہا ہے اور پھر کہتا ہوں کہ ہندوستان ایک دُلہن کی مانند ہے جسکی خوبصورت اور رسیلی دو آنکھیں ہندو اور مسلمان ہیں - اگر وہ دونوں آپس میں نفاق رکھیں گے تو وہ پیاری دُلہن بھینگی ہو جاویگی، اور اگر ایک دوسرے کو برباد کر دیں گے تو وہ کانڑی بن جاویگی

پس اے ہندوستان کے رہنے والے ہندو مسلمانوں اب تمکو اختیار ہے کہ چاہو اُس دُلہن کو بھینگا بناؤ چاہو کانڑا ۔"

اس کے علاوہ - جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے - اُنھوں نے جتنے رفاہِ عام کے کام کئے اُن میں تمام ہندو مسلمانوں کو شریک کیا، سوسائٹی کے اخبار میں - جو کہ پینتیس برس اُنکے ہاتھ تلے رہا کبھی بھولکر بھی کوئی آرٹکل یا نوٹ ایسا نہیں لکھا جس سے کہ مذہبی تعصب کی بو آتی ہو کبھی گورنمنٹ سے اس بات کی شکایت نہیں کی کہ مسلمانوں کی تعداد بہ نسبت ہندوؤں کے سرکاری ملازمت میں بہت کم ہے کبھی کسی ہندو عہدہ دار کی ترقی پر اعتراض یا ناگواری کا اظہار نہیں کیا بلکہ برخلاف اسکے ہمیشہ مسلمانوں کو یہ نصیحت کی کہ سرکاری ملازمت کا استحقاق پیدا کریں ہمیشہ ہندو لیڈروں اور ریفارمروں کا ذکر ادب اور تعظیم کے ساتھ اپنے اخبار میں اور پبلک اسپیچوں میں کیا، اور ہمیشہ اُنکے مرنے پر حد سے زیادہ رنج اور افسوس ظاہر کیا - یہی حال اُنکی بے تعصبی کا اسلامی فرقوں کے ساتھ تھا اور یہی حال عیسائیوں کے ساتھ -

اسلامی حمیت

باوجود اسکے اسلامی حمیت جیسی اس شخص میں پائی جاتی تھی نہ وہ مولویوں اور واعظوں میں دیکھی گئی نہ صوفیوں اور درویشوں میں - جب کوئی بیجا حملہ اسلام یا مسلمانوں پر غیر مذہب والوں کی طرف سے ہوا اُسنے فوراً اُسکی مدافعت کی نہ اس معاملہ میں اسکو اپنی صلح کل کی پالیسی کا پاس و لحاظ تھا اور نہ اس بات کی کچھ پروا تھی کہ فریق ثانی کس رتبہ اور درجہ کا آدمی ہے چنانچہ وہ ہندو مسلمانوں میں ہمیشہ اتحاد و اتفاق قایم رکھنا چاہتا تھا مگر جب اُسنے دیکھا کہ ہندو اُردو زبان اور فارسی خط کو صرف اس وجہ سے مٹانا چاہتے ہیں کہ وہ ہندوستان میں مسلمانوں کے عہد کی یادگار ہے تو اُسنے علانیہ اُنکی مخالفت کی اور ولایت جانے سے پہلے دو برس تک برابر اُن تمام سبھاؤں اور مجلسوں اور کمیٹیوں کے برخلاف آرٹکل لکھتا رہا جو بنارس اور الہ آباد اور دیگر مقامات میں اردو کی بیخ کنی کے لئے قایم ہوئی تھیں - پھر جب ایسے ہی تنگدلی اور تعصب کے خیالات سے الہ آباد یونیورسٹی میں یہ تحریک ہوئی کہ فارسی زبان یونیورسٹی کے کورس سے خارج کر دی جائے تو اُسنے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسہ میں بمقام الہ آباد اس تحریک کے برخلاف ایک نہایت پرجوش اور زبردست اسپیچ میں اُن تمام دلائل کی تردید کی جو فارسی زبان کے خارج کرنے کی ضرورت پر پیش کی گئی تھیں -

باوجودیکہ وہ انگریزوں کا دوست تھا اور اُنمیں اور مسلمانوں میں خلوص اور دوستی پیدا کرنا چاہتا

تھا مگر جن انگریزوں نے اسلام کے برخلاف کتابیں لکھیں اُنکا مقابلہ اُس نے نہایت آزادی
اور بیباکی کے ساتھ کیا۔ اُسی نے سب سے پہلے گورنمنٹ کو اس بات سے آگاہ کیا کہ ملکی اور
فوجی افسر اپنے تابعین کو مشنریوں کا وعظ سنوانے کے لئے اپنا رعب و داب کام میں لاتے
ہیں جس سے لوگوں کو خیال ہوتا ہے کہ گورنمنٹ ہندوستانیوں کو عیسائی بنانا چاہتی ہے ضلع
مراد آباد میں انتظام قحط کے موقع پر ہندو مسلمانوں کے یتیم لاوارث بچوں کی بابت جو کشاکشی
سرسید اور مشنریوں اور کلکٹر مراد آباد کے درمیاں رہی وہ پہلے حصہ میں مفصل بیان ہو چکی ہے
اُسنے ایجوکیشن کمیشن کی شہادت میں صاف صاف کہدیا کہ مسلمانوں کی عام فیلنگ مشنری
اسکولوں اور کالجوں کے برخلاف ہے۔ پس اگر کہیں کسی مشنری اسکول کی موجودگی کے سبب
کوئی گورنمنٹ اسکول توڑ دیا جائیگا تو اس کی وجہ سے لوگوں میں ناراضی پیدا ہو گی۔
اُسنے کمیشن میں یہ بھی ظاہر کر دیا کہ "جہاں مشنری اسکول ہیں اگر وہاں کے لوگ اپنی اولاد کو اُن اسکولوں
میں بھیجنا پسند نہ کریں اور آپ اپنے لئے علٰحدہ اسکول یا کالج قایم کریں تو گورنمنٹ اُنکو گرینٹ ان ایڈ عطا
فرما دے اور اس بات کی خبر رکھے کہ وہاں کے حکام اس قسم کی لوکل کوششوں میں خلل انداز نہوں
اور جیسا کہ بعض ضلعوں میں ہوا ہے اپنی حکومت اور رعب داب کو اُنکے برخلاف عمل میں نہ لاویں"

اُس سے بڑھکر کوئی شخص اس بات کا مخالف نہ تھا کہ مسلمان اپنی اولاد کو تعلیم کے لئے
مشنری اسکولوں یا کالجوں میں داخل کریں؛ نہ اسلئے کہ اُسکو عیسائی مذہب سے کچھہ تعصب تھا
بلکہ صرف اس خیال سے کہ مسلمانوں کو غیرت آئے اور وہ اپنی اولاد کی دینی اور دنیوی تعلیم کا خود
انتظام کریں۔ نیز مشنریوں کا قحط زدہ رعایا کے بچوں کو انکی پرورش کے بہانہ سے لیکر عیسائی بنانا
اور اسی غرض سے مشنری کالج اور اسکول قایم کرنے اسکے نزدیک سخت اعتراض کے قابل
کارروائی تھی۔ اُسنے جو لکچر ۱۸۸۳ء میں بمقام لودہیانہ دیا تھا اُس میں وہاں کے مسلمانوں
سے مخاطب ہو کر صاف صاف کہا تھا کہ "بڑے افسوس کی بات ہے کہ لودہیانہ سے شہر میں۔
جو ایک بڑا شہر ہے اور جہاں بہت سے مسلمان آباد ہیں۔ مشنری اسکول بہت سے ہیں اور مسلمانوں کو یہ
شرم نہیں آتی کہ مشنری تعلیم گاہوں میں وہ اپنے لڑکوں کو بھیجتے ہیں اُنکو کچھہ جوش پیدا نہیں ہوتا اُنکو کچھہ
غیرت نہیں آتی کہ وہ اپنے لڑکوں کا خود کچھہ بندوبست کریں وہ کتے کی طرح اپنے لڑکوں کو خیراتی روٹی
پر جلاتے ہیں اور ایسے خیراتی اسکولوں میں اپنی اولاد کو تعلیم کے واسطے بھیجتے ہیں اور خود کوئی بندوبست
اپنے بچوں کی تعلیم کا نہیں کرتے"

اُسی لودھیانہ کے جلسہ میں جب وہاں کے مشن اسکول کے ایک مسلمان طالب علم
نے سرسید کی تعریف میں کچھ تقریر کی تو اُسکے جواب میں جو کچھ اُنھوں نے کہا اُس سے اندازہ
ہو سکتا ہے کہ وہ ایک مشن اسکول کے تعلیم یافتہ مسلمان نوجوان کی نسبت کیسے خیالات اور
شبہات رکھتے تھے۔ اُنھوں نے کہا "تمہارے بیان میں کئی جگہ قوم کا لفظ آیا ہے مگر یاد رکھو کہ قوم
کوئی چیز نہیں ہے جب تک کہ وہ قوم قوم نہو۔ ایک ایک شخص جو اسلام کے گروہ میں داخل ہے وہ سب
ملکر مسلمانوں کی ایک قوم کہلاتی ہے۔ جب تک وہ اپنے مذہب کے پیرو اور پابند ہیں تبھی تک وہ
قوم ہیں۔ یاد رکھو کہ اسلام جس پر تمکو چلنا ہے اور جس پر تمکو مرنا ہے اسکے قائم رکھنے سے ہماری قوم
قوم ہے۔ اسے عزیز بچے اگر کوئی آسمان کا تارا ہو جائے مگر مسلمان نہ رہے تو ہمکو کیا؟ وہ تو ہماری قوم
ہی نہ رہا۔ پس اسلام کو قائم رکھکر ترقی کرنا قومی ترقی ہے۔ میں تم سے کہتا ہوں کہ تم ہمیشہ اُسکو قائم رکھوگے
اور اُسکے ساتھ تمام باتوں میں ترقی کرتے جاؤگے کہ یہی قومی ترقی ہوگی جو قوم کو بھی فائدہ دیگی اور
قوم کو بھی عزت ہوگی اور آیندہ آنے والی نسلیں بھی اس سے فائدہ اُٹھاویں گی۔"

اگرچہ اسلامی حمیت ہر مسلمان کے دل میں کم و بیش ضرور ہوتی ہے اور ہونی چاہیے مگر
اس باب میں سرسید کے خیالات عام مسلمانوں کے خیالات سے بالکل مختلف تھے۔ جو اعتراض
عیسائی لوگ اسلام پر کرتے ہیں یا جو مطاعن رسول خدا صلعم کی نسبت اپنی کتابوں میں لکھتے ہیں
بعضے مسلمان تو اسی کو کمال دینداری سمجھتے ہیں کہ اُسکو آنکھ اُٹھاکر نہیں دیکھتے۔ بعضے غیظ و
غضب میں آکر ایسی کتابوں کو آگ میں جلا دیتے ہیں اور بعضے گورنمنٹ سے فریاد کرتے ہیں
کہ فلاں کتاب میں ہمارے دین یا ہمارے نبی کی توہین کی گئی ہے۔ اُسکو گورنمنٹ تلف کرا دے
اور آیندہ اسکے چھاپنے کی ممانعت ہو جائے۔ مگر درحقیقت ان باتوں کو مذہبی حمیت سے کچھ
علاقہ نہیں ہے بلکہ ایسا کرنا گویا اس بات کو تسلیم کر لینا ہے کہ مخالفوں کے اعتراضات کا ہمارے
پاس اسکے سوا کچھ علاج نہیں کہ اُن اعتراضوں سے اپنی آنکھیں اور کان بند کر لیں یا گورنمنٹ
سے فریاد کر کے ایسی کتابوں کو تلف اور اُن کی اشاعت بند کرا دیں۔ برخلاف اس کے
سرسید کے خیالات اس باب میں یہ تھے کہ مسلمانوں کے لئے اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ عیسائیوں
کے اعتراض کو لغو و بیہودہ سمجھکر اُن کی طرف التفات نہ کیا جائے یا گورنمنٹ میں استغاثہ کر کے
اس بات کا ثبوت دیا جائے کہ مسلمان اُنکا جواب دینے سے عاجز ہیں بلکہ اسلامی حمیت
کا مقتضا یہ ہے کہ اُنکے اعتراضوں کو نہایت ٹھنڈے دل سے اور نہایت صبر و تحمل کے

ساتھ دیکھیں اور اُن پر غور کریں، پھر جو جواب دینے کے قابل ہوں اُنکا جواب دیں اور جن میں بدزبانی و بے تہذیبی کے سوا کوئی بات التفات کے قابل نہ ہو اُنکا فیصلہ پبلک کی رائے پر چھوڑ دیں نہ یہ کہ گورنمنٹ کو اُن کا جج قرار دیں اور مذہبی مباحثوں میں حکومت کی پناہ ڈھونڈیں تاکہ دنیا پر ظاہر ہو جائے کہ اسلام کی دلیلیں باوجود اُسکے محکوم و مغلوب ہونے کے اب بھی ویسی ہی غالب ہیں جیسی اُسوقت تھیں جبکہ اسپین[1] کے عیسائی مسلمانوں کے زوال کے بعد اُن کو اس لئے جلا وطن کرتے تھے کہ اُن کی دلیلوں کا جواب دینے سے عاجز آ گئے تھے۔

الغرض اگر مسلمان سے یہ مراد ہے کہ دین اسلام کے حق ہونے پر اپنی ذاتی تحقیقات سے۔ نہ کہ ماں باپ کی تقلید سے۔ یقین واثق رکھتا ہو، اسلام کو اعلیٰ ترین اخلاق کا تعلیم دینے والا، غیر مذہب والوں کے ساتھ فیاضانہ برتاؤ سکھانے والا اور فتنہ و فساد و ظلم و بیرحمی کی بیخ کنی کرنے والا، غرض کہ اُسکی تعلیم کو نوع انسانی کے حق میں سراسر رحمت اور برکت سمجھتا ہو، خدا کے سوا کسی کو مستحق عبادت اور نبی کے سوا کسی انسان کے قول کو واجب الاتباع نہ جانتا ہو، اسلام کی حمایت کو اپنی زندگی کا اعلیٰ ترین مقصد خیال کرتا ہو، مسلمانوں کی عزت چاہنے والا اور اُن کی ذلت پر افسوس کرنے والا ہو، جس بات کو سچ جانے اُس کے ظاہر کرنے میں کسیکی مخالفت سے نہ ڈرتا ہو، معاملات میں راستباز ہو اور بُرائی کے عوض میں بھی بھلائی کے سوا کچھ نہ کرے تو شاید سید احمد خاں جیسا مسلماں زمانہ میں مشکل سے ملیگا؛ لیکن اگر مسلماں سے یہ مراد نہیں ہے بلکہ اس لفظ کے حقیقی مصداق وہ لوگ ہیں جو تعصب کو دین اسلام کا رکن رکین سمجھتے ہیں، جو ذرا ذرا سے اختلافات پر جماعت اسلام کو پراگندہ کرنا اپنا فرض جانتے ہیں، جنکو ائمہ مجتہدین کی تقلید نے قرآن اور حدیث سے مستغنی کر دیا ہے، جو قرآن کو محض تلاوت کرنے کی کتاب اور حدیث کو صرف سند لینے کی چیز خیال کرتے ہیں

---

[1] سرسید نے خطبات احمدیہ میں ایک آزاد خیال یورپین مصنف کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "اگرچہ بظاہر مور (یعنی اسپین کے مسلمان) اسوجہ سے جلا وطن کئے جاتے تھے کہ وہ عیسائی مذہب قبول نہ کرتے تھے مگر مجھکو گمان ہے کہ وہ اپنی دلیلوں سے عیسائیوں پر اسقدر غالب آ گئے تھے کہ نادان منک (راہب) یہ سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کی دلیلوں کا جواب صرف مذہبی عدالت کی سزا اور تلوار سے ہو سکتا ہے، اور مجھے کچھ شبہ نہیں کہ جہانتک اُنکی ناقص قوت جواب دینے کے باب میں تھی وہانتک اُن کا یہ خیال صحیح تھا"

جو احکام ظاہری پر لمبے لمبے وعظ کہتے ہیں، آمین اور رفع یدین کی بحث میں عمریں گذار دیتے ہیں، وضع ولباس میں غیر قوموں کے تشبہ کو محاربۂ خدا و رسول کی حد تک پہنچا دیتے ہیں۔ مگر قوم کے اخلاق کی درستی کا جسکی نسبت نبی نے کہا تھا کہ "بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الاَخْلَاقِ" کبھی بھولکر بھی خیال نہیں کرتے، جن کے وعظ و نصیحت سے۔ سوا اس کے کہ مسلمانوں میں افلاس، نااتفاقی، بغض اور کینہ کو ترقی ہو، اہل قبلہ میں ہمیشہ کھٹا پٹی رہے۔ اسلام مطعون ہو، اور قوم کو دنیا میں رہنا مشکل ہو جائے۔ کوئی نتیجہ پیدا ہوتا نظر نہیں آتا تو ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ان معنوں میں سید احمد خاں کو مسلمان کہنا صحیح نہ ہوگا مگر یہ ویسی ہی مسلمانی ہوگی جسکی نسبت کہا گیا ہے ؎

اگر حقیقتِ اسلام در جہاں این ست ہزار خندہ کفر ست بر مسلمانی

بالخیر



تفصیل کتب مطبوعات مسلم یونیورسٹی بک ڈپو علی گڑھ

جن پر زیادہ خریداری کی حالت مین معمول سے زیادہ کمیشن حسب تفصیل ذیل دیا جائیگا یعنے دس روپیہ سے کم کی خریداری پر کچھ کمیشن نہیں ہے۔ دس روپیہ سے زیادہ پر پچیس۲۵ روپیہ تک دس روپیہ فیصدی۔ پچیس۲۵ روپیہ سے زیادہ پر ایک سو روپیہ تک پندرہ فیصدی۔ اور ایکسو۱۰۰ روپیہ سے زیادہ پر بیس۲۰ روپیہ فیصدی کمیشن دیا جائیگا۔ قیمت ہر حال مین نقد وصول کیجائیگی۔ اور محصول وغیرہ ہر حالت مین ذمہ خریدار ہوگا۔ ریلوے پارسل اگر ریلوے ملازمین کی غلطی سے کسی دوسرے مقام پر پہنچ جائے یا گم ہو جائے تو اسکی ذمہ داری سے یہ بکڈپو سبکدوش ہوگا۔

نمبر صفحہ فہرست	نمبر کتاب	نام کتاب	نام مصنف	قیمت	نمبر صفحہ فہرست	نمبر کتاب	نام کتاب	نام مصنف	قیمت
۲	۱۴	اعجاز البیان فی لغات القرآن	مولوی محمد رفیع الدین صاحب	۱۲ر	۹	۳۴	کتاب المحبت و الشوق	نواب محسن الملک مرحوم	۱۰ر
۵	۱۵	تفسیر القرآن جلد اول	سر سید مرحوم	ے	۹	۳۵	اعجاز التنزیل	خلیفہ سید محمد حسن صاحب	[illegible]
۵	۱۶	〃 جلد دوم	〃	ے	۹	۳۵	مکاتبات الخلان	محمد عثمان صاحب	[illegible]
۵	۱۷	〃 جلد سوم	〃	ے		۷۹	انتخاب مضامین سرسید	از تہذیب الاخلاق	۱۲ر
۶	۱۸	〃 جلد چہارم	〃	ے	۱۸	۷۹	تحریر المراۃ	مترجمہ مولوی رشید احمد صاحب	[illegible]
۶	۱۹	〃 جلد پنجم و ششم	〃	ے	۲۱	۱۰۱	عود ہندی	مرزا غالب مرحوم	۱۲ر
۶	۲۱	〃 جلد ہفتم	〃	ے	۲۴	۱۲۵	ایک فلسفیانہ لکچر	خواجہ غلام الثقلین	۲ر
۷	۲۲	خطبات احمدیہ	〃	ے	۲۴	۱۲۷	کیفیت تشریف آوری	مرتبہ نواب محسن الملک	۴ر
۷	۲۳	تبیین الکلام ہر دو حصہ	〃	ے	۲۵	۴	تذکرۃ المصطفٰے	مولوی سید نواب علی صاحب	[illegible]
۷	۲۴	احکام طعام اہل کتاب	〃	۶ر	۳۹	۱۶۶	حیات سعدی	مولوی حالی مرحوم	[illegible]
۷	۲۳	ترقیم فی قصہ اصحاب الکہف	〃	۸ر	۳۱	۱۷۷	الفاروق	مولوی شبلی نعمانی مرحوم	[illegible]
۸	۲۷	ازالۃ الغین	〃	۶ر	۳۲	۱۸۷	یادگار غالب	مولوی حالی مرحوم	[illegible]
۸	۲۸	النظر فی بعض مسائل	〃	[illegible]	۳۴	۱۹۳	دعوت اسلام	ترجمہ [illegible]	[illegible]
۸	۳۰	جواب امہات المومنین	〃	[illegible]	۳۵	۱۹۶	[illegible]	〃	[illegible]
۹	۳۲	[illegible]	[illegible]	۱۰ر	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]

نمبر شمار	نمبر صفحہ	نام کتاب	نام مصنف	قیمت	نمبر شمار	نمبر صفحہ	نام کتاب	نام مصنف	قیمت
		علوم عرب	مولوی محمد اسلم صاحب	عہ	۶۴	۳۹۷	رہنمایان ہند	سلسلہ انجمن ترقی اردو	عہ
۳۹	۲۶۰	کتب خانہ اسکندریہ	مولوی شبلی نعمانی	۲ ر	۶۵	۳۹۸	مصباح القواعد	مولوی فتح محمد خان	عہ
۳۵	۲۱۸	رسالہ اسباب بغاوت ہند	سرسید مرحوم	۴ ر	۶۵	۳۹۹ تا ۴۰۳	نپولین اعظم جلد اول	سید معین الدین	عہ
۴۰	۲۴۳ ۲۴۴	تاریخ ہندوستان اردو کامل	مولوی ذکاء اللہ	[illegible]	۶۵	"	جلد دوم	"	۸ ر
۴۳	۲۵۴	تاریخ نیپال	خلیفہ محمد حسن صاحب	[illegible]	۶۵	"	جلد سوم	"	۸ ر
۴۵	۲۵۴	وقائع سیر سیاحت نیپال ہر دو حصہ	"	۸ ر	۶۵	"	جلد چہارم	"	۲ ر
۴۶	۲۵۹	سفر نامہ پنجاب	سرسید	عہ	۶۵	"	جلد پنجم	"	۶ ر
۴۶	۲۶۶	پرشیا کا گلدان	ترجمہ از انگریزی	۴ ر	۶۵	۴۰۴	القول الاظہر	حکیم محمد محسن	عہ
۴۷	۲۷۳	کنیز فاطمہ ناول	خان بہادر قاضی عزیز الدین احمد	عہ	۶۶	۴۰۶	امراض ہند قسم ۲ و ۳	مولوی سید احمد مارہروی	عہ
۴۸	۲۷۹	نوشتہ تقدیر	مولوی سید احمد صاحب	عہ	۷۰	۴۲۴	شرح قانون شہادت	سید محمود صاحب	۸ ر
۵۳	۳۱۰	جنگل کی پہلی کہانی	مولوی عنایت اللہ صاحب	۲ ر	۷۰	۴۲۹	کتاب الطلاق	"	۴ ر
۵۰	۳۲۳	نقش وفا	مولوی حبیب الرحمن خان صاحب	۸ ر	۷۱	۴۳۰	کتاب الشفعہ ہر دو حصہ		۴ ر
۵۹	۳۲۵	تکمیل نسواں	سید افتخار عالم صاحب	۸ ر	۷۲	۴۳۸	علم برقی	سر ولیم اسٹوپیرس	۴ ر
۵۹	۳۵۰	مجموعہ نظم حالی طبع جدید	مولوی حالی مرحوم	۱۲ ر	۷۲	۴۴۰	رسالہ علم حفظ صحت	رابرٹ اسکاٹ برن	عہ
۶۰	۳۵۲	مسدس حالی	"	۱۲ ر	۷۶	۴۷۴	الکحل	حکیم فضل حسین صاحب	۱۲ ر
۶۰	۳۵۳	شکوہ ہند	"	۲ ر	۸۰	۵۰۲	انتخابات فارسی	انتخابی مضامین	۴ ر
۶۰	[illegible]	ایک بیوہ کی مناجات	"	۲ ر	۸۱	۵۰۵	گارستان اتفاقیہ	آغا کمال الدین سنجر	۱۰ ر
۶۰	[illegible]	[illegible]	مولوی حالی و مولوی نذیر احمد	۱۰ ر	۸۲	۵۱۹	المقدمہ عربی	مولوی سید امت حسین	عہ
					۸۴	۵۲۴	البیزان دی لائف آف محمد	سرسید مرحوم	للعہ
۹۰	۳۹۱	مسدس بیغ نہار	مولوی احمد علی شوق	عہ					
۹۳	۳۹۲	مثنوی صبح امید	مولوی شبلی نعمانی	عہ	۵۲۵	۵۲۵	ہسٹری آف انگلش ایجوکیشن ان انڈیا	سید محمود مرحوم	للعہ
۹۳	[illegible]	فلسفہ تعلیم	مترجم غلام حسنین	[illegible]					